ہم کیوں مسلمان ہوئے
دنیا بھر کے نوّے نومسلموں کے
قبولِ اسلام کے حالات و واقعات
بے حد دلچسپ بے حد ایمان افروز
ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

دنیا بھر کے ۹۰ نو مسلموں کے قبول اسلام کے حالات و واقعات

بہت دلچسپ، بہت ایمان افروز

ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ ڈی ایچ ایم ایس

سابق صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج آف سائنس

وحدت روڈ، لاہور

بیت الحکمت کا اشاعتی ادارہ

بیاد پروفیسر عبدالجبار شاکر ۱۹۴۷ء ۔ ۲۰۰۹ء

۲۰۱۰ء ۱۴۳۰ھ

نام کتاب : ہم کیوں مسلمان ہوئے

مصنف : ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

اہتمام : بیت الحکمت، لاہور

مطبع : میٹرو پرنٹرز، لاہور

اپنی ہمت کے مطابق پڑھنے کو بہت کچھ پڑھا ہے اور لکھنے پڑھنے کے سوا کیا بھی کیا ہے؟ لیکن کتاب اللہ کے بعد صرف تین کتابیں ہیں جنہیں بار بار پڑھا ہے اور پھر بھی پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔ فارسی میں گلستان سعدی کا دیباچہ' اردو میں مولانا مناظر احسن گیلانی کی ''النبیؐ الخاتم'' اور پروفیسر عبدالغنی فاروق کی کتاب ''ہم کیوں مسلمان ہوئے؟''

سوانح عمری کسی کی بھی ہو' سبق آموز ہوتی ہے اور جب وہ خود نوشت ہو تو سبق آموزی کے ساتھ دلچسپ بھی ہو جاتی ہے۔ زیر نظر کتاب میں دو چار نہیں نوے (۹۰) سوانح حیات ہیں اور وہ بھی دنیا کے نامور نومسلم حضرات کے روح پرور' ایمان افروز اور وجد آفریں سوانح حیات۔

کتاب میں سنی سنائی کہانیاں نہیں بلکہ ان خوش نصیب صاحبانِ فکر و نظر کی مبنی بر حقیقت سرگزشتیں ہیں جنہیں ایمان کی دولت نصیب ہوئی۔ اس طرح وہ اپنے آبائی مذاہب کو چھوڑ کر حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ اکثر سرگزشتوں کو ۹۰ خودنوشتوں کا مجموعہ کہا جائے' تو درست ہوگا۔

ماضی قریب اور زمانہ حال کے ان معروف اہلِ علم حضرات میں مشرقی بھی ہیں' مغربی بھی' ان میں سائنس دان بھی ہیں' انجینئر بھی' اساتذہ اور دانشور بھی ہیں اور صحافی بھی۔ ان کی قومیت اور حیثیت کی طرح اسلام کی طرف ان کے مائل ہونے کی وجوہ بھی مختلف ہیں اور حیران کن بھی۔

ہم خوش نصیب ہیں کہ ہم نے اسلام کی دولت ورثہ میں پائی' لیکن ناقدرے ہیں کہ اس دولت کی حفاظت کے لیے نہ جدوجہد کی' نہ قربانی دی۔ ان نومسلم خواتین و حضرات سے پوچھیے کہ انہوں نے اس راستے میں کیا صعوبتیں جھیلیں اور اس چشمۂ صافی تک پہنچنے کے لیے انہیں کتنے ہفت خواں طے کرنے پڑے۔

فاضل مرتب نے اس گلدستہ کو جس حسنِ ترتیب سے جمع کیا ہے' وہ اپنی جگہ قابلِ تعریف ہے۔ یہ کتاب بلاشبہ ہر چھوٹے بڑے کے مطالعہ کی ہے اور غیر مسلم احبابؔ بطور تحفہ پیش کرنے کی ہے۔ کیا پتہ کس کی بات کس کے دل میں اتر جائے؟

پروفیسر حافظ نذر احمد
سابق پرنسپل شبلی کالج' لاہور

انتساب

والدِ مرحوم و مغفور کے نام جو جمعہ ۲۲ جولائی ۱۹۷۷ء کو انتقال فرما گئے۔ "انا للہ و انا الیہ راجعون" وہ ایک ان پڑھ کسان تھے، لیکن دینِ حق سے ان کی محبت اور شیفتگی بے پناہ تھی۔ وہ ایک دردمند، حساس اور ایثار پیشہ مسلمان تھے۔ عمر بھر صوم و صلوٰۃ کے سختی سے پابند رہے۔ جاگتے میں وہ دو خواب اکثر دیکھا کرتے۔ پاکستان میں اسلامی نظام آ جائے اور کسان زمینداروں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ ہو جائیں۔ آہ! یہ دونوں خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوئے۔

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

فہرست

مضامین

نومسلموں کے حالات اور تبلیغِ دین......اقبال کی نظر میں

ڈاکٹر محمد اقبالؒ ایک پختہ دماغ عارف اور حکیم تھے۔ آپ جب بھی کسی مسئلہ پر گفتگو فرماتے تھے، اس کے تعلق میں کلیّات و تخیلّات کا اور ان کے ساتھ ہی مثالوں اور حوالوں کا ایک موّاج دریا آپ کے دماغ سے اترتا تھا اور زبان سے بہہ جاتا تھا۔

۲۸ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو راقم الحروف موصوف کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ آرام کرسی پر تشریف فرما تھے' حقہ سامنے رکھا تھا' رسمی مزاج پرسی ہوئی اور اس کے بعد تبلیغ اسلام کے عنوان پر گفتگو شروع ہو گئی۔

"آپ ایک کتاب لکھیے" ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔

"کیسی کتاب؟" میں نے پوچھا۔

"تحقیقات کرنے سے آپ کو معلوم ہو گا کہ ہندوستان کے قصبات اور دیہات میں ہزارہا غیر مسلم حلقۂ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان از خود مسلمان ہونے والوں سے ملے اور ان سے قبولِ اسلام کی وجوہات دریافت کر کے ایک کتاب میں جمع کر دے تو اس سے تبلیغ اسلام کے مقصد کو بے حد تقویت حاصل ہو گی۔"

"کیا صداقتِ اسلام کے متعلق پہلے دلائل ناکافی ہیں؟" مَیں نے پوچھا۔

"بہت کافی ہیں' مگر ایسا کرنے سے کئی ایسے عجیب اور جدید دلائل آپ کو ملیں گے کہ دنیا حیرت زدہ رہ جائے گی۔ مَیں یہ سمجھتا ہوں کہ دل اور دماغ کے کام کرنے کے طریقوں میں بہت فرق ہے۔ دماغ اکثر اوقات ہزارہا مضبوط سے مضبوط دلائل کو مسترد کر دیتا ہے اور ان کی کچھ بھی پروا نہیں کرتا' لیکن دل اس کے برخلاف' بعض اوقات کمزور سے کمزور چیزوں سے اس قدر متاثر ہو جاتا ہے کہ صرف ایک ہی جھٹکے میں زندگی کا سارا نقشہ بدل جاتا ہے۔ قبولِ اسلام کا جس قدر تعلق دل سے ہے' دماغ سے نہیں اصل بات جو مبلغ کو

معلوم ہونی چاہیے' یہ ہے کہ وہ کون کون سے نشتر ہیں جن سے دل متاثر ہوا کرتے ہیں؟ کفار اور مشرکین کے انقلابِ حیات کی ہزار ہا مثالیں تاریخ اسلام کے پاس موجود ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص اپنے حالات کے ماتحت' ایک خیال یا ایک مذہب پر چٹان کی طرح قائم ہوتا ہے' ناگہاں غیب سے اس کے دل پر ایک نشتر چلتا ہے اور چشم زدن میں اس کی زندگی کی تمام گزشتہ تاریخ بدل جاتی ہے۔ صداقت اسلام کے عقلی دلائل تو آپ کے پاس بہت ہیں' مگر قلبی دلائل کم ہیں۔ اگر آپ نومسلموں کے پاس جائیں تو وہ بتائیں گے کہ اسلام کی وہ کون سی بے ساختہ ادا تھی جو ان کے دل کو بھا گئی؟ اگر ان کے بیانات ایک کتاب میں جمع کر دیئے جائیں تو مجھے یقین ہے کہ انقلابِ حیات کی ایک بالکل نئی دنیا' مبلغینِ اسلام کے سامنے آ جائے گی اور انہیں اشاعتِ اسلام کے لیے ایسے نئے دلائل یا جدید ہتھیار مل جائیں گے کہ ان سے اسلام کا موجودہ کتب خانہ خالی ہے۔''

عبدالمجید قریشی

''اسلام زندہ باد'' ص ۷'۸

مطبوعہ الہلال بک ڈپو' الہ آباد

کچھ اس کتاب کے بارے میں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○ الحمدللہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسول اللہ وعلیٰ آلہ وصحابہ اجمعین○

میں نے اس گرانقدر کتاب کا مطالعہ کیا ہے اور اس میں بیان کردہ نومسلموں کے حالات پڑھے ہیں بلاشبہ مصنف کا اسلوبِ نگارش بڑا دلکش ہے۔ انہوں نے ان مضامین کو بڑی محنت اور عرق ریزی سے جمع کیا ہے اور پھر انہیں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے' امرِ واقعہ یہ ہے کہ ان نومسلموں کے حالات میں ان لوگوں کے لیے عبرت ونصیحت کا بہت کچھ سامان ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے مسلمان والدین کے ہاں پیدا کیا اور وہ ایک اسلامی ماحول میں تربیت حاصل کرنے کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے۔

اسلام کی نعمت عطا فرما کر اللہ تعالیٰ نے یقیناً اپنی ان بندوں پر بڑا انعام فرمایا ہے' دنیا کا سب سے بڑا انعام۔ بلاشبہ ان میں سے کتنے ہی لوگ ایسے ہیں' جنہیں اسلام قبول کرنے کی پاداش میں بے پناہ آلام ومصائب اور آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا۔ ان آزمائشوں میں قتل' جلاوطنی اور قید وبند وغیرہ سب کچھ تھا چنانچہ ان میں سے کتنے ہی ہیں جنہیں اس جرم کی پاداش میں اپنی جانیں قربان کرنی پڑیں' کتنے ہی ہیں جنہیں اپنے گھر بار اور عزیز واقارب سے جدا ہونا پڑا اور کتنے ہی ہیں جنہیں انواع واقسام کی دوسری آزمائشوں سے گزرنا پڑا لیکن اللہ کے فضل سے ساری سختیوں کے باوجود ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ راہِ حق میں ان آلام ومصائب اور شدید مشکلات کے دوران ان حضرات کو جس چیز نے حوصلہ دیے رکھا وہ نبی اکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ تھا جنہوں نے اس راہ میں ایسے ایسے مصائب وشدائد برداشت فرمائے تھے اسی طرح

ان لوگوں کے لیے اصحاب رسولؐ کی زندگیاں بھی مشعلِ راہ بنی رہیں جنھوں نے اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں نچھاور کر دیا تھا۔

اللہ تعالیٰ قرآنِ کریم میں اہلِ ایمان کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ (سورۃ البقرہ۔۲۱۴)

''یعنی کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تمھیں جنت کا داخلہ بس یونہی مل جائے گا حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے، ان پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہلِ ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ (اس وقت انہیں تسلی دی گئی) کہ اب اللہ کی مدد قریب ہے۔''

ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہوتا ہے:

الٓمّٓ ۝ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝ (العنکبوت۔۱۔۳)

''ا ل م کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ (ہم ایمان لائے) اور ان کو آزمایا نہ جائے گا حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون؟''

مسندِ امام احمد، ترمذی اور ابنِ ماجہ کی ایک حدیث ہے ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً الانبیاء ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ ''یعنی سب سے زیادہ آزمائشیں انبیاء علیہم السلام کو پیش آئیں، اس کے بعد ان کے قریب تر لوگوں کو پھر اس کے بعد ان کے قریب لوگوں کو۔

اس طرح ایک دوسری حدیث میں ہے کہ بعض صحابہ کرامؓ نے نبی کریمؐ کی خدمت میں مشرکینِ مکہ کی طرف سے پہنچنے والی ایذاؤں کے بارے میں شکایت کی۔ رسول اللہ ﷺ اس وقت خانہ کعبہ کے سائے میں تشریف فرما تھے۔ صحابہ کرام نے گزارش کی کہ اے اللہ

کے رسول! کیا آپ ہمارے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا نہیں کریں گے اور کیا آپ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ سے مدد نہیں مانگیں گے؟"

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا "تم سے پہلے ایسے لوگ بھی گزرے ہیں کہ ان میں سے ایک شخص کے سر پر آری رکھ کر اسے چیرا جاتا تھا یہاں تک کہ آری اس کے قدموں تک پہنچ جاتی تھی، لیکن یہ سختی بھی انہیں ان کے دین سے دور نہیں کرتی تھی۔ اسی طرح ایک شخص کو لوہے کی کنگھیوں سے چیرا جاتا تھا یہاں تک کہ اس کا گوشت اور ہڈیاں الگ الگ ہو جاتی تھیں لیکن یہ بات بھی انہیں ان کے دین سے باز نہیں رکھتی تھی اور اس کے بعد ارشاد فرمایا "خدا کی قسم یہ دین قائم ہو کر رہے گا، یہاں تک کہ ایک سوار تنہا صنعا سے حضرموت تک سفر کرے گا اور اسے اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا۔"

میں اس کتاب میں نومسلموں کے حالات پڑھ کر بے حد متاثر ہوا ہوں، خصوصاً جس استقامت اور عزیمت سے انہوں نے راہِ حق میں پہنچنے والی ایذاؤں کو برداشت کیا۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ ان مصائب و آلام سے ان کا جذبہ ایمان و یقین مزید پختہ اور گہرا ہوا اور وہ دین پر مزید استقامت کے ساتھ جم گئے۔ اس کتاب کے مطالعے سے بھی ایمان میں تازگی اور دل میں سرور پیدا ہوتا ہے اور قاری اپنے عقیدہ و ایمان میں مزید پختگی محسوس کرتا ہے۔

میں کتاب کے فاضل مؤلف کو مشورہ دوں گا کہ وہ نومسلم حضرات کے حالات و واقعات کے بارے میں تصنیف و تالیف کا یہ سلسلہ جاری رکھیں اور اس مقصد کے لیے دوسرے ماخذ و منابع سے بھی استفادہ کریں۔ انشاء اللہ ان کی یہ کوشش دعوتِ اسلامی کے فروغ میں مفید ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی
استاد کلیۃ الشریعہ مدینہ یونیورسٹی
مدینہ منورہ۔

عرضِ مؤلف ...... چودھویں اشاعت

اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذاتِ گرامی کا شکر کس زبان سے ادا کروں کہ اس کتاب کا چودھواں ایڈیشن شائع ہو رہا ہے' جو اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ کتاب قارئین کے وسیع حلقے میں پسند کی گئی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے کہ جس شخص نے اس کتاب کو ایک نظر دیکھا' وہ اسے پڑھے بغیر نہ رہ سکا۔ دراصل یہ اس موضوع کا اعجاز ہے کہ اس میں بیک وقت کئی خصوصیات یکجا ہو گئی ہیں یعنی کہانی کا عنصر شروع سے آخر تک غالب رہتا ہے جس کی وجہ سے قاری پر تجسس اور دلچسپی کی خاص کیفیت طاری رہتی ہے' اسے متعلقہ فرد کی عزیمت اور استقامت متاثر بھی کرتی ہے اور ایمان کی افزونی کا باعث بھی بنتی ہے۔ اسلام کی حقانیت کے بارے میں اسے ٹھوس شواہد ملتے ہیں اور دیگر مذاہب کے کھوکھلے پن سے بھی آگاہ ہو جاتا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ موضوع کی روانی میں وہ بعض اوقات ثقیل باتیں بھی دلچسپی اور توجہ سے پڑھتا چلا جاتا ہے۔

مَیں اعتراف کرتا ہوں کہ اس سب کچھ میں میرا کوئی کمال نہیں۔ یہ محض اللہ رب العزت کا کرم ہے کہ اس نے مجھے تبلیغی اور دینی اعتبار سے ایک بے حد اہم اور مفید موضوع سجھایا اور اس سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق بخشی اور اسی کے فضل سے میں کم و بیش ۷۵ نو مسلموں کے قبولِ اسلام کی سرگزشتیں محفوظ کرنے میں کامیاب ہوا ہوں اور عہدِ حاضر کا شاید ہی کوئی نامور نو مسلم ہے جس کا ذکر اس کتاب میں موجود نہ ہو۔ انشاء اللہ اس کے بعد اس کتاب میں کوئی اضافہ نہیں کیا جائے گا اور ضرورت ہوئی تو کتاب کی دوسری جلد مرتب کی جائے گی۔ (بحمد اللہ تعالیٰ ۸۱ نومسلم خواتین کے حالات پر مبنی "ہمیں خدا کیسے ملا" بھی شائع ہو گئی ہے اور اس کا چوتھا ایڈیشن حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے۔)

مَیں نے اس کتاب کے بیشتر مضامین کا انگریزی سے ترجمہ کیا ہے لیکن چند مضامین اردو رسائل و اخبارات سے بھی اخذ کیے گئے ہیں' جن کا باقاعدہ حوالہ دیا گیا ہے۔ میں ان

تمام رسائل و جرائد اور مضمون نگار حضرات کا شکر گزار ہوں۔ میں اپنے ان احباب کا تہہ دل سے ممنون ہوں جنہوں نے مجھے مختلف نومسلموں کے بارے میں مضامین اور کتابیں مہیا فرمائیں اور مفید مشورے دیئے۔ ان حضرات میں ڈاکٹر سفیر اختر صاحب (اسلامی یونیورسٹی' اسلام آباد) ڈاکٹر صابر کلوروی صاحب (پشاور یونیورسٹی) جناب ریاست علی چودھری (اقبال میموریل لائبریری' سیالکوٹ) پروفیسر افضل حق قرشی صاحب ' ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی (پنجاب یونیورسٹی) پروفیسر عبدالجبار شاکر صاحب' پروفیسر عبدالجلیل ساجد صاحب (مقیم انگلینڈ) ڈاکٹر رحیم بخش شاہین صاحب (اسلام آباد) پروفیسر سید وقار علی کاری صاحب (پنجاب یونیورسٹی) میرے دلی شکریے کے مستحق ہیں۔ خصوصاً ڈاکٹر سفیر اختر صاحب اور عبدالجلیل ساجد صاحب کے خلوص اور تعاون کا شکریہ چند لفظوں میں ادا نہیں ہو سکتا۔ میں جناب ارشد میر مرحوم' جناب تنویر قیصر شاہد اور برادر عزیز عباس اختر اعوان صاحب کا بھی منت پذیر ہوں جنہوں نے مختلف نومسلموں پر مضامین لکھ کر مجھے عطا کیے اور خصوصاً ملک احمد سرور صاحب (مدیر بیدار ڈائجسٹ) کا جن کے متعدد مضامین میں نے اس کتاب میں شامل کیے ہیں۔ میں نامور عالم دین' مفسر و فقیہہ مولانا محمد متین ہاشمی مرحوم' پروفیسر حافظ نذر احمد صاحب اور ممتاز مؤرخ جناب طالب ہاشمی صاحب کا بھی ممنون احسان ہوں' جنہوں نے کتاب کو بے حد پسند کیا اور کمال شفقت اور محبت سے از خود ہی اس پر تبصرے بھی رقم فرمائے۔ میں صاحب طرز ادیب اور ناول نگار جناب ممتاز مفتی کا بھی شکریہ ادا کروں گا جنہوں نے اس کتاب کو غیر معمولی اہم گردانا' اپنی اہم کتاب "تلاش" میں بار بار اس کا ذکر کیا اور ایک تبصرہ بھی لکھ کر مجھے بھجوایا۔ آخر میں میں نامور نومسلم اور مدینہ یونیورسٹی کے فاضل استاذ ڈاکٹر پروفیسر ضیاء الرحمٰن اعظمی صاحب کا ممنون و مشکور ہوں جنہوں نے کتاب کو پسندیدگی کی نظر دیکھا اور اس پر دیباچہ رقم فرمایا۔

یہ کتاب نئی کمپوزنگ اور نئے اہتمام کے ساتھ "کتاب سرائے" کے جمال الدین افغانی صاحب شائع کر رہے ہیں۔ میں ان کے اخلاص اور محبت اور تعاون کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

قارئین سے ضروری گزارش ...... اگر آپ عمل کے حوالے سے اس کتاب کو مفید پائیں تو مؤلف' ناشر اور ان کے والدین کو اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں۔ (مؤلف)

ہم کیوں مسلمان ہوئے

ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

ڈاکٹر آر۔ایل۔میلما (ہالینڈ)

(Prof.Dr.R.L.Mellema)

ماہر علم الانسان، مصنف اور محقق کی حیثیت سے ڈاکٹر آر۔ایل۔میلما یورپ کے علمی حلقوں میں خاص عزت اور شہرت کے مالک تھے۔وہ ایمسٹرڈیم کے استوائی عجائب گھر میں اسلامی شعبے کے صدر اور نگران تھے۔انہوں نے متعدد کتابیں لکھی تھیں جن میں سے ایک پاکستان کے بارے میں ہے۔

مجھے اسلام میں کیا حُسن نظر آیا، وہ کونسی جاذبیت تھی جو مجھے اس عقیدے کی طرف کھینچ لائی؟ یہ ہیں وہ دو سوال جن کے جواب مجھے دینے ہیں۔تو عرض ہے کہ میں نے ۱۹۱۹ء میں لیڈن یونیورسٹی سے مشرقی زبانوں کی تعلیم شروع کی اور مشہور مستشرق اور عربی علوم کے ماہر پروفیسر سناؤک ہرگرونج کے لیکچروں میں باقاعدگی سے شرکت کرنے لگا۔میں نے عربی میں اس قدر استعداد حاصل کر لی کہ البیضاوی کی تفسیر قرآن اور غزالی کی ایک کتاب کا ترجمہ کر ڈالا۔

جیسا کہ اس زمانے کی روایت تھی میں نے تاریخ اسلام اور اسلامی اداروں کے بارے میں ساری معلومات ان کتابوں سے حاصل کیں جو یورپین زبانوں میں شائع ہوئی تھیں۔۱۹۲۱ء میں میں مصر گیا اور وہاں ایک ماہ تک قیام کیا۔اس دوران میں، میں نے الازہر کا خوب مطالعہ و مشاہدہ کیا۔چونکہ میں نے عربی کے علاوہ سنسکرت، ملائی اور جاوی زبانوں پر عبور حاصل کر لیا تھا اس لئے ۱۹۲۷ء میں ہالینڈ کی نوآبادی جزائر شرق الہند (جو آزادی کے بعد انڈونیشیا کہلایا) چلا گیا اور جکارتہ میں اعلیٰ تعلیم کے ایک خاص ادارے

میں جاوی زبان اور ہندوستانی کلچر کی تاریخ پڑھانے لگا۔ اگلے پندرہ برس تک میں جاوی زبان اور کلچر کے قدیم و جدید شعبوں میں تخصص حاصل کر چکا تھا۔ اس مدت میں اسلام اور عربی سے میرا رابطہ بالکل برائے نام رہ گیا تھا۔

دوسری عالمی جنگ کے دوران میں جب انڈونیشیا پر جاپان کا تسلط قائم ہوا تو میں بھی جنگی قیدی بن گیا۔ رہائی ملی تو ۱۹۴۶ء میں واپس وطن چلا گیا اور ایمسٹرڈیم کے رائل ٹراپیکل انسٹی ٹیوٹ میں تدریسی فرائض انجام دینے لگا۔ یہاں مجھے جاوی زبان میں اسلام پر ایک گائیڈ بک لکھنے کا حکم ملا اور یوں ایک مرتبہ پھر اسلام سے میرا رابطہ قائم ہو گیا۔ یورپ میں اسلام پر جتنی کتابیں چھپی تھیں تقریباً ساری میں نے پڑھ ڈالیں۔

اس ضمن میں مجھے اسلام کے نام پر معرضِ وجود میں آنے والی ریاست پاکستان کے مطالعے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میں نے رختِ سفر باندھا اور ۵۳ء کے اواخر میں لاہور جا پہنچا۔ اب تک اسلام کے بارے میں میری معلومات کا ماخذ یورپین لٹریچر تھا مگر لاہور میں مجھے اسلام کے بارے میں بالکل نئے پہلو سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔ دل و دماغ پر اس کے تاثر کا یہ عالم تھا کہ میں نے اپنے مسلمان دوستوں سے نماز جمعہ میں شرکت کی اجازت طلب کی جسے انہوں نے نہایت خوشدلی کے ساتھ قبول کر لیا۔ یہیں سے میں اسلام کی اعلیٰ و ارفع قدروں سے واقف ہوا اور میری زندگی ایک پاکیزہ انقلاب سے دوچار ہونے لگی۔

میں نے اپنے آپ کو اسی روز سے مسلمان سمجھنا شروع کر دیا تھا جب ایک جمعہ کو مجھے مسجد کے نمازیوں سے خطاب کا موقع دیا گیا اور اس کے بعد ان گنت دوستوں سے مصافحہ کرنا پڑا جو اگرچہ میرے لئے اجنبی تھے مگر ان کے بے پناہ تپاک میں سگے بھائیوں کی محبت جھلکتی تھی۔ اس کے بعد میرے دوست مجھے ایک چھوٹی مسجد میں لے گئے' وہاں ایک ایسے صاحب خطبہ دیتے تھے جو روانی سے انگریزی بول سکتے تھے اور پنجاب یونیورسٹی میں خاصے اہم عہدے پر فائز تھے۔

انہوں نے نمازیوں کو بتایا کہ اس اجتماع میں انگریزی الفاظ زیادہ استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ایک دور دراز کے ملک ''نیدر لینڈز'' سے آیا ہوا ہمارا ایک بھائی اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کر سکے۔ بہر حال خطاب ختم ہوا تو پہلے امام کی اقتدا میں

دو رکعتیں پڑھی گئیں اور بعد میں انفرادی طور پر لوگوں نے چند رکعات ادا کیں۔

مَیں اٹھ کر باہر نکلنے ہی والا تھا کہ خطیب صاحب جنہیں لوگ علامہ صاحب[1] کے لقب سے پکارتے تھے، میری طرف متوجہ ہوئے، انہوں نے بتایا کہ لوگ میری زبان سے کچھ سننا چاہتے ہیں۔ خیر میں اٹھا اور مائیکروفون کے سامنے جا کر اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگا۔ مَیں انگریزی میں بات کر رہا تھا جبکہ علامہ صاحب اس کا اردو میں ترجمہ کرتے جاتے تھے۔ مَیں نے بتایا کہ مَیں ایک ایسے ملک سے آیا ہوں جہاں بہت ہی کم مسلمان رہتے ہیں۔ مَیں ان کی جانب سے اور اپنی طرف سے آپ حضرات کو ہدیہ سلام و تحریک پیش کرتا ہوں کہ آپ اپنی آزاد و خودمختار اسلامی ریاست کے مالک ہیں اور اس ریاست نے گذشتہ سات برسوں میں خاصا استحکام حاصل کر لیا ہے اور خدا نے چاہا تو ایک روشن مستقبل آپ کا منتظر ہے۔ مَیں اپنے وطن واپس جا کر بتاؤں گا کہ پاکستان میں مجھے مہمان نوازی اور محبت و اخلاص کے کس بے پایاں سلوک کا مستحق سمجھا گیا۔

ان الفاظ کا اردو ترجمہ کیا گیا تو عجیب منظر دیکھنے میں آیا۔ سینکڑوں نمازی غیر معمولی اشتیاق اور کمال محبت کے ساتھ میری طرف لپکے۔ ان کے چہرے خلوص اور پیار کے نور سے چمک رہے تھے اور آنکھوں سے اخوت و یگانگت کی ایسی کرنیں پھوٹ رہی تھیں جو دل و دماغ سے آگے میری روح میں اترتی جا رہی تھیں۔ مَیں نے بچشمِ سر مشاہدہ کر لیا کہ اسلام کا رشتۂ اخوت دنیا کا سب سے مضبوط رشتہ ہے۔ سچی بات ہے، اس روز میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

یوں پاکستان کے مسلمانوں نے مجھ پر یہ ثابت کر دیا کہ اسلام محض قوانین کا ایک مجموعہ نہیں ہے بلکہ محبت کا رواں دواں زمزمہ بھی ہے جو پیاسی روحوں کو سیراب کرتا اور ویران دلوں میں سدا بہار پھول کھلاتا ہے۔ یہ اعلیٰ اخلاقی قدروں کا وہ حسین گلدستہ ہے جس سے مسلمان سب سے پہلے نوازا جاتا ہے۔ یوں ایمان و علم کی روشنی نے میرے دل و دماغ کو بھی منور کر دیا اور مَیں نے اسلام قبول کرنے کا باضابطہ اعلان کر دیا۔

---

[1] مراد ہے علامہ علاؤالدین صدیقی مرحوم۔ سابق صدر شعبۂ اسلامیات اور وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی۔

اب میں یہ بتاؤں گا کہ اسلام کی کون سی باتوں نے مجھے متاثر کیا:

۱۔ صرف ایک اعلیٰ و برتر ہستی "اللہ" کا اقرار۔ یہ نظریہ فطرت کے اتنا قریب ہے کہ سوجھ بوجھ رکھنے والا کوئی بھی انسان اسے آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔ اللہ بڑا ہی بے نیاز ہے، سبھی مخلوقات اسی کی محتاج ہیں۔ وہ کسی کی اولاد نہیں مگر ہر چیز کو اسی نے پیدا کیا اور ساری کائنات میں کوئی بھی اس کا ہمسر نہیں ہے۔ وہ حکمت، طاقت اور حُسن کا منبع ہے، وہ بڑا ہی مہربان اور بہت ہی زیادہ رحیم ہے۔

۲۔ اللہ کا اپنی کائنات، مخلوقات اور اشرف المخلوقات انسان سے رابطہ براہ راست قسم کا ہے۔ اس تک پہنچنے کے لئے کسی درمیانی ذریعے کی ضرورت نہیں۔ اسلام میں عیسائیت کی مانند پاپائیت کا کوئی تصور نہیں۔ اس مذہب میں انسان اپنے اعمال و افعال کے لئے آزاد و خود مختار پیدا کیا گیا ہے۔ یہ دنیا اس کے لئے دارالامتحان ہے، جہاں اسے دوسری زندگی کے لئے تیاری کرنا ہے۔ وہ اپنے اچھے بُرے کا خود ذمہ دار ہے اور کسی دوسرے کی قربانی اسے کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

۳۔ "مذہب میں کوئی جبر نہیں"، "صداقت جہاں سے بھی ملے اسے قبول کر لو" اسلام کے ان سنہرے اصولوں میں رواداری اور حق شناسی کا جو جوہر پایا جاتا ہے، اس کی مثال دنیا کے کسی مذہب میں نہیں ملتی۔

۴۔ اسلام انسانوں کو رنگ و نسل اور علاقے سے ماورا ہو کر رشتۂ اخوت میں منسلک کرتا ہے اور صرف یہی وہ مذہب ہے جس نے عملی طور پر اس اصول کو اپنا کر دکھا بھی دیا ہے۔ مسلمان دنیا میں کہیں بھی ہوں، وہ دوسرے مسلمانوں کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں۔ خدا کے سامنے سارے انسان یکساں درجہ رکھتے ہیں اس کا سب سے خوبصورت اور روح پرور مظاہرہ حج کے موقع پر احرام باندھ کر کیا جاتا ہے۔

۵۔ اسلام زندگی میں روح اور مادے دونوں کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے۔ انسان کی ذہنی و روحانی پرورش کا گہرا تعلق اس کی جسمانی ضرورتوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ اسے زندگی میں ایسا انداز اختیار کرنا چاہئے کہ روح اور جسم اپنے اپنے دائروں میں ترقی کر سکیں۔

۶۔ شراب اور دیگر نشہ آور اشیا کو ممنوع قرار دینے کا عمل اپنے اندر وہ عظمت رکھتا ہے جس نے اسلام کو دیگر مذاہب کے مقابلے میں صدیوں آگے لا کھڑا کیا ہے۔

محترمہ آمنہ

قبول اسلام کی یہ روح پرور سرگزشت ماہنامہ "حکایت" لاہور کے شمارہ فروری مارچ ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی تھی اور اسے ستار طاہر مرحوم نے مرتب کیا تھا۔ میں نے پہلے حصے کی تلخیص کی ہے جبکہ واحد متکلم والا دوسرا حصہ من وعن ستار طاہر صاحب کے الفاظ میں ہے۔
(بشکریہ مدیر حکایت اور مترجم)

محترمہ آمنہ پچاس سالہ سیاہ فام امریکی خاتون ہیں جو اپنی سماجی خدمات کی وجہ سے عالمگیر شہرت رکھتی ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں ان کے بارے میں جو کتاب شائع ہوئی اس کے مطابق ساڑھے تین سو افراد نے ان کی ترغیب سے منشیات سے توبہ کی تھی اور اکیس مرد و زن نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

قابل ذکر امر یہ ہے کہ "شکاگو نیوز" سے وابستہ زبردست صلاحیتوں کی حامل یہ صحافی خاتون جسمانی اعتبار سے معذور ہے۔ وہ شکاگو کے سلم (SLUM) نامی حبشیوں کے ایک ایسے محلے میں پیدا ہوئی جو غلاظت، جرائم، منشیات اور غربت و افلاس کا گڑھ تھا۔ اس کا پیدائشی نام سنتھیا (SYNTHIA) تھا اور اس کا باپ بھی اکثر حبشیوں کی طرح آوارہ منش، نشہ باز اور جرائم پیشہ آدمی تھا اور اس کی ماں ہی سفید فاموں کے گھروں میں مزدوری کر کے گھر کا خرچ چلاتی تھی۔ باپ کی غیر ذمہ داری اور سنگ دلی کی وجہ سے وہ بہت بچپن میں پولیو کا شکار ہو گئی مگر وہ غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں کی مالک تھی۔ پانچ سال کی عمر میں اس کی ماں ایک سستی سی پہیوں والی کرسی خرید لائی اور اسے ایک اسکول میں چھوڑ آئی۔ سنتھیا نے جب سے بولنا شروع کیا تھا وہ بار بار کہا کرتی تھی "میں سکول جاؤں گی،

میں اسکول جاؤں گی''۔

سنتھیا بڑی سمجھدار اور ذہین بچی تھی وہ اپنی کرسی کو گھسیٹتی ہوئی اسکول چلی جاتی' گھر آجاتی اور کتابیں پڑھتی رہتی۔ اس کے اساتذہ اس کی ذہانت سے بہت متاثر تھے۔ وہ بڑی صابر اور باہمت بچی تھی۔ وہ کسی احساسِ کمتری میں مبتلا نہ ہوئی۔ دوسرے بچوں کو بھاگتے دوڑتے دیکھ کر وہ اپنی معذوری پر کبھی آنسو بہاتی نہ پریشان ہوتی اور سر جھکائے بڑے اطمینان اور یکسوئی سے مطالعہ کرتی رہتی۔ اس نے اسکول میں اپنی ذہانت کی دھاک بٹھادی تھی۔ اسے ہر سال انعام ملا کرتا تھا۔ وقت گزرتا گیا اور سنتھیا سترہ سال کی ہوگئی۔ اس نے اسکول کی تعلیم مکمل کرلی تھی اور اب یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ چونکہ اس کی اعلیٰ تعلیمی کارکردگی اور ذہانت سے سبھی متاثر تھے اس لئے اسے وظیفہ مل گیا اور وہ پانچ برس تک یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتی رہی۔ اعزاز کے ساتھ اسے مکمل کیا اور ایک مقامی اخبار ''شکاگو نیوز'' میں اسے ملازمت بھی مل گئی۔

یہی وہ زمانہ تھا جب سنتھیا امریکہ کے مشہور سیاہ فام رہنما میلکم ایکس کے کردار سے متعارف ہوئی۔ موصوف مشہور و معروف جرائم پیشہ اور منشیات فروش حبشی تھا۔ وہ بے شمار سنگین وارداتوں میں ملوث تھا اور زندگی کا بڑا حصہ جیلوں میں گزار چکا تھا۔ پھر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ میلکم مسلمان ہوگیا اور نہ صرف اس کی اپنی زندگی میں زبردست انقلاب آگیا اور وہ ایک صالح پاک باز مسلمان بن گیا بلکہ اس کی تبلیغ و ترغیب سے ہزاروں سیاہ فام لوگوں کی زندگیاں بدل گئیں۔ اس نے سینکڑوں ایسے رضا کار تیار کیے جو خاص طور پر حبشیوں کو راہِ راست پر لانے اور نشے سے نجات دلانے کے لئے دن رات کوشاں رہتے تھے۔ یہ ایک نئی تحریک تھی' ایک نیا انقلاب تھا جو آہستہ آہستہ امریکی حبشیوں میں آرہا تھا اور جو انہیں وقار سے زندہ رہنا سکھا رہا تھا۔ سنتھیا' میلکم ایکس کی زندگی کے دونوں پہلوؤں سے واقف تھی' اس لئے اس کے دل و دماغ نے مذہب اسلام سے بھی گہرا اثر قبول کیا تھا اور چونکہ وہ مطالعے کی رسیا تھی اس لئے اس نے اسلام کے بارے میں بہت کچھ پڑھ ڈالا اور اسے اپنے تصورات اور انسانی فطرت کے عین مطابق پایا تو اسے قبول کرلیا اور ایک روز جب کہ حسب معمول اس کا والد شراب کے نشے میں وحشت اس کی ماں کی پٹائی کرنے والا

تھا' اس نے اپنے باپ کو سمجھانا شروع کر دیا اور ماں کو صبر کی تلقین کرنے لگی اور گفتگو کی تیزی میں انہیں بتا دیا کہ وہ اسلام قبول کر چکی ہے جس کے بعد جو کچھ ہوا اسے خود سنتھیا بلکہ آمنہ کی زبانی سنیے۔

میرے والدین کے لئے ''مسلمان'' کا لفظ اجنبی بھی نہ تھا۔ میں نہیں جانتی کہ اسلام اور اسلام کے پیروکاروں کے بارے میں امریکیوں کا رویہ بلا رنگ و نسل کیوں معاندانہ اور مخالفانہ ہے۔ میری زبان سے یہ سننے کے بعد کہ میں مسلمان ہو چکی ہوں میرے والدین کو بے حد تعجب ہوا۔ خاص طور پر میری ماں کو بے پناہ صدمہ ہوا۔ اس کا یہ ردعمل تب بہت پریشان کن تھا۔ میں اسے ایک مظلوم عورت سمجھتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ میرے مسلمان ہونے پر زیادہ واویلا نہ کرے گی۔ مگر ہوا اس کے برعکس' میرے والد کے چہرے پر نفرت' حقارت اور استہزاء کے ساتھ ساتھ بے پروائی کی جھلک بھی دکھائی دے رہی تھی مگر میری ماں مسلسل بولتی جا رہی تھی۔ آج جب وہ منظر مجھے یاد آتا ہے تو میں بے اختیار مسکرا دیتی ہوں لیکن اس وقت میرا ردِعمل کچھ مختلف تھا۔ میں یہ محسوس کرنے لگی تھی کہ میں نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کچھ جلدی میں کر دیا ہے' اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ میرے ایمان میں کوئی کمی تھی' بلکہ یہ کہ میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ جب تک میں مسلمانوں کے پورے طور و اطوار باطنی اور ظاہری طور پر اپنا نہیں لیتی تب تک اسلام لانے کا اعلان نہ کروں گی مگر اس لمحے میں خاصی جذباتی ہو گئی تھی' اپنے مسلمان ہونے کا ذکر بڑے جوش اور جذبے سے کر دیا۔ میرے والد بڑبڑاتے ہوئے باہر چلے گئے۔ میری والدہ مجھے سمجھانے لگیں۔

''ممی!'' میں نے کہا۔ ''جو ہونا تھا ہو چکا ہے' میں جو قدم آگے بڑھا چکی ہوں وہ پیچھے نہیں ہٹا سکتی'' میری ماں نے اور زیادہ شدت سے مجھے سمجھانا بجھانا شروع کر دیا' میں نے ان سے کہا کہ وہ اپنا وقت بلاوجہ ضائع کر رہی ہیں' میں مسلمان ہو چکی ہوں اور اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میری والدہ نے سوچا شاید میں ضد کر رہی ہوں یا جذباتی ہو گئی ہوں' انہوں نے اپنا طویل لیکچر ادھورا چھوڑا اور بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

میں مسلمان کیوں ہوئی؟

یہ بات مجھ سے کئی لوگوں نے پوچھی ہے اور میں کئی بار جواب دے چکی ہوں' اس کے باوجود میں سمجھتی ہوں کہ مجھے اس سوال کا جواب بڑے سکون اور اطمینان سے دینا چاہئے۔ میرے گھریلو حالات' امریکا میں حبشیوں کی مجموعی حالت سے زیادہ میری معذوری اور اپاہج پن نے مجھے اسلام کی طرف راغب کیا' اس کی تفصیل بھی سن لیں۔ ایک اخبار میں کام کرنے کی وجہ سے میں ہر روز میلکم ایکس اور مسلمان ہونے والے حبشیوں کی اصلاحی تحریک کے بارے میں پڑھتی تھی۔ چونکہ پولیو کی وجہ سے میں معذور اور اپاہج ہو چکی تھی اور سوائے مطالعہ کے میرا اور کوئی شغل نہ تھا' اس لئے مجھ میں غور وفکر کی عادت بہت بڑھ گئی تھی۔ جب میں پڑھتی کہ میلکم ایکس اور اس کے رضا کار ساتھی لوگوں سے منشیات کی عادت چھڑانے میں کامیاب ہو رہے ہیں تو مجھے بڑی حیرت ہوتی۔ میں سمجھتی یہ صرف ایک خبر ہے جس میں صداقت نہیں ہے۔ لیکن پھر میں سوچتی کہ یہ خبر کس طرح جھوٹی ہو سکتی ہے؟ اور کس حد تک جھوٹی ہو سکتی ہے؟

میرے پاس میرے اپنے اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا مگر اس زمانے میں میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ مجھے اسلام کے بارے میں زیادہ سے زیادہ پڑھنا چاہیے۔ میں نے کچھ کتابیں حاصل کیں اور پڑھنے لگی۔ ان کتابوں نے مجھے خاصا متاثر کیا۔ جب میں نے یہ پڑھ ڈالیں تو میرے دل میں قرآن پڑھنے کا خیال پیدا ہوا اور میں نے انگریزی میں ترجمۂ قرآن کا ایک نسخہ حاصل کر لیا۔ قرآن پاک کے اس ترجمے نے مجھے عجیب طرح کا روحانی سرور بخشا جسے میں بیان نہیں کر سکتی۔ میں سمجھتی ہوں کہ اگر کوئی بھی شخص دلچسپی' انہماک اور لگن سے قرآن پاک کا مطالعہ کرے تو وہ اس مقدس کتاب کی حقانیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

قرآن پاک کے مطالعے نے مجھے کئی دن بے چین رکھا' میرے دل میں ایک عجیب طرح کا جذباتی مد وجزر پیدا ہو گیا تھا۔ جی چاہتا کہ اب میلکم ایکس سے ملوں مگر وہ اس شہر سے بہت دور تھے۔ میں نے اخبار کے ذریعے یہ پتہ چلایا کہ یہاں ہمارے شہر میں کون

سا ایسا شخص ہے جو مسلمانوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس کا پتہ مجھے جلد ہی مل گیا۔ میں نے اس شخص 'محمد یوسف' کو فون کیا اور اس سے ملاقات کے لئے وقت مانگا۔ دوسری طرف سے مجھے بڑی ہمدرد اور نرم آواز سنائی دی۔ محمد یوسف نے مجھے کہا کہ میں جس وقت چاہوں اسے مل سکتی ہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں کل بعد دوپہر ان سے ملوں گی۔ وقت طے ہو جانے کے بعد میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

جب میں اگلے دن محمد یوسف سے ملنے گئی تو وہ مجھے دیکھ کر کچھ پریشان ہو گئے۔ میں نے ان کی پریشانی کے سبب کو بھانپ لیا۔ وہ کسی صحت مند اور توانا لڑکی سے ملنے کی توقع رکھتے تھے۔ جب انہیں وہیل چیئر میں بیٹھی' حرکت سے معذور مجھ جیسی لڑکی دکھائی دی تو وہ کچھ پریشان سے ہو گئے' مگر میری مسکراہٹ اور خوشدلی نے ان کی پریشانی کو جلد ہی ختم کر دیا۔

محمد یوسف میری ہی طرح حبشی تھے...... کبھی ان کا نام جانی بلیکڈن تھا اب وہ محمد یوسف کے خوبصورت نام کے مالک تھے۔ وہ اس شہر کے مسلمانوں کے سربراہ یا امام تھے۔ وہی مسجد میں نماز پڑھاتے تھے اور وہی قرآنی تعلیمات کا درس دیتے تھے۔ وہ ہمدردی بھرے لہجے میں مجھ سے میرے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ باتوں باتوں میں بڑے غیر محسوس انداز میں انہوں نے مجھ سے میرے اور میرے کنبے کے بارے میں سب معلومات حاصل کر لیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ وہ مسلمان کیوں ہوئے تھے؟

محمد یوسف مسکرا دیئے پھر انہوں نے دھیمے سے بڑے میٹھے لہجے میں جواب دیا...... ''میں اس لئے مسلمان ہوا کہ خدا تعالیٰ کی یہ مرضی تھی کہ وہ مجھے سیدھا راستہ دکھائے''۔ ان کا وہ جواب میں آج تک نہیں بھولی ہوں اور زندگی بھر نہیں بھول سکوں گی کیونکہ میں بھی یہی سمجھتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ جس انسان کو سیدھے راستے پر لانا چاہتا ہے اس کے دل میں اسلام کے لئے محبت پیدا کر دیتا ہے۔

محمد یوسف نے مجھے بتایا کہ وہ بھی حبشیوں کے غریب اور نادار علاقے میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے بچپن غربت اور افلاس میں گزارا۔ بڑے ہوئے تو وہ ایک ایسے ہوٹل میں ملازم ہو گئے جہاں انہیں برتن مانجھنے کے لئے رکھا گیا تھا مگر ان سے ایک

اور ضروری کام اور بھی لیا جاتا تھا۔ انہیں کچھ پیکٹ دے دیئے جاتے کہ وہ انہیں کسی جگہ پہنچا آئیں اس کام کے عوض انعام میں انہیں ایک آدھ ڈالر مل جایا کرتا تھا۔ ایک دن ان کے جی میں آئی کہ اس پیکٹ کو کھول کر دیکھنا چاہئے۔ جب انہوں نے کھول کر دیکھا تو اس میں سے انہیں حشیش ملی۔ انہوں نے یہ حشیش مہنگے داموں بیچ دی اور ہوٹل واپس نہ گئے' مگر ہوٹل کی انتظامیہ نے انہیں ڈھونڈ نکالا' پیکٹ مانگا اور جب پیکٹ نہ ملا تو ان کی خوب پٹائی کی۔ وہ کئی دنوں تک بستر سے نہ اُٹھ سکے۔ اس واقعہ کے بعد وہ گناہوں کی دنیا میں پہنچ گئے۔ تیس برس کی عمر تک انہوں نے ہر بُرا کام کیا۔ وہ عورتوں کی دلالی کرتے' قحبہ خانوں کی نگرانی کا فرض انجام دیتے' ہیروئن اور دوسری منشیات کا خفیہ دھندا کرتے کرتے خود بھی ان منشیات کے عادی ہو گئے۔ انہیں کئی بار سزا ہو چکی تھی مگر وہ سزا کے خوف سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ ایک بار جب وہ جیل میں تھے تو کچھ لوگ ان سے ملنے آئے۔ یہ رضا کار مسلمان تھے جو قیدیوں میں اسلام کی تبلیغ کر رہے تھے۔ ان کی تبلیغ سے محمد یوسف بے حد متاثر ہوئے اور ان کا جی چاہنے لگا کہ وہ باعزت اور بے فکر زندگی بسر کریں۔ جب وہ جیل سے رہا ہوئے تو خاصے بدل چکے تھے۔ مگر انہیں زندہ رہنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا تھا وہ کچھ بھی نہیں جانتے تھے اس لیے انہوں نے یہی سوچا کہ اب پھر انہیں جرائم کی زندگی بسر کر کے ہی اپنا پیٹ پالنا پڑے گا۔ وہی رضا کار جنہوں نے جیل میں ان کے خیالات کو تبدیل کرنے کی کوشش کی تھی وہ اُن سے ملے ان کے لئے روزگار کا بندوبست کیا' کچھ نقد رقم دی تاکہ جب تک انہیں تنخواہ نہیں ملتی وہ اس رقم سے گزر اوقات کریں۔ وہ انہیں اپنے ساتھ رکھتے۔ یوں محمد یوسف جو کبھی جانی ہیلکڈن تھے' مسلمان ہو گئے۔

اسلام کے ساتھ ان کی شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ ایک برس میں انہوں نے کلام مجید عربی میں پڑھ لیا۔ اس راہ میں انہیں بہت سی دقتیں اور پریشانیاں پیش آئیں' مگر وہ کسی پریشانی سے نہ گھبرائے۔ قرآن مجید کی تعلیم کے بعد وہ اسلامی قواعد اور طرز زندگی کو اپنانے میں کامیاب ہو گئے۔ چار سال کے بعد انہیں اس علاقے میں مسلمانوں کا امام مقرر کر دیا گیا۔ امام بننے کے بعد انہوں نے اپنی تگ و دو سے زمین کے لئے چندہ جمع کیا اور وہاں ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کرا دی۔ اس مسجد کی تعمیر میں خود انہوں نے اور دوسرے مسلمانوں نے

حصہ لیا تھا۔ وہ خود مزدوری کرتے اور اس کا معاوضہ نہ لیتے تھے۔

میں محمد یوسف کی زندگی اور ان کی باتوں سے بے حد متاثر ہوئی اور ان سے کہا کہ میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں۔ محمد یوسف صاحب نے پہلی بار مجھے بھرپور نظروں سے دیکھا اور بولے...... "خدا مبارک کرے، مگر مسلمان ہونا بہت مشکل ہے"۔

"میں ہر مشکل پر قابو پالوں گی"

"الحمدللہ"...... انہوں نے کہا"...... کیا تمہیں کلمہ اور نماز آتی ہے؟"۔

میں نے نفی میں سر ہلایا تو انہوں نے مجھے ایک چھوٹی سی کتاب دی اس میں رومن حروف میں کلمہ اور نماز لکھی ہوئی تھی۔ کہنے لگے: "اسے یاد کرلو اور اگر ہو سکے تو سہ پہر کو تھوڑی دیر کے لئے آجایا کرو"۔ میں نے چند دنوں میں نہ صرف کلمہ اور نماز ازبر کرلی بلکہ ان کے معنی بھی سمجھ لیے۔ اس دوران میں محمد یوسف سے بھی ملتی رہی اور ان سے دین اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرتی رہی۔

جمعہ کا دن تھا' مسجد میں تمام مسلمانوں کے سامنے میں نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گئی۔ میرا نام آمنہ رکھ دیا گیا۔ مسلمان ہونے کے بعد میں نے پہلا کام یہ کیا کہ کھانے کے ساتھ تھوڑی بہت شراب پینے کی جو عادت تھی اسے ترک کر دیا۔ میں سگریٹ بھی پی لیا کرتی تھی یہ بھی چھوڑ دیے اور مسلمان عورتوں جیسا لباس سلنے کے لیے دے دیا۔ میں سمجھتی تھی کہ جب میں مسلمان عورتوں کی طرح لمبے چغے میں اپنا جسم چھپاؤں گی اور سر کو بھی ڈھانپوں گی تو وہیل چیئر میں بیٹھی ہوئی خاصی مضحکہ خیز دکھائی دوں گی۔ میں نے ہر طنز اور مذاق کا سامنا کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ جب میں پہلی بار مسلمان عورتوں کا لباس پہن کر گھر سے نکلنے لگی تو میری ماں نے مجھے حیرت سے دیکھا۔

"سنتھیا یہ کیا پہن رکھا ہے تم نے؟"

اس کے چہرے پر طنز تھا۔ میرے والد نے بھی جو رات بھر شراب پینے کے بعد اب کرسی پر بیٹھے اونگھ رہے تھے اپنی سرخ آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور قہقہہ لگایا۔

"ممی یاد رکھیے میرا نام آمنہ ہے سنتھیا نہیں"

آ...... آمنہ...... کیا نام ہوا یہ بھلا" ماں نے کہا...... "لڑکی تیرا دماغ تو نہیں چل گیا؟"۔

میں نے اپنی والدہ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ میں انہیں بتا چکی ہوں کہ میں مسلمان ہو چکی ہوں اور اب میں مسلمانوں کی طرح باقاعدہ زندگی کا آغاز کر رہی ہوں۔ "تمہاری جگہ جہنم میں ہے" اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا "ممی آپ کو میرے معاملات میں دخل دینے کی ضرورت نہیں اگر کوئی بات کرنی ہے تو جب میں دفتر سے آؤں گی تو کر لینا اس وقت مجھے دیر ہو رہی ہے"۔ میں وہیل چیئر کو دھکیلتی ہوئی باہر نکل گئی۔ حبشیوں کی اس گندی بستی میں جس کسی نے مجھے اس لباس میں دیکھا وہ پہلے تو حیران ہوا پھر مذاق اڑانے لگا، مگر میں نے کسی کی ایک نہ سنی اور اپنی راہ چلتی رہی۔ جب میں اپنے اخبار کے دفتر پہنچی تو وہاں بھی شدید ردِ عمل پیدا ہوا۔ بہت سے لوگ میرے ارد گرد جمع ہو گئے۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ میں مسلمان ہو گئی ہوں اور مسلمان عورتیں ایسا ہی لباس پہنتی ہیں تو بعض لوگوں نے خاموشی اختیار کر لی اور بعض بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔ اتفاق سے اس روز تنخواہ کا دن تھا۔ تنخواہ ملی تو میں نے اس کا ایک چوتھائی حصہ اپنے علاقے کی مسجد کے فنڈ میں جمع کرا دیا۔ جب میں گھر لوٹی تو میری والدہ میرا انتظار کر رہی تھی۔ میرے والد بھی گھر پر موجود تھے...... میں تنخواہ کا نصف حصہ اپنی والدہ کو دے دیا کرتی تھی۔ اس رقم سے میرے والد اپنے نشے کے لئے کچھ پیسے اینٹھ لیا کرتے تھے۔ میں نے جب اپنی تنخواہ کی کچھ رقم اپنی ماں کو دی تو اس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور پوچھا...... "تم نے اس بار دس ڈالر کم دیئے ہیں"۔

"ہاں اب ہر ماہ آپ کو اتنی رقم ہی ملے گی۔ میں نے اپنی تنخواہ کا ایک چوتھائی مسجد کو دینے کا فیصلہ کر لیا ہے"۔ میری یہ بات سنتے ہی وہ مجھے، مسلمانوں اور مسجد کو کوسنے لگی۔ میں نے کوئی جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں بہت دیر تک اپنی والدہ کو بکتے جھکتے سنتی رہی۔ بیچ بیچ میں میرے والد کی آواز بھی سنائی دیتی تھی "...... اب سمجھیا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ مسلمانوں نے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ ہم نے تو کبھی کرسچے کو چندہ نہیں دیا' یہ تنخواہ کا ایک چوتھائی مسجد کو دینے لگی ہے"۔ میرے والد اور والدہ کے نزدیک مسلمان لٹیروں سے کم نہ تھے جو ان کی بیٹی کی کمائی لوٹ کرنے گئے تھے۔ آہستہ آہستہ میں نے اپنی زندگی اسلام کے قوانین و ضوابط کے مطابق ڈھال لی۔ وہ لوگ

جو پہلے مجھ پر انگلیاں اٹھاتے تھے مجھ سے بے پروا ہو گئے۔ میرے اور اسلام کے خلاف زہر اگلنے والی زبانیں بھی خاموش ہو گئیں۔

اور پھر کرسمس کا تہوار آ گیا۔ ہم خواہ کتنے ہی غریب اور بدحال کیوں نہ ہوں کرسمس کو ٹھاٹھ باٹھ سے منانے کا اہتمام ضرور کرتے ہیں۔ کرسمس کے روز شراب پانی کی طرح بہائی جاتی ہے۔ اب میں نے مہمانوں کے ساتھ شراب کے جام کو چھونے سے ہی انکار کر دیا تو ہمارے گھر میں قیامت برپا ہو گئی۔ والد تو صبح سے نشے میں دھت تھے' والدہ بھی دو ایک بار مہمانوں کے ساتھ پی چکی تھی۔ نشے کی حالت میں وہ مجھ پر برسنے لگے۔ مہمان بھی نشے میں تھے وہ بھی جو ان کے منہ میں آیا بکنے لگے۔

ان سب کی حالت قابل رحم تھی۔ میں نے سوچا کہ مجھے اس کمرے سے چلے جانا چاہئے مگر جب میں اپنی وہیل چیئر کو دھکیل کر جا رہی تھی تو ایک مہمان لڑکا اور میرے والد میرے پیچھے لپکے اور وہیل چیئر کے سامنے کھڑے ہو گئے...... "راستہ چھوڑ دیں" ...... میں نے کہا...... "مجھے جانے دیں"۔

"یہ پی لو پھر چلی جانا"۔ لڑکے نے میرے راستے سے ہٹے بغیر شراب کا جام میرے آگے کیا۔

"میں لعنت بھیجتی ہوں اس پر"۔

میرے منہ پر ایک زوردار طمانچہ لگا جو میرے والد نے مارا تھا۔ میرا سر چکرا گیا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے مگر میرے والد اور اس لڑکے میں تو جیسے شیطان کی روح حلول کر گئی تھی۔ وہ مجھے پیٹنے لگے۔ انہوں نے مجھے روئی کی طرح دھنک دیا۔ میں خاموشی سے یہ ظلم برداشت کرتی رہی۔ وہ گالیاں بک رہے تھے۔ نشے میں ان کے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ جب وہ تھک کر بیٹھ گئے تو میں کسی نہ کسی طرح اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ اس رات میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

میرا پہلا ردعمل یہ تھا کہ مجھے امام مسجد محمد یوسف کو ساری بپتا سنانی چاہئے اور پھر یہ گھر چھوڑ دینا چاہئے۔ لیکن جوں جوں میرا غصہ اور جوش ٹھنڈا ہوتا گیا میری سوچ بدلتی گئی۔ میں نے سوچا کہ مجھے اپنی پریشانیاں لے کر محمد یوسف کے پاس نہیں جانا چاہئے' ان کا حل خود تلاش کرنا چاہئے اور اپنے والدین کے ساتھ ہی رہنا چاہئے۔ ان کا مجھ پر حق ہے اور میرا

بھی یہ فرض بنتا ہے کہ میں ان کی زندگی بدلنے کی کوشش کروں۔ چنانچہ اس روز میں نے ایک اہم فیصلہ کیا اور اگلے روز میں نے اپنے اس فیصلے سے امام مسجد محمد یوسف کو مطلع کر دیا۔

میں نے اخبار کی ملازمت چھوڑ دی اور رضا کار بن گئی۔ مجھے معمولی سا گزارہ الاؤنس ملنے لگا۔ جب میرے والدین کو میرے اس فیصلے کا علم ہوا تو بہت سٹپٹائے۔ وہ یہ سوچ ہی نہ سکتے تھے کہ میں اچھی بھلی ملازمت چھوڑ دوں گی۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ فکر نہ کریں، ان کو ان کا حصہ ملتا رہے گا۔ میں اخباروں کے لئے لکھوں گی اور جو معاوضہ مجھے وہاں سے ملے گا وہ میں ان کو دے دیا کروں گی۔ میری اس عملی زندگی کا آغاز اس وقت ہوا جب میں مسلمان رضا کار بن گئی۔

محمد یوسف نے مجھے بہت سی ہدایات دیں اور جس کام کے لئے مجھے چنا گیا تھا اس راہ کے خطرات سے آگاہ کیا۔ مجھے خود بھی اندازہ تھا کہ یہ راستہ پُر خطر ہے مگر اسلام نے مجھے حوصلہ بخشا جس کی وجہ سے میں کسی خطرے کو خاطر میں نہ لا رہی تھی۔ میں جیلوں میں جانے لگی وہاں میں قیدیوں سے ملتی ان کے سامنے اسلام کی عظمت بیان کرتی۔ انھیں ان کی زندگی کے گھناؤنے پہلو دکھا کر ان کو بہتر زندگی بسر کرنے کا مشورہ دیتی۔ کچھ قیدی وقت کاٹنے کے لیے میری باتوں کو توجہ سے سنتے، کچھ میرا مذاق اڑاتے۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے میری جسمانی معذوری پر بھی قہقہے لگائے مگر میں مطلق ہراساں نہ ہوئی نہ میری ہمت نے جواب دیا۔

ان قیدیوں میں سے ایک حبشی قیدی ارنٹو بھی تھا۔ اس نے میری باتوں سے خاصا اثر قبول کیا اور ایک دن کہنے لگا...... "تم بڑی باہمت لڑکی ہو۔ اگر تم واقعی یہ چاہتی ہو کہ برائی کا خاتمہ ہو جائے تو برنارڈو کا خاتمہ کر دو"۔

"برنارڈو کون ہے؟"...... میں نے پوچھا۔

برنارڈو اس شہر میں ایک بڑی مافیا فیملی کا سربراہ ہے۔ وہی شخص ہے جو اس شہر میں منشیات کا اجارہ دار ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو لوگوں کو منشیات ملیں اور نہ وہ ان کے عادی ہوں۔ وہ بڑا خطرناک آدمی ہے...... آج میں جس حالت کو پہنچا ہوا اس کا ذمہ دار بھی برنارڈو ہے"۔

"میں برنارڈو سے کیسے مل سکتی ہوں"؟

اس نے میرے کان میں مجھے برنارڈو کا پتہ بتا دیا۔ جب میں جانے لگی تو ارنٹو کا لہجہ یکسر بدل گیا تھا۔ وہ ندامت کے ساتھ کہنے لگا...... ''مجھ سے غلطی ہوئی کہ میں نے تم سے برنارڈو کا ذکر کیا۔ تم اس سارے واقعے کو بھول جاؤ۔ تم اندازہ نہیں کر سکتی ہو کہ برنارڈو کتنا خطرناک آدمی ہے؟''۔

''مگر میں اس سے ملنے کا فیصلہ کر چکی ہوں''...... میں نے عزم سے کہا۔

''تم اس سے مل کر کیا کرو گی؟'' اس نے پوچھا۔

''اس کو سیدھا راستہ دکھانے کی کوشش کروں گی......''

وہ ہنسنے لگا۔ اس کے قہقہے دور تک میرا پیچھا کرتے رہے۔

صبح کا وقت تھا جب میں وقت طے کئے بغیر برنارڈو کے عالیشان گھر کے اندر داخل ہوئی۔ اس گھر کو دیکھ کو کوئی بھی شخص اندازہ نہ کر سکتا تھا کہ اس گھر میں رہنے والا شخص بہت بڑا مجرم ہے۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' ایک ملازم نے مجھے روک کر پوچھا۔ وہ میرے لباس اور میری وہیل چیئر کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

''مجھے مسٹر برنارڈو سے ملنا ہے'' میں نے کہا۔

''تمہیں......'' اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ''مسٹر برنارڈو سے ملنا اتنا آسان نہیں''۔

''آخر کیوں''؟ میں نے کہا...... ''وہ بھی انسان ہے اور انسان انسانوں سے ملا جلا کرتے ہیں''۔

ہم دونوں میں تو تکرار ہونے لگی۔ اسی وقت ایک ادھیڑ عمر کا مضبوط جثے والا آدمی ایک کمرے سے باہر نکلا اور غصے سے بولا...... ''یہ کیا ہو رہا ہے؟ شور کیوں مچا رکھا ہے؟'' ملازم نے اس شخص کے سامنے سر جھکا کر کہا...... ''یہ لڑکی آپ سے ملنے پر اصرار کر رہی تھی''۔

''مجھ سے'' اس نے پوچھا ''کیا کام ہے؟''

میں آپ سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتی ہوں'' میں نے کہا۔ برنارڈو نے کچھ تعجب سے میری طرف دیکھا پھر ملازم کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔ جب ملازم چلا گیا تو

برنارڈو نے بڑی نخوت سے کہا..... ''میں اس طرح کسی سے ملاقات نہیں کرتا۔ تم معذور ہو اس لیے رک گیا ہوں۔ کہو میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟''

میں نے اس کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا..... ''مسٹر برنارڈو! کیا واقعی آپ اس معذور لڑکی کے کسی کام آنا چاہتے ہیں''؟

اس نے جواب دینے سے پہلے کچھ سوچا پھر مسکرا کر کہا..... ''ہاں کہو میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں''؟

میں نے پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ میں نے محسوس کیا کہ مسٹر برنارڈو کچھ بے چینی محسوس کر رہا ہے۔ وہ میری نظروں سے نظریں چرا رہا تھا۔

''مسٹر برنارڈو'' ..... میں نے کہا..... ''اللہ نے آپ کو سب کچھ دیا ہے اب آپ کو ہدایت کی ضرورت ہے' سچی ہدایت کی۔''

''لڑکی! ..... میں نہیں جانتا تم کون ہو۔ میرا وقت بہت قیمتی ہے۔ دو منٹ میں اپنی بات ختم کرو''۔

میں نے جب بات شروع کی تو برنارڈو کا چہرہ طیش اور غصے سے سرخ ہو گیا' اس نے غصے کو دبا کر کہا..... ''تم پاگل ہو' نکل جاؤ یہاں سے' تمہیں کس نے بتایا ہے کہ میں یہ کام کرتا ہوں؟۔ میں تمہیں اور تم کو یہ بتانے والے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا''۔

میں نے بڑے اطمینان سے کہا'' آپ کے اس غصے اور جوش ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ مجھے آپ کے بارے میں جو اطلاع ملی ہے وہ درست ہے''۔

''تم بکتی ہو' چلی جاؤ یہاں سے۔ مجھے تمہارے اپاہج پن کا خیال آ رہا ہے ورنہ.....''

''میں جانتی ہوں مسٹر برنارڈو آپ طاقتور ہیں اور سارا شہر آپ کے چنگل میں پھنسا ہوا ہے''۔

''تو تم چاہتی کیا ہو''؟ برنارڈو نے گرج کر کہا۔

''میں چاہتی ہوں کہ آپ خلق خدا کے فائدے کے لئے اپنا یہ دھندا چھوڑ کر کوئی اور کام کریں اگر آپ سے یہ ممکن نہیں تو پھر مجھ معذور لڑکی پر کرم کریں اور مجھے ہر روز پانچ منٹ ملاقات کا وقت دے دیا کریں''۔

وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگا‘ پھر اس نے قہقہہ لگایا اور بولا ”تم ضد کی پکی ہو......تم کل پھر آسکتی ہو اسی وقت......“۔

میں وہاں سے نکلی تو بے حد مطمئن تھی۔

برنارڈو اطالوی نژاد تھا‘ دل کا کھلا۔ اس کو زندگی میں شاید ہی مجھ سا کوئی انسان ملا ہو۔ وہ میری ذات میں دلچسپی لینے لگا۔ ایک دن کے بعد دوسرا دن......وہ مجھے ہر روز بلاتا مجھ سے باتیں کرتا۔ پانچ منٹ کی گفتگو کا دائرہ پھیل کر گھنٹوں تک پہنچ گیا۔ میں اس کے سامنے انسانوں کی بدحالی کا ذکر کرتی‘ منشیات کی تباہ کاریاں بیان کرتی اور اسلام کی حقانیت کا ذکر کرتی۔ آہستہ آہستہ اس کے خیالات میں کچھ لچک پیدا ہونے لگی۔

”آمنہ!“......ایک دن اس نے مجھ سے کہا......”میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو؟ مسلمان کیا ہوتے ہیں؟ مگر میں ایک بات جان گیا ہوں کہ تم انسان کی نفسیات کو خوب سمجھتی ہو“۔

”اسلام انسانوں کا مذہب ہے، ایک مکمل دین ہے، مکمل دین“......میں نے جواب دیا......”اس لئے اسلام مسلمانوں کو انسانی نفسیات پر گہری نظر رکھنے کی تلقین کرتا ہے“۔

میں نے محسوس کیا کہ اب جب میں اس سے ملنے جاتی ہوں تو وہ کچھ بے چینی محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس نے ایک دن مجھ سے کہا......”آمنہ! کیا واقعی انسان کی زندگی فانی ہے‘ انسان کو دنیا میں اچھے کام کرنے چاہئیں اور دوسروں کا بھلا سوچنا چاہیے؟“

”الحمد للہ......“ میں نے جواب دیا......”خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ بات آپ کے ذہن میں سما گئی ہے“۔

چند دنوں بعد برنارڈو نے اپنا دھندا چھوڑ دیا اور راہِ راست پر آگیا۔ اس نے بلا ہچکچاہٹ قبول کرلیا کہ وہ مافیا کا رکن ہے۔ اس نے مافیا کے سربستہ رازوں کو کھول کر رکھ دیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ صدر فورڈ کے عہدِ صدارت میں برنارڈو کے اس عمل سے امریکہ میں کتنا تہلکہ مچا تھا۔ برنارڈو نے اخبار نویسوں سے کہا تھا......”ایک اپاہج اور معذور لڑکی نے مجھے یہ طاقتِ پرواز بخشی ہے کہ میں نے برائی کی زنجیروں کو توڑ دیا ہے اور کھلی آزاد فضاؤں میں اڑنے کی ہمت اپنے اندر محسوس کررہا ہوں“۔

اس روز میں بہت روئی تھی جب مجھے یہ خبر ملی کہ برنارڈو کو جیل میں گولی ماردی گئی

ہے۔ اس کو مافیا کے آدمیوں نے قتل کر دیا تھا۔ اس کا زندہ رہنا ان کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ ایک ایسا انسان تھا جو راستی کی راہ پر چل نکلا تھا۔ وہ زندہ رہتا تو بڑا مصلح ثابت ہو سکتا تھا۔

برنارڈو کے تائب ہونے کی وجہ سے مجھے پریس نے بڑی شہرت دی میری تصویریں شائع ہونے لگیں۔ اخباروں اور رسالوں میں میرے انٹرویو شائع ہوئے۔ ٹی وی اور ریڈیو پر مجھے بلایا گیا اور میری خدمات کو بے حد سراہا گیا۔

عالمی ہیوی ویٹ چیمپئن محمد علی مجھ سے ملنے آئے۔ انہوں نے میری بڑی تعریف کی۔ صدر فورڈ نے مجھے وائٹ ہاؤس میں بلایا اور میری تعریف کی۔ اس شہرت اور عزت کے باوجود مجھ میں تکبر پیدا نہیں ہوا کیونکہ اللہ تعالیٰ کو تکبر پسند نہیں ہے۔

اسلام نے میری زندگی میں جو انقلاب پیدا کیا' میں ساری دنیا میں پھیلا دینا چاہتی ہوں اور اگر یہ میرے بس میں نہیں تو میرے دل میں یہ خواہش ضرور ہے کہ اسلام کی برکات اور فیوض سے امریکا کے سیاہ فام ضرور فیض یاب ہوں۔

میرے والد شراب سے توبہ کر چکے ہیں اور نشہ چھوڑ چکے ہیں۔ میری والدہ میری عزت کرتی ہیں' اگرچہ انہوں نے اپنا مذہب نہیں چھوڑا مگر ان کی زندگی میں بڑی تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔

پچھلے چند برسوں میں میری کوششوں کی وجہ سے ساڑھے تین سو افراد نے منشیات سے توبہ کی ہے اور اکیس مردوں اور عورتوں نے اسلام قبول کیا ہے۔

میں ایک اپاہج عورت ہوں مگر میں اپنے آپ کو اپاہج نہیں سمجھتی کیونکہ میرا ایمان ہے کہ جو شخص مسلمان ہو جائے وہ کبھی اپاہج نہیں ہو سکتا، خدا اس کا سہارا بن جاتا ہے..... میری زندگی اسلام کے لئے وقف ہو چکی ہے۔ میں اسلام ہی کے لئے کام کروں گی اور اسلام کی روح انسانوں میں پھونک دینا چاہتی ہوں۔

جب بھی کوئی انسان برائی کا راستہ ترک کرتا ہے تو میں سمجھتی ہوں کہ اسلام کی فتح ہوئی ہے۔ تو یہ ہے میری کہانی ...... سنتھیا سے آمنہ بننے کی!!

●......●......●

ابراہیم کوآن (ملائیشیا)

(Ibrahim Kuan)

میں نے ساٹھ سال کی عمر تک ایک پروٹسٹنٹ عیسائی کی حیثیت سے زندگی گزاری اور اس دوران میں تقریباً تین سال تک کوالالمپور (ملائیشیا) کے چرچ میں پادری کی خدمات بھی انجام دیں' مگر بالآخر اسلام کی آغوش میں آ گیا۔ آج میں تشکر بھری مسرت کے ساتھ وہ وجوہات بیان کروں گا جو میرے قبولِ اسلام پر منتج ہوئیں۔

میں ۳ فروری ۱۹۰۷ء کو پیدا ہوا۔ میرے والدین بدھ مت سے تعلق رکھتے تھے۔ چھ برس کی عمر میں مجھے ایک چینی اسکول میں داخل کرایا گیا۔ جہاں میں نے کنفیوشس مذہب کی ایک بنیادی کتاب ''چہار کتب'' اور دیگر کئی کتابیں پڑھیں۔ جن کے زیرِ اثر میں کنفیوشس مت کے ایک خدا کے عقیدے کا قائل ہو گیا۔

میری عمر نو برس کی تھی جب کہ میں کوالالمپور کے ''وکٹوریہ انسٹیٹیوٹ'' میں انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے لگا۔ اس سے میں نے بائبل کے عہد نامہ قدیم اور جدید کا سبقاً سبقاً مطالعہ کیا اور مذہبِ عیسوی اختیار کر لیا۔ میری عمر اس وقت سولہ سترہ برس کے لگ بھگ تھی۔

ستمبر ۱۹۲۲ء میں جب میں کوالالپس کے چرچ میں پادری بن کر جانے ہی والا تھا' میرے ایک ہندوستانی دوست کے۔ کے۔ محمد نے مجھے قرآن پاک کے انگریزی ترجمے کا ایک نسخہ دیا۔ میں نے اس کا مطالعہ کیا اور اس کے موضوعات کے حُسن سے بے حد متاثر ہوا۔ اگرچہ اس تاثر کی شدت اتنی زیادہ نہ تھی کہ میں اسلام قبول کر لیتا۔

کوالالپس میں عیسائیت کی تبلیغ کرتے ہوئے مجھے یہ دیکھ کر سخت صدمہ ہوا اور میرا ذہن یہ محسوس کر کے جھنجھنا اٹھا کہ پروٹسٹنٹ چرچ کی کتنی شاخیں ہیں اور ''مذہبی عقائد'' کی

بنا پر ہر شاخ دوسری سے برسر پیکار رہتی ہے۔ آپ کو یہ بھی اندازہ ہوگا کہ پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقوں میں بُعد واختلاف کی شدت کا کیا عالم ہے اور ان کے مذہبی عقائد باہم دگر کتنے مختلف ہیں۔ اس کیفیت نے مجھے سخت پریشان کیا اور گھبرا کر میں نے قرآن کا سہارا لیا۔ جن آیتوں نے میری رہنمائی فرمائی وہ یہ ہیں:

''اس نے آپ پر (اے نبی ﷺ) یہ کتاب نازل کی جو حق لے کر آئی ہے اور ان کتابوں کی تصدیق کر رہی ہے جو پہلے سے آئی ہوئی تھیں۔ اس سے پہلے وہ انسانوں کی ہدایت کے لئے تورات اور انجیل نازل کر چکا ہے'' (آل عمران:۳)

''اے نبی کہہ دیجیے کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں۔ اس تعلیم کو مانتے ہیں جو ہم پر نازل کی گئی ہے۔ ان تعلیمات کو بھی مانتے ہیں جو ابراہیم' اسماعیل' اسحٰق' یعقوب اور اولادِ یعقوب پر نازل ہوئی تھیں۔ ان ہدایات پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئیں۔ ہم ان کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے تابع فرمان (مسلم) ہیں'' (آل عمران:۸۴)

قرآن کے مسلسل اور گہرے مطالعے نے مجھے حقیقت کے قریب کر دیا اور عیسائیت کے عقائد کا کھوکھلا پن مجھ پر واضح ہوتا گیا۔ مثال کے طور پر عقیدۂ تثلیث وہ گورکھ دھندہ ہے جسے ہر عیسائی سمجھے بغیر اختیار کرتا ہے حالانکہ دنیا میں کوئی ایسی کتاب ہے ہی نہیں جس میں اس پیچیدہ مسئلے کی وضاحت یا تعلیم موجود ہو۔ اس کے مقابلے میں اسلام توحید کا صاف ستھرا اور عقلی و منطقی عقیدہ رکھتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی کبریائی میں کوئی شریک نہیں۔ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ ذات وصفات میں وہ یکتا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے آخری رسول اور نبی ہیں۔ میرے نزدیک اسلام اور عیسائیت میں یہی بنائے امتیاز ہے۔

مجھے پروفیسر خورشید احمد کی اس بات سے مکمل اتفاق ہے (جو انہوں نے اسلام کا تعارف کراتے ہوئے ایک طویل مضمون میں رقم کی) ''کہ دنیا میں بہت سے مذاہب اور نظریات کے بظاہر روشن اور پرشکوہ یک رخہ پن نے بڑا غضب ڈھایا' کچھ نے زندگی کے روحانی پہلوؤں پر اتنا زور دیا کہ مادی اور دنیاوی امور کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ ان مذاہب اور نظریات نے دنیا کو ایک واہمہ' فریب نظر اور زنجیر پا قرار دیا۔ جبکہ اس کے مقابلے

میں بعض دیگر فلاسفہ نے زندگی کی روحانی اور اخلاقی قدروں کی نفی کی اور انہیں خیالی اور فرضی قرار دیا۔ ظاہر ہے یہ دونوں نقطہ ہائے نظر انتہا پسندانہ تھے اور اپنے ساتھ تباہی و بربادی لے کر آئے تھے۔ انہوں نے انسانیت کے امن و سکون' قناعت پسندی اور آسودگی کو غارت کر دیا۔ عدمِ توازن کی یہ کیفیت آج بھی برقرار ہے''۔

میں فرانسیسی سائنس دان ڈاکٹر ڈی ہیروگیبسی سے بھی متفق ہوں کہ ''جدید مادہ پرستانہ تہذیب میں انتہاپسندی اور عدمِ توازن کی جو کیفیت کارفرما ہے وہ غیر معمولی طور پر خطرناک ہے اور اگر روحانی قدروں کے فروغ کے لئے کوئی متوازی تحریک نہ چلی تو دنیا دردناک تباہی سے دوچار ہو جائے گی''۔

لارڈ رسل کے بقول عیسائیت نے ایک انتہا کی طرف جھک کر فاش غلطی کی جبکہ تہذیبِ جدید نے سارا وزن دوسرے پلڑے میں ڈال کر ظلم کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہم نے زندگی کے ظاہری ڈھانچے کو بے حد خوبصورتی اور سلیقے سے سجایا ہے مگر باطن کی بنیادی اور ضروری احتیاجات کو نظرانداز کر بیٹھے ہیں۔ ہم نے ایک حسین و جمیل پیالہ بنایا ہے' اس کی آرائش بھی خوب کی ہے اور اس کے بیرونی حصے کی صفائی کا بھی خاص خیال رکھتے ہیں' لیکن یہ نہیں دیکھا کہ اس کے اندر خوش ذائقہ زہر بھرا ہوا ہے۔ ہم نے علم کی ساری صلاحیتوں اور عقل کی ساری قوتوں کو محض جسمانی عیش و آرام مہیا کرنے کے لئے استعمال کیا' لیکن روح کے تقاضوں کی پروانہ کی اور اسے بے یار و مددگار چھوڑ دیا''۔

اس دردناک کیفیت کے برعکس اسلام زندگی گزارنے کا ایک درمیانہ اور متوازن لائحۂ عمل دیتا ہے۔ اسلام مادیت اور روحانیت میں توازن پیدا کرتا ہے اور دونوں میں سے کسی کو نظرانداز نہیں کرتا۔ اسلام کا مطلب ہے اطاعت' اللہ کی اطاعت اور اس کے قوانین و احکامات کی پابندی۔ اس کی مخلوقات کی خیرخواہی اور معاشرے کی اصلاح و بہبود کی فکر۔

عیسائیت' تہذیبِ حاضر اور اسلام کے تقابلی مطالعے نے مجھے یکسو کر دیا۔ میں نے دل کی انتہائی گہرائیوں سے اسلام قبول کر لیا اور سچے مسلمان کی طرح اسلامی قوانین کی پیروی قبول کر لی۔ اسلام نے مجھے یہ سکھایا کہ میں غریبوں اور ضرورت مندوں کی ضروریات اور مشکلات کو سمجھوں اور ان کی مدد کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کروں۔ میں اپنے

آپ کو بے حد خوش قسمت سمجھتا ہوں' جو کچھ اللہ نے مجھے عنایت فرمایا ہے میں اس پر قانع ہوں اور اس کے فضل و کرم کا شکریہ ادا کرتا ہوں' جو وہ شب و روز ہم پر نازل کرتا ہے۔ ہمیں اس پر آشوب دور میں صرف اللہ کی مدد درکار ہے۔ ہم اس سے تحمل' حلم اور محبت کی بھیک مانگتے ہیں تاکہ ایک پر امن دنیا کی تخلیق کی جا سکے۔

ہاں اس امر کا بھی اظہار کرتا چلوں کہ قرآن میں کتنی ہی ایسی باتیں ہیں جن کی تصدیق بائبل بھی کرتی ہے۔ مثلاً اطاعت خداوندی' اخوت و مساوات' زندگی بعد موت اور روز حشر پر ایمان۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ صحیح معنوں میں حضرت عیسیٰ پر میں اب ایمان لایا ہوں' بمقابلہ اس دور کے جب میں نام نہاد "عیسائی" تھا۔

مختصراً اسلام کی جن تعلیمات نے مجھے اپنا اسیر بنا لیا وہ یہ ہیں:

۱۔ اسلام عیسائیت کے مقابلے میں کہیں زیادہ عقلی' عملی' قابل فہم' منطقی اور سادہ مذہب ہے۔

۲۔ اسلامی عبادات اللہ سے براہ راست تعلق جوڑتی ہیں۔

۳۔ اسلام میں خدا کا تصور بڑا ہی باوقار اور پرشکوہ ہے۔

۴۔ اسلامی عبادات میں زندگی اور تکمیل کا احساس ہوتا ہے۔ عیسوی طرز عبادت کی طرح ادھورا پن نہیں ہے۔

۵۔ قرآنی تعلیمات کے مطابق مسلمان گزشتہ ساری کتابوں کو مقدس اور الہامی مانتے ہیں۔ اگرچہ وہ تحریف کی نذر ہو چکی ہیں۔ قرآن ہر قسم کی ترمیم و تبدیلی سے محفوظ ہے اور پہلی کتابوں اور رسولوں کی تصدیق کرتا ہے۔

●......●......●

سسٹر امینہ (امریکا)

محترمہ امینہ جنان کا تعلق امریکہ سے ہے۔ انہوں نے ۱۹۷۷ء میں اسلام قبول کیا۔ اس سے قبل وہ امریکہ کے سنڈے اسکولوں میں عیسائیت کی تعلیم دیا کرتی تھیں۔ قبولِ اسلام کے بعد انہیں غیر معمولی قسم کی قربانیاں دینی پڑیں، مگر انہوں نے کسی موقع پر حوصلہ مندی اور استقامت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا چنانچہ اپنے بے پناہ علم، شفقت، خوش طبعی، حُسنِ اخلاق اور انسانی احترام کی وجہ سے وہ اپنے حلقۂ تعارف اور خواتین میں Smiling Lady یعنی متبسم خاتون کے لقب سے یاد کی جاتی ہیں اسی خوش خلقی اور کریم النفسی کی وجہ سے لوگ انہیں عقیدت سے سسٹر امینہ بھی کہتے ہیں حالانکہ چند برسوں سے ان کی ریڑھ کی ہڈی میں درد ہے اور وہ بیساکھیوں کا سہارا لینے پر مجبور ہیں۔ مگر نہ تو وہ نماز پنج وقتہ کو قضا ہونے دیتی ہیں اور نہ دینِ حق کی تبلیغ میں کوتاہی ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اس معذوری کے باوجود ہزاروں میل کا سفر طے کر کے فروری ۹۰ء میں پاکستان آئیں اور اسلام پر اپنے محکم یقین سے بے شمار خواتین اور مردوں کو متاثر کر گئیں۔ وہ ایک باعمل خاتون ہیں اور قرآن وسنت کے ایک ایک حکم کو بجالانے کی کوشش کرتی ہیں۔ سفرِ پاکستان میں ان کے ساتھ ان کا دس سالہ بیٹا ''محمد'' بھی تھا جو بڑا ذہین اور حساس بچہ ہے اور سسٹر امینہ اس کی اسلامی اصولوں کے مطابق تربیت کر رہی ہیں۔

محترمہ موصوفہ نے مختلف مواقع پر اپنے قبولِ اسلام کی وجوہ بیان کی ہیں۔ میں نے اس نوعیت کے تین مختلف مضامین سے استفادہ کر کے ذیل کی خودنوشت مرتب کی ہے۔ ان میں سے مفصل مضمون مِس منور صادق کا ہے جو مجھے میرے بزرگ اور مہربان دوست کنور سعید اللہ خان صاحب (سرگودھا) نے فراہم کیا۔ میں اس کے لئے کنور صاحب اور مِس

منور صادق دونوں کا ممنون ہوں۔

مَیں جنوری ۱۹۴۵ء میں امریکہ کی ریاست لاس اینجلس کے علاقہ ویسٹ میں پیدا ہوئی۔ میرے والدین پروٹسٹنٹ عیسائی تھے اور ننھیال و ددھیال دونوں طرف مذہب کا بڑا چرچا تھا۔ مَیں اسکول کے آٹھویں گریڈ میں تھی کہ میرے والدین کو فلوریڈا منتقل ہونا پڑا اور باقی تعلیم وہیں مکمل ہوئی۔ میری تعلیمی حالت بہت اچھی تھی۔ خصوصاً بائبل سے مجھے خاص دلچسپی تھی اور اس کے بہت سے حصے مجھے زبانی یاد تھے۔ اس سلسلے میں مَیں نے متعدد انعامات بھی حاصل کئے۔ مَیں غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی اور وومن لبریشن موومنٹ (تحریک آزادیٔ نسواں) کی پُر جوش کارکن تھی۔

ہائی اسکول کی تعلیم ختم ہوئی تو میری شادی ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی مَیں ماڈلنگ کے شعبے سے منسلک ہوگئی۔ خدا نے مجھے اچھی شخصیت عطا کی تھی اور مَیں محنت بھی خوب کرتی تھی، اس لیے اس لئے میرا کاروبار خوب چمکا۔ پیسے کی ریل پیل ہوگئی۔ شوفر، بہترین گاڑیاں غرض آسائش کا ہر سامان میسّر تھا۔ حالت یہ تھی کہ بعض اوقات ایک جوتا خریدنے کے لئے مَیں ہوائی سفر کر کے دوسرے شہر جاتی تھی۔ اس دوران میں مَیں ایک بیٹے اور ایک بیٹی کی ماں بھی بن گئی، مگر سچی بات یہ ہے کہ ہر طرح کے آرام و راحت کے باوجود دل مطمئن نہ تھا۔ بے سکونی اور اداسی جان کا گویا مستقل آزار بن گئی تھی اور زندگی میں کوئی زبردست خلا محسوس ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ مَیں نے ماڈلنگ کا پیشہ ترک کردیا، دوبارہ مذہبی زندگی اختیار کرلی اور مختلف تعلیمی اداروں میں مذہبی تبلیغ کی رضاکارانہ خدمات انجام دینے لگی۔ اس کے ساتھ ہی مَیں نے مزید تعلیم کے لئے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ خیال تھا کہ اس بہانے شاید روح کو کچھ سکون ملے گا۔ اس وقت میری عمر تیس سال تھی۔

اسے خوش قسمتی ہی کہئے کہ مجھے ایک ایسی کلاس میں داخلہ مل گیا جس میں سیاہ فام اور ایشیائی طالب علموں کی خاصی بڑی تعداد تھی۔ بڑی پریشان ہوئی، مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔ مزید گھٹن یہ دیکھ کر محسوس ہوئی کہ ان میں خاصے لوگ مسلمان تھے اور مجھے مسلمانوں سے سخت نفرت تھی۔ عام یورپین آبادی کی طرح میرے نزدیک بھی اسلام وحشت و جہالت کا

مذہب تھا اور مسلمان غیر مہذب' عیاش' عورتوں پر ظلم کرنے والے اور اپنے مخالفوں کو زندہ جلا دینے والے لوگ تھے۔ امریکہ اور یورپ کے عام مصنفین اور مؤرخ یہی کچھ لکھتے آرہے ہیں۔ بہر حال شدید ذہنی کوفت کے ساتھ تعلیم شروع کی۔ پھر اپنے آپ کو سمجھایا کہ میں ایک مشنری ہوں' کیا عجب کہ خدا نے مجھے ان کافروں کی اصلاح کے لئے یہاں بھیجا ہو' اس لئے مجھے پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ چنانچہ میں نے صورت حال کا جائزہ لینا شروع کیا تو حیرت میں مبتلا ہو گئی کہ مسلمان طالب علموں کا رویہ دیگر سیاہ فام نوجوانوں سے بالکل مختلف تھا۔ وہ شائستہ' مہذب اور باوقار تھے۔ وہ عام امریکی نوجوانوں کے برعکس نہ لڑکیوں سے بے تکلف ہونا پسند کرتے تھے نہ آوارگی اور عیش پسندی کے رسیا تھے۔ میں تبلیغی جذبے کے تحت ان سے بات کرتی' ان کے سامنے عیسائیت کی خوبیاں بیان کرتی تو وہ بڑے وقار اور احترام سے ملتے اور بحث میں الجھنے کی بجائے مسکرا کر خاموش ہو جاتے۔

میں نے اپنی کوششوں کو یوں بیکار جاتے دیکھا تو سوچا کہ اسلام کا مطالعہ کرنا چاہئے تا کہ اس کے نقائص اور تضادات سے آگاہ ہو کر مسلمان طالب علموں کو زچ کر سکوں' مگر دل کے گوشے میں یہ احساس بھی تھا کہ عیسائی پادری' مضمون نگار اور مؤرخ تو مسلمانوں کو وحشی' گنوار' جاہل اور نہ جانے کن کن برائیوں کا مرقع بتاتے ہیں' لیکن امریکی معاشرت میں پلنے بڑھنے والے ان سیاہ فام مسلمان نوجوانوں میں تو ایسی کوئی برائی نظر نہیں آتی بلکہ یہ باقی سب طلبہ سے مختلف و منفرد پاکیزہ رویے کے حامل ہیں۔ پھر کیوں نہ میں خود اسلام کا مطالعہ کروں اور حقیقت حال سے آگاہی حاصل کروں۔ چنانچہ اس مقصد کی خاطر میں نے سب سے پہلے قرآن کا انگریزی ترجمہ پڑھنا شروع کیا اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ یہ کتاب دل کے ساتھ ساتھ دماغ کو بھی اپیل کرتی ہے۔ عیسائیت پر غور و فکر کے دوران اور بائبل کے مطالعے کے نتیجے میں ذہن میں کتنے ہی سوال پیدا ہوتے تھے' مگر کسی پادری یا دانشور کے پاس ان کا کوئی جواب نہ تھا اور یہی تشنگی روح کے لیے مستقل روگ بن گئی تھی۔ مگر قرآن پڑھا تو ان سارے سوالوں کے ایسے جواب مل گئے جو عقل اور شعور کے عین مطابق تھے۔ مزید اطمینان کے لئے اپنے کلاس فیلو مسلمان نوجوانوں سے گفتگو کی' تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا تو اندازہ ہوا کہ میں اب تک اندھیروں میں بھٹک رہی تھی۔

اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں میرا نقطۂ نظر صریحاً بے انصافی اور جہالت پر مبنی تھا۔

مزید اطمینان کی خاطر میں نے پیغمبر اسلام اور ان کی تعلیمات کا مطالعہ کیا تو یہ دیکھ کر مجھے خوشگوار حیرت ہوئی کہ امریکی مصنفین کے پروپیگنڈے کے بالکل برعکس حضور اکرمؐ بنی نوع انسان کے عظیم محسن اور سچے خیر خواہ تھے۔ خصوصاً انہوں نے عورت کو جو مقام و مرتبہ عطا فرمایا' اس کی پہلے یا بعد میں کوئی مثال نظر نہیں آتی۔ ماحول کی مجبوریوں کی بات دوسری ہے' ورنہ میں طبعاً بہت شرمیلی ہوں اور خاوند کے سوا کسی مرد سے بے تکلفی پسند نہیں کرتی' چنانچہ جب میں نے پڑھا کہ پیغمبر اسلامؐ خود بھی بے حد حیادار تھے اور خصوصاً عورتوں کے لئے عفت و پاکیزگی اور حیا کی تاکید کرتے ہیں تو میں بہت متاثر ہوئی اور اسے عورت کی ضرورت اور نفسیات کے عین مطابق پایا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کا قدر و مرتبہ جس درجہ بلند فرمایا اس کا اندازہ اس قول سے ہوا کہ "جنت ماں کے قدموں میں ہے" اور آپؐ کے اس فرمان پر تو میں جھوم اٹھی کہ عورتیں نازک آبگینوں کی طرح ہیں اور تم میں سے سب سے اچھا شخص وہ ہے جو اپنی بیوی اور گھر والوں سے اچھا سلوک کرتا ہے۔

قرآن اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات سے میں مطمئن ہو گئی اور تاریخ اسلام کے مطالعے اور اپنے مسلمان کلاس فیلو نوجوانوں کے کردار نے مسلمانوں کے بارے میں ساری غلط فہمیوں کو دور کر دیا اور میرے ضمیر کو میرے سارے سوالوں کے جواب مل گئے' تو میں نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا ذکر میں نے متذکرہ طالب علموں سے کیا تو وہ ۲۱ مئی ۷۷ء کو میرے پاس چار ذمہ دار مسلمانوں کو لے کر آئے' ان میں ایک ڈینور (DENVER) کی مسجد کے امام تھے۔ چنانچہ میں نے ان سے چند مزید سوالات کیے اور کلمۂ شہادت پڑھ کر دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئی۔

میرے قبولِ اسلام پر پورے خاندان پر گویا بجلی گر پڑی۔ ہمارے میاں بیوی کے تعلقات واقعی مثالی تھے اور میرا شوہر مجھ سے ٹوٹ کر محبت کرتا تھا۔ مگر میرے قبولِ اسلام کا سن کر اسے غیر معمولی صدمہ ہوا۔ میں اسے پہلے بھی قائل کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی اور اب پھر سمجھانے کی بہت سعی کی مگر اس کا غصہ کسی طرح ٹھنڈا نہ ہوا اور اس نے مجھ سے علیحدگی اختیار کر لی اور میرے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ عارضی طور پر دونوں

بچوں کی پرورش میری ذمہ داری قرار پائی۔

میرے والد بھی مجھ سے گہری قلبی وابستگی رکھتے تھے' مگر اس خبر سے وہ بھی بے حد برافروختہ ہوئے اور غصے میں ڈبل بیرل شارٹ گن لے کر میرے گھر آ گئے تا کہ مجھے قتل کر ڈالیں...... مگر خدا کا شکر ہے کہ میں بچ گئی اور وہ ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کر کے چلے گئے۔ میری بڑی بہن ماہر نفسیات تھی' اس نے اعلان کر دیا کہ یہ کسی دماغی عارضے میں مبتلا ہو گئی ہے اور اس نے سنجیدگی سے مجھے نفسیاتی انسٹی ٹیوٹ میں داخل کرانے کے لئے دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ میری تعلیم مکمل ہو چکی تھی، میں نے معاشی ضرورتوں کے پیشِ نظر ایک دفتر میں ملازمت حاصل کی' لیکن ایک روز میری گاڑی کو حادثہ پیش آ گیا اور تھوڑی سی تاخیر ہو گئی تو مجھے ملازمت سے نکال دیا گیا۔ فرم والوں کے نزدیک میرا اصل جرم یہی تھا کہ میں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

اس کے ساتھ ہی حالت یہ تھی کہ میرا ایک بچہ پیدائشی طور پر معذور تھا۔ وہ دماغی طور پر بھی نارمل نہ تھا اور اس کی عام صحت بھی ٹھیک نہ تھی۔ جبکہ بچوں کی تحویل اور طلاق کے مقدمے کے باعث امریکی قانون کے تحت مقدمے کے فیصلے تک میری ساری جمع پونجی منجمد کر دی گئی تھی۔ ملازمت بھی ختم ہوئی تو میں بہت گھبرائی اور بے اختیار ربِّ جلیل کے حضور سربسجود ہو گئی اور گڑگڑا کر خوب دعائیں کیں۔ اللہ کریم نے میری دعائیں قبول فرمائیں اور دوسرے ہی روز میری ایک جاننے والی خاتون کی کوشش سے مجھے الیکٹریسل پروگرام میں ملازمت مل گئی اور میرے معذور بیٹے کا علاج بھی بلا معاوضہ ہونے لگا۔ ڈاکٹروں نے دماغ کے آپریشن کا فیصلہ کیا اور اللہ کے خاص فضل سے یہ آپریشن کامیاب رہا۔ بچہ تندرست ہو گیا اور میری جان میں جان آئی۔ لیکن آہ ابھی آزمائشوں کا سلسلہ ختم نہ ہوا تھا۔ عدالت میں بچوں کی تحویل کا مقدمہ دو سال سے چل رہا تھا۔ آخر کار دنیا کے اس سب سے بڑے ''جمہوری'' ملک کی ''آزاد'' عدالت نے فیصلہ یہ کیا کہ اگر بچوں کو اپنے پاس رکھنا چاہتی ہو تو اسلام سے دستبردار ہونا پڑے گا کہ اس قدامت پرست مذہب کی وجہ سے بچوں کا اخلاق خراب ہو گا اور تہذیبی اعتبار سے انہیں نقصان پہنچے گا۔

عدالت کا یہ فیصلہ میرے دل و دماغ پر بجلی بن کر گرا۔ ایک مرتبہ تو میں چکرا کر رہ

گئی۔ زمین آسمان گھومتے ہوئے نظر آئے' مگر اللہ کا شکر ہے کہ اس کی رحمت نے مجھے تھام لیا اور میں نے دوٹوک انداز میں عدالت کو کہہ دیا کہ میں اپنے بچوں سے جدائی گوارا کر لوں گی مگر اسلام اور ایمان کی دولت سے دستبردار نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ بچہ اور بچی دونوں باپ کی تحویل میں دے دیئے گئے۔

اس کے بعد ایک سال اسی طرح گزر گیا۔ میں نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے اپنا تعلق گہرا کر لیا اور تبلیغ دین میں منہمک ہو گئی۔ نتیجہ یہ کہ ساری محرومیوں کے باوجود میں ایک خاص قسم کے سکون واطمینان سے سرشار رہی۔ مگر میرے خیر خواہوں نے اصرار کے ساتھ مشورہ دیا کہ مجھے کسی باعمل مسلمان سے عقدِ ثانی کر لینا چاہئے کہ عورت کے لئے تنہا زندگی گزارنا مناسب ومستحسن نہیں ہے۔ چنانچہ ایک مراکشی مسلمان کی طرف سے نکاح کی پیش کش ہوئی تو میں نے قبول کر لی۔ یہ صاحب ایک مسجد میں امامت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ قرآن خوب خوش الحانی سے پڑھتے اور سننے والوں کو مسحور کر دیتے۔ میں دین سے ان کے گہرے تعلق سے بڑی متاثر ہوئی اور ان سے نکاح کر لیا۔ عدالت نے میرا کی رقوم واگزار کر دی تھیں چنانچہ میں نے اپنے خاوند کو اچھی خاصی رقم دی کہ وہ اس سے کوئی کاروبار کریں' مگر وائے ناکامی کہ شادی کو صرف تین ماہ گزرے تھے کہ میرے خاوند نے مجھے طلاق دیدی۔ اس نے کہا مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں' میں تمہارے لئے سراپا احترام ہوں' مگر اکتا گیا ہوں' اس لئے معذرت کے ساتھ طلاق دے رہا ہوں۔ میں نے اسے جو بھاری رقم دی تھی' چونکہ اس کی کوئی تحریر موجود نہ تھی' اس لئے وہ بھی اس نے ہضم کر لی اور اس کے بل پر جلد ہی دوسری شادی رچالی۔

طلاق کے چند ماہ بعد اللہ نے مجھے بیٹا عطا فرمایا۔ اس کا نام میں نے محمد رکھا۔ اب یہ بیٹا ماشاءاللہ دس برس کا ہے۔ وجیہہ وشکیل اور بڑا ذہین ہے۔ اسے ہی میں دیکھ دیکھ کر جیتی ہوں۔ اب میں نے اپنے آپ کو اللہ کے فضل سے دینِ اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لئے وقف کر دیا ہے اور جی چاہتا ہے کہ بقیہ زندگی اسی مبارک فریضے کی نذر ہو جائے۔ یہ بھی اللہ ہی کا فضل ہے کہ میں نے قرآن کو خوب پڑھا ہے۔ امریکہ میں اس وقت قرآن کے ستائیس ترجمے دستیاب ہیں' میں نے ان میں سے دس کا بڑی توجہ سے مطالعہ کر لیا ہے۔

عربی زبان بھی سیکھ لی ہے اور جہاں ترجمے میں کوئی بات کھٹکتی ہے' فون پر عربی کے کسی سکالر سے معلوم کر لیتی ہوں۔ الحمد للہ کہ میں مختلف کتب حدیث یعنی بخاری' مسلم' ابوداؤد اور مشکوٰۃ کا کئی کئی بار مطالعہ کر چکی ہوں اور اسلام کو جدید ترین اسلوب میں سمجھنے کے لئے مختلف مسلمان علماء کی کتابوں کا بھی مطالعہ کرتی رہتی ہوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ جب تک ایک مبلغ قرآن' حدیث اور اسلام کے بارے میں بھرپور معلومات نہ رکھتا ہو' وہ تبلیغ کے تقاضوں سے کما حقہ' عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

ایک زمانہ تھا کہ میں اتوار کا دن آرام کرنے کی بجائے کسی سنڈے اسکول میں بچوں کو عیسائیت کے اسباق پڑھاتی تھی' آج اللہ کے کرم سے میں اتوار کا دن اسلامک سنٹروں میں گزارتی ہوں اور وہاں مسلمان بچوں کو دینی تعلیم دینے کے علاوہ دیگر مضامین بھی پڑھاتی ہوں۔ لاس اینجلس میں مختلف مقامات پر مختلف نوعیت کی نمائشوں' کانفرنسوں اور مجالسِ مذاکرات کا اہتمام کر کے غیر مسلموں تک دینِ اسلام کا پیغام پہنچانے کی کوشش کرتی ہوں۔ میں ان سے کہتی ہوں کہ میں نے آپ لوگوں کو تبدیلی مذہب کے لئے نہیں بلایا' بلکہ اس لئے زحمت دی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں اور میں آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں اسلام سے کیوں وابستہ ہوں' زندگی کی کیا حقیقت ہے؟ اور انسان اور خدا کا باہمی تعلق کیا ہے؟ میں بحمد اللہ ریڈیو اور ٹی وی پر بھی اسلامی تعلیمات پیش کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔

یہ بھی اللہ ہی کی توفیق ہے کہ میں نے مختلف مقامات پر مسلم ویمن سٹڈی سرکل قائم کئے ہیں جن میں غیر مسلم خواتین بھی آتی ہیں۔ میں انہیں بتاتی ہوں کہ اسی امریکہ میں آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے عورتوں کی باقاعدہ خرید و فروخت ہوتی تھی اور ایک عورت کو گھوڑے سے بھی کم قیمت میں یعنی ڈیڑھ سو روپے میں خریدا جا سکتا تھا۔ بعد کے ادوار میں بھی عورت کو باپ یا شوہر کی جائداد میں سے کوئی حصہ نہ ملتا تھا حتیٰ کہ اگر وہ شادی کے موقع پر ایک لاکھ ڈالر شوہر کے گھر میں لے کر جاتی اور چند ہی ماہ بعد اسے طلاق حاصل کرنا پڑتی تو وہ ساری رقم شوہر کی ملکیت قرار پاتی۔ تعلیم کے مواقع بھی اسے مناسب صورت میں حاصل نہ تھے۔ اور اس ایٹمی و سائنسی دور میں بھی صورت حال یہ ہے کہ امریکہ اور

یورپ میں عملاً عورت دوسرے درجے کی شہری ہے۔ وہ مردوں کے برابر کام کرتی ہے' مگر معاوضہ ان سے کم پاتی ہے' وہ ہمیشہ عدمِ تحفظ کا شکار رہتی ہے۔ پندرہ برس کی عمر کے بعد والدین بھی اس کی کفالت کا ذمہ نہیں لیتے اور اسے خود ملازمت کر کے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ شادی کے بعد طلاق کا خوف اسے ہمہ وقت گھیرے رکھتا ہے اور طلاق کے بعد جو یورپین زندگی کا لازمہ بن گئی ہے نہ والدین نہ بھائی اس کا غم بانٹتے ہیں۔ بچوں کی ذمہ داری بھی اسی کے سر پڑتی ہے اور سابق شوہر بچوں کا بمشکل تیس فیصد خرچ برداشت کرتے ہیں یعنی پچاس ڈالر ماہوار کے حساب سے ادا کرتے ہیں جس سے ایک بچے کا جوتا خریدنا بھی مشکل ہوتا ہے۔

میں خواتین کو بتاتی ہوں کہ اس کے برعکس اسلام نے آج سے چودہ سو سال پہلے خواتین کو جو حقوق عطا کیے تھے' اس کی انسانی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ بحیثیت بیٹی' بہن' بیوی اور ماں اسے خاص احترام اور حقوق حاصل ہیں۔ باپ' خاوند' بھائیوں اور بیٹوں کی جائیداد سے اسے حصہ ملتا ہے اور طلاق کی صورت میں اولاد کی کفالت کا ذمہ دار شوہر ہوتا ہے۔ طلاق کو یوں بھی اسلام میں سخت ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے اور شادی کے موقع پر خاوند کی حیثیت کے مطابق اسے معقول رقم (یعنی مہر) کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ خاوند کو پابند کیا گیا ہے کہ اپنی شریکِ حیات کے ساتھ بہترین سلوک روا رکھے اور اس کی غلطیوں کو معاف کرے۔ اس باپ کے لئے جنت میں اعلیٰ ترین انعامات کی خوشخبری دی گئی ہے جو اپنی بچیوں کی محبت اور شفقت سے پرورش کرتا اور ان کی دینی تربیت کر کے انہیں احترام سے رخصت کرتا ہے اور اس اعزاز کی تو کہیں ادنیٰ سی بھی مثال نہیں ملتی کہ ماں کے قدموں میں جنت قرار دی گئی ہے اور باپ کے مقابلے میں اسے تین گنا واجب الاحترام قرار دیا گیا ہے۔

میں جب یہ تقابلی موازنہ کرتی ہوں تو امریکی عورتوں کے منہ حیرت سے کھلے رہ جاتے ہیں...... وہ تحقیق کرتی ہیں' مطالعہ کرتی ہیں اور جب انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ میں صحیح باتیں کرتی ہوں اور واقعتہً اسلام نے عورت کو غیر معمولی حقوق و احترام عطا کیا ہے تو وہ اسلام قبول کر لیتی ہیں...... چنانچہ اللہ کا شکر ہے کہ اب تک تقریباً چھ سو امریکی خواتین دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکی ہیں۔

خواتین میں تبلیغ کے ساتھ ساتھ میرا ہدف شعبۂ تعلیم ہے جس کے نصابات میں اسلام کے بارے میں طرح طرح کے اعتراضات والزامات ہیں۔ ٹی وی پروگراموں میں بھی جا و بے جا اسلام کے خلاف زہر افشانی کی جاتی ہے' چنانچہ میں نے عزم کرلیا کہ اس تکلیف دہ صورتِ حال کی اصلاح کرنی چاہیئے۔ اس کے لئے میں اکیڈمی آف ریلیجس سائنس کے کارپردازوں سے ملی۔ یہی لوگ نصابات اور ٹی وی پروگراموں میں اسلام کی غلط تصویر کشی کے ذمہ دار ہیں۔ میں نے اصرار کے ساتھ ان سے بحث مباحثہ کیا اور انہیں قائل کرلیا کہ اگر نشاندہی کردی جائے تو وہ متعلقہ حصوں کی اصلاح کردیں گے۔ چنانچہ میں نے مسلمان والدین کو توجہ دلائی' امریکہ میں مختلف مسلم انجمنوں سے رابطہ قائم کیا اور انہیں آمادہ کیا کہ وہ بچوں کی نصابی کتب میں سے غلط اور قابلِ اعتراض باتوں کی نشاندہی کریں۔ ان کوششوں کے نتیجے میں اسلامک فاؤنڈیشن فار کریکلم ان رچمنٹ اینڈ ڈویلپمنٹ (IFCD) کا قیام عمل میں آیا جس کے تحت نصابی کتابوں میں اسلام کے خلاف منفی اور قابلِ اعتراض مواد کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ اسی طرح امریکہ کی یونیورسٹیوں میں اسلامیات کا مضمون یہودی' عیسائی اور ہندو پڑھاتے ہیں۔ ہم نے IFOD کی وساطت سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ اسلامیات کی تدریس پر صرف مسلمان اساتذہ کا تقرر کیا جائے' مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ ہم یہ مطالبہ منظور کرالیں گے۔

اخیر میں یہ خوش کن خبر بھی سناتی جاؤں کہ میرا وہ خاندان جس نے میرا مکمل سوشل بائیکاٹ کردیا تھا' اللہ کے فضل سے اس کے بیشتر افراد اسلام قبول کرچکے ہیں۔ میرے والد جو مجھے قتل کرنے کے درپے تھے' وہ مسلمان ہوچکے ہیں اور والدہ' سوتیلے والد' دادی' دادا اور خاندان کے کئی دیگر افراد بھی حلقۂ بگوشِ اسلام ہوچکے ہیں۔ حتیٰ کہ میرا وہ بیٹا جو اپنے عیسائی باپ کے پاس رہتا ہے اور جس کی مذہبی تربیت عیسائیت کے عین مطابق بڑے اہتمام سے ہورہی تھی' ایک روز میرے پاس آیا اور کہنے لگا "ممی! اگر میں اپنا نام تبدیل کرکے فاروق رکھ لوں تو آپ کے نزدیک کیسا رہے گا؟" میں پہلے حیرت اور پھر مسرت کے بے پناہ احساس سے نہال ہوگئی' میں نے اسے گلے سے چمٹا لیا' پیار کیا اور اسلام کی دعوت پیش کی تو اس نے فوراً ہی کلمہ پڑھ لیا۔ فاروق اب بھی باپ کی تحویل میں

ہے' مگر راسخ العقیدہ مسلمان ہے۔ میری وہ بہن جو مجھے پاگل سمجھتی تھی' ایک تقریب میں اس نے میری تقریر سنی تو بے اختیار تعریف کرنے لگی۔ امید ہے انشاء اللہ وہ بھی ایک روز دائرۂ اسلام میں آجائے گی۔

یہ بھی اللہ کی عنایت ہے کہ امریکہ میں رہتے ہوئے باپردہ زندگی گزار رہی ہوں۔ اس ملک میں چہرے پر نقاب ڈال کر ادھر ادھر جانا تو ممکن ہی نہیں کہ اس سے بے شمار مشکلات آڑے آتی ہیں۔ تاہم چہرے اور ہاتھوں کے سوا میں سارے جسم کو ڈھیلے لباس میں مستور رکھتی ہوں اور اس میں بھی قدم قدم پر تعصب اور تنگ نظری کا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ اندازہ کیجیے کہ ایک مرتبہ میں اسی لباس میں ایک بنک میں گئی تو جب تک وہاں موجود رہی' بنک کا گن مین میرے سر پر رائفل تان کر کھڑا رہا۔ ایک پی ایچ ڈی خاتون متعلقہ ملازمت کے لئے منتخب ہو گئی' مگر اسے پہلے ہی روز اس لئے فارغ کر دیا گیا کہ وہ باحجاب لباس میں تھی اور اس نوعیت کی مثالیں بے شمار ہیں۔ ایک بار میں نے ریڈیو پر بچوں کا پروگرام کیا' اسے ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا' مگر تقریب سے ایک روز قبل جب کمیٹی کے ارکان سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے مجھے اسلامی لباس میں دیکھا تو کمال ڈھٹائی سے انہوں نے ایوارڈ منسوخ کر دیا۔

بہر حال یہ ہے امریکہ کا ماحول اور یہ ہیں وہ رکاوٹیں جن میں رہ کر مجھے تبلیغ دین کا کام کرنا پڑ رہا ہے۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے استقامت عطا کرے اور میں آخر وقت تک نہ صرف خود ایمان و یقین سے سرشار رہوں بلکہ یہ روشنی دوسروں تک بھی پہنچاتی رہوں۔

فروری ۱۹۹۰ء میں محترمہ امینہ انٹرنیشنل یونین آف مسلم وومن کی عالمی کانفرنس میں شرکت کے لئے پاکستان تشریف لائیں اور یہاں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات' لاہور کالج برائے خواتین' کنیرڈ کالج' کالج فار ہوم اینڈ سوشل سائنسز اور اسلام آباد کے مختلف تعلیمی اداروں میں خطاب فرمایا۔ انہوں نے خواتین کو تکرار کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی کہ حجاب میں عورت کی عزت و احترام ہے اور عورت کی سب سے

بڑی ذمہ داری اپنے بچوں کی پرورش ہے۔ انہوں نے بڑے دکھ سے کہا "میں سمجھتی تھی کہ پاکستان کا معاشرہ اسلامی رنگ میں رنگا ہوگا، مگر افسوس کہ یہاں ایئر پورٹ پر اترتے ہی مجھے مردوں کے عجیب وغریب رویے سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ عورتوں کو جس انداز میں بے باکی کے ساتھ گھورتے ہیں، اس طرح تو امریکہ کے لادین معاشرے میں بھی نہیں ہوتا۔ پھر یہاں کی خواتین یورپین عورتوں کی نقالی میں ماڈرنزم اختیار کرنے کی بڑی شوقین ہیں۔ میں انہیں انتباہ کرتی ہوں کہ یورپ کے معاشرے کی تقلید نہ کریں۔ وہاں کی خواتین آزادی اور برابری کے مفہوم کو نہیں سمجھ سکیں، انہوں نے ہر شعبۂ زندگی میں مردوں سے مسابقت کا انداز اختیار کیا اور نسوانیت کو ترک کر کے مردوں کی روش اپنالی۔ نتیجہ یہ کہ آج یورپ میں عورت سے زیادہ مظلوم کوئی نہیں۔ وہ فحاشی اور عدم تحفظ کے گہرے گڑھے میں گر گئی ہے اور جو کچھ اس کے پاس تھا وہ بھی کھو دیا ہے۔ آج عالم یہ ہے کہ گھر کو قید خانہ سمجھ کر دفتروں کی زندگی اپنانے کے نتیجے میں اسے صبح ہی صبح تیزی کے ساتھ گاڑیوں کا تعاقب کرنا پڑتا ہے اور ٹریفک کے بے پناہ رش میں دو دو گھنٹے کی بھاگ دوڑ کے بعد اپنے دفتر میں پہنچتی ہے۔ وہاں دن بھر نوکرانی کی طرح کام کرنا پڑتا ہے اور اپنے باس (BOSS) کے اشارۂ ابرو پر ہر طرح کا ناگوار کام بھی کرتی ہے۔ شام کو دوبارہ ٹریفک کے سیلاب کا مقابلہ کر کے گھر پہنچتی ہے تو تھکاوٹ سے اس قدر نڈھال اور زندگی سے اتنی بیزار ہوتی ہے کہ اپنے ننھے پیارے بچے کی بات کا جواب تک نہیں دے سکتی۔ امریکی خواتین کے بچے ڈے کیئر سنٹروں میں پلتے ہیں جہاں وہ عدم توجہ کا شکار رہتے اور نفسیاتی مریض بن جاتے ہیں۔ وہاں انہیں سادھوازم اور جادوگری کا زہر پلایا جاتا ہے، ان پر مجرمانہ حملے ہوتے ہیں اور والدین کی شفقت اور خاندانی زندگی سے محروم ہو کر وہ بچپن ہی میں منشیات کے عادی ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ بے شمار نو دس سال کی عمر میں خودکشی تک کر لیتے ہیں۔ پبلک اسکولوں میں قتل ہونے والے بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ایڈز اور ہم جنسی عام ہے اور امریکہ کی بعض ریاستوں میں تو ہم جنسی کو قانونی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ بڑھاپے میں والدین شدید کسمپرسی کی زندگی گذارتے ہیں۔ جونہی ایک خاتون کی عمر ۳۵ سال سے تجاوز کرتی ہے اسے اس طرح نظر انداز کیا جاتا ہے کہ وہ

زندہ درگور ہو کر نفسیاتی مریض بن جاتی ہے۔ چنانچہ امریکہ میں ذہنی امراض کے ہسپتال مریضوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ غرض وہاں عورتوں کو سکون حاصل ہے نہ بچوں کو نہ بوڑھوں کو۔ پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ پاکستانی خواتین اور مرد حضرات اس معاشرے کو آئیڈیل کیوں سمجھتے ہیں اور وہی اطوار کیوں اختیار کر رہے ہیں جنھوں نے امریکی اور یورپی سماج کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔"

●......●......●

کاؤنٹ ایڈورڈ گیادا (انگلستان)

میری پیدائش اگرچہ ایک کیتھولک گھر میں ہوئی تھی' لیکن اپنے والد کے زیرِ تربیت میں نے کیتھولک مذہب کے پیچیدہ اور سوفسطائی عقائد کو کبھی قبول نہیں کیا۔ حضرت مسیح نے اخوتِ انسانی کی تلقین کی تھی کہ خدا کی نظر میں سب انسان خواہ امیر ہوں یا غریب بلاتفریق یکساں درجہ رکھتے ہیں' مگر کیتھولک چرچ میں قدم رکھتے ہی اخوت اور مساوات کا جو نقشہ نظر آتا ہے وہ بڑا بھیانک اور دردناک ہے۔ امرا صفِ اوّل میں قربان گاہ کے قریب مخملیں گدوں پر جھکتے ہیں' جبکہ غریب لوگ بہت پیچھے دور کھڑے ہوتے ہیں اور ان کے لئے لکڑی کے سخت بنچوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص کارڈینل سے کچھ کہنا چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ درخواست لکھ کر پیش کرے۔ بالعموم ان درخواستوں کو رد کر دیا جاتا ہے کہ کارڈینل اپنے آپ کو کلیسا کے شہزادے سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے یسوع مسیح نے جس سادگی اور اخوت کی تعلیم دی تھی اس ماحول سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ مسیح کے ماننے والے سیدھے سادھے اور غریب لوگ تھے۔ مجھے یقین ہے کہ آج اگر جناب مسیح پھر دنیا میں آ جائیں تو ان کے نام لیوا ان کی باتیں سن کر انہیں یقیناً صلیب یا اس قسم کی کسی نئی ایجاد پر کھینچ دیں گے۔

پاپائے روم کا دعویٰ ہے کہ وہ حضرت مسیح کے جانشین ہیں' حالانکہ ان کی زندگی انتہائی امارت میں بسر ہوتی ہے۔ ارغوانی مخمل' ریشم' کمخواب' اور سمور میں ملبوس' سر پر جواہرات کا چمکتا ہوا تاج۔ پاپائے اعظم زریں تخت پر جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ چمکیلی وردیاں پہنے مودب خدام ارد گرد کھڑے رہتے ہیں۔ سارا ماحول خوشبو سے معطر ہے۔ یہ منظر بلاشبہ پرشکوہ اور خوبصورت ہے لیکن ظاہر ہے دلوں پر اس کا کوئی روحانی اثر نہیں ہوتا اور نہ اسے مسیح علیہ السلام کی تعلیمات سے کوئی واسطہ ہے۔

پھر روما کے کلیسائے سینٹ پیٹر میں جب کسی ولی کے اعزاز میں کوئی تقریب ہوتی ہے تو اس میں شمولیت کے لئے بھاری رقم کے عوض ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے۔ ٹکٹ پر جو نمبر درج ہے وہی نشست آپ کو دی جائے گی اور یہ آپ کی رقم اور حیثیت کے مطابق ہوگی۔ گرجے کے اندر متعدد گیلریاں ہیں جو رؤسا' امراء' ارباب سیاست اور دوسرے معززین کے لئے مخصوص ہوتی ہیں۔

اس کے برعکس میں بچپن ہی سے مساجد کی سادگی اور خوبصورتی سے بڑا متاثر تھا۔ اسلامی تمدن و معاشرت نے میرے ذہن پر دور رس اثرات چھوڑے تھے۔ خصوصاً میں مسلمانوں کی شاعری اور فن تعمیر کا بڑا مداح تھا۔ اکثر سوچا کرتا کہ جس قوم نے تہذیب و شائستگی کے ہر پہلو کو اس قدر ترقی اور اہمیت دی ہے اور دنیا کے سامنے حُسن و جمال کا ایک وسیع منظر پیش کیا ہے' یقیناً اس کا فلسفہ اور مذہب میں بھی بلند درجہ ہوگا۔ یہی تجسس مجھے اسلام کے قریب لے آیا۔

تلاشِ حق کے لئے میں نے جدید و قدیم مذاہب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ پھر ان کا ایک دوسرے سے مقابلہ کیا اور گہری تلاش و تنقید کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ اسلام ہی سچا مذہب ہے اور قرآن میں وہ سب کچھ موجود ہے جس کی انسان کو اپنے روحانی ارتقاء کے لئے ضرورت رہتی ہے۔ اب میں خدا سے دعا کرتا تھا کہ وہ مجھے اسلام کی آغوش میں آنے کی توفیق عطا فرمادے کہ ابھی میں آبائی مذہب کو ترک کرنے اور پورے خاندان اور ماحول سے ٹکر لینے کی استعداد نہ پاتا تھا۔

اسی کشمکش و پیچ اور گومگو کی کیفیت میں ایک رات میں نے ایک خواب دیکھا۔ میں متلاطم سمندر میں جان بچانے کے لئے موجوں سے لڑ رہا ہوں اور بڑی مشکلوں سے ساحل پر پہنچا ہوں۔ اس وقت میں نے ایک آواز سنی جو سمندر کے شور سے بھی زیادہ تیز تھی۔ کوئی کہہ رہا تھا: "تمہیں غرق ہونے سے کس نے بچایا ہے' تجھے ایمان کے اقرار سے تامل کیوں ہے؟" بیدار ہوا تو یقین کو ساحلِ مراد سے لگے ہوئے پایا۔ صبح ہی میں نے اسلام قبول کر لیا۔

قبولِ اسلام کے بعد قتل کی دھمکیاں بھی دی گئیں اور میرا سماجی مقاطعہ بھی ہوا' لیکن میں نے برداشت کی۔ اب میری انتہائی آرزو ہے کہ میں کسی طرح خانہ کعبہ کی زیارت سے

مشرف ہوں۔ میں بسا اوقات تخیل ہی تخیل میں اپنے آپ کو تن تنہا صحرائے عرب میں کھڑا ہوا پاتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ریت کا سمندر ہر چہار طرف میلوں تک پھیلا ہوا ہے اور میں اکیلا بارگاہِ الٰہی میں کھڑا ہوں۔ اس وقت میری مثال ایک ذرۂ ریگ کی سی ہوتی ہے اور دنیا کی تمام مکروہات سے اپنے آپ کو دُور پاتا ہوں۔ ستاروں کی دنیا میرے سامنے ہوتی ہے اور میرا دل قدرتِ خداوندی کے لامتناہی کرشموں کو دیکھ کر حیران ہونے لگتا ہے۔ اس وقت میرا خیال بار بار اس چیز کی طرف جاتا ہے کہ جوں جوں علم و حکمت کے تعجب انگیز اور زبردست قوانین دریافت ہوتے جائیں گے، اسی اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی غیر محدود قوت آشکار ہوتی جائے گی۔ آہ وہ دن کیا خوبصورت ہوگا جب میں کسی تفریق و امتیاز کے بغیر اپنے مختلف نسلوں اور رنگوں کے مسلمان بھائیوں کے ساتھ خوش باش کھڑا ہوں گا اور ان کی معیت میں مجھے بھی طوافِ کعبہ کی سعادت حاصل ہوگی۔

آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ مجھے سیاہ اور بھوری جلد بہت پسند ہے۔ جوں جوں آدمی اوپر کی طرف جاتا ہے، بالوں کا رنگ کھلتا جاتا ہے اور جلد زرد ہونے لگتی ہے۔ خطِ استوا کی طرف بڑھتے جایئے تو جلد کا رنگ بھورا اور سیاہ ہونے لگتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ آفتاب کی شعاعوں کو جذب کرنے کا ہے۔ برف موت کی علامت ہے اور سورج زندگی کی۔ مجھے آفتاب سے محبت ہے برف سے میں دور بھاگتا ہوں۔ صدف کا رنگ بھورا ہوتا ہے، مگر اس کے اندر سے سفید چمکتا ہوا موتی برآمد ہوتا ہے۔ میرے نزدیک روح کی وہی حیثیت ہے جو موتی کی ہے۔ میں سیاہ اور بھورے رنگ کے انسانوں کی تصویروں سے بہت لطف اندوز ہوتا ہوں۔ اگر میری جلد کی رنگت بھی سیاہ ہوتی تو میں بہت خوش ہوتا۔ یہ رنگ انسان کے لئے زیادہ موزوں ہے، اگر ایک مرتبہ مجھے مشرق وسطیٰ کے گرم ملکوں کی طرف جانے کا موقع مل گیا تو شاید میری رنگت بھی بھوری ہو جائے گی۔ بھوری بھوری جلدوں پر سفید پگڑیاں کتنی خوش نما لگتی ہیں۔ جب میں حاجی بن گیا تو میری بھی ایسی صورت بن جائے گی اور وہ کتنا اچھا وقت ہوگا۔

●......●......●

اسمٰعیل جزائرسکی (پولینڈ)

(Ismail Wieslaw Jaxierski)

میں ۸ جنوری ۱۹۰۰ء کو پولینڈ کے شہر کراکوف میں پیدا ہوا۔ میرا تعلق پولینڈ کے اونچے درجے کے ایک گھرانے سے ہے۔ اگرچہ میرے والد پکے اور سچے دہریے تھے مگر بڑے روادار تھے۔ انہوں نے اپنے بچوں سے رومن کیتھولک مذہب کی تعلیم حاصل کرنے پر کوئی تعرض نہیں کیا۔ اصل میں یہ مذہب ہماری والدہ کا تھا اور والد صاحب ان کی خواہشات میں مزاحم نہیں ہوتے تھے۔ یوں بھی انہیں پتہ تھا کہ یہ تعلیم محض رسمی اور سطحی قسم کی ہے اور اس کا کوئی اثر انسان کی ذاتی یا اجتماعی زندگی پر نہیں پڑتا' مگر جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے یہی وہ مرحلہ تھا جبکہ مذہب کا احترام میرے ذہن پر نقش ہو گیا اور میں انفرادی و معاشرتی سطح پر اس کی زبردست اہمیت کا قائل ہو گیا۔

ہمارے گھر کی دوسری خصوصیت اس کا بین الاقوامی قسم کا ماحول تھا' میرے والد نے اپنی جوانی میں یورپ کے بہت سے ممالک کی سیاحت کی تھی اور وہ اپنے سفر کے تاثرات مزے لے لے کر بیان کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نسلی' قومی اور ثقافتی تعصبات میرے نزدیک بے معنی ہو کر رہ گئے اور میرا ذہن بین الاقوامی طور پر سوچنے لگا۔ میں اپنے آپ کو دنیا بھر کا شہری سمجھتا تھا۔

میرے خاندان کی تیسری خوبی یہاں کی میانہ روی میں پنہاں تھی۔ میرے والد اگرچہ ایک امیر اور نواب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر وہ اس طبقے کے عام افراد کے برعکس بیکار وقت ضائع کرنے سے سخت متنفر رہے' وہ ان لوگوں سے بھی بیزار اور گریزاں

رہے جو تشدد یا آمریت کے قائل ہوتے ہیں۔ وہ بڑے زمیندار تھے اور معاشرتی روایات کے خلاف بغاوت کو مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ وہ ایسی ترقی کی تحسین کرتے تھے جس کی بنیاد ماضی کی روایات پر استوار ہو۔ غرض وہ میانہ روی کی بہترین مثال پیش کرتے تھے۔ چنانچہ آپ کو یہ کہنا کر ہرگز تعجب نہ ہوگا کہ جب میری سوچوں میں بلوغت آئی اور جب خصوصاً میں نے عام معاشرتی مسائل میں دلچسپی لینا شروع کی' تو جب بھی کوئی سماجی' سیاسی' اقتصادی یا ثقافتی الجھن پیدا ہوئی تو میں نے ہمیشہ درمیانی راستہ اختیار کیا۔ میں نے اکثر محسوس کیا کہ انتہا پسندی عوام کے اکثریتی مزاج سے متصادم ہے اور صرف میانہ روی اور اعتدال و توازن ہی میں نوع انسان کی بھلائی کا راز مضمر ہے۔ میرا ہمیشہ سے یقین رہا ہے کہ انسانی معاشرے کا قلم ایسی آزادی پر مبنی ہونا چاہئے جو اصول و ضوابط کی پابند ہو۔ دوسرے لفظوں میں انسانی آزادی اور روایات کا احترام تو ہو مگر ساتھ ہی فضا اور ماحول کے پیش نظر لچک کا انداز ضرور اختیار کیا جائے۔ مدعا عرض کرنے کا یہ ہے کہ میری پرورش میانہ روی کے ماحول میں ہوئی' اس لئے میں بھی مستقل طور پر میانہ روی پر کاربند ہو گیا۔ چنانچہ مجھے بجا طور پر ترقی پسند روایت پرست قرار دیا جا سکتا ہے۔

میری عمر ابھی سولہ سال ہی کی تھی کہ رومن کیتھولک چرچ کے مختلف توہمات نے مجھے مذہب سے نفرت کی حد تک بیزار کر دیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان توہمات کا پرچار حتمی و بنیادی عقائد کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر تثلیث کا فارمولا میرے نزدیک احمقانہ تھا۔ یہ تصور بھی وحشت ناک تھا کہ عشائے ربانی میں روٹی اور شراب حضرت عیسیٰ کے خون اور گوشت میں بدل جاتے ہیں۔ اسی طرح پادریوں کا خدا اور مخلوق کے درمیان واسطہ بننا' پوپ کا معصوم عن الخطا ہونا اور پُراسرار طلسمی نوعیت کے لفظوں اور اشاروں کی تاثیر کا تصور اور اسی طرح کے دوسرے توہمات میرے دل میں بیزاری کا شدید احساس بیدار رکھتے تھے۔ پھر میں اپنے ذہن کو کبھی بھی مریم' مختلف بزرگوں' تبرکات' تصویروں' بتوں وغیرہ کی پرستش پر آمادہ نہ کر سکا۔ ان سب خرافات کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں مذہب پر سارا اعتماد کھو بیٹھا اور اعتقادی معاملات سے بالکل بے تعلق ہو گیا۔

دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو میرے اندر ایک نئی مذہبی امنگ کروٹیں لینے لگی۔

خدا نے میرے آنکھیں کھول دیں۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ انسانیت کو کسی اعلیٰ و ارفع نصب العین کی ضرورت ہے اور اگر دو مثالی نصب العین نہ ملا تو بنی آدم مکمل تباہی کے عمیق غاروں میں ڈوب جائے گا۔ یہ حقیقت بھی میرے آئینۂ دل پر روشن ہو گئی کہ صرف مذہب ہی مطلوبہ حیات بخش نصب العین فراہم کر سکتا ہے لیکن یہ ناقابل تردید اور عبرت ناک منظر نظروں کے سامنے تھا کہ عصر حاضر کا انسان اس مذہب سے کسی طرح بھی مطمئن نہیں ہو سکتا' جس کی بنیاد خلاف عقل رسوم و رواج اور توہمات پر کھڑی ہو۔ میرا وجدان کہتا تھا کہ نوع انسان کی رہنمائی وہی مذہب کر سکتا ہے جو انفرادی اور اجتماعی سطح پر ایک مکمل اور جامع ضابطۂ حیات پیش کرتا ہو۔

روحانی پیاس بہت بڑھ گئی تو میں نے تلاش حق کی خاطر مختلف مذاہب کا مطالعہ شروع کیا۔ ابتداء میں میرے قریب کوا کرزم (QUAKERISM)' UNITARIANISM یعنی توحید پرستی' بدھ ازم اور بہائی ازم تھے' مگر یہی بات ہے ان میں سے کسی مذہب اور نظریئے نے بھی مجھے مطمئن نہ کیا۔

بالآخر فروری ۱۹۴۹ء میں میں نے اسلام کو "دریافت" کر لیا۔ ایک انگریز نومسلم اسماعیل کولن ایونز کا اسلام پر لکھا ہوا ایک پمفلٹ میرے ہاتھ لگ گیا۔ اس کے بعد دارالتبلیغ الاسلام قاہرہ کی مطبوعہ کچھ کتابیں اور کتابچے مجھ تک پہنچے۔ میں دلچسپی سے اسلام کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسلامی تعلیمات نے میرے دل کی آنکھیں روشن کر دیں۔ اس کی تعلیمات میرے ذہنی تصورات سے مکمل ہم آہنگی رکھتی تھیں۔ میں نے اسلام کی صورت میں ایک مکمل اور بے عیب قسم کا ضابطۂ حیات پا لیا۔ جو زمین پر اللہ کی شہنشاہیت قائم کرنے میں ذاتی اور اجتماعی سطح پر انسان کی پوری رہنمائی کرتا ہے اور جس میں اتنی لچک بھی ہے کہ ہر لحظہ تغیر پذیر زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ میں ثقافت اور سماجی علوم سے خصوصی دلچسپی رکھتا تھا' چنانچہ مجھے اسلام کے مختلف معاشرتی اداروں نے بہت متاثر کیا خصوصاً نظام زکوٰۃ' نظام وراثت' حرمت سود' جارحیت پر مبنی جنگوں کی ممانعت' حج کا عالمگیر اجتماع'

---

۱ عیسائیوں کا ایک مذہبی فرقہ جس کو دوستوں کی انجمن یا سوسائٹی کہتے ہیں۔ امریکہ کی ایک سماجی انجمن جسے فاکس نے قائم کیا۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ امن وامان کی تبلیغ کی جائے اور زبان ولباس کی سادگی پر زور دیا جائے۔

اور تعددِ ازدواج کی اجازت نے مجھے مسحور کر دیا۔ یہ ساری خصوصیات سرمایہ دارانہ تہذیب و نظام اور کمیونزم کے درمیان انصاف' عدل' اور میانہ روی کی بہترین مثالیں تھیں۔ پھر اسلام مختلف ریاستوں کے درمیان پیدا ہونے والے جھگڑوں کا جو عقلی حل پیش کرتا ہے اس کا کہیں کوئی جواب نہیں۔ سارے اہلِ اسلام کو نسل' زبان' ثقافت' رنگ اور علاقے کی حد بندیوں سے نکال کر ایک رشتۂ اخوت میں پرو دیا گیا ہے۔ جہاں تک شادی اور ازدواجی زندگی کا تعلق ہے' اسلام میں اس کی بنیادیں بڑی گہری ہیں اور سماجی و حیاتیاتی حقائق نے ان کے مبنی بر حق ہونے پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ مغرب کی سطحی' غیر سنجیدہ' اور نام نہاد یک زوجیت کے مقابلے میں اسلام کے یہ خاندانی اصول و ضوابط کہیں زیادہ بہتر اور عملی خوبیوں کے حامل ہیں۔

بہر حال میں خدائے عزّ و جل کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے کفر و ضلالت کے اندھیروں سے نجات دی اور اسلام کی روشن صراطِ مستقیم پر لا کھڑا کیا۔ الحمد للہ ربِّ العالمین۔

ایچ - ایف - فیلوز

(انگلستان)

مَیں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ برطانیہ کی شاہی بحریہ میں گزارا ہے اور اسی سلسلے میں ۱۹۱۴ء اور ۱۹۳۹ء کی عالمی جنگوں میں بھی خدمات انجام دی ہیں۔

سمندر ایک ایسا مقام ہے جہاں بیسویں صدی کی تمام ترقی، تکنیکی مہارت کے باوجود فطرت کی پُرشوکت طاقتیں اپنا آپ دکھاتی رہتی ہیں۔ ہیبت ناک آندھیاں اور غضب ناک لہریں اس سلسلے کی معمولی مثالیں ہیں۔ جنگ کے ایام میں ناگہانی خطرے اس پر مستزاد ہیں۔ خوف و خطر کی جب بھی ایسی کوئی حالت درپیش آئی، مَیں بے اختیار محسوس کرتا تھا کہ دل میں صرف ایک ہی ہستی کا خیال آتا ہے اور روح کی گہرائیوں سے فریاد کی جو لہریں پیدا ہوتیں ان کی منزل بھی وحدہٗ لاشریک ہوتی، مگر عیسائی گھرانے میں پیدا ہونے کی بنا پر اب تک مجھے یہی بتایا گیا تھا کہ دنیا کا نظام تثلیث پر قائم ہے یعنی باپ، بیٹا اور روح القدس، لیکن میرا ضمیر اس مضحکہ خیز فارمولے کو ماننے سے گریز کرتا رہا۔ آگے بڑھ کر مزید غور کیا تو عیسوی مذہب میں بہت سی اور بھی ناقابلِ فہم باتیں نظر آئیں۔ مثال کے طور پر کفارے کا فلسفہ خاک سمجھ میں نہ آیا۔ مَیں اکثر سوچتا کہ جب ہمیں اپنی دنیوی غلطیوں کا نتیجہ بالفعل خود بھگتنا پڑتا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ دوسری دنیا میں ہم گناہوں کی سزا سے محض اس لئے بچ جائیں گے کہ یسوع مسیح ان کا کفارہ دے چکے ہیں۔

دوسری بات جس سے مجھے سخت وحشت ہونے لگی وہ پیدائشی گنہگار ہونے کا نظریہ تھا۔ حالانکہ عام مشاہدہ اس کے سراسر برعکس تھا۔ مَیں نے روزمرہ زندگی میں ایسے مناظر عام دیکھے تھے کہ متوازن اور معتدل مزاج کے لوگ ہمیشہ دوسرے لوگوں کی بھلائی سوچتے

ہیں۔ نوجوان بھی عموماً اپنے پڑوسیوں اور ملنے والوں کی مدد اور خدمت خوشی سے کرتے ہیں' جہاں تک بچوں کا تعلق ہے ان کے والدین اگر اچھے ہوں اور اساتذہ ذہین اور تجربہ کار' تو ان کی عادتیں یقیناً اچھی اور قابل تعریف ہوتی ہیں' چنانچہ ازلی گنہگار کا نظریہ انسانیت کی توہین کے سوا کچھ نہ تھا۔ ان شبہات اور سوالات نے میرے ذہن کو مضبوطی سے جکڑ لیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ عیسائیت تضاد بیانیوں کا شاہکار تھی۔ مثال کے طور پر حضرت مسیح نے حکم دیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کے ان دس احکام الٰہی پر عمل کرو جو انہیں کوہ سینا پر عطا کئے گئے تھے اور ان میں پہلا حکم یہ تھا "میں تمہارا مالک ہوں' تمہارا خدا' تم میرے سوا کسی اور کو معبود نہیں مانو گے"۔ مگر عیسائی تین خداؤں کی پرستش کرنے لگے۔

پھر دوسرا حکم یوں شروع ہوتا ہے "تم اپنے لئے کوئی بُت نہیں تراشو گے نہ ہی ان کے سامنے سجدہ ریز ہو گے"۔

لیکن یہاں مریم و عیسیٰ کے بُت بنا لئے گئے اور ان کی اعلانیہ پرستش کی جانے لگی۔ مَیں نے مزید تحقیق کی تو پتہ چلا کہ اگرچہ مارٹن لوتھر نے رومن کیتھولک چرچ کے خلاف بغاوت کر کے کئی کافرانہ رسموں کو ختم کر دیا تھا مگر یہ مذہب کلی طور پر ان آلائشوں سے پاک نہ ہو سکا اور آج تک بہت سی کفریہ روایات پروٹسٹنٹ فرقے میں بھی موجود ہیں اور بنیادی طور پر دونوں فرقوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔

تاریخ کے مطالعے سے یہ خیال بھی تنگ کرتا رہتا کہ آخر حضرت مسیح کی زندگی یا موت نے فلسطین کے یہودیوں' رومنوں یا عام لوگوں پر فوری اثرات کیوں مرتب نہ کئے اور تاریخ میں حضرت موصوف کے مفصل حالات کیوں نہیں ملتے؟۔ چنانچہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ اسکول میں بائبل کے اشلوک تو پڑھائے جاتے ہیں مگر مسیح علیہ السلام کی زندگی مکمل طور پر پردۂ اخفا میں رکھی جاتی ہے۔ یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ عیسائیت کی اشاعت حضرت مسیح کی وفات کے صدیوں بعد ہوئی تھی۔

مذہب کے بارے میں یہ تھی وہ ذہنی حالت جس کے تحت مجھے ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۳ء کے دوران میں ایسے جہازوں میں رہنا پڑا جو ترکی کے پانیوں میں سرگرم عمل تھے۔ یہیں پہلے پہل مسلمانوں سے تعارف ہوا اور اسلام کے مطالعے کا شوق چرایا۔ خصوصاً اس تعلیم نے میری

توجہات کو اپنی طرف کھینچ لیا کہ "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے رسول ہیں"۔ میں نے اسلام کے بارے میں کتابیں خریدلیں ان میں سے غالب تعداد ایسی تھی جن میں اسلام کے خلاف سخت تعصب کارفرما تھا۔ پھر گذشتہ تین صدیوں سے عثمانی خلفا یورپ کے ساتھ جو کچھ کرتے رہے تھے اور ترک سیاست دان اور حکام جس قسم کے کردار کے مالک تھے اس نے میرے اندر اسلام کے لئے جوش و سرگرمی کا جذبہ کم کر دیا۔ میں نے یہ معاملہ ترک کر دیا۔ خدا سے میرا تعلق قائم رہا مگر اس کی نوعیت مجہول اور انفعالی قسم کی تھی۔

کم و بیش ایک سال اور گزر گیا۔ میں نے دوبارہ اسلام کو سمجھنے کی کوشش شروع کر دی۔ اب میں نے مسلم مشن لندن سے براہ راست رابطہ قائم کیا۔ وہاں سے مجھے مسلمان مصنفین کی لکھی ہوئی کتابیں بھجوائی گئیں۔ ان کتابوں نے مغربی علما کی علمی دیانت کی قلعی کھول دی۔ بدگمانیوں اور غلط بیانیوں کا جو کھیل یورپ کے مصنفین رچاتے ہیں، اس پر دکھ ہوا اور حیرت بھی۔ عبارتوں کو توڑ مروڑ کر اور مطالب کو مسخ کر کے من مانے مفاہیم برآمد کرنا ان دانشوروں کا دل پسند مشغلہ ہے۔ ان کتابوں نے یہ بھی بتایا کہ یورپ اسلام کے خلاف کیوں ادھار کھائے بیٹھا ہے۔ دراصل اسلام ایک مرتبہ پھر بیدار ہو رہا ہے اور ایسی تحریکیں چل پڑی ہیں جو پوری سرگرمی کے ساتھ اسے اس کی مکمل اور صحیح صورت میں جدید سائنسی اور تاریخی ضرورتوں کے تحت پیش کر رہی ہیں اور یہ چیز ثابت ہوتی جا رہی ہے کہ صرف اسلام ہی عہد حاضر کے تقاضوں کو ساتھ لے کر انسان کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ باقی سارے مذاہب اور نظریے اپنی حیثیت کھو چکے ہیں اور ان کے لئے زمانے کی پیچیدگیوں اور فکری و نظری تاریکیوں میں راستہ بنانا ناممکن ہے۔

مختصر یہ کہ مجھے میرے سارے سوالوں کے جواب مل گئے۔ مجھے سکون قلب کی دولت مل گئی اور میں مسلمان ہو گیا۔ میرا دعویٰ ہے کہ اسلام ہی وہ تنہا مذہب ہے جو فکر و عمل یعنی ہر دو اعتبار سے ایک سچا مذہب ہے اور یہی وہ صراط مستقیم ہے جو ہمیں بلا شک و شبہ خالق اکبر تک لے جا سکتا ہے۔

●......●......●

لیڈی بارنس

(انگلستان)

اس واقعے کی روایت ...... علامہ اقبالؒ نے کی ہے۔ یہ بصیرت افروز داستان علامہ مرحوم کی فرمائش پر لکھی جانے والی مختصر کتاب "اسلام زندہ باد" میں چھپی تھی اور وہیں سے نقل کی جا رہی ہے۔

حکیم الامت علامہ اقبال نے بیان فرمایا:

مسٹر وارڈ آہسن کی طرح لیڈی بارنس کا قبول اسلام بھی اپنے اندر تعجب کے کئی پہلو رکھتا ہے۔ آپ ایک نومسلم فوجی انگریز کی بیوی تھیں۔ چند سال کا ذکر ہے یہ دونوں میاں بیوی ایک مقدمے میں ملوث ہو کر میرے پاس آئے چونکہ الزامات سراسر جھوٹے تھے اس لئے عدالت نے انہیں باعزت بری کر دیا۔ چونکہ وکالت کے فرائض میں نے انجام دیئے تھے اس لئے چند روز بعد لیڈی بارنس میرا شکریہ ادا کرنے کے لئے لاہور تشریف لائیں۔ اس وقت میں نے سوال کیا "لیڈی صاحبہ! آپ کے مشرف بہ اسلام ہونے کے اسباب کیا ہیں؟"

"مسلمانوں کے ایمان کی پختگی" ڈاکٹر صاحب" لیڈی موصوف نے جواب دیا اور وضاحت میں ایک واقعہ سنایا۔

"ڈاکٹر صاحب! میں نے دیکھا ہے کہ دنیا بھر میں کوئی بھی قوم ایسی نہیں ہے جس کا مسلمانوں کی طرح ایمان پختہ ہو۔ بس اسی چیز نے مجھے اسلام کا حلقہ بگوش بنا دیا" لیڈی بارنس نے تھوڑا سا تامل فرمایا اور کہا "ڈاکٹر صاحب! میں ایک ہوٹل کی مالکہ تھی۔ میرے ہوٹل میں ایک ستر سالہ بڈھا مسلمان ملازم تھا۔ اس بڈھے کا فرزند نہایت ہی خوبصورت

نوجوان تھا۔ ایک وبائی بیماری میں یہ لڑکا چل بسا تو مجھے بے حد صدمہ ہوا۔ میں بڑھے کے پاس تعزیت کے لئے گئی، اسے تسلی دی اور دلی رنج و غم کا اظہار کیا۔ بڑھا نہایت غیر متاثر حالت میں میری باتیں سنتا رہا اور جب میں خاموش ہو گئی تو اس نے نہایت شاکرانہ انداز میں آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور کہا "میم صاحبہ! یہ خدا کی تقدیر ہے۔ خدا کی امانت تھی، خدا لے گیا، اس میں غمزدہ ہونے کی کیا بات ہے؟ ہمیں تو ہر حالت میں خدائے غفور کا شکریہ ادا کرنا واجب ہے"۔

ڈاکٹر صاحب! بڑھے کا آسمان کی طرف انگلی اٹھانا ہمیشہ کے لئے میرے دل میں پیوست ہو گیا۔ میں بار بار اس کے الفاظ پر غور کرتی تھی اور حیران تھی کہ الٰہی! اس دنیا میں اس قسم کے صابر، شاکر اور مطمئن دل بھی موجود ہیں۔ جستجو ہوئی کہ بڑھے نے ایسا پُر استقامت دل کیسے پایا؟ اسی غرض سے میں نے پوچھا کہ کیا مرحوم کے اہل و عیال بھی ہیں۔ وہ کہنے لگا "ایک بیوی اور ایک چھوٹا بچہ"۔ بڑھے کے اس جواب نے میری حیرت کو کم کر دیا۔ میں نے اس کے اطمینانِ قلب کی یہ تاویل کی کہ چونکہ پوتا موجود ہے، اس واسطے وہ اس کی زندگی اور محبت کا سہارا بنے گا۔

اس واقعہ کو زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ یتیم بچے کی ماں بھی چل بسی۔ اس سے میرے دل کو بہت تکلیف ہوئی۔ بڑھے کی بہو کا غم میری عقل پر چھا گیا۔ تعزیت کے لئے میں ان کے گاؤں روانہ ہوئی۔ اس وقت جذبات و تخیلات کی ایک دنیا میرے ہمرکاب تھی۔ سوچتی تھی اس تازہ مصیبت نے بڑھے کی کمر توڑ دی ہو گی۔ وہ ہوش و حواس کھو چکا ہو گا۔ یتیم بچے کی کم سنی اسے نڈھال کر رہی ہو گی۔ میں انہی خیالات میں غلطاں بڑھے کے گھر پہنچی تو وہ سر جھکائے لوگوں کے ہجوم میں بیٹھا تھا۔ میں نے اس کی تازہ مصیبت پر افسوس کا اظہار کیا اور اسے اپنی ہمدردی کا یقین دلایا۔ بڑھا میری ہمدردانہ باتیں بڑے سکون سے سنتا رہا، لیکن اس کے جواب کی نوبت آئی تو اس نے پھر اپنی انگلی آسمان کی طرف اٹھا دی اور کہا "میم صاحب! خدا کی رضا میں کوئی بشر دم نہیں مار سکتا۔ اسی کی شے تھی وہی لے گیا ہے ہمیں ہر حال میں اس کا شکریہ ہی ادا کرنا چاہیے"۔

"ڈاکٹر صاحب" لیڈی پارکس نے حد درجہ حیرت کے انداز میں کہا "میں جب تک

بڑھے کے پاس بیٹھی رہی نہ اس کے سینے سے آہ نکلی' نہ آنکھ سے آنسو گرا اور وہ اس طرح اطمینان کی باتیں کر رہا تھا گویا اس نے اپنے اکلوتے بیٹے اور بہو کو زمین میں دفن نہیں کیا بلکہ کوئی فرض ادا کیا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں واپس لوٹ آئی مگر سارے راستے بڑھے کی پختگی ایمان پر غور کرتی رہی۔ یہ خیال مجھے تنگ کرتا تھا اور حیرت زدہ بھی کہ اس درجہ مصیبت میں کسی انسان کو یہ استقامت اور صبر و شکر کی نعمت کیسے نصیب ہو سکتی ہے۔

شومئی قسمت کہ چند روز بعد بڑھے کا معصوم پوتا بھی وفات پا گیا۔ اس اطلاع کے بعد میں نے اپنی اندازہ شناسی کی تمام قابلیتوں کو نئے سرے سے جمع کیا اور بے قراری کے عالم میں اس کے پاس گاؤں پہنچی۔ مجھے یقین تھا کہ اب لاوارث بڑھا صبر و قرار کھو چکا ہوگا' اس کا دل و دماغ معطل ہو چکا ہوگا اور ناامیدی اس کی امید کے تمام رشتے منقطع کر چکی ہوگی مگر یہ دیکھ کر خود میرے حواس جواب دینے لگے کہ بڑھا اسی سکون کی حالت میں ہے جس کا تجربہ میں دو مرتبہ کر چکی تھی۔ میں نے نہایت دل سوزی کے ساتھ اس کے مصائب پر غم کا اظہار کیا۔ وہ سر جھکائے میری باتیں سنتا رہا۔ کبھی کبھی اس کے سینے سے آہوں کی صدا بھی آتی۔ وہ بخت غمگین بھی تھا۔ مگر میرے خاموش ہوتے پر اس نے کمال صبر و تحمل سے جواب دیا" میم صاحب! یہ سب خدا کی حکمت کے کھیل ہیں' اس نے جو کچھ دیا تھا خود ہی واپس لے لیا ہے۔ اس میں ہمارا تھا ہی کیا' پھر ہم اپنے دل کو برا کیوں کریں' بندے کو ہر حال میں خدا کا شکر ہی ادا کرتا چاہئے۔ ہم مسلمانوں کو یہی حکم ہے کہ اللہ کی رضا پر صبر کریں"۔

لیڈی بارنس درد دل کی کیفیتوں سے لبریز تھی۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا اور رندھی ہوئی آواز میں کہا" ڈاکٹر صاحب! بڑھے کا یہ جواب میرے لئے قتل کا پیغام تھا۔ اس کی انگلی آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھی مگر نشتر بن کر میرے دل میں اتر گئی تھی۔ میں نے اس مرد ضعیف کی پختگی ایمان کے سامنے ہمیشہ کے لئے سر جھکا دیا۔ مجھے یقین حاصل ہو گیا کہ بڑھے کا یہ اطمینان قلب مصنوعی نہیں حقیقی ہے۔ اب وہ گاؤں میں اکیلا تھا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی' اس نے شکریہ ادا کیا اور بے تکلف میرے ساتھ ہوٹل میں چلا آیا۔ یہاں وہ دن بھر ہوٹل کی خدمت کرتا اور رات کو خدا کی یاد میں مصروف ہو جاتا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد ایک روز بڈھے نے قبرستان جانے کا ارادہ کیا۔ تجسس کا جذبہ مجھے بھی اس کے ساتھ لے گیا۔ مَیں دیکھنا چاہتی تھی کہ اب اس کے جذبات کیا صورت اختیار کرتے ہیں۔ قبرستان میں پہنچ کر وہ شکستہ قبروں کو درست کرنے لگا۔ وہ مٹی کھود کھود کر لاتا اور قبروں پر ڈالتا۔ پھر وہ پانی لے آیا اور قبروں پر چھڑکاؤ کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے وضو کیا' ہاتھ اٹھائے اور اہلِ قبرستان کے حق میں دعا کرکے واپس چل دیا۔ مَیں نے اس تمام عرصے میں نہایت احتیاط سے اس کی حرکات وسکنات کا جائزہ لیا اور محسوس کیا کہ اس کے ہر کام میں اطمینان کا نور اور ایمان کی پختگی جلوہ گر ہے۔ میرے دل میں وہ چنگاری جو ایک مدت سے آہستہ آہستہ سلگ رہی تھی' یکایک بھڑک اٹھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ بڈھے کی خوبی نہیں بلکہ اس دینِ حق کا کمال ہے جس کا یہ بڈھا پیروکار ہے۔ مَیں نے اسی وقت مسلمان ہونے کا حتمی فیصلہ کر لیا اور ہوٹل میں پہنچ کر اس سے کہا کہ وہ کوئی ایسی مسلمان عورت بلا لائے جو مجھے اسلامی تعلیم دے۔ بڈھا فی الفور اپنے مُلّا کی لڑکی کو بلا لایا۔ اس نے مجھے خدا اور رسولؐ پر ایمان لانے کی ترغیب دی اور لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا سبق سکھایا۔

''ڈاکٹر صاحب' 'لیڈی بارنس نے روح پرور لہجے میں کہا'' اب مَیں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے مسلمان ہوں اور وہی عظیم الشان قوتِ ایمانی جس سے بڈھے کا دل سرشار تھا اپنے سینے میں موجود پاتی ہوں۔

●......●......●

شیخ بشیر احمد شاد

(پاکستان)

میں ۱۹۲۸ء میں ضلع شیخوپورہ کے ایک گاؤں دھیان گالو کے ایک عیسائی خاندان میں پیدا ہوا۔ میرے والد متھیاس صاحب مشہور پادری تھے اور تبلیغی خدمات کے سلسلے میں اپنے آبائی ضلع گورداسپور سے شیخوپورہ میں منتقل ہو گئے تھے۔ میرے دادا مسی جھنڈے مل بھی پختہ اعتقاد عیسائی تھے اور تبلیغی خدمات انجام دیتے تھے۔

میرے والد صاحب مجھے بھی ایک کامیاب مبلغ اور پادری بنانا چاہتے تھے' چنانچہ ابتدا ہی سے میری تعلیم اور تربیت مذہبی نہج پر ہوئی۔ پرائمری تعلیم میں نے ایس۔ ڈی۔ اے مشن سکول چوہڑکانہ منڈی میں حاصل کی۔ یہاں شروع ہی سے کوشش کی جاتی تھی کہ ہر بچہ بڑا ہو کر ایک اچھا مبلغ عیسائیت بن سکے۔ میں اپنی پڑھائی میں بڑا تیز تھا۔ سکول کے مذہبی کاموں کے علاوہ تبلیغی لٹریچر تقسیم کرنے والی پارٹیوں میں بھی شامل ہوتا۔ مجھے بچپن سے تقریریں کرنے اور تبلیغی خدمات انجام دینے کا بہت شوق تھا اور میرے اس شوق کو سارے اساتذہ اور پادری قدر اور شفقت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

پرائمری کے بعد میں ایس-ڈی-اے مشن ہائی سکول رڑکی چلا گیا۔ وہاں بھی میری تعلیمی و تبلیغی کارکردگی نمایاں رہی۔ یہاں میں نے عیسائیت کے بنیادی اصولوں مثلاً تثلیث' مسئلہ ابنیت مسیح' مسئلہ کفارہ' مسئلہ الوہیت مسیح اور الٰہیات کے بعض دیگر مسائل کی تربیت حاصل کی۔ سکول میں بھی عام اساتذہ خصوصاً جناب ایچ سی الیگزینڈر میرے معاملے میں بہت خوش اور مطمئن تھے۔ انہیں بجا طور پر میری صورت میں مستقبل کا ایک کامیاب مبلغ اور پادری نظر آ رہا تھا۔

اسی اثنا میں میرے والد کا تبادلہ راولپنڈی ہو گیا اور ساتھ ہی وہ حادثہ رونما ہوا جس نے میری دنیا تاریک بنا دی یعنی ۱۹۴۴ء میں میری والدہ محترمہ کا انتقال ہو گیا۔ میرے والد صاحب نے دوسری شادی کر لی' تاہم ہماری نئی والدہ نے سارے بچوں سے محبت اور شفقت کا برتاؤ جاری رکھا اور آخر تک اس میں کوئی کمی نہ آئی۔

۱۹۴۷ء میں میرا تعلیمی اور تبلیغی کورس ختم ہو گیا اور میں نے اسی سال مسیحی کلیسا کے خادم کی حیثیت سے لاہور میں اپنی خدمات کا آغاز کیا۔ میں رومن کیتھولک مشن کے ساتھ وابستہ ہوا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے اواخر میں میری شادی شرق پور کے ایک پروٹسٹنٹ پادری گھرانے میں ہوئی۔ میری بیوی ایک راسخ العقیدہ عیسائی خاتون تھی۔

تبلیغی میدان میں میرا انداز بڑا جارحانہ تھا' جہاں میں عیسائیت کو دین حق کے طور پر پیش کرتا وہاں اسلام سے اس کا مقابلہ بھی کرتا اور زور شور کے ساتھ اسلام پر عیسائیت کی برتری ثابت کرتا۔ اس ضمن میں متعدد مسلمان علماء سے میری بحثیں ہوئیں' تاہم یہ بات عجیب ہے کہ دوران گفتگو میرے منہ سے عموماً اسلامی تراکیب و اصطلاحات نکل جاتیں جس پر میرے ساتھی مجھے ٹوکتے اور خود میں بھی شرمندہ ہو جاتا۔ مثلاً الہامی کتب کا ذکر آتا تو میں بے ساختہ کہہ جاتا کہ الہامی کتابیں چار ہیں تورات' زبور' انجیل اور قرآن مجید۔ خدا کے بجائے عموماً اللہ کا اور حضرت مسیح کی بجائے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے الفاظ بول جاتا۔ عبادت کو نماز کہہ جاتا۔ وغیرہ وغیرہ۔

میری کلیسائی خدمت کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ وہ مشنری حضرات جن کے ساتھ میں کام کرتا تھا' اپنے وطن بلجیم چلے گئے۔ میں نے ترقی دیہات کے سرکاری محکمہ میں شمولیت اختیار کر لی اور شیخوپورہ چلا گیا۔ خان انور طہماسپ خان پی-سی-ایس ضلع شیخوپورہ کے ڈویلپمنٹ آفیسر تھے۔ انہوں نے خاص شفقت کا برتاؤ کیا اور دفتر ہی میں خدمت کا موقع عنایت فرمایا۔ چونکہ میرا نام مسلمانوں جیسا تھا اس لئے مجھے بعض احباب مسلمان سمجھتے مگر جب انہیں پتہ چلا کہ میں عیسائی ہوں تب بھی ان کے سلوک میں کوئی فرق نہ آتا اور ان کا برتاؤ مہر و مروت میں گندھا ہوا ہوتا۔ خصوصاً خان انور طہماسپ صاحب' میاں غلام سرور' نواز رومانی صاحب اور چودھری منظور علی صاحب کا لطف و کرم مثالی

نوعیت کا تھا۔ ان حضرات کی وجہ سے اسلام کے بارے میں میرے شکوک و شبہات دور ہونے لگے۔ میرے دل میں اسلام کے لئے نرم گوشہ پیدا ہوتا گیا اور میرے دل کی دنیا ایک صالح انقلاب کی طرف مائل ہونے لگی۔

اسی دوران میں بلجیم والے مشنری واپس آ گئے اور مجھے دوبارہ تبلیغی خدمات انجام دینے کی دعوت دی مگر میں نے ان کے ساتھ کام کرنے سے انکار کر دیا۔ اس ضمن میں میری بیوی' باپ اور سسر نے بھی بہت زور دیا بلکہ خفگی اور برہمی کا مظاہرہ کیا' مگر میں اپنی ضد پر قائم رہا۔ مسلمانوں کے اتنے قریب رہنے کے بعد اب مشنری خدمات انجام دینے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

لیکن ۱۹۵۹ء میں ترقی دیہات یا وِلیج ایڈ کا محکمہ ختم ہو گیا تو تبلیغی خدمات انجام دینے کے لئے مجھ پر دوبارہ زور ڈالا گیا اور اس مرتبہ میں دیر تک مزاحمت نہ کر سکا۔ تاہم یہ ارادہ ضرور کر لیا کہ اب عیسائیت کی تبلیغ کرتے ہوئے اسلام پر کبھی کوئی اعتراض نہیں کروں گا۔ بلکہ خدا نے موقع دیا تو اسلام کے خلاف ان تمام اعتراضات کو حقیقت و تحقیق کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش جاری رکھوں گا۔

میری تبلیغی مہمات کا مرکز شیخوپورہ تھا' مگر ہفتے میں دو مرتبہ مسیحی بشارت کے لئے ضلع لاہور میں بھی مدعو کیا جاتا۔ مجھے تبلیغی جوہر ورثے میں ملے تھے جنہیں میری محنت اور ریاضت نے جلا عطا کی تھی۔ چنانچہ میں ہر قسم کی تقاریر خود ہی تیار کرتا۔ انجیل کے مختلف حصوں کو نظم کی صورت دیتا اور نہایت موثر اور خوبصورت آواز میں خود پیش کرتا۔ ایک خوش الحان پادری کی حیثیت سے میں عوام کو گھنٹوں متوجہ رکھتا تھا۔ میری مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ بیشتر مقامی پادری میری نظمیں اور گیت الاپتے تھے اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے' لیکن سچی بات یہ ہے کہ اسلامی ماحول نے مجھ پر کچھ ایسا جادو کر دیا تھا کہ میں نے مسلمانوں میں اپنے حلقۂ احباب کو قائم ہی نہیں رکھا' بلکہ اسے وسعت بھی دی۔ میری بیوی اس پر سخت برافروختہ ہوتی اور اپنے اور میرے والدین کو آگاہ کرتی رہتی۔ کبھی جوش میں آ کر گھر میں اسلام کی کوئی خوبی بیان کر دیتا تو گویا طوفان اُٹھ کھڑا ہوتا اور کئی روز تک فضا میں تلخی رہتی۔ پھر بھی میں نے ہمت نہ ہاری اور اسلام کے بارے میں میرا تجسس آگے ہی آگے

بڑھتا رہا۔

۱۹۶۱ء میں ایک مرتبہ میں اپنے والدین سے ملنے لاہور گیا۔ والد صاحب کے پاس کرسچن کونسل لٹریچر بورڈ کے سیکرٹری مسٹر پی جے ایکلن بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں معلوم ہوا کہ میں سابق ویلیج ایڈر ہوں اور فیلڈ کے تجربہ کے علاوہ لکھنے بولنے اور گانے میں بھی ماہر ہوں تو انہوں نے میری خدمات حاصل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور ایک چٹھی دے کر گوجرانوالہ میں مسٹر پال ای ہوسٹیٹر کے پاس بھیجا۔ ہوسٹیٹر پاکستان میں مسیحی تعلیمِ بالغاں کے پروگرام کے ڈائریکٹر تھے۔ اس پروگرام کے چلانے کے لئے انہیں ایک موٹی ویٹر (MOTIVATER) ضرورت تھی۔

مسٹر ہوسٹیٹر ماہر نفسیات و لسانیات تھے۔ انہوں نے بخوشی میری تقرری کر دی اور میں گوجرانوالہ منتقل ہو گیا۔ میری بیوی بچے بھی میں مشن کپاؤنڈ کھوکھر کی گوجرانوالہ آ گئے۔

تعلیمِ بالغاں کا یہ پراجیکٹ جو ویسٹ پاکستان کرسچن کونسل کی طرف سے شروع ہوا تھا۔ اس کی تمام مالی امداد نیویارک سے آتی تھی' اس کے حسب ذیل چار شعبے تھے۔

۱۔ ریسرچ اینڈ پبلی کیشن (تحقیق و اشاعت)

۲۔ علمی تربیتی کورس برائے اساتذہ، سپروائزر وغیرہ۔

۳۔ مسیحی علمی لٹریچر کی تقسیم و فروخت۔

۴۔ تبلیغ و ترغیب۔ پبلسٹی وغیرہ۔

ان چاروں شعبوں کا بیشتر بوجھ میرے کندھوں پر ڈالا گیا اور میں پورے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ اس کام میں جُت گیا۔ میں نے فرائض کی ادائیگی میں دن دیکھا نہ رات' چنانچہ اس علاقے کا ہر عیسائی' اس امر کی گواہی دے گا کہ میں نے علمی' تعلیمی اور تبلیغی خدمات کس تندہی سے انجام دیں۔ ان فرائض کے سلسلے میں پاکستان کے تقریباً ہر بڑے شہر اور قصبے میں جانا پڑتا تھا۔ میری یہ خدمات اتنی وسیع تھیں کہ مسٹر پال ای ہوسٹیٹر نے مجھے ہر طرح کی سہولیات فراہم کر رکھی تھیں۔ سفر میں مجھے سیکنڈ کلاس کی سہولت حاصل تھی اگر گھر سے باہر کہیں رات بسر کرنی پڑتی تو تمام راتوں کا الاؤنس دس روپے فی رات ملتا تھا۔

دیگر اخراجات سفر بھی ادارہ کے ذمہ ہوتے۔ تنخواہ تقریباً چھ سو روپے ماہوار تھی اوور ٹائم اس کے علاوہ تھا' بچوں کے تعلیمی وظائف ایک سپیشل فنڈ سے ادا ہوتے۔ میڈیکل الاؤنس بھی اسی میں سے ملتا۔ ہر کرسمس پر ڈیڑھ سو روپے الگ ملتے۔ گرمیوں کی تعطیلات میں ایک ماہ کی زائد تنخواہ ملتی۔ گندم خریدنے کے لئے آسان قسطوں پر پانچ سو روپے کا قرضہ ملتا۔ میری ہر کتاب پر تین سو روپے تک رائلٹی ملتی یہاں تک کہ بیس ہزار روپے میں میرا حادثاتی بیمہ بھی کرا دیا گیا تھا تا کہ میری ناگہانی موت کے بعد میرے بیوی بچے بے سہارا نہ رہیں۔

یہ ساری سہولتیں میسر تھیں' مگر قلبی سکون حاصل نہ تھا۔ میں اپنے آپ کو اندھیروں میں بھٹکتا ہوا محسوس کرتا تھا' صاف نظر آتا تھا کہ میں لوگوں کو بزعم خویش حق کی تعلیم دیتا تھا' حالانکہ خود جہالت کی تاریکیوں میں سرگرداں تھا اور عوام کو روشنی کی طرف بلاتا تھا جبکہ خود نور کی ایک کرن کے لئے ترس رہا تھا۔ تبلیغی و علمی خدمات کے دوران میں یہ احساس مجھے متواتر تنگ کرتا رہتا۔ میں اپنے عہد کے مطابق اسلام پر اعتراض تو کوئی نہ کرتا تھا' مگر یہ خیال ذہن میں کچوکے لگاتا رہتا کہ میں عیسائیت کی تبلیغ کر کے اپنے آپ کو اور دنیا کو دھوکا دے رہا ہوں' خصوصاً دو سوال تو روح کی پھانس بن گئے اور میں ان کے بارے میں اکثر سوچتا رہتا۔

۱- اگر عیسائیت ایک سچا مذہب ہے اور اسی کی تقلید پر انسان کی نجات کا دارومدار ہے تو یہ مذہب زوال کی طرف کیوں جا رہا ہے؟ حالانکہ کہا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد محبت و اخلاق پر ہے۔

۲- اس کے برعکس اسلام کو ہر عیسائی جھوٹا خیال کرتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد ظلم و تشدد اور تلوار پر قائم ہے پھر یہ اس قدر ترقی کیوں کر گیا؟ جبکہ ظلم و تشدد انسانی فطرت کے خلاف ہے۔

انہی دو بنیادی مسائل کا تقاضا مجھے راہِ تجسس پر دور تک کھینچتا چلا گیا اور میں ذہنی و قلبی اضطراب کو لئے ہوئے تلاشِ حق کے لئے ادھر اُدھر سرگرداں رہا۔ علمائے کرام سے اعتراضات کی صورت میں گفتگو کا ایک ہی مقصد ہوتا اور علمی و تحقیقی طلب و جستجو کا بھی اب ایک ہی مدعا تھا۔ یعنی دل کی اس خلش کا علاج جو متذکرہ بالا مسائل نے پیدا کر دی تھی۔

تجسس کی یہ مدت دس سال کے عرصے پر محیط ہو گئی۔ حتیٰ کہ الحمدللہ اندھیرے کے تمام پردے ایک ایک کر کے نگاہوں سے ہٹتے چلے گئے۔ ذہن کے سارے شکوک دور ہو گئے۔ اسلام ایک روشن جگمگاتا ہوا سورج بن کر میرے سامنے آ گیا اور اب اس سے انکار کرنا ممکن نہ رہا۔ چنانچہ ۲۳ جون ۱۹۶۸ء کا مبارک دن تھا جبکہ میں اپنے دس افرادِ خانہ کے ساتھ گوجرانوالہ کی کسی مسجد میں گیا اور مولانا محمد یوسف کاشمیری کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ (الحمدللہ تعالیٰ)

یہاں پر ایک دردناک حادثے کا ذکر بہت ضروری ہے۔ میں روحانی سکون کی تلاش کے آخری مراحل طے کر رہا تھا کہ میری دیرینہ رفیقۂ حیات ایک طویل بیماری کے بعد فوت ہو گئی۔ میں نے دوسری شادی کر لی اور اس خدا کی بندی سے جو نہی میں نے اسلام کی بات کی' اس نے اس کی تائید کی اور تلاشِ حق کے سلسلے میں میری سرگرم مؤید و مونس بن گئی۔ اللہ اسے جزائے خیر عطا کرے۔

آخر میں' میں نہایت اختصار کے ساتھ اسلام اور عیسائیت کے ان عقائد کا تجزیہ پیش کرتا ہوں جنھوں نے ایک عرصے تک مجھے تحقیق و تجسس کے میدان میں محوِ سفر رکھا۔

سب سے پہلے مجھے تثلیث کے مسئلے نے پریشان کیا۔ عیسائی عقیدے کے مطابق ایک خدا میں تین اقانیم ہیں۔ یعنی باپ' بیٹا اور روح پاک' جسے وہ انسان کے جسم میں تین چیزوں' میری سمجھ' میری یاد اور میری مرضی سے بھی تشبیہ دیتے ہیں۔ وہ تثلیث کو بہت بڑا بھید بھی کہتے ہیں جو انسان کی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ میں نے غور کیا تو پتہ چلا کہ عیسائی لوگ پہلے ایک خدا کہہ کر توحید کا اقرار کرتے ہیں مگر پھر ایک خدا میں تین شخص کہہ کر توحید کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اقرار تو توحید کا کرتے ہیں مگر مانتے تثلیث کو ہیں۔ کہتے کچھ اور ہیں کرتے کچھ ہیں۔

پھر یہ بات بھی خاصی پریشان کن تھی کہ تثلیث کا بھید انسان کی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ ظاہر ہے جو چیز شعور کے احاطے میں نہ آ سکے اس پر عمل کی عمارت کیسے کھڑی ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس زمین و آسمان' کائنات اور مخلوقات کا سارا نظام پکار پکار کر گواہی دیتا ہے کہ خالقِ حقیقی وحدہٗ لاشریک ہے یعنی توحید کا تصور عام فہم اور انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ تمام الہامی کتابیں بھی اس کی شہادت دیتی ہیں مثال کے طور پر:

تورات خروج آیت ۔۲۰/۲۲' جو کوئی واحد خدا کو چھوڑ کر کسی اور معبود کے آگے قربانی چڑھائے گا' وہ نیست و نابود کر دیا جائے گا۔

۲۔ سلاطین آیت ۱۰/ ۸: خداوند ہی خدا ہے' اس کی مانند اور کوئی خدا نہیں۔

۳۔ زبور۔ آیت ۱۰/ ۸۶ تو ہی بزرگ ہے' تو ہی واحد خدا ہے۔

۴۔ انجیل۔ متی آیت ۱۷/۱۹: تو مجھے نیک کیوں کہتا ہے کیونکہ نیک تو ایک ہی ہے۔

قرآن تو ظاہر ہے توحید کی دعوت اور مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔

چنانچہ خدا کا شکر ہے کہ میں تثلیث کے غیر عقلی عقیدے سے منحرف ہو گیا اور توحید پر ایمان لے آیا۔

عیسائیت میں قرآن کو الہامی کتاب نہیں مانا جاتا اور کہا جاتا ہے کہ قرآن دراصل تورات' زبور اور انجیل کی نقل ہے۔ چنانچہ توحید کے بعد مجھے ایسے دلائل مطلوب تھے جو قرآنِ پاک کو آسمانی کتاب ثابت کر دیں۔۔ شکر ہے کہ تحقیق نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔

رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں مسیحی فرقوں کی بائبلوں میں زبردست تضاد ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ دونوں فرقے ایک دوسرے کی کتابوں کو غلط کہتے ہیں اور ساتھ ہی ان کے الہامی ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر رومن کیتھولک کی بائبل میں عہدِ عتیق (پرانے عہد نامے) کے صحیفوں کی تعداد ۴۶ ہے اور عہد جدید یا نئے عہد نامے کی تعداد ۲۸ ہے یعنی کل ۷۴ ہے۔ جبکہ پروٹسٹنٹ فرقے میں عہد عتیق اور عہدِ جدید کے صحیفوں کی بالترتیب تعداد ۳۹ اور ۲۷ ہے جو ۶۶ بنتی ہے۔ بائبلوں میں تضاد ہونے کے علاوہ ان کی آیات میں بھی تضاد ہے۔ چند مثالیں پیشِ خدمت ہیں۔

پیدائش ۹/۳ آیت میں ہے کہ "خدا غیب کا علم نہیں رکھتا"۔

متی ۳۶/۲۴ میں مرقوم ہے کہ "خدا کو غیب کا علم ہے اور اس کے سوا کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا"۔ مجھے تحقیق کے باوجود آج تک کوئی عیسائی بائبل کا حافظ نہیں ملا' چنانچہ اگر دنیا بھر سے بائبل کے نسخے نابود ہو جائیں تو بائبل کا وجود ختم ہو جائے گا۔ جبکہ یہ بات مسلّم الثبوت ہے کہ قرآن نہ صرف ہر نوع کے تضاد یا تحریف سے پاک ہے' بلکہ لاکھوں حفاظ

کے سینوں میں محفوظ بھی ہے اور صدیاں گزر جانے کے باوجود اس کی زیر زبر میں بھی فرق نہیں پڑا۔ بائبل کا متن پکار پکار کے کہتا ہے کہ یہ تغیر و تبدل کے بہت سے مراحل سے گزرا ہے، مگر قرآن کے بارے میں ایسی کوئی بات ثابت نہیں کی جا سکتی۔ محکم اور اٹل دلائل نے میرا ایمان قرآن پر بھی راسخ کر دیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ فی الواقع یہ خدائے تعالیٰ کا کلام پاک ہے۔

بچپن سے سنتا آ رہا تھا کہ اسلام ظلم و تشدد کا علمبردار ہے اور یہ تلوار کے زور سے پھیلا ہے، جبکہ عیسائیت محبت و اخلاق سے پھیلی ہے۔ اس میں کسی پر ظلم و زیادتی نہیں کی جاتی۔

مگر پیدائشی مسیحی ہوتے ہوئے بھی یہ بات میرے مشاہدے میں آتی رہی کہ برصغیر میں انگریزوں کے آنے کے بعد لوگ پیار و محبت سے عیسائی نہیں ہوئے بلکہ انہیں دنیاوی لالچ دے کر عیسائی بنایا گیا اور روحانی سکون کی طرف کھینچنے کی بجائے انہیں دنیاوی عیش و آرام کی طرف اکسایا جاتا تھا۔ چنانچہ اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ پاک و ہند میں جتنے لوگ بھی عیسائی ہوئے وہ کسی نہ کسی دنیاوی مفاد اور مادی لالچ میں گرفتار ہوئے۔

پھر یہ بات بھی میرے تجربے میں آئی کہ غیر ملکی مشنری امریکہ اور یورپ سے بھاری رقمیں منگاتے تو مقامی عیسائیوں کی امداد کے نام پر ہیں مگر وہ خرچ اپنی ذات پر کرتے ہیں۔ انہیں کالے عیسائیوں سے کوئی محبت نہیں ہوتی۔ وہ اس کو کاروبار سمجھتے ہیں اور تبلیغ کے نام پر دراصل خود گھر ے اڑاتے ہیں۔ بلکہ یورپ کی طاقتوں نے خصوصاً اسلام کو ختم کرنے کے لئے بڑے سے بڑے ظلم اور دھونس اور دھاندلی سے بھی گریز نہیں کیا۔

اس کے برخلاف مجھے یاد نہیں کہ پاکستان میں کبھی کسی غیر مسلم کو مسلمان ہونے پر مجبور کیا گیا ہو۔ یہی عالم دوسری اسلامی دنیا کا ہے۔ ہندوستان میں صدیوں تک مسلمان حکمران رہے مگر ہندو آخر تک اکثریت میں رہے اور آزادی سے اپنے مذہب پر عمل کرتے رہے۔ انڈونیشیا اور ملائیشیا میں کبھی اسلامی فوجیں گئی ہی نہیں مگر وہ اکثریتی مسلم ممالک ہیں۔ تلوار یا تو دفاع کے لئے ہے یا ظالم انسان دشمن قوتوں کے لئے ورنہ نبی اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے لے کر ساری اسلامی تاریخ بتاتی ہے کہ اسلام رحم و کرم، محبت و شفقت اور انسانی ہمدردی کا بے نظیر مرقع ہے اور اس پر تشدد کا الزام جھوٹ

اور بہتان کے سوا کچھ نہیں۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شادیوں کو عیسائی خوب اچھالتے ہیں' چنانچہ میں بھی برسوں تک ایک پادری کی حیثیت سے اس امر کو اعتراض کی صورت دے کر پھیلاتا رہا' مگر تحقیق کی اور خدا نے میری آنکھیں کھول دیں تو معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہر بات میں حکمت پوشیدہ تھی۔ انہوں نے جتنی بھی شادیاں کیں ان سب کے پس پردہ کسی نہ کسی جاہلی رسم کی تردید یا اسلامی تعلیم کی اشاعت کا مقصد ہوتا تھا۔ پھر تاریخ بتاتی ہے کہ کئی نبیوں نے بیک وقت بہت سی شادیاں کیں۔ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی عورتوں سے متنفر نہ تھے اور کسی پیغمبر کو شادی کرنے سے نہیں روکا گیا۔

عیسائیوں کی طرف سے عام اعتراض کیا جاتا ہے کہ مسلمان ایک سے زیادہ شادیاں کرتے ہیں۔ میں نے غور کیا کہ اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو اپنے نبیؐ کے طریقے پر عمل کرتے ہیں مگر عیسائی ایک شادی کر کے بھی اپنے نبی کی سنّت کی خلاف ورزی کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سرے سے شادی کی ہی نہیں تھی۔ پھر ایک شادی کرنا اور بیک وقت بہت سی عورتوں کے ساتھ ناجائز مراسم استوار کرنا آخر کہاں کی دیانت اور شرافت ہے اور یہ سب کچھ عیسائیت کی کون سی تعلیم کے تحت کیا جاتا ہے؟

دینِ اسلام کے جس پہلو نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ مساوات کی تعلیم ہے۔ حلقہء اسلام میں بلا امتیاز سب مسلمان برابر ہیں' فضیلت ہے تو صرف نیکی' پارسائی اور تقویٰ و پرہیزگاری کی۔ مساجد میں حاکم و محکوم' گورے کالے' امیر غریب سب ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ یہاں عیسائیوں کی مانند گوروں اور کالوں کے گرجے الگ الگ نہیں ہوتے۔ امیر لوگ عبادت کے وقت کرسیوں پر نہیں بیٹھتے نہ غریب اور ناخواندہ لوگ فرش پر بیٹھتے ہیں بلکہ یہاں تمام کی حیثیت برابر اور یکساں ہے۔ اسلام مساوات کا، احترامِ انسانیت کا مذہب ہے اور جس دین میں مساوات ہے وہی دینِ حق ہے۔

●.....●.....●

بیگم مولانا عزیر گل

(انگلستان)

مولانا عزیر گل شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے ساتھ مالٹا میں اسیر تھے۔ایک انگریز عورت نے مولانا حسین احمد مدنی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ پھر انہی کے مشورے اور خواہش سے مولانا عزیر گل سے شادی کر لی۔ یہ آپ بیتی اس نیک بخت مومنہ کی ہے۔

مَیں اپنے والد چارلس ایڈورڈ اسٹیفورڈ اسٹیل کی ساتویں لڑکی ہوں۔ مَیں ۱۸۸۵ء میں حیدر آباد سندھ میں پیدا ہوئی۔ میرے والد صاحب انصاف پسند اور بات کے پکے انسان تھے۔ انہیں ہندوستان اور ہندوستانی لوگوں سے بڑا لگاؤ تھا۔ کبھی کبھی تو وہ خود کو سندھی کہہ دیا کرتے تھے۔ ہماری خاندانی نسبتیں بڑی عظیم تھیں مگر ہمارے والد کا کہنا تھا کہ شرافت کا معیار کردار ہے نہ کہ خون' بہر حال مَیں چھ سال کی ہی ہوں گی کہ مجھے تعلیم کے لئے انگلستان بھیج دیا گیا۔ مجھے سچی بات سے ہمیشہ سے پیار رہا۔ مَیں ہر بات کا سبب کھوجنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔

مَیں ایک عیسائی کنبے میں پیدا ہوئی مگر عیسائی کسی ایک عقیدے میں بھی متفق نہیں ہیں۔ عیسائیوں کے بہت سے فرقے ہیں جو ایک دوسرے کو جہنمی قرار دیتے ہیں' اس لئے عیسائی مذہب مجھے گورکھ دھندا سا لگا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ حضرت عیسیٰ خدا کے بیٹے کیسے ہو سکتے ہیں۔ مگر مجھے دعا سے بڑا شغف تھا اور مَیں اکثر ان دیکھے مالک سے لو لگا کر دعائیں کرتی رہتی تھی۔ جب مَیں جوان ہو گئی تو مَیں نے بائبل کو تنقیدی نظر سے پڑھنا شروع کیا۔ مجھے بائبل کے بہت سے بیانات ایک دوسرے سے متضاد محسوس ہوئے۔ مجھے

بائبل کے کلامِ خدا ہونے میں شک ہونے لگا۔

کچھ عرصہ بعد میری شادی ہو گئی' مگر میرے شوہر ایک دنیادار عیسائی تھے۔ وہ میرے فکر و خیال کے ساتھی نہ بن سکے' اس لئے مَیں نے فرصت کے وقت میں فلسفہ کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا مگر ان خیالی بھول بھلیّوں سے مجھے کچھ نہ ملا۔

انہی دنوں مَیں اپنے والد کے پاس ہندوستان آئی۔ میری ۱۲ سالہ لڑکی اور ۱۰ سالہ لڑکا میرے ساتھ تھے۔ یہاں مجھے ویدانت [1] پڑھنے کا موقع ملا۔ مجھے اسُ کے پڑھنے سے بڑی تسکین ملی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ چیز مل گئی جس کی مجھے تلاش تھی۔ ویدانت کے مطالعے نے مجھے ہندو دھرم کے قریب کر دیا' مَیں کچھ عرصہ کے لئے ایک ہندو خانقاہ میں مہمان بن کر رہی اور بالآخر ہندو ہو گئی۔ مجھے راما کرشن کے ویدانتی سلسلے میں داخل کر لیا گیا' مگر مجھے یہ شرک سا محسوس ہوا' چنانچہ میرا الیقین مل گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ حقیقت ابھی اور آگے ہے۔

مَیں اسی زمانے میں بیمار ہو گئی اور مجھے علاج کے لئے فرانس جانا پڑا۔ وہاں میرے سات آپریشن ہوئے۔ ہر آپریشن پر موت سامنے کھڑی نظر آتی تھی۔ مَیں چاہتی تھی کہ مَیں موت کے لئے تیاری کر لوں۔ مَیں نے سوچا کہ دنیا ترک کر دوں اور آخرت کی تیاری میں لگ جاؤں۔ لہٰذا واپس جب ہندوستان آئی تو مَیں نے سنیاس لے لیا۔ میں نے ایک سو آٹھ اپنشد پڑھے' لیکن یہ کیا......؟ یہاں بھی بائبل کی طرح کے ان گنت تضاد تھے۔ ان میں کون سی بات حق ہے اور کون سی غلط ہے' یہ کیسے معلوم ہو؟ مَیں ایک بار پھر الجھ گئی۔ مجھے خوف ہو گیا کہ اسی ذہنی الجھن میں کہیں پاگل نہ ہو جاؤں۔ مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ سنیاس سے میری روحانیت نہیں بڑھ رہی ہے بلکہ نفسیاتی کشمکش میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اسی زمانہ میں ہندوستان میں عدم تعاون کی تحریک چل پڑی۔ ہندوستانی ہندوستانیوں سے لڑ پڑے۔ الموڑہ بھی فسادات سے بچا نہ رہا۔ اس وقت میرے دل نے کہا یہ خانقاہ میں بیٹھ کر دھیان گیان کا وقت نہیں ہے بلکہ باہر نکل کر زخمیوں اور دُکھیوں کی مدد کرنے کا وقت ہے۔ مَیں نے اپنے گرو جی سے یہ بات کہی مگر انہوں نے کہا کہ ہم لوگ دنیادار نہیں ہیں۔ تم جن

---

[1] ویدانت ہندوؤں کے فلسفے اور مذہبیات کا ایک نظام ہے جس میں خدا پر بحث کی گئی ہے۔

باتوں کے کرنے کو کہہ رہی ہو وہ سیاست کی باتیں ہیں۔ ہم ان باتوں میں نہیں پڑتے۔

مجھے ان کے سوچنے کے اس انداز پر حیرت ہوئی۔ میں انہیں تو خانقاہ چھوڑ کر زخمیوں کی مدد پر آمادہ نہ کر سکی' مگر خود خانقاہ سے نکل آئی۔ میں نے زخمیوں' مریضوں اور دکھیوں کی امداد کی۔ اس سے دل کو چین ملا اور میں نے طے کیا کہ روحانی ترقی انسانیت کی خدمت کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے' خانقاہوں کی زندگی سے نہیں۔ چنانچہ میں نے ایک آشرم کھولنے کا فیصلہ کیا' جس میں نوجوان لڑکوں کی اخلاقی تربیت کی جائے۔ اس آشرم میں' میں نے ہندو مسلمان کی قید نہیں رکھی۔ وہاں ایک مسلمان لڑکا داخلے کے لئے لایا گیا۔ یہ لڑکا اپنے والدین کے لئے ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ میں نے سوچا جب تک میں مسلمانوں کے نظام حیات کے بارے میں معلومات حاصل نہ کروں' میں اس لڑکے کی تربیت کا حق ادا نہ کر سکوں گی۔ اس نیت سے میں نے قرآن پڑھنا شروع کیا۔

اب تک میں مسلمانوں سے ڈرتی تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ مسلمان ایک قسم کے ''ڈاکو'' ہوتے ہیں جو ہر قسم کا ظلم کر سکتے ہیں، لیکن اس کتاب نے میری آنکھیں کھول دیں۔ یہ تو سراسر حق تھا اور دل میں اترتا چلا جاتا تھا۔ یہ عملی ویدانت تھا۔ آہ! میں اب تک کن اندھیروں میں بھٹک رہی تھی۔ افسوس کہ یورپی مستشرقوں نے اسلام کی کتنی غلط تصویر پیش کی ہے۔ وہ مذہب جسے میں خونخوار بھیڑیوں کا مذہب سمجھتی تھی، مکمل سچائی کا دین تھا۔ ''میرے خدا میں اب کیا کروں' میں نے تو ساری زندگی اکارت کر دی'' میں نے سوچا میں ہندو ہی رہوں یا ہندومت کو چھوڑ دوں۔ میں نے راہبانہ زندگی اختیار کر لی تھی۔ یہ ایک طرح کی موت تھی۔ قرآن مجھے زندگی کی طرف بلا رہا تھا۔ ایسی زندگی کی طرف جو آخرت کی زندگی کی بنیاد بنتی ہے، مگر مشکل یہ تھی کہ میں ایک مقدس خانقاہ کی راہبہ تھی۔ لوگ مجھے پیار سے ماں کہتے تھے۔ میں مسلمان ہو جاؤں گی تو دنیا کیا کہے گی؟ مگر مجھے اپنی روح کو خلجان سے بچانا تھا۔ میں نے لوگوں کے کہنے کی پروا نہ کی۔ میں نے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔

میرے گرو بھائی بڑے دہشت زدہ ہوئے' مگر میں نے انہیں خلوص سے بتایا کہ اصل ویدانت یہ ہے جو میں قبول کر رہی ہوں۔ میرے گرو بھائیوں نے کہا کہ یہ کام

مسلمان ہوئے بغیر بھی جاری رہ سکتا ہے۔ ویدانتی رہ کر بھی تم قرآن کی راہ اختیار کر سکتی ہو۔ یہ بھی ویدانت کا ہی ایک سلسلہ ہوگا' لیکن یہ بات میرے دل میں نہ اتر سکی۔ میں سمجھ رہی تھی راما کرشن نے حقیقت کا راستہ نہیں اختیار کیا تھا بلکہ وہ خود ان کے ذہن کی اپج اور ایک بھرم تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی نام نہاد صوفی نے انہیں یہ بھرم دلا دیا ہو۔ میرے ہندو دوستوں نے مجھ سے کہا کہ میں اپنے آپ کو مسلمان نہ کہوں تو وہ مجھے آگرہ میں راما کرشن مشن کا مہنت بنا دیں گے' مگر مجھے دنیاوی لالچ نہ تھا مجھے روح کے آرام کی ضرورت تھی' اس لئے میں نے ان کی بات کو رد کر دیا۔

اب ایک اور مشکل پیش آئی۔ مسلمانوں نے مجھے مسلمان ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ ہمیں ہندو بنانے کے لئے نیا روپ دھارن کر رہی ہے۔ میں خود شبہے میں پڑ گئی۔ میں قرآن کو اپنا ہادی اور راہنما مان رہی تھی تو کیا یہ بات مسلمان ہونے کے لئے کافی نہ تھی۔ اپنے دل کی بے قراری کو دور کرنے کے لئے میں دیوبند گئی۔ میری بیٹی میرے ساتھ تھی۔ ہم دونوں بے پردہ تھیں۔ ہم نے مولانا حسین احمد مدنی سے ملاقات کی۔ اپنی بات ان کے سامنے رکھی اور پوچھا "کیا ہم مسلمان نہیں؟"

"تم حقیقتاً مسلمان ہو"! مولانا نے ایک زوردار قہقہہ لگا کر کہا "تمہیں اس میں شک کیوں ہے؟"

مولانا حسین احمد صاحب کی عظمت ہم دونوں کے دل میں بیٹھ گئی۔ انہوں نے ہماری بہت خاطر کی۔ بعد کو وہ ایک بار مجھ سے ملنے بنگلور بھی آئے تھے۔ انہی کے ساتھ مولوی عزیر گل بھی تھے۔ مولانا حسین احمد انہیں بہت چاہتے تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ دو دوست لڑکے ہوں۔ وہ ایک دوسرے سے معصوم مذاق کرتے' ایک دوسرے کی ہنسی اڑاتے اور کبھی کبھی ایک دوسرے کو چڑاتے بھی تھے۔ مجھے ان کی محبت پر رشک محسوس ہوتا۔

وہ دن بھر ہمارے پاس رہے۔ جب وہ چلنے لگے تو میں نے مولانا حسین احمد صاحب سے کہا کہ وہ پھر تشریف لائیں۔ اس پر انہوں نے کہا میں تو زیادہ نہ آسکوں گا مگر عزیر گل کبھی کبھی آیا کریں گے۔ چنانچہ مولوی عزیر گل صاحب آتے رہے۔ میں ان سے پردہ اور دوسرے مسائل پر بلا جھجک بات چیت کرتی رہی۔ شروع میں یہ سمجھتی تھی کہ یہ مولوی بڑے تنگ

نظر ہوتے ہیں مگر بعد کو پردے کی حقیقت مجھ پر کھلی تو میں ان کی وسعتِ نظر کی قائل ہوگئی۔
یہاں میں اسلام کے مطالعہ میں لگی ہوئی تھی کہ اچانک میرے شوہر کا خط آیا کہ اگر میں فوراً انگلستان نہ لوٹی تو وہ مجھے خرچ دینا بند کر دیں گے۔ بچوں کی تعلیم کا خرچ مجھ سے وصول کریں گے اور مجھ سے تعلق توڑ لیں گے۔ اس پر مجھے تعجب ہوا نہ افسوس۔ میں مسلمان ہو چکی تھی اب میں کسی عیسائی شوہر کی بیوی کیسے رہ سکتی تھی۔ رہا رزق تو یہ اللہ کی دین ہے' کم یا زیادہ ملے گا ہی۔
عزیز گل صاحب کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے میرا ہاتھ تھامنے کی پیشکش کو قبول کر لیا۔ میں جانتی تھی کہ ان کے یہاں غربت ہے' افلاس ہے' پردہ ہے' مگر میرے لئے تو یہی اللہ کی پسندیدہ جگہ تھی۔ عزیز گل کے گھر میں مجھے زندگی کی حقیقی راحت ملی۔ وہ نہایت شریف اور مہربان شوہر ثابت ہوئے۔
یوں بھی وہ سیّد ہیں اور انہوں نے سیادت کی لاج رکھی ہے۔ ان کے اجداد عرب سے افغانستان اور افغانستان سے ہندوستان آئے تھے اور راہِ حق کی مسافرت میں مشرق و مغرب کے لئے ہماری راہ ایک تھی۔ ہماری منزل ایک تھی۔ ہماری روحیں ہم آہنگ تھیں۔ ہم دونوں اللہ کے پیارے نبی ﷺ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کا ارادہ لے کر اٹھے تھے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس راہ میں میری بیٹی' میرا بیٹا اور میرا بھائی سب مجھ سے ہمدردی کرتے رہے۔ انہوں نے مجھے حق کی راہ میں قدم بڑھانے سے روکا نہیں۔ میری زندگی کا ایک سفر ہے' وہ ''برسوں کی محرابوں'' سے گذر کر اسلام کی حسین وادی میں ختم ہو رہا ہے۔

بشکریہ ''الفرقان'' لکھنؤ

''ایشیا'' لاہور۔

●……●……●

پیکی راڈرک

(ہندوستان)

میں ہندوستان میں برطانوی راج کے دوران ایک اینگلو انڈین خاندان میں پیدا ہوا۔ میں نے ابتدائی تعلیم ایک مشن اسکول میں حاصل کی جہاں مذہب پر بطور خاص توجہ دی جاتی تھی۔ میں مسیح علیہ السلام کی زندگی سے بہت متاثر ہوا' مگر ابتدا ہی سے مجھے احساس ہونے لگا کہ انجیل کی تعلیمات انسانی فطرت اور حقیقت کے برخلاف ہیں۔ چنانچہ اگر ہم انھیں بروئے کار لائیں تو انسانی تہذیب کا جنازہ نکل جائے۔ اس ضمن میں ذیل کی مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

''اگر کوئی میرے پاس آئے اور اپنے آپ اور ماں اور بیوی اور بچوں اور بھائیوں اور بہنوں بلکہ اپنی جان سے بھی دشمنی نہ کرے تو میرا شاگرد نہیں ہو سکتا'' (لوقا ۱۴۔۲۶)

''پس اسی طرح تم میں سے جو کوئی اپنا سب کچھ ترک نہ کرے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا''۔ (لوقا: ۱۴۔۳۳)

''کیونکہ بعض خوجے ایسے ہیں جو ماں کے پیٹ ہی سے ایسے پیدا ہوئے اور بعض خوجے ایسے ہیں جن کو آدمیوں نے خوجہ بنایا اور بعض خوجے ایسے ہیں جنھوں نے آسمان کی بادشاہی کے لئے اپنے آپ کو خوجہ بنایا جو قبول کر سکتا ہے وہ قبول کرے۔''[1] (متی: ۱۹۔۱۲)

''لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرو بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اسی کی طرف پھیر دے اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کرتہ لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لے لینے دے اور کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے اس کے

---

[1] خوجہ: خواجہ کا مخفف' یعنی مالک' سردار' آقا۔

ساتھ دو کوس چلا جا''۔ (متی: ۵۔ ۲۹۔ ۴۱)

ظاہر ہے یہ تعلیمات یا تو خانقاہوں میں رہنے والے راہبوں کے لئے ہو سکتی ہیں یا تارک الدنیا صوفیوں کے لئے، روزمرہ کی زندگی سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی مرد یا عورت اپنے معمولات میں ان کی اتباع کر سکتا ہے۔ چنانچہ عہدِ حاضر میں اگر کوئی حکومت ان ''اصولوں'' کے مطابق قانون سازی کرے اور افراد اپنی زندگی میں ان پر عمل کریں تو ہر طرف لاقانونیت اور افراتفری کا سماں پیدا ہو جائے گا۔

دوسری چیز جس پر مجھے کسی طرح اطمینان نہیں ہوتا تھا وہ عیسائیت میں مذہب اور سیاست کی تفریق ہے۔ اسی نظریے نے یورپ میں میکاویلین نقطۂ نظر (دھونس، دھاندلی اور دھوکے کی سیاست) پیدا کیا۔ بائبل کے مطابق یسوع مسیح نے کہا تھا:

''یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں میں صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں''۔ (متی: ۱۰۔ ۳۴)

چنانچہ اس نے اپنے شاگردوں کو ہدایت کی۔

''جس کے پاس تلوار نہ ہو وہ اپنی پوشاک بیچ کر تلوار خریدے'' (لوقا: ۲۲۔ ۳۶)

مگر خرابی یہ ہوئی کہ عیسائیوں کو تلوار کا جائز استعمال نہ سکھایا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے پیروکاروں کے ہاتھ میں ہمیشہ ہی تلوار نظر آتی ہے۔ یہی تلوار تھی جس کا صلیبی جنگوں میں بار بار استعمال کیا گیا اور غیر مسیحی علاقوں میں بے گناہ انسانوں کو بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ یہاں تک کہ ایک مسیحی فرقے نے دوسرے مسیحی فرقے کا بے دریغ قتلِ عام کیا۔ پھر سامراجی طاقتوں نے بھی چرچ کی مقدس اشیرباد کے ساتھ تلوار اٹھائی اور ایشیا اور افریقہ میں قتل و غارت گری اور ہمہ نوع استحصال کی حد کر دی حتیٰ کہ نیوزی لینڈ، آسٹریلیا اور شمالی امریکہ کے قدیم باشندوں کو بالکل ہی ملیا میٹ کر دیا۔ میری زندگی میں فیصلہ کن موڑ اس وقت آیا جب ۱۹۴۵ء میں امریکیوں نے جاپان کے شہر ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے۔ لاکھوں کی تعداد میں مرد، عورتیں اور بچے لقمۂ اجل بن گئے۔ جبکہ ان گنت تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو بدقسمتی سے موت کے منہ سے تو بچ گئے تھے مگر ناقابلِ تصور اذیتوں اور عقوبتوں میں مبتلا ہو کر رہ گئے تھے۔ میرا دل خوف سے بھر گیا اور اس

واقعہ کے بعد میں کئی راتوں تک اطمینان کی نیند نہ سو سکا۔ پھر جب میں نے پڑھا کہ امریکی فوجیوں نے جاپان میں کیا کہرام مچایا ہے تو مجھے شدید نفرت کے احساس نے گھیر لیا اور اس وقت تو میرے جذبات میں آگ لگ گئی جب میں نے سنا کہ جنرل میکارتھر کی سرپرستی میں عیسائی پادریوں کے غول جاپانی جزیروں پر اتر آئے ہیں تاکہ مقامی باشندوں کے ضمیر خرید کر انہیں عیسائی بنائیں اور ان سے جاسوسی کا کام لے سکیں۔ سامراجی طاقتوں کی ہمیشہ سے یہی چال رہی ہے۔ وہ لالچ دے کر مقامی لوگوں میں سے ایک طبقے کو عیسائی بناتے ہیں اور پھر یہ طبقہ اپنی قوم سے غداری کر کے سفید فام آقاؤں کی حاشیہ برداری کرتا ہے۔

جب میں کالج میں پڑھتا تھا تو مختلف عقیدوں کے مردوں اور عورتوں سے میرا تعارف تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ تمام غیر عیسائی لوگ کافر اور گمراہ ہیں، مگر میں ان لوگوں کے قریب آیا اور غور سے ان کے رہن سہن اور نظریات کا مطالعہ کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ کافر لوگ اور غلط مذاہب عیسائیوں اور عیسائیت کے مقابلے میں کہیں زیادہ رواداری، مروت اور احترام انسانیت کے قائل ہیں۔ میرے دل میں ان مذاہب کے لئے خوشگوار جذبات پیدا ہونے لگے۔ خصوصاً ایک مسلمان میرا بہت گہرا دوست تھا۔ اس نے مجھے اپنے عقیدے کے بارے میں ضروری تفصیلات بتائیں تو میں نے بہت جلد یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ عیسائیت کے مقابلے میں اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو انسانی فطرت اور عقل کو مطمئن کرتا ہے۔ خاص طور پر اسلام میں توحید کا عقیدہ تثلیث کی نسبت عقل و شعور کے ذریعے خدا سے جوڑتا ہے اور یہ عین عقلی بات نظر آتی ہے، مگر عیسائی ہر دوسرے مذہب کو کفر سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسلام کی اخلاقی تعلیمات مثالی نوعیت کی ہیں جن کو اختیار کر کے ایک انسان بھرپور قسم کی دنیاوی زندگی گزارنے کے باوجود اللہ کے قریب بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں مذہب اور سیاست میں کوئی تفریق نہیں چنانچہ وہ اصول جو ایک انسان اپنی انفرادی زندگی میں بجا لاتا ہے انہی کو ایک حکومت عوام سے معاملہ کرتے ہوئے بروئے کار لائے گی اور وہی اصول ایک ریاست کو دوسری ریاستوں سے تعلقات استوار کرتے وقت کام دیں گے۔ اس طرح اسلام میں کسی ناانصافی یا استحصال کی کوئی گنجائش نہیں نہ نوآبادیاتی نظام، سامراجیت، طبقاتی کشمکش یا غیر منصفانہ اور جارحانہ جنگوں کی کہیں اجازت ہے۔ ظاہر ہے جب تک بنی نوع انسان ایک ہی

جامع اور منصفانہ نظام کے تحت نہیں آجاتے' دفاع کی ضرورت اور افادیت اپنی جگہ برقرار رہے گی' مگر اسلام کے قانونِ صلح و جنگ میں فطری اور انسانی مفاد میں ہیں۔

اسلام کا نظریۂ جہاد عورتوں' بچوں' بوڑھوں اور نہتوں کی حفاظت کرتا ہے۔ یہاں ہسپتالوں' سکولوں' عبادت گاہوں اور رہائشی مکانوں پر بمباری کی کہیں گنجائش نہیں۔ اسلام صرف انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دینے کے لئے لڑتا ہے یا پھر اس وقت تلوار اٹھاتا ہے جب تبلیغ دین کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کی جائیں یا دشمن جارحیت پر اتر آئیں۔ مگر یہاں کسی غیر مسلم کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جاتا نہ وہ کسی سامراج کے مظلوم و بے سہارا عوام پر ظلم و ستم کو برداشت کرتا ہے۔ مسلمان ہر وقت جنگ بندی اور صلح پر تیار رہتا ہے۔ خواہ دشمن اس بہانے انہیں دھوکا ہی کیوں نہ دے رہا ہو۔ اسلام امن و آشتی کا مذہب ہے۔ اسلام میں سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ خلقِ خدا کی خدمت کی جائے اور ان کی مشکلات کا مداوا کیا جائے چنانچہ ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کون سا عمل سب سے اچھا ہے تو آپؐ نے فرمایا'' کسی انسان کا دل خوش کر دینا' بھوکے کو کھانا کھلانا' مظلوم کی دادرسی کرنا' کسی پریشان حال کا دکھ بانٹ لینا اور کسی زخمی کا علاج معالجہ کر دینا''۔

میں اسلام کے نظریۂ اخوت سے بے حد متاثر ہوا ہوں جو رنگ' نسل اور قبیلے کے امتیازات سے بلند ہو کر سب کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔ اسلام میں سب لوگ برابر ہیں اور مساوات کا یہ عمل بین الاقوامی اور عالمگیر ہے۔ اسلام نے عملی طور پر انسانوں کے درمیان حائل خلیجوں کو پاٹ دیا ہے اور صحیح معنوں میں بنی نوع انسان کو خدا کا کنبہ بنا دیا ہے جیسا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

'' اللہ کی ساری مخلوقات اس کا کنبہ ہے اور خدا کو وہی سب سے زیادہ محبوب ہے جو اس کے کنبے کے ساتھ بھلائی سے پیش آتا ہے''۔

(یہ تفصیلات انگریزی پندرہ روزہ ''یقین'' ۲۲ نومبر ۱۹۶۸ء سے ترجمہ کی گئی ہیں)

●......●......●

تھامس اِروِنگ

(کینیڈا)

قبولِ اسلام سے قبل اور بعد میں مَیں جس قسم کے ذہنی و جذباتی تجربے سے گزرا ہوں اسے بیان کرنے سے پہلے یہ بتاؤں کہ کینیڈا اور امریکہ کے ہزاروں نوجوان اسی قسم کے خیالات سے گزر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر مناسب اور موثر طریقے سے وہاں اسلام کا پیغام پہنچا دیا جائے تو وہ اسے قبول کرنے کے لئے بس موقع اور بہانے کی تلاش میں ہیں۔

جہاں تک اسلام قبول کرنے کی داستان کا تعلق ہے' مجھے بچپن کا وہ زمانہ ابھی تک یاد ہے جب مَیں عیسائی عقیدے کے مطابق حضرت مسیح کی زندگی کے حالات دہرایا کرتا تھا' لیکن یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں ہمیشہ راسخ العقیدہ عیسائی رہا ہوں۔ لڑکپن میں اگرچہ میں بائبل کی کتنی ہی کہانیوں کو اپنے ذہن میں اتار چکا تھا لیکن یہ سوچ کر اکثر حیرت میں ڈوب جاتا کہ بائبل پڑھنے کے باوجود لوگ عموماً مذہب سے دور کیوں ہیں؟ ایک ہی کتاب یعنی بائبل کے بارے میں عیسائیوں اور یہودیوں کا نقطۂ نظر اس قدر مختلف کیوں ہے؟ پھر گمراہ اور بے دین لوگوں کو کیوں ملامت کی جاتی ہے' جبکہ وہ بائبل ہی کے بقول پیدائشی گنہگار ہیں اور اس میں ان کا کوئی قصور نہیں؟ یہ خیال بھی عموماً تنگ کرتا کہ عیسائی اور یہودی اپنے آپ کو دیگر ساری قوموں سے افضل و برتر سمجھتے ہیں' مگر یہ نیکی اور خدا ترسی پر کاربند کیوں نہیں ہوتے؟

اسی زمانے کا ذکر ہے۔ ہندوستان سے ایک پادری واپس کینیڈا آئے تو انہوں نے نہایت بیزاری سے فرمایا وہاں ''محمڈن'' لوگ اپنے مذہب پر سختی سے کاربند ہیں اور ان پر

ہمارا کوئی جادو نہیں چلتا۔ اسلام سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔ میں چونک اٹھا' تحسین کا بے اختیار جذبہ تھا جو ان لوگوں کے لئے لاشعور میں پیدا ہوا' جو آج بھی اپنے مذہب پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ بغیر جانے بوجھے دل میں اسلام کیلئے نرم گوشہ بیدار ہو گیا اور تمنا کروٹیں لینے لگی کہ اس مذہب کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں، اور یہ تمنا اس وقت پوری ہوئی جب میں نے یونیورسٹی میں جا کر مشرقی لٹریچر کا مطالعہ شروع کیا۔ خدا کا تصور اپنی مکمل صورت میں اختیار کرنے کے لئے انسان کوشش اور ترقی کے جن مختلف مرحلوں سے گزرا ہے ان سے واقفیت ہوئی تو ذہن کی گرہیں کھلنے لگیں۔

حضرت مسیح نے ایک شفیق وحلیم خدا کا تصور دیا تھا مگر میں نے دیکھا کہ یہ نظریہ توہم پرستانہ عبادت کے گرد وغبار میں گم ہو کے رہ گیا ہے اور بت پرستی نے اس کا اثر زائل کر دیا ہے۔ کہاں ایک طرف یہ یقین دہانی کہ خدا رحیم وکریم ہے اور انسانوں سے محبت کرتا ہے اور کہاں چرچ کا یہ عمل کہ بغیر زبردست سفارش اور واسطے کے کوئی انسان اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ ذہن میں یہ بات پختہ ہو گئی کہ عیسائیت خدا کا سچا مذہب نہیں۔ ضرورت کسی ایسے نظریے کی ہے جو مبنی برحق ہو اور انسانوں کو خدائے واحد کی طرف لے جانے کی طاقت رکھتا ہو۔ اس مقصد کی خاطر میں نے اسلام کا مطالعہ شروع کیا تو حیرت انگیز انکشافات ہوئے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عیسیٰ کے سات سو سال بعد اس وقت خدائے واحد کی دعوت دی جبکہ پورا یورپ نیم وحشی حالت میں زندگی گزار رہا تھا۔ مریم وعیسیٰ کی پرستش ہو رہی تھی اور عقل وشعور پر مبنی کوئی تحریک ابھی نو سو سال کی دوری پر کھڑی تھی۔ اس عالم میں حضرت موصوف نے دنیا کو نیا پیغام دیا' عقل وفکر کی تائید اس کی پشت پر تھی' اور واقعی اس دعوت نے تاریخ میں ہمہ نوع انقلاب برپا کر دیا۔

اس زمانے میں میں نے اسلام کے بارے میں بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ بمبئی کے ایک سماجی کارکن جیراز بھائی (مرحوم) نے مجھے H.W. LOVE GROVE کی کتاب What is Islam بھجوا دی۔ میرے نزدیک یہ کتاب اسلام کے عملی پہلوؤں اور انسانی زندگی پر اس کی برکات کی بہترین شارح ہے۔ پھر مرحوم نے مجھے مولوی محمد علی کا ترجمۂ قرآن مجید اور کئی دیگر کتابیں بھی مہیا کیں۔ مونٹریال میں میں نے فرانسیسی زبان میں

اسلام پر بہت سالٹریچر پڑھ ڈالا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے سارے سوالوں کے جواب مل گئے اور ذہن میں کوئی شک یا وسوسہ باقی نہ رہا۔

بالآخر میں اس یقین تک پہنچ گیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے سچے نبی تھے اور ان کی زبردست ضرورت بھی تھی۔ میں نے اب تک جو نتائج اخذ کئے تھے مکمل طور پر اختیاری نوعیت کے تھے اور علم وعقل ان کی صداقت پر گواہی دیتے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ قرآن پاک کا تقدس و پاکیزگی میں ڈوبا ہوا انداز اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حد درجہ نفیس تعلیمات نے میرے دل پر ہجوم کر لیا اسلام آفتاب سے زیادہ روشن ہو کر میرے سامنے آگیا اور میں نے اسے قبول کر لیا۔

●......●......●

راجکماری جاوید بانو بیگم

(ہندوستان)

کلکتہ کی مشہور نو مسلم خاتون محترمہ جاوید بانو بیگم بنگال کے ایک ہندو راجہ کی صاحبزادی تھیں۔ اعلیٰ تعلیم کی حامل تھیں۔ انہوں نے کامل تحقیق کے بعد اسلام قبول کیا اور اس سلسلے میں بہت سی تکلیفیں برداشت کیں۔ ذیل کی تقریر انہوں نے قبول اسلام کے بعد کلکتہ کے ایک جلسے میں کی:

برادرانِ اسلام و خواہرانِ دین! میں ایک نو مسلمہ ہوں اور... ایک سچے اور عالمگیر مذہب اسلام کو پا کر بہت ہی خوش ہوئی ہوں۔ میرا دل حقیقی خوشی سے لبریز ہے اور میری دلی آرزو ہے کہ میں ہر انسان سے جس تک میری رسائی ہو' اپنے آقائے نامدار محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ اخلاق اور تعلیمات کا ذکر کروں۔

شاید آپ میرے تجربات کا مختصر خلاصہ جو مجھے تحقیق مذاہب کے سلسلہ میں پیش آئے سن کر مسرور ہوں گے۔ میں ہندو والدین کے گھر پیدا ہوئی' مگر ہماری پرورش عیسائی اثر کے تحت ہوئی۔ ہندو مذہب کی مطلقاً کوئی واقفیت نہ تھی۔

میں نے ۱۹۲۴ء میں مذہب اور فلسفہ کا وسیع طور پر مطالعہ شروع کیا۔ میں ان کا مطالعہ عالم فاضل بننے کے لئے نہ کرتی تھی بلکہ تحقیقِ حق میرا منشا تھا۔ میرے دل میں خدا تعالیٰ کے ایک مخلص اور صادق بندے کی طرح عبادت کرنے کی تڑپ پیدا ہوئی تھی۔ میں نے بدھ مذہب کو سمجھنے کی کوشش کی لیکن ناکامی کا سامنا ہوا۔ عیسائیت کی طرف' جو مجھے میں نہایت سیدھی سادی معلوم ہوئی' رجوع کیا۔ اس سلسلے میں میں نے عیسائی پادریوں سے رابطہ قائم کیا' تاہم مجھے کوئی ایسا راستہ نہ ملا جس سے میں دورِ حاضر میں عیسائیت کی ایک

مخلص اور صادق متبع بن سکوں۔ گو بڑے بڑے دلائل و براہین پیش کئے جاتے تھے لیکن میں عیسائی گرجوں کی لاتعداد فرقہ بندیوں میں ذاتی اغراض اور شخصی مطلب کے سوا اور کچھ نہ دیکھ سکی اور بالکل ناامید ہو کر دوبارہ ہندو مذہب اختیار کر لیا۔ کیونکہ ویدوں کا فلسفہ ایک ایسے دماغ کے لئے جو مذہب کی کمزوریوں سے مضطرب اور متفکر ہو چکا ہو' ایک کافی و شافی سہارا تھا۔ لیکن ویدوں کی فلاسفی بھلا کسی کے لئے بھی کیسے مفید ہو سکتی ہے کیونکہ جہاں تک عملی زندگی اور حقائق کا تعلق ہے' ہندو منوجی مہاراج کے زمانہ سے لے کر آج تک ویدانت سے اتنے ہی دور ہیں جتنا کہ اس فرضی مخلوق سے جس کا چاند میں ہونا عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ ویدوں کی پیروی کے لئے ایک ہندو پر لازم ہے کہ یا تو وہ موجودہ ہندو مذہب سے کنارہ کش ہو جائے یا تمدنی مصلح بن کر ان بے شمار فرقوں میں ایک اور فرقہ کا اضافہ کر لے جس کے اندر زمانہ حال میں ہندوستان ڈوبا جا رہا ہے۔ ہندوؤں کی حالت قابل رحم ہے۔ بڑی خامیاں اور نقائص روز افزوں ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ ان پر دوسرے مذاہب کے پیروکار ہی تنقید نہیں کرتے بلکہ ہندو خود ان کو آشکارا کرتے رہتے ہیں۔ گاندھی مہاراج ہریجنوں کے لئے اپنی زندگی کو مہلک خطروں میں کیوں ڈالتے ہیں؟ مجلس قانون کے ذریعہ بیوگان کی شادی کو جائز کیوں قرار دیا گیا ہے؟ سلطنت برطانیہ کے ایک قانون کے تحت رسم ستی کو کیوں روکا گیا؟ تمام تمدنی اصلاحات کو مجالس قوانین ساز کے ذریعہ کیوں دائرۂ عمل میں لایا جاتا ہے؟ اس مذہب کا فائدہ ہی کیا جو دماغی نشوونما اور تمدنی اصلاحات کے بغیر اپنے پیروکاروں کو عام برائیوں سے محفوظ رکھنے سے عاجز ہے۔

مندرجہ بالا حقائق سے آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ مجھے سچے مذہب اسلام کو قبول کرنے میں کتنی خوشی ہوئی ہو گی۔ اسلام کے علاوہ اور کوئی مذہب دنیا میں ایسا نہیں جس کے عقائد کو اس کے پیروکار ایمانداری اور دیانت داری کے ساتھ صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ آخر کار میں نے صداقت کو پا لیا۔ میں بہت ہی خوش ہوں اور میری روح مطمئن ہے۔ کیا ہم آج کسی ایسی مذہبی یا تمدنی اصلاح کے درپے ہیں جس کی تائید قرآن پاک سے نہیں ہو سکتی؟ کیا ہمارے آقائے نامدار محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام روحانی

رہنماؤں میں ایک ایسی شخصیت نہیں جنہوں نے آزادی' اخوت و مساوات ایسے زریں اعمال بتائے ہیں جن کے ذریعے ہم صراط مستقیم پر چل کر نجات حاصل کر سکتے ہیں؟ صرف اسلام ہی دنیا میں ایک ایسا مذہب ہے جو روز مرہ کی زندگی میں ہمارا سچا رہنما ہو سکتا ہے۔ کیا دنیا میں سوائے اسلام کے ایسا کوئی مذہب ہے جس میں خدا کا نام عالمی زبان میں ہو؟ اللہ کا لفظ تمام مسلمانوں کے لئے خواہ وہ چینی ہوں یا ہندی یکساں ہے۔ السلام علیکم تمام مسلمانوں کو بھائی بھائی کا سبق دیتا ہے خواہ کسی قومیت اور کسی ملک کے ہوں اور ان کی کوئی زبان ہو۔

کیا دنیا میں کسی مذہب کی الہامی کتاب اپنی فراخدلی اور فیاضی پر ناز کر سکتی ہے سوائے ہمارے قرآن کریم کے جس میں ہر ایک مسلمان کو کہا گیا ہے کہ ان کے لئے تمام پیغمبروں پر ایمان لانا ضروری ہے؟

صرف اسلام ہی انصاف وانسانیت اور آزادی کا مذہب ہے جس کی مثال اور کوئی مذہب پیش نہیں کر سکتا۔ ہمیں اسلامی اصولوں کے تحت جائیداد پر قابض ہونے کے لئے کونسل و قانون کے دروازے کھٹکھٹانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ وہ تمام قوانین اب سے ۱۳ سو سال قبل ہم مسلمانوں کے لئے اتارے گئے تھے۔ آج کل مذاہب عالم جس مقصد کو اپنا نصب العین بنا کر اخلاقی' تمدنی' معاشرتی فوائد کے لئے سرگرداں ہیں وہ تمام فوائد مسلمانوں کے لئے جس دن سے قرآن مجید نازل ہوا' موجود ہیں۔

میرے لئے یہ بالکل ناممکن تھا کہ میں ایسے مذہب میں رہتی جو ہماری موجودہ اور روز مرہ کی زندگی سے کوسوں دور ہے۔ میں کس طرح ایک مخلص ہندو یا عیسائی ہو سکتی تھی جبکہ انسانی اصول اور تہذیب مجھے ان مذاہب کی تعلیمات کے بالکل مخالف کھڑا کرتے ہیں۔ اگر کوئی مذہب ہمیں روز مرہ کی زندگی میں تسکین نہیں دے سکتا تو کیوں اسے مذہب کے نام سے موسوم کیا جائے؟ یقیناً ایسے تمام مذاہب نامکمل ہیں۔ اگر ان میں ذرہ بھر بھی صداقت موجود تھی تو وہ بھی اب زمانے سے مفقود ہوتی جا رہی ہے۔ میں نے اس صورت حال کو محسوس کیا اور اس پر غور کیا تو میرے لئے اسلام قبول کرنا ضروری ہو گیا کیونکہ میں نے اس میں تمام صداقتیں دیکھ لی تھیں۔

اسلام میں ہر وہ بات پائی جاتی ہے جس کے دوسرے تمام مذاہب کے پیروکار متلاشی ہیں۔ اسلام میں وہ سب کچھ موجود ہے جو کچھ وہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں یقین واثق سے کہتی ہوں کہ کوئی دوسرا مذہب اصلاح اور خوشی کا موجب نہیں ہو سکتا' سوائے اسلام کے جو خدا کی سچی محبت' انسانیت کی سچی الفت اور حقانیت پر مبنی ہے۔ اسلام کو کسی قسم کی ترمیم کی ضرورت نہیں۔ اسلام کے بنیادی اصول وحدانیت' حقانیت اور اخوت و مساوات بے حد معقول' موثر' مفید اور فطری ہیں۔

●......●......●

سر جلال الدین لاڈر برنٹن

(انگلستان)

SIR JALALUDDIN LAUDER BRUNTON

سر جلال الدین لاڈر برنٹن آکسفورڈ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے۔ وہ انگلستان کے ایک ممتاز جاگیردار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور زبردست عزت و افتخار اور نیک نامی کے حامل تھے۔

قبولِ اسلام کی وجوہات بیان کرتے ہوئے میں اللہ تعالیٰ کا بے پناہ شکر ادا کرتا ہوں۔ آج میرا دل مسرت و انبساط کے ایسے جذبات سے بھرپور ہے جنہیں میں بیان کرنے پر اپنے آپ کو قادر نہیں پاتا۔

میرے والدین عیسائی تھے۔ وہ مجھے ابتدا ہی سے پادری بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ میں نے عیسائیت کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور فارغ ہونے کے بعد چرچ آف انگلینڈ سے وابستہ ہو گیا' لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس کام میں میں کبھی گہری دلچسپی نہ لے سکا۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد مجھے جس عقیدے نے سخت پریشان کرنا شروع کیا وہ انسان کے ازلی گنہگار ہونے کا عقیدہ تھا۔ پھر اس پر یہ تصور کہ معدودے چند افراد کے سوا باقی ساری مخلوق دائمی عذاب سے دوچار ہو گی۔ یہ نظریات اتنے مکروہ تھے اور مجھے ان سے اتنی گھن آتی تھی کہ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد میں تقریباً بے دین ہو گیا۔ مذہب کا سارا ڈھانچہ میری نظروں میں مشکوک ہو گیا۔ میں اکثر سوچتا تھا' کہ انسان خدا کا شاہکار ہے' ساری مخلوقات پر برتری رکھتا ہے' پھر اسے ازلی گنہگار قرار دینا اور ہمیشہ کے عذاب کا مستحق ٹھہرانا کہاں کی دانشمندی ہے۔ یہ تصور تو براہِ راست خالقِ کائنات پر اتہام کی حیثیت رکھتا ہے اور اس

آئینے میں تو اس کی تصویر کچھ ایسی پسندیدہ نہیں ہے۔ مَیں اگرچہ اب بھی موہوم انداز میں خدا پر یقین رکھتا تھا مگر خدا تعالیٰ کی کُنہ تک پہنچنے کے لئے مَیں نے دوسرے مذاہب کا مطالعہ شروع کیا۔

اسلام کے مطالعے کی ابتداء ہی سے یہ راز مجھ پر کھل گیا کہ یہ مذہب انسانی فطرت کے قریب ہے، شکوک و شبہات کی گرہیں کھلتی چلی گئیں اور میرے اندر سچے خدا کی عبادت اور خدمت کا جذبہ پیدا ہونے لگا۔ مَیں نے دیکھا کہ عیسائیت کے سارے عقائد کی بنیاد بائبل کی تعلیمات پر استوار بتائی جاتی ہے مگر ان میں تو زبردست تضاد پایا جاتا ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ بائبل اور حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات تحریف کا شکار ہو چکی ہیں؟ اس سوال کا جواب پانے کے لئے مَیں نے بائبل کا گہرا ناقدانہ مطالعہ جاری رکھا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ واقعی یہ کتاب تغیر و ترمیم سے محفوظ نہیں ہے اور اس میں بہت سے لوگوں کے خود ساختہ عقائد راہ پا گئے ہیں۔

اسلام کے مطالعے نے مجھے بتایا کہ انسان میں "روح" نام کی ایک غیر مرئی قوت ہوتی ہے جو کبھی نہیں مرتی۔ گناہوں کی سزا اس دنیا میں بھی ملتی ہے اور آخرت میں بھی اور اگر انسان خلوصِ دل سے توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اپنی ساری رحیمی و کریمی کے ساتھ گناہوں کو معاف کرنے کے لئے ہر وقت آمادہ رہتا ہے۔

اب مَیں نے اپنا تمام وقت صرف اسلام کے مطالعے کے لئے وقف کر دیا اور اس نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ تلاشِ حق کے لئے مَیں نے جو مطالعہ اور غور و فکر کیا وہ رائیگاں نہیں گیا اور مَیں نے اپنے اندر اس دین کے لئے بے پناہ کشش محسوس کی، یہی کشش مجھے برصغیر کے ایک شہر لاہور میں لے گئی۔ یہاں مَیں نے ایک نواحی بستی اچھرہ میں قیام کیا جہاں کی بیشتر آبادی اسلام کے ماننے والوں پر مشتمل تھی۔ میرے شب و روز انہی لوگوں کے درمیان گزرتے تھے جو جفاکش اور سادہ دل تھے اور غربت و افلاس کے باوجود صابر و قانع اور خوش و خرم تھے۔ مَیں نے ان سے اسلام کا عملی سبق لیا۔ دین داری اور بھائی چارے کا احساس یہاں کے سارے ماحول پر حاوی تھا۔ مَیں نے ان لوگوں کے ساتھ بذاتِ خود خون پسینہ ایک کیا اور خاصے عرصے تک ان کے ساتھ رہ کر ان کی عادات اور عقائد کا بغور مشاہدہ کیا۔

اب تک میں پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ عیسائی رسول عربیؐ کے شدید مخالف اور نکتہ چیں ہیں۔ بہرحال میں نے اس طرف توجہ کی اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ شروع کیا اور بہت جلد محسوس کر لیا کہ آپ حق وصداقت کا روشن مینار ہیں اور خدا تک آپ کو مکمل رسائی حاصل ہے۔ میں نے دیکھا کہ انسانیت پر اس بشر کامل ﷺ کے اتنے احسانات ہیں کہ ان کے خلاف بغض کا اظہار کرنا ظلم عظیم ہے۔ وہ لوگ جو وحشی تھے' بتوں کی پوجا کرتے تھے' جرم وگناہ اور بے حیائی میں سرتا سر ڈوبے ہوئے تھے' آپؐ نے ان کو عزت نفس' وقار' احترام انسانیت اور پاکیزگی کا درس دیا اور ان ساری صفات کے ساتھ خدائے واحد کے حضور میں لا کھڑا کیا۔ اعلیٰ انسانی قدروں نے فروغ پایا۔ شراب نوشی کا قلع قمع ہو گیا اور اسلامی معاشرہ پاکیزگی اور تقدس کی اس سطح تک پہنچا کہ تاریخ میں کہیں اس کی مثال نہیں ملتی۔ میں نے سوچا ان عدیم النظیر کارناموں کے علاوہ پیغمبر اسلام کی اپنی ذات جس قدر بے عیب اور منزہ تھی' اس کی موجودگی میں ان پر عیسائیوں کی خردہ گیری بدترین شقاوت اور سیاہ قلبی کے سوا کچھ نہیں۔ عیسائیت کے خلاف میری بغاوت لحظہ بہ لحظہ تیز ہوتی جا رہی تھی اور میں اکثر غور وفکر کی حالت میں رہتا تھا کہ ایک دن ایک مسلمان میاں امیر الدین سے میری ملاقات ہوئی۔ اسلام کے موضوع پر ان سے باتیں ہوئیں۔ میں نے بہت سے سوال کر ڈالے اور میاں صاحب نے ہر بات کا نپے تلے انداز میں جواب دیا۔ مجھے کامل اطمینان اور یکسوئی حاصل ہو گئی۔ میاں امیر الدین نے میری چنگاری کو شعلے میں تبدیل کر دیا اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ اسلام ہی دین حق اور مکمل ضابطۂ زندگی ہے تو میں نے ایک روز اس کے حلقہ بگوش ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ بحمد للہ اب میں مسلمان ہوں اور اسلام کی روحانی نعمتوں سے بہرہ ور ہوں۔ میں نے عزم کر لیا ہے کہ ان نعمتوں سے دوسری انسانیت کو بھی فیض یاب کروں گا۔ (انشاء اللہ)

●……●……●

حسین روف (انگلستان)

(HUSSAIN ROFE)

جب کوئی شخص اپنے آبائی اور نسلی مذہب کو چھوڑ کر کوئی نیا دین اختیار کرتا ہے تو اس کے پس پردہ عموماً جذباتی ' فکری یا سماجی عوامل کارفرما ہوتے ہیں، لیکن جہاں تک میری افتادِ طبع کا تعلق ہے' مَیں اس معاملے میں کبھی جذباتیت کا شکار نہیں ہوا' بلکہ خالص فکری اور سماجی بنیادیں تھیں جنہوں نے بالآخر مجھے اسلام کی آغوش میں لا ڈالا جبکہ اس سے قبل مَیں نے دنیا بھر کے تمام مذاہب کے دعاوی' الہامی کتب اور نتائج فکر کا ایک ایک پہلو کھنگال ڈالا تھا۔

میرے والد رومن کیتھولک تھے۔ جبکہ والدہ یہودی تھیں۔ تعلیم اور تربیت چرچ آف انگلینڈ کے اصولوں کے مطابق ہوئی۔ یوں بیک وقت تین مذاہب سے میرا تعارف ہو گیا۔ میری تشکیک کا آغاز اس وقت ہوا جب مَیں نے یہودیت اور عیسائیت کے عقائد کا موازنہ کیا۔ میرے وجدان نے مقدس اوتار کے تصور اور کفارے کے عقیدے کو ماننے سے صاف انکار کر دیا' بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی ذہین انسان نہ تو بائبل کے بلند آہنگ اور تہ در تہ دعاوی سے مطمئن ہو سکتا ہے نہ وہ خدا کے روایتی تصور پر مبنی چرچ آف انگلینڈ کی ان تعلیمات کو قبول کر سکتا ہے جن میں عقل و شعور پر مبنی کسی زندہ نظریۂ عبادت کا وجود نہیں۔

جہاں تک یہودیت کا تعلق ہے اگرچہ بائبل کی مختلف کتابوں میں اس کا تناسب گھٹتا بڑھتا رہتا ہے تاہم یہاں مَیں نے خدا کا خاصا باوقار تصور پایا ہے اور اس کی قدیم اصلیت ابھی برقرار ہے' چنانچہ مَیں نے یہودیت کے کئی اجزا کو قبول کر لیا مگر بعض کو یکسر مسترد کر

دیا۔ مثال کے طور پر اگر اس کے تمام اصولوں اور سفارشوں کو قبول کر لیا جائے تو دنیاوی و مادّی زندگی کے لئے بہت کم گنجائش رہ جاتی ہے۔ ثانیاً ذہن کو رسوم و روایات اور مصنوعی تصورات کے ایک لمبے سلسلے کا پابند بنانا پڑتا ہے اور سب سے بڑی قباحت تو یہ ہے کہ یہودیت ایک نسلی مذہب ہے اور محدود طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ مختلف انسانی گروہوں کے درمیان اختلافات کی خلیج وسیع کرتا ہے۔

مَیں نے چرچ آف انگلینڈ کے طریق عبادت اور تصورات کو قریب سے دیکھا تھا اور یہودیت کی مذہبی رسوم کا بغور مشاہدہ کیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرے ذہن نے دونوں میں سے کسی کو قبول نہ کیا۔ رومن کیتھولک میں' مَیں نے پُراسراریت کا غلبہ پایا اور انسانی وقار و احترام کو توہمات تلے کراہتے دیکھا۔ یہاں ایک طرف تو انسان کو پیدائشی گنہگار کہا جاتا ہے مگر دوسری طرف پوپ اور اس کے حواری معصوم عن الخطا قرار دیے گئے ہیں۔

اکتا کر مَیں نے ہندو فلاسفی کا مطالعہ شروع کیا اور اپنشد اور وید کو بنیاد بنایا' مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات یعنی کچھ چیزوں کو مَیں نے احترام کی نظر سے دیکھا مگر اکثر باتوں کو ردّ کر دیا۔ معاشرتی برائیوں کا ہندو تعلیمات کوئی حل پیش نہیں کرتیں۔ برہمن کو غیر معمولی تقدس اور ان گنت سہولتوں کا مستحق ٹھہرایا گیا ہے مگر اچھوت کو زندہ درگور کر دیا گیا ہے' کسی مذہب میں بھی انسانیؔ توہین کی وہ مثال نہیں ملتی جس کا نمونہ ہندومت میں نظر آتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ سارا الزام خدا کے سر تھوپا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق ہو رہا ہے۔

بدھ مت نے مجھے انسانی ذہن اور اس کے طریق کار کو سمجھنے میں مدد دی۔ مَیں نے اندازہ کیا کہ ضروری قسم کی قربانیاں دی جائیں تو مظاہر فطرت کا ادراک بالکل کسی کیمیائی تجربے کی طرح حاصل ہو سکتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ بدھ مت ذات پات کے نظریے کا محض ردعمل ہے۔ لیکن اس میں ان اخلاقی تعلیمات کا فقدان ہے جو ہندومت میں پائی جاتی ہیں۔ بدھ مت میں مافوق الانسان قوتیں تو حاصل ہو سکتی ہیں مگر مجھے بہت جلد پتہ چل گیا کہ ان قوتوں کا روحانیت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ سائنس کا ایک شعبہ ہے جو اخلاقیات کو سہارا تو نہیں دیتا محض اعلیٰ درجے کی تفریح کا باعث بنتا ہے۔ جذبات کو دبا دینا اور تمام

خواہشات کو تابع کر لینا یہ کام تو زینو[1] کے پیروکار بھی کرتے تھے۔ پھر بدھ ازم میں خالق کائنات کا کہیں تصور نہیں ملتا۔ محض ذاتی نجات کی خاطر تگ و دو کی جاتی ہے اور اس کا انداز بھی سراسر غیر فطری اور مصنوعی ہے۔ ٹالسٹائی کی عیسائیت کی مانند کم از کم نظریاتی اعتبار سے بدھ ازم دنیا کی رہنمائی کر سکتا تھا' مگر جس طرح عیسائیت مسیح علیہ السلام کے اقوال تک محدود ہو کے رہ گئی' اسی طرح بدھ ازم محض زبانی جمع خرچ کا ایک نمونہ بن گیا اور بس۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب کچھ مذاہب نظریاتی اعتبار سے دنیا کے لئے باعث نجات ہو سکتے تھے تو عملی میدان میں وہ ایسا کرنے سے کیوں قاصر رہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ مذاہب ایک محدود طبقے کے لئے تھے' عوام تک ان کی رسائی نہیں تھی۔ عیسائیت اور بدھ ازم کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان مذاہب کے بانیوں نے سماجی مسائل کو چھوا تک نہیں' وجہ یہ ہے کہ وہ انہیں اہمیت ہی نہیں دیتے تھے۔ مسیح اور بدھ دونوں نے ترک دنیا کی تعلیم دی ہے اور خدا کو پانے کے لئے نفی ذات کو پسندیدہ اور لازمی قرار دیا ہے۔ "وائرا گیام یعنی برائی کی مزاحمت نہ کرو' کل کی فکر نہ کرو' یا بھیک کے کشکول کی عظمت" جیسے خیالات کتنے ہی بلند کیوں نہ ہوں اور جو لوگ ان پر کاربند ہوتے ہیں ان کی کتنی ہی تعظیم کیوں نہ کی جائے مگر ان تعلیمات کی کوئی سماجی حیثیت یا اہمیت نہیں ہے کہ نہ تو ایک عام آدمی ان پر عمل پیرا ہو سکتا ہے نہ ان سے کسی غریب کسان یا مزدور کے دکھوں میں کوئی کمی ہو سکتی ہے' ان میں شاید روحانی تسکین کا کوئی پہلو تو موجود ہو' مگر سماجی فوائد کے اعتبار سے یہ بیکار محض ہیں۔

یہ بات آپ کو خاصی عجیب لگے گی کہ عرب ممالک میں رہنے کے باوجود اسلام سے میرا تعارف بس سرسری اور سطحی نوعیت کا تھا اور میں نے جتنی گہری توجہ دوسرے مذاہب پر صرف کی اسلام کا حصہ اس میں صفر کے برابر ہے۔ میں نے اس وقت تک صرف راڈویل

---

[1] (۳۳۶۔۲۶۵ قبل مسیح) زینو یونان کا ایک فلسفی جس کا نقطہ نظر یہ ہے کہ سب انسان برابر ہیں اور مثالی زندگی یہ ہے کہ کسی شخص کو کوئی پریشانی لاحق نہ ہو۔

کا ترجمۂ قرآن مجید پڑھا تھا اور اس سے کوئی خاص تاثر نہیں لیا تھا۔ معاملہ تو اس وقت آگے بڑھا جب لندن میں میری ایک بہت اچھے مسلمان مبلغ سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ غیر مسلموں کو اسلام کے قریب لانے کے لئے عرب ملکوں میں کچھ نہیں ہوا حالانکہ اگر اس سمت میں کام ہوتا تو اس کے بڑے خوشگوار نتائج سامنے آسکتے تھے۔

بہر حال میں نے مسلمان مصنفین کی کتابوں کا مطالعہ کیا اور ایک مسلمان کا ترجمہ قرآن پڑھا تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ مجھے میری منزل مل گئی ہے اور میں سالہا سال سے اسی گوہر مقصود کا متلاشی تھا۔

۱۹۴۵ء کی ایک عید کے موقع پر مجھے دعوت دی گئی کہ میں مسلمانوں کے طریق عبادت کا مشاہدہ کروں اور بعد میں ان کے کھانے میں بھی شرکت کروں۔ میں نے دیکھا کہ دنیا بھر سے مختلف رنگوں' زبانوں اور تہذیبوں کے مسلمان بھائیوں کی طرح یکجا ہیں اور ایک ہی زبان میں ایک ہی طریقے سے عبادت کر رہے ہیں۔ یہاں کسی کو کسی پر فوقیت نہیں۔ یہاں میں نے ایک ترک شہزادے کو بالکل عام لوگوں سے کھلے ملے ہوئے دیکھا۔ یہاں کسی امیر میں نہ دولت کا نشہ نظر آیا نہ اس نخوت کا مشاہدہ ہوا جو ایک انگریز اپنے سیاہ فام پڑوسی سے عموماً روا رکھتا ہے۔ یہاں مجھے کسی میں مضحکہ خیز قسم کا غرور نظر آیا نہ ریاکارانہ زہد و تقویٰ کی کوئی جھلک دیکھی۔ ساری فضا وقار' توازن اور اعتدال کا حسین امتزاج پیش کر رہی تھی۔

میں بیان نہیں کر سکتا کہ اسلام سے اس باقاعدہ اور عملی تعارف نے میرے دل و دماغ پر کیا تاثرات چھوڑے۔ یہاں مجھے وہ سب کچھ نظر آیا جو کسی بھی دوسرے مذہب میں نہیں تھا۔ آپ میری سوچوں کا اندازہ اس امر سے لگا سکتے ہیں کہ میں نے دنیا بھر کے مذاہب کا تفصیلی مطالعہ کیا مگر کسی میں کشش نظر نہ آئی مگر اسلام نے بہت تھوڑے عرصے میں مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اور میں مسلمانوں کی عظیم عالمی برادری کا باقاعدہ رکن بن گیا۔

متذکرہ بالا تصریحات سے یہ بات تو سامنے آگئی کہ میں مسلمان کیوں ہوا مگر یہ وضاحت نہیں ہوئی کہ مجھے مسلمان ہونے پر فخر کیوں ہے؟ دراصل فخر و ناز کا احساس مجھے

وقت اور تجربے نے عطا کیا۔ مَیں نے اسلامی تہذیب و ثقافت کی تعلیم ایک انگریزی یونیورسٹی میں حاصل کی۔ یہاں مجھے پتہ چلا کہ یورپ کو قرونِ مظلمہ (DARK AGE) سے نکالنے والا اسلام تھا۔ تاریخ نے مجھے بتایا کہ دنیا میں مسلمانوں نے کتنی عظیم و پُرشوکت سلطنتیں قائم کیں اور آج کے سائنسی علوم اور ایجادات دراصل اسلام کی مرہونِ منت ہیں۔ چنانچہ اب جب کوئی اظہار افسوس کرتا ہے کہ تم پیچھے کی طرف لڑھک گئے ہو تو مَیں اس کی جہالت پر مسکرا دیتا ہوں۔ مَیں اکثر سوچتا ہوں کہ یہ لوگ اسباب و علل کو کس طرح خلط ملط کرتے ہیں۔ آخر یہ اسلام کو ان عوامل کے حوالے سے کیوں دیکھتے ہیں جنہوں نے باہر سے نفوذ کیا اور غیر فطری طریقے سے اسلام کی صورت کو مسخ کرنے کی کوشش کی۔ اگر چیزوں کو جانچنے کا یہی معیار ہے تو پھر یہ لوگ نشاۃ ثانیہ کے دور کی مصوری کو کیوں در یا برد نہیں کر دیتے۔ پھر عیسائیت کو قرونِ مظلمہ اور چین کے حوالے سے خون آشامی اور بربادی و بربریت کا سمبل کیوں نہ مان لیا جائے۔ یورپ کے لوگوں کو یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ ہر دور کی منصف مزاج عظیم شخصیتوں نے اسلامی تہذیب کو بنظرِ تحسین دیکھا ہے اور اس سمندر میں ایسے موتی پنہاں ہیں جو اب بھی سارے زمانے کی تاریکیوں کو روشنیوں سے بدل سکتے ہیں۔

●......●......●

ڈاکٹر حمید مارکوس (جرمنی)

(Dr.Hamid Marcus)

ڈاکٹر حمید مارکوس ایک سائنس دان' مصنف اور صحافی کی حیثیت سے جرمنی میں خاصی شہرت وعزت کے مالک تھے۔ آپ مشہور جرمن رسالے ''مسلم ریویو'' کے ایڈیٹر بھی تھے۔

یہ میں نہیں جانتا کہ کیوں؟ مگر بچپن ہی سے میرے اندر اسلام کو سمجھنے کی لگن موجود تھی' چنانچہ دیگر لٹریچر کے علاوہ میں نے ہوش سنبھالنے پر قرآن کا توجہ سے مطالعہ شروع کیا۔ قرآن کی یہ جلد ۱۷۹۰ء میں چھپی تھی اور ہمارے آبائی قصبے کی لائبریری میں موجود تھی۔ یہ وہی نسخہ تھا جس سے مشہور جرمن مفکر گوئٹے نے اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں۔

میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا اور مسرت کے گہرے احساس سے آشنا ہوا کہ قرآن کے حوالے سے اسلام کی اپروچ سراسر منطق اور استدلال پر مبنی ہے۔ پھر اسلامی تعلیمات اپنے مزاج کے اعتبار سے فطری بھی ہیں اور حیرت انگیز حد تک مرعوب کن بھی۔ میں اس بات سے بھی بے حد متاثر ہوا کہ اسلام نے اپنے ماننے والوں میں زبردست روحانی و سماجی انقلاب پیدا کیا جس کا سلسلہ مسلمانوں کی کوتاہیوں کے باوجود اب تک چلا آ رہا ہے۔

یہ میری خوش بختی ہے کہ انہی ایام میں مجھے جرمنی میں مسلمانوں کے ہمراہ رہنے اور کام کرنے کا موقع ملا اور ان کے عادات و اطوار سے خاصا متاثر ہوا۔ ساتھ ہی میں برلن مسجد کے بانی اور جرمن مسلم مشن کے بانی سے متعارف ہوا اور قرآن پر ان کے تفسیری درس میں شریک ہونے لگا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ کئی برسوں تک میں نے اس غیر معمولی انسان کا قریب سے مطالعہ کیا۔ ان کی روحانی پاکیزگی اور جسمانی مجاہدے نے میرے

دل کی دنیا بدل کر رکھ دی اور میں نے انہی کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔

اسلام قبول کرنے اور اپنے نئے مذہب کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد جس بات نے مجھے مسرت اور حیرت سے دوچار کیا وہ یہ ہے کہ نوع انسان کے بارے میں میں غور و فکر کے بعد جن خیالات تک پہنچا تھا' اسلام نے ان کی احسن طریقے سے تکمیل کر دی۔ مجھے اس حقیقت نے بھی روحانی مسرتوں سے نوازا کہ اسلام میں خدا پر ایمان بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور اس نے ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا جسے جدید سائنس جھٹلانے کی جرأت کر سکی ہو' چنانچہ اسلامی عقائد اور سائنس کے ماڈرن نظریات میں کوئی تضاد نہیں۔ یہ صورت حال مجھ جیسے ایک ایسے شخص کے لئے لازوال نعمت کی حیثیت رکھتی ہے جو بنیادی طور پر سائنسدان ہو اور سائنسی تحقیقات کا شیدا۔ دور حاضر کے ایک انسان کے لئے اسلام کا یہ پہلو بھی زبردست افادی نتائج کا حامل ہے کہ یہ مذہب سماجی زندگی کی حد تک خشک اور بے لچک رویہ نہیں رکھتا۔ یہ زندگی کے ساتھ چلنے کا قائل ہے' بلکہ ایسے فطری اور باوقار نظام کا پرچار کرتا ہے جو پوری زندگی کو متاثر کرتا ہے۔ اسلامی قوانین جائز انسانی آزادیوں پر کوئی قدغن نہیں لگاتے بلکہ اس طرح کے رہنما اصول دیتے ہیں جو انسانی عزت و شرف اور وقار میں اضافہ کرتے ہیں۔

برسوں سے میں اس حقیقت کو دیکھتا چلا آ رہا ہوں کہ اسلام توازن و تناسب کا حسین امتزاج ہے۔ یہ فرد کی ذات کا تحفظ و احترام بھی کرتا ہے اور سماج کے اجتماعی تقاضوں سے بھی آنکھیں بند نہیں کرتا۔ یہاں تعصب کا کہیں گزر نہیں اور رواداری کی وہ شان ہے کہ اچھی بات جہاں سے بھی ملے اسے قبول کرنے کی کھلی اجازت ہے۔

●...... ●...... ●

ڈاکٹر خالد شیلڈرک (انگلستان)

(Dr. Khalid Sheldrick)

ڈاکٹر خالد شیلڈرک نے ۱۹۰۳ء میں اس وقت اسلام قبول کیا جب ان کی عمر صرف سترہ برس تھی اور وہ مذہب عیسوی کی تبلیغ کی تعلیم و تربیت حاصل کر رہے تھے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان پر عیسائی مصنفین کی خلاف اسلام کتابوں کی وساطت سے اسلام کی حقانیت واضح ہوئی۔ جب وہ حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو ان کے والد نے انہیں گھر سے نکال دیا' لیکن نوجوان خالد نے راہ حق میں ہر طرح کی صعوبتوں کا پامردی سے مقابلہ کیا اور تن دہی سے اسلام کی روشنی کو دوسرے ذہنوں میں اتارنے کی مہم شروع کر دی۔ چنانچہ ان کے اخلاص' طرز تبلیغ اور انتھک کوششوں کا نتیجہ تھا کہ انگلستان کے بہت سے ذہین اور معروف لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ایسے خوش نصیب اصحاب میں سے چند نام یہ ہیں۔ ولید بلنڈ (۱۹۰۴ء) ' احمد براؤننگ (۱۹۰۵ء) ' عمر فلائٹ (۱۹۰۶ء) ' عمر رچرڈسن (۱۹۱۵ء) ایک روسی جرنیل بیرن ہودن (۱۹۲۰ء) ایل۔ جے محمد بل (۱۹۲۰ء)' ریورنڈ جے خیارڈ آف نیویارک (۱۹۲۴ء) ' عبداللہ ڈے (۱۹۲۵ء) ' بلال اینڈریو (۱۹۲۶ء)' رائل ایئرفورس کے ولید ڈائسن (۱۹۲۷ء) سارا واک کی شہزادی ہر ہائی نس خیر النسا گلیڈز پالمر (۱۹۳۲ء) خالد کنراڈ سیملین (۱۹۳۲ء) انجینئرنگ کالج بنڈونگ جاوا کے پروفیسر کمال شومیکر (۱۹۲۴ء)۔

ڈاکٹر خالد زبردست صلاحیتوں کے حامل معروف صحافی بھی تھے۔ اسلامی جرائد میں ان کے بے شمار مقالات شائع ہوئے۔ انہوں نے ''مینارہ'' کے نام سے خود بھی ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا جو ڈاکٹر صاحب موصوف کے مسلسل تبلیغی سفروں اور مالی دشواریوں کی وجہ

سے چند سال کے بعد بند ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے مشرق بعید' ہندوستان اور شرق اوسط کے بہت سے سفر کئے اور لندن میں ایک مستقل تبلیغی ادارہ "ویسٹرن اسلامک ایسوسی ایشن" کے نام سے قائم کیا۔ ڈاکٹر شیلڈرک اس کے تاحیات صدر رہے۔ بہت سی نامور مسلم ہستیاں اس کی رکن تھیں۔

ذیل میں ڈاکٹر صاحب کی ایک تقریر کا متن دیا جا رہا ہے جس میں انہوں نے اپنے قبول اسلام کی وجوہ پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ تقریر انہوں نے قاہرہ میں جمیعت شبان المسلمین کے اجتماع میں کی تھی۔

مَیں اپنے خطبہ کا آغاز کلمۂ طیبہ لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ سے کرنا چاہتا ہوں کہ میرے جذبات مسرت کا تقاضا یہی ہے۔ مَیں نے دین اسلام کافی غور وفکر کے بعد قبول کیا ہے اور آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ مَیں نے اس دین کی تعلیمات پہلے پہل اس کے موافقین کی کتابوں سے نہیں بلکہ اس کے مخالفین کی تصانیف سے حاصل کی ہیں۔

مَیں برطانوی والدین کے گھر پیدا ہوا جو پروٹسٹنٹ چرچ سے وابستہ تھے۔ میرے والد کی آرزو تھی کہ وہ مجھے اس چرچ کا ایک پادری دیکھیں' اس لئے مجھے دینی کتب کے مطالعہ اور مذہبی موضوعات پر مباحثہ میں مصروف دیکھ کر اسے بہت مسرت ہوتی۔

یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان بظاہر عیسائیت کا پیرو ہے لیکن نوے فیصد انگریز عیسائیت سے ناواقف ہیں اور مَیں بلند آہنگی کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ مَیں خود اپنی زندگی میں ایک دن کے لئے بھی عیسائیت کے عام اصولوں کا قائل نہ ہو سکا۔ آپ جانتے ہیں کہ عیسائیت کی بنیاد اس عقیدہ پر قائم ہے کہ خدا کی ذات واحد تین شخصیتوں کا مجموعہ ہے۔ یہ ایک ایسا عقیدہ ہے کہ عقل قبول کرنے سے انکار کرتی ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ باپ اور بیٹا ہر زمانے میں ساتھ ساتھ موجود ہوں۔ جس کسی زمانے میں باپ کا وجود فرض کر لیا جائے بیٹے کا وجود بھی اس کے ساتھ لازم ہو۔ یہ ایک ناقابل فہم عقیدہ ہے جسے کوئی عقل سلیم کا مالک قبول نہیں کر سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ عیسائی اس عقیدے کو سمجھے

بغیر سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ عیسائی ۲۵ دسمبر کو مسیح علیہ السلام کا یوم ولادت مناتے ہیں' حالانکہ اس خیال کی تائید میں وہ مسیح کی کسی ہم عصر یا کم از کم قریب العصر شخصیت کی سند پیش نہیں کر سکتے۔ دراصل یہ ایک پوپ کی دماغی اختراع ہے' جس کی کوئی تاریخی اصلیت نہیں بلکہ اصول حساب کی شہادت اس کے برخلاف ہے۔ بات یہ ہے کہ ۲۵ دسمبر قدیم بت پرستوں کا ایک مقدس دن تھا۔ یہ لوگ سورج دیوتا کے پجاری تھے۔ چنانچہ جب ان کا دیوتا...... سورج...... جسے یہ مصدر وجود اور چشمۂ حیات سمجھتے' تھے زمانۂ انقلاب سرمائی کو ختم کر لیتا تھا تو اس سے اگلے دن وہ عید مناتے تھے اور اسے اپنے دیوتا کا یوم ولادت مانتے تھے۔ اسی عقیدۂ ولادت شمس کو عیسائیوں نے عید ولادت مسیح میں تبدیل کر دیا اور بت پرستوں کے قدیم دستور کے مطابق ۲۵ دسمبر کو یوم عید قرار دیا ہے۔

اسی طرح بت پرست موسم سرما کے خاتمے کے اگلے دن بھی عید مناتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ آج ان کے خدا...... سورج دیوتا...... نے اس تاریکی پر فتح پائی ہے جو اس کے راستے میں حائل ہو گئی تھی اور اب اس کی طاقت اور روشنی میں اضافہ ہو گیا ہے چنانچہ پرانے بت پرستوں کی پیروی میں جس طرح عیسائیوں نے یوم ولادت مسیح میں تبدیل کر کے اسے عید مانا تھا' اسی طرح انہوں نے یوم اعتدال ربیع کو جو دراصل سورج دیوتا کے طاقت پانے کا دن تھا' مسیح کے طاقت پانے کا دن قرار دے کر اسے عید القیامہ (ایسٹر) بنا لیا۔

اسی طرح باپ بیٹے کا مسیحی عقیدہ بھی قطعی پرانے بت پرستوں کے عقائد سے ماخوذ ہے' اس کا ثبوت یہ ہے کہ بدھ مت کے ماننے والے بدھ کے بچپن کے زمانہ کی تصویر' اس کی ماں (مایا) کے ساتھ جس انداز سے بناتے ہیں' بعینہٖ اسی انداز کی تصویر مسیح کے زمانۂ طفولیت کی' ان کی ماں' مریم کے ساتھ ہم گرجوں میں منقش پاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسیح کی وہ شخصیت جس کے عیسائی دعوے دار ہیں' کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتی۔ اگر کوئی ناقد علمی طریقے سے اس موضوع پر بحث کرے تو اسے کلی طور پر مایوس ہونا پڑے گا۔ اس کا اندازہ آپ مسیح کی ان تصویروں سے کر سکتے ہیں جو مختلف ممالک میں مختلف انداز میں ملتی ہیں۔ آسٹریا کے گرجوں میں مسیح کی جو صورت منقش ہے وہ اٹلی کے گرجوں کی تصویروں سے خاصی مختلف ہے' وعلی ہذا القیاس' چنانچہ خاصے غور و فکر کے بعد بھی مسیح کی ان فرضی

تصویروں سے ان کی اصل صورت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ چنانچہ اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ عیسائیوں کے مختلف طبقوں میں عیسائیت کے اصولوں اور مسیح کی ذات کے متعلق بنیادی اختلافات ہیں اور کوئی بھی غیر جانبدار قاری معمولی مطالعے سے ان کا ادراک کر سکتا ہے۔

یہ تھیں وہ بنیادی الجھنیں جنھوں نے مجھے دیگر مذاہب کے مطالعے پر آمادہ کیا۔ چنانچہ مذاہب عالم پر انگلستان کی لائبریریوں میں مجھے جتنی بھی کتابیں ملیں میں نے وہ پڑھ ڈالیں۔ اس مرحلے میں ایک عجیب انکشاف ہوا۔ وہ یہ کہ ان کتابوں میں یہودیت، ہندومت، بدھ مت وغیرہ کے بارے میں تو صرف معلومات ہی تھیں، مگر اسلام کا جہاں بھی ذکر آتا تھا، کوئی بھی مصنف طعن و تشنیع کے بغیر نہیں گزرتا تھا۔ اسلام کے بارے میں ان کتابوں کا ماحصل یہ تھا کہ اسلام بذاتہٖ کوئی مستقل مذہب نہیں ہے بلکہ وہ محض عیسائی لٹریچر سے ماخوذ چند اقوال کا مجموعہ ہے۔

قدرتاً میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر واقعی اسلام ایسا بے حقیقت مذہب ہے جیسا کہ ہمارے مصنفین ظاہر کرتے ہیں تو پھر اس پر اس قدر اعتراضات، طعن و تشنیع اور شور و واویلا کی اتنی ضرورت کیوں ہے؟ اس کے مقابلہ و مدافعت پر اتنا زور کیوں دیا جاتا ہے؟ اس احساس نے غور و فکر کی راہیں مزید کھول دیں اور یہ بات میرے دل میں بیٹھتی چلی گئی کہ اگر عیسائی مصنفین مذہب اسلام سے خائف نہ ہوتے اور اس کی قوت و حرکت سے مرعوب نہ ہوتے تو اس سے مقابلہ و مجادلہ کی اس قدر فکر نہ کرتے، نہ اٹھتے بیٹھتے اس کی توہین و تذلیل کے درپے ہوتے۔ چنانچہ اب میں نے طے کر لیا کہ اسلام پر خود مسلمانوں کی کتابیں پڑھوں گا اور اسے اس کے صحیح آئینے میں دیکھنے کی کوشش کروں گا۔

چنانچہ میں نے سارا وقت اسلام کو پڑھنے اور سمجھنے میں لگا دیا اور خدا کا شکر ہے حقیقت تک پہنچنے میں مجھے زیادہ دیر نہ لگی۔ میں نے خوب دیکھ لیا کہ اسلام کے خلاف اعتراضات کی جو بوچھاڑ کی جاتی ہے وہ قطعی بے بنیاد ہے۔ اسلام ہی دینِ فطرت ہے اور سلامتِ طبع رکھنے والا کوئی فرد بھی اس سے زیادہ عرصے تک دُور نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ میں نے باقاعدہ اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے ایک دوست نے بتایا کہ ترکی کے

دارالخلافہ استنبول میں ایک مسجد ایا صوفیہ ہے اور وہ اسلامی تبلیغ کا مرکز ہے۔ میں نے اس مسجد کے پتے پر اپنے حالات استنبول لکھ بھیجے۔ میرا یہ خط سلطان عبدالحمید کی خدمت میں پیش کیا گیا اور سلطان المعظم کے سیکرٹری نے مجھے جواب دیا کہ میں مشہور نومسلم انگریز شیخ عبداللہ کوئیلم (بیرسٹر) سے ملاقات کروں۔

برادرانِ اسلام! آپ خوب اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک انگریز مسلمان سے مل کر میرے جذبات مسرت کا کیا عالم ہوگا۔ میں نے ان سے اپنے دل کا حال بیان کیا اور آزادی کے ساتھ اپنے عقائد اور خیالات کا اظہار کیا۔ شیخ عبداللہ کوئیلم نے مجھے سینے سے لگا لیا اور تھوڑی دیر کے بعد میں اسلامی برادری کا رکن بن چکا تھا۔ شیخ موصوف کی شخصیت اور محنت کے نتیجے میں انگلستان میں پانچ سو سے زائد انگریز مسلمان ہوئے۔

میں نے مناسب سمجھا کہ اپنے قبولِ اسلام کی اطلاع اپنے والد کو دوں۔ عجیب بات ہے کہ انہیں عیسائیت کو خیرباد کہنے سے تو کوئی رنج نہ ہوا مگر میرے قبولِ اسلام کی خبر سے ان کے دل پر سخت چوٹ لگی اور ان کے ساتھ سارے خاندان نے شدید صدمہ محسوس کیا۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ میں اپنے فیصلے کو واپس لے لوں، مگر میں نہایت مسرت کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ مجھے اسلام کے دامن کو تھامے ہوئے پینتیس سال گزر گئے ہیں اور اسلام پر میرا یقین بڑھتا ہی چلا گیا ہے۔ آج میں پہلے کے مقابلے میں اسلامی تعلیمات کا زیادہ معتقد اور اس کے محاسن و فضائل کا زیادہ معترف ہوں۔ الحمد للہ! میں اس کے احکام پر عمل بھی کرتا ہوں۔ میں ولی اللہ ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا مگر یہ ضرور ہے کہ اسلامی فرائض کو ادا کرنے میں حتی الامکان کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔

آخر میں میں اپنے اس یقین کا اظہار کروں گا کہ انشاء اللہ ایک دن تمام دنیا دینِ اسلام کا پرچم تھام لے گی۔ مگر یہ اس امر پر موقوف ہے کہ اسلام کے نام لیوا اسلام کا عملی نمونہ بنیں اور اصولِ اسلام کو عملی طور پر دنیا کے سامنے پیش کریں۔ مختلف اسلامی ممالک کے سفر کے دوران میں، میں نے محسوس کیا ہے کہ مسلم اکثریت کے ملکوں میں ضعفِ ایمان، بے عملی، پست ہمتی، اور افتراق کا غلبہ ہے۔ اقلیت والے ملکوں میں مسلمان دینی تعلیمات کی پیروی اور عمل میں (جو قوت و ترقی کے اسباب ہیں) نسبتاً بڑھے ہوئے ہیں۔ اگر دنیا کے

مختلف ملکوں کے مسلمان اپنے دین کی پیروی کریں اور ان کی سیرت پر اسلام کی عظمت کے آثار نمایاں ہوں تو یہ اسلام کی ایک عملی تبلیغ ہوگی جو غیر مسلم اقوام عالم کو اسلام کے اصولوں کا گرویدہ بنا دے گی۔

("برہان" دہلی بحوالہ "کشکول" از مفتی محمد شفیع صاحبؒ)

●.....●.....●

خالد لطیف گابا

(ہندوستان)

خالد لطیف گابا کا آبائی نام کنہیا لال گابا تھا۔ وہ ضلع مظفر گڑھ کے قصبے لیہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد لالہ ہرکشن لال بیسوی صدی کے اوائل میں برصغیر کے نامور ترین ماہر مالیات تھے۔ پنجاب کی کابینہ میں سالہا سال تک شامل رہے تھے۔ وہ کارخانہ دار اور صفِ اول کے تاجر کی حیثیت سے لکھ پتی آدمی تھے۔

۱۹۱۷ء میں سینئر کیمبرج کا امتحان پاس کرنے کے بعد کے۔ ایل۔ گابا انگلستان گئے اور ۱۹۲۱ء میں قانون کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔ وطن واپس آکر انہوں نے لاہور ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی اور گہرے مطالعے اور طویل غور و خوض کے بعد ۱۹۳۳ء میں ہندومت کو ترک کرکے حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔

ممتاز ماہر قانون کے ساتھ ساتھ کے۔ ایل۔ گابا زبردست تخلیقی و تصنیفی صلاحیتوں کے حامل بھی تھے۔ ان کی اولین کتاب ۱۹۲۷ء میں "انکل سام" کے عنوان سے شائع ہوئی جو مس میو کی مشہور کتاب "مدر انڈیا" کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ اسلام قبول کرنے کے ایک سال بعد ۱۹۳۴ء میں ان کی معرکۃ الآرا کتاب "پرافٹ آف دی ڈیزرٹ" (پیغمبر صحرا) کے نام سے شائع ہوئی جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت پر مبنی ہے اور سند و ثقاہت کے اعتبار سے علمی حلقوں میں خاصی قدر و منزلت کی حامل سمجھی جاتی ہے۔

۱۹۳۶ء میں گابا کے خاندان پر مصائب کا ایک دور شروع ہوا۔ پنجاب ہائی کورٹ کا انگریز چیف جسٹس سر جان ڈگلس ینگ ان کا دشمن ہو گیا اور نہایت گھٹیا ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے نہ صرف ان کی ساری جائیداد ضبط کر لی بلکہ دونوں باپ بیٹوں کو جیل میں

ڈال دیا اور قید و بند کا یہ سلسلہ بار بار دہرایا گیا۔ حتیٰ کہ ۱۹۳۷ء میں لالہ ہرکشن لال اسی کسمپرسی میں وفات پا گئے۔

اس ظلم و ستم اور اپنے والدین کی مظلومانہ ہلاکت سے متاثر ہو کر خالد لطیف گابا نے ''نیو میگنا کارٹا'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جس میں سر ڈگلس ینگ کے نجی اور معاشرتی کردار کے بارے میں نہایت گھناؤنے انکشاف تھے۔ اس کتاب نے برطانوی عدلیہ اور محکمۂ انصاف کے کھوکھلے پن کو بھی عیاں کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ گابا صاحب کے خلاف توہینِ عدالت کا مقدمہ دائر ہو گیا مگر جسٹس ینگ کے خلاف ماحول میں نفرت اتنی بڑھ گئی کہ اس کے پاس استعفا دینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

خالد لطیف گابا ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۷ء تک ہندوستان کی مرکزی قانون ساز اسمبلی کے رکن رہے' جبکہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۱ء تک ...... پنجاب اسمبلی میں عوامی نمائندگی کا فرض ادا کرتے رہے۔ انہوں نے تیس سے زیادہ نہایت وقیع کتابیں تصنیف کیں جن میں بعض برطانوی سامراج کے کچے چٹھے پر مبنی تھیں۔ چونکہ گابا صاحب قیامِ پاکستان کے معاملے میں مسلم لیگ سے اختلاف رکھتے تھے اس لئے تقسیمِ ہند کے بعد وہ بمبئی منتقل ہو گئے اور وفات تک وہیں مقیم رہے۔ وہاں انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی حالتِ زار پر ایک مبسوط' مستند اور دستاویزی کتاب PASSIVE VOICEs (مجبور آوازیں) لکھی' جس نے ایک طرف دنیا بھر میں بھارتی مسلمانوں کی مظلومی و بیچارگی کو عیاں کیا اور دوسری جانب نام نہاد ہندوستانی سیکولرزم کا پردہ فاش کیا۔ جرأت مندی اور حق گوئی گابا صاحب کی زندگی کا مستقل شعار رہا ہے جس پر وہ آخیر وقت تک قائم رہے۔

جن دنوں خالد لطیف گابا سر ڈگلس ینگ کے زیرِ عتاب تھے اور جیل میں تھے' ضمانت پر رہائی کے لئے انگریز ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج لاہور نے ڈیڑھ لاکھ روپے زرِ ضمانت کے طور پر طلب کئے۔ روزنامہ ''زمیندار'' اور ''احسان'' نے مسلمانانِ ہند سے بار بار اپیل کی کہ رقم کا انتظام کر کے بے گناہ نومسلم کو قید سے رہائی دلائی جائے مگر پورے ہندوستان میں ایک مسلمان بھی اتنی بڑی رقم جمع نہ کرا سکا۔

اسی اثنا میں سیالکوٹ کے ایک ٹھیکیدار الحاج ملک سردار علی کو نبی اکرم ﷺ نے

خواب میں تشریف لا کر ہدایت فرمائی کہ لاہور میں ایک نومسلم خالد لطیف گابا قید میں پڑا ہے' اس نے ہمارے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے جو ہمیں بہت پسند ہے' اس لئے تم ڈیڑھ لاکھ روپے کا انتظام کرو اور لاہور جا کر اسے ضمانت پر رہا کراؤ۔

ملک سردار علی چند برس ہوئے وفات پا چکے ہیں' وہ فخر اور تشکر سے یہ خواب سنایا کرتے تھے' چنانچہ حضور ختم رسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم سنتے ہی ملک صاحب لاہور پہنچے۔ جائیداد کے کاغذات تیار کئے اور ضمانت کے لئے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کی عدالت میں پہنچے، مگر متعصب جج نے انہیں ڈرایا دھمکایا کہ گابا باہر بھاگ جائے گا اور تمہاری جائیداد قرق ہو جائے گی۔ لیکن ملک صاحب مصر رہے کہ وہ ان کی ضمانت ضرور دیں گے۔

جج کے انکار پر ملک صاحب نے بھاگ دوڑ کر کے ڈیڑھ لاکھ روپے جمع کئے اور نقد زرضمانت پیش کر کے گابا صاحب کو رہا کرا لیا۔

ذیل کی تقریر خالد گابا نے قبول اسلام کے بعد لاہور کی بادشاہی مسجد میں سامعین کے بہت بڑے اجتماع میں کی تھی۔ اس اجتماع میں علامہ اقبال بھی موجود تھے۔

خدائے بزرگ و برتر کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اپنے لاکھوں گمراہ بندوں میں سے مجھے انتخاب کیا اور صراط مستقیم کی ہدایت دے کر دوسروں کے لئے مثال بنایا تا کہ سب لوگ یہ جان لیں کہ صداقت کا سیدھا راستہ اسلام کے سوا اور کوئی نہیں۔

حضرات! جب انسان پیدا ہوتا ہے تو کئی درجوں میں سے گزر کر مکمل ہوتا ہے' پہلے درجے میں اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی ہوتی ہے' چہرے پر دلکش معصومیت برس رہی ہوتی ہے' وہ چھو سکتا ہے' سونگھ سکتا ہے' دیکھ سکتا ہے۔ اس کے پانچوں حواس قائم ہوتے ہیں۔ تمام جبلی خواص موجود ہوتے ہیں' مگر ابھی عقل و خرد سے بہرہ یاب نہیں ہوتا۔ پھر آہستہ آہستہ ماں باپ کو پہچاننے لگتا ہے۔ اشیا کی ماہیت جاننے لگتا ہے اور اس طرح قدم قدم چل کر اپنی جسمانی زندگی کو مکمل کر لیتا ہے۔

حضرات! انسان کی روحانی زندگی کا بھی اسی طرح بچپن ہو سکتا ہے۔ انسان برسوں

کے بعد ہی اپنی روحانی منزل کو پہچانتا ہے اور غفلت کی نیند سے بیدار ہو کر صداقت کی روشن دنیا میں سرگرمِ عمل ہوتا ہے۔ میرے قبولِ اسلام پر ہندو جاتی میں بہت غیظ و غضب کا اظہار کیا گیا ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ ہندوؤں نے مجھ پر یہ گولہ باری من حیث القوم شروع کر دی ہے۔ البتہ ایک امر میں مجھے ہندو پریس سے پورا اتفاق ہے، یعنی ہندو اخبارات نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ میں کبھی بھی راسخ العقیدہ ہندو نہ تھا۔

برادرانِ اسلام! اس وقت میری مثال ایک ایسے دل باختہ عاشق کی سی ہے جسے کسی شہزادی سے محبت ہو گئی ہو۔ سنگدل دنیا دار اسے کیا کچھ نہیں کہتے' کوئی اقتدار اور بادشاہی کی تمنا کو اس کے عشق کا محرک گردانتا ہے، کوئی دماغ کا خلل بتاتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ عشق کی حقیقت خشک منطق سے دریافت نہیں ہو سکتی۔ انوارِ سماوی کی بارش خرد بینوں سے نہیں دیکھی جا سکتی۔ جذبات کے بڑھتے ہوئے سمندر کو استدلال کے پیمانوں سے ناپنا ناممکن ہے۔ ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

حضرات! میرا یہ عشق نیا نہیں' میرے قلب میں اس آگ کی پہلی چنگاری آج سے ۱۵ برس پہلے چمکی تھی۔ میں اُن دنوں مصر میں تھا۔ اسلامی تہذیب و تمدن نے میرے دل میں ایک نہ مٹنے والا اثر ڈالا۔ میں اسلامی معاشرت کی سادگی' وقار' باہمی مہر و محبت' احترامِ انسانیت اور مساوات کے ایک خاص انداز سے بے پناہ متاثر ہوا۔ یہ چنگاری آہستہ آہستہ سلگتی رہی اور آخر اس نے میرے دل کے خس و خاشاک کو جلا کر راکھ کر دیا اور آج اللہ کے فضل سے میرا دل و دماغ اسلام کی صداقت سے تابندہ ہے۔ مصر سے واپس آنے کے بعد جب کبھی میں کسی مسجد کے قریب سے گزرا ہوں' میرا سر ہمیشہ اس کی عظمت و جبروت کے سامنے جھک گیا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ مسجد کے مینار مجھے انگلیوں کے اشارے سے اپنی طرف بلا رہے ہیں اور مؤذن مجھ کو پکار پکار کر کہہ رہا ہے' آؤ نماز کی طرف۔ آؤ نماز کی طرف۔ میرا دل میرے سینے سے نکل کر ایمان والوں کی صفوں میں

شریک ہونا چاہتا تھا تاکہ میں خدائے رحیم و رحمان کے اطاعت گزار بندوں میں داخل ہو جاؤں اور یہ احساس پیدا ہونے کے بعد میں زیادہ عرصے تک اس کو نہ روک سکا۔ تاہم اگر باہر کی دنیا کے لوگ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ میں نے اسلام کو دوسرے مذاہب پر کیوں ترجیح دی ہے تو میں مختصراً چند باتیں پیش کرتا ہوں۔

پہلی چیز جس نے مجھے بے حد متاثر کیا' وہ اسلام کی سادگی اور ہدایت ہے۔ اسلام کے ارکان انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ان سب کی بنیاد اصولوں پر ہے اور وہ اس قدر واضح ہیں کہ ایک عام عقل و فہم کا انسان بھی انہیں سمجھ سکتا ہے۔ یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور اس خدا کی وحدانیت جو نہ کسی کا باپ ہے اور نہ بیٹا، جو مٹی میں ڈھالا جا سکتا ہے نہ پتھر میں، جو ایک ہے اور ایک رہے گا۔

اسلام کو ترجیح دینے کی دوسری وجہ اسلام کی جمہوریت ہے۔ اسلامی مساوات سوشلزم اور کمیونزم کی مساوات نہیں جو امیروں کو بظاہر غریبوں کی خاطر درندوں سے ہلاک کرنا سکھاتی ہے۔ یہ عیسائیت کی مساوات بھی نہیں جہاں سیاہ رنگ کے حبشی کو سفید رنگ کی عورت پر نگاہ ڈالنے کے جرم میں بے محابا قتل کیا جاتا ہے اور سیاہ فام عیسائی خدا کی عبادت کے لئے بھی ان گرجوں میں نہیں جا سکتے جہاں سفید فام عیسائی جاتے ہیں۔ سیاہ فاموں کے لئے الگ مخصوص گرجے ہیں جبکہ اس کے برعکس مسجد کے دروازے ہر ایک مسلمان کے لئے یکساں کھلے ہیں' خواہ وہ کسی رنگ کا ہو اور خواہ اس کی کوئی سی نسل ہو۔

برادرانِ اسلام! چونکہ اسلام کی عالمگیر اخوت انہی اصولوں پر مبنی ہے لہٰذا قبولِ اسلام کسی خاص موسم کا پابند نہیں۔ اس کے لئے دو اصولوں کا اقرار و اعلان کافی ہے۔ اور وہ اسلام کا کلمہ ہے یعنی اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمداً عبدہ و رسولہ' اس کلمے کے پڑھتے ہی دنیا کی اس سب سے بڑی برادری کی آغوشِ محبت کشادہ ہو جاتی ہے۔ جس میں ہر انسان ہم مرتبہ ہے اور یہ محض نظریہ ہی نہیں ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ ہر نو مسلم کلمہ پڑھنے کے ساتھ ہی مسجد میں بادشاہ وقت کے پہلو میں کھڑا ہو سکتا ہے اور اس کے ساتھ مل کر ایک ہی دستر خوان پر کھانا کھا سکتا ہے۔

برادرانِ اسلام! میرے قبولِ اسلام کی تیسری وجہ بھی اسی اخوت کے احساس پر مبنی

ہے۔ اس وقت ہندوؤں میں داخلہ مندر پر بڑی لے دے ہو رہی ہے۔ اسلام ان انسانیت سوز بحثوں سے پاک ہے۔ ہمارے مذہب کو چھوت چھات نے چھوا تک نہیں۔ ہندوؤں کا ایک فرقہ اچھوتوں کو شدھی کی چھومنتر سے چھوت بنا دینے کا دعویدار ہے۔ مگر یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی کیونکہ اس میں دو باتیں بُری طرح حارج ہیں۔ ایک یہ کہ ہندو پیدا ہوتا ہے بنایا نہیں جا سکتا۔ وہ فقط ہندو ہی نہیں پیدا ہوتا بلکہ ایک خاص گوت' ایک خاص ذات کے حلقے میں پیدا ہوتا ہے اور یہ گوتیں اور ذاتیں درجہ بدرجہ ہیں۔ ہندو مت محض مردوں کے تناسخ اور تبدیلی کا قائل ہے' زندوں کی حالت نہیں بدل سکتا۔ کوئی شودر کھتری نہیں بن سکتا' کوئی کھتری برہمن نہیں ہو سکتا۔ ہاں سیاسی اغراض کے لئے شودر کو کچھ ظاہرداری کا سہارا مل جائے تو الگ بات ہے یا مہاتما گاندھی کو خودکشی سے بچانے کے لئے اسے وقتی طور پر پیار دیا جا سکتا ہے۔ مگر شودر کبھی ہندو کی سماجی زندگی میں برابر کا شریک نہیں ہو سکتا' کبھی نہیں ہو سکتا۔ شدھ ہو جائے یا کچھ اور۔ دوسری رکاوٹ اچھوتوں کو چھوت بنانے کے راستے میں یہ ہے کہ ایک انسان کا دوسرے انسان کو شدھ یا پوتر یعنی پاکیزہ بنانے کا عمل کبھی مقبولیت حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کا خیال بھی دانش کی توہین ہے۔ مذہب کی تبدیلی خدا اور بندے کا اپنا معاملہ ہے کیا یہ محض جسارت نہیں کہ ایک انسان اپنے جیسے دوسرے انسان کو شدھ یعنی پاکیزہ بنانے کی صلاحیت رکھنے کا دعویدار ہو۔ دوسرے کو پاکیزہ بنانے والے پہلے اپنی پاکیزگی کا ثبوت تو فراہم کریں۔

اس کے برعکس اسلام میں محض اعلان اسلام ہی سے برابر کے حقوق مل جاتے ہیں۔ یہاں پاکیزگی یا ناپاکی کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ ان حالات میں اچھوتوں کو میرا پیغام یہی ہے کہ وہ اور تدبیریں چھوڑ دیں اور اسلام کی طرف متوجہ ہوں جو ان کے انتظار میں آغوش وا کئے کھڑا ہے۔ وہ یہاں جس کو چاہیں چھوئیں' جس کے پاس چاہیں اٹھیں' بیٹھیں۔ نماز میں مقتدی بنیں یا امام، کسی پر کوئی قدغن نہیں۔ اچھا وہی ہے جو متقی ہے جو اپنے فرائض کو اچھی طرح سرانجام دیتا ہے۔

برادران ملت! میری آخری اور چوتھی وجہ ترجیح یہ ہے کہ اسلام دورِ حاضر کی ضروریات کے عین مطابق ہے۔ اس عہد کی مشکلات کا حل کسی دوسرے مذہب کے پاس

نہیں' آج دنیا اخوت اور مساوات چاہتی ہے اور اسلام کے سوا یہ نعمتیں کہاں ہیں؟ اسلام کا معیار فضیلت تقویٰ ہے اور کچھ نہیں۔ سب سے اچھا وہ شخص ہے جس کے اعمال سب سے اچھے ہیں۔ آج دنیا میں حقوق کی پکار ہے۔ شادی کے رشتے ناتے استوار ہو رہے ہیں۔ اسلام عورت کو آزادی اور حقوق دلاتا ہے اور عورت کے ازدواجی تعلق کو عاقلانہ معاہدہ پر قائم کرتا ہے۔ اسلامی قوانین انسانوں کے لئے بنائے گئے ہیں۔ فرشتوں کے لئے نہیں' چنانچہ انہی فطری قوانین کا نتیجہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں ہنگامہ پروری' تماشا کاری' سازباز' زنا اور بن بیاہی ماؤں جیسے مسائل مفقود ہیں۔

اخوان الاسلام! بنی نوع انسان کے لئے مناسب ترین مذہب اسلام ہے۔ گرجے خالی ہیں اور مساجد اہل ایمان سے آباد ہیں۔ اطاعت گزار خاصی بڑی تعداد میں دن میں پانچ مرتبہ خدا کے سامنے سربسجدہ ہوتے ہیں۔ اسلام پھر اسی پرانے رنگ میں اپنے پورے عروج پر آرہا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت ایسی نہیں جو اسلام کی طرح دنیا کی اقوام کے اقتصادی اور اخلاقی مسائل کا تسلی بخش حل پیش کر سکے۔ آؤ اس مقصد اور غرض کو سرانجام دینے کے لئے جسے آج سے تیرہ سو سال پہلے ہمارے پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا کے سامنے پیش کیا' ہم سب مل کر اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔

عزیز بھائیو! سلسلۂ کلام ختم کرنے سے پہلے میں اپنی اس مسرت کا پھر اعلان کرنا چاہتا ہوں جو میرے دل میں قبول اسلام سے موجزن ہے۔ میں خدائے برتر و بالا کے سامنے دست بدعا ہوں کہ وہ مجھے اسلام کی کسی ایسی خدمت کی توفیق عطا کرے جو آپ کی محبت واخلاص کی طرح عظیم اور رفیع المرتبت ہو"۔

وضاحت: گاما صاحب 2 نومبر 1981ء کو بمبئی میں وفات پا گئے۔ وفات سے چند ماہ قبل وہ صدر ضیاء الحق کی دعوت پر پاکستان تشریف لائے تھے اور سیالکوٹ جا کر اپنے محسن ملک سردار علی مرحوم کے لواحقین سے ملنا چاہتے تھے' مگر کسی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔

●.....●.....●

محترمہ خدیجہ فزوئی

KHADIJA FIZOUI

(انگلستان)

بچپن میں میری مذہبی تربیت چرچ آف انگلینڈ کی زیر نگرانی ہوئی، مگر ہوش سنبھالا تو میرا ذہن اس سے بالکل مطمئن نہ ہوا۔ مجھے چرچ آف انگلینڈ کی تعلیمات میں قوت اور وقار کا فقدان نظر آیا اس لئے مَیں نے اس چرچ سے علیحدگی اختیار کر لی اور بیس سال کی عمر میں رومن کیتھولک بن گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرے اعزا اور احباب سخت برہم ہوئے اور ان کی ناراضگی بلکہ دشمنی نے مجھے کئی برس تک پریشان رکھا' لیکن چونکہ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ صرف رومن کیتھولک ہی سچا مذہب ہے اور اسے خدا کی پشت پناہی حاصل ہے' اس لئے مَیں نے غیروں کی دشمنی یا اپنی پریشانی کی کوئی پروا نہ کی اور اپنے موقف پر قائم رہی۔

لیکن کچھ عرصے کے بعد مجھے شدت سے احساس ہوا کہ رومن کیتھولک کی وابستگی ایک قیمت چاہتی ہے اور وہ ہے سوچ' فکر اور اظہار پر پابندی۔ یعنی یہ اعتقاد کہ چرچ اور چرچ کی تعلیمات ہر قسم کی خامی سے پاک ہیں اور ان پر اعتراض کفر کے مترادف ہے خواہ وہ عقلی تقاضوں کے کس قدر خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ جب کبھی میری عقل کسی عقیدے پر معترض ہوتی تو مَیں اپنے آپ کو سمجھاتی کہ قصور دراصل میری عقل میں ہے اور چرچ عقل سے بالا ہے۔ مثال کے طور پر یہ عقیدہ کہ چرچ میں جو روٹی بھی پادری صاحبان کھاتے ہیں وہ فوراً ہی یسوع مسیح کے وجود میں بدل جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کی حیثیت بیک وقت خدا کی بھی ہوتی ہے اور انسان کی بھی' اگرچہ بظاہر اس کا احساس نہیں ہوتا۔ مَیں اکثر حیرت میں ڈوب جاتی کہ ایک پورا انسان روٹی میں کیسے سما سکتا ہے اور پھر حضرت مسیح بیک

وقت مختلف مقامات پر مختلف روٹیوں میں کیسے حلول کر سکتے ہیں جبکہ دنیا میں لاکھوں چرچ ہیں اور ہر چرچ میں بے شمار روٹیاں استعمال ہوتی ہیں۔ یہ بات بڑی بے جوڑ اور مضحکہ خیز لگتی کہ انسان اپنے گوشت اور خون سمیت ایک روٹی کی صورت اختیار کر جائے۔

ذہن جس دوسری بات پر خاصا پریشان ہوتا وہ حضرت عیسیٰؑ کا مصلوب ہونا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی قربانی کا واقعہ بار بار پیش آتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی سوالات تھے۔ جو ذہن میں پیدا ہوتے تاہم میں نے اپنے آپ کو مجبور کیے رکھا کہ چرچ کے عقائد بلاشک وشبہ صحیح ودرست ہیں مگر عقل سے ماوراء ہیں۔ ایسے خیالات سے بچنے کے لئے میں نے اپنے آپ پر ایک روحانی سا نشہ طاری کر لیا یعنی زیادہ سے زیادہ عبادت میں مصروف رہتی تاکہ عقل کو مختلف شکوک کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہ ملے نہ اس میں بغاوت کے کیڑے کلبلا سکیں۔ یہ الگ بات ہے کہ میں اپنے آپ کو راسخ العقیدہ کیتھولک نہیں سمجھتی تھی اور اس پر سخت پریشان تھی۔

مگر اپنے آپ کو مصنوعی طور پر مصروف رکھنے کا نشہ دیرپا ثابت نہ ہوا۔ میں کوشش کے باوجود اپنی ذات کو کنواری مریم' یسوع یا دیگر بزرگوں کی پرستش پر آمادہ نہ کر سکی۔ کیتھولک لوگ یسوع علیہ السلام کی والدہ کو...... خدا کی ملکہ اور تمام قوتوں کی ثالثہ قرار دیتے ہیں اور اس کی سفارش کو لازم قرار دیتے ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ ایک پادری کو دیکھا وہ اسکول کے بچوں کو بتا رہا تھا کہ ایک شخص اگرچہ سخت بدبخت اور گنہگار تھا لیکن صرف ایک نیکی نے اسے جہنم سے بچا لیا تھا اور وہ یہ کہ متذکرہ آدمی مریم کی پوجا بڑی باقاعدگی سے کرتا تھا۔ میں سوچتی رہ گئی کہ انجیل تو حضرت عیسیٰؑ کو نجات دہندہ قرار دیتی ہے' مگر پادری صاحب یہ اعزاز مریم کو بخش رہے ہیں آخر دونوں باتوں میں مطابقت کیا ہے؟

ان ساری ذہنی مشکلات کے باوجود کیتھولک چرچ میں اطمینان کے سامان بکھر تھے اور میں بعض اوقات اس ماحول میں خاصی خوشی بھی محسوس کرتی تھی' تاہم پورے ایک برس تک میری حالت خاصی گوں مگوں کی سی رہی۔ میری ملاقات پروٹسٹنٹ عقائد کے کچھ لوگوں سے ہوئی جن کی مذہب کے بارے میں گرمجوشی اور خلوص کیتھولک لوگوں سے کم نہ تھا۔ انہوں نے مجھے ایسا راستہ بتایا جو کیتھولک عقائد کا ہم پہلو تھا دل بھی تھا اور بائبل کی تعلیمات پر مبنی تھا

اور جس میں چرچ آف انگلینڈ کا سا ابہام بھی نہیں تھا۔ مگر میں اس امر سے اتفاق نہ کر سکی کہ محض عقیدہ ہی نجات کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ بہر حال کئی طرح کے شکوک کے باوجود میں رومن کیتھولک عقیدے پر قائم رہی۔

میں اس وقت تک اسلام کے بارے میں کچھ نہ جانتی تھی۔ اخبارات کے مضامین سے صرف اتنی خبر ضرور تھی کہ اسلام غلامی کا قائل ہے اور اب تک عرب ملکوں میں یہ مکروہ کاروبار جاری ہے۔ تعدد ازدواج کی صورت میں عورت پر ظلم ڈھائے جاتے ہیں۔ حیوانات کو بے دریغ کاٹ کر کھایا جاتا ہے اور منشیات کی تجارت پر کوئی پابندی نہیں۔ اسکول کے زمانے میں صلیبی جنگوں کے بارے میں بھی پڑھا تھا، جن میں مسلمانوں کو پرلے درجے کے سفاک اور بے رحم بتایا گیا تھا۔

ان سارے تعصبات کے باوجود میں نے اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ عقائد کے درمیان قلب و ذہن کی کھینچا تانی نے میرے اعصاب کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا اور میں بیمار رہنے لگی تھی۔ حل صرف ایک ہی تھا کہ میں جلد از جلد صداقت کو پالوں اور یکسوئی حاصل کروں۔ اس کے لئے میں نے قرآن کی طرف رجوع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے خدا سے صراط مستقیم کی دعا کی۔ پھر فرض کر لیا کہ میں دور کے کسی سیارے کی مخلوق ہوں عیسائیت کے بارے میں کچھ جانتی ہوں نہ اسلام کے بارے میں، ذہن میں جتنے تعصبات تھے وہ جھٹک دیئے اور راہ حق کو پانے کے لئے قرآن کے مطالعے میں محو ہو گئی۔

میں نے قرآن کی صورت میں بلاشبہ ایک متبادل تو پالیا مگر ذہن مختلف سوالوں سے بھر گیا۔ کیا واقعی یہ خدا کی طرف سے وحی ہے یا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی ذریعے سے بائبل کی تاریخی کہانیوں کو سنا اور خدا کے حوالے سے اپنے الفاظ میں بیان کر دیا؟ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کوئی بدروح تو سوار نہیں تھی؟ (خدا مجھے معاف کرے) چونکہ وہ بے حد ذہین انسان تھے اس لئے کیا شیطان نے انہیں آلۂ کار تو نہیں بنا لیا تھا (العیاذ باللہ)

ان بیہودہ سوالات کے جواب کے لئے میں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی اور کردار کے بارے میں جاننے کی ضرورت محسوس کی۔ اس کے لئے میں نے مسلم

اور غیر مسلم مصنفین کی کتابیں حاصل کیں۔ پتہ چلا کہ انہوں نے کسی انسانی ذریعے سے یہودی اور عیسائی تاریخ کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ وہ پڑھنا لکھنا جانتے ہی نہ تھے۔ اس لئے انہوں نے براہ راست بائبل کا مطالعہ بھی نہیں کیا تھا۔ اب اگر فرض کیا جائے کہ انہوں نے قرآن کی ساری معلومات یہودی اور عیسائی علما سے معلوم کی تھیں تو یہ ناممکن ہے کہ زبانی گفتگو کو اتنی شرح وبسط سے یاد رکھا جائے اور پھر انہیں کتابی صورت میں مرتب بھی کر لیا جائے۔ فرض کیا اگر یہ صورت ممکن بھی ہوتی تو یہ کھیل دوسرے لوگوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا اور پھر خود یہودیوں اور عیسائیوں کے لئے قرآن کی مخالفت بالکل بے تکی حرکت تھی۔ دراصل کچھ لوگوں نے اس طرح کے الزامات عائد کرنے کی کوشش بھی کی مگر کوئی ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے یہ الزامات دم توڑ بیٹھے۔

بہرحال مکمل اطمینان ہونے پر میں نے اسلام قبول کر لیا اور اس پر خدا کا شکر ادا کرتی ہوں۔

●.....●.....●

مولانا خلیل الرحمٰن مدنی

ذیل کا ایمان افروز واقعہ مقبول جہانگیر مرحوم نے مرتب کیا تھا اور ''اردو ڈائجسٹ'' لاہور کے شمارہ مئی ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا تھا۔

آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے کا ذکر ہے' یوپی کے مشہور و معروف قصبے رڑکی میں ایک بزرگ تشریف لائے اور قصبے کی ایک چھوٹی سی کچی مسجد میں ٹھہر گئے۔ کشیدہ قامت' سرخ و سفید چہرہ اور چہرے پر برستے ہوئے انوار۔ سرتا پا سفید لباس میں ملبوس' سن کچھ زیادہ نہ تھا۔ جوانی کی منزلیں طے کر کے ادھیڑ عمری کی سرحد میں قدم رکھ رہے تھے۔ مختصر سی شرعی ڈاڑھی میں چند ہی بال چاندی کے تھے ' تاہم شانِ بزرگی ان کی چال ڈھال اور لب و لہجے سے آشکارا تھی۔ گفتگو میں متانت' بشرے سے شرافت اور قول و عمل سے صداقت کا اظہار ہوتا۔ ابتدا میں جب تشریف لائے تو قصبے والوں نے خاص توجہ نہ دی' یہی جانا کہ مسافر ہیں مسجد میں چند روز ٹھہر کر چلے جائیں گے۔ مگر جب کئی دن گزر چکے اور مولانا کو لوگوں نے وہیں پایا تب ان کے حالات جاننے کی جستجو ہوئی۔ قصبے میں پڑھے لکھے افراد کی تعداد زیادہ نہ تھی تاہم مسلمانوں میں ذی علم موجود تھے۔ مسلمانوں کے علاوہ ہندو برہموں کے کئی معزز خاندان بھی رڑکی میں آباد تھے۔ مولانا نے مسجد کو نئے سرے سے آباد کیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے طلبہ ان کے پاس جمع ہونے لگے' وہ کسی سے کچھ طلب نہ کرتے ' فی سبیل للہ درس دیتے' لوگوں کو شرعی مسائل سے آگاہ کرتے' خود اذان دیتے اور پانچوں وقت کی امامت کرتے۔ دیکھنے والوں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ سخت متقی اور پرہیزگار ہیں۔ خود اپنی ذاتی روٹی پکاتے اور صبر شکر سے کھا لیتے' بلکہ مسجد میں آنے والے مسافروں کی

تواضع بھی خندہ پیشانی سے فرماتے‘ قصبے کے بازار میں نکلتے تو ادنیٰ واعلیٰ کو سلام کرنے میں پہل کرتے۔ بات چیت میں منہ سے پھول جھڑتے‘ بہت جلد قصبے کا قصبہ گرویدہ ہو گیا۔ مسلمان تو خیر دیوانہ وار فدا تھے‘ ہندو برہمنوں کی نگاہوں میں بھی ان کا احترام کم نہ تھا اور اکثر ہندو گھرانوں کے بچے ان سے اردو اور فارسی کا درس لینے مسجد میں آنے لگے۔

مولانا کا ارادہ رڑکی میں قیام کا تو نہ تھا، محض سیاحت کے لئے اِدھر آ نکلے تھے لیکن اس قصبے کا ماحول اور گرد و پیش کی آب و ہوا اس قدر پسندِ خاطر ہوئی کہ وہیں رہنے کا عزم کر لیا۔ وہاں سے تھوڑا دور حضرت مخدوم احمد صابر کلیری علیہ الرحمۃ کا مزار مبارک ہے جہاں مسلمانوں کی ہمہ وقت حاضری ہوتی‘ دوسری جانب ہندوؤں کا مشہور تیرتھ ہردوار بھی قریب ہی تھا۔ رڑکی کو اس اعتبار سے بھی خصوصیت حاصل تھی کہ انگریز حکمرانوں نے خاصی بڑی چھاؤنی قصبے سے باہر بنائی تھی‘ پہاڑوں کے باعث قصبے کی فضا بے حد خوش گوار اور سرد تھی اور اس کا حسن اس نہر نے دوبالا کر دیا تھا جو پہاڑوں کے اندر سے نکلتی اور آبادی کے درمیان میں سے گزرتی تھی۔ اسے نہر گنگ کہتے تھے۔ قصبے کی اکثر عمارتیں پتھر کی بنی ہوئی تھیں اور جا بجا میلوں میں پھیلے ہوئے باغ تھے۔ صبح کے وقت نہر کی جانب جائیے تو صبحِ بنارس یاد آئے اور شام کا سماں بالکل ایسا ہی ہوتا جیسے شامِ اودھ کا نظارہ کر رہے ہوں۔ مولانا کا نامِ نامی اسمِ گرامی عبد السمیع تھا اور بیدل تخلص کرتے تھے۔ شاعری میں مرزا غالب کے شاگرد تھے اور اگرچہ شعر کہنے کا ذوق باقی نہ رہا تھا تاہم جب شعر کہنے کا ذوق غالب ہوتا تو نعت کہتے‘ یہ حالت اس وقت سے شروع ہوئی جب شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت کا شرف نصیب ہوا۔ بعد میں حاجی صاحب نے سندِ خلافت عطا فرمائی اور مجازِ بیعت بھی ہوئے۔ اس کے بعد یک قلم مولانا کی ظاہری حالت تو بدلی ہی تھی‘ باطنی کیفیت بھی کچھ سے کچھ ہو گئی۔

مولانا کا آبائی وطن قصبہ کرم پور منہاراں تھا۔ ان کے والد محمد یوسف اپنے دور کے کاملِ فن طبیب ہوئے ہیں۔ مولانا عبد السمیع نے والد سے ابتدائی درسی کتابیں پڑھیں اور جب علم کا شوق فزوں ہوا تو شہرِ علم دلی تشریف لے گئے۔ اس زمانے میں بالکل نوجوان تھے بلکہ مسیں بھی نہ بھیگی تھیں‘ والد نے حضرت صہبائی کے نام رقعہ لکھ دیا تھا۔

صہبائی کسی تعارف کے محتاج نہ تھے‘ دلی کا بچہ بچہ انہیں جانتا تھا۔ دلی کالج میں عربی فارسی پڑھاتے تھے۔ سینکڑوں شاگرد تھے۔ مشاہیر دلی سے دوستانہ اور برادرانہ تعلقات استوار تھے۔ حکیم مومن خاں مومن‘ ذوق اور مرزا غالب سے بے تکلفی تھی۔ انہوں نے عبدالسمیع کو اپنا فرزند سمجھ کر محبت اور شفقت سے پڑھایا۔ پھر صدر الصدور مولانا مفتی صدر الدین آزردہ کے سپرد کر دیا۔ مفتی صاحب نے ہونہار شاگرد کو حدیث اور تفسیر پڑھائی۔ اس زمانے میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی بھی دلی میں تھے چنانچہ چند اسباق عبدالسمیع نے ان سے بھی پڑھے اور شاگردی کا شرف حاصل کیا۔ قیاس ہے کہ اس دوران میں حضرت حاجی امداد اللہ کی نگہِ شفقت بھی عبدالسمیع پر پڑی اور انہوں نے انہیں۔ . . اپنی طرف کھینچ لیا۔ ایک مرتبہ حاجی صاحب کے ساتھ سفر میں تھے‘ جب قصبہ تھجھانہ ضلع مظفر نگر میں داخل ہوئے تو حاجی صاحب پر معاً عجب کیفیت طاری ہوئی‘ ایک درخت کے نیچے ٹھہرے اور مولانا عبدالسمیع کی طرف دیکھ کر فرمایا: ’’میاں! جانتے ہو یہ درخت کیا ہے‘‘۔ پھر آبدیدہ ہو کر فرمایا ’’یہ وہ درخت ہے جس کے سائے میں سراج السالکین زبدۃ العارفین حضرت میاں جی نور محمد صاحب قدس سرہ نے ہمیں بیعت سے نوازا تھا‘‘ پھر حاجی امداد اللہؒ نے وہی کلاہ مبارک اپنے سر سے اتار کر مولانا عبدالسمیع کے سر پر رکھ دی جو میاں نور محمد نے حاجی صاحبؒ کے سر پر رکھی تھی۔

1857ء کے ہنگامۂ دار و گیر میں مولانا عبدالسمیع بڑی مشکل سے جان بچا کر دلی سے نکلے اور مختلف شہروں اور قصبوں میں گھومتے رہے، مگر کہیں امن چین نہ پایا۔ آخر قدرت کے نادیدہ ہاتھ نے راستہ دکھایا اور مولانا رڑکی میں آن کر ٹھہرے۔ کبھی کبھی حضرت مخدوم علاؤ الدین صابر کلیریؒ کے مزار پر حاضر ہوتے اور خاصی دیر تک مراقبے میں رہتے۔ ایک دن اسی عالم میں تھے کہ اپنے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ کا سراپا دکھائی دیا۔ حاجی صاحب اس زمانے میں ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ میں مستقل قیام کی نیت سے آ چکے تھے۔ مولانا عبدالسمیع نے دیکھا حاجی صاحبؒ کے ساتھ بارہ تیرہ برس کا ایک لڑکا بھی ہے۔ مولانا نے بصد ادب دریافت کیا حضرت! یہ بچہ کون ہے؟ فرمایا ’’ہمارا بیٹا‘‘۔ اس جواب پر مولانا عبدالسمیع کو بڑی حیرت ہوئی۔ ’’یہ آپ کیا فرماتے

ہیں؟" حاجی صاحبؒ نے جواب دیا" ہاں یہ ہمارا بیٹا ہے عنقریب تم اس سے ملو گے۔ اس کا خیال رکھنا۔"

اس مراقبے کے بعد بھی مولانا عبدالسمیع کی نظروں میں اس لڑکے کی صورت مدتوں قائم رہی۔ اکثر حیران ہو کر غور کیا کرتے کہ اس مراقبے میں حاجی صاحب نے جو کچھ فرمایا اس کا اصل مطلب کیا ہے۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اس حیص بیص میں حاجی صاحب کو خط بھی بھجوایا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ خیال کیا کہ شاید حضرت تک خط نہ پہنچا ہو گا تاہم روز بروز روح کی الجھن بڑھتی جاتی تھی۔ ایک روز مسجد میں بیٹھے طلبہ کو درس دے رہے تھے کہ ایک شخص مسجد کے دروازے کے قریب آیا۔ مولانا نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ آنے والا رڑکی کا نہایت دولت مند ہندو شخص تھا۔ مستری موتی سنگھ کے نام سے قصبے کا کون ایسا فرد ہو گا جو واقف نہ تھا۔ مولانا بھی اسے اچھی طرح پہچانتے تھے۔ وہ اٹھ کر دروازے پر گئے اور اب پہلی بار ان کی نظر مستری موتی سنگھ کے پیچھے کھڑے ہوئے ایک بچے پر پڑی۔ مولانا نے اس کی صورت دیکھی اور مبہوت رہ گئے۔ یہ صورت تو انہوں نے کئی برس پہلے اپنے مراقبے میں دیکھی تھی۔ انہوں نے مستری موتی سنگھ سے پوچھا کیسے آنا ہوا اور یہ لڑکا کون ہے؟ مستری نے ادب سے کہا یہ میرا لڑکا ناہر سنگھ ہے اسے پڑھنے لکھنے کا کوئی شوق نہیں، ہر وقت کھیل کود میں دھیان رہتا ہے۔ کئی پنڈتوں کے سپرد کر چکا ہوں کہ اسے آدمی بنائیں مگر سب اس کی شرارتوں سے نالاں ہو کر ہاتھ جوڑ گئے اب مجبور ہو کر آپ کی خدمت میں لایا ہوں اس پر نظر کیجیے، اردو اور فارسی پڑھا دیجیے حسب مقدور نذرانہ پیش کروں گا۔

مولانا نے مسکراتے ہوئے فرمایا" فقیر کو نذرانہ پیش کرنے کی ضرورت نہیں، بچے کو چھوڑ جایئے، خدا نے چاہا تو آپ کو شکایت نہ ہو گی"۔

مستری موتی سنگھ بچے کو چھوڑ گیا۔ مولانا نے شفقت اور محبت سے اس کا ہاتھ پکڑا اور مسجد کے اندر لے گئے۔ ناہر سنگھ نے ابتدا میں رسیاں تڑانا چاہیں مگر بہت جلد مولانا کے حسن سلوک اور محبت نے اسے رام کر لیا۔ ایسی شفقت اور ایسا پیار تو اسے اپنے گھر میں بھی نہ ملا تھا۔ چند روز کے اندر اندر اسے مولانا کے ساتھ ایسا انس ہوا کہ گھر جانے کو تیار نہ ہوتا۔ مولانا کے پیر و مرشد حاجی صاحب کا فرمان تھا کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ اس اعتبار سے

ہر وقت ناہر سنگھ کی تعلیم و تربیت کا ایسا خیال رکھتے جیسے انہی کی اولاد ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ناہر سنگھ نے فارسی کی ابتدائی کتابیں ختم کرلیں اور مولانا نے اسے قرآن مجید پڑھانا شروع کیا۔ تاہم اتنا ضرور سمجھایا کہ ابھی اپنے گھر والوں سے اس کا ذکر نہ کرنا۔ آہستہ آہستہ ناہر سنگھ کے ذہن میں ایک عجیب انقلاب برپا ہونے لگا۔ مولانا اسے سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحابِ رسولؐ کے واقعات سنایا کرتے۔ خود بہت اچھے قاری بھی تھے جب طلبہ پڑھ کر رخصت ہو جاتے تو ناہر سنگھ کو سامنے بٹھا کر قرآن کی تلاوت کرتے یہاں تک کہ ایک روز ناہر سنگھ نے روتے ہوئے ان کے قدموں پر سر رکھ دیا اور اسے کفر کی تاریکیوں سے نکال کر اسلام کے نور سے منور کرنے کی التجا کی۔ ناہر سنگھ جب مولانا کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوا تھا تو اس کی عمر بارہ برس کی تھی چھ سال کا عرصہ گزر گیا تھا۔ اب وہ اٹھارہ برس کا نوجوان تھا اور مروجہ قانون کی رو سے قطعی بالغ اور عاقل، چنانچہ مولانا نے اسے دائرۂ اسلام میں داخل کرلیا اور اس کا ہندوانہ نام بدل کر نیا اسلامی نام خلیل الرحمٰن رکھا۔

ناہر سنگھ نے اپنے قبولِ اسلام کا واقعہ خود قلم بند کیا ہے اسے ہم اس کے الفاظ میں یہاں درج کرتے ہیں:

''ایک دن جب سبق ختم ہوا اور مَیں نے مولانا سے گھر جانے کی اجازت چاہی تو انہوں نے فرمایا: ''ناہر سنگھ! یہ تو بتاؤ خدا نے ہمیں کس لئے پیدا کیا ہے؟ مَیں نے جواب دیا اپنی عبادت کے لئے۔ یہ سن کر مولانا متبسم ہوئے اور بولے عبادت سے تمہاری کیا مراد ہے؟ مَیں نے عرض کیا جو کچھ آپ نے تعلیم فرمایا ہے' اسی کی بنا پر کہتا ہوں کہ میں اپنے دھرم کا سختی سے پابند ہوں اور یہی ہمارے گھر کا دستور ہے' میرے والد دھرم کے معاملات میں بہت احتیاط کرتے ہیں اور کسی رو رعایت کے قائل نہیں۔ مَیں بغیر نہائے کھانا نہیں کھاتا اور کھانا بھی ہمیشہ زمین لیپ پوت کر چوکے ہی پر کھاتا ہوں۔ دیوی دیوتاؤں کی پوجا بھی پابندی سے کرتا ہوں۔ ہمارے گھر میں بڑے پنڈت جی برابر آتے رہتے ہیں۔ سارا گھرانا انہیں گرو مانتا ہے۔ وہ جو باتیں بتاتے ہیں انہیں سننا اور ان پر عمل کرنا بھی میرا کام ہے۔ بس مَیں اس سے زیادہ اپنے دھرم کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

مولانا خاموشی سے میری تقریر سنتے اور مسکراتے رہے' آخر انہوں نے دل نشیں لہجے

میں فرمایا: "بیٹا! یہ تمہاری پوجا پاٹ اور دیوی دیوتاؤں کی مورتیوں کے آگے سر جھکانا عبث ہے۔ یہ بت تو اپنے ہاتھ سے تم نے خود بنائے ہیں ان پر اگر مکھی اور مچھر بیٹھ جائے تو یہ انہیں اڑانے کی سکت نہیں رکھتے بھلا یہ بت تمہاری کیا حاجت پوری کر سکیں گے؟ اشنان کر کے ننگے بدن کھانا پینا اور گائے کے گوبر اور پیشاب کو پاک سمجھنا دھرم کیسے ہو گیا؟ تم خوب سمجھتے ہو کہ یہ چیزیں نجس اور ناپاک ہیں تم اپنے دھرم پر جتنا غور کرو گے اتنی ہی الجھنیں تمہارے سامنے آ جائیں گی۔

مولانا کی یہ باتیں میں پہلے بھی سنتا رہا تھا لیکن اس روز انہوں نے جو کچھ فرمایا وہ اتنا اثر انگیز تھا کہ ایک ایک لفظ دل میں اترتا چلا گیا۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ ہمارا دھرم اور اس کا سارا سلسلہ کس قدر خلاف عقل ہے۔ رفتہ رفتہ میں نے دینِ اسلام کا گہرا مطالعہ شروع کیا۔ مولانا کی صاف اور سیدھی سادی اسلامی زندگی میرے سامنے بطور نمونہ تھی۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ اقدس سے متعلق بہت سے واقعات مختلف کتابوں میں پڑھے اور اپنے محترم استاد کی زبان سے بھی سنے۔ ان سے بھی گہرا اثر قبول کیا اور یوں ذاتی تحقیق اور جستجو سے مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ میں کتنی گمراہی اور تاریکی میں گھرا ہوا ہوں۔ روز بروز کفر سے مجھے نفرت ہوتی چلی گئی اور دائرۂ ایمان میں داخل ہونے کے لئے اضطراب اور بے قراری میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ مبارک ساعت آ گئی جب مولانا نے میری طلب اور درخواست پر مجھے کلمۂ طیبہ پڑھایا اور میں نے باقاعدہ اسلام قبول کر لیا۔ لیکن مصلحت کے تحت میں نے اپنے اسلام کا اعلان باقاعدہ نہ کیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد مولانا کی شفقت، محبت اور ہمدردی بہت بڑھ گئی۔ انہوں نے مجھے قرآنِ کریم ناظرہ پڑھایا پھر تفسیر بھی پڑھائی۔ فقہ اور حدیث کی تعلیم بھی دی۔ صوم وصلوٰۃ کا پابند کیا۔ مگر میں یہ تمام امور پوشیدہ ہی سرانجام دیا کرتا۔ ان دنوں مولانا ایک چھوٹے سے مکان میں منتقل ہو گئے تھے۔ میں وہیں جا کر نمازیں ادا کرتا۔ قرآن کی تلاوت میں اس قدر سرور ملتا کہ بیان سے باہر ہے، لیکن سب سے زیادہ دشواری رمضان المبارک میں پیش آیا کرتی۔ میں روزے سے ہوتا اور میرے گھر والے مجھے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلانے کی کوشش کرتے اور اس حقیقت سے بچنے کے لئے طرح طرح

کی تدبیروں اور حیلے بہانوں کا سہارا لینا پڑتا تھا۔

کبھی میں نہانے میں دیر کر دیتا کبھی کہتا میرے پیٹ میں درد ہے، میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ کبھی بہانہ کرتا کہ اس وقت میں چاول روٹی نہیں کھاؤں گا حلوا پوری کھانے کو جی چاہتا ہے اور میں خود جا کر بازار سے لاؤں گا۔ کبھی یہ تدبیر کرتا کہ اس قدر سردی ہے اگر میں نہایا تو بیمار پڑ جاؤں گا اور نہائے بغیر کھانا ہمارے دھرم میں کھایا نہیں جا سکتا۔ اس لئے آج فاقہ ہی کر لوں تو بہتر ہے۔ ویسے بھی طبیعت ٹھیک نہیں۔ جب اس قسم کے بہانے ختم ہو جاتے تو آخر میں یہی حیلہ کام آتا کہ ابھی طبیعت ٹھیک نہیں میرا کھانا رکھ دیا جائے، جب بھوک لگے گی تب کھا لوں گا۔ ان حیلوں بہانوں کے بعد بھی طوعاً و کرہاً گھر والے جب مجھے کھانے کے لئے بٹھا لیتے تو میرے اضطراب اور بے چینی کی انتہا نہ رہتی۔ معاً کوئی نہ کوئی نیا حیلہ سوجھ ہی جاتا اور میں یہ عذر کر کے اٹھ کھڑا ہوتا کہ چھوٹی بہن نے میرے کھانے کی تھالی کو ہاتھ لگا دیا ہے اب میں یہ کھانا نہیں کھا سکتا وغیرہ۔ قصہ مختصر ہزاروں جتن کر کے اپنا روزہ بچاتا پھر بھی ایسے لمحے نمودار ہو ہی جاتے جب والد مجھے اپنے سامنے بڑی محبت سے بٹھا لیتے اور کھانا کھانے کا حکم دیتے۔ اس وقت میرے لئے اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہ ہوتی کہ جھوٹ موٹ منہ چلاتا رہوں اور چھوٹے چھوٹے لقمے بنا کر نہایت ہوشیاری سے والد کی نگاہ بچا کر اپنے دامن یا قریب رکھی ہوئی پانی کی گڑوی میں ڈالتا جاؤں اور جب والد کھانا کھا کر اٹھیں تو وہ گڑوی کسی جگہ خالی کر آؤں۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ احساس میرے قلب و روح کو چھیدنے لگا کہ اگر میں واقعی مسلمان ہوں تو مجھے اس قسم کے کمزور سہاروں اور حیلے بہانوں سے کام نہ لینا چاہئے اور اپنے مسلمان ہونے کا بے خوف و خطر اعلان کر دینا چاہئے، آخر ایک نہ ایک دن تو لوگوں کو پتہ چل ہی جائے گا۔

ابھی میں اسی حیص بیص میں تھا کہ ایک روز خود بخود یہ راز کھل گیا۔ میں مولانا کے مکان پر پہنچا اور ظہر کی نماز کے لئے مصلیٰ بچھایا۔ پھر ان کا لوٹا لے کر وضو کرنے لگا۔ میں نماز قضا ہو جانے کے ڈر سے اتنی عجلت میں تھا کہ معمول کی احتیاطیں بھی بھول گیا تھا اور مجھے قطعاً پتہ نہ چلا کہ یہ سب حرکتیں میرا حقیقی ماموں جواہر سنگھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا

ہے۔ ادھر مَیں نے نماز کی نیّت باندھی اُدھر میرا ماموں مولانا کے مکان میں آ گیا اور وہ چپ چاپ وہیں کھڑا مجھے رکوع و سجود کرتے دیکھتا رہا۔ جب مَیں نے سلام پھیرا تو اس پر نگاہ پڑی۔ ایک لمحے کے لئے میرے قلب کی حالت دگرگوں ہو گئی مگر فوراً ہی مَیں نے دل میں استغفار شروع کر دی۔ ماموں نے لال پیلی آنکھیں نکال کر کہا ''او بدمعاش کیا تو مسلمان ہو گیا ہے؟ دیکھ تیری کیا درگت بنواتا ہوں! تجھے زندہ چھوڑ دیا تو میرا نام جواہر سنگھ نہیں کچھ اور ہے''۔ یہ کہہ کر وہ غصے میں بڑبڑاتا باہر نکل گیا اور مَیں دم بخود مصلّے پر بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا۔

اس کے بعد ناہر سنگھ پر ابتلاء و آزمائش کا وہ دور آیا جو کم و بیش چھ سال جاری رہا۔ اس کے والد اور خاندان کے دوسرے لوگوں نے اس اٹھارہ سالہ نوجوان پر ظلم و ستم اور تشدد کا ایسا سلسلہ شروع کیا کہ جس کے تصوّر ہی سے بدن پر لرزہ طاری ہوتا ہے۔ مولانا عبدالسمیع نے ناہر سنگھ سے کہا کہ آزمائش کے اس کٹھن وقت میں اگر عزم و استقلال اور صبر و ثبات سے کام لو گے تو انشاء اللہ دشمنوں کے دل خود ایک روز نرم ہو جائیں گے۔ ناہر سنگھ مولانا کے گھر سے رخصت ہو کر جب اپنے مکان پر پہنچا تو مستری موتھی سنگھ گھر کے دوسرے افراد سمیت اپنے بیٹے کا انتظار کر رہا تھا۔ جواہر سنگھ نے نہ جانے کیا کیا کچھ کہا تھا کہ ہر ایک کی آنکھوں میں خون اتر رہا تھا۔ موتھی سنگھ نے زندگی میں شاید پہلی بار اپنے بیٹے کو انتہائی بے دردی سے پیٹا۔ پہلے ہاتھوں سے اور پھر بید سے۔ ناہر سنگھ کی ماں نے ایک دو بار اسے بچانے کی ہمت کی مگر موتھی سنگھ غصے میں اندھا ہو رہا تھا اس نے ناہر سنگھ کی ماں کو بھی مارا اور کہا کہ تو نے اسے جنا ہے اور اس نے مسلمان ہو کر پورے خاندان کی عزت آبرو خاک میں ملا دی ہے۔ اس لئے تو بھی اتنی ہی قصوروار ہے جتنا تیرا لڑکا۔ ناہر سنگھ پٹتا رہا اور پٹ پٹ کر لہولہان ہو گیا۔ اس نے زبان سے اف تک نہ کی۔ اذیّت کے بارے میں خود ایک جگہ لکھا ہے ''اس روز میرے والد اتنے مشتعل تھے کہ مَیں نے انھیں اس عالم میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ ایسا لگتا تھا مجھے جان سے مار ڈالیں گے۔ تاہم جوں جوں ان کا ہاتھ چلتا گیا،

میں دل ہی دل میں درود شریف پڑھتا رہا۔ بالآخر وہ مار مار کر تھک گئے اور غصے میں کانپتے ہوئے دوسرے کمرے میں جا کر چارپائی پر لیٹ گئے۔ کئی دن میرے زخموں پر ہلدی چونا تھوپا جاتا رہا۔ والد نے حکم دیا تھا کہ گھر کا کوئی فرد میرے قریب نہ آئے اور بات بھی نہ کرے اور نہ مجھے باہر نکلنے دیا جائے۔

آہستہ آہستہ بستی کے تمام ہندوؤں کو علم ہو گیا کہ موتی سنگھ کے بیٹے نے اپنا دھرم چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا ہے۔ ایک سرے سے دوسرے تک غل مچ گیا۔ دھرم کے بڑے بوڑھے جمع ہوئے اور گھنٹوں اس امر پر سوچ بچار ہوا کہ اس فتنے کو کیونکر روکا جائے۔ خدشہ یہ تھا کہ آج ناہر سنگھ مسلمان ہوا کل کلاں کوئی اور ہندو لڑکا اپنا دھرم چھوڑے گا۔ آخر میں یہ فیصلہ ہوا کہ اس فتنے کی اصل جڑ اس مولوی ہی کو قصبے سے نکالا جائے جس نے ناہر سنگھ کو خلیل الرحمن بنایا۔ چنانچہ معزز ہندوؤں کا ایک وفد مولانا عبدالسمیع کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ وہ بستی چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں ورنہ غضب ناک ہندو نوجوان انہیں قتل کر دیں گے۔ لیکن مولانا ایسی دھمکیوں میں آنے والے نہ تھے۔ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ ناہر سنگھ اپنی خوشی سے مسلمان ہوا ہے اور خدا نے چاہا تو مسلمان ہی رہے گا۔ اس قصے کی اطلاع رڑکی کے مسلمانوں تک بھی پہنچی اور جب انہیں پتہ چلا کہ ہندوؤں نے مولانا کو قتل کرنے کی دھمکیاں دی ہیں تو ان میں بھی اشتعال پھیل گیا۔ مولانا نے مسلمانوں کو سمجھایا کہ چند روز کی بات ہے پھر ہندوؤں کا غصہ خود بخود ٹھنڈا پڑ جائے گا، مگر مسلمان نہ مانے اور کہنے لگے کہ ناہر سنگھ اگر مسلمان ہو چکا ہے تو اب وہ ان کا دینی بھائی ہے اور قصبے کے مسلمان ہرگز برداشت نہیں کریں گے کہ ہندو خلیل الرحمن پر ظلم و تشدد کریں۔

مولانا عبدالسمیع نے دیکھا کہ اس طرح قصبے میں ہندو مسلم فساد برپا ہو جائے گا اور خواہ مخواہ کئی جانیں ضائع ہوں گی لہٰذا وہ اگلے ہی روز کسی کو بتائے بغیر رڑکی سے چلے اور میرٹھ پہنچ گئے۔ برہمنوں نے اطمینان کا سانس لیا' ان کا خیال تھا کہ جب تک مولانا قصبے میں موجود ہیں اس وقت تک ناہر سنگھ مسلمان رہے گا اور جونہی اسے معلوم ہو گا کہ مولانا

یہاں سے جا چکے ہیں وہ اپنے دھرم پر واپس آ جائے گا۔ ادھر ناہر سنگھ نے جی میں مصمم ارادہ باندھ لیا کہ خواہ جان بھی چلی جائے وہ ایمان سے کفر کی طرف نہ جائے گا۔ مصائب اور مشکلات سے بھرپور اس زمانے کے واقعات آپ اکثر عمر کے آخری دور میں عقیدت مندوں اور تلامذہ سے بیان فرمایا کرتے تھے۔ ان ملفوظات کے مطالعے سے اس آزمائش اور ابتلا کی جو تصویر سامنے آتی ہے وہ عجیب ہونے کے ساتھ ساتھ باعثِ عبرت و موعظت ہے کہ جب قلب و روح میں ایمان پختہ ہو جائے تو دنیا کی بڑی سے بڑی آفت اور مصیبت بھی اس کے آگے ہیچ ہے۔ حضرت مولانا خلیل الرحمٰن کا ہندو دھرم ترک کر کے اسلام قبول کرنا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا اور ایسے قصبے میں جہاں اکثریت متمول با اثر اور با رسوخ برہمنوں کی تھی' برہمن خاندان کے ایک نوجوان کا قبولِ اسلام جس ہنگامے کا باعث بن سکتا تھا وہ اظہر من الشمس ہے۔ مولانا آب دیدہ ہو کر اکثر ان واقعات کا ذکر کیا کرتے۔ صاحبِ انوارِ خلیل نے یہ ملفوظات ترتیب دیئے ہیں :۔

"جب میں مسلمان ہوا تو قصبے کے عام ہندوؤں کے علاوہ میرے گھر والے بھی جانی دشمن ہو گئے۔ ان کا بس نہ چلتا تھا ورنہ وہ میرا سینہ شق کر کے ایمان کھرچ ڈالتے تاہم بدنی اور روحانی اذیتیں دینے میں انہوں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ خاص طور پر میرے والد موتی سنگھ کا غیظ و غضب تو انتہا پر پہنچ گیا۔ ان کی ساری محبت اور شفقت عداوت اور نفرت میں بدل گئی۔ مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں واقعی خون اتر آتا اور وہ مجھے بے دریغ جوتوں اور ڈنڈوں سے پیٹنے لگتے۔ مجھ سے انہوں نے کہا اسلام ترک نہ کرے گا تو مارتے مارتے تجھے مار ہی ڈالوں گا۔ خواہ بعد میں مجھے پھانسی ہی کیوں نہ ہو جائے۔

ایک رات اپنی کال کوٹھڑی میں پڑا آنسو بہا رہا تھا' دن بھر مجھے کھانے کو کچھ نہ ملا تھا۔ حد یہ کہ پانی کی ایک بوند بھی میرے حلق سے نہ اتری تھی۔ اسی حال میں غنودگی سی طاری ہوئی' خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک حسین و جمیل نوجوان میرے پاس آیا' مجسمۂ وقار اور پیکرِ جمال و جلال' اس کی رفتار و گفتار سے شانِ ربی کا مظاہرہ ہو رہا تھا' میں نے حیرت سے پوچھا "آپ کون ہیں"؟ نوجوان نے متبسم ہو کر کہا "میں امداد اللہ ہوں...... آؤ میرے ساتھ چلو......" یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ تھاما اور مغرب کی طرف روانہ ہوا۔

میں حیران پریشان اس نوجوان کے ساتھ چلا جاتا تھا اور خواب ہی میں مجھے احساس ہوا کہ یہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ہیں جو نوجوان کی شکل میں تشریف لائے ہیں۔ مجھے ان سے کچھ پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی کہ آپ مجھے کہاں لئے جا رہے ہیں۔ مَیں چپ چاپ چلتا گیا اور میرا ہاتھ بدستور اپنے دستِ مبارک میں تھامے رہے۔ یکایک خود کو ایک شہر میں پایا، لوگ عربی لباس پہنے ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے اور میری نگاہوں کے سامنے کوچہ و بازار پھیلتے چلے گئے تھے۔ تب مَیں نے اپنے رہبر سے پوچھا کہ حضرت جہاں اس وقت آپ مجھے لائے ہیں یہ کونسی جگہ ہے؟ حضرت امداد اللہ نے فرمایا خلیل الرحمن ذرا چشمِ دل کھول کر دیکھ...... اس گھر کا مالک اور مکین زمانے کا شہنشاہ ہے...... اتنا کہنا تھا کہ میری آنکھیں روشن ہو گئیں' حجابات اٹھنے لگے' مَیں نے دیکھا کہ میرے سامنے تمام جمال آرائیوں اور تابانیوں کے ساتھ کعبۃ اللہ موجود ہے۔ اس کا سیاہ ریشمی پردہ عجب بہار دکھا رہا ہے اور ہر حیثیت کے انسان مصروفِ طواف ہیں۔ کعبے کی زیارت سے میرا قلب ربُّ العالمین کی جلوہ گاہ بن گیا اور جب دفعۃً میری آنکھ کھلی تو میرا اضطراب انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ دل میں خدا اور حبیبِ خدا کی محبت بڑھتی جا رہی تھی اور کسی پہلو قرار نہ تھا۔ اس کے ساتھ مستقبل میں پیش آنے والے شدائد کا تصور میرے جذبۂ عشق و محبت کے لئے مہمیز ثابت ہوا اور قلب میں محبت کا ایسا شعلہ بھڑکا جس نے باطل کا ہر رابطہ خاکستر بنا کر رکھ دیا۔

ایک روز والد نے میری والدہ سے کہا اگر یہ لڑکا مجھے صاف صاف بتا دے کہ مسلمان ہو چکا ہے اور دوبارہ اپنے سچے دھرم پر واپس آنے کے لئے تیار نہیں تو مَیں اسے زہر دے کر بدنامی سے نجات حاصل کر لوں۔ میری والدہ مجھ سے بڑی محبت کرتی تھیں اور گھر بھر میں یہی ایک ہستی ایسی تھی کہ جس سے مجھے بھلائی کی توقع تھی۔ وہی مجھے چپکے سے آن کر کھانا دے جاتیں اور بار بار اس بات کی تلقین کرتیں کہ اپنے باپ کے سامنے مسلمان ہونے کا اعتراف نہ کرنا ورنہ وہ تجھے قتل کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ مَیں خاموش رہتا۔ ہاں یا ناں میں کچھ جواب نہ دیتا۔ جب چند روز گزر گئے تو والدہ نے میرے والد کو مشورہ دیا کہ ناہر سنگھ ابھی بچہ ہے نا سمجھ ہے اس پر اتنی سختی ٹھیک نہیں' غلطی تو اپنی ہی ہے کہ اسے کیوں ایسے شخص کے پاس پڑھنے بٹھایا جس نے اس پر جادو ٹونا کر دیا، ورنہ ہمارا بچہ

کبھی مسلمان نہ ہوتا جونہی اس کا اثر ٹوٹے گا وہ دوبارہ اپنے دھرم میں آ جائے گا۔ بہتر یہ ہے کہ اسے رڑکی سے باہر کسی اور جگہ بھیج دیا جائے تاکہ یہاں کے مسلمانوں سے اسے ربط ضبط کا موقع ہی نہ ملے۔

یہ بات والد کے ذہن میں بیٹھ گئی' انہوں نے کہا کہ فی الحال ناہر سنگھ کو کہیں اور بھیجنا مناسب نہ ہو گا البتہ اسے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔ میں اس کے لئے ایسا بندوبست کئے دیتا ہوں کہ اسے ادھر ادھر کی باتیں سوچنے اور کسی غیر شخص سے ملنے ملانے کا موقع ہی نہ ملے۔ چنانچہ انہوں نے ہندی' انگریزی اور حساب کے کئی ہندو ٹیچر میری تعلیم اور نگرانی پر مقرر کر دیئے۔ صبح دس بجے سے دوپہر ایک بجے تک ایک استاد انگریزی پڑھانے گھر پر آتے۔ اس کے بعد میں دوپہر کا کھانا کھاتا۔ فوراً بعد ہندی اور سنسکرت کے استاد آ جاتے' وہ مجھے ہندو دھرم کی خوبیوں سے آگاہ کرتے۔ رام' لکشمن اور سیتا کے قصے سناتے۔ میں طوعاً و کرہاً سنتا اور گردن ہلاتا رہتا۔ وہ سمجھتے طالب علم پر ان کی تقریر کا بے حد اثر ہو رہا ہے لیکن میں دل ہی دل میں لاحول ولاقوۃ الا باللہ کا ورد کرتا رہتا۔ شام تین چار بجے تک پڑھا کر وہ تشریف لے جاتے تو ایک ماہر حساب پنڈت جی آ جاتے' یوں یہ اوقات مقرر ہو گئے۔

ایک دن ہندی اور سنسکرت پڑھانے والے پنڈت جی نے مجھ سے پوچھا ''کیا واقعی میں مسلمان ہو گیا ہوں؟'' میں نے صاف اقرار کرنا مناسب نہ جانا البتہ اتنا کہا'' میں نے اسلام کے بارے میں کتابیں پڑھی ہیں اور مجھے اس دین میں کوئی بات قابل اعتراض نظر نہیں آئی۔ میں نے محسوس کیا کہ میری باتیں سن کر پنڈت جی کو بھی دلچسپی پیدا ہوئی اور وقتاً فوقتاً میں نے انہیں اسلام کی خاص خاص باتوں اور خوبیوں سے آگاہ کرنا شروع کیا۔ سیرت رسولؐ اور اصحاب رسول کے کارنامے سنائے۔ بزرگان دین کی زندگیوں اور ان کے پاکیزہ معمولات و اشغال سے خبردار کیا۔ میری یہ باتیں سن کر پنڈت دھرم پرشاد جی کچھ کھوسے جاتے اور ان کا چہرہ متغیر ہونے لگتا۔ مجھے شبہ ہوتا کہ شاید غیظ و غضب میں آن کر مجھے ادھیڑنے لگیں گے یا والد سے شکایت کریں گے کہ آپ کا بیٹا تو ہاتھ سے جاتا رہا۔ یہ پکا مسلمان ہو چکا ہے اور اب اس کے ہندو دھرم میں واپس آنے کا کوئی امکان نہیں۔

لیکن ایسا نہ ہوا بلکہ ایک روز وہ مجھے اپنے ساتھ گھر سے باہر باغ میں لے گئے اور ادھر ادھر دیکھ کر کہنے لگے'' بیٹا! میں تیرا احسان مند ہوں کہ تو نے مجھے گمراہی اور تاریکی سے نکالا' میں جان گیا ہوں کہ اسلام ہی سچا دین اور دھرم ہے' اب تو مجھے کلمہ پڑھا کر مسلمان کر لے۔'' میں مبہوت ہو کر اس کا چہرہ تکنے لگا' مجھے اپنی سماعت پر یقین ہی نہ آ رہا تھا، لیکن جب میں نے پنڈت جی کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو یقین آ گیا۔ وہیں باغ میں بنے ہوئے کنویں پر پنڈت جی نے غسل کیا اور میں نے انہیں کلمۂ طیبہ پڑھا کر دائرۂ اسلام میں داخل کر لیا۔ پنڈت جی کے مشرف بہ اسلام ہونے سے میرے قلب کو اس قدر تقویت پہنچی اور ایسی روحانی خوشی نصیب ہوئی جو اس کے بعد زندگی میں پھر کبھی نصیب نہ ہوئی۔ اب ہم دونوں گھر سے نکل کر باغ میں آ جاتے اور نہایت اطمینان سے نمازیں پڑھتے' میں نے پنڈت جی کو ناظرہ قرآن پڑھایا۔ گھر میں والد کے سامنے وہ بدستور پنڈت بنے رہتے تھے۔ مجھے ہندی اور سنسکرت کی کتابیں پڑھاتے' رامائن اور بھگوت گیتا کے درس دیتے اور گھر سے باہر میں ان کا استاد بن جاتا۔

ہمارے گھر میں کئی نوکر تھے۔ ان میں بہلی ہانکنے والا ایک بوڑھا دیا رام بھی شامل تھا۔ دیا رام نے مجھے بچپن میں کھلایا تھا اور مجھ سے بڑی الفت رکھتا تھا۔ ایک دن جب ہم باغ میں اپنے منتخب گوشۂ تنہائی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ خلاف معمول دیا رام ادھر آ گیا اور اس نے مجھے اور پنڈت جی کو نماز پڑھتے دیکھ لیا۔ وہ وہیں بیٹھ گیا اور جب ہم نے سلام پھیرا تو وہ اٹھ کر پنڈت جی کے قدموں میں گر پڑا۔ معلوم ہوا کہ وہ بھی مسلمان ہونا چاہتا ہے اور مدتوں سے یہ پاکیزہ خواہش دل میں لیے پھر رہا ہے۔ دیا رام کو بھی ہم نے مسلمان کیا اور اب ہم تین مسلمان ہو گئے۔ نمازوں میں جو لطف آتا وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ کبھی پنڈت جی امامت کرتے اور میں اور دیا رام مقتدی بنتے۔ کبھی میں امامت کرتا اور وہ دونوں مقتدی ہوتے۔ والد کو بھی گھر بھر کے نوکروں میں دیا رام پر سب سے زیادہ اعتماد تھا چنانچہ جب مجھے گھر سے باہر کہیں جانا ہوتا تو وہ دیا رام ہی کو میرے ساتھ بھیجتے اور یوں اللہ کی رحمت سے میرے تمام معمولات حسب مرضی پورے ہو جاتے۔

والد کا دل اگرچہ میری طرف سے صاف نہ ہوا تھا تاہم ان کے غیظ و غضب اور

آئے دن کی مار پیٹ میں کمی ضرور آ گئی تھی۔ ایک جب میں حساب کے پنڈت جی سے فرصت پا کر مغرب کی نماز کے لئے باغ میں جانے کی تیاری کر رہا تھا والد نے مجھے آواز دے کر اپنے کمرے میں بلایا۔ میرا دل دھڑکنے لگا کہ ضرور کوئی خاص بات ہے۔ دل ہی دل میں درود شریف کا ورد کرتا ہوا میں ان کے کمرے میں گیا تو انہوں نے محبت سے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب ہی بٹھا لیا اور نرم آواز میں کہا نا ہر سنگھ! تمہارے دل میں جو بات ہے صاف صاف کہہ دو۔ میں کسی قسم کی سختی نہیں کروں گا۔ مجھے بتاؤ تم کس دھرم کو بہتر اور سچا سمجھتے ہو۔ میں نے جواب میں کہا آپ خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہیں اور مجھ پر الزام دھرتے ہیں یقین کیجئے میں اپنے ہی دھرم کو صحیح اور سچا سمجھتا ہوں۔ میرا دھرم سچا ہے اور دوسرے تمام مذاہب غلط ہیں۔ آپ دشمنوں کی باتوں کا اعتبار نہ کریں۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ میرے طور طریقے کس قدر صاف ستھرے ہیں؟ میں ہمیشہ نہا دھو کر کھانا کھاتا ہوں؟ غرض میں نے اسی قسم کی کئی باتیں کہیں جو غلط تھیں نہ جھوٹ۔ والد یہ سب سن کر کچھ مطمئن دکھائی دینے لگے اور انہوں نے مجھ سے کہا بیٹا! تمہارا ہی دھرم سب دھرموں کے مقابلے میں سچا ہے اسے کبھی نہ چھوڑنا اس پر جمے رہنا۔

وہاں سے تو میں شکر کا کلمہ پڑھتا چلا آیا لیکن چند ہی روز بعد ایک عجیب سانحہ ہوا جس نے والد کے دل میں پھر میری طرف سے غبار بھر دیا۔ کعبۃ اللہ اور مسجد نبوی کے دیدار کی حسرت اور اضطراب روز بروز بڑھتا جاتا اور مجھے ایک لحظہ قرار نہ تھا۔ ایک روز تنہائی کے عالم میں طبیعت اس جذبے سے بے خود ہو گئی اور میں گرد و پیش کے ماحول سے بے نیاز بلند آواز میں حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کے وہ اشعار پڑھ پڑھ کر زار و قطار رونے لگا جو آپ نے میدان کربلا میں پڑھے تھے۔

اِن نِلتَ یا ریحَ الصّبا یوماً اِلی الارضِ الحرم

بَلّغ سَلامی روضۃً فِیھا النّبیُّ المحترم ☆[1]

مجھے تو خبر بھی نہ ہوئی کہ میری آواز کب والد کے کانوں تک گئی اور کب انہوں نے

---

[1] یعنی اے صبح کی ہوا اگر کسی روز تو مدینہ منورہ کی طرف جائے تو روضۂ رسول پر میرا محبت بھرا سلام پہنچا دینا۔

لاتوں اور گھونسوں سے میری پٹائی شروع کی۔ مارتے جاتے اور کہتے جاتے بدمعاش میرے ہی گھر میں اتنی اونچی آواز میں قرآن پڑھتا ہے۔ میں نے لاکھ کہا کہ میں قرآن نہیں پڑھ رہا تھا لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور میری ہڈی پسلی ایک کر ڈالی۔ نتیجہ یہ کہ ایک بار پھر میرے ساتھ گھر میں اچھوتوں کا سا سلوک ہونے لگا اور والد نے میری نگرانی پہلے سے زیادہ کڑی کر دی۔ اسی دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ مولانا عبدالسمیع میرٹھ تشریف لے جا چکے ہیں۔ ان سے ملنے کو دل تڑپنے لگا لیکن میرٹھ تک پہنچنے کا کوئی سامان ہی نہ تھا۔ ایک دن بھلی ماں نے چپکے سے مجھے بتایا کہ تمہارے استاد مولانا صاحب رڑکی آئے ہوئے ہیں اور مسجد میں موجود ہیں۔ بس اتنا سننا تھا کہ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ والد اس وقت گھر میں نہ تھے۔ میں نے والدہ کے پاؤں پکڑ لئے اور کہا تھوڑی دیر کے لئے باہر جانے کی اجازت دے دیں اور اس کا ذکر بعد میں والد سے نہ کریں۔ والدہ پہلے تو راضی نہ ہوئیں مگر میری منت سماجت سے ان کا دل پسیج گیا اور انہوں نے اس شرط پر مجھے جانے کی اجازت دی کہ گھنٹے آدھ گھنٹے کے اندر اندر واپس آ جاؤں گا۔ میں خوشی خوشی گھر سے نکلا اور مسجد کی طرف روانہ ہوا جو ہمارے مکان سے ایک میل دور ہو گی۔ ابھی میں آدھے راستے میں تھا کہ میں نے والد کو نوکروں کے ساتھ آتے دیکھا۔ میں لپک کر درخت کی آڑ میں ہو گیا۔ احساس ہوا کہ والد اس اثنا میں واپس آ گئے اور اب میری ہی تلاش میں نکلے ہیں۔ اب مسجد جانا مناسب نہ تھا۔ مجھے یاد آیا قریب ہی والد کے ایک پرانے دوست پنڈت تیکی رام رہتے ہیں۔ میں لپک کر پنڈت جی کے گھر میں داخل ہو گیا اور انہیں پرنام کر کے پاس بیٹھ گیا۔ پنڈت جی مجھے دیکھ کر کچھ خوش' کچھ حیران ہوئے اور پوچھنے لگے کیسے آئے؟ میں نے بات بنائی کہ بہت دنوں سے آپ کو دیکھا نہ تھا اس لئے ادھر چلا آیا۔ ابھی یہ بات ہو رہی تھی کہ میرے والد وہاں آن پہنچے اور آتے ہی ڈپٹ کر مجھ سے پوچھا گھر سے نکل کر کہاں گیا تھا؟ سچ سچ بتا دے ورنہ ابھی تیرا گلا گھونٹ دوں گا۔ میں نے کہا میں سیدھا یہیں آیا ہوں اور کہیں نہیں گیا۔ پنڈت تیکی رام کے جی میں نہ جانے کیا نیکی آئی کہ انہوں نے میری اس بات کی تائید کی اور کہا کہ لڑکا بہت دیر سے یہاں آیا ہوا ہے اور اکثر میری باتیں سننے آ جاتا ہے۔ پنڈت جی کی یہ بات سن کر والد مطمئن ہو گئے اور ان سے

کہنے لگے آپ کی بڑی کرپا ہو اگر آپ روزانہ رات کو ہمارے مکان پر آکر کتھا کہا کریں۔ پنڈت جی تیار ہو گئے اور اسی رات وہ اپنا سنکھ بغل میں داب ہمارے یہاں آ گئے۔ مسلسل تین گھنٹے ان کی کتھا ہوئی اور مَیں ایک گوشے میں بیٹھا دل ہی دل میں درود شریف پڑھتا رہا۔ پنڈت جی نے رواج کے مطابق کتھا میں کئی بار سنکھ بجانے کی کوشش کی لیکن درود شریف کی برکت سے وہ ایک بار بھی سنکھ نہ بجا سکے اور بعد میں حیران پریشان ہو کر چلے گئے۔

والد نے جب سے مجھے عربی زبان میں اشعار پڑھتے سنا تھا ان کا شک وشبہ پھر زندہ ہو گیا تھا اور وہ سمجھ چکے تھے کہ مَیں مسلمان ہو گیا ہوں۔ انہی دنوں ایک زبردست نجومی رڑکی میں آیا۔ بہت لوگ اس سے اپنا احوال پوچھتے رہے۔ والد نے اسے گھر میں بلایا اور مجھے بھی حاضر ہونے کا حکم دیا۔ نجومی نے میرے چہرے پر نگاہ ڈالی اور اس کا رنگ اڑنے لگا۔ مَیں نے فوراً دل میں آیت الکرسی کا وِرد شروع کر دیا اور چپکے سے نجومی پر دم کر دیا۔ دم کرنا تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں بری طرح لرزنے لگے اور اس کے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکل سکا۔ چند لمحوں بعد اس نے جانے کی اجازت چاہی اور گھر کے دروازے سے نکلتے ہی ایسا بھاگا کہ مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ نجومی کی اس حرکت پر سب لوگ سخت متعجب ہوئے اور ہر فرد اپنی اپنی بولی بولنے لگا۔ اس واقعے کا والد پر گہرا اثر ہوا اور انہوں نے گھر میں والدہ سے ذکر کیا کہ مجھے اس لڑکے سے اب خوف آنے لگا ہے۔ اس کے اندر کوئی زبردست شکتی ہے۔ چنانچہ اس روز سے انہوں نے مجھے مارنا پیٹنا بہت کم کر دیا تاہم نگرانی اُسی طرح جاری رہی۔

ایک دن اپنے مکان کی ڈیوڑھی میں اداس بیٹھا تھا اور تصور باندھا ہوا تھا اپنے استادِ محترم کا کہ دُور سے تین پاکیزہ صورتوں والے آدمی مجھے دکھائی دیئے۔ دل بے اختیار ان کی طرف کھنچنے لگا۔ اتفاق سے اس وقت گھر کا کوئی فرد میری جانب متوجہ نہ تھا۔ مَیں آہستہ سے باہر نکل گیا۔ وہ تینوں بزرگ آہستہ آہستہ چلتے ایک کھیت کے قریب پہنچے اور چادر بچھا کر بیٹھ گئے۔ مَیں نزدیک گیا تو اٹھ کھڑے ہوئے پھر انہوں نے باری باری مجھے سینے سے لگایا۔ مَیں نے دیکھا ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ تینوں محض مجھے دیکھنے کے لئے دیوبند سے تشریف لائے ہیں۔ اس سے پہلے مَیں نے انہیں دیکھا تھا نہ ان

کے اسمائے گرامی سے واقف تھا۔ ان میں ایک بزرگ حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ تھے۔ دوسرے مولانا سعادت علی اور تیسرے صاحب مولانا فیض الحسن سہارنپوری تھے۔ انہوں نے مجھے دین حق قبول کرنے پر مبارکباد دی اور نصیحت فرمائی کہ اس راہ میں جتنی تکالیف آئیں انہیں خندہ پیشانی سے برداشت کرنا۔ ایک دن آئے گا جب یہ پریشانیاں جاتی رہیں گی اور اللہ تمہیں صبر وشکر کے عوض دین ودنیا کی بھلائی عطا فرمائے گا۔ ان تینوں بزرگوں کی زیارت سے طبیعت بے حد مسرور ومحظوظ ہوئی۔ قلب کی طمانیت اور روح کی سرشاری کا کیا کہنا۔ احساس ہوا کہ راہ حق میں اب تک جتنے مصائب جھیلے ہیں۔ حقیقت میں ان کی حیثیت پرکاہ کے برابر بھی نہ تھی اور اگر اس سے بھی زیادہ آزمائشیں آئیں تو انشاء اللہ ان میں بھی پورا اتروں گا۔

یہ تینوں حضرات پورے ہندوستان میں مشہور ومعروف تھے اور یہ ممکن ہی نہ تھا کہ رڑکی میں ان کی آمد کی خبر کسی کو نہ ہوتی ہو آنا فانا سینکڑوں مسلمانوں کا ہجوم ہو گیا۔ ادھر میں سخت محجوب کہ میرے سبب سے ان بزرگوں کو تکلیف ہوگی۔ اسی اثنا میں قصبے کے ہندوؤں نے بھی مجھے ان حضرت سے ملاقات کرتے دیکھ لیا تھا اور یہ خبر والد کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ میں گھر گیا تو وہ میرے منتظر تھے اور ان کی آنکھوں میں جیسے خون اترا ہوا تھا۔ میں سمجھا آج پھر خیر نہیں۔ بری طرح مرمت ہوگی۔ چنانچہ میں نے زیر لب کلمۂ طیبہ کا وِرد شروع کیا اور گھر کے اندر چلا گیا۔ والد اپنی جگہ بیٹھے مجھے دیکھتے رہے اور خلاف معمول انہوں نے اس وقت کچھ سرزنش نہ کی۔ میں سیدھا اپنے کمرے میں گیا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد آہٹ سی ہوئی۔ میں نے گردن اٹھا کر دیکھا تو والد تھے۔ انہوں نے آتے ہی اندر سے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور چٹخنی چڑھا دی۔ میں سمجھا اب آفت ٹوٹے گی لہٰذا میں پٹنے کے لئے تیار ہو گیا۔ لیکن میں قطعی بھونچکا رہ گیا جب والد صاحب نے سر سے اپنی پگڑی اتاری اور میرے قدموں میں رکھ دی۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور کہا یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولے "بیٹا! میری آبرو رکھ لو مجھے لوگوں میں رسوا نہ کرو۔ تم اپنے گھر میں جو چاہو کرو مگر جب تک میں زندہ ہوں کھل کر ایسی حرکتیں نہ کرو جن کے سبب مجھے بدنامی اور شرمندگی سے دوچار ہونا پڑے"۔ یہ کہتے ہی وہ

دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور اس قدر روئے کہ ہچکی بندھ گئی۔ میں دم بخود تھا، کچھ عقل میں نہ آتا تھا کیا کروں۔ محبتِ پدری جو ایک فطری چیز ہے میرے اندر جوش کرنے لگی اور میں نے ان سے کہا اچھا آئندہ آپ کی مرضی کے خلاف نہ کروں گا۔ یہ سن کر وہ خوش ہوئے اور اپنے آنسو پونچھنے لگے۔

اگلے ہی روز وہ سورج نکلنے کے وقت میرے پاس آئے اور کہنے لگے "ناہر سنگھ تو نے وعدہ کیا تھا کہ میری مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کرے گا اور جو میں حکم دوں گا اس کی تعمیل کرے گا"۔ میں نے کہا کہ آپ کی پہلی بات کا اقرار کرتا ہوں کہ آپ کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کروں گا البتہ میں نے اس کا وعدہ نہیں کیا کہ جو حکم آپ دیں گے اس کی بھی تعمیل کروں گا۔ خیر آپ فرمایئے۔ انہوں نے کہا میرے ساتھ باہر چلو اور سورج دیوتا کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کرو تب میں جانوں کہ تمہیں میری خوشی عزیز ہے۔ یہ سنتے ہی میں نے ان سے کہا یہ حرکت مجھ سے نہ ہوگی خواہ آپ جان سے مار ڈالیں۔ اگر میں سورج کو پرنام نہ کروں تو اس سے آپ کا کیا بگڑتا ہے۔ اور کونسی بدنامی ہوتی ہے؟ والد چند لمحے چپ چاپ میری صورت تکتے رہے پھر کچھ کہے بغیر واپس چلے گئے۔

والد مکان کے نچلے حصے میں رہتے تھے اور میرا کمرہ بالائی منزل پر تھا۔ میرے کمرے میں لکڑی کا ایک صندوق رکھا رہتا اس میں دینی کتابیں بھری ہوئی تھیں انہی میں نہایت عمدہ کتابت کا قرآن مجید بھی تھا۔ ایک مرتبہ رات کے وقت سراج السالکین کا مطالعہ کر رہا تھا کہ والد نے نیچے سے آواز دی کہ آدھی رات ہوگئی، چراغ گل کرو اور سو جاؤ۔ میں نے اس اندیشے سے والد کہیں اوپر نہ آجائیں چراغ بجھا دیا اور گھبراہٹ میں سراج السالکین وہیں صندوق کے اوپر رکھ دی۔ حالانکہ میں ہمیشہ ایسی کتابیں صندوق میں مقفل کر کے رکھا کرتا تھا۔ ابھی میں نے چراغ بجھایا ہی تھا کہ والد اوپر آگئے اور کہنے لگے مجھے بتاؤ اس وقت کیا کر رہے تھے؟ میں نے دوبارہ چراغ جلایا اور کہا کہ ایک ضروری کتاب دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ان کی نظر سراج السالکین پر پڑ گئی۔ جھٹ کتاب اٹھائی اسے دیکھ کر آگ بگولا ہوگئے فوراً میرے چھوٹے بھائی کو بلایا اور اس سے پوچھا یہ کتاب کس کی ہے؟ بھائی نے گنگا جل کی قسم کھاتے ہوئے میرے بارے میں کہا کہ یہ کتاب ان کی نہیں اور نہ

ان کے پاس کبھی دیکھی۔ اگر ان کی ہوتی تو کبھی نہ کسی وقت میری نظر بھی پڑتی کیونکہ ان کی اکثر کتابیں میں دیکھا کرتا ہوں۔ یہ سن کر والد نے اسی وقت باہر سے اس مسلمان منشی کو طلب کیا جو ہمارے ہاں ملازمت کرتا تھا۔ والد نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا تو نے اپنی کتاب یہاں لا کر کس لئے رکھی ہے۔ منشی جی اگرچہ مجھ سے ہمدردی رکھتے تھے اور بارہا انہوں نے مجھے والد کے غیظ وغضب سے بچایا تھا لیکن اس روز منشی جی بھی گھبرا گئے اور ان کے منہ سے نکل گیا کہ "یہ کتاب میری ہے نہ میں نے یہاں لا کر رکھی ہے"۔ بس یہ جواب بہت تھا۔ والد نے کتاب اٹھائی اور نیچے لے جا کر اسے آگ دکھا دی۔ میں اپنی محبوب اور قیمتی کتاب نظروں کے سامنے جلتے دیکھتا رہا اور دم نہ مار سکا۔ تاہم آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو نہ روک سکا۔ والد نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ اپنے سامنے کتاب اچھی طرح خاکستر کرنے کے بعد پھر میرے کمرے میں آئے اور مطالبہ کیا یہ صندوق کھول کر دکھا اس میں کون کونسی کتابیں ہیں۔ اب تو میرا خون خشک ہو گیا۔ جانتا تھا اگر صندوق کھول دیا تو کوئی کتاب بچے گی اور نہ قرآن مجید بے حرمتی سے محفوظ رہے گا۔ غرض اس لمحے اللہ کو یاد کیا اور مصمم ارادہ کر لیا کہ خواہ کچھ ہو صندوق نہ کھولوں گا۔ والد نے جب دیکھا کہ میں صندوق کی کنجی دینے پر تیار نہیں تو انہوں نے لکڑی اٹھا کر مجھے مارنا شروع کیا اور اس وقت پیٹتے چلے گئے جب تک لکڑی ٹوٹ نہ گئی۔ پورے گھر میں کہرام مچ گیا۔ پاس پڑوس والے بھی جاگ گئے والدہ ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی پشت پناہ بن گئیں اور والد سے کہنے لگیں آپ کو شرم نہیں آتی جوان بیٹے پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے۔ جب اسے پڑھنا لکھنا سکھایا ہے تو وہ کتابیں نہیں پڑھے گا تو اور کیا بھاڑ جھونکے گا؟

والد اس وقت تو بکتے جھکتے نیچے اتر گئے مگر یہ بھی کہہ گئے کہ صبح صندوق نہ کھولا تو اسے بھی یونہی آگ لگا دوں گا۔ میں جانتا تھا وہ بے حد ضدی شخص ہیں اور ایسا یقیناً کر گزریں گے چنانچہ میں نے منشی جی سے کہا اس صندوق میں دینی کتابوں کے علاوہ قرآن مجید بھی بند ہے اگر اسے کچھ صدمہ پہنچا تو قیامت کے روز تم اللہ کو کیا منہ دکھاؤ گے؟ جس طرح بھی ممکن ہو یہ کتابیں اور قرآن مجید یہاں سے نکال کر کسی محفوظ مقام پر پہنچا دو۔ خدا منشی جی کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے منہ اندھیرے موقع پا کر تمام کتابوں اور کلام پاک کی ایک گٹھڑی سی

بتائی اور سر پر اٹھا کر لے گئے ۔ اس کے بعد میں نے صندوق میں ہندی، حساب اور سنسکرت وغیرہ کی کتابیں بھر دیں تاکہ والد اسے کھولیں تو انہیں اطمینان ہو جائے ۔ لیکن اگلے روز والد نے صندوق تو نہ کھولا مجھے حکم دیا کہ ان کے ساتھ میوڑ چلوں ۔ میوڑ رڑکی سے دس بارہ کوس دور ایک چھوٹا گاؤں ہے ۔ وہاں ان کے ماتحت سینکڑوں کاریگر کام کیا کرتے تھے ۔ والد خود تو گھوڑے پر سوار ہوئے اور مجھے اذیت دینے کے لئے پیدل چلنے کا حکم دیا ۔ میرے لئے یہ بھی راحت ہی تھی ۔ میوڑ پہنچ کر انہوں نے اپنے آدمیوں کو تاکید کی کہ یہ لڑکا دن رات تمہارے ساتھ رہے گا اور کوئی غیر شخص یا مسلمان اس کے قریب بھی پھٹکنے نہ پائے ۔ اس کا کھانا پینا بھی تمہارے ساتھ ہی ہوگا اور تم اسے بڑھئی کا کام سکھاؤ ۔ ان لوگوں نے والد کے حکم کی تعمیل کی اور مجھے کام سکھانا شروع کر دیا ۔ ساتھ ساتھ وہ کفر و شرک کی باتیں بھی سناتے رہتے ۔ رات کو جب یہ لوگ تھک ہار کر سو جاتے تو میں نگرانی کرنے والوں سے کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے نہر پر چلا جاتا اور دن بھر کی نمازیں رو رو کر ادا کرتا اور بارگاہِ الٰہی میں دعا کرتا کہ اس مصیبت سے نجات دے ۔ چھ برس بعد جب سے میں نے اپنے اسلام کا اعلان کیا تھا اس وقت تمام نمازوں کی دوبارہ قضا کی ۔ بہر حال اس ماحول میں میری جان سخت پریشان اور عجب عذاب میں تھی ۔ بہت عرصہ اسی طرح گزرا پھر ایک روز اللہ نے نجات کی صورت پیدا کر ہی دی ۔

والد آصف نگر کے مقام پر کسی کام کی انجام دہی کے سلسلے میں نہر پر گھوم رہے تھے، اچانک پل کے اوپر سے نیچے گر گئے، چونکہ نہر میں کچھ پانی تھا اس لئے جان تو بچ گئی پھر بھی خاصے زخمی ہوئے، بے ہوشی کی حالت میں چارپائی پر ڈال کر گھر لائے گئے ۔ ہوش میں آتے ہی انہوں نے میرے بارے میں دریافت کیا اور کہا میرا بڑا لڑکا کہاں ہے؟ اسے جلدی میرے پاس لاؤ اس کی صورت تو دیکھ لوں ۔ آج کل میں نہ معلوم کس وقت میرا دم نکل جائے ۔ میں نے اسلام کی کتاب جلائی، لڑکے کو مارا پیٹا اور قید کیا ۔ میرے ساتھ جو کچھ ہوا یہ اسی کا نتیجہ ہے ۔ ادھر تو والد کے خیالات میرے بارے میں نرم ہو رہے تھے ادھر بعض متعصب ہندو پنڈتوں نے پھر ان کے کان بھرے اور کہا اگر آپ نرم پڑیں گے تو لڑکا یقیناً مسلمان ہو جائے گا ۔ اسے ہمارے حوالے کر دیجئے ۔ چنانچہ والد نے مجھے حکم دیا کہ

پنڈتوں کے پاس بلاناغہ حاضری دیا کروں۔ ان میں ایک پنڈت جی بڑے بھاری وگیان اور جوگی تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ کالا جادو بھی جانتے ہیں اور ہمزاد قبضے میں کر رکھا ہے۔ وہ کبھی کبھار قصبے کے ہندوؤں اور مسلمانوں پر رعب بٹھانے کے لئے شعبدے اور طرح طرح کے کرتب دکھایا کرتے تھے۔ کبھی بے موسم کے پھل منگوا رہے ہیں کبھی جھاڑ پھونک کر کسی ناقابل علاج مریض کو ٹھیک کر رہے ہیں۔ ہندو تو ان کے اس قدر گرویدہ تھے کہ بے تکلف پنڈت جی کو سجدہ کرتے۔

ایک شام وہ مجھے اپنے ساتھ جنگل میں لے گئے۔ وہاں ہُو کا عالم تھا اور اندھیرا تیزی سے بڑھتا جا رہا تھا۔ اگرچہ مَیں بارہا ادھر سے آ جا چکا تھا لیکن اس شام مجھے خاصا ڈر لگا۔ میں نے دیکھا پنڈت کا رخ مرگھٹ کی طرف ہے۔ جب زیادہ ہی خوف محسوس ہوا تو مَیں نے دل ہی دل میں آیت الکرسی کا ورد شروع کیا۔ اس طرح خوف دور ہوا۔ مرگھٹ سے ادھر ہی پنڈت رکا اور ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اس نے مجھے بھی اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مَیں نے محض انگلی کے اشارے سے اپنے گرد دائرہ بنایا اور اس دائرے کے اندر سمٹ کر بیٹھ گیا۔ پنڈت نے تھوڑی دیر بعد میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور کہا بچہ بتاؤ! تمہارے اندر کونسا کمال ہے؟ اپنے دل کی بات مجھ پر واضح کر دو۔ اس کی بات سن کر مَیں نے پہلے تو متوکلا علی اللہ درود شریف پڑھا پھر جواب دیا۔ پنڈت جی ہوشیار ہو جایئے مَیں اپنی باتیں آپ کو بتاتا ہوں' سنئے! مَیں حبسِ دم کرتا ہوں اور خنّاس پر قابو پا کر اسے جلا ڈالتا ہوں اور پھر اپنے محبوب کے خیال میں کھو جاتا ہوں' خود کو بالکل فنا کر دیتا ہوں۔ صرف اسی کی ذات رہ جاتی ہے اور ہر سمت اسی کا جلوہ نظر آتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس کی باقی ذات کے سامنے ہمارے فانی وجود کی حقیقت ہی کیا ہے۔ ہر سانس کے ساتھ اسی کا تصور ہے۔ اس کی یاد سے ایک لحہ غفلت کفر سمجھتا ہوں۔ اگر دل میں محبوب کے سوا کوئی باطل خیال آ بھی جائے تو اس کو ضربوں سے پامال کر ڈالتا ہوں۔ میری ہستی محبوب کے لئے فنا ہو گئی اور میں نے خود کو مٹا دیا ہے۔ آؤ! ہم دونوں گردن جھکا کر بیٹھیں اور ایک دوسرے کو اپنا اپنا کرتب دکھائیں۔ یہ کہہ کر میں نے لاحول پڑھی اور پنڈت پر دم کر دیا۔ وہ تھر تھر کانپنے لگا اور اس کی ساری جادوگری دھری کی دھری رہ گئی۔ جب کچھ سنبھلا تو کہنے

لگا اچھا اپنے کرتب کا نام تو بتا دو۔ میں نے کہا ایک تو حبس دم ہے اور دوسرا پاس انفاس اور تیسری چیز محبوب کے نام کی ضرب ہے۔ اس نے دریافت کیا ضرب میں تم کس کا نام لیتے ہو؟ میں نے کہا وہ نام تم کو کس طرح بتا دوں وہ زبان سے دل میں اتر چکا ہے۔ تم لوگ تو جوگ کے بڑے بڑے کرتب دکھاتے ہو ہمت ہے تو اپنے جوگ سے معلوم کرو کہ وہ کون ہے۔ میری بات سن کر پنڈت حیران اور اس کا ہمزاد مشتعل ہو گیا۔ ہمزاد نے پنڈت سے پوشیدہ طور پر کہا یہ لڑکا میرے قابو میں آنے والا نہیں اس کے کلام میں بہت طاقت ہے اور اس کے مقابلے میں میرے کرتبوں اور تمہارے جادو ٹونے کی کوئی حیثیت نہیں۔

واپس آن کر وہ پنڈت میرے والد سے ملا اور کہا لڑکا دھرم تیاگ چکا ہے اور اب اس کا مرض لا علاج ہے۔ والد یہ سن کر رونے لگے اور انہوں نے کہا کہ تم لوگ کس لئے اتنے بڑے بڑے دعوے کرتے ہو اور خود کو بڑا مہا پرش اور شکتی مان بتاتے ہو؟ وہ پنڈت آئیں بائیں شائیں بکتا چلا گیا۔ اتفاق سے چند ہی روز بعد عید الفطر کی رات آئی۔ میں اس وقت گھر والوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ والد دوسروں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کل مسلمانوں کی عید ہے۔ یہ لوگ اپنی مسجد میں جمع ہوں گے، ہندوؤں کے ہاں اس طرح کی یک جہتی بالکل نہیں، کبھی تیج تہوار پر اکٹھے نہیں ہوتے۔ میرے منہ سے نکل گیا پتا جی ہندو تو تین دیوتاؤں کو پوجتے ہیں اسی طرح ان کے راستے بھی تین طرف کو نکل گئے۔ دوسری طرف مسلمانوں کو دیکھئے وہ ذاتِ واحد کی عبادت کرتے ہیں جو پاک صفات سے موصوف ہے۔

میری یہ باتیں سن کر والد کو پھر طیش آیا اور مجھے اس قدر مارا کہ دونوں ہاتھ سن ہو گئے۔ کہنے لگے اپنے دھرم کو سب سے اچھا جانو اور مانو۔ اگر تم نے دھرم بدلا تو اپنے باپ کا رویہ بھی بدلا ہوا پاؤ گے۔ اگلے روز انہوں نے میرے بارے میں اپنے قریبی دوستوں سے مشورہ کیا اور کہا اس لڑکے کی بہن کا بیاہ ہونے والا ہے' ہزاروں کا خرچہ، باہر سے برات آئے گی۔ اگر ان کے سامنے بات کھل گئی اور براتیوں کو احساس ہو گیا کہ لڑکی کا بھائی دھرم بدل چکا ہے تو کوئی میرے ہاں کھانا کھائے گا اور نہ لڑکی کا ڈولا اٹھ سکے گا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ ناہر سنگھ کو بیاہ کی رسموں کے دوران میں دھنوری گاؤں بھیج دیا

جائے۔ یہ نالائق وہاں پوربیوں کی قید میں رہے گا اور جب لڑکی وداع ہو جائے تو اسے رڑکی واپس بلوا لیجئے گا۔ والد کو یہ تدبیر بہت پسند آئی۔ چنانچہ مجھے زبردستی دھنوری لے جا کر ایک مکان میں قید کر دیا گیا۔

جب بہن رخصت ہو گئی اور بیاہ کا ہنگامہ ختم ہوا تو قصبے کے بعض مسلمانوں کی طرف سے انگریز مجسٹریٹ کی عدالت میں میری جانب سے اس مضمون کی عرضی داخل کرائی گئی کہ عرصہ ہوا میں نے برضا و رغبت ہندو دھرم چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا ہے اس لئے میرے والد نے بطور انتقامی کارروائی مجھے دھنوری کے مقام پر سخت قید میں ڈال دیا ہے اور میرے دونوں ہاتھوں کی فصد کھول دی گئی ہے اگر مجھے جلد رہا نہ کرایا گیا تو یہ لوگ مجھے مار کر کہیں دبا دیں گے۔

اللہ نے مدد فرمائی اور انگریز مجسٹریٹ نے درخواست پر فوراً کارروائی فرمائی۔ اس نے پولیس کو حکم دیا کہ مستری موتھی سنگھ اور اس کے بیٹے ناہر سنگھ دونوں کو فوراً حاضر کرو اور موتھی سنگھ کو ہتھکڑی لگا کر لایا جائے۔ پولیس نے مجھے دھنوری سے برآمد کیا اور والد کی گرفتاری کے لئے مکان پر گئی مگر انہوں نے تھانیدار کو رشوت دے کر خود کو ہتھکڑی سے بچایا اور تھانیدار سے کہا کہ وہ خود کسی وقت عدالت میں حاضر ہو جائیں گے۔ پولیس نے تنہا مجھے مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا' اس نے پوچھا سچ بتاؤ تمہارے باپ نے تمہیں کیوں قید کیا تھا؟ اپنی بہن کی شادی میں تم کیوں شریک نہ ہوئے اور تمہارے جسم سے بذریعہ فصد خون نکالنے کی کوشش کیوں کی گئی اور کیا یہ عرضی تمہیں نے بھجوائی تھی؟ میں نے جواب میں کہا جناب والا! یہ عرضی میں نے نہیں لکھی اور نہ میرے ہاتھوں کی فصد کھولی گئی۔ یہ سب باتیں کسی اور نے اپنی جانب سے لکھ دی ہیں۔ بہن کی شادی کے موقع پر کام بہت بڑھ گیا تھا اس لئے میں انہیں کاموں کی انجام دہی کے سلسلے میں باہر چلا گیا' آنسو میری آنکھوں سے خود بخود رواں تھے۔ انگریز مجسٹریٹ بے حد متاثر نظر آیا' آخر کہنے لگا' لڑکے مجھے سب خبر ہے تمہارے باپ نے تم پر کتنا ظلم ڈھایا اور تم پھر بھی اسے بچا رہے ہو؟ بہر حال اگر تم نہیں چاہتے تو میں تمہارے باپ کے خلاف کوئی کارروائی نہ کروں گا' آج سے تم اپنے

کاموں میں آزاد ہو' تمہیں پورا اختیار ہے جس طرح چاہے زندگی گزارو اور جو مذہب پسند ہے اس میں داخل ہو جاؤ۔ اس کے بعد مجسٹریٹ نے والد کو طلب کیا اور سخت لہجے میں ان سے کہا'' پنڈت موتی سنگھ! تمہارے ظلم وستم کا سب حال معلوم ہو چکا ہے تمہارا لڑکا بہت نیک ہے۔ اس نے آج تمہاری عزت بچالی ورنہ میں تمہیں سزا دیئے بغیر نہ چھوڑتا' آئندہ اسے ستاؤ گے اور تکلیف دو گے تو سیدھا جیل بھیج دوں گا''۔

اس واقعے کے ٹھیک دو ہفتے بعد میں نے قبولِ اسلام کا اعلان کر دیا۔ اب ایک اور عجیب بات سنئے۔ جس روز صبح کو میں مسلمان کی حیثیت سے ظاہر ہونے والا تھا اس رات پنڈت نیکی رام نے خواب میں دیکھا کہ لوگ جمع ہیں اور میرے ہاتھ میں ایک نورانی تختی ہے' تختی پر سنہرے حروف میں کلمہ طیبہ لکھا ہے اور کلمہ دیکھ دیکھ کر لوگ خوش ہو رہے ہیں' میں نے پنڈت سے کہا اسے آپ بھی دیکھیے۔ پنڈت نے جواب دیا اچھی چیز ہے' گم نہ ہونے پائے۔

پنڈت جی کی صبح آنکھ کھلی تو انہیں یہ خواب اچھی طرح سے یاد تھا اور حقیقت میں ہوش وحواس گم تھے۔ اپنے ہندو احباب سے بھی بیان کیا اور رڑکی کی مشہور و معزز شخصیت قاضی فصیح الدین کی خدمت میں بھی حاضر ہو کر کہا کہ مجھے یقین ہے یہ لڑکا بہت جلد اپنے اسلام کا اعلان کر دے گا اور خواب بس ظاہر ہی ہونے والا ہے۔ وہ رات میں نے دوستوں کے ساتھ گزاری۔ صبح انہوں نے کہا آج ہمارے ساتھ چل کر نماز جامع مسجد میں پڑھو۔ ہم لوگ تمہیں اپنے درمیان لے لیں گے۔ ابھی اندھیرا ہے کون پہچان سکے گا۔ چنانچہ میں نے سب کے ساتھ فجر کی نماز جامع مسجد میں ادا کی اور اس طرح شریک جماعت افراد پر یہ راز ظاہر ہو ہی گیا۔ پھر کسی نے جا کر والد سے بھی کہہ دیا کہ آپ کا بیٹا آج جامع مسجد میں تھا۔ یہ سن کر انہوں نے مایوسی اور پریشانی کے عالم میں گھر بلوا کر سخت باز پرس کی اور کہنے لگے سچی بات بتا دے ورنہ آج تیرا یہاں سے بچ کر جانا مشکل ہے' جامع مسجد میں کیا کرنے گیا تھا؟ والد بہت کچھ کہتے رہے اور میں خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔ آخر میں نے صرف اتنا کہا مجھے اس وقت چھوڑ دیجئے بہت تھکا ہوا ہوں شام تک آپ کی ساری باتوں کا جواب دے دوں گا اور شام بھی بہت دور نہیں۔ میری یہ بات سن کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ میں بھی اٹھا اور نہا کر کھانا کھانے لگا۔ نہاتے وقت جی میں نیت کر لی کہ میرا یہ غسل اسلام کے لئے ہے۔

کھانا کھا کر والد تو باہر گئے میں نے عمدہ اور نیا لباس زیب تن کیا اور اکیلا ہی سیدھا جامع مسجد رڑکی پہنچ کر باضابطہ اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔ رڑکی کی جامع مسجد میں قبول اسلام کے اعلان نے ہندوؤں کو مشتعل کر دیا اور وہ اکٹھے ہو کر مجھے مارنے کے درپے ہوئے لیکن اسی اثنا میں سینکڑوں پُرجوش مسلمانوں کے ہجوم نے مجھے اپنے درمیان لے لیا اور ہندوؤں کو حملہ کرنے کی جرأت ہی نہ ہوئی۔ اس روز مجھے جو مسرت حاصل ہوئی وہ کسی شہنشاہِ ہفت اقلیم کو بھی میسر نہیں آسکتی اور ترجمانی الفاظ کے ذریعے ناممکن ہے۔ اس روز ہاتھ میں کلام پاک اور زبان پر نعتِ رسول ؐ تھی اور صرف خدا اور محبوبؐ خدا کی باتیں تھیں''۔

اسلام لانے کے بعد مولانا خلیل الرحمٰن کی شخصیت میں ایسا عظیم اور پاکیزہ انقلاب رونما ہوا کہ ان کی ظاہری و باطنی حالت دیکھ کر بڑے بڑے اکابر علما، صوفیا اور اولیا بھی رشک کرنے لگے۔ صورت پر وہ نور کہ راہ چلتے لوگ دیکھتے اور ٹھٹک کر رک جاتے۔ باتوں میں ایسی حلاوت اور سحر کہ ان کے اسلام لانے کے فوراً بعد رڑکی کے ہندوؤں کو خدشہ پیدا ہوا کہ ایک ایک کر کے سبھی مسلمان ہو جائیں گے چنانچہ اکثر لوگ ایمان کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ مسلمان ہونے کے بعد آپ نے اپنے گھر والوں سے کوئی مادی تعلق بھی نہ رکھا بلکہ یہی شرط پیش کی کہ مسلمان ہو جاؤ تو تمہارا غلام ہوں ورنہ میرا اور تمہارا کوئی واسطہ نہیں۔ والدہ نے بصد اصرار کئی بار بلایا تو آپ ایک آدھ مرتبہ تشریف لے گئے اور جب والدہ نے کہا کہ گھر بار روپیہ پیسہ جائیداد سب تیرے لئے موجود ہے، تو آپ نے فرمایا مجھے ان کی ضرورت نہیں۔ اسلام نے سب کچھ عطا کر دیا ہے اور میں اب اپنے زورِ بازو سے رزق حاصل کروں گا چنانچہ محنت مزدوری کو اپنا شعار بنایا اور کسی کے مرہونِ منت نہ ہوئے۔ بعد ازاں رڑکی اور گرد و نواح کے مسلمانوں نے اپنے بچوں کو آپ کے پاس تعلیم و تربیت کے لئے بھیجنا شروع کیا اور مجبور کیا کہ آپ پورا وقت دینی کاموں کے لئے وقف کر دیں۔ آپ نے یہ درخواست منظور فرمائی اور متوکلاً علی اللہ ایک گوشے میں بیٹھ گئے۔ پھر ایسی فتوحات ہوئیں کہ باید و شاید۔ فیاضی کا یہ عالم تھا کہ جب آپ حج کے لئے جاتے تو پورا قافلہ ساتھ ہوتا اور سب کا خرچ آپ ہی کے ذمے رہتا۔

اکثر ایسا ہوا کہ کسی نے حرمین شریفین کی زیارت کا شوق ظاہر کیا اور آپ نے فوراً اسے اپنا رفیق سفر بنا لیا۔

ایک مرتبہ سخت قحط پڑا اور خشک سالی سے ہر طرف کہرام مچ گیا۔ لوگوں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا کی درخواست کی۔ آپ نے دوسرے دن نماز استسقا کے لئے نکلنے کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ جس وقت آپ ایک جم غفیر کے ساتھ نماز استسقا ادا کرنے جا رہے تھے اس وقت ہندو آپ کا مذاق اڑاتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ مستری موتھی کا لڑکا آج پانی برسانے جا رہا ہے۔ لیکن انہی لوگوں نے دیکھا کہ دعا سے قبل اگرچہ آسمان بالکل صاف تھا اور کہیں بادل کا شائبہ تک نہ تھا تاہم دعا سے فارغ ہونے کے بعد صرف چند ہی منٹ میں ایسی دھواں دھار بارش شروع ہوئی کہ لوگ واپسی میں گھروں کو جاتے ہوئے شرابور ہو گئے اور ہر طرف جل تھل ہو گیا۔

آپ کے مزاج میں حد درجہ استغنا کے ساتھ ساتھ سخاوت اور فیاضی بھی بے انتہا تھی۔ کسی کی درخواست اور طلب کو رد نہ فرماتے تھے۔ جس زمانے میں ظفر پور گاؤں میں بسلسلہ امامت مقیم ہوئے وہاں ہریجنوں نے آس پاس پانی نہ ہونے کی شکایت کی۔ آپ نے ان کے لئے ایک کنواں کھدوا دیا' جس میں سے شیریں پانی نکلا' وہ کنواں آج بھی موجود ہے۔ اسی طرح رسول پور کی مسجد کے لئے لوگوں نے بڑی کوشش کی کہ کنویں سے پانی نکل آئے کئی جگہ کنواں کھودا گیا مگر پانی نہ نکلا۔ آپ نے ایک مقام پر اللہ کا نام لے کر پانچ پھاوڑے مارے اور اللہ نے اسی جگہ ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا چشمہ جاری کر دیا۔ رسول پور کی گنبد والی مسجد بھی آپ نے بنوائی جو بدستور آباد ہے۔

آپ کے استاد جن کے ذریعے آپ نے اسلام کی دولت پائی، مولانا عبدالسمیع میرٹھ میں تھے۔ آپ سب سے پہلے ان کی قدم بوسی کے لئے وہاں گئے۔ مولانا نے شاگرد کو سینے سے لگایا اور خوب روئے۔ ان کی علمی و دینی و اخروی ترقیوں کے لئے دعا فرمائی اور کہا کہ میرا خط لے جاؤ' مکہ معظمہ میں حاجی امداد اللہ تمہارے منتظر ہیں۔ یہ سن کر مولانا خلیل الرحمن کی مسرت کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اللہ نے غیب سے حج کے اخراجات کے لئے انتظام کر دیا۔ مکہ معظمہ پہنچے تو حاجی صاحب اپنے رفقا کے ساتھ شہر سے باہر آپ کے استقبال

کے لئے خلوتشریف لائے ہوئے تھے۔ مولانا نے خط پیش کیا۔ حاجی صاحب نے معانقہ کیا اور بہت کچھ عطا فرمایا۔ پھر اپنے مکان پر لے گئے۔ مولانا خلیل الرحمٰن کو حاجی صاحبؒ سے ایسا انس ہوا کہ وہیں مستقل طور پر قیام کا ارادہ کر لیا لیکن حاجی صاحب نے فرمایا میاں خلیل الرحمٰن ابھی تم ہندوستان واپس جاؤ اللہ کو تم سے وہاں بہت کام لینا ہے اور سنو تم بار بار انشاء اللہ حج کے لیے آؤ گے۔ یہ سن کر آپ خوش ہوئے۔ حاجی صاحب کا ارشاد صحیح نکلا مولانا خلیل الرحمٰن سولہ مرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت سے مشرف ہوئے اور وہ بھی طویل اقامتوں کے ساتھ، اس لئے حاجی صاحب سے برابر فیض یاب ہوتے رہے۔ حضرت نے آپ کو بیعت سے بھی سرفراز کیا اور خلافت عطا فرمائی۔ ۱۳۱۷ھ میں حاجی امداد اللہ واصل بحق ہوئے۔ مولانا خلیل الرحمٰن کو اس قدر صدمہ ہوا کہ حالت غیر ہو گئی۔

حاجی صاحب علیہ الرحمہ کے وصال سے اگلے برس یعنی ۱۳۱۸ھ میں مولانا عبدالسمیع بھی وفات پا گئے تو دل بجھ گیا۔ خانہ نشین ہو گئے لیکن لوگوں کی منت سماجت پر بچوں کی تعلیم وتربیت کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔ وعظ و نصیحت' بیعت وارشاد اور تعلیم و تلقین کا یہ اثر ہوا کہ دور دراز سے طالبین کھنچے چلے آتے۔ بے شمار افراد کو کفر کی تاریکیوں سے نکالا اور اسلام کی روشنی میں لائے۔ تقریباً سترہ برس کی طویل مدت اسی حالت میں گزر گئی۔ شہر کی معزز و مقتدر مسلمان شخصیتوں کے زور دینے پر آپ نے ۱۳۰۵ھ میں ایک دینی مدرسہ قائم کیا تھا۔ آج رڑکی اور گردونواح میں جو کچھ علم کے آثار وانوار نظر آتے ہیں وہ اس مدرسہ رحمانیہ کے زندہ جاوید فیض کا پرتو ہیں۔ اب تک لاتعداد حفاظ' قراء' آئمہ مساجد اور علما اس عالی شان مدرسے سے فیض یاب ہو چکے ہیں۔

۱۳۱۹ھ میں مولانا خلیل الرحمٰن دیارِ رحمۃ للعلمین کی جانب ہجرت کی نیت سے عازم سفر ہوئے اور مدینہ منورہ پہنچ کر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ آپ کے اس سفر سے اہالیانِ شہر' اراکینِ مدرسہ اور معتقدین حد درجہ مضطرب ہوئے۔ اسی زمانے میں مدرسہ رحمانیہ کی روداد میں اس اضطراب کا اظہار ان الفاظ میں ہوا" حضرت مولانا مولوی حافظ جی مہاجر الی اللہ جناب مخدومنا و مکرمنا خلیل الرحمٰن صاحب کا مدرسے اور اہلِ مدرسہ سے جدا ہو جانا سخت رنج و الم کی بات ہے۔ فی الحقیقت حضرت مولانا مدرسے کے لئے باغبانی اور اہلِ

مدرسہ کے لئے نور ایمانی کا کام فرماتے تھے۔ اب آپ اپنے لگائے ہوئے علمی باغ کی آبیاری اپنی خلوت کی دعاؤں اور مدینۃ العلم کی ضیا پاشیوں سے فرمائیں گے"۔

غرض جس ذاتِ اقدس کی محبت میں آپ نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا' اسی کے کوچے میں اپنے آپ کو لا کر ڈال دیا۔ آپ ۱۳۲۷ھ تک مدینہ منورہ میں مقیم رہے یہاں تک کہ ۱۷ محرم الحرام ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۹۱۹ء کو آپ انتقال فرما گئے۔ آپ کی زندہ و تابندہ یادگار مدرسہ عربیہ رحمانیہ رڈ کی آج بھی علوم و فنون کے خزانے لٹا رہی ہے۔ اسے من جانب اللہ ہر دور میں مخلص' دیندار' صالح اور جفاکش افراد کی خدمات حاصل ہوتی رہیں اور یہ سب بانی مدرسہ حضرت مولانا خلیل الرحمن صاحبؒ کے اخلاص کا مظہر ہے۔

●......●......●

داؤد آپسن

(انگلستان)

داؤد آپسن انگریز تھے اور زبردست صحافیانہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ بمبئی میں اسلام قبول کرنے کے بعد وہ لاہور منتقل ہو گئے اور مشہور انگریزی جریدے ''مسلم آؤٹ لک'' کا اجرا کیا۔ علامہ اقبال مرحوم سے ان کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ علامہ موصوف کے استفسار پر جناب داؤد آپسن نے اپنے قبول اسلام کا عجیب و غریب واقعہ بیان کیا۔ اسے علامہ مرحوم و مغفور نے روایت کیا ہے اور یہ ''اسلام زندہ باد'' میں شامل ہے۔

جناب داؤد آپسن نے بتایا:

''میرے مسلمان ہونے کا قصہ نہایت ہی عجیب ہے' اگر میں عرض کروں تو آپ حیران رہ جائیں گے۔ میرا اسلام کے متعلق کوئی مطالعہ نہیں تھا نہ مجھے کسی مسلمان عالم و فاضل کی صحبت میسر آئی تھی کہ مجھ پر اسلام کی خوبیاں منکشف ہوتیں۔ میں انگلستان سے آیا اور بمبئی میں رہنے لگا۔ ہندوستان میں میرے سب سے پہلے دوست وہ لوگ تھے جو سیاسی تحریکات سے وابستہ تھے۔ بمبئی کے مذہبی حلقوں سے میرا تعارف تھا نہ تعلق' جب میں نے ملکی سیاسی تحریکات میں حصہ لینا شروع کیا تو بعض مقامی مسلمانوں سے میری ملاقات ہوئی اور میں ان کے ہاں آنے جانے لگا۔

ایک مرتبہ ایک معزز مسلمان نے مجھے کھانے پر بلایا' اس وقت جو چیزیں میرے سامنے لائی گئیں ان میں ایک پلاؤ بھی تھا۔ میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میری زبان اس بہشتی نعمت سے لذت اندوز ہوئی۔ میں پلاؤ کھا رہا تھا' مسحور ہو رہا تھا اور ساتھ

ہی ساتھ کچھ غور کر رہا تھا اور وہ یہ تھا کہ جس قوم کا مذاق کھانے کے معاملے میں اس قدر لطیف اور پاکیزہ ہے' دین اور روحانیت کے معاملہ میں اس کا معیار کتنا کچھ پاکیزہ اور لطیف نہیں ہوگا۔ یہ حقیقت ہے کہ مجھے نہ کسی ملا نے مسلمان کیا اور نہ کسی صوفی نے' مَیں تو حضرت پلاؤ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب! مَیں نے پلاؤ کی رکابی کے سامنے بیٹھ کر مسلمانوں کی خوش مذاقی اور اسلام کی لطافت کا جو اندازہ کیا تھا' بعد کے مطالعۂ اسلام سے وہ بالکل صحیح ثابت ہوا۔ مَیں نے دیکھا کہ زندگی کے ہر میدان میں اسلام صرف بلندی اور برتری کا علمبردار ہے۔ اسلام کی سلطنت میں کہیں بھی بد مذاقی اور پستی نہیں ہے۔ جس قدر اسلام کی عبادت بلند ہے' اسی قدر اسلام کی تہذیب بھی بلند ہے۔ جس قدر اسلام کے طعام ولباس بلند ہیں' اسی قدر اسلام کے اعمال و اخلاق کی روایات بلند ہیں۔ میرے نزدیک کسی شخص کے قبولِ اسلام کے معنی یہ ہیں کہ وہ ساری دنیا سے اونچا ہو جاتا ہے اور پھر اس کی زندگی میں جس قدر بھی اعمال سرزد ہوتے ہیں وہ بھی دنیا بھر کے عملوں سے اونچے ہوتے ہیں''۔

●......●......●

سلیمان شاہد مفسر

(امریکہ)

ایک دنیا جانتی ہے کہ امریکہ میں سیاہ فام باشندوں نے ''بلیک پاور'' کے نام سے کیا طوفان برپا کر رکھا ہے۔ تقریباً تین صدیوں تک یہ لوگ سفید فاموں کے غیر انسانی سلوک اور ظلم و تشدد کا نشانہ بننے کے بعد بالآخر ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ کی قیادت میں اٹھ کھڑے ہوئے، مگر بہت جلد موصوف کی اعتدال پسند رہنمائی سے ربی تڑوا کر مسلح اور انتہا پسندانہ سرگرمیوں پر اتر آئے اور ''بلیک پینتھر'' نامی تنظیم کے ذریعے سفید فاموں کے لئے پیغام اجل بن گئے۔ دونوں طرف سے تشدد، قتل اور لوٹ مار کی دوڑ شروع ہوگئی اور پوری امریکی قوم ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۸ء تک پورے تین سال خوفناک نسلی فسادات سے دوچار رہی جن میں انسانی خون کی ارزانی رہی اور دارالحکومت واشنگٹن میں کچھ حصے جلا کر راکھ کر دیئے گئے۔

اسلام سے میرا تعارف اسی زمانے میں ہوا، مجھے شدت سے احساس ہوا کہ دونوں قومیں ایک ہی مذہب، عیسائیت سے تعلق رکھتی ہیں، مگر سفید فام عیسائی سیاہ فام عیسائیوں کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں اور اب ردِ عمل کے طور پر دوسری جانب بھی یہی کیفیت ہے۔ میں عیسائیت سے سخت بدظن ہو گیا، خوش قسمتی سے میری ملاقات مشہور انقلابی ملک الشہباز (میلکم ایکس) سے ہوگئی۔ موصوف اب صحیح العقیدہ مسلمان ہو چکے تھے اور نہایت خلوص اور سرگرمی سے اسلام کی تبلیغ میں معروف تھے۔ میں ان سے بے حد متاثر ہوا اور یوں میں سوشلزم، کمیونزم یا کیپٹل ازم سے بال بال بچ گیا۔ جملہ مسائل کے سلسلے میں سیاہ فاموں کی نظریں ادھر بھی اٹھ رہی تھیں۔

تاہم میں میلکم ایکس کی تحریک میں شامل نہ ہوا۔ ان دنوں میں متذکرہ مسیحی فرقے (Black Panthers) میں پادری کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ عیسائیت ترک کر کے اسلام قبول کرتے ہوئے طبیعت سخت متذبذب تھی' لیکن اسلام پر میرا غور و فکر برابر جاری رہا۔ دوسرے برس میں متذکرہ فرقے سے الگ ہو گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس میں بے حد غیر عقلی باتیں تھیں۔ مثلاً حضرت عیسیٰ کی آمد کی کئی تاریخوں کا اعلان کیا گیا جسے ہر مرتبہ بدل دیا جاتا تھا۔

روحانی سکون کی خاطر میں یہودیت کے قریب بھی آیا' مگر میں نے دیکھا کہ یہودی زبردست روحانی خلفشار اور عدم سکون کا شکار ہیں۔ ہر مقام پر ان کے نسلی تعصبات ابھر آتے اور مجھے یہ اندازہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ نسل پرست یورپین یہودی مجھ سیاہ فام کو "مذہبی بھائی" کے طور پر کبھی قبول نہیں کریں گے۔

مایوس ہو کر میں نے ہر قسم کے مذہب کا خیال دل سے نکال دیا اور ان تحریکوں میں شمولیت اختیار کر لی جو غریب و پسماندہ لوگوں کی دور افتادہ بستیوں میں انسانی خدمات انجام دیتی ہیں لیکن ۱۹۶۷ء میں اصلاحی خدمات انجام دیتے ہوئے ضلع کولمبیا کے جیل خانوں میں میرا اسلام سے دوبارہ تعارف ہوا۔ یہاں بہت سے لوگوں نے ایک نسلی قسم کے فرقہ (BLACK MUSLIMS) کو قبول کر لیا تھا۔ اگرچہ یہ اسلام کی صحیح اور سچی صورت نہیں تھی تاہم بیشتر مسیحی فرقوں کے مقابلے میں یہ لوگ بہتر شہری ثابت ہوتے تھے۔ میں نے بہت سے کالے مسلمان قیدیوں کو دیکھا۔ وہ تمام قیدیوں کے مقابلے میں مثالی رویہ کے حامل تھے اور اپنے اندر شریفانہ زندگی گزارنے کا زبردست داعیہ رکھتے تھے۔

ان دنوں اصلاحی و رفاہی خدمات کے ساتھ ساتھ میں سٹاکلی کارمیکا ئیل کے بلیک یونائیٹڈ فرنٹ کا بھی رکن تھا اور بڑی سنجیدگی سے BLACK PANTHERS کے انتہا پسند گروپ میں شمولیت کا ارادہ کر رہا تھا کہ خوش قسمتی سے میری ملاقات ایک ایسے دوست سے ہوئی' جسے میں نے کئی برسوں سے نہیں دیکھا تھا۔ میرا یہ دوست بھی ایک زمانے میں JEHOVAHS WITNESS میں مبلغ کی حیثیت سے کام کرتا تھا' مگر اب وہ نیکی اور پرہیزگاری کا مجسمہ تھا۔ گفتگو ہوئی تو اس نے زندگی پر بھرپور اور محکم یقین کا اظہار کیا'

وہ حقیقی آزادی اور سچی خوشی کی نعمت سے مالا مال نظر آتا تھا۔ عام سیاہ فاموں کی طرح اس کے رویے یا باتوں میں دور دور تک مایوسی کا نشان تک نہ تھا۔ قدرتی طور پر میں نے اس کی رجائیت اور مسرت کا راز دریافت کیا کہ یہ نعمت تو اب عنقا ہو کے رہ گئی تھی۔

اس کا جواب تھا "اسلام" وہ اب راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔ اس نے بتایا کہ اسلام قبول کر کے اللہ کی اطاعت اختیار کی جائے تو وہ سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں جو "بلیک پاور" کبھی حل نہیں کر سکتی۔ اس نے بڑے اعتماد سے بتایا کہ اللہ کی محبت اور رہنمائی ہر قسم کی نفرت اور تشدد کے مظاہرے سے زیادہ قوی ہے۔ اس نے مجھے واشنگٹن کے اسلامک سنٹر میں آنے کی دعوت دی اور میں نے یہ دعوت بڑے اشتیاق سے قبول کی۔

اور وہ جمعہ کا بڑا ہی مبارک دن تھا' جب میں نے پہلے پہل اسلامک سنٹر میں حاضری دی۔ میں سکون اور عظمت کے اس امتزاج کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا جو اس مقدس اور بے حد پاکیزہ مقام پر چھایا ہوا تھا۔ میں جلال و جمال کے اس حسین پارۂ تعمیر سے بھی مرعوب ہوا اور قرآن کا دلنواز لحن بھی میرے دل میں اترتا چلا گیا۔ مگر جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا' وہ عبادت کا مسحور کن منظر اور نظم و ضبط کا شاندار مظاہرہ تھا جو آنکھوں کے راستے دل میں اتر گیا۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ مساوات کی بنیاد پر کوئی معاشرہ وجود میں آ ہی نہیں سکتا' مگر یہاں کے ماحول میں میرا یہ خیال وہم بن کر اڑ گیا۔ آنکھ کے پردوں میں نفرت کا جو احساس رچ گیا تھا' وہ یکسر مٹ گیا۔ میں نے سیاہ و سفید' چینی' افریقی اور امریکی لوگوں کو بھائیوں کی مانند ایک خدا کے حضور میں ایک جگہ بیٹھے ہوئے دیکھا تو خدا اور انسانیت پر میرا اعتماد بحال ہو گیا۔ میں نے اسلام قبول کر لیا اور اس وقت سے میں دیکھ رہا ہوں کہ اسلام کا نظریۂ اخوت کوئی بے جان تصور نہیں ہے' بلکہ زبردست عملی قوت ہے اور مسلم سوسائٹی میں ہر جگہ مجھے اس کا تجربہ ہوا ہے۔ صرف یہی نہیں' بلکہ اب اسلام کا ہر شعار مجھے بے حد محبوب ہے۔ میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے نسل و رنگ کے اندھیروں میں ڈوبنے سے بچا لیا۔ میری دعا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ دین حق کی تبلیغ کی توفیق عطا کرے اور میں بنی نوع انسان کو راہِ راست کی طرف آنے کی دعوت دیتا رہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکہ کے ہر باشندے کو اسلام کی صحیح صورت دکھانے

کی ضرورت ہے کہ ، ، مغرب میں اسلام کو اس کی حقیقی شکل میں نہیں دکھایا گیا۔ آج لوگ عیسائیت اور یہودیت کے بے جان مذاہب سے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھ رہے ہیں' مگر انہیں کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اسلام کی دعوت حکمت اور جرأت سے دی جائے تب یہ امر یقینی ہے کہ مغرب کا مستقبل اسلام سے وابستہ ہے۔

●.....●.....●

سیف الدین ڈرک والٹر موسگ

(ارجن ٹائن)

(SAIFUDDIN WALTER MOSIG)

میں ۱۹۴۳ء میں برلن (جرمنی) کے ایک عیسائی خاندان میں پیدا ہوا۔ یہ وہ پُرآشوب دور تھا جب دوسری جنگِ عظیم نے عذابِ خداوندی کی مانند پورے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اسی عذاب کے خوف سے میرے والدین نے ۱۹۴۳ء ہی میں وطن کو چھوڑا اور سپین چلے گئے' جہاں سے ۱۹۴۸ء میں ارجنٹائن (جنوبی امریکہ) میں منتقل ہو گئے۔ میں نے پرائمری اور ثانوی تعلیم ارجنٹائن کے شہر قرطبہ (CORDOBA) کے ایک رومن کیتھولک اسکول میں حاصل کی' چنانچہ جیسا کہ ہونا چاہئے تھا میں نوعمری ہی میں کٹر کیتھولک بن چکا تھا۔ بلکہ بذاتِ خود پادری بننے کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ اس کے لئے میں روزانہ کیتھولک مذہب پر لیکچر سنتا اور گاہے گاہے مذہبی امور میں پادریوں کی معاونت کرتا۔

مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ یہ سراسر اس کا فضل اور کرم ہے کہ ایک روز میرے دل میں قرآن کو دیکھنے اور پڑھنے کی تمنا بیدار ہوئی۔ میں نے قرآن کا ایک ہسپانوی ترجمہ لیا اور کھول کر پڑھنے لگا۔ میرے والد نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا' ان کا خیال تھا کہ قرآن کا مطالعہ میرے مذہبی عقائد کو مزید پختہ کر دے گا' لیکن انہیں اور خود مجھے بھی کوئی خبر نہ تھی کہ آئندہ تھوڑی دیر میں کیا انقلاب آنے والا ہے اور اللہ تعالیٰ نے میرے بارے میں کیا فیصلہ کر لیا ہے۔ یوں سمجھئے کہ جب میں نے قرآن کو کھولا تھا تو ایک متعصب عیسائی تھا' مگر اس کے مطالعہ مکمل ہونے تک میں اسلام کی آغوش میں جا چکا تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن پاک کا مطالعہ کرنے سے قبل اسلام کے بارے میں

میری رائے ہرگز اچھی نہ تھی' مَیں نے اس کتاب کو ہاتھ میں لیا تو تجسس غالب تھا اور کھولا تو دل و دماغ پر نفرت و حقارت کے جذبات مسلط تھے' ارادہ محض یہ تھا کہ اس کے موضوعات کی خوفناک غلطیوں' مضحکہ خیز تضادات' بے بنیاد اوہام اور کفریات کی نشاندہی کروں گا۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں' مَیں مذہب کے معاملے میں خاصا متعصب ہو چکا تھا لیکن ابھی نوجوان تھا اس لئے تعصب کا رنگ پختہ ہو کر بغض اور عناد کی صورت اختیار نہ کر سکا تھا۔ چنانچہ مَیں نے ابتدا ہی سے اس کا مطالعہ شروع کیا تو طبیعت پر ہچکچاہٹ کا عالم طاری تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ کیفیت اشتیاق کی صورت اختیار کر گئی اور آخر میں یہ حالت شدید پیاس کی شکل میں سامنے آ گئی۔ یوں لگتا تھا کہ اگر صداقت کا چشمۂ صافی نہ ملا تو میری جان نکل جائے گی۔ پھر اللہ جلّ جلالہٗ نے مجھ پر خاص کرم فرمایا اور جلد ہی وہ لمحہ آیا جب اس نے خود میری رہنمائی فرمائی۔ مَیں توہّم پرستی سے حقیقت کی دنیا میں' جھوٹ سے سچ کی حالت میں' گھٹا ٹوپ اندھیروں سے روشن اجالوں یعنی عیسائیت سے اسلام کی آغوش میں آ گیا۔ مَیں نے قرآن پاک کے مقدس و مطہر اوراق میں اپنے مسائل کا حل پا لیا۔ میری ساری روحانی حاجتوں کی تسکین ہو گئی اور میرے سارے شکوک و شبہات ہوا میں تحلیل ہو کر یقین کی صورت اختیار کر گئے۔ اللہ نے اپنے نور کی طرف کچھ اس انداز سے رہنمائی فرمائی کہ مجھے مزاحمت کا یارا ہی نہ رہا اور مَیں نے نہایت خوشدلی کے ساتھ سرِ تسلیم خم کر دیا۔ قرآن کے حکیمانہ اسلوب نے ہر چیز نکھار کر رکھ دی۔ اب ہر شے میں مجھے اس کی حکمت نظر آنے لگی۔ مَیں نے اپنے آپ کو پہچان لیا۔ کائنات کی حقیقت سمجھ میں آنے لگی اور اس کے خالق و مالک کی حیثیت متعین ہو کر سامنے آ گئی۔

قرآن نے مجھے اس امر سے آگاہی بخشی کہ مَیں اب تک گمراہیوں میں بھٹک رہا تھا۔ یہ سوچ کر مجھے بے حد دکھ ہوا کہ مذہب کے نام پر اب تک مجھے دھوکا دیا جا رہا تھا اور میرے محبوب اساتذہ کے الفاظ سفید جھوٹ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ میرے خیالات و تصورات کی دنیا ایک آن میں تہ و بالا ہو گئی جس پر مَیں نے تائید ایزدی سے نئی خوبصورت عمارت کھڑی کر لی۔ مجھے اس بات نے لافانی مسرتوں سے ہمکنار کیا کہ بالآخر مَیں نے اپنے مالکِ حقیقی کو پہچان لیا ہے۔ میرا دل محبت اور احسان مندی کے جذبات سے

بھر گیا۔ میں کسی طرح بھی اس کے فضل و کرم کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ اگر اس کی رہنمائی شاملِ حال نہ ہوتی تو میں ساری عمر جہالت و حماقت کے اندھیروں میں ٹھوکریں کھاتا رہتا۔

بہر حال جونہی میں اسلام کی حقانیت سے آگاہ ہوا' خوشی اور ولولے کے بے پایاں احساس کے ساتھ میں اپنے والدین' اساتذہ' ہم مکتب ساتھیوں' عزیزوں اور واقف کاروں کی طرف بھاگ کھڑا ہوا اور باری باری انہیں اس نعمتِ عظمیٰ سے آگاہ کیا جو اللہ نے مجھے عطا کی تھی۔ میری خواہش تھی کہ یہ لوگ بھی جہالت و تعصب سے چھٹکارا پا کر اس روشنی کو اپنے سینوں میں بھر لیں جس سے محروم رہ کر یہ لوگ ہمیشہ خسارے میں رہیں گے اور جس سے دور رہ کر یہ کبھی سچی مسرتوں سے ہمکنار نہیں ہو سکیں گے۔ مگر آہ! میں نے دیکھا کہ میرے اور ان لوگوں کے درمیان بہت اونچی اور موٹی دیواریں حائل ہو گئی ہیں۔ یہ تنگ نظری اور کور باطنی کے ایک ایسے قلعے میں بند ہیں جہاں تک میری کوئی آواز نہیں پہنچتی۔ ان کے دل پتھروں سے زیادہ سخت ہیں' جن پر حق و صداقت کا کوئی تیشہ کام نہیں کرتا۔ انہوں نے میری باتوں کے جواب میں شدید نفرت اور بیزاری کا اظہار کیا' مجھے ذہنی اذیت دینے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا اور معاشرے میں میرا اٹھنا بیٹھنا دوبھر کر دیا۔ ان کی غیر معمولی مخالفانہ روش سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ ہدایت صرف اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اسی لئے میرا دل ہر وقت اس احسان کے سامنے جھکا رہتا ہے جس نے اپنے فضلِ خاص سے مجھے اپنے دینِ کامل، اسلام کے حصار میں پناہ دی۔

آخر میں میں یہ عرض کرتا چلوں کہ معلومات کی خاطر میں نے دوسرے مذاہب کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور ہر اعتبار سے اسلام ہی کو مکمل اور قابلِ عمل ضابطۂ حیات پایا ہے۔ اسلام کے سامنے دوسرے مذاہب کی مثال وہی ہے جو سورج کے سامنے ماچس کی تیلی کی ہوتی ہے۔ میں پورا یقین رکھتا ہوں کہ جو شخص بھی قرآن کو سمجھ کر پڑھے گا وہ انشاء اللہ اسلام قبول کر لے گا۔ بشرطیکہ اس نے ذہن کو حق شناسی کے لئے بالکل بند نہ کر لیا ہو۔ سلامتِ طبع رکھنے والا غیر متعصب شخص قرآن کو پڑھ کر بے دینی کے اندھیروں میں رہ سکتا ہی نہیں۔ ☆

●……●……●

صلاح الدین بورڈ (امریکہ)

(SALAHUDDIN BOARD)

یہ ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ کی بات ہے' میں ایک دن ایک ڈاکٹر کے کلینک میں بیٹھا ہوا تھا جہاں میں نے لندن سے چھپنے والے ایک رسالے "افریقن ٹائمز اینڈ اورینٹ ریویو" کا ایک شمارہ دیکھا۔ اس میں اسلام کے بارے میں ایک مضمون تھا جس نے میری توجہات کو بے اختیار اپنی طرف کھینچ لیا۔ ایک لمحے میں میری زندگی کا دھارا بدل گیا اور میں نے اسلام قبول کرلیا۔ اس مضمون کا ایک ہی فقرہ میرے دل میں کھب گیا اور وہ لا الٰہ الا اللہ یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مختصر سا کلمہ مسلمانوں کی وہ انمول متاع ہے کہ جس پر وہ جتنا بھی فخر کریں' بجا ہے۔

میں نے اسلام قبول کیا تو صلاح الدین کے نام سے نوازا گیا۔ میرا محکم یقین ہے کہ اسلام سچا اور سیدھا راستہ ہے' کیونکہ یہ خدا کے اقتدار اعلیٰ میں کسی کو شریک نہیں کرتا اور یہ تعلیم دیتا ہے کہ خدا کے سوا اور کوئی ہماری فریاد نہیں سنتا' نہ گناہوں کو معاف کرسکتا ہے۔ پھر یہ مذہب فطرت سے کامل ہم آہنگی بھی رکھتا ہے۔ چنانچہ ہمارا شب و روز کا مشاہدہ یہ ہے کہ کارخانہ ہو یا کھیت' دفتر ہو یا کاروبار' شہر ہو یا ریاست' کسی بھی معاملے میں بیک وقت دو سربراہ نہیں چل سکتے۔ اس حقیقت نے بھی مجھے بہت متاثر کیا کہ یہ اسلام ہی کا پیغام تھا جس نے عربوں کو حیات نو عطا کردی۔ وہ لق و دق صحراؤں سے اٹھ کر دنیا پر چھا گئے اور انسانیت کو جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر علم و تہذیب کی روشنی میں لا کھڑا کیا۔ یہ عرب ہی تھے' جنہوں نے اندلس میں محبت اور رحم کے شادیانے بجائے اور بنجر و ویران ملک کو لہلہاتے گلستانوں میں تبدیل کردیا۔

میں جان ڈبلیو ڈریپر کا شکر گزار ہوں جن کی کتاب (INTELECTUAL DEVELOPMENT OF EUROPE) نے مسلمانوں کی عظمت کو میرے دل میں مزید نقش کر دیا۔ اسلام نے عصری علوم اور تہذیب کو ترقی دینے میں جو زبردست رول ادا کیا' جان ڈریپر نے اس کا نقشہ بڑی منصف مزاجی اور صاف گوئی سے کھینچا ہے۔ وہ اندلس میں مسلمانوں کی آمد کے وقت یورپ کی عمومی حالت کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

''یورپ کے مقامی باشندوں کے وحشیانہ طور طریق سے کچھ یوں اندازہ ہوتا تھا کہ جیسے ابھی یہ حیوانی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کے جسم صفائی کے تصور سے ناآشنا تھے' ذہنوں میں جہالت کے اندھیرے لمبی تانے سو رہے تھے۔ وہ جھونپڑیوں میں رہتے تھے جن کے فرش پر اگر لمبی گھاس بچھی ہوتی اور دیواروں کے ساتھ تنکوں کی چٹائی چڑھی ہوتی تو مکین کو خاصا صاحب حیثیت سمجھا جاتا تھا۔ ان کی مرغوب غذاؤں میں لوبیا' گوارا کے بیج اور پودوں کی جڑیں تھیں۔ اکثر حالات میں درختوں کی جڑیں بھی چٹ کر جاتے۔ جانوروں کی کھالوں کو سکھا کر لباس کے طور پر استعمال کرتے تھے جو اس وقت تک جسم سے جدا نہ ہوتیں جب تک خود ہی دھجیوں کی صورت میں نہ اڑ جاتیں''۔

مسلمانوں نے یورپ کے لوگوں کو شخصی آرام و سہولت سے بھی آشنا کیا اور انہیں کھانے پینے' لباس پہننے اور مہذب زندگی گزارنے کے طریقے بھی سکھائے۔ چنانچہ یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے یورپ کو جہالت' مایوسی' بدتہذیبی اور توہمات کے اندھیروں سے نکالا اور انہیں وہ علوم و فنون دیئے جن کی بدولت آج وہ ساری دنیا کا چودھری بنا بیٹھا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ عربوں میں یہ انقلاب ان کے خدا نے' قرآن نے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیدا کیا تھا اور یہی نسخہ کیمیا تھا جس نے انہیں صدیوں تک عزت و شرف کی مسند پر بٹھائے رکھا۔

اشهد أن لااله الا الله و أشهد أن محمدا الرسول الله.

●......●......●

ڈاکٹر طارق احمد راشد (انگلستان)

ڈاکٹر طارق احمد راشد کا پرانا نام ڈاکٹر کینتھ کریگ (KENNETH CRAIG) تھا۔ قبول اسلام سے قبل وہ انگلستان میں عیسائیت کے ایک مستند عالم اور مبلغ (THEOLOGIAN) تھے۔ اسلام کی طرف حیرت انگیز طور پر انہوں نے اس وقت پیش قدمی کی جب ۱۹۷۶ء میں وہ ملازمت کے سلسلے میں چین میں مقیم تھے اور وہاں دیگر مذاہب کی طرح اسلام پر بھی مکمل پابندی عائد تھی۔ ان کے قبول اسلام کی دلچسپ داستان انہی کی زبان سے سنئے۔

میں ۱۹۳۵ء میں امریکہ میں پیدا ہوا۔ عام ماحول کے مطابق میرے ماں باپ محض نام کے عیسائی تھے اور انہیں مذہبی مراسم کی چنداں پروا نہ تھی۔ تاہم مجھے رواج کی خاطر رومن کیتھولک طریقے سے بپتسمہ دیا گیا۔

میری عمر چند ہی برس کی تھی جب میرے والدین چین منتقل ہو گئے اور میرے لڑکپن کے کئی سال شنگھائی میں بسر ہوئے۔ قدرتی طور پر مجھے چین کے لوگوں سے پیار ہو گیا اور کمیونزم کی تحریک چلی تو عام چینی بچوں کی طرح ماؤزے تنگ میرے بھی محبوب رہنما بن گئے۔ میں نے چیئرمین ماؤ کے علاوہ کارل مارکس، انجلز اور لینن کی تحریروں کا خوب مطالعہ کیا اور ساری امیدیں پرولتاری انقلاب سے وابستہ کر لیں۔ لیکن انقلاب کا ماحول، ان گنت قسم کی پابندیاں اور گھٹن ہمارے خاندان کو راس نہ آئی اور میرے والدین انقلاب کے تین چار سال کے اندر چین سے انگلستان چلے گئے جہاں میں نے سیکنڈری اسکول کی تعلیم ختم کی ہی تھی کہ بدقسمتی سے میرے ماں اور باپ دونوں وفات پا گئے اور

میں دنیا میں یک و تنہا رہ گیا۔

اس وقت خدا نے مجھے سہارا دیا اور اس کی یاد اور عبادت میری تنہائیوں کی مونس و ہمدم بن گئی۔ چنانچہ میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو مذہبی تعلیمات کو گہرائی کے ساتھ سمجھنے کے لئے میں نے فلاسفی اور THEOLOGY (علم الٰہیات) کے مضامین اختیار کئے۔ میں چاہتا تھا کہ مستقبل میں عیسائیت کی تعلیم اور تبلیغ میں تخصص (SPECIALIZATION) حاصل کر دوں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور میں نے پوسٹ گریجوایشن کے بعد THEOLOGY میں پی ایچ ڈی بھی کر لی اور عیسائیت کے ایک مستند مبلغ کی حیثیت سے چرچ میں خدمات انجام دینے لگا۔

لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ عین اس دور میں جب میں مبلغ کی حیثیت سے اپنی خدمات جوش و خروش سے انجام دے رہا تھا' میں عیسوی عقائد کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گیا اور شک کی یہ لہر بڑھتی ہی چلی گئی۔ مسیح کا خدا ہونا' عقیدہ تثلیث یعنی ایک میں تین اور تین میں ایک ہونا اور سب سے بڑھ کر ''خدا'' کا دشمن کے ہاتھوں مصلوب ہونا' ان عقائد نے مجھے سخت پریشان کیا اور عجیب بات یہ ہے کہ جوں جوں مطالعہ کیا اور رفقا سے گفتگوئیں کیں' یہ گتھی الجھتی چلی گئی۔ تنگ آ کر تقابل ادیان کی شاخ اور اسلام کا مطالعہ کیا اگرچہ یہ معلومات تعصب سے آلودہ تھیں' پھر بھی ذہن بے اختیار اس اجنبی مذہب سے خاصا متاثر ہوا۔ میں نے چرچ سے اپنا تعلق منقطع کر لیا ''سول'' زندگی اختیار کر لی اور پہلے انگلستان اور پھر جرمنی کے مختلف تعلیمی اداروں میں تدریس کے فرائض انجام دیتا رہا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس ذہنی تبدیلی کے باوجود خدا پر میرا ایمان متزلزل نہ ہوا۔ اس لئے ہفتہ وار عبادت کے لئے میں اتوار کو گرجے میں جایا کرتا تھا۔

۱۹۷۲ء میں لندن کے چینی سفارت خانے نے مجھ سے رابطہ قائم کیا اور پیشکش کی کہ میں چین کے ایک لسانیاتی ادارے (LANGUAGE INSTITUTE) اور پیکنگ یونیورسٹی میں انگریزی زبان کی تعلیم دیا کروں۔ میں بہت خوش ہوا۔ گویا خوابوں کو تعبیر مل گئی۔ میں نے پیشکش قبول کر لی اور پیکنگ یونیورسٹی سے وابستہ ہو گیا۔ زبانوں کے متعلقہ انسٹیٹیوٹ میں بھی مجھے خدمات انجام دینا تھیں۔

لیکن میں اس مرتبہ مجھے بالکل نئی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ مذاہب کو مکمل طور پر کچل دیا گیا تھا۔ عبادت خانے یا تو مسمار کر دیئے گئے تھے یا انہیں سرکاری تحویل میں لے لیا گیا تھا جبکہ چرچ سے تعلق منقطع ہونے کے باوجود میرا خدا سے رابطہ بڑھ گیا تھا اور میں عبادت کے بغیر اپنے آپ کو خلا اور گھٹن کی کیفیت سے دوچار پاتا تھا۔ اسی لئے اتوار کو پابندی سے گرجا میں حاضری دیتا تھا...... لیکن یہاں ایسی کوئی سہولت موجود نہ تھی اور چند ہی برسوں میں ماحول کے زیر اثر میری یہ کیفیت ہوئی کہ آخر کار میں نے سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا کہ آیا خدا واقعی موجود ہے اور مذہب کی کوئی افادیت بھی ہے؟

مایوسی کا یہ وہ آخری درجہ تھا جب اللہ نے ہاتھ بڑھایا اور مجھے حیرت انگیز طور پر دہریت والحاد کی تاریک پستیوں میں گرنے سے بچا لیا۔ ہوا یوں کہ میرے شاگردوں میں دو نوجوان ایسے تھے جن کا مجموعی رویہ باقی سب طلبہ سے مختلف تھا۔ وہ بڑے ہی خوش اخلاق، ملنسار اور باوقار تھے۔ ان سے کوئی چھچھوری حرکت کبھی سرزد نہ ہوئی اور خصوصاً اساتذہ کا وہ بڑا ہی احترام کرتے تھے۔ ان دونوں نے میری توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ راہ و رسم پیدا ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ وہ مسلمان ہیں اور اس طرح اسلام سے میرا براہ راست تعلق قائم ہوا۔ اگرچہ غیر ملکیوں سے چینی باشندوں کا تعلقات استوار کرنا ممنوع تھا، مگر استاد کے ناطے ہمیں کچھ رعایات بھی حاصل تھیں اور اسی رعایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے ان نوجوانوں سے اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کیں اور پہلی بار مجھ پر کھلا کہ یہ مذہب تو عقل و شعور اور وجدان و ضمیر کے مطالبات کے عین مطابق ہے۔

اسلام کے بارے میں میری دلچسپی بڑھتی چلی گئی۔ میں نے پاکستان اور مصر کے سفارت خانوں سے بھی رابطہ قائم کیا اور وہاں سے مجھے بہت ہی کارآمد لٹریچر مل گیا۔ خصوصاً مولانا مودودی کی تحریروں سے مجھے ان سارے سوالوں کے جواب مل گئے جو مذہب کے بارے میں میرے دل و دماغ میں پیدا ہوتے رہتے تھے اور وہ سارے اعتراضات بھی رفع ہو گئے جو مجھے گھیرے رکھتے تھے۔ مولانا مودودی کے علاوہ پروفیسر محمد قطب اور محمود عبدالعاطی کی تحریروں نے بڑا کام کیا۔ میں مکمل طور پر یکسو ہو گیا اور جی چاہنے لگا کہ مسلمانوں کے انداز میں عبادت کیا کروں۔ میرے مسلمان شاگردوں نے

بتایا کہ بیجنگ کے نواح میں ٹونکسی کے مقام پر ایک مسجد جمعہ کے روز صرف ایک گھنٹے کے لیے کھلتی ہے جہاں ایک چینی امام غیر ملکی مسلمانوں کو جمعہ کی نماز پڑھاتا ہے۔ اس کی تصدیق فلسطین، پاکستان اور مصر کے رفقائے کار نے بھی کی اور میری خواہش پر وہ مجھے جمعہ کے روز اپنے ساتھ مسجد میں لے جانے لگے اور اسلامی طریق عبادت اور اس کے فلسفے نے میری ساری روحانی پیاس بجھادی۔ پاکستانی سفارت خانے سے مجھے قرآن اور اس کا انگریزی ترجمہ بھی مل گیا اور میں اسے خوب توجہ سے پڑھنے لگا۔

اسلامی کتب کے مطالعے اور مسلمانوں سے رابطے کا سلسلہ کئی سال تک جاری رہا حتیٰ کہ میں نے اسلام قبول کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ اس مقصد کے لئے میں ہانگ کانگ چلا گیا اور ۱۲ دسمبر ۱۹۸۲ء کو وہاں کے اسلامک سنٹر میں جاکر حلقہ بگوشِ اسلام ہوگیا۔ اللہ غفور الرحیم کی رحمت اور فضل و کرم کا شکر کس زبان سے ادا کروں، اس نے اسلام کی نعمت مجھے اس ملک میں عطا فرمائی جہاں اس کا نام لینا جرم قرار پایا تھا اور جہاں خصوصاً اہلِ اسلام پر بے حد و حساب ظلم توڑے گئے تھے۔

●......●......●

مولانا عبدالرحمٰن

(ہندوستان)

مولانا موصوف کراچی میں مقیم ہیں اور مسلکِ اہلِ حدیث کے ممتاز عالمِ دین ہیں۔ ان کے قبولِ اسلام کی سرگزشت پروفیسر محمد ایوب قادری نے مرتب فرمائی جو شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد کے مجلہ "الولی" میں شائع ہوئی۔ پروفیسر صاحب موصوف کے شکریے کے ساتھ اسے یہاں نقل کیا جارہا ہے۔

ضلع جالندھر کی تحصیل نکودر میں میانوال آرائیاں اور میانوال مولویاں دو مشہور بستیاں ہیں۔ میں اول الذکر مقام میانوال آرائیاں میں ۲۰ فروری 1913ء کو پیدا ہوا۔ میرا نام رام سرن رکھا گیا۔ میرے باپ کا نام لالہ نند لال تھا۔ ہماری ذات ریہان کھتری تھی۔ ہمارا خاندان اس علاقے میں خاصا مشہور، صاحبِ حیثیت اور بااثر تھا۔ سرکار دربار میں اچھا رسوخ تھا۔ مذہباً ہم سناتن دھرمی تھے۔ ہمارے ہاں ساہوکارہ، تجارت اور زمینداری کا کام ہوتا تھا اور علاقے کی سرداری بھی حاصل تھی۔

مروّجہ طریقے کے مطابق میری تعلیم شروع ہوئی۔ ۱۹۳۱ء میں میں نے شاہ کوٹ سے انگلش مڈل پاس کیا اور اول درجے میں کامیاب ہوا۔ پھر مزید تعلیم حاصل کرنا چاہی مگر کچھ مواقع ایسے رہے کہ تعلیم حاصل نہ کرسکا اور تجارت کا سلسلہ شروع کردیا۔ مجھے بچپن ہی سے مذہب سے لگاؤ تھا اور دل تلاشِ حق کا جویا تھا۔ میری بستی کے لوگ سناتن دھرمی تھے۔ مجھے شرک و بدعات سے طبعاً نفرت تھی۔ چنانچہ جب میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا اسی زمانہ میں میرے دو تایا زاد بھائی لالہ دینا ناتھ اور لالہ گردھاری لال بسلسلہ تجارت

جالندھر اور فیروز پور میں ایک سال یا آٹھ ماہ رہ کر گھر واپس آئے۔ اس زمانے میں مذہبی مباحثے اور مناظرے عام ہوتے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ انہوں نے یہ مناظرے سنے، اگر سنے تو مذہب کے متعلق کیا معلومات حاصل کیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ مخلوق بحیثیت مخلوق نہ ہم کو کوئی نفع پہنچا سکتی ہے اور نہ نقصان اور یہ اختیار صرف بھگوان (خدا) کو ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ آریہ سماج کے خیالات سے متاثر ہو چکے تھے۔

میرے بھائیوں کی یہ بات میرے ذہن میں بیٹھ گئی اور میں نے اس کا تجربہ شروع کر دیا۔ ہمارے گاؤں کے قریب ''سید پور'' کی ایک بستی تھی وہاں ''بابا سید رانا'' کی قبر تھی جس پر دور و نزدیک سے ہندو، مسلمان، سکھ بھی نذریں چڑھاتے تھے۔ ہمارے گھر سے بھی نذر جاتی تھی۔ میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب میرے ذریعے سے کوئی چیز بطور نذر قبر پر بھیجی جاتی تو میں بجائے قبر پر چڑھانے کے خود چٹ کر جاتا تھا اور اس قبر پر جو پیسے وغیرہ ہوتے وہ بھی اٹھا لیتا۔ اس عمل سے مجھے کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اس طرح میرا دل مضبوط ہو گیا۔

میں پانچویں جماعت میں تھا کہ ایک مرتبہ ڈپٹی صاحب اسکول میں معاینے کے لئے آئے۔ اساتذہ نے اسکول کو خوب سجایا۔ ہر جماعت کے کتبے لگائے گئے۔ ہماری جماعت کے استاد درشن خان نے کتاب میں سے مندرجہ ذیل اشعار لکھے ؎

چار دن کی زندگی ہے آپ کو ہے اختیار
دوستی کر لیجیے یا دشمنی کر لیجیے
آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں

ان اشعار کا میرے دل پر خاص اثر ہوا۔ ہماری پانچویں جماعت کے ایک استاد بے انت سنگھ تھے۔ وہ بالعموم طلبہ کو نیکی کے کاموں کی رغبت دلاتے تھے۔ انہوں نے طلبہ سے ایک ڈائری بنانے کے لئے کہا اور بتایا کہ اس ڈائری میں نیکی کا وہ کام لکھا جائے جو کیا جائے تاکہ اس طرح نیک کام کرنے کی عادت پڑ جائے۔ انہوں نے فرمایا کہ اگر کوئی بڑا کام نہ کر سکو تو کم از کم راستے میں سے اینٹ اور پتھر ہی ہٹا دو۔ استاد بے انت سنگھ کی

باتوں نے بھی مجھے متاثر کیا اور مجھے نیکی سے محبت ہوتی چلی گئی۔ پھر جب میں نے فارسی پڑھنی شروع کی اور کتاب میں اس طرح کے اشعار پڑھے ؎

از مکافات عمل غافل مشو
گندم از گندم بروید جو ز جو

تو ان اشعار اور اساتذہ کی نصیحتوں کے نتیجے میں میرے دل و دماغ میں یہ بات راسخ ہوگئی کہ نیک کاموں کا بدلہ نیک ہے اور بُرے کاموں کا بدلہ برا ہے۔

تعلیم چھوڑنے کے بعد میں مطالعہ بھی کرتا تھا اور غور و فکر بھی۔ بت پرستی سے مجھے شروع ہی سے نفرت تھی اور اب میں آریہ سماج کے قریب ہوگیا تھا۔ شرک و بدعات اور رسوم پرستی سے مجھے سخت بے زاری تھی اور میں اپنے معاشرے کا باغی تھا۔ میں نے آریہ سماج کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ ستیارتھ پرکاش کو پڑھا اور نظریاتی طور پر میں نے آریہ سماج کے اصول قبول کر لئے مگر دل اب بھی مطمئن نہیں تھا۔

اس کے بعد میں اپنے تجارتی نیز دوسرے مشاغل میں معروف رہا' مگر تلاشِ حق کا جذبہ برابر کارفرما رہا۔ اب میں نے ہر قسم کا مذہبی لٹریچر پڑھا' لیکچر اور وعظ سنے' مگر کوئی ایسا آدمی نہیں ملا جو مجھے مطمئن کر سکتا۔ اب میرا مطالعہ بہت وسیع ہوگیا تھا اور میں حق بات علی الاعلان کہہ دیتا تھا۔ اس وجہ سے لوگ میری عزت کرنے لگے تھے اور میری حق گوئی سے متاثر بھی تھے بلکہ بالعموم لوگ مجھے متنازعہ فیہ مسائل میں ثالث و حکم بھی بنانے لگے تھے بلکہ بعض مذہبی معاملات میں بھی میری رائے کو وقیع سمجھنے اور ماننے لگے۔

ستیارتھ پرکاش میں آریوں کے لئے دس اصول لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے چھٹے اصول پر مجھے شک ہوا اور وہ اصول میری نظر میں بالکل باطل ٹھہرا اور اب میں آریہ سماج سے بھی متنفر ہوگیا۔ اب میں نے اسلامی کتب کا خاص طور سے مطالعہ شروع کیا۔ میاں وال مولویاں میں ایک فارغ التحصیل طالب علم تھے۔ بعض مباحث میں جب میں ان سے رجوع کرتا تھا تو وہ مجھے مطمئن نہ کر سکتے تھے۔ اسی دوران میں نے اپنے ایک ہم جماعت ولی محمد سے کہا کہ میں اسلام کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے جواب دیا کہ میرے بھائی علی محمد صاحب سے گفتگو کرو، وہ آپ کو معلومات بہم پہنچا سکیں گے۔ میں

جب علی محمد صاحب کے پاس گیا تھا تو وہ ایک ضروری کام میں مصروف تھے، مگر وہ میری طرف فوراً متوجہ ہوئے۔ میں نے گوشت خوری پر اعتراض کیا کہ یہ جانوروں پر سراسر ظلم ہے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا سبزیوں میں روح ہے یا نہیں؟ میں نے اثبات میں جواب دیا تو انہوں نے کہا کہ پھر تو سبزی خور بھی ''جیو ہتیا'' کے مرتکب ہوئے۔ ان کے اس جواب سے میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں کئی مہینے تک ان کے پاس جاتا رہا۔ وہ میرے بہت سے سوالوں اور اعتراضات کے تسلی بخش جواب دیتے رہے۔ یہاں تک کہ مجھے اطمینان کی منزل تک پہنچا دیا اور اب میں اسلام کو سچا مذہب سمجھنے لگا۔ ایک روز میں نے اپنے باپ سے اس سلسلے میں گفتگو کی اور ان سے کہا:

میں...... ''میں نے مختلف مذاہب کا مطالعہ اور تحقیق کی ہے اور اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اسلام سب سے بہتر مذہب ہے''۔

باپ...... ''بیٹا! سب مذہبوں کا مدعا اور مقصد ایک ہے لیکن لوگوں نے جہالت اور لاعلمی کی وجہ سے ان کو مسخ کر دیا ہے''۔

میں...... ''اسلام میں عبادت اور اس کا طریقہ نہایت پاکیزہ اور اعلیٰ ہے' اس کی مثال کوئی دوسرا مذہب نہیں پیش کر سکتا''۔

باپ...... میں مانتا ہوں کہ ایسی پاکیزہ عبادت کسی اور مذہب میں نہیں......

اس کے بعد میں نے اس گفتگو کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا' مگر میں علی محمد صاحب کے پاس برابر آتا جاتا رہا۔ اب میری ذہنی کیفیت عجیب تھی۔ میں برابر اسلام کے بارے میں سوچا کرتا تھا۔ رات کو جب سوتا تو دیکھتا کہ ایک سفید پرندہ میرے اوپر سے اڑ کر جاتا ہے۔ یہ کیفیت مہینوں رہی۔ میں اکثر خواب میں پرواز کرتا تھا اور دہلی کی طرف جاتا تھا۔ یہاں ایک بات کا ذکر اور ضروری سمجھتا ہوں کہ کپورتھلہ کی جامع مسجد کو دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا تھا۔ یہ ایسی نفیس اور عالی شان مسجد تھی کہ جس کو میں گھنٹوں دیکھا کرتا تھا۔ بات یہ تھی کہ وہ مسجد جامع مسجد دہلی کے نقشہ کے مطابق نئے مسالہ سے بنائی گئی تھی۔ چونکہ میں ابھی باقاعدہ داخلِ اسلام نہیں ہوا تھا لہذا میں نے مسجد میں داخلہ کا حل یہ نکالا کہ مسجد میں جا کر حوض پر بیٹھتا اور وضو کرتا رہتا۔ اس طرح مسجد کو دیکھتا رہتا۔

میں اپنے مسلمان دوستوں اور خصوصاً شیخ نظام الدین درزی سے برابر ملتا رہتا تھا اور اسلام کی تعلیمات حاصل کرتا تھا۔ ایک روز میرے بڑے بھائی نے جو نہایت زیرک اور قیافہ شناس تھا' مجھے وضو کرتے دیکھ لیا۔ مجھ سے پوچھا کہ یہ کیا کر رہے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ میں ہاتھ منہ دھو رہا ہوں۔ میرے مولوی صاحب جن کے پاس میں عربی پڑھنے جاتا ہوں' وہ اسی طرح ہاتھ منہ دھوتے ہیں۔ یہ سن کر بھائی نے کہا کہ عربی پڑھنے مت جایا کرو۔ مگر اب تو میں نے نماز بھی سیکھنی شروع کر دی تھی اور مجھے سورہ اخلاص وغیرہ یاد ہو گئی تھیں۔

ایک دن میں سو کر اٹھا تو بے اختیار میرے منہ سے لا الٰہ الا اللہ نکلا۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اسلام میں سچی اور پکی توحید موجود ہے۔ اب رسالت کا معاملہ رہ گیا۔ ہمارے پڑوس کے ایک گاؤں میانوال مولویاں میں مولوی جلیل الرحمٰن ایک حنفی عالم رہتے تھے۔ میں نے ان سے رابطہ قائم کیا اور مذہبی مباحث پر گفتگوئیں کیں۔ شیعہ اور قادیانی لٹریچر بھی میں نے خوب پڑھا اور ان فرقوں کے متعلق مجھے بہت سی معلومات حاصل ہو گئیں اور میں ان کی اصلیت و حقیقت سے پوری طرح واقف ہو گیا۔ شیخ نظام الدین اور ان کے بھانجے خوشی محمد سے میرا رابطہ اور ملاقاتیں برابر جاری رہیں۔ یہ لوگ اہلِ حدیث تھے۔ میرا رجحان بھی اہلِ حدیث مسلک کی طرف ہو گیا۔ بلکہ ایک مرتبہ مجھ سے مولوی جلیل الرحمٰن سے تقلید و عدم تقلید کے مباحث پر گرما گرم بحث اور تلخی بھی ہو گئی۔ میں نے اہلِ حدیث مسلک کی زوردار طریقے سے حمایت کی۔

اب میں نماز یاد کر چکا تھا اور ضروریاتِ دین سے پوری طرح واقف ہو چکا تھا۔ ایک روز میں نظام الدین صاحب کی دکان پر گیا اور ان سے کہا کہ اب میں نے پختہ ارادہ کر لیا ہے کہ اپنے اسلام کا اعلان کر دوں اور علی الاعلان فرائضِ اسلام بجا لاؤں اور میں نے یہ طے کیا ہے کہ اپنے اسلام کا اعلان جامع مسجد دہلی' جامع کپور تھلہ' امرتسر یا لاہور میں کروں۔ میری اس بات کو سنتے ہی شیخ نظام الدین نے فوراً اپنی دکان کا دروازہ بند کر لیا اور کہنے لگے کہ ایسی گفتگو آہستہ سے کرو۔ اگر کہیں تمہارے خاندان والوں کو پتہ چل گیا تو میرا سر پھوڑ دیں گے اور میرے گھر بار کو تباہ و برباد کر دیں گے۔

اس کے بعد طے ہوا کہ خوشی محمد سے مشورے کے بعد اگلا قدم اٹھایا جائے' چنانچہ مجلس مشاورت منعقد ہوئی اور طے پایا کہ دہلی جا کر میں اپنے اسلام کا اعلان کردوں۔ چنانچہ ۸ ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ/۱۳ اپریل ۱۹۳۳ء کو ایک بجے خوشی محمد کی معیت میں اپنے گھر سے نکلا' گویا کفر و ضلالت کی دنیا کو خیرباد کہا اور اسلام و ایمان کی طرف بڑھا۔ دنیا کے سارے رشتے توڑے اور اللہ سے رشتہ جوڑا۔

میں نے اس سے پہلے اپنے والد کو سارا حساب کتاب جو مجھ سے متعلق تھا سونپ دیا تھا اور جو رقم میری تحویل میں تھی وہ ان کے سپرد کر دی تھی۔ صرف آٹھ روپے ساڑھے چودہ آنے جو میری ذاتی پونجی تھی' وہ اپنے پاس رہنے دیے۔ یہ میرا کل اثاثہ تھا۔ رات کو ہم نے شاہکوٹ میں قیام کیا۔ مسلمانوں کا محلہ تھا۔ سڑک کے کنارے سوئے۔ وہیں خوشی محمد نے قاضی سلیمان منصور پوری مرحوم کی کتاب رحمۃ للعالمین کی پہلی جلد لا کر دی۔ میں نے اس جلد کا خاص طور پر وہ حصہ پڑھا جو صحابہ کرامؓ کے اسلام لانے اور مصائب و آلام برداشت کرنے اور ثابت قدم رہنے سے متعلق تھا۔ تقریباً نوّے صفحات تھے۔ رات کو گائے کا گوشت پکا کر کھایا اور اللہ تعالیٰ سے خوب دعائیں کیں۔ صبح سات بجے ہم شاہ کوٹ سے دہلی روانہ ہو گئے۔ راستے میں فکودر میں ایک صاحب مولوی محمد عیسیٰ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ جب ان کو میرے عزائم معلوم ہوئے تو انہوں نے کہا کہ مسلمان ہونے کے بعد داڑھی رکھنی پڑے گی۔ میں نے کہا ضرور رکھوں گا۔

شام کو ساڑھے آٹھ بجے دہلی پہنچے۔ خوشی محمد مجھے مولوی عبدالوہاب ملتانی کے مدرسے میں لے گئے۔ اس وقت وہاں نماز عشا ہو رہی تھی۔ نماز کے بعد خوشی محمد نے مولوی عبدالستار صاحب سے میرا تعارف کرایا اور مقصد بیان کیا کہ وہ مجھے باقاعدہ مسلمان کرلیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ اب اسی طرح سلادو' صبح ترجمہ قرآن کریم سنانے کے بعد مسلمان کریں گے۔

میرے دل پر اس کا برا اثر ہوا کہ اس کام میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے تھی۔ مبادا میرا ارادہ بدل جاتا۔ بہرحال مجھے ایک رات اور غور کرنے کا موقع مل گیا۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں اختلاف ہیں مجھے سب سے اقرب الی الحق فرقہ کی طرف رہنمائی فرما۔ رات کو مجھے اطمینان ہوا کہ اہل حدیث مسلک کو اختیار

کرلوں۔ ساتھ ہی میں نے دعا کی۔

''خدایا! میں بالکل کنارے پر کھڑا ہوں۔ مجھے حق کی روشنی دکھا''۔ رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک مجمع عام ہے۔ اس میں اسلام کی حقانیت پر مباحثہ و مناظرہ ہو رہا ہے جس میں اسلام پر تقریر کرنے والا شخص مظفر و منصور ہوا ہے۔ چنانچہ جب میں بیدار ہوا میرے دل کو سکون و اطمینان تھا اور میں نے سمجھ لیا کہ کہ اسلام دین حق ہے۔ صبح اذان ہوئی تو میں نماز میں شریک ہوا۔ نماز کے بعد مولوی عبدالستار صاحب کا درس قرآن ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے باقاعدہ مسلمان کیا اور میرے اسلام لانے کا اعلان عام ہوا۔ مولوی صاحب نے میرا نام عطاء اللہ تجویز کیا جو ایک سال تک جاری رہا مگر مجھے اپنا نام ارشاد اللہ پسند تھا۔ مگر جب میں نے حدیث میں پڑھا کہ اسلام میں پسندیدہ نام عبداللہ اور عبدالرحمن ہیں تو میں نے اپنا نام عبدالرحمن رکھ لیا اور اب میں اسی نام سے مشہور ہوں۔ میری زندگی کا یہ عظیم واقعہ (قبول اسلام یا اعلان اسلام) ۱۴ اپریل ۱۹۳۳ء بمطابق ۷ ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ کو ہوا۔ واللہ یھدی من یشاء۔

میں نے جامع مسجد دہلی کے امام صاحب سے اپنے اسلام لانے کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا اور وہ سرٹیفکیٹ خوشی محمد صاحب کو دے دیا تاکہ ان پر کوئی مصیبت نہ پڑے۔ ساتھ ہی میں نے اپنے اہل خاندان کو بذریعہ ڈاک مطلع کر دیا کہ بلا کسی جبر و اکراہ کے برضا و رغبت میں نے اسلام کو دین حق سمجھتے ہوئے اسے قبول کیا ہے۔ اس میں کسی کی ترغیب و تحریص و تخویف کو مطلق دخل نہیں تھا۔ میرے اس فعل کا کوئی شخص محرک و ذمہ دار نہیں ہے۔ اس کے بعد یہ معاملہ ختم ہو گیا۔ البتہ میری بہن سودھابائی زوجہ لالہ کشوری لال ساکن کپور تھلہ نے جو اس وقت دہلی میں مقیم تھی، ضرور ہاتھ پاؤں مارے۔ اس زمانے میں اس نے تقریباً نو سو روپے خرچ کیے۔ مختلف اسکیمیں اور منصوبے بنائے، مجھے اغوا کرانا چاہا مگر سب بے سود ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر موقع پر میری حفاظت اور مدد فرمائی۔

اب میں نے دہلی میں سکونت اختیار کر لی اور مدرسہ دارالکتاب والسنہ میں پڑھنے لگا۔ میرے اسلام لانے کے ایک سال آٹھ ماہ بعد میرے رشتہ کی بات چیت ہوئی۔ مولانا عبدالستار دہلوی مرحوم کی بڑی پھوپھی کی پوتی اور چھوٹی پھوپھی کی نواسی کے ساتھ میری شادی ہو گئی۔

میں نے مسجد فتح پوری کے مدرسے میں بھی تعلیم حاصل کی۔ کچھ دنوں مدرسہ صدیقیہ میں بھی پڑھا۔ جب میں فارغ التحصیل ہوگیا تو مدرسہ دارالکتاب والسنہ میں باقاعدہ تدریس کا سلسلہ شروع کردیا۔ شروع شروع میں مجھے پڑھانے میں دقت ہوئی' لہٰذا میں مولانا عبدالجلیل صاحب کے پاس سامرود (ضلع سوات) چلا گیا۔ ان کے پاس میں نے پھر تمام کتابیں پڑھیں۔ اب مجھے اپنے اوپر اعتماد ہوگیا اور میں دہلی آگیا۔ دو سال تک میں پھر مدرسہ دارالکتاب والسنہ میں پڑھاتا رہا۔ اس کے بعد میں نے دہلی میں مسجد نیم والی (پہاڑ گنج) میں اپنا مدرسہ محمدیہ قائم کرلیا اور کتابوں کی تجارت کا سلسلہ بھی شروع کردیا۔ ستمبر 1947ء تک میرا یہی مشغلہ رہا۔

تقریباً چھ سال میں دہلی میں ''صحیفہ اہلِ حدیث'' کا منیجر رہا۔ مولانا محمد اسماعیل صاحب (گوجرانوالہ) اور میرے درمیان ایک بحث تقریباً آٹھ ماہ جاری رہی۔ بحث یہ تھی کہ مسلمان کو اپنے لئے بحیثیت مسلمان کیا کہنا چاہیے۔ مسلمان یا اہلِ حدیث' میں کہتا تھا کہ مسلمان کہنا چاہیے۔ مولانا محمد اسماعیل کہتے تھے کہ اہلِ حدیث۔ مولانا عبیداللہ (شیخ الحدیث مدرسہ رحمانیہ دہلی) حَکم قرار پائے۔ انہوں نے کہا کہ میں تو عبدالرحمٰن کی رائے سے متفق ہوں۔ میں نے مولانا عبیداللہ صاحب سے علمِ حدیث کا درس دینا سیکھا ہے۔ بخاری شریف اور ترمذی شریف کا درس مولانا عبیداللہ صاحب ہی نے مجھے سکھایا۔

قیامِ پاکستان کے بعد جب دہلی میں مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا تو میں نے اپنے اہل و عیال کے ہمراہ پاکستان ہجرت کی اور ۷ نومبر ۱۹۴۷ء کو لاہور آگیا۔ دس ماہ منٹگمری (ساہیوال) میں رہا' پھر مدرسہ ڈھلانہ میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ یہ سلسلہ ۲۸ فروری ۱۹۴۸ء تک رہا۔ اس کے بعد میں کراچی آگیا اور جماعتِ اسلامی کراچی کا ناظمِ دفتر مقرر ہوا اور ایک مسجد میں بلامعاوضہ خطابت کے فرائض بھی انجام دیتا رہا۔ جماعتِ اسلامی کے بعض حضرات سے کچھ اختلاف ہوا لہٰذا میں نے علیحدگی اختیار کرلی۔

میرے چار لڑکے (۱) عبدالمنان (۲) حبیب الرحمٰن (۳) خلیل الرحمٰن اور (۴) عبیدالرحمٰن ہیں۔ ول الذکر جیالوجسٹ ہیں اور اس وقت امریکہ میں ہیں۔

ڈاکٹر عبدالکریم جرمانوس (ہنگری)

(DR. ABDUL KARIM GERMANUS)

الحاج ڈاکٹر عبدالکریم جرمانوس ہنگری کے مستشرق اور بین الاقوامی علمی شہرت کے مالک تھے۔ وہ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے درمیان ہندوستان آئے تھے۔ کچھ عرصہ ڈاکٹر ٹیگور کے شانتی نکیتن میں گزار کر جامعہ ملیہ دہلی گئے۔ جہاں انہوں نے انشراح صدر کے ساتھ اسلام قبول کر لیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کئی زبانوں کے ماہر تھے خصوصاً ترکی میں سند کا درجہ رکھتے تھے۔ مشرقی علوم کا مطالعہ اسلام کی طرف ان کی رہنمائی کا سبب ہوا تھا۔ موصوف کے یہ تاثرات اردو ڈائجسٹ ۱۹۶۴ء سے ماخوذ ہیں۔

جوانی کا زمانہ تھا۔ میں برسات کی ایک خوشگوار اور خوبصورت سہ پہر کو ایک مصور رسالہ پڑھ رہا تھا۔ اس کے صفحات پر عصرِ حاضر کے مباحث کے ساتھ ساتھ دلچسپ افسانے اور دور دراز ملکوں کے حالات چھپے ہوئے تھے۔ میں رسالے کے ورق الٹ پلٹ رہا تھا کہ نگاہ ایک تصویر پر جم کر رہ گئی۔ یہ تصویر کچھ چھت دار مکانوں کی تھی' جا بجا گنبد اور مینار آسمان کی طرف بلند ہو رہے تھے اور بہت سے لوگ زرق برق لباس پہنے سیدھی صفوں میں دوزانو بیٹھے ہوئے تھے۔ تصویر کا منظر ہمارے مغربی مناظر سے بالکل مختلف تھا۔ اس لئے میری توجہ اس میں جذب ہو کر رہ گئی۔ ایک نامعلوم سی بے چینی ہوئی کہ اس تصویر کا اصل مفہوم معلوم کیا جائے۔

بعد میں تھوڑی سی کوشش سے پتہ چل گیا کہ یہ تصویر مسلمانوں کی عبادت' نماز کی ایک

جھلک پیش کرتی ہے۔ مزید معلوم ہوا کہ مسلمان اپنا ایک الگ طرز زندگی رکھتے ہیں۔ تجسس تو تھا ہی' میں نے ترکی زبان پڑھنا شروع کی۔ مجھے بہت جلد یہ معلوم ہو گیا کہ ترکی ادب میں اس کے اپنے الفاظ بہت کم ہیں۔ اس کی نثر میں فارسی اور نظم میں عربی کا اثر غالب ہے۔ اب میں نے ترکی کے ساتھ عربی اور فارسی کی تحصیل بھی شروع کر دی۔ مقصد محض یہ تھا کہ ان زبانوں کے ذریعے اپنے آپ کو اس روحانی دنیا میں داخل ہونے کے قابل بنا سکوں جس کی تابناکیوں نے انسانیت کی تقدیر کو جگمگا دیا ہے۔

خوش قسمتی سے ایک مرتبہ موسم گرما کی تعطیلات میں مجھے بوسنیا کے سفر کا اتفاق ہوا۔ یہ یورپی ملکوں میں ہمارا سب سے قریبی پڑوسی ہے۔ وہاں میں نے ایک ہوٹل میں قیام کیا اور جیتے جاگتے' چلتے پھرتے مسلمانوں کو قریب سے دیکھنے لگا۔ رات کا وقت تھا۔ مدھم مدھم روشنی سڑکوں پر پڑ رہی تھی۔ میں ایک کم حیثیت کیفے میں داخل ہوا۔ اندر معمولی سٹولوں پر بیٹھے دو بوسنیئی قہوے کا لطف اٹھا رہے تھے۔ وہ ترکوں کے روایتی گھیرے دار پاجامے پہنے ہوئے تھے جو کمر پر سے پیٹیوں کے ذریعے بندھے ہوئے تھے۔ ہر ایک پیٹی میں ایک خنجر لٹکا ہوا تھا۔ پوشاک اور وضع قطع سے وہ فوجی معلوم ہوتے تھے۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ ان سے کچھ دور ایک سٹول پر دبک کر بیٹھ گیا۔

دونوں نے میری طرف متجسس نگاہوں سے دیکھا۔ میری رگوں میں خون منجمد ہو کر رہ گیا اور وہ تمام قصے ذہن میں تازہ ہو گئے جو کتابوں میں مسلمانوں کے متعصبانہ تشدد اور عدم رواداری کے بارے میں پڑھ چکا تھا۔ وہ دونوں آپس میں کچھ سرگوشیاں کر رہے تھے اور جہاں تک میں سمجھ سکا' موضوع سخن کیفے میں اس وقت میری غیر متوقع موجودگی تھی۔ مجھے ڈر لگنے لگا کہ کہیں وہ مجھے قتل نہ کر دیں۔ اس خطرناک ماحول سے میں نے نکل جانے کا ارادہ کر لیا، لیکن مجھ میں اٹھنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ میں اسی پریشانی میں مبتلا تھا کہ ہوٹل کے ملازم نے خوشبودار قہوے کی ایک پیالی لا کر میرے سامنے رکھ دی اور ان خوفناک آدمیوں کی طرف اشارہ کیا کہ انہوں نے بھیجی ہے۔ میں نے ان آدمیوں پر گہری نگاہ ڈالی۔ اس پر ان میں سے ایک نے متبسم چہرے کے ساتھ نرم اور شیریں آواز میں مجھے سلام کیا۔ میں نے بادل نخواستہ مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ سلام کا جواب دیا۔ میرے

دونوں مفروضہ دشمن اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آ گئے۔ مجھ کو یقین ہو گیا کہ وہ کم از کم مجھے کیفے سے نکال باہر کریں گے' لیکن انہوں نے پہلے سے بھی زیادہ شیریں لہجے میں دوبارہ سلام کیا اور میری چھوٹی میز کے سامنے بیٹھ گئے۔ ایک نے تپاک کے ساتھ سگار پیش کیا۔ ان کے اس شریفانہ برتاؤ سے مجھے محسوس ہونے لگا کہ اس فوجی لباس کے اندر خلیق اور متواضع روح پوشیدہ ہے۔

انہوں نے سلسلۂ گفتگو شروع کیا۔ میں قدیم ترکی میں ان کی باتوں کا جواب دیتا رہا۔ یہ بات چیت بڑے کام کی ثابت ہوئی۔ انہوں نے بڑے خلوص سے مجھے اپنے یہاں مدعو کیا۔ مسلمانوں سے ذاتی طور پر یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

دن' مہینے' برس گوناگوں واقعات و حادثات اپنے دامن میں لے کر آتے اور گزرتے گئے' علم کا ہر مسئلہ اور زمانے کا ہر واقعہ مجھے نئے تجربات سے دوچار کرتا رہا۔ میں نے یورپ کے تمام ملکوں کی سیاحت کی۔ قسطنطنیہ یونیورسٹی میں تعلیم پائی' ایشیائے کوچک اور شام کی تاریخی یادگاروں اور قدرتی مناظر کی رعنائی کا مشاہدہ کیا اور عربی' فارسی اور ترکی میں فارغ التحصیل ہو کر بوڈاپسٹ یونیورسٹی (ہنگری) میں شعبہ اسلامیات کا صدر مقرر ہو گیا۔

میں نے علم کے خشک و تر ذخیرے کا بڑا حصہ حاصل کر لیا جو صدیوں سے جمع ہوتا چلا آ رہا تھا۔ ہزار ہا کتابوں کی ورق گردانی کر ڈالی' لیکن کتابی معلومات کا یہ سرمایہ مجھے قلب کی تسکین کا سامان نہ دے سکا۔ دماغ سیراب تھا' مگر روح تشنہ تھی۔ میری دلی تمنا تھی کہ جو کچھ میں نے اب تک پڑھا ہے' اسے یکسر فراموش کر کے دل کی داخلی کیفیات میں کھو جاؤں۔ میری روح مقدس مذہب کے سدابہار چمن سے مہک بیز ہونا چاہتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ جس طرح لوہار کچے لوہے کو آگ میں تپا کر فولاد کی شکل دے دیتا ہے' اسی طرح میرا علم روحانیت کے سوز سے زیادہ کارآمد اور بیش بہا بن جائے۔

میں ہندوستان میں تھا جبکہ ایک رات میں نے پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ آپ کی ریش مبارک حنا شدہ تھی۔ (حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ریش مبارک کا قدرتی رنگ حنا شدہ بالوں کی طرح تھا) لباس سادہ اور پاکیزہ

تھا اور اس میں سے ایک عجیب روح پرور خوشبو مہک رہی تھی۔ آپؐ نے نہایت دلپذیر لہجے میں فرمایا:

"تم اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو؟ سیدھا راستہ تمہارے سامنے کھلا ہوا ہے۔ اٹھو اور یقین اور ایمان کی قوت سے اس پر گامزن ہو جاؤ۔"

میں نے ہمت کر کے عرض کیا: "آپ جیسی عظیم ہستی کے لئے یہ بات بہت آسان تھی، جسے خدا نے مافوق الفطرت طاقت عطا کی تھی، جس نے منصب نبوت پر فائز ہو کر تائید غیبی سے اپنے دشمنوں پر فتح کامل حاصل کی اور جس کی مساعی پر خدائے قدوس نے عظمت و جلال کا تاج رکھ دیا۔"

آپ نے ذرا تیز نگاہ سے میری طرف دیکھا پھر کچھ تامل کے بعد فرمایا:

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰداً وَّ الْجِبَالَ اَوْتَادًا وَّ خَلَقْنَاكُمْ اَزْوَاجاًوَّ جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتاً۔ کیا ہم نے زمین کو فرش اور پہاڑوں کو میخیں نہیں بنایا اور تم کو جوڑے کر کے پیدا نہیں کیا اور ہم ہی نے تمہارے سونے کو راحت کی چیز بنایا۔

آپ کی عربی اس قدر فصیح اور پرشکوہ تھی کہ اس کا ہر لفظ خوشگوار ہلکے درا کی مانند میرے کانوں میں بج رہا تھا۔ کلام الٰہی جو آپ کی پیغمبرانہ زبان سے ادا ہو رہا تھا وہ میرے سینے پر ایک بھاری بوجھ ڈالے جا رہا تھا۔

اس کے بعد اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے کراہتے ہوئے کہا، اب مجھے نیند نہیں آسکتی۔ میں اس راز کو نہیں سمجھ سکا جو ان پردوں میں پنہاں ہے۔ میرے منہ سے خوفناک چیخ نکل گئی۔ بے چینی سے دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ پیغمبر خدا کی خشمگیں نگاہ سے دل پر ہیبت سی بیٹھتی جا رہی تھی۔ پھر ایسا محسوس ہوا جیسے گہری نیند طاری ہو گئی ہے۔ میں اچانک جاگ اٹھا۔ رگوں میں دوران خون تیز ہو گیا۔ سارا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ جوڑ جوڑ میں درد تھا۔ زبان گنگ ہو رہی تھی اور بے حد اضمحلال اور تنہائی کا احساس ہو رہا تھا۔

دوسرے جمعے کو جامع مسجد میں آنکھوں نے ایک نیا منظر دیکھا۔ بھورے بالوں اور زرد چہرے کا ایک اجنبی چند محترم شخصیتوں کے ساتھ مجمع میں سے اپنا راستہ بناتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ میں ہندوستانی کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ سر پر رام پوری ٹوپی تھی۔ سینے پر

سلاطین ترکی کے عطا کردہ نشانات امتیاز آویزاں تھے۔ ایک مختصر سی جماعت مجھے اپنے ہمراہ لئے سیدھی منبر کے سامنے پہنچی۔ یہاں علما اور بزرگان ملت بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے بلند آواز سے "السلام علیکم" کہہ کر میرا استقبال کیا۔ میں منبر کے قریب بیٹھ گیا۔ میری آنکھیں بلا ارادہ اٹھ کر تھوڑی دیر کے لئے مسجد کی تعمیری صنعت کاری اور محراب و در کی زیب و زینت کی طرف جم گئیں۔ درمیان کی بلند محراب پر شہد کی مکھیوں نے چھتے لگا رکھے تھے۔ جن کے گرد وہ مجمع سے بے نیاز ہو کر چکر لگا رہی تھیں۔

یکا یک اذان کی صدا بلند ہوئی، جسے دوسرے مکبّروں نے جو مناسب مقامات پر ایستادہ تھے، اپنی صداؤں سے مسجد کے گوشے گوشے میں پہنچا دیا۔ اس الٰہی حکم پر تقریباً چار ہزار مسلمان فوجی سپاہیوں کی طرح ایک دم کھڑے ہوئے اور ایک دوسرے کے پیچھے قریب قریب صفیں جما کر بڑے خضوع و خشوع کے ساتھ نماز ادا کی۔ یہ نظارہ بڑا پُر کیف اور روح پرور تھا۔ نماز پڑھنے والوں میں میں بھی شامل تھا۔

نماز ختم ہونے کے بعد ایک صاحب میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے منبر کے قریب لے گئے۔ زینے پر میرے قدم رکھتے ہی مجمع میں ایک حرکت پیدا ہوئی۔ پگڑیوں سے آراستہ ہزاروں سر لہلہاتے چمن زار کی طرح جنبش میں آ گئے۔ سفید ریش علما نے میرے گرد حلقہ سا بنا لیا، ان کی پُر شوق نگاہیں اور شگفتہ نورانی چہرے ہر ساعت میری ہمت بڑھا رہے تھے۔ میرے اندر جرأت اور امنگ پیدا ہو گئی تھی۔ کسی جھجک کے بغیر میں نے منبر کے ساتویں زینے پر قدم رکھا۔ میں نے اچٹتی نگاہ سے ہجوم کا جائزہ لیا جو مسجد کے آخری سرے تک بحر مواج کی طرح نظر آتا تھا۔ پچھلی صفوں کے لوگ گردنیں اٹھا اٹھا کر مجھے دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا انسانوں کے اس سمندر میں تلاطم برپا ہو گیا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر بعض لوگوں کے منہ سے بیساختہ ماشاء اللہ نکل گیا۔ میں نے اپنی تقریر عربی میں شروع کی:

"ایھا السادات الکرام! میں ایک دور دراز ملک سے سفر کر کے یہاں اس علم کی طلب میں آیا ہوں جو مجھے وطن میں حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں آپ کے پاس روحانی فیضان حاصل کرنے آیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے اس سے مستفید فرمایا"۔

اس کے بعد میں اصل موضوع کی طرف آیا:

''مسلمانوں میں یہ بات عام ہے کہ بس خدا ہی جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے۔ ہمارے عمل اور کئے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن قرآن یہ کہتا ہے کہ ہم نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی جس نے خود اپنی حالت بدلنے کی کوشش نہ کی ہو''۔

میں نے آیت کی تفسیر کر کے اس کا مفہوم و منشا بیان کیا اور تقویٰ کی زندگی اور گناہ و طغیان کے خلاف جہاد کرنے پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ تقریر کے دوران میں اللہ اکبر کے وجد آفریں نعروں سے فضا بار بار گونج اٹھتی رہی۔ بیان ختم کر کے میں وہیں منبر پر بیٹھ گیا' میرے دل میں جذبات کا طوفان ان طرح موجزن تھا کہ اس وقت کی اور بات سوائے اس کے یاد نہیں رہی کہ ایک صاحب نے ہاتھ کے سہارے مجھے منبر سے اتارا اور مسجد سے باہر لے چلے۔

میں نے پوچھا کہ آخر اتنی جلدی کیوں ہے؟ لیکن ذرا سی دیر میں اس کا سبب معلوم ہو گیا' بے شمار لوگ بڑی بے تابی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ مجھ سے مصافحے اور معانقے کیے۔ ناتواں اور عمر رسیدہ لوگ جو مجھ تک نہ پہنچ سکتے تھے' بڑی محبت کی نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہے تھے۔ ہر شخص اپنے لئے دعا کا خواستگار اور میرے ہاتھوں اور سر کو بوسہ دینے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا۔ میں نے پوری قوت سے گھٹی ہوئی آواز میں کہا ''اے اللہ کے نیک بندو! آپ مجھے اپنے اوپر اتنی ترجیح کیوں دے رہے ہیں۔ بے شمار حشرات الارض میں میرا بھی شمار ہے۔ میری مثال ایک پتنگے کی سی ہے جو روشنی کی طرف بڑھ رہا ہے''۔

اپنے ساتھ اللہ کے ان مخلص بندوں کی عقیدت و محبت کو دیکھ کر میرا دل عجز و ندامت سے پانی پانی ہو رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ سب کچھ اسلام کی بدولت ہے۔ بے شک ہمارا سب سے بڑا اور پختہ رشتہ دین ہی کا ہے۔

●......●......●

عبداللہ بیٹرزبی (انگلستان)
(MAJOR ABDULLAH BATTERSBEY)

کم و بیش تیس برس کا ذکر ہے میں برما میں مقیم تھا۔ کشتی میں سوار ہو کر ندیوں اور دریاؤں میں گشت کرنا میرا سرکاری معمول تھا۔ کشتی کا ملاح چٹا گانگ کا ایک مسلمان شیخ علی تھا۔ شیخ علی زبردست قسم کا ملاح اور باعمل مسلمان تھا۔ نماز کا وقت آتا تو وہ سارے کام چھوڑ کر نہایت وقار اور خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھتا۔ نیکی اور فرض شناسی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس کی ان خوبیوں نے میرے دل میں اس کے لئے عزت اور عقیدت کے جذبات پیدا کر دیئے تھے۔ ساتھ ہی مجھ میں یہ احساس بیدار ہونے لگا تھا کہ اس مذہب کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہئیں جس نے ایک عام آدمی کو اعلیٰ انسانی و اخلاقی اقدار کا پیکر بنا دیا ہے۔

میرے ارد گرد بدھ مذہب کے پیروکاروں کی اکثریت تھی۔ میں دیکھتا تھا کہ یہ لوگ بھی نیکی و پرہیزگاری کی بڑی نمائش کرتے ہیں اور کہا جاتا تھا کہ سخاوت اور دریا دلی کے اعتبار سے دنیا بھر میں کوئی قوم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی مگر ان کو عبادت کرتے ہوئے دیکھتا تو رہ رہ کر کسی کمی کا احساس ہوتا تھا۔ وہ پگوڈوں (عبادت گاہوں) میں بھی جاتے تھے مگر صاف نظر آتا تھا کہ ان کے طرز عبادت میں غیر فطری قسم کا عجز و انکسار غالب ہے اور قوت یا وقار کا کہیں شائبہ نہیں جبکہ اس کے مقابلے میں شیخ علی کی عبادت میں وقار بھی تھا، حسن بھی اور عجز و انکسار بھی۔ اس تقابلی مطالعے نے اسلام کے لئے میری دلچسپی میں بہت اضافہ کر دیا۔ لیکن جب کبھی میں شیخ علی سے کچھ جاننے کی کوشش کرتا مجھے بڑی مایوسی ہوتی' وہ بیچارہ اپنے مذہب کی ان خوبیوں کو بیان کرنے پر قادر نہ تھا۔ حالانکہ انہی خوبیوں نے اس کی شخصیت کو میرے نزدیک بے حد محترم بنا دیا تھا۔ تاہم میں شیخ علی کے پیکر میں اسلام کو مجسم صورت میں دیکھتا رہتا تھا۔

اپنی دلچسپی اور تجسّس کی تسکین کے لئے میں نے اسلام اور تاریخ اسلام کے بارے میں کچھ کتابیں خرید لیں۔ میں نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی اور کارناموں کا مطالعہ بھی کیا۔ مزید وضاحت کے لئے میں نے اپنے مسلمان دوستوں سے بھی گفتگو کی۔ تلاشِ حق کا یہ مرحلہ طے نہیں ہوا تھا کہ پہلی جنگِ عظیم چھڑ گئی اور میں فوج میں شامل ہو کر عراق کے محاذ پر چلا گیا۔

اب میں ایک ایسے علاقے میں تھا جسے عرب مسلمانوں کا قلب کہنا چاہئے۔ یہ لوگ قرآن کی زبان عربی میں باتیں کرتے تھے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہی کے درمیان مبعوث ہوئے تھے۔ اسلام کو سمجھنا اب میرے لئے کہیں زیادہ آسان تھا۔ میں نے عربی زبان سیکھ لی اور مسلمان اور قرآن سے براہِ راست تعلق قائم کر لیا۔ اسلامی طریق عبادت کے تواتر اور تسلسل نے مجھے خصوصی طور پر متاثر کیا۔ یہ جان کر مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ اسلام خدا کی وحدانیت کا قائل ہے۔ عیسائیت کے نظریۂ تثلیث سے مجھے خود بھی الجھن ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ مجھے یقین ہو گیا کہ اسلام ہی دنیا کا سچا مذہب ہے اور لا الٰہ الا اللہ میں فطری اپیل ہے۔ میں نے اسلام قبول کرنے کا ارادہ کر لیا۔ گرجے میں جانا چھوڑ دیا اور جب کبھی پولیس آفیسر کی حیثیت سے میری ڈیوٹی لگتی میں مسجد میں بھی چلا جاتا۔

۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۲ء تک مجھے فلسطین میں رہنا پڑا۔ یہیں میں نے قبولِ اسلام کا مصمم ارادہ کر لیا اور ایک روز بیت المقدس کے محکمۃ الشرعیہ میں حاضر ہو کر مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔ میں اس وقت جنرل سٹاف آفیسر تھا۔ چنانچہ میرے اعلان پر خاصے ناخوشگوار ردِ عمل کا اظہار کیا گیا، مگر میں نے کسی کی پرواہ نہ کی۔ الحمد للہ تعالیٰ آج میں مسلمان ہوں اور کروڑوں افراد کی ایک متحد برادری کا فرد۔ میں خدا کا بے حد شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے کفر کے اندھیروں سے نکال کر توحید اور ایمان کے اجالوں میں لا کھڑا کیا ہے اس کے لئے میں اس بوڑھے ملاح "شیخ علی" کا دل کی انتہائی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں جس کے عمل اور شخصیت نے اسلام کی روشنیوں کی طرف میری رہنمائی کی۔ میں ہر نماز کے وقت اس کے لئے دعا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اسے جزائے خیر عطا کرے اور اس کے درجات بلند فرمائے۔

پروفیسر عبداللہ ہینل (امریکہ)

پروفیسر ہینل ہیوٹ امریکہ کے ایک نامور مفکر اور اہلِ قلم ہیں۔ ان کا شمار حالیہ برسوں میں اسلام پر ایمان لانے والے چند اہم امریکی دانشوروں میں ہوتا ہے۔ اب ان کا اسلامی نام عبداللہ حسن ہینل ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے اسلام کی ان خوبیوں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے انہیں اپنا گرویدہ بنا لیا۔

میرا اسلام قبول کر لینا کوئی تعجب انگیز امر نہیں ہے اور نہ اس میں کسی ترغیب یا لالچ کو دخل ہے۔ میرے خیال میں یہ ذہن کی قدرتی تبدیلی اور ان مذاہب کے وسیع مطالعہ کا نتیجہ ہے جو انسانی عقلوں پر قابض ہیں۔ مگر یہ تبدیلی اس شخص میں پیدا ہو سکتی ہے جس کا دل و دماغ مذہبی تعصب سے پاک ہو اور صاف دل کے ساتھ اچھے اور برے میں تمیز کر سکتا ہو۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ عیسائیت میں کچھ سچے اور مفید اصول موجود ہیں اور اگر اس مذہب سے وہ تمام بدعتیں الگ کر دی جائیں جو پادریوں نے ایجاد کر دی ہیں تو یہ بھی انسان کے لئے ایک مفید مذہب بن سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ان بدعتوں نے اس کی صورت کو بگاڑ دیا ہے اور اسے بالکل بے جان کر ڈالا ہے۔ اس کے برخلاف اسلام اسی ابتدائی شکل میں ہے جس میں وہ جلوہ گر ہوا تھا اور چونکہ میں ایک ایسے مذہب کا متلاشی تھا جو آمیزش سے پاک ہو اس لئے میں نے اسلام قبول کر لیا۔

کسی کلیسا میں بھی چلے جایئے' وہاں نقش و نگار اور تصویروں اور مورتیوں کے سوا آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔ اس کے علاوہ پادریوں کے زرق برق لباس پر نظر ڈالئے' پھر ان

بطریقوں، راہبوں اور ننوں کے ہجوم کو دیکھئے تو ان کا روحانیت سے دور کا بھی تعلق دکھائی نہیں دیتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم کسی عبادت خانے میں نہیں بلکہ ایک ایسے بت خانے میں کھڑے ہیں جو صرف بتوں کی پوجا کے لئے بنایا گیا ہے۔ اس کے بعد مساجد پر نظر ڈالئے، وہاں آپ کو نہ کوئی مورت دکھائی دے گی اور نہ تصویر۔ پھر نمازیوں کی صفوں پر نظر ڈالئے، ہزاروں چھوٹے بڑے انسان شانہ سے شانہ ملائے کھڑے نظر آئیں گے۔ امام صاحب کو دیکھئے تو ان کا لباس نہایت سادہ نظر آئے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ نماز میں رکوع و سجود کا منظر اس قدر جاذب نظر ہوتا ہے کہ کوئی انسان بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مسجد کی پوری فضا اور اس کی تمام چیزیں روحانیت کی جانب انسان کی رہنمائی کرتی ہیں۔ وہاں تصنع ہے اور نہ بناوٹ اور نہ غیر ضروری آرائش۔ اس کے برخلاف گرجا کی تمام چیزوں میں مادی دنیا کا مظاہرہ بہت زیادہ ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ اعتراض کریں کہ پروٹسٹنٹ مذہب تو ان عیوب سے پاک ہے، اس نے تو اپنے گرجوں سے بت اور تصویریں نکال پھینکی ہیں۔ تم نے اسلام کی بجائے اسے قبول کیوں نہیں کیا۔ بلاشبہ پروٹسٹنٹ مذہب حقیقی مسیحیت سے قریب ضرور ہے مگر میں باوجود اس اعتراف کے کہ مسیح علیہ السلام ایک جلیل القدر پیغمبر تھے، ہرگز ان کی الوہیت کا قائل نہیں۔ وہ میری ہی طرح کے انسان تھے اور میرا یہ عقیدہ کوئی نیا نہیں بلکہ اسلام اسی عقیدے کا پرچار کرتا ہے۔ اسلام نہ صرف حضرت مسیح علیہ السلام کا پورا احترام سکھاتا ہے بلکہ دنیا کے تمام مذاہب اور بانیان مذاہب کے احترام کی دعوت دیتا ہے۔

میں عرصۂ دراز سے اسلام کی جانب مائل تھا، لیکن میرا ایمان اتنا قوی نہیں ہو رہا تھا کہ میں بے دھڑک اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر سکتا۔ یہ تذبذب کسی انسان یا سوسائٹی کے خوف کی بنا پر نہیں تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں پوری طرح اسلام کی خوبیوں سے اور خصوصیات سے واقف نہیں ہوا تھا، لیکن اسلام کے بارے میں جوں جوں میں علمائے اسلام کی کتابوں کا مطالعہ کرتا گیا، میری آنکھیں کھلتی گئیں اور مجھے صاف طور پر اس دین متین کی خوبیاں اور پیغمبر اسلام محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کا بنی نوع انسان پر احسان معلوم ہو گیا اور آخر میں نے اس دین فطرت کو اپنا مذہب بنا لیا۔

اسلام میں جیسی توحید پرستی مَیں نے دیکھی ہے وہ کسی دوسرے مذہب میں موجود نہیں اور اسلام کی اسی توحید پرستی نے مجھے سب سے پہلے اس مذہب کی جانب مائل کیا۔ اسلام میں جو سب سے بڑی خوبی مَیں نے پائی وہ یہ ہے کہ وہ صرف روحانی ترقی ہی کا حامی نہیں ہے بلکہ وہ دنیاوی ترقی میں بھی بہت بڑا ممد و معاون ہے۔ وہ انسان کو گوشہ نشینی اور راہبانہ زندگی گزارنے کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ وہ انسان کو کارگاہِ حیات میں آگے بڑھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ وہ دینی معاملات ہی میں انسان کی رہنمائی نہیں کرتا بلکہ دنیا کے ہر معاملے میں سیدھا متوازن راستہ بتاتا اور قدم قدم پر بنی نوعِ انسان کو روشنی دکھاتا ہے۔ اسلام نے دنیا کو عاقبت کی کھیتی قرار دیا ہے اور اسے حکم دیا ہے کہ وہ دینی فرائض ادا کرنے کے ساتھ دنیاوی فرائض سے بھی غافل نہ ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ موجودہ سائنسی دور میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو ترقی یافتہ دنیا کا ساتھ دے سکتا ہے۔

اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تنگ نظری اور تعصب کا شدید مخالف ہے۔ وہ صرف اپنے ہم مذہبوں ہی کے ساتھ مروّت اور محبت کی ہدایت نہیں کرتا بلکہ وہ کُل بنی نوعِ انسان کے ساتھ خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے کیوں نہ تعلق رکھتے ہوں' ہمدردی و مساوات کا حکم دیتا ہے۔ وہ تفریق کا نہیں بلکہ اتحادِ انسانی کا قائل ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے پہلی مرتبہ انسان کو انسانیت کا سبق پڑھایا ہے۔

مَیں گزشتہ پانچ سال سے مذہب اسلام کا پیرو ہوں۔ جس چیز نے میرے ایمان کو تقویت دی وہ اسلام کے بلند اور پاک اصول ہیں۔ اس کی عالمگیر اخوت ہے' اس کی بے نظیر مساوات ہے اور اس کا علم و عرفان ہے جس نے میرے دل و دماغ میں ایک نئی روشنی پیدا کر دی ہے۔

اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو سرتا پا علم و عمل ہے بلکہ مَیں تو کہوں گا کہ اسلام ایک ایجابی دین ہے جبکہ مسیحیت ایک ایسا مذہب ہے جو نہ صرف وحدانیت کا منکر ہے بلکہ انسان کو دنیا اور اس کی تمام نعمتوں سے متمتع ہونے سے منع کرتا ہے۔

کوئی فرد اگر صحیح معنوں میں عیسائی بننا چاہتا ہے تو اسے دنیا سے کنارہ کش ہو کر گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کرنی ہوگی، لیکن اسلام میں رہ کر ہم دنیا کی تمام مسرتوں اور راحتوں

سے مستفید ہو سکتے ہیں نہ ہمیں مسجد کا گوشہ تلاش کرنا ہوگا اور نہ ویرانوں میں زندگی بسر کرنے کی مجبوری ہوگی۔

اگر انسان کو دنیا میں اسی لئے بھیجا گیا ہے کہ گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر کے اسے برباد کر دے تو اس کی پیدائش کا مقصد سمجھ میں نہیں آتا۔ انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ وہ صرف اسلام نے بتایا ہے کہ انسان اس کارگاہ حیات میں رہ کر قدرت کی ہر چیز سے فائدہ اٹھائے مگر ساتھ ہی اپنے پروردگار اور اس کی مخلوق کو بھی نہ بھولے۔ میں نے جب سے اسلام قبول کیا ہے قلبی سکون محسوس کر رہا ہوں۔ میری دنیا بھی درست ہو گئی ہے اور عاقبت بھی (الحمد للہ تعالیٰ)۔

(بشکریہ "وفاق" یکم جون ۱۹۷۶ء)

●......●......●

سر عبداللہ آرکیبالڈ ہملٹن

(انگلستان)

(SIR ABDULLAH ARCHIBALD HAMILTON)

سر چارلس ایڈورڈ آرکیبالڈ وانکو ہملٹن نے ۲۰ دسمبر ۱۹۲۳ء کو اسلام قبول کیا اور سر عبداللہ آرکیبالڈ ہملٹن کے نئے اسلامی نام سے موسوم ہوئے۔ وہ انگلستان کے بڑے نیک نام اور معروف سیاست دان تھے۔ 1976ء میں اپنی پیدائش کے پہلے ہی سال وہ تاج شاہی کی طرف سے بیرونٹ (نواب) قرار دیئے گئے۔ جبکہ 1919ء میں انہیں دوبارہ یہی اعزاز عطا کیا گیا۔ وہ شاہی افواج میں لیفٹیننٹ تھے اور سلیسی کی کنسرویٹو ایسوسی ایشن کے صدر بھی۔

جونہی میرے شعور نے آنکھیں کھولیں اسلام کے حسن اور سادگی نے مجھے متاثر کرنا شروع کیا۔ میں اگرچہ ایک عیسائی گھرانے میں پیدا ہوا تھا اور اسی ماحول میں پروان چڑھا تھا' لیکن اس کے توہم پرستانہ عقائد نے مجھے کبھی اپیل نہیں کیا۔ میں اندھی عقیدت کے مقابلے میں دلیل اور عقلِ عام (COMMON SENSE) کو فوقیت دیتا تھا' مگر عیسائیت میں اس کا کہیں گزر نہ تھا۔

جوں جوں عقل پختہ ہوتی گئی میرا جی چاہنے لگا کہ اپنے خالق سے میرے تعلقات خوشگوار اور امن و آشتی پر استوار ہوں۔ مگر چرچ آف روم یا چرچ آف انگلینڈ دونوں میں یہ اہلیت نہ تھی کہ وہ ایسی فضا قائم کر سکیں۔ یہاں خدا تک پہنچنے کی راہیں بڑی پیچیدہ اور ناقابلِ عبور تھیں۔ اس لئے ان کے تصور ہی سے گھن آنے لگی اور میں بڑی بے چینی سے کسی ایسے صراطِ مستقیم کی جستجو کرنے لگا جو مجھے میری منزل تک لے جا سکے۔

خدا کا شکر ہے مجھے اسلام کی صورت میں یہ سیدھا راستہ مل گیا۔ پہلی ہی نظر میں مجھے اس کی دلکشی اور رعنائی نے گھائل کر دیا اور پھر تو معاملہ یہ ہوا کہ جب میں نے اسلام قبول کیا تو دراصل اس کے پیچھے دل اور ضمیر کا پُر زور اصرار شامل تھا۔ میں پھر خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس وقت سے میں اپنے آپ کو پہلے کے مقابلے میں بہتر اور سچا انسان سمجھتا ہوں۔ یہ امر اپنے اندر دلچسپی کے بہت سے پہلو رکھتا ہے کہ جاہل اور متعصب لوگ جتنا اسلام سے بدکتے ہیں کسی اور مذہب سے نہیں بدکتے۔ لیکن کاش یہ لوگ جانتے کہ اسلام ہی وہ دینِ رحمت ہے جو کمزور کے لئے طاقتور سہارا اور ہر غریب کا امیر دوست ہے۔ انسانیت عموماً تین طبقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک وہ طبقہ جو مالدار اور صاحب ثروت ہوتا ہے۔ دوسرا وہ جسے زندگی گزارنے کے لئے سخت محنت کرنا پڑتی ہے اور تیسرا بے روزگار اور تہی دست و کنگال ہوتا ہے اور اس تیسرے طبقے کی دنیا میں غالب اکثریت ہے۔

اسلام یوں تو ان تینوں طبقوں کے لئے رحمت و برکت کا موجب ہے' مگر موخر الذکر طبقے پر اس کی خاص نظرِ شفقت ہے۔ یہ شرفِ انسانیت کا علمبردار ہے اور فردِ واحد کا بڑا احترام کرتا ہے۔ اس کا طرزِ عمل سراسر تعمیری ہے' تخریب کا یہاں گزر نہیں۔ مثال کے طور پر ایک ایسا زمیندار جو پہلے ہی بہت امیر ہو' اسے زمین کاشت کرنے کی ضرورت بھی نہ ہو وہ اگر زمین کو کچھ مدت کے لئے یونہی بغیر کاشت کے چھوڑ دے تو یہ زمین سرکاری ملکیت میں چلی جاتی ہے اور اسلامی قانون کے مطابق ان لوگوں کو دے دی جاتی ہے جو اسے کاشت کرتے ہوں۔

اسلام اپنے ماننے والوں کو جوئے اور ہر اس کھیل سے سختی سے منع کرتا ہے جو محض اتفاق (CHANCE) پر مبنی ہوں۔ یہ نشہ آور چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے اور سود کی شدت سے مذمت کرتا ہے' جس نے تنہا انسانیت کو بے شمار مصائب و آلام سے دوچار کر رکھا ہے۔ اسی طرح اسلام کسی شخص کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ دوسرے کی بے بسی یا بے چارگی کا فائدہ اٹھائے اور یوں اسلامی معاشرے میں کسی گھٹیا حرکت کا ارتکاب کرے۔

اسلام بڑی باوقار اور متوازن زندگی کا علمبردار ہے۔ یہ نہ تو انسان کو مجبورِ محض سمجھتا ہے نہ مادر پدر آزادی کا قائل ہے۔ بلکہ سعی و جہد' احتیاط اور عقل و فہم کو بنیادی اہمیت دیتا

ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ ایسا معاشرہ برپا کرتا ہے جہاں قوانین کی سیادت تسلیم کی جاتی ہے اور ذہانت اور سوجھ بوجھ کے ساتھ ان پر عمل درآمد ہوتا ہے۔

اسلام انسان کو یہ خوشخبری سناتا ہے کہ وہ معصوم اور ہر قسم کے گناہوں سے پاک پیدا ہوتا ہے۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں ایک ہی مادے سے پیدا ہوتے ہیں' ایک ہی طرح کی روح کے حامل ہوتے ہیں اور جہاں تک ذہنی' روحانی اور اخلاقی ترقی کا تعلق ہے' دونوں یکساں اہلیت سے نوازے گئے ہیں۔

جہاں تک اسلام کی عالمی برادری کا تعلق ہے اس پر مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ مسلّمہ امر ہے جس سے ہر شخص واقف ہے۔ بندہ و صاحب ہو یا محتاج و غنی' اسلام کی نظروں میں سب برابر ہیں۔ خود میرا بارہا کا تجربہ ہے کہ میرے مسلمان بھائی میرے لئے عزت و شرف کا ایک خاص احساس رکھتے ہیں اور میں ان کی کسی بھی بات پر اعتماد کر سکتا ہوں۔ انہوں نے ہمیشہ مجھ سے غیر معمولی محبت و مودّت کا برتاؤ کیا ہے اور جب بھی میں ان کے درمیان ہوتا ہوں' انہیں اپنے سگے بھائیوں کی طرح پاتا ہوں۔

قصہ کوتاہ یہ کہ جہاں اسلام روزمرہ زندگی میں اپنے پیروکاروں کی صاف ستھری اور روشن شاہراہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہاں آج کی نام نہاد عیسائیت نظریاتی اعتبار سے بالواسطہ طور پر اور عملی اعتبار سے براہ راست اپنے ماننے والوں کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ اتوار کو ایک دن تو وہ خدا کی عبادت (PRAY) کریں اور ہفتے کے باقی دن بندگانِ خدا کے شکار (PREY) میں مصروف رہیں۔

(IN CONLUSION I WOULD LIKE TO SAY THAT WHEREAS ISLAM GUIDES HUMANITY IN THE DAILY WORKADAY LIFE, THE PRESENT DAY SO- CALLED CHRISTIANITY, INDIRECTLY IN THEORY AND INVARIABLY IN PRATICE, TEACHES ITS FOLLOWERS,IT WOULD SEEM, TO PRAY TO GOD ON SUNDAYS AND TO PREY ON HIS CREATURES FOR THE REST OF THE WEEK).

●......●......●

ڈاکٹر عبداللہ علاؤالدین (جرمنی)

مجھے اسلام قبول کئے ۱۲ برس ہو چکے ہیں۔

میں دس سال کی عمر میں ذہنی طور پر خودمختار ہو گیا تھا اور منطقی طور پر سوچ سکتا تھا۔ مجھے جرمن پروٹسٹنٹ طریقے کے مطابق کلیسا میں داخل کیا گیا۔ میں نے پادری سے تثلیث یعنی تین خداؤں خدا، بیٹا اور روح القدس کی تشریح سنی کہ یہ تین بھی ہیں اور ایک بھی۔ معمولی ذہانت رکھنے والا بچہ بھی جانتا اور سمجھتا ہے کہ ایک تین نہیں ہو سکتے اور تین کو ایک نہیں کہا جا سکتا۔

میرے دل نے کہا یہ الہامی بات نہیں ہو سکتی، کسی آدمی نے یہ مضحکہ خیز عقیدہ اپنے پاس سے گھڑ لیا ہے۔

پادری صاحب نے بتایا کہ ابن مریم نے سولی پر چڑھ کر کفارہ یعنی قربانی دی تاکہ ان کے سب پیرو نجات حاصل کریں۔

میں نے جب پادری سے اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی تو اس نے سمجھانے کی بجائے غضب ناک ہو کر کہا: لگتا ہے تو خدا کے وجود کا قائل نہیں۔

میں سمجھ گیا کہ پادری پیٹ کا بندہ ہے۔ اس کو خدا اور دین سے کوئی واسطہ نہیں۔ بالآخر میں نے از خود بائبل کا مطالعہ شروع کیا۔ انجیل و تورات کے بعد میں نے بدھ مت کی کتابیں پڑھیں۔

اس وقت تک میں اسلام سے بالکل واقف نہ تھا۔

میری انتہائی خواہش تھی کہ میں کسی طرح تخلیقِ کائنات کی حقیقت سمجھ سکوں۔ انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ انسانی زندگی کا مقصد --- حیوانی زندگی سے بہت اعلیٰ و ارفع ہونا چاہئے۔ نیز انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے آخر کس لئے پیدا کیا؟

میں دو برس تک رات دن مطالعہ کرتا رہا۔ چوبیس گھنٹہ میں مشکل سے دو گھنٹے سوتا

تھا۔ نیند اڑانے کے لئے تیز دوائیں کھائیں' اپنی آنکھوں کے پپوٹوں میں دیا سلائی اس طرح پھنسائی کہ آنکھیں بند نہ ہوں۔ اس طرح میری صحت بھی خراب ہو گئی اور مجھے کچھ حاصل بھی نہ ہوا۔ لیکن جب میں نے اپنی قوتِ ارادی سے کام لینا چھوڑ دیا تو رحمتِ ربّی نے میری دستگیری اور رہنمائی کی۔ میں ایک جرمن جہاز ران کی رپورٹ پڑھ رہا تھا جسے مشرقِ وسطیٰ کے اکثر ممالک دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ جرمن جہاز ران نے اپنی معلومات کا سکہ بٹھانے کے لئے سورۃ اخلاص کا متن اور ترجمہ بھی لکھ دیا تھا۔ اس کے جرمن ترجمہ پر جب میری نظر پڑی تو میں حقیقت کو اس طرح سامنے پا کر دنگ رہ گیا۔ لکھا تھا۔

"اے پیغمبر کہہ دو اللہ صرف ایک ہے (وہی اللہ جسے بنی نوع انسان ابتدائے آفرینش سے ڈھونڈتی چلی آرہی ہے) نہ اللہ کو کسی نے جنا' نہ اللہ ہی نے کسی کو جنا' اس دنیا میں اس کی کوئی مثل ہی نہیں"۔

میں نے زندگی میں پہلی بار پڑھا کہ نہ اللہ کو کسی نے پیدا کیا اور نہ اللہ نے اپنا کوئی بیٹا پیدا کیا۔ یہ آیت پوری طرح میری سمجھ میں آ گئی۔ لیکن مجھے اسلام اور اس کی تعلیمات کا کوئی علم نہ تھا۔ اس لئے میں نے کسی قریبی اسلامی ملک میں جا کر مسلمانوں کے مذہب اور دین کی معلومات حاصل کرنے کا ارادہ کیا۔ شاید مجھے وہ سچا مذہب مل جائے جس کی مجھے پچیس سال سے تلاش ہے۔

میں ایک غریب آدمی ہوں۔ اس لئے جرمنی سے استنبول تک میں نے سائیکل پر سفر کیا۔ میں استنبول پہنچا اور قرآن شریف کو اس خیال سے پڑھنا شروع کیا کہ کتابِ مقدس (بائبل)' تورات' زبور اور اناجیل کی جس طرح غلطیاں تلاش کرتا رہا ہوں اسی طرح اس کتاب کی غلطیاں بھی ڈھونڈوں گا۔ لیکن جوں جوں اس کی تلاوت اور مطالعہ سے مستفیض ہوتا گیا' میرے ایمان میں اضافہ ہوتا گیا کہ یہی وہ آخری اور سچی ہدایت ہے جس کی مجھے تلاش تھی اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ میں ۱۹۵۴ء میں استنبول ہی میں مسلمان ہو گیا۔ الحمد للہ مجھے اسلام کی دولت نصیب ہو گئی۔

●......●......●

شیخ عبدالمجید سندھی

(ہندوستان)

شیخ عبدالمجید سندھی ان رجالِ عظیم میں سے ہیں جنہوں نے جنگِ آزادی کو حقیقی معنوں میں لڑا۔ انہوں نے روایتی ہندو مذہب کو خیرباد کہہ کر "اسلام" قبول کیا۔ ہم نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اس داستان کو قلم بند کیا۔ پھر اس مواد کو سنا کر ان کی منظوری حاصل کی۔ اس طرح یہ داستان گویا ان کی خود نوشت ہے۔ (محمد ایوب قادری)

میں سندھ کے مشہور تاریخی شہر ٹھٹھہ میں ۷ر جولائی ۱۸۸۹ء کو پیدا ہوا۔ میرا نام جیٹھا نند رکھا گیا۔ میرے والد کا نام لیلا رام تھا۔ ہم لوگوں کی ذات عامل ہے جو سندھ کے ہندوؤں میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ یہ لوگ بالعموم تعلیم یافتہ اور سرکاری ملازم ہوتے تھے۔ میرے والد پہلے گورنمنٹ ملازم تھے اور کراچی میونسپل بورڈ میں ملازم ہو گئے تھے۔ وہ نہایت نیک اور مذہبی آدمی تھے اور اکثر مذہبی مجلسیں اور اجتماعات منعقد کرتے تھے جن میں کچھی اور میمن عورتیں خاص طور سے شریک ہوتی تھیں۔ غالباً ۱۹۰۵ء یا ۱۹۰۶ء میں میرے باپ فوت ہوئے۔ اس زمانہ میں ٹھٹھہ میں صرف پانچویں انگریزی جماعت تک سرکاری اسکول تھا۔ لہذا ٹھٹھہ کی تعلیم ختم کر کے میں کراچی آ گیا اور یہاں کے سرکاری اسکول این۔ جے ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اس وقت یہ اسکول اس جگہ تھا جہاں آج کل ڈاؤ میڈیکل کالج ہے۔ میں قریب ہی تھانی کیپا ڈنڈ میں رہنے لگا۔ پہلے یہ وسیع علاقہ تھا اور ٹہل رام وکیل کی ملکیت تھا۔ اس میں زیادہ تر عامل ہندو رہتے تھے۔ اس وقت

میرے بڑے بھائی گیان چند کراچی میونسپل بورڈ میں ملازم تھے۔لہذا والدہ بھی کراچی آ گئی تھیں۔میرا ایک چھوٹا بھائی بھی تھا جس کا نام داود ل تھا۔

کراچی میونسپل بورڈ میں ایک صاحب مولوی تاج محمد بلوچ بھی ملازم تھے جو نہایت نیک اور دیندار شخص تھے۔ان سے میرے بھائی گیان چند کے گہرے روابط تھے۔مولوی صاحب کے ذریعہ سے میرا بڑا بھائی اسلام سے متعارف ہوا اور آہستہ آہستہ وہ اسلام کی طرف راغب ہو گیا۔جب میں کراچی آیا تو میرے بھائی نے مجھے بھی آہستہ آہستہ اسلام کی طرف رغبت دلائی اور کچھ دنوں کے بعد مولوی تاج محمد بلوچ صاحب سے متعارف کرا دیا، اس طرح میں توحید و رسالت کے مفہوم سے آشنا ہو گیا۔

مولوی تاج محمد صاحب نے مجھے بکل کا ترجمۂ قرآن کریم اور بائبل دی تاکہ میں ان کتابوں کا تقابلی مطالعہ کروں۔میں ان دونوں کتابوں کا مطالعہ کرنے لگا تا آنکہ اسلام نے میرے دل میں پوری طرح گھر کر لیا۔اسکول میں ہندو طلبہ سے جب مذہبی مسائل پر گفتگو ہوتی تو میں اسلام کی تائید کرتا۔اس لئے ہندو طلبہ نے مجھے بطور طنز و تحقیر مُسلا (مسلمان) کہنا شروع کر دیا۔

اتفاق کی بات کہ ایک دن میری میز پر بکل کا ترجمۂ قرآن اور بائبل دونوں کتابیں رکھی ہوئی تھیں کہ میرے چچازاد بھائی آ گئے۔انہوں نے قرآنِ کریم کو دیکھ کر کہا کہ یہ کتاب یہاں کیوں رکھی ہے؟ میں نے جواب دیا کہ پڑھنے کے لئے لایا ہوں۔اس بات کو انہوں نے پسند نہیں کیا حالانکہ بائبل پر انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا لیکن وہ ٹھٹک گئے۔وہ میرے طرز عمل سے پہلے سے ہی پریشان تھے۔

مجھے اس اسکول کے طلبہ کا طرز عمل پسند نہیں آیا اور میں نے یہ اسکول چھوڑ دیا۔ موجودہ پاکستان چوک کے پاس ہندوؤں کا ایک اسکول تھا۔اس میں داخلہ لے لیا۔کچھ دنوں کے بعد جب وہاں کے طلبہ اور اساتذہ کو میرے متعلق کچھ معلومات ہوئیں تو وہاں بھی سابقہ صورت حال پیش آئی کہ لڑکے اور استاد مجھ پر انگشت نمائی کرنے لگے اور جدھر سے میں گزرتا مجھے ''مسلمان'' کہہ کر آوازے کسے جاتے۔

بالآخر ایک روز میں نے طے کیا کہ یہ بات مناسب نہیں کہ جس عقیدہ اور مذہب کو

میں حق سمجھتا ہوں اسے لوگوں کے خوف سے پوشیدہ رکھوں۔ مجھے علی الاعلان اُسے قبول کرنا چاہیے اور ڈرنا نہیں چاہیے۔ جب میں نے اپنے ارادے کا اظہار مولوی تاج محمد صاحب سے کیا تو انہوں نے نہایت مسرت اور پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اسی روز رات کو میں نے ایک خط اپنے اعزہ کے نام لکھا:

"میں اسلام کو دینِ حق سمجھتے ہوئے برضا ورغبت قبول کرتا ہوں۔ اب آپ لوگوں سے جدا ہوتا ہوں۔ میرے پاس تیس روپے ہیں وہ رکھے جاتا ہوں۔ میرے بدن پر جو کپڑے ہیں صرف وہی پہنے جا رہا ہوں۔ میرے لئے پریشان نہ ہوں"۔

یہ تحریر چھوڑ کر میں مولوی تاج محمد صاحب کے پاس آ گیا۔ انہوں نے مجھے حیدرآباد سندھ شیخ عبدالرحیم صاحب کے پاس بھیج دیا۔ جو کانگرس کے سابق صدر جیوت بھگوان داس اچاریہ کرپلانی کے بڑے بھائی تھے' انہوں نے مجھے اپنے پاس رکھ لیا۔

میرے گھر چھوڑنے کے بعد جب میری تحریر میرے تکیے کے نیچے سے برآمد ہوئی تو تمام اعزہ اور رشتہ داروں میں تہلکہ مچ گیا۔ چونکہ ہندوؤں کی عامل برادری سندھ میں بہت بااثر تھی لہذا انہوں نے بڑی دوڑ دھوپ کی۔ لوگ تلاش کرتے ہوئے حیدرآباد پہنچے' جس وقت میرے رشتہ دار میرے ٹھکانے پر پہنچے تو میں نماز پڑھ رہا تھا۔

شیخ عبدالرحیم نے مجھے نماز پڑھنے سے روک دیا۔ میں نے فوراً سلام پھیرا۔ انہوں نے اسی وقت مجھے صدر کی مسجد کے پیش امام کے حجرے میں پہنچا دیا۔ اس طرح میرے رشتہ دار مجھے نہ پا سکے۔

اس کے بعد شیخ عبدالعزیز مالک "الحق" پریس (حیدرآباد سندھ) مجھے لاہور لے گئے اور اسٹیشن کے قریب ایک شاندار ہوٹل میں ٹھہرے۔ میں نے ان سے کہا یہ تو ہندو ہوٹل ہے اور اگر میرے رشتہ دار یہاں آئے تو وہ ہم کو یہاں آسانی سے پکڑ سکیں گے۔ شیخ صاحب نے جواب دیا کہ فکر نہ کرو۔ اسی لئے میں اس ہوٹل میں ٹھہرا ہوں تاکہ ہمیں فوراً معلوم ہو جائے کہ تعاقب کرنے والوں کے عزائم کیا ہیں؟

اس کے بعد میں لدھیانہ پہنچا اور وہاں شیخ احمد صاحب کے یہاں رہا۔ پھر انہوں

نے مجھے ایک مسجد کے حجرے میں رکھا۔ ماحول سے علیحدگی کی وجہ سے یہاں میری طبیعت پریشان ہوئی۔ میں نے دل میں سوچا کہ آخر میں نے ایسا کیا گناہ کیا ہے کہ جس کی وجہ سے میں چھپا چھپا پھر رہا ہوں۔ میں نے جو مذہب حق سمجھا وہ اختیار کر لیا۔ لہذا مجھے کراچی واپس جانا چاہئے۔ چنانچہ میں نے اسی مضمون کا ایک خط مولوی تاج محمد صاحب کو لکھ دیا کہ میں کراچی واپس آرہا ہوں۔

میں لدھیانہ سے لاہور پہنچا۔ ٹرین میں مجھے لاہور کے رہنے والے ایک صاحب عبدالرحمن چشتی مل گئے جن کی انارکلی بازار (لاہور) میں ترکی ٹوپیوں کی دکان تھی۔ وہ بڑے ملنسار اور با اخلاق شخص تھے۔ جب ان کو میرے حالات کا علم ہوا تو وہ مجھے اپنے گھر لے گئے اور بڑے آرام سے رکھا۔

دوسرے دن میں کراچی کے لئے روانہ ہوا۔ وہ اسٹیشن پہنچانے آئے۔ میں انٹر کلاس کا ٹکٹ خریدنا چاہتا تھا مگر اتفاق سے میرے پاس تھرڈ کلاس کا کرایہ تھا۔ چشتی صاحب نے فرمایا کہ تمہارے پاس جس درجے کا کرایہ ہے اسی کا ٹکٹ لے لو۔ چنانچہ میں تیسرے درجے کا ٹکٹ لے کر ٹرین میں سوار ہو گیا۔ یہاں ایک لطیفہ غیبی کا ظہور ہوا۔ وہ یہ کہ جب ٹرین جنگ شاہی اسٹیشن پر پہنچی تو میں نے دیکھا کہ میرے کئی رشتہ دار کراچی جانے والے ہیں اور وہ سب انٹر کلاس میں سوار ہوئے۔ اس طرح تھرڈ کلاس میں ہونے کی وجہ سے ان کی گرفت سے بچ گیا۔

کراچی پہنچنے پر میں مولوی تاج محمد صاحب سے ملا۔ انہوں نے مجھے جونا مارکیٹ میں ایک ہوٹل میں ٹھہرا دیا۔ بعد ازاں یہ مشورہ ہوا کہ میں سول اسپتال کراچی کے سول سرجن سے اپنے بلوغ کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لوں۔ چنانچہ میں اس سلسلے میں سول سرجن سے ان کے گھر پر ملا۔ انہوں نے مجھے اسپتال میں بلایا۔

اندیشہ ناک بات یہ تھی کہ سول اسپتال کھٹائی کیپاؤنڈ کے سامنے تھا۔ جہاں میرے تمام اعزہ اور برادری کے لوگ رہتے تھے۔ بہر حال میں اسپتال پہنچا، ابھی سول سرجن سے ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی کہ میرے چچا آ گئے۔ انہوں نے نہایت مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ تمہیں تمہاری ماں بہت یاد کر رہی ہے۔ میں نے ہوش و حواس قائم رکھے اور کہا

کہ بے شک یاد کرتی ہوں گی۔ پھر جھٹ جھٹکا دیکر ہاتھ چھڑا لیا اور فوراً بھاگا۔

سول اسپتال کے دروازے پر وکٹوریہ کھڑی تھی۔ میں اس میں سوار ہو کر جونا مارکیٹ ہوٹل پہنچا۔ وہاں سے مولانا عبداللہ صاحب کے پاس مدرسہ مظہر العلوم محلہ کھڈہ پہنچایا گیا۔ اس زمانہ میں یہ مدرسہ تبلیغ کا مرکز تھا۔ مولانا موصوف نے نہایت شفقت اور محبت کا برتاؤ کیا۔ وہاں میں ایک مکان میں رہنے لگا۔

مولانا عبداللہ صاحب نے ایک روز فرمایا کہ شیخ صاحب! اگر آپ ختنہ بھی کر لیں تو کیسا رہے گا؟ میں نے عرض کیا کہ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لہذا ختنہ ہو گیا۔ اتفاق کی بات کہ خون نہ صرف کافی مقدار میں خارج ہوا بلکہ دوا اور علاج کے باوجود کئی دن تک بند نہیں ہوا۔

اس صورتحال سے مولانا عبداللہ صاحب بہت پریشان ہوئے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعائیں مانگیں۔ میں نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں التجا کی یا مولا! تو مجھے اٹھا لے یا اس تکلیف کو رفع فرما۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ خدا تعالیٰ نے مولانا صاحب کی دعا قبول فرمائی اور خون فوراً بند ہو گیا۔

میرے اعزہ نے میرے بھائی کی طرف سے عدالت میں مقدمہ درج کرا دیا لہذا میری گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو گیا اور پولیس گرفتاری کی تلاش میں تھی۔ جب مولانا عبداللہ صاحب کو اس صورت حال کا علم ہوا تو انہوں نے مجھے دوسرے مکان میں منتقل کرا دیا۔

پولیس مولانا صاحب کے پاس آئی اور ان سے استفسار حاصل کیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ شیخ عبدالمجید صاحب یہاں آئے ضرور تھے اور فلاں مکان میں ٹھہرے تھے اب نہیں معلوم کہاں ہیں۔

اس کے بعد میں چند روز اور کراچی میں رہا' پھر لاڑکانہ چلا گیا وہاں انگریز کلکٹر تھا۔ اس کے یہاں میں نے درخواست دی کہ "میں عاقل و بالغ ہوں اور میں نے برضا و رغبت اسلام قبول کیا ہے۔ میں آپ کے سامنے اس کا اظہار کرتا ہوں لہذا مجھے اس امر کا سرٹیفکیٹ مرحمت فرمایا جائے"۔

حسب ضابطہ کلکٹر نے سرٹیفکیٹ جاری کر دیا۔ پھر میں غلام محمد خاں بھرگری کے پاس گیا جو سندھ کے بڑے زمیندار تھے اور اس زمانے میں لندن سے بیرسٹری پاس کر کے آئے تھے اور انہیں تمام صورت حال سے مطلع کیا۔

بھرگری صاحب نے فوراً ایک خط سٹی ڈپٹی کلکٹر کراچی مسٹر وٹل کو لکھا کہ مطلوبہ لڑکا میرے پاس ہے۔ وٹل نے جواب دیا کہ فلاں تاریخ کو اس لڑکے کو لے کر عدالت میں حاضر ہوں۔ چنانچہ بھرگری صاحب نے مقررہ تاریخ پر مجھے عدالت میں پیش کر دیا۔ میرے اعزہ کی طرف سے مسٹر ریمنڈ وکیل تھا جو اس زمانے میں علاقے کا مشہور وکیل تھا۔ مسٹر ریمنڈ نے اس بات پر زور دیا کہ تا انفصال مقدمہ لڑکا اپنے اعزہ کے پاس رہے جس کے لئے بھرگری صاحب تیار نہیں ہوئے اور انہوں نے عدالت سے کہا کہ یہ لڑکا میرے پاس رہے گا میں اس کا ضامن ہوں۔ وہ سندھ کے بڑے زمیندار اور بیرسٹر تھے' لہذا عدالت نے ان کی یہ بات منظور کر لی۔

اس فیصلہ کے خلاف جوڈیشل کمشنر کے یہاں اپیل کی گئی۔ مقدمے کی پیشی پر جوڈیشل کمشنر نے کہا کہ میں اس لڑکے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ لہذا میں ان کے حضور میں پیش کیا گیا۔ اس کے بعد اس نے پوچھا کہ اس کا وارث کون ہے؟ اس کو بھی پیش کیا جائے۔ چنانچہ میرا بھائی بھی جوڈیشل کمشنر کے سامنے پیش کیا گیا۔ کمشنر نے دیکھ کر کہا کہ عمر کے اعتبار سے کم وبیش دونوں برابر ہیں لہذا اس نے مقدمہ خارج کر دیا اور میں آزاد ہو گیا۔

اس کے بعد میرے اعزہ اور دوسرے رشتہ دار مجھ سے ملے اور چچازاد بھائی نے پوچھا کہ "اب کیا صلاح ہے؟"

میں نے فوراً جواب دیا "اب یہ صلاح ہے کہ تم سب بھی مسلمان ہو جاؤ"۔ یہ سن کر سب لوگ مایوس ہو گئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اب اس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے بعد میں تعلیم کی غرض سے سندھ مدرسہ میں داخل ہوا۔ اتفاق سے ایک روز میرے استاد پرشوتم داس نے کلاس کے تمام طلبہ کو حکم دیا کہ کتابیں ڈیسک کے نیچے زمین پر رکھ دی جائیں۔ طلبہ نے کتابیں نیچے رکھ دیں مگر میں نے نہیں رکھیں۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم نے کتابیں زمین پر کیوں نہیں رکھیں؟ میں نے کہا کہ کتابوں میں خدا کا نام لکھا ہے لہذا

زمین پر رکھنا مناسب نہیں ہے۔ اس پر اس نے کہا کہ میرے حکم کی تعمیل کرتے ہو یا نہیں؟ میں نے جواب دیا کہ افسوس میں معذور ہوں۔ چنانچہ پرشوتم داس نے پرنسپل سے میری شکایت کی۔ پرنسپل نے مجھے بلایا اور کہا کہ پرشوتم داس سے معافی چاہو۔ میں نے کہا کہ اس میں میرا کیا قصور ہے؟ مجھے بتایا جائے۔ پرنسپل نے مجھ سے کہا کہ تم معافی چاہتے ہو یا نہیں؟ میں نے جواب دیا کہ میں معذور ہوں۔ لہذا میرا نام بورڈنگ ہاؤس سے خارج کر دیا گیا۔

اس زمانے میں شیخ عبدالرحیم صاحب پشاور میں رہتے تھے۔ ان کو جب یہ حالات معلوم ہوئے تو انہوں نے مجھے پشاور بلا لیا اور میری تعلیم کا انتظام کر دیا۔ اس زمانے میں وہاں کے امتحانات پنجاب یونیورسٹی کے تحت ہوتے تھے اور پنجاب یونیورسٹی کی زبان اردو تھی۔ میں اتنی اردو نہیں جانتا تھا لہذا انگریزی سے اردو ترجمہ کے پرچہ میں ناکام ہو گیا۔
میں پھر سندھ مدرسہ کراچی آیا۔ پرنسپل نے فیصلہ کن انداز میں کہا کہ اگر تم پرشوتم داس سے معافی چاہو تو تمہیں داخلہ مل سکتا ہے۔ میں نے فوراً ان سے معافی چاہی اور 1910ء میں میٹرک پاس کر لیا۔

(مرتبہ پروفیسر محمد ایوب قادری)
بشکریہ "الولی" حیدرآباد (سندھ) اکتوبر ۱۹۷۲ء

●.....●.....●

مولانا عبیداللہ سندھی

(ہندوستان)

جید عالمِ دین، تحریکِ آزادیٔ ہند کے صفِ اول کے رہنما اور مفکر و مصلح مولانا عبیداللہ سندھی چنداں محتاجِ تعارف نہیں۔ آبائی طور پر آپ ایک سکھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے، مگر قبولِ اسلام کے بعد ساری صلاحیتیں اسلام کے فروغ اور اشاعت کے لیے وقف کر دیں اور آزادیٔ وطن کے لیے سب کچھ داؤ پر لگا دیا اور اس سلسلے میں ملکوں ملکوں کی خاک چھانتے رہے۔ چنانچہ افغانستان، ترکی، روس، سوئٹزرلینڈ اور حجاز میں برسوں مقیم رہے اور غلامی سے نجات پانے اور مسلمانوں کو زوال و ادبار سے رہائی دلانے کی عملی تدبیریں کرتے رہے۔ آخری عمر میں انہوں نے دہلی میں مستقلاً رہائش کر لی تھی۔ ۱۹۴۴ء میں وفات پائی۔

میں ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء کو ضلع سیالکوٹ (پنجاب) کے گاؤں چیانوالی میں ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوا۔ میرے والد رام سنگھ میری پیدائش سے چار ماہ پہلے ہی وفات پا گئے تھے۔ دو سال بعد دادا بھی فوت ہو گئے تو میری والدہ مجھے میرے ماموں کے پاس جام پور (ڈیرہ غازی خاں) لے گئیں۔ میرے ماموں وہاں پٹواری تھے۔ میرے دادا سکھ حکومت میں اپنے گاؤں کے کاردار تھے۔

میری تعلیم ۱۸۷۸ء سے جام پور کے اردو مڈل اسکول سے شروع ہوئی۔ خدا کے فضل سے میں پڑھائی میں بہت اچھا تھا اور میرا شمار ممتاز طالب علموں میں سرِ فہرست تھا۔

۱۸۸۴ء میں جبکہ میری عمر صرف بارہ برس تھی مجھے اسکول کے ایک آریہ سماج ہندو لڑکے کے ہاتھ میں "تحفۃ الہند" نظر آئی۔ میرے اشتیاق پر اس نے مجھے یہ کتاب عاریتاً دے دی جسے میں نے بڑی توجہ اور دلچسپی سے پڑھا۔ خصوصاً اس حصے نے بہت متاثر کیا جو نومسلموں کے حالات پر مشتمل تھا۔ اسلام کی صداقت نے میرے دل و دماغ پر ایک نقش سا قائم کر دیا۔

ڈیرہ غازیخاں مسلم اکثریت کا ضلع تھا اور عام مسلمان مذہب کے سچے شیدائی اور راسخ العقیدہ تھے۔ اس ماحول نے وہاں کے غیر مسلموں کو خاصا متاثر کر رکھا تھا۔ چنانچہ نزدیکی گاؤں کوٹلی مغلاں کے چند ہندو دوستوں نے جو میری طرح "تحفۃ الہند" کے گرویدہ تھے، مجھے شاہ اسماعیل شہید کی "تقویۃ الایمان" پڑھنے کو دی۔ اس کے مطالعہ سے میں اسلامی توحید اور پرانک شرک کے فرق کو بخوبی سمجھ گیا۔ میں نے شدت سے محسوس کیا کہ جن چیزوں کو میں دل سے ٹھیک سمجھتا ہوں اور میری عقل ان پر یقین رکھتی ہے، وہ چیزیں ہندوؤں اور سکھوں کے مذہبی طور طریقوں سے زیادہ اسلام میں ہیں۔ یہ میرا اپنا تجزیہ اور احساس تھا اور متذکرہ کتابوں نے اس جانب میری رہنمائی کی تھی۔ میں نے دیکھا کہ سکھ بھی خدا کو ایک مانتے ہیں اور مسلمان بھی، مگر اسلام کا تصورِ توحید سکھوں سے بلند تر ہے۔ مساواتِ انسانی دونوں مذہبوں میں موجود ہے لیکن اسلام نے مساوات کو جس طرح عملی شکل دی ہے وہ سکھ مت سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہے۔ سماج کی نمائشی رسوم سے دونوں مذہبوں کو نفرت ہے مگر میں اکثر محسوس کرتا ہوں کہ سکھ مت نے اپنے آپ کو ان رسوم میں بُری طرح مقید کر لیا ہے اور اب اس مذہب کا بابا گورو نانک کی پاکیزہ تعلیمات سے بس برائے نام تعلق ہے۔

میں ان باتوں پر عرصے تک غور و فکر کرتا رہا۔ کتنی ہی راتیں میں نے آنکھوں میں کاٹ دیں۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ جس مذہب کو میری ماں، بہنیں اور ماموں مانتے ہیں، وہ صداقت پر مبنی نہیں ہے جبکہ اسلام جو غیروں کا مذہب ہے وہ بہر حال سچا اور مبنی برحق ہے۔ اب کروں تو کیا کروں۔ جاؤں تو کہاں جاؤں؟

انہیں دنوں ایک مولوی صاحب نے مولوی محمد صاحب لکھوکی کی کتاب "احوالِ

الآخرت" (پنجابی) پڑھنے کو دی۔ "تحفۃ الہند" اور "احوال الآخرت" کے بار بار مطالعے نے بالآخر مجھے حتمی فیصلے تک پہنچا دیا۔ میں نے نماز سیکھ لی اور تحفۃ الہند کے مصنف کے نام پر اپنا نام عبیداللہ رکھ لیا۔ یہ ۱۸۸۷ء کا ذکر ہے اور اس وقت میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ ارادہ تھا کہ اگلے سال جب کسی ہائی اسکول میں تعلیم کے لیے جاؤں گا تو قبول اسلام کا اعلان کر دوں گا۔

مگر جذبات نے سمجھایا کہ مزید تاخیر مناسب نہیں، کیا خبر موت اس وقت تک کی مہلت دے یا نہ دے۔ چنانچہ ۱۵ اگست ۱۸۸۷ء کی صبح کو جبکہ میری والدہ باہر رسوئی میں بیٹھی کھانا پکا رہی تھی، میں کسی بہانے چپکے سے باہر نکلا اور زندگی کے نئے سفر پر چل پڑا۔ منزل نامعلوم تھی۔ میرے ساتھ کوٹلی مغلاں کا ایک رفیق عبدالقادر تھا۔ ہم دونوں عربی مدرسہ کے ایک طالب علم کی معیت میں کوٹلہ رحم شاہ (مظفر گڑھ) پہنچے۔ وہاں ۹ ذی الحجہ ۱۳۰۴ھ کو میری سنتِ تطہیر ادا ہوئی۔ وہیں معلوم ہوا کہ میرے اعزہ میری تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہے ہیں۔ چنانچہ میں سندھ کی طرف روانہ ہو گیا اور بھرچونڈی شریف میں حافظ رفیق صاحب کی خدمت میں پہنچ گیا جو اپنے وقت کے جنید ثانی اور سید العارفین تھے۔

چند ماہ بھرچونڈی شریف میں حافظ صاحب کی صحبت میں گزرے۔ فائدہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرت میرے لیے اس طرح طبیعتِ ثانیہ بن گئی جس طرح ایک پیدائشی مسلمان کی ہوتی ہے۔ حضرت نے ایک روز میرے سامنے اپنے لوگوں کو مخاطب ہوتے ہوئے کہا "عبیداللہ نے اللہ کے لیے ہمیں اپنا ماں باپ بنا لیا ہے"۔ اس کلمہ مبارک کی تاثیر خاص طور پر میرے دل میں محفوظ ہے۔ میں انہیں اپنا دینی باپ سمجھتا ہوں اور انہیں کی خاطر میں نے سندھ کو اپنا مستقل وطن بنا لیا اور سندھی کہلایا۔ میں نے قادری راشدی طریقہ میں حضرت سے بیعت کر لی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ محسوس ہوا کہ بڑے سے بڑے انسان سے کبھی مرعوب نہیں ہوا۔

بھرچونڈی شریف سے میں تحصیل علم کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ پہلے ریاست بہاولپور کی دیہاتی مساجد میں عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھتا رہا۔ پھر دین پور (متصل خانپور) پہنچا جہاں سید العارفین کے خلیفۂ اول مولانا ابوالسراج غلام محمد صاحب رہتے تھے۔ یہیں میں

نے ہدایت النحو تک کی کتابیں مولانا عبدالقادر سے پڑھیں۔ حضرت خلیفہ صاحب نے میری والدہ کو خط لکھوایا۔ وہ آگئیں اور مجھے واپس لے جانے کے لیے بہت زور لگایا' مگر الحمدللہ میں ثابت قدم رہا (یہ غلط ہے کہ میری والدہ دیوبند پہنچیں)۔ شوال ۱۳۰۵ھ میں دین پور سے کوٹلہ رحم شاہ چلا گیا اور وہاں سے ریل پر سوار ہو کر دیوبند جا پہنچا جہاں شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کی رہنمائی میں ایک نئی تعلیمی اور سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔

●......●......●

ڈاکٹر عزیز الدّین

(بھارت)

ڈاکٹر لشی کانت چٹوپادھیا بنگال کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور معزز ہندو خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں کلکتہ میں پیدا ہوئے اور ملازمت کے سلسلے میں حیدر آباد منتقل ہو گئے۔ وہ بے مثال اور غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل تھے۔ حق کی تلاش میں انہوں نے ہندی' انگریزی' جرمن' فرانسیسی اور پالی زبانیں سیکھیں۔ دنیا کے تمام مذاہب کا بغور مطالعہ کیا' مگر کسی پر مطمئن نہ ہوئے۔ ان کے بقول اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان میں سے کوئی مذہب بھی تاریخی معیار پر ثابت نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ پھر ان کی واقعیت پر کیسے یقین کیا جائے اور انہیں کیونکر مستند مانا جائے۔

آخر میں انہوں نے اسلام کا مطالعہ کیا اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اسلام کی تعلیمات آج بھی اپنی اصل صورت میں محفوظ ہیں۔ اسلام کی شخصیات مکمل طور پر تاریخی شخصیات ہیں' دیومالیت کا ان پر سایہ بھی نہیں پڑا۔ خصوصاً وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکمل' بھرپور اور جامع شخصیت سے بہت متاثر ہوئے۔ لکھتے ہیں: ''یہ حقیقت ثابت شدہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی کے بارے میں کوئی بات مبہم اور دھندلی نہیں اور نہ پُراسرار یا دیومالائی ہے جیسا کہ مثال کے طور پر زرتشت' شری کرشن حتیٰ کہ بدھ اور مسیح کی زندگیاں نظر آتی ہیں۔ بعض دیگر پیغمبروں کے وجود تک کے بارے میں اہلِ علم نے شکوک و شبہات بلکہ انکار کا اظہار کیا ہے' مگر جہاں تک میں جانتا ہوں' کسی شخص نے بھی پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں یہ کہنے کی جسارت نہیں کی کہ وہ توہماتی شخصیت ہیں یا وہ جنوں پریوں کی داستان سے مشابہ ہیں''۔ اس مقام پر ڈاکٹر چٹوپادھیا نے اپنی مسرت کا اظہار

یوں کیا ہے۔

OH'WHAT A RELIFE TO FIND, AFTRE ALL, A TRULY HISTORICAL PROPHET TO BELIVE IN

''واہ کس قدر تسکین کی بات ہے کہ آخر کار انسان کو صحیح معنوں میں ایک ایسا پیغمبر مل جائے جس کی صحیح معنوں میں تاریخ شہادت دیتی ہو اور جس پر وہ ایمان لا سکے''۔

ڈاکٹر چنتو پادھیا نے مئی ۱۹۰۴ء میں حیدر آباد دکن کی مکہ مسجد میں ہزاروں مسلمانوں کی موجودگی میں اسلام قبول کیا۔ ان کا اسلامی نام عزیز الدین رکھا گیا۔ ہندو پریس نے الزام لگایا کہ ڈاکٹر موصوف حیدر آباد دکن کی مخصوص فضا میں محض دنیاوی فوائد کی خاطر مسلمان ہوئے ہیں' تب ۲۶۔ اگست ۱۹۰۴ء کو حیدر آباد کے فتح میدان میں ایک بہت بڑے جلسہ عام میں انہوں نے انگریزی میں ایک مفصل اور طویل تقریر کی جس میں اپنے قبولِ اسلام کی وجوہ تفصیل سے بیان کیں۔ جلسے کی صدارت حیدر آباد کے ایک معروف عالم سیّد شاہ عبدالرحیم نے کی جب کہ اسٹیج پر ریاست کے متعدد سر برآوردہ قائدین موجود تھے۔ اس تقریر کا اردو ترجمہ مولانا ظفر علی خان نے کیا اور بعد ازاں اسے اپنی ادارت میں چھپنے والے ماہانہ رسالے ''رہبر دکن'' کے شمارہ ستمبر ۱۹۰۴ء میں شائع کر دیا۔

مضمون کی اصل تحریر مشکل بھی ہے اور موجودہ دور کے اعتبار سے نامانوس بھی' اس لیے مجھے تقریباً ساری کی ساری تبدیل کرنی پڑی ہے۔

جنابِ صدر انجمن اور حاضرینِ جلسہ!

ایک پرانی مثل ہے کہ زمانہ حال کا ادراک اس وقت تک پوری طرح نہیں ہو سکتا جب تک ہم زمانہ ماضی کے بارے میں ضروری باتیں معلوم نہ کر لیں۔ چونکہ مجھے آپ حضرات کے سامنے اس وقت وہ اسباب بیان کرتا ہیں جن کی بنا پر میں نے دنیا کے دیگر بڑے بڑے مذاہب کو چھوڑ کر اسلام قبول کیا ہے' اس لیے ضروری ہے کہ میں شک اور یقین کے ان مختلف مراحل کی اجمالی تفصیل بیان کر دوں جو اوائل عمر سے قبولِ اسلام تک

مجھے طے کرنے پڑے ہیں۔

میرا آبائی تعلق ایک ہندو خاندان سے ہے اور آپ جانتے ہیں کہ ہندوؤں میں بت پرستی، مظاہر پرستی اور شرک و خرافات کی بے شمار اقسام رائج ہیں۔ لیکن آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ آغاز شعور ہی سے میرے دل و دماغ نے ان بے بنیاد عقائد کو مسترد کر دیا تھا اور میرا ضمیر ہمیشہ سے ایک ایسے مذہب کی تلاش میں رہا جو سچا اور برحق ہو۔ چونکہ میرا رجحان تحقیقِ حق کی طرف تھا اس لیے سب سے پہلے میرا تعلق برہمو سماج اور عیسائیت سے قائم ہوا۔ ان دنوں یہ مذاہب بنگال کی نئی نسل کو بڑی تیزی سے متاثر کر رہے تھے اور برہمو سماج کے رہنما بابو کیشب چندر سین کی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ جب میں ان کی فصیح و بلیغ تحریریں پڑھتا تھا تو مجھ پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور طبیعت پر جوش اور سرخوشی چھا جاتی تھی۔

برہمو سماج کے تعلق سے میرا تعارف انگلستان اور امریکہ کے بعض بڑے بڑے توحید پرست عیسائی علما سے ہوا جن میں تھیوڈور پارکر کا نام سرفہرست ہے۔ اس شخص کی تصانیف سے مجھے گہرا قلبی تعلق ہو گیا۔ میں اسے پیغمبر اور نبی سمجھنے لگا۔ سفر و حضر میں اس کی کوئی نہ کوئی کتاب میرے پاس رہتی اور جس طرح لوگ قرآن اور بائبل کی تلاوت کرتے ہیں، میں تھیوڈور پارکر کی تحریریں اسی ذوق و شوق سے پڑھتا تھا۔

اسی دوران میں مجھے اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان جانا پڑا اور میرا داخلہ سکاٹ لینڈ کی ایڈنبرا یونیورسٹی میں ہوا۔ وہاں میرا رابطہ بعض بڑے ہی نیک نہاد اور راسخ العقیدہ پروٹسٹنٹ عیسائیوں سے قائم ہوا۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ میں ان کی محفلوں میں شامل ہونے لگا اور ان کے خلوص سے بڑا متاثر ہوا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بالغ نظر و باشعور لوگ تھے، مگر مجھے بڑا تعجب ہوتا کہ وہ اپنے گناہوں کو یاد کر کر کے زار و قطار رونے لگتے اور رقت کی وجہ سے بعض لڑکیوں پر غشی طاری ہو جاتی۔ حقیقۃً وہ لوگ اخلاص، دردمندی اور انسانی خیر خواہی کا چلتا پھرتا نمونہ تھے۔ مجھ سے بھی غیر معمولی محبت سے پیش آتے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں بھی مذہب عیسوی قبول کر لوں اور مغفرت و نجات کا مستحق بن جاؤں۔ خود میرا دل بھی ان کے رویے سے متاثر ہو کر عیسائیت کی طرف مائل ہونے لگا۔

ان کی مذہبی مجالس میں شمولیت میرا معمول بن گیا اور مَیں کبھی کبھی ان کی نمازوں (PRAYERS) میں بھی شامل ہونے لگا' لیکن مسیحیت کے لیے دل میں گہرا نرم گوشہ پیدا ہونے کے باوجود دو باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں یعنی کفارہ اور عذاب ابدی۔

ان ناقابلِ فہم عقائد کی تفہیم کے لیے مَیں ایڈنبرا کے ایک ایسے گرجے میں بھی جانے لگا جہاں کے پادری توحید پرست تھے۔ ان کی بہت سی تقریریں سنیں' مگر عقدہ لاینحل ہی رہا۔ پادری صاحبان کے لیکچر بڑے ہی پھیکے اور بے روح تھے اور مَیں ان کے غیر دلکش اسلوب اور بے جان دلائل سے ذرا بھی مطمئن نہ ہوا۔ سکون کی منزل اب بھی نظروں سے دور تھی۔

ایڈنبرا میں مجھے ٹامس کارلایل کی تصانیف دیکھنے کا اتفاق ہوا جس کے نتیجے میں میرے اندر جرمن مشاہیر اور لٹریچر کے لیے بے پناہ اشتیاق پیدا ہوا۔ لوتھر' گوئٹے' اور شلر کا سکہ میرے دل پر بیٹھ گیا اور مَیں نے بڑے ذوق و شوق سے جرمن زبان سیکھنی شروع کر دی۔ جرمنی کی محبت میرے دل میں اس طرح جاگزین ہوئی کہ جی چاہتا تھا کہ اس ملک کی خوب سیاحت کروں جس نے علم و فلسفہ کے شعبے میں نابغہ روزگار لوگ پیدا کیے۔ اسی یونیورسٹی سے سائنس' لٹریچر اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کروں جہاں سے گوئٹے' لیسنگ اور لائبنز فارغ التحصیل ہوئے تھے چنانچہ ایک روز میں نے ایڈنبرا کا قیام ترک کیا اور جہاز پر بیٹھ کر لائپزگ پہنچ گیا۔

مجھے علم الحیات (ANTHROPOLOGY) سے خاص دلچسپی تھی' اس لیے میں نے لائپزگ یونیورسٹی سے علمِ نباتات' علمِ حیوانات اور علمِ ترکیب اجسام (نباتی و حیوانی) میں تعلیم شروع کی اور اس حوالے سے مجھے ڈاروِن کے نظریہ ارتقا نے بہت جلد اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ان دنوں یہ نظریہ جرمنی کے علمی و سائنسی حلقوں میں زور و شور سے زیر بحث تھا۔ چنانچہ مَیں نے بیوخز' ہیکل' ڈارون اور خصوصاً ہربرٹ سپنسر کی تصانیف کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا۔ موخر الذکر نے نظریہ ارتقا کو عملی طور پر مذہب' تدبیرِ مملکت' تمدن و معاشرت سب پر منطبق کیا تھا اور انسانی خیالات و جذبات اور اس کے مختلف شعبوں کو اس اصول کا تابع ثابت کر دکھایا تھا۔ اس نے اپنے دعوے کے ثبوت میں اس کثرت سے مثالیں دی

تھیں اور دلائل کا وہ کمال دکھایا تھا کہ مجھے یوں لگا کہ دنیا نے افلاطون اور ارسطو کے بعد سب سے بڑا فلسفی ہربرٹ سپنسر ہی پیدا کیا ہے اور اس نے نظریہ ارتقا کی جو تشریح و تعبیر کی ہے وہ عملی شکل میں بنی نوع انسان کا مستقبل کا مذہب بن جائے گا۔ اس مسئلہ نے میری تمام ذہنی مشکلات کو حل کر کے سارے شکوک و شبہات رفع کر دیے اور بہت سی باتیں جو لاینحل معمّا بنی ہوئی تھیں، اس کی بدولت روز روشن کی طرح عیاں ہو گئیں۔ یقیناً یہ نظریہ میرے نزدیک ایسی چٹان تھا جس پر انسانی خیالات و نظریات کی آئندہ عمارت بلا خوف و خطر تعمیر کی جا سکتی ہے۔

یہ سب کچھ اپنی جگہ صحیح تھا لیکن نظریۂ ارتقا نے خالق کائنات اور قادر مطلق خدا کی ہستی کے لیے بہت کم گنجائش چھوڑی تھی۔ اس نظریے کو تسلیم کرنے کے بعد نہ دعا کی ضرورت باقی رہتی تھی نہ حیات بعد ممات کی۔ نظریۂ ارتقا اول و آخر مادیت کا پرچارک ہے اور اس کے ساتھ مذہب اور روحانیت کا دور دور تک کوئی تعلق نہیں بنتا۔ چنانچہ ان دنوں میری عجیب و غریب کیفیت تھی۔ میں بیک وقت اگسٹ کانت کے فلسفیانہ مذہب پوزیٹوزم (POSITIVISM) اور ہکسلے کے مذہب لاادریہ (SKEPTICISM) کا قائل تھا۔ اس وقت میری حالت یہ تھی کہ میں اسٹراس کی کتاب ''مذہب قدیم و جدید'' جان سٹورٹ مل کی ''مذہب پر تین خطبات'' اور خصوصاً اس کی دلچسپ سوانح عمری بڑے اشتیاق سے پڑھتا تھا۔ آرتھر شوپن ہائر کی فلسفیانہ کتابوں کا مطالعہ تعلیم یافتہ حلقوں میں فیشن سمجھا جاتا تھا۔ میں نے ان کتابوں کے ساتھ بعض دوسرے جرمن فلسفیوں کی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا جس کا اثر یہ ہوا کہ میری طبیعت کا میلان بدھ مذہب کی طرف ہوتا چلا گیا اور آخر کار میں اسی مذہب کا پیروکار ہو گیا۔

حضرات! بدھ مذہب کی قدیم ترین کتب مقدسہ کے حوالے سے اس مذہب نے بلاشبہ اعلیٰ ترین ضابطۂ اخلاق پیش کیا ہے اور رنگ و نسل اور علاقہ و زبان کے امتیازات سے بالاتر ہو کر محض انسانیت اور مساوات کی بنیاد پر ایک معاشرے کا پرچار کیا ہے، اس لیے مہاتما بدھ کے مذہب نے گویا میری روح کی پیاس بجھا دی اور میں اس کا والہ و شیفتہ ہو گیا۔ چنانچہ میں نے نہ صرف اس مذہب کے بارے میں وہ ساری کتابیں پڑھ ڈالیں جو

انگریزی اور جرمن زبان میں مجھے مل سکیں، بلکہ خاص اہتمام کرکے پالی زبان سیکھی تاکہ مسئلہ نروان کے جو صحیح معنی میں اس زمانہ میں سمجھا تھا' اس کی تفسیر کے لیے مہندا پرستا کا ایک باب ترجمہ کرسکوں۔ اس زمانے میں میں نے جرمنی میں بدھ مذہب اور عیسائیت پر کئی لیکچرز بھی دیے اور ثابت کرنے کی کوشش کی کہ بدھ مت بعض حیثیتوں سے مذہب عیسوی پر فوقیت رکھتا ہے۔ یہ لیکچر شائع بھی ہوئے اور مذہبی حلقوں میں اس پر شور بھی مچا۔

لیکن بدھ مت کے رگ و پے میں یہ عقیدہ جاری و ساری ہے کہ دنیا کے تمام مظاہر رنج و مصیبت کا پہلو لیے ہوئے ہیں اور دنیا کی حقیقت ایک غمکدے کے سوا کچھ نہیں۔ اس سے میری طبیعت جلد ہی اس مذہب سے اکتا گئی۔ عجیب تماشا ہے کہ میرے جسم و روح کی قوتیں دنیاوی مشاغل اور لذات کے لیے بے قرار ہیں' مگر ایک فلسفیانہ مسلک مجبور کرے کہ ان فطری جذبات و احساسات میں سے بعض کو دبا دو اور بعض کو کچل دو۔ ظاہر ہے اس قسم کا مذہب ایک جیتے جاگتے انسان کا کب تک ساتھ دے سکتا ہے؟

حضرات! میری کیفیت اس زمانے میں بعینہٖ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ابتدائی دور کی سی تھی۔ میں بھی ہر چمکتے ستارے اور جگمگاتے ہوئے ستارے کی طرف لپک پڑتا تھا اور اسے اپنا ہادی و رہنما سمجھ لیتا تھا۔ لیکن بار بار دھوکا کھاتا تھا اور منزل کا دور دور تک پتہ نہ ملتا تھا۔ روحانی خلا کے اس دور میں مجھے پہلے پیرس اور پھر ایک سال کے بعد سینٹ پیٹرزبرگ جانے کا اتفاق ہوا۔ پیرس میں مجھے فرانسیسی زبان پر عبور حاصل ہوگیا۔ میں نے اس کی تحصیل کی ابتدا لائپزگ میں کی تھی اور فرانسیسی زبان نے گویا میری آنکھیں کھول دیں۔ میں نے مولیر' رسین' والٹیر' وکٹر ہیوگو' رینان اور ٹین کی کتابیں مزے لے لے کر پڑھیں۔ خصوصاً والٹیر کے بارے میں میری یہ رائے بنی کہ دنیا میں اس سے بڑھ کر عالم فاضل شخص کوئی پیدا نہیں ہوا' لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یقین کی دولت مجھے میسر نہ آئی۔ تشکیک کی لے پہلے سے بھی بڑھ گئی۔ خصوصاً والٹیر کی ''آیورس'' کی چالیس جلدوں کے مطالعے نے جس میں انسانی احساسات و خیالات پر ہر پہلو سے بحث کی گئی ہے' بدھ مذہب کی اہمیت میرے دل سے ختم کردی کہ اس مذہب کے زیر اثر میں ہر مادی شے کو سرچشمۂ الم و مصیبت سمجھنے لگا تھا۔ والٹیر کے مطالعے نے اس احساس کو مثبت رنگ دے دیا۔ اس

کے ساتھ ہی میں نے دیکھا کہ اگرچہ رینان کے ہاں سوفسطائیت کی آمیزش بھی تھی، پھر بھی وہ اخلاقِ عامہ اور حسنِ معنوی کا پرچارک تھا۔ چنانچہ ''حیاتِ مسیح'' میرے نزدیک اس کی بہترین تصنیف ہے جس کے شاعرانہ طرزِ ادا اور اخلاقی حقائق نے مجھ پر گہرا اثر ڈالا۔ رینان کی تصانیف کے مطالعے نے مجھ پر ایک اضافی اثر یہ مرتب کیا کہ میں سامی زبان و مذاہب کو خاص دلچسپی کی نظر سے دیکھنے لگا۔

چند سال قبل میکسملر کی تصانیف کے گہرے مطالعے نے مجھے بخوبی سکھا دیا تھا کہ مختلف زبانوں اور مذاہب کا مطالعہ سائنٹفک انداز میں کیسے کیا جاتا ہے چنانچہ رینان کی کتابوں نے میرے اندر سامی مذاہب اور زبانوں سے دلچسپی پیدا کی، تو میں نے ارادہ کر لیا کہ میں دنیا کے تمام بڑے مذاہب یعنی یہودیت، عیسائیت، مجوسیت، بدھ مت اور اسلام کا خوب توجہ سے مطالعہ کروں گا اور تقابلی موازنہ کر کے دیکھوں گا کہ ان میں سے نسبتاً کونسا مذہب زیادہ خوبیاں رکھتا ہے۔

اس مطالعے کی روشنی میں آغاز میں کچھ عرصے کے لیے میں عیسائیت کو سامی اور آرین مذاہب کا مرکزِ اتصال سمجھتا رہا اور اگر پاپائے اعظم کے معصوم عن الخطا ہونے اور عشائے ربانی اور اسی نوعیت کے بعض دیگر عقائد جنہیں میں اپنی جرمن تعلیم کے تحت قطعی لایعنی اور بے بنیاد سمجھتا تھا، میرے راستے میں حائل نہ ہوتے تو میں رومن کیتھولک عیسائی ہو گیا ہوتا۔

مطالعے کا یہ اسلوب جاری تھا کہ میں واپس ہندوستان آ گیا اور حیدر آباد میں ملازمت کا آغاز کیا۔ یہاں آ کر پہلے میں نے مذہب زرتشت یعنی مجوسیت پر تحقیق کی اور پھر اسلام کا مطالعہ شروع کیا۔ اس کے لئے میں نے حیدر آباد کی معروف لائبریریوں کے علاوہ شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی اور مولوی چراغ علی صاحب کے کتب خانوں سے بھی بھرپور استفادہ کیا اور خدا کا شکر ہے کہ سالہا سال تک متناقض عقائد اور متضاد مذاہب و فلسفہ کی دلدلوں میں ٹھوکریں کھانے کے بعد میری تھکی ہاری روح کو قرار آ گیا اور مذہب اسلام کی صورت میں اسے وہ منزل مل گئی جس کی تلاش میں وہ ایک عرصے سے بھٹک رہی تھی۔ میں نے قرآن کا اور پیغمبر اسلام کی سیرت کا مطالعہ کیا اور مجھے ان سارے سوالات

کے جوابات مل گئے جو برسہا برس سے مجھے پریشان کیے ہوئے تھے اور کسی مذہب اور فلسفہ نے مجھے ان کے سلسلے میں مطمئن نہیں کیا تھا۔ مجھے ایک سادہ' سریع الفہم' عقل کے عین مطابق اور بے حد قابل عمل مذہب مل گیا۔ دین اسلام نے میرے دل و دماغ کو مسخر کر لیا اور میں آپ کی برادری کا ایک رکن بن گیا۔

حاضرین گرامی! مذہب اسلام کی پہلی خصوصیت جس نے مجھے غیر معمولی انداز میں متاثر کیا وہ اس کی تاریخی حیثیت ہے۔ اس مذہب کی بنیاد ایک ایسی کتاب پر استوار ہے جس میں صدیاں گزر جانے کے باوجود آج تک معمولی سی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اس کتاب کو قصوں' کہانیوں' غیر مربوط پیش گوئیوں اور شاعرانہ انداز کی سوانح عمریوں کا ایک غیر متجانس مجموعہ نہیں سمجھنا چاہیے جو مختلف زمانوں میں ترتیب دیا گیا' جس کے الگ الگ اور متعدد مصنف تھے اور جس کو ایک سانچہ میں خدا جانے کب اور کس طرح ڈھال لیا گیا۔ بلکہ یہ کتاب ایک صحیفۂ واحد ہے اور اس میں ایسا حیرت انگیز تسلسل اور یک رنگی ہے کہ کوئی بھی غیر متعصب اور منصف مزاج انسان اس کے برحق ہونے میں شبہ نہیں کر سکتا۔ پھر اس کا پُر شکوہ مگر سادہ اسلوب' انسانی نفسیات کے عین مطابق مسائل کا ادراک اور مادی و روحانی معاملات میں انسان کی مکمل اور قابل عمل رہنمائی' اسے ایک ابدی رہنما کتاب ماننے پر مجبور کرتی ہے۔

اسلام کا دوسرا سرچشمۂ ہدایت اس کا نبی (ﷺ) ہے جس کا تاریخی وجود محقق و مسلم ہی نہیں بلکہ جس کی زندگی کی تمام ضروری تفصیلات اس کی شکل و شمائل' عادات و خصائل یہاں تک کہ ذاتی خصوصیات کا ہمیں ایسا ہی علم ہے جیسا آلیور کرامویل یا نپولین بونا پورٹ کے بارے میں۔ عیسائیت اور دیگر مذاہب کے مصنفین اس عظیم ہادی و رہبر پر کیچڑ اچھال سکتے ہیں' اسے برا بھلا کہہ سکتے ہیں لیکن اس کے تاریخی وجود پر شک کرنے کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا۔ یہ حقیقت ثابت شدہ ہے کہ پیغمبر اسلام کی زندگی کے بارے میں کوئی بات مبہم اور دھندلی نہیں' نہ پراسرار یا دیو مالائی ہے جیسا کہ مثال کے طور پر زرتشت' سری کرشن حتیٰ کہ بدھ اور مسیحؑ کی زندگیاں نظر آتی ہیں۔ بعض دیگر پیغمبروں کے وجود تک کے بارے میں اہل علم نے شکوک و شبہات بلکہ انکار کا اظہار کیا ہے' مگر جہاں تک میں جانتا ہوں

کسی شخص نے بھی پیغمبر اسلام کے بارے میں یہ کہنے کی جسارت نہیں کی کہ وہ توہماتی شخصیت ہیں یا وہ جنوں پریوں کی داستان سے مشابہ ہیں۔ یہ امر کس قدر موجب تسکین ہے کہ آخر کار انسان کو صحیح معنوں میں ایک ایسا پیغمبر مل جائے جس کی تاریخ شہادت دیتی ہو اور جس پر وہ ایمان لا سکے۔

اسلام کی یہ تاریخی بنیاد ایسی ہے کہ ارنسٹ رینان جیسا متشکک فلسفی اور مؤرخ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا اور اس نے اپنی مشہور کتاب ''تاریخ مذاہب'' (صفحات ۲۲۰ تا ۲۳۰) میں اس حوالے سے دین اسلام کی خوب تحسین کی ہے۔ پروفیسر باسورتھ سمتھ بھی اس اعتبار سے رینان کا ہم صفیر ہے' وہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور دین اسلام پر اپنے لیکچرز میں لکھتا ہے:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمیں مسیح کی زندگی کے ایک حصہ کے صرف چند اجزا معلوم ہیں یعنی صرف آخری تین سال کی کچھ تفصیلات جبکہ باقی تیس سال کا عرصہ ہماری نگاہوں سے بالکل مستور ہے...... لیکن اسلام کی حالت اس کے بالکل برعکس ہے یہاں موہوم اور مبہم واقعات کی بجائے تاریخ کی بھرپور روشنی نظر آتی ہے۔ ہمیں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حالات اسی قدر معلوم ہیں کہ جس قدر لوتھر اور ملٹن کے۔ مصنوعی' روایتی اور فوق العادت واقعات اول تو عرب مصنفین کی کتابوں میں پائے ہی نہیں جاتے اور اگر شاذ و نادر یہ نظر بھی آتے ہیں تو ان میں اور تاریخی حقائق میں فرق کیا جا سکتا ہے۔ یہاں نہ تو کوئی شخص خود اپنے آپ کو فریب دیتا ہے اور نہ دوسروں کا فریب کھاتا ہے۔ ہر چیز روز روشن کی طرح مصفا و منقح ہے۔ قرآن کے سارے الفاظ بلا شک و شبہ بغیر کسی کسر یا اضافہ کے بعینہٖ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے الفاظ ہیں۔ ہم ایک مذہب کا طلوع ہونا اور اس کا نشو و نما پانا اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں''۔

(ملاحظہ ہوں صفحات ۱۷' ۱۸' ۲۲)

اس ضمن میں میں کارلائل کی شہادت بھی پیش کروں گا۔ یورپ کا یہ عظیم اور بے حد معتبر مورخ اپنی کتاب ''ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ'' میں لکھتا ہے:

''قرآن کو پڑھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس کتاب کی سب سے پہلی خصوصیت اس

کا حقیقی، اصلی اور بے میل ہوتا ہے۔ میری دانست میں قرآن کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ یہ ہر لحاظ سے سچا ہے''۔

حضرات محترم! دوسرا سبب جس نے مجھے اسلام قبول کرنے کی ترغیب دی' یہ ہے کہ یہ مذہب نہایت ہی عقل کے مطابق ہے۔ عیسائیت کی طرح اسلام میں ہمیں اتنالیس ارکان پر ایمان نہیں لانا پڑتا جن میں ایسے ایسے معتقدات بھرے پڑے ہیں کہ نہ عقل ان کا ادراک کرتی ہے نہ شعور ان کا احاطہ کرتا ہے۔ اسلام میں صدق دل سے صرف ایک سیدھے سادے قول کو تسلیم کرنا پڑتا ہے اور وہ ہے 'لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ یعنی اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں'' اور یہ ایسی بات ہے کہ ایک عام عقل کے آدمی سے لے کر متبحر عالم اور فلسفی بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے اور ایک معمولی انسان سے لے کر بادشاہ وقت تک اس کے تقاضوں پر عمل کر سکتا ہے۔ توحیدِ خداوندی گویا اسلام کی جان ہے اور ہر صحیح الدّماغ اور معتدل حواس کا انسان جس کی قوتِ ممیّزہ کسی وجہ سے مسخ نہ ہو گئی ہو اور ہر وہ شخص جو ضدی قسم کا ملحد اور زندیق نہ ہو' خالقِ کائنات کی وحدت کا انکار نہیں کر سکتا۔ اسلام ہمیں مسیحی اکابر کی طرح تثلیث فی التوحید کا درس نہیں دیتا یا ہندو مت کی مانند تین کروڑ دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش کی ترغیب نہیں دیتا بلکہ خدائے یکتا کی وحدانیت کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ خدا جو خالقِ کون و مکاں ہے' جو عالم الغیب والشہادہ ہے' جو حکیمِ مطلق اور رحمٰن و رحیم ہے۔ اس کے ساتھ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانے کی تلقین بھی کی گئی ہے کہ آپؐ کی رہنمائی کے بغیر دینی تعلیمات کو سمجھنا اور ان پر عمل کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ کارلائل نے ''ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ'' میں انہیں جس طرح خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اس کا ایک اقتباس پیش کر رہا ہوں:

''منصبِ نبوت پر فائز ہونے سے قبل ہی اس سیاہ چشم' روشن جبیں' فراخ حوصلہ' کریم النفس' محفل پسند اور درد بھرے' مخلص بادیہ نشیں کے خیالات جاہ طلبی سے کوسوں دور تھے۔ اس شخص کی متانت میں عظمت نظر آتی تھی اور اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو سچائی کے علمبردار اور فطرتاً بے لوث اور صداقت شعار ہوتے ہیں۔ دوسرے لوگ سنی سنائی توہمانہ باتوں کو اپنا

مسلک قرار دے کر اپنے دل کو مطمئن کر لیتے تھے مگر محمد کی تسکین اس انداز کی باتوں سے نہیں ہوتی تھی۔ وہ قابل احترام شخص عرصۂ کائنات میں واقعی اکیلا کھڑا تھا اور اس کا دماغ اس نوعیت کے ہزاروں خیالات سے بھرا رہتا تھا کہ میں کیا ہوں؟ یہ دنیا کیا ہے' زندگی اور اس کا مدعا کیا ہے؟ موت کیا ہے؟ میں مانوں تو کیا مانوں اور کروں تو کیا کروں؟ ان سوالات کے ساتھ وہ کوہ حرا کی ہیبت ناک چٹانوں اور ریگستانوں کی درشت تنہائیوں میں سرگرداں رہا اور آخر کار اسے ان کا جواب مل گیا' خدا کی الہامی قوت نے اسے انسانوں کی رہنمائی کے لیے چن لیا"۔

چنانچہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کے یہ دونوں بنیادی ارکان یعنی توحید اور رسالت جن کے اقرار سے ایک انسان مسلمان ہوتا ہے' ہماری عقل و دانش کا اعلیٰ ترین تقاضا ہیں۔ یہ بات ادورڈ نائٹل جیسے مسیحی مصنف نے بھی تسلیم کی ہے۔ چنانچہ موصوف اپنی کتاب "تبلیغ دینِ مسیحی اور اس کے مسلمان حریف" میں لکھتا ہے کہ مذہب اسلام لفظ معقول (RATIONAL) کے وسیع ترین معنوں میں اصطلاحی و تاریخی اعتبار سے معقول ہے۔ معقولات کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ یہ وہ طریقۂ خیال ہے جو مذہبی عقائد کو اصولِ عقلی پر مبنی قرار دیتا ہے اور یہ تعریف اسلام پر پوری طرح سے صادق آتی ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک اسلام کا ملخص یہ ہے کہ خدا کی وحدانیت اور اس کے رسول کے برحق ہونے کی تصدیق کی جائے اور یہ دو امور ایسے ہیں جو ایک منصف مزاج شخص کی نظر میں عقل کی مستحکم بنیاد پر استوار ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کو تبلیغ اسلام کی کوششوں میں جو غیر معمولی کامیابی ہوئی' اس کے اسباب یہ ہیں' اولاً اس مذہب کا اعلان جس یقین و وثوق' صدق و صفا' عظمت و شان اور جاہ و جلال سے کیا جاتا ہے' اس کی نظیر کسی دوسرے مذہب میں نظر نہیں آتی۔ ثانیاً جس کلمہ کو اسلام کی بنیاد بنایا گیا ہے وہ بے حد سادہ اور عقل کے مطابق ہے۔ ثالثاً جن بزرگانِ دین نے اسلام کی تبلیغ کی ان کے دل میں اسلام کی صداقت اور حقانیت کا پُرجوش اور والہانہ یقین اور اس یقین کا ان کے دعوے میں ممد و معاون ہوتا ہے...... ظاہر ہے کہ جو مذہب ایسا صاف' فقہی پیچیدگیوں سے اس درجہ آزاد اور عقل کی رسائی کے

اندر ہو‘ اس میں انسان کی قوتِ ممیزہ پر قابو پانے کی حیرت انگیز استعداد ہونی چاہیے۔“
(ص ۱۷۸، ۱۸۱)

تیسری وجہ میرے قبولِ اسلام کی یہ ہے کہ یہ مذہب ہر اعتبار سے قابلِ عمل ہے۔ اس کا اخلاقی ضابطہ فطرتِ انسانی کی حقیقی ضروریات پر مبنی ہے اور نیکی کے کسی ایسے وہمی و خیالی اور مبالغہ آمیز معیار کو نہیں مانتا جو ناممکن الحصول اور ناقابلِ عمل ہو۔ دوسرے مذاہب مثلاً بدھ مت اور عیسائیت نے جو معیارِ خیر مقرر کیا ہے وہ ایک لحاظ سے بظاہر اسلام کے مقابلے میں اعلیٰ وارفع قرار دیا جاسکتا ہے‘ مثلاً بائبل کے اس مقولہ کی شاعرانہ لطافت کی جی بھر کر تحسین کی جاسکتی ہے کہ ”اگر تیرا بھائی تیرے داہنے گال پر ایک تھپڑ مارے تو اپنا بایاں گال بھی اس کی طرف پھیر دے“۔ لیکن میں یہ پوچھتا ہوں کہ پوری مسیحی دنیا میں کوئی ایک فرد بھی اس پر عمل کرتا ہے؟ اور آیا روزمرہ کی زندگی میں اس کے مطابق عمل کرنا ممکن بھی ہے؟ لیکن اخلاقی ضابطے کے بارے میں رائے قائم کرتے ہوئے ہمیں اس کے شاعرانہ حسن پر نظر نہیں ڈالنی چاہیے بلکہ اس کی عملی سودمندی کے حوالے سے دیکھنا چاہیے کہ یہ ضابطہ ہماری فطرت کی ضروریات کو پورا کرتا ہے یا نہیں؟ ایمرسن نے کیا خوب کہا ہے کہ ”سیارہ سیرئن آفتاب سے اونچا ہوا کرے‘ مجھے اس سے کیا‘ میرے انگور تو اس سے نہیں پکتے“۔ قصوں اور افسانوں سے ممکن ہے ہمیں ایسے اشخاص سے سابقہ پڑے جو اپنے کمال درجہ کے خیالی اوصاف کے اعتبار سے ہماری تعریف و توصیف کے مستحق ہوں‘ مگر روزمرہ زندگی کی بے پناہیوں میں اس قسم کے ”کمالات“ قطعی بے سود ہیں۔

نظریہ اور عمل کے حوالے سے تجرد اور مناکحت کے مسائل ہی کو لیجیے۔ بدھ مت اور عیسائیت دونوں نے اگرچہ ازدواج کو جائز قرار دیا ہے‘ لیکن تجرد کو بہرحال ترجیح دی ہے۔ برخلاف اس کے اسلام تجرد کو ہرگز جائز نہیں سمجھتا بلکہ مناکحت کو مذہبی فریضہ قرار دیتا ہے جس کا ادا کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ ازدواج کے اس لا دینی طریقہ کی بدولت جس کے ساتھ خوشحالی اور متمول لوگوں میں کہیں کہیں تعددِ ازدواج کی رسم بھی دیکھنے میں آتی ہے‘ پورے عالمِ اسلام میں طوائفوں اور بازاری عورتوں کی تعداد لندن‘ پیرس‘ ویانا اور سینٹ پیٹرز برگ کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر ہے جہاں گلیوں‘ بازاروں میں یہ

مخلوق آزادانہ اپنی کارروائیوں میں معروف رہتی ہے۔ اسی تناظر میں اینگلیکن چرچ کے ایک معروف رکن پادری آئزک ٹیلر نے ۷۔ اکتوبر ۱۸۸۷ء کو والور ہیمپٹن میں ایک مذہبی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے صاف گوئی اور جرأت مندی سے کہا تھا:

''محمدؐ نے کثرتِ ازدواج کے غیر محدود جواز کو محدود کر دیا۔ اکثر ممالکِ اسلامیہ میں کثرتِ ازدواج مستثنیات میں شامل ہے' لیکن اس اجازت نے بہت سے معاشرتی مفاسد کا راستہ روک دیا ہے اور اسلامی ممالک اس بنا پر ان پیشہ ور فاحشہ عورتوں سے تقریباً پاک ہیں جن کا وجود مسیحی دنیا کے لیے باعثِ ننگ و عار ہے۔ مسلمانوں کا طریقہ تعدد ازدواج جو ایک سخت ضابطے کا پابند ہے' عورتوں کے لیے اس قدر ذلت و تحقیر اور مردوں کے لئے اتنا ضرر و نقصان کا باعث نہیں ہے جتنا ایک عورت کا بلا تفریق و امتیاز بہت سے مردوں کے ساتھ تعلق قائم کرنا انسانیت کے لئے باعثِ عار اور صحت کے اعتبار سے نقصان دہ ہے۔ انصاف کی رو سے اہلِ یورپ کو جن کے ہاں ایک عورت کے کئی کئی شوہر ہوتے ہیں مسلمانوں پر طعنہ زن نہیں ہونا چاہیے جو بیک وقت اگر دو یا تین یا چار بیویوں کے خاوند ہوتے ہیں مگر سب کے حقوق کا تحفظ کرتے اور ان کی اولاد کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ برعکس اس کے کہ یورپ میں لاتعداد حرامی بچوں کا کوئی پرسانِ حال نہیں اور یہ ہمارے معاشرے کا ناسور بنتے جا رہے ہیں''۔

ان شواہد کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ نکاح کا کونسا طریقہ زیادہ قابلِ عمل' انسانی فطرت اور ضروریات کے زیادہ قریب' بلند کردار اور اخلاقی و انسانی اقدار کے مطابق ہے۔

حضرات گرامی! میں اسلام کی دیگر تعلیمات کا تجزیہ پیش کر کے اور دیگر مذاہب کی تعلیمات سے ان کا تقابلی موازنہ کر کے ثابت کر سکتا ہوں کہ احکامِ اسلامی میں عملی دانش اور روحانی وسعتِ نظر کی آمیزش جس خوبی اور لطافت سے ہوئی ہے' اس کی مثال کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔ لیکن اس طرح بحث خاصی طویل ہو جائے گی۔ میں بات کو سمیٹتے ہوئے سید امیر علی کی کتاب ''اسپرٹ آف اسلام'' کا ایک اقتباس پیش کروں گا۔ موصوف لکھتے ہیں ''کسی مذہب کے ہمہ گیر ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ نوعیت کے اعتبار سے قابلِ عمل ہو' باہمی معاشرتی تعلقات کو معمول پر رکھنے میں معاون ہو اور جذبات و احساسات کا ہم ضمیر ہو۔ بلاشبہ اسلام

اس معیار پر پورا اترتا ہے۔ اس میں اعلیٰ درجہ کے نظری مقاصد انتہا درجہ کے عقلی معمولات کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اسلام نے فطرت انسانی کو نظر انداز نہیں کیا اور کبھی اپنے آپ کو عقائد کی ان بھول بھلیوں میں نہیں ڈالا جو واقعیت اور حقیقت کی دنیا سے باہر ہیں"۔

جناب صدر مجلس اور برادران اسلام! یہ وہ چند عملی اور نظری وجوہ ہیں جو میرے قبول اسلام کے محرک بنے ہیں اور یہی وہ اسباب ہیں جن کی بنا پر زمانہ حال کے بعض مشاہیر یورپ کو اسلام کی حقانیت کا قائل ہونا پڑا۔ اٹھارویں صدی میں والٹیر' گوئٹے اور گبن اور انیسویں صدی میں یورپ کے بہت سے علما و فضلا نے اسلام کے بارے میں جو موافقانہ آرا کا اظہار کیا' اس کا مختصر حوالہ بھی بات کو طویل کر دے گا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ انگلستان کے ایک جلیل القدر سیاسی و سماجی رہنما لارڈ اسٹینلے کے حالات اخبارات میں شائع ہوئے تھے۔ انہوں نے وفات سے تھوڑی دیر پہلے انکشاف کیا کہ عرصہ ہوا انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور مسلمان ہی کی حیثیت سے ان کی زندگی گزری ہے۔ میں آپ حضرات کو یقین دلاتا ہوں کہ یورپ اور امریکہ میں صدہا لوگ لارڈ اسٹینلے کے نقش قدم پر چلنے پر آمادہ ہیں۔ ارنسٹ رینان جیسا مدبر' عالم' محقق اور فلسفی اپنی کتاب "اسلام اور سائنس" میں برملا لکھتا ہے کہ "جب کبھی میں کسی مسجد میں داخل ہوا ہوں تو میرا دل بھر آیا ہے اور مجھے اقرار کرنا چاہیے کہ اس وقت پشیمانی کا شدید احساس مجھے دبا لیتا ہے کہ میں مسلمان کیوں نہیں ہوں"۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اپنی سادگی' معقولیت اور قابل عمل ہونے کی وجہ سے انسان کے سارے مسائل کا بہترین حل پیش کرتا ہے۔ ڈاکٹر آف ڈیوٹی پادری مارکس ڈاڈ نے اسی لیے تو اپنی کتاب "محمد' بدھ اور مسیح" میں لکھا ہے کہ:

> "مذہب اسلام کی سادگی نے اس کی غیر معمولی اشاعت و وسعت میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ ان پڑھ اور جاہل لوگوں نے بھی اس کی تعلیمات کو فوراً سمجھ لیا۔ یہ ایک ایسا مذہب ہے جس سے عقل انسانی کو فطری مناسبت ہے اور جس نے مشرکین کے دلوں میں بھی اپنی طرف سے تنفر پیدا نہیں کیا۔ جن لوگوں کو مابعد الطبیعی الٰہیات کے پیچیدہ مسائل میں تلاش حق کے معاملے میں مایوسی ہو چلی تھی' وہ پرسکون ہو گئے کہ انہیں ایک سیدھا سادا مذہب مل گیا ہے جسے سمجھنے

میں انہیں کوئی الجھن اور دقت پیش نہیں آتی۔" (ص ۱۰۶، ۱۰۷)

چنانچہ اب ہم سب مسلمانوں کا فرض ہے کہ ہم انھیں اور اس سادہ، سہل، فطری اور قابلِ عمل دین کو باقی دنیا تک پہنچائیں۔ بحمد للہ میں نے عزم کر لیا ہے کہ میں اس فریضے کو اپنی بہترین صلاحیتوں کے ساتھ انجام دوں گا۔

پس اے برادرانِ اسلام! مجھے ایک رفیق، ایک بھائی اور ایک خادم کی حیثیت سے اپنے دائرۂ اخوت میں شامل کر کے میری حوصلہ افزائی کیجیے۔ شکریہ۔

●.....●.....●

ڈاکٹر علی سلمان بینواسٹ

(فرانس)

(ALI SALMAN BENOIST)

میں اگرچہ مذہبی اعتبار سے فرنچ کیتھولک خاندان سے تعلق رکھتا تھا' مگر ڈاکٹر آف میڈیسن کی حیثیت سے میری سوچ اور فکر ٹھوس سائنسی اور منطقی رنگ میں رنگ گئی تھی۔ زندگی کے کسی معاملے کو توہمانہ انداز میں بغیر سوچے سمجھے قبول کرنا مجھے منظور نہ تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں خدا کا انکار کرتا تھا' لیکن عیسائیت اور خصوصاً کیتھولک فرقے کے عقائد خدا کے احساس کو متشکل نہیں ہونے دیتے تھے۔ میرا وجدان کہتا تھا کہ خدا ایک ہے اور تثلیث اور حضرت عیسیٰ کی الوہیت کے عقائد سب بیکار ہیں۔

تاہم میں ابھی تک اسلام سے براہ راست متعارف نہ ہوا تھا۔ لیکن ایک مرتبہ کسی طرح جب مجھے پتہ چلا کہ اسلام میں توحید باری بنیادی عقیدہ کی حیثیت سے شامل ہے تو میں چونک اٹھا۔ مزید جستجو کی تو پتہ چلا کہ میں اسلامی کلمہ کے ایک جز ولا الٰہ الا اللہ کا تو پہلے ہی قائل چلا آ رہا تھا اور قرآن کے اس قول فیصل پر مکمل یقین رکھتا تھا۔

قل ھو اللہ احد ○ اللہ الصمد ○ لم یلد و لم یولد و لم یکن لہ کفواً احد ○ ''یعنی خدا ایک ہے' وہ بے نیاز ہے' اس کا کوئی بیٹا ہے نہ باپ ہے اور اس کا کسی اعتبار سے کوئی ہم پلہ نہیں ہے''۔

ان معلومات سے مجھے وجدانی اعتبار سے جو تسکین ہوئی اس کا آپ شاید اندازہ نہ کر سکیں' ایک روشنی تھی جو اندھیروں میں میری رہنمائی کے لیے لپک رہی تھی۔ میرے دل میں اسلام کے لیے عقیدت و ہمدردی کے جذبات پیدا ہو گئے اور میں نے ارادہ کر لیا کہ

اسلام کا وسیع مطالعہ کیا جائے۔

عیسائیت میں پادری حضرات جس طرح زبردستی خدائی اختیارات کے مالک بن جاتے ہیں، معاوضہ لے کر لوگوں کے گناہوں کی بخشش کرتے ہیں، اس سے میں شدید برگشتہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ اسلام میں ایسی کوئی فضول بات نہیں۔ عیسائیت کا دوسرا نکتہ جس نے مجھے اس مذہب سے دور کر دیا وہ شرکت عشائے ربانی کا عقیدہ ہے۔ ایک روٹی کو نہ صرف مقدس بلکہ حضرت عیسیٰ قرار دے کر اسے کھانا اتنا ہی مضحکہ خیز ہے جتنا افریقہ کے وحشی قبائل کا وہ عمل جس کے تحت وہ اپنے مذہبی رہنما کو اس کی موت کے بعد یہ سمجھ کر کھا جاتے ہیں کہ اس کی شخصیت و کردار کی تمام خوبیاں اس گوشت کھانے والوں میں حلول کر جائیں گی۔ ظاہر ہے اس سائنسی دور میں ان خرافات کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ مذہب عیسوی میں بدنی صفائی کے متعلق بھی مکمل خاموشی پائی جاتی ہے اور عبادت سے پہلے بھی اس کا کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا۔ میں اکثر سوچتا کہ یہ تو دراصل خدا کے خلاف نفرت کا ایک اظہار ہے مگر اسلام کے مطالعے کے بعد مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ یہاں بدنی طہارت پر غیر معمولی زور دیا جاتا ہے اور اس کے بغیر عبادت کو بیکار سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح کیتھولک عقیدے میں تجرد کو خاص پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور پادری حضرت کے لیے تو ازدواجی زندگی قطعاً حرام سمجھی جاتی ہے مگر اسلام اس غیر فطری انسانی طرز عمل کا سخت مخالف ہے اور اسکے بغیر ایمان کو مکمل نہیں سمجھا جاتا۔

اسلام کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے میں نے قرآن کا مطالعہ شروع کیا، اسی ضمن میں میں نے مالک بن نبی کی قرآن کے بارے میں قابل قدر فرانسیسی کتاب بھی پڑھ ڈالی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ قرآن خدا کی سچی کتاب ہے۔ چنانچہ مجھے یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ اگرچہ قرآن کو نازل ہوئے تیرہ صدیاں گذر گئیں لیکن اس کی بعض آیتیں مختلف معاملات میں ہو بہو وہی رائے دیتی ہیں جو جدید ترین فکر کے حامل محقق دے سکتے ہیں۔ ان حقائق نے میرے دل کی دنیا بدل کر رکھ دی اور میں نے اسلامی کلمے کے دوسرے حصے ''محمد رسول اللہ'' کا بھی اقرار کر لیا۔

یہی وجوہ تھیں جن کی بنا پر میں نے ۲۰۔فروری ۱۹۵۳ء کو پیرس کی مسجد میں حاضری

دی اور اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔ مسجد کے مفتی نے مجھے علی سلمان کے اسلامی نام سے موسوم کیا اور میں نے اپنے آپ کو مسلمان کی حیثیت سے رجسٹر کرا لیا۔

میں اللہ کی اس عنایت پر بے حد شکر ادا کرتا ہوں اور مسرت کے ساتھ دوبارہ اعلان کرتا ہوں کہ اشھدان لا الٰہ الاّ اللہ و اشھد انّ محمداً عبدہٗ و رسولہٗ ○

●……●……●

علی محمد موری (جاپان)

(ALI MUHAMMAD MORI)

دوسری جنگ عظیم کے دوران مَیں منچوریا میں تھا۔ ان دنوں منچوریا میں جاپان ہی غالب قوت کی حیثیت سے قابض تھا۔ وہیں پائی چنگ کے قریب ایک صحرائی نخلستان میں مجھے پہلی مرتبہ مسلمانوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ نیکی اور پارسائی کا حسین مرقع تھے۔ مَیں ان کی معاشرت خصوصاً اس بے حد متوازن نقطۂ نظر سے بہت متاثر ہوا جو وہ زندگی کے بارے میں رکھتے ہیں۔ جوں جوں منچوریا کے اندرونی علاقے میں سفر کرتا رہا میرا یہ تاثر گہرا ہوکر خوشگوار صورت اختیار کرتا گیا۔

جنگ ختم ہوئی تو مَیں ۱۹۴۶ء کی گرمیوں میں واپس وطن آ گیا۔ جاپان اب ایک شکست خوردہ ملک تھا۔ ملکی صورت حال مکمل طور پر بدل چکی تھی اور خیالات میں زبردست انقلاب آ گیا تھا۔ بدھ ازم ملک کا اکثریتی مذہب تھا' مگر اب اس کی صورت پہلے سے بھی زیادہ مسخ ہو چکی تھی اور چہ جائیکہ وہ ہزیمت خوردہ ذہنوں کا کوئی شافی علاج پیش کرتا' اس نے معاشرے کو الٹا بدی اور بے اطمینانی کی دلدل میں دھکیل دیا۔

عیسائیت نے جنگ کے بعد جاپان میں خاصا نفوذ کیا بلکہ کم و بیش ایک صدی سے جاپان میں اس کا وجود قائم چلا آ رہا تھا' مگر اس کی حیثیت ایک رسمی مذہب سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ شروع شروع میں کچھ سادہ دل' مخلص اور نیک سیرت نوجوانوں نے بدھ ازم کو ترک کرا سے قبول بھی کر لیا لیکن انہیں بہت جلد پتہ چل گیا اور ان کی مایوسی کی انتہا نہ رہی کہ عیسائیت مذہب کے لبادے میں دراصل برطانوی اور امریکی سامراج کے لیے جال مہیا کرتی ہے۔ عیسائیت تمام یورپی اور امریکی ممالک میں ناکام ہو چکی ہے مگر دوسرے

ممالک میں محض سامراجی عزائم کے تحت اس کی تبلیغ و اشاعت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

جغرافیائی طور پر جاپان کے ایک طرف روسی عفریت پھنکار رہا ہے اور دوسری طرف امریکہ واقع ہے۔ دونوں اپنی اپنی توفیق کے مطابق جاپانی عوام کو متاثر کرنا چاہتے ہیں مگر کسی کے پاس کوئی ایسا مرہم نہیں جو جاپانیوں کی زخمی روحوں کو تسکین بخش سکے۔ ظاہر ہے ان سے ایسی امید ہی عبث ہے۔

بہر حال ۱۹۶۰ء کی گرمیوں کا ذکر ہے' پاکستان سے تین مسلمان ہمارے شہر ٹاکن شن آئے۔ منچوریا کے مسلمانوں کی وساطت سے میں اسلام سے پہلے ہی متعارف تھا۔ پاکستانی مسلمانوں کے کردار نے اور بھی متاثر کیا اور میں نے ان کے قریب ہو کر اسلام کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ زندگی کے سارے دکھوں کا علاج اسلام کی اطاعت میں ہے اور یہی وہ مذہب ہے جو سارے مسائل کا قابلِ عمل حل مہیا کرتا ہے۔ خصوصاً میں اسلام کے نظامِ اخوت سے بہت متاثر ہوا۔ سارے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور خدا نے انھیں باہمی طور پر محبت اور ہمدردی سے رہنے کی تاکید کی ہے۔ میرا یقین ہے کہ دنیا کو آج اسی قسم کی اخوت کی اشد ضرورت ہے۔ المختصر مزید اطمینان اور وضاحت کے لیے کوبے سے مسٹر موتی والا اور ٹوکیو سے مسٹر جیتا[1] میرے پاس آئے اور میں نے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔ میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ دنیا کو اسلام کی جتنی ضرورت آج ہے' شاید پہلے کبھی نہ تھی۔ اگر دنیا اسلام کی نعمت کو قبول کر لے تو سرزمینِ ارضی امن و راحت کا لازوال نمونہ بن سکتی ہے اور دکھوں اور بلاؤں میں گھرا ہوا یہ باغِ جنت میں بدل سکتا ہے۔

●……●……●

---

[1] عمر جیتا۔۔۔۔ جاپان کے ایک مشہور نو مسلم۔

ڈاکٹر عمر رولف اہرنفلس (آسٹریا)

(Dr. Umar Rolf Baron Ehrenfels)

"ڈاکٹر رولف فریہر بیرن وان اہرنفلس پراگ میں پیدا ہوئے۔ جنوبی آسٹریا میں اپنی جائیداد کا انتظام کرنے کے لیے انہوں نے فن زراعت اور تحفظ جنگلات کی تربیت حاصل کی مگر باقاعدہ تعلیم میں فلسفہ، اسلامیات اور علم الانسان میں تخصص حاصل کیا۔ انہوں نے ۱۹۲۷ء میں اسلام قبول کیا۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو وہ حیدر آباد دکن میں آ گئے۔ علم الانسان پر وہ سند کی حیثیت رکھتے ہیں چنانچہ نہایت ثقہ قسم کے بین الاقوامی سائنسی جرائد اور کتب میں ان کے ایک سو سے زائد وقیع مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ انسانی نسلوں پر ان کی ایک کتاب کا اردو ترجمہ دو ضخیم جلدوں میں دہلی سے انجمن ترقی اردو نے شائع کیا۔ انہوں نے برسوں تک مدراس یونیورسٹی میں شعبۂ علم الانسان (ANTHROPOLOGY) کے صدر کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے"۔

جہاں تک اسلام کو بحیثیت مذہب قبول کرنے کا تعلق ہے اور جہاں تک اس معاملے میں میری اپنی ذات ملوث ہے تو جب کوئی سوال کرتا ہے کہ میں نے اسلام کیوں اور کیسے قبول کیا؟ تب مجھے حیرت ہوتی ہے۔ میں سوچتا ہوں بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے؟ بعض لوگ حقیقتوں کا بیان تو کر لیتے ہیں مگر ان کی وجوہات کا گہرا ادراک نہیں رکھتے۔ پہلے مسلمانوں اور پھر اسلام کی طرف راغب ہونے میں میرا معاملہ بھی اسی سے ملتا

جلتا ہے۔ میری عمر تقریباً دس برس تھی اور میں اور میری بہن اپنے والدین کے ساتھ بڑے ہی خوشگوار ماحول میں رہ رہے تھے جب ۱۹۱۱ء کے موسم خزاں کی ایک سہ پہر کو والد صاحب ہمارے کمرے میں آئے۔ میں نے ان کے چہرے پر غم کی گہری پرچھائیاں دیکھیں۔ میں خوف سے کانپ اٹھا۔ میرے والد بے حد شفیق اور مہربان تھے۔ وہ بنیادی طور پر ایک فلسفی تھے مگر میں نے ان کے چہرے پر ہمیشہ ایک باوقار اور خوبصورت مسکراہٹ کھیلتے ہوئے دیکھی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ غمگین نظر آرہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ہمارے پڑوسی ملک اٹلی نے ترکی کے خلاف جنگ چھیڑ دی ہے اور شمالی افریقہ میں لیبیا پر حملہ کر دیا ہے۔ میں بہت سی جنگوں کے بارے میں کئی کہانیاں پڑھ چکا تھا۔ چنانچہ میں نے فوراً ہی سوال داغ دیا کہ اس جنگ میں ہمارا کیا رول ہوگا اور ہم دونوں طاقتوں میں سے کس کا ساتھ دیں گے''؟

''اطالوی ہمارے پڑوسی ہیں اور حلیف بھی اور پھر یہ کہ ہمارے ہم مذہب یعنی عیسائی ہیں'' میرے والد نے جواب دیا'' جبکہ اس کے مقابلے میں ترکوں یا عربوں سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس ترکی کا شمار صدیوں سے سلطنتِ ہنگری و آسٹریا کے دشمنوں میں ہوتا آیا ہے''۔

میں جانتا تھا کہ میرے والد صاحب اٹلی، اس کی ثقافت اور ادب و آرٹ کے کس قدر پرستار تھے۔ وہ بتایا کرتے تھے کہ شادی کے بعد انہوں نے ہنی مون اٹلی ہی میں منایا تھا اور بعد میں بھی وہ اکثر وہاں جاتے رہے ہیں۔ چنانچہ ان کی بات سن کر میرا تصور دُور اٹلی کے ساحلوں پر چکر لگانے لگا اور میں اطالوی فوجوں کو بھورے رنگ کی دلکش اور خوب صورت وردیوں میں دیکھ کر وفورِ مسرّت سے جھوم اٹھا۔ اسی اثنا میں والد صاحب کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

''مگر جہاں تک موجودہ صورتحال کا تعلق ہے، اطالوی سراسر جارحیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ وہ ترکوں کے علاقوں پر بالکل ناجائز اور غیر قانونی طور پر قبضہ کرنے کی فکر میں ہیں اور عربوں کو اپنا غلام بنانا چاہتے ہیں''۔

میں نے اپنے والد صاحب کی طرف دوبارہ دیکھا۔ گھنے ابروؤں کے درمیان

تشویش کی سلوٹیں ابھر آئی تھیں اور بھورے رنگ کی داڑھی نے ان کے پریشان چہرے کو بیحد باوقار اور دلکش بنا دیا تھا۔ میرے ذہن کے پردے پر ایک ایسی ہی تصویر ابھر آئی جو میں نے اپنے دادا کے قلعے میں دیکھی تھی۔ ترک دی آنا کا محاصرہ کرتے ہیں۔ پولینڈ کا بادشاہ سوبسکی آسٹریا کی مدد کو آتا ہے۔ ترکوں کو شکست ہوتی ہے اور ہزیمت خوردہ ترک جنرل کے چہرے کے تاثرات ہو بہو وہی ہیں جو اس وقت میرے والد صاحب کے چہرے پر نظر آ رہے ہیں۔ میں نے اچانک محسوس کیا کہ میرے دل میں ترکوں کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں۔ یہی وہ لمحہ تھا جس کے بعد میں نے ترکوں اور عربوں کا مطالعہ شروع کیا اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کے بارے میں معلومات جمع کیں۔ ذرا ہوش سنبھالا تو بچپن کے اس شوق نے ایک دوسری صورت اختیار کر لی۔ میں اپنے والد اور ان کے رفیق کار پروفیسر ونٹرنٹز کی نگرانی میں مشرقی مذاہب اور زبانوں کی باقاعدہ تعلیم پانے لگا۔

جنگ عظیم اول ختم ہوئی تو ۱۹۲۳ء میں میں نے اپنے بہترین دوست (جو بعد میں میرے برادر نسبتی بنے) ولہلم بوڈمرشوف کے ہمراہ بلقان سے ترکی تک کا سفر کیا۔ اس سفر میں مجھے ترکوں کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور ان کی تہذیب نے میرے دل و دماغ میں گھر کر لیا۔ میں جب کبھی کسی مسجد کے اونچے مینار سے نیچے جھانکتا تو مسجد کا گنبد اور محرابیں ذوقِ لطیف کو عجیب سی روحانی مسرت بخشتیں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اگرچہ ہم ابھی تک مسلمان نہ ہوئے تھے مگر نماز کے وقت ہم استنبول اور اناطولیہ کی مساجد میں گھس جاتے اور بے اختیار نماز باجماعت میں شامل ہو جاتے۔ ہر طبقے اور پیشے کے ترک اور کرد ہم سے غیر معمولی عزت اور شفقت کا برتاؤ کرتے اور دین اسلام اور اپنے ملک کے بارے میں خوب بے تکلفی سے باتیں کرتے۔ اسی سفر کے مشاہدات سے میرے محترم ہمسفر نے یہ رائے قائم کی کہ اسلام اپنے اندر ہر قسم کے عصری مسائل کا مقابلہ کرنے کی سکت رکھتا ہے۔ یہ وہ نظامِ زندگی ہے جو انسان کی فطرت کے مطابق ہے اور توہمات کے بجائے سائنسی بنیادیں رکھتا ہے۔

سفر سے واپس آکر میں نے ترکی کے بارے میں ایک کتاب لکھی جو برلن کے ''مسلم ریویو'' میں قسط وار چھپتی رہی۔ یہ رسالہ ڈاکٹر حمید مارکوس کی ادارت میں چھپتا تھا۔ اسی

رسالے کے دفتر میں میری ملاقات سیالکوٹ کے ایس این عبداللہ سے ہوئی جن کے ہمراہ میں نے بعد میں برصغیر کا سفر اختیار کیا۔ یہ سفر میری زندگی کا فیصلہ کن موڑ ثابت ہوا اور میں نے بالآخر وہ فیصلہ کر ہی لیا جس کی طرف قدرت مدت سے میری رہنمائی کر رہی تھی۔

جیسا کہ آپ نے اوپر کے واقعات سے اندازہ کر لیا ہے کہ میرے لیے یہ وضاحت کرنا بہت مشکل ہے کہ اسلام کے بارے میں تفصیل سے معلوم کیے بغیر میں اس میں کیوں دلچسپی لینے لگا تھا۔ تاہم اس مذہب کے وہ اصول جنہوں نے مجھے متاثر کیا مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ سارے انبیا ایک ہی پیغام لے کر آتے رہے ہیں۔ روشنی کا منبع ہر زمانے میں ایک ہی رہا ہے اور ہر نبی نے انسانیت کی فلاح اور آخرت کی کامیابی کے لیے ایک ہی پروگرام پیش کیا ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ خالق کائنات کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے۔

۲۔ اسلام تاریخی اعتبار سے مذہب کی آخری اور مکمل ترین صورت ہے۔

۳۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے آخری نبی تھے۔ ان کے کارنامے اپنی کوئی مثال نہیں رکھتے لیکن ان کارناموں کو مافوق الفطری صورت نہیں دی جا سکتی۔ یہ تاریخ کے بہاؤ کے ساتھ چل کر سامنے آتے ہیں اور عقل ان کی تصدیق کرتی ہے۔

۴۔ جب کسی پرانے مذہب کا فرد اسلام قبول کرتا ہے تو دراصل وہ اپنے مذہب کی کسی سچائی کی نفی نہیں کرتا۔ قرآن کے مطابق سارے مذاہب کی بنیاد ایک ہے، بعد میں انسانوں نے ان کا حلیہ بگاڑ دیا۔

۵۔ اسلام اخوت اور انسانی بھائی چارے پر زور دیتا ہے۔ وہ مساوات کا علمبردار ہے، نسل یا رنگ کا امتیاز روا نہیں رکھتا۔ اسطرح اسلام نوع انسان کے لیے مجسمۂ محبت و کرم ہے۔ یہی وہ روح ہے جو مسجد ایا صوفیہ اور مسجد محمد فاتح کے میناروں اور گنبدوں میں نظر آتی ہے اور اسی روح کا اظہار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس قول مبارک میں ہوتا ہے کہ ''جنت ماں کے قدموں تلے ہے''۔

●......●......●

ڈاکٹر عمر فاروق عبداللہ (امریکہ)

ذیل میں ہم ایک امریکی نومسلم بھائی عمر فاروق عبداللہ کی ریڈیو تقریر شائع کر رہے ہیں جو انہوں نے وینکور (کینیڈا) کے ریڈیو اسٹیشن سے اردو پروگرام میں نشر کی۔ عمر فاروق عبداللہ نے یونیورسٹی آف شکاگو سے علوم اسلامیہ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور ان کا خاص موضوع اصولِ فقہ ہے۔ ان کی تقریر میں ایک سچے مسلمان کا جو جذبہ اور جوش ہے وہ ہم سب کے لیے مثالی نوعیت کا حامل ہے۔ سب سے دلچسپ اور ایمان افروز بات یہ ہے کہ عمر فاروق نے خود اپنے مطالعہ سے اور اپنی روحانی جدوجہد کی بنیاد پر وہ راستہ اختیار کیا جس پر چلنے سے اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت کے نور سے نوازا۔ اسلام کی حقانیت اور اس کے ابدی اور عالمگیر پیغام کی سچائی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے..... ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ تقریر انہوں نے خود اردو میں لکھی ہے۔

اسلام اور اسلامی علوم سے ان کی محبت اور دلچسپی کا ثبوت یہ بھی ہے کہ انہوں نے پانچ سال کی قلیل مدت میں نہ صرف یہ کہ عربی زبان پر عبور حاصل کیا بلکہ اب بڑی تیزی سے یونیورسٹی آف شکاگو کے ساؤتھ ایشیا ڈیپارٹمنٹ سے اردو بھی سیکھ رہے ہیں۔ عمر عبداللہ حج کی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔ سعودی عرب، مصر اور . . . . نائیجریا جا چکے ہیں اور پاکستان سے بھی انھیں گہرا قلبی تعلق ہے۔

وہ شادی شدہ ہیں اور ایک پیاری سی بچی ''ایمان'' کے باپ ہیں۔

میں ۱۹۷۰ء میں مسلمان ہوا۔ اس سے پہلے میں کورنیل یونیورسٹی میں انگریزی ادب کا طالب علم تھا۔ کالج کے ابتدائی سالوں میں میں تاریخ کا بھی طالبعلم رہا۔ مجھے عیسائیت کی ابتدائی تاریخ سے بے حد دلچسپی تھی، خصوصاً آریاؤں وغیرہ کے بارے میں جن کے ہاں

وحدانیت یعنی ایک خدا کا تصور تھا۔ چنانچہ مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ عیسائیت میں تین خدا کا تصور حضرت عیسیٰ کا دیا ہوا نہیں ہے۔ میرے والد خود ایک معلّم رہے ہیں۔ انہوں نے BIO CHEMISTRY (حیاتیاتی کیمیا) اور علم الحیوانات میں ڈاکٹریٹ کی تھی۔ وہ ایک خدا کے وجود کو مانتے ہیں اور تین خدا کے تصور کے خلاف تلقین کرتے رہتے ہیں۔

فلسفہ اور ادب کے مطالعہ نے میرے خیالات میں گہرائی اور گیرائی پیدا کی۔ اس دوران میں مجھے Pinoza اور Elbnitz کو پڑھنے کا موقع ملا۔ ان دونوں کے پاس توحید کا جو تصور تھا اس نے مجھے متوجہ کیا۔ انگریزی ادب میں مَیں جان ملٹن سے کافی متاثر رہا۔ ملٹن کو میں انگریزی کا بہت بڑا شاعر تسلیم کرتا ہوں۔ اس کی آخری شاعری میں توحید کا واضح رجحان ملتا ہے۔ اس کی شاعری میں جنت کا خوشگوار اور دوزخ کا بھیانک تصور پوری طرح اجاگر ہوتا ہے۔ ملٹن نے نہ صرف اس ایمان کا اظہار کیا کہ خدا ایک ہے بلکہ یہ بھی کہا کہ جنت میں داخلے کے لیے حضرت عیسیٰ کی اشیرباد ضروری نہیں۔

اس نے لاطینی' یونانی اور عبرانی ادب کے مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ POLYGAMY یعنی ایک سے زیادہ شادیاں کرنا بائبل کے پیغمبروں کے طریقے کے عین مطابق ہے۔ ان کے مطالعہ کے بعد مشہور سیاسی لیڈر میلکم ایکس (MALCOM X) کی سوانح عمری نے میرے ذہن پر خوشگوار اثرات مرتب کیے' وہ مسلمان ہو گیا تھا اور اس کا مسلم نام الملک الشہباز تھا۔ بعد میں اسے قتل کر دیا گیا۔ اس نے اس خیال کا اظہار کیا کہ توحید یعنی وحدانیت کو اپنانے ہی میں امریکہ کی فلاح اور بھلائی ہے اور اسی طرح امریکہ کو نسلی امتیازات اور دوسری سماجی برائیوں سے پاک کیا جا سکتا ہے۔

اس وقت تک مجھے اسلام کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں بلکہ سچ کہیے تو اسلام کے بارے میں غلط تصورات تھے کہ یہ ایک سے زیادہ خداؤں کو ماننے والا مذہب ہے۔ اس کے بعد جب مَیں نے مطالعہ کیا تو یہ اندیشے بے بنیاد ثابت ہوئے اور مَیں یہ جان کر متعجب ہوا کہ یہ تو حضرت ابراہیم کا مذہب ہے اور اسلام صرف عربوں کا نہیں بلکہ پاکستان' ہندوستان' انڈونیشیا' یوگوسلاویہ اور کئی دوسرے ممالک کے لوگوں کا مذہب ہے۔

مَیں نے قرآنِ پاک کے ایک انگریزی ترجمہ کا مطالعہ کیا جو غنیمت تھا اور جس میں

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے حالات بھی درج تھے۔ مجھے یقین کرنا پڑا کہ بے شک آپ پیغمبر اور رسول ہیں' کیونکہ بائبل میں پیغمبروں کی جو خصوصیات درج تھیں ان پر آپ پورا اترتے تھے۔ اتفاق سے ایک جمعہ تھا جس دن کہ میں ایمان لایا اور مسلمان ہوا۔ ہاں میں بغیر کسی مسلمان کی مدد کے اور دعوت کے مسلمان ہوا۔ صرف اپنے ذاتی مطالعہ کی وجہ سے۔

مسلمان ہونے کے بعد MSA سے اور دوسرے مسلمانوں سے میری جان پہچان ہوئی۔ MSA کے سالانہ کنونشن میں شرکت کرنے کے بعد مجھے اسلام کی حقیقی روح کا اندازہ ہوا جہاں مختلف ممالک کے اور مختلف زبانیں بولنے والے مسلمانوں کو ایک ساتھ دیکھنے اور ساتھ رہنے کا موقع ملا۔

یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ بہت سے ایسے لوگ جو مسلمان خاندانوں میں پیدا ہوئے اور مسلم نام رکھتے ہیں' وہ اسلام کی صحیح نمائندگی نہیں کرتے۔ مجھے بہت جلد احساس ہو گیا کہ جب مسلمان اسلام پر قائم ہے تو وہ بہت نیک سیرت اور اعلیٰ ہے اور اگر اسلام پر قائم نہیں تو وہ حقیر ترین اور انتہائی پست ہو سکتا ہے۔

قومیت کے بارے۔۔۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ قومیت چاہے ہندوستانی ہو یا پاکستانی' عربی ہو یا امریکی' چینی ہو یا برطانوی ہمیشہ اپنے طور پر ایک غیر منصفانہ بات ہے۔۔۔ کسی انسان کو یہ آزادی نہیں کہ وہ اپنے طور پر کسی شہریت کو اختیار کرے۔ جو شخص جہاں پیدا ہوتا ہے' وہیں کا ہو جاتا ہے مثال کے طور پر میں امریکہ پیدا ہوا ہوں، میں پاکستانی یا ہندوستانی نہیں ہو سکتا۔ البتہ مسلمان ہو سکتا ہوں جس کا مجھے اختیار ہے' جب کہ قومیت کا نہیں۔

آرنلڈ ٹائن بی مشہور مؤرخ نے کہا ہے کہ بیسویں صدی کی سب سے بڑی لعنت قومیت ہے۔ اس نے کہا اس وقت دنیا کے ممالک معاشی طور پر ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ قومیت ایک بیماری ہے۔ غلط اصولوں پر یہ ایک قوم کو دوسری قوم سے لڑا کر رکھ دیتی ہے۔ اسلام کی بنیاد قومیت پر نہیں بلکہ سچائی اور عقیدے پر ہے۔ قومیت دراصل یہودیوں کا طریقہ ہے۔ عموماً ایک

یہودی ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ یہودی گھرانے میں پیدا ہو۔ظاہر ہے کہ اب میں ایک یہودی خاندان میں پیدا نہیں ہوسکتا۔لیکن مسلمان ہونے کے لیے ضروری نہیں۔چاہے آپ کا تعلق کسی بھی نسل سے ہو' کسی بھی ملک سے ہو' کسی بھی زبان سے ہو اگر آپ سچائی پر ایمان لاتے ہیں تو مسلمان ہو سکتے ہیں۔آپ کو آزادی ہے اور یہی انصاف ہے۔

آخر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ مسلمان ہونے کے ناطے ہمیں اچھا مسلم بننا چاہیے۔قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ○ (آل عمران:۸۶'۸۷)

خدا ان لوگوں کو کیسے ہدایت کرے جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے' جنہوں نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سچے ہونے کا اقرار کیا اور جن کے پاس خدا کی واضح دلیلیں پہنچ چکی ہیں۔خدا ایسے نامعقول اور بے ڈھنگے لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔ان پر تو لعنت ہے خدا کی' فرشتوں کی اور تمام انسانیت کی۔

یہاں یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ خدا نے ان پر اپنی لعنت اور فرشتوں کی لعنت کے ساتھ ساتھ انسانیت کی لعنت بھیجی ہے؟ ان پر تمام مسلمانوں اور غیر مسلموں کی لعنت ہے۔مسلمانوں کی لعنت اس لیے کہ انہوں نے ایمان نہ لا کر سچائی کا راستہ چھوڑ دیا اور مسلمانوں سے الگ ہو گئے۔ان پر غیر مسلموں کی لعنت اس لیے ہے کہ انہوں نے اپنے طور طریقوں سے انہیں سچائی اور انصاف کا راستہ اختیار کرنے سے باز رکھا۔

(بشکریہ ماہنامہ ''الحق'' مارچ 1977ء)

●......●......●

پروفیسر غازی احمد (پاکستان)

(سابق کرشن لال)

پروفیسر غازی احمد، ایم اے عربی (گولڈ میڈلسٹ) ایم اے علوم اسلامیہ (گولڈ میڈلسٹ) ایم او ایل (عربی) آنرز عربی (میڈلسٹ) فاضل درس نظامی، بی ایڈ، سابق لیکچرار شعبہ اسلامیات پنجاب یونیورسٹی، سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج بوچھال کلاں ضلع جہلم۔ آج کل اپنے آپ کو تبلیغ دین کے لیے وقف کر چکے ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے اپنے قبول اسلام کے مفصل حالات پر مشتمل ایک کتاب شائع کی ہے جو تاثر سے بھرپور اور بڑی ایمان افروز ہے۔

میں ۱۹۲۲ء میں ضلع جہلم کے ایک دور افتادہ گاؤں میانی میں ایک ہندو خاندان میں پیدا ہوا۔ والدین نے نام کرشن لال رکھا۔ میرے خاندان کے تمام افراد سناتن دھرمی عقائد کے مالک تھے۔ شروع میں میں بھی انہیں نظریات کا پابند تھا، لیکن آٹھویں جماعت میں پہنچا تو میرا رجحان خود بخود دین اسلام کی طرف ہونے لگا۔ اسی زمانے میں میری ملاقات بوچھال کلاں کے ایک عالم دین مولانا عبدالرؤف صاحب سے ہوئی۔ انہوں نے متعدد نشستوں میں مجھ پر اسلام کی حقانیت واضح کی۔ میں ان کے مواعظ سے بہت متاثر ہوا لیکن ابھی زمانہ بچپن کا تھا اس لئے اپنے آبائی مذہب، اپنے خاندان، اپنے بہن بھائیوں اور خصوصاً والدین کو چھوڑنے کا خیال میرے ننھے سے دل میں قیامت برپا کر دیتا۔ میرا معصوم سا ذہن ایسی سوچ ہی سے لرز جاتا تھا۔ چنانچہ جب بھی اسلام قبول کرنے

کا سوال آتا' دل میں والدہ اور بھائیوں کی محبت کا بہاؤ تیز تر ہو جاتا۔ بچپن کی ناپختگی اور ناتجربہ کاری آڑے آتی اور میں کسی حتمی فیصلے پر نہ پہنچ پاتا۔

یکم مارچ ۱۹۳۸ء کی رات تھی جبکہ میں نے ایک سہانا اور مبارک خواب دیکھا۔ میں مکہ معظمہ میں بیت اللہ کے عین سامنے کھڑا ہوں۔ سید الاولین والآخرین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (فداہ روحی وابی وامی) دیوارِ کعبہ سے تکیہ لگائے میرے سامنے جلوہ افروز ہیں۔ اردگرد صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تشریف فرما ہیں۔ میں والہانہ جذب وشوق کے عالم میں صحابۂ کرامؓ کے درمیان سے گزرتا ہوا سید الانبیاء کی بارگاہِ اقدس میں پہنچتا ہوں۔ مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتا ہوں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کر میرا ہاتھ تھام لیتے ہیں۔ میرے بدن کے رگ و ریشے میں مسرت و شادمانی کی لہریں دوڑ جاتی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دریافت فرماتے ہیں: "کہو کیسے آئے ہو"۔ "مشرف بہ اسلام ہونے کے لئے" میں عرض کرتا ہوں۔ یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا روئے انور رونور مسرت سے چمک اٹھتا ہے۔ آپ میرا ہاتھ اپنے مقدس ہاتھوں میں تھام کر کچھ پڑھتے ہیں جسے میں نہیں سمجھ سکا۔ پھر فرماتے ہیں "بس اب تم دولتِ اسلام سے بہرہ ور ہو گئے ہو"۔

حسبِ معمول صبح آنکھ کھلی تو میرا دل خوشی کے بے پایاں جذبات سے معمور تھا۔ چنانچہ جب والدہ محترمہ کے پاس بیٹھ کر کھانا کھانے لگا تو انہوں نے مجھ سے خلافِ معمول اس قدر خوش خوش نظر آنے کی وجہ پوچھی۔ میں بات کو ٹال گیا۔

مدرسہ کے اوقات میں مولانا عبدالرؤف صاحب سے مل کر انہیں جب رات کا پُرلطف خواب سنایا تو انہوں نے فرمایا روزانہ سوتے وقت اللہ سے راہِ ہدایت کی دعا کیا کرو۔ میں ایسا ہی کرنے لگا۔ دو ہی دن گزرے تھے کہ ۳۔ مارچ ۱۹۳۸ء کی شب کو میں سو رہا تھا کہ خواب میں یوں محسوس ہوا جیسے مدرسہ بند ہونے پر میں میانی کے دیگر طلبہ کے ساتھ گھر آ رہا ہوں۔ راستے میں ایک قوی ہیکل' دیو قامت اور کریہہ المنظر شخص کھڑا ہے جسے دیکھ کر ہم سب پر لرزہ طاری ہو گیا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا یہ دجال ہے۔ ہم

جس سے بھی یہ پوچھے کہ تم کس کے بندے ہو تو یہی جواب دے کہ میں خدا کا بندہ ہوں۔ پھر وہ میرے ساتھیوں سے فرداً فرداً سوال کرنے لگا جو طالب علم اس کی مرضی کے مطابق جواب دیتا اسے قسم قسم کے پھل' کھانے اور کھلونے دیتا اور جو اس کی بات نہ مانتا اس کو موت کے گھاٹ اتار دیتا۔

آخر میں جب میری باری آئی تو اس نے پوچھا ''کس کے بندے ہو''؟

''اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں'' میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

یہ سنتے ہی اس نے مجھے اس زور کا گھونسہ رسید کیا کہ میں کئی گز دور جا گرا اور رونے لگا۔ دجّال نے تحکمانہ لہجے میں آواز دے کر کہا ''اِدھر آؤ''۔ میں ڈرتا کانپتا اُدھر چلا ہی تھا کہ میرے کانوں میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پرور آواز آئی ''پہلے میرے پاس آؤ''۔ آپ کو دیکھ کر مجھے تعجب ہوا کہ ابھی کل ہی تو میں نے انھیں مکہ مکرمہ میں دیکھا تھا۔ آج یہاں کیسے تشریف لے آئے۔ میں دجّال کی سخت مار کی وجہ سے روتا ہوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بارگاہ عالی میں پہنچا۔ آپ نے میری کمر پر دستِ شفقت پھیرتے ہوئے فرمایا ''دیکھو! میں صرف تمہاری خاطر یہاں آیا ہوں۔ دجّال کی بات ہرگز نہ ماننا۔ میں تمہارے لئے دعا کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو تم ناکامی کا منہ نہیں دیکھو گے''۔ یہ ارشاد فرما کر آپ تشریف لے گئے تو میں دجّال کے پاس پہنچا۔ اس نے پھر وہی سوال دہرایا۔ میں نے بھی حسب سابق وہی جواب دے دیا۔ اس پر وہ مارے غصے کے لال پیلا ہو گیا اور جھلّا کر جب اس نے میرے منہ پر تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو مارے دہشت کے میری چیخ نکل گئی اور اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی' پھر میں صبح تک نہ سو سکا۔

میں نے پختہ فیصلہ کر لیا کہ آج بوچھال پہنچ کر قبولِ اسلام کا اعلان کر دوں گا۔ والدہ محترمہ نے حسبِ معمول جب صبح کو کھانا تیار کیا اور میں ان کے پاس بیٹھ کر کھانے لگا۔ جذبات میں تلاطم برپا تھا۔ جانتا تھا کہ آج آخری مرتبہ ماں کے گھٹنوں کے پاس بیٹھ کر کھانا کھا رہا ہوں اور والدین اور بھائیوں سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہا ہوں۔ آج کے

بعد اس گھر میں جہاں زندگی کی بہت سی بہاریں گزری ہیں شاید ہی کبھی قدم رکھنا نصیب ہو۔ میں نے بہانے سے بھائیوں کے سر پر آخری مرتبہ ہاتھ پھیرا اور شفقت و محبت کا اظہار کیا۔ اسی طرح حیلے بہانے سے پیاری ماں کے قدم چھو کر ہدیۂ عقیدت و احترام پیش کیا اور بستہ اٹھا کر اپنے گھر پر' تینوں بھائیوں پر اور ماں پر حسرت بھری نگاہ ڈالی اور پرنم آنکھوں سے شہر کی راہ لی۔ ۴۔ مارچ ۱۹۳۸ء کو جمعہ کا مبارک دن تھا اور محرم کی پہلی تاریخ جب میں نے غسل کیا اور سید ھا مسجد میں جا کر مولانا عبدالرؤف صاحب کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ میرا اسلامی نام غازی احمد تجویز ہوا۔

میرے اسلام لانے کی اطلاع جب گھر پہنچی تو کہرام سا مچ گیا۔ سب نے رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ والد صاحب کشمیر میں ملازم تھے' انہیں اور دوسرے رشتہ داروں کو بذریعہ تار مطلع کیا گیا۔ چنانچہ تین چار دن کے اندر ہی اندر میرے والد اور رشتہ داروں نے مولانا عبدالرؤف اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر ملک محمد طفیل پر مقدمہ دائر کر دیا کہ انہوں نے ہمارے نابالغ بچے کو ورغلا کر زبردستی مسلمان بنا لیا ہے۔ ایس ڈی ایم کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا۔ ایک طرف والد محترم اور متعدد ہندو رشتہ دار تھے۔ دوسری طرف میں خود اور ہزاروں مسلمان۔ عدالت میں میرے بیان ہوئے' میں نے بتایا کہ برضا و رغبت مسلمان ہوا ہوں۔ میرے قبول اسلام میں کسی فرد بشر کا ہاتھ نہیں۔ میں مسلمانوں کے پاس ہی رہوں گا۔ والدین کے پاس مجھے جان کا خطرہ ہے۔ عدالت نے فیصلہ میرے حق میں دے دیا۔ مسلمان خوشی سے نعرے لگانے لگے۔ میں شاداں و فرحاں ان کے ساتھ واپس آ گیا۔

میرے والد بھلا کب نچلے بیٹھنے والے تھے۔ انہوں نے مختلف عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر کامیابی نہ ہوئی بالآخر انہوں نے سیشن جج جہلم کی طرف رجوع کیا۔ وہاں پیشی ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ جج صاحب کا رویہ میرے خلاف ہے۔ میرا خدشہ درست ثابت ہوا اور مجھے دوسری پیشی تک والدین کے حوالے کر دیا گیا۔ میں نے جانے سے انکار کر دیا' مگر مجھے زبردستی کار میں بٹھا دیا گیا اور دریا کے کنارے ایک مندر میں لایا گیا۔

والدہ بھی وہیں آگئیں۔ انہوں نے دھمکی دی کہ اگر میں اپنی روش سے باز نہ آیا تو وہ دریا میں کود کر جان گنوا دیں گی۔ دوسرے ہندو بھی طرح طرح کے لالچ دیتے تھے۔

دراصل والد صاحب نے مل ملا کر ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر جہلم سے میرے نابالغ ہونے کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا تھا اور اسی کی بنیاد پر سیشن جج نے میرے والد کے حق میں فیصلہ دے کر مجھے ان کے حوالے کر دیا۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ یہ جج مسلمان تھا۔ والد صاحب بتایا کرتے تھے کہ انہوں نے جج کو رشوت دے کر فیصلہ اپنے حق میں کرایا تھا۔

فیصلے کے دن ہی والد صاحب مجھے ساتھ لے کر کشمیر روانہ ہو گئے۔ راستے میں جموں اور بٹوت ٹھہرتے ہوئے چوتھے دن ہم بھدرواہ پہنچ گئے۔ وہاں پہنچنے کے دوسرے ہی دن والد صاحب مجھے ایک پنڈت کی معیت میں گاؤں سے باہر ایک بلند پہاڑی پر لے گئے اور رو رو کر مجھے ''راہِ راست'' پر لانے کی کوشش کرنے لگے۔ انہوں نے کہا ''مَیں اس مقدمے پر دس ہزار روپیہ خرچ کر چکا ہوں۔ میری عزت خاک میں مل گئی ہے۔ مَیں خاندان میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا وغیرہ۔ میرا دل پسیج گیا۔ مگر رحمتِ ایزدی نے سہارا دیا اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کے تمام مناظر میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔ میں نے ادب سے جواب دیا:

> ''مجھے آپ کی ساری پریشانی کا خوب احساس ہے، مگر مَیں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ مَیں اب ترکِ اسلام کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اگر آپ مجھے اسلام پر قائم رہنے کی بخوشی اجازت دے دیں تو مَیں زندگی بھر آپ کا غلام رہوں گا''۔

یہ سنتے ہی والد صاحب غصے میں آ گئے۔ انہوں نے چھڑی اٹھالی اور مجھے نہایت بے رحمی سے پیٹنے لگے۔ یہ مار اتنی شدید تھی کہ بدن کے ہر حصے سے خون بہنے لگا۔ مَیں تڑپ تڑپ جاتا تھا مگر والد کو رحم نہ آتا تھا۔ وہ پورے زور سے بے تحاشا مجھے ضربیں لگا رہے تھے۔ بالآخر تھک گئے تو پنڈت سے کہنے لگے: ''کیوں نہ مَیں اسے دریا میں دھکیل دوں شاید اس طرح کلنک کا ٹیکا میرے ماتھے سے اتر جائے''۔ پہاڑی کے دامن میں بپھرتا ہوا دریا میرے سامنے تھا۔ موت کے خوف سے مَیں لرز گیا۔ مگر لاکھ لاکھ شکر ہے اللہ تعالیٰ کا کہ

میرے قدموں میں لغزش نہ آنے دی۔ میرے دل میں یہ خیال آنے لگا کہ والد نے مجھے دریا میں پھینکا تو میں اپنے پیارے نبیؐ کی بارگاہِ اقدس میں حاضر ہو کر عرض کروں گا: میرے آقا! آپ نے مجھے اسلام کی جو دولت بخشی میں اس کو صحیح و سالم لے کر حاضر ہو گیا ہوں۔

چھڑی کی مار اور بوٹوں کی ان گنت ٹھوکروں سے جسم کا روآں روآں زخمی تھا۔ حتیٰ کہ ناک، منہ اور آنکھیں بھی متورم تھیں۔ تقریباً ہفتہ بھر بستر ہی پر دراز رہا۔ والد خود ہی مرہم پٹی کرتے رہے۔ حالت کچھ سنبھلی تو انہوں نے مجھے بھدرواہ ہائی اسکول میں داخل کرا دیا۔ میں ہندو لڑکوں کی نگرانی میں سکول آنے جانے لگا۔ مسلمان طلبہ کو مجھ سے بات کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ہندو لڑکے اور استاد مجھے نفرت بھری نگاہوں سے دیکھتے۔ یہ سکول میرے لئے جہنم سے کم اذیت ناک نہ تھا۔

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد میں نے ایک مسلمان لڑکے دوست محمد سے تعلقات بڑھائے اور اس کے توسط سے مولانا عبدالرؤف کو خط لکھا۔ خط ملتے ہی مولانا نے قصبے کے لوگوں کو جمع کیا اور پوچھا "کوئی ہے جو جان پر کھیل کر ایک مسلمان کو کافروں کے چنگل سے چھٹکارا دلائے"۔ اس پر ایک غریب لیکن باغیرت شخص اٹھا اور اس نے اپنی خدمات پیش کر دیں، اس کا نام جان محمد تھا۔

پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق جان محمد صاحب ایک روز اسکول کے اوقات ہی میں بھدرواہ پہنچ گئے۔ دوست محمد نے مجھے آگاہ کیا تو میں تفریح کے بعد روتا روتا اپنے ماسٹر صاحب کے پاس پہنچا اور شدید پیٹ درد کا بہانہ کیا۔ ماسٹر صاحب نے مجھے چھٹی دے دی۔ میں نے بستہ سنبھالا اور آنکھ بچا کر سکول سے نکل گیا۔

جان محمد صاحب نے ایک مقامی مسلمان راہبر کو ساتھ لیا اور ہم بھدرواہ سے بھاگ کر راتوں رات کشمیر کی سرحد پار کر کے ریاست چنبہ میں آ گئے۔ مسلمان راہبر واپس چلا گیا اور ہم دونوں تقریباً ساٹھ میل کا سفر طے کر کے تیسرے دن ڈلہوزی پہنچے۔ سفر سے بُرا حال تھا۔ پاؤں متورم تھے اور کپڑے میلے چیکٹ۔

شام کو ہم براستہ پٹھان کوٹ امرتسر پہنچے۔ میں نے لباس تبدیل کیا اور کھیوڑہ کی راہ

بوچھال کلاں پہنچ گیا۔ لاری اڈے پر ایک ہجوم پذیرائی کے لئے موجود تھا۔

۱۹۴۱ء میں میٹرک کا امتحان میں نے اسکول میں اوّل رہ کر امتیازی حیثیت سے پاس کرلیا۔ اس کے بعد میں نے علومِ دینیہ کی طرف توجہ دی چنانچہ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۸ء تک میں نے مدرسہ خادم الشرعیہ پنڈی گھیپ، مدرسہ عربیہ اشاعت القرآن گجرات اور دارالعلوم دیوبند سے دینی علوم کی تکمیل کی۔ ۱۹۴۸ء میں مولوی فاضل کا امتحان دیا اور صوبے بھر میں اوّل رہا۔ اس کے بعد میں نے بتدریج ایف اے، بی اے، بی ایڈ اور ایم اے کیا۔ اللہ کے فضل سے ہر امتحان میں فسٹ ڈویژن حاصل کی۔ ایم اے عربی اور ایم اے اسلامیات میں تو صوبے بھر میں اوّل رہا۔ میرا ایمان ہے کہ یہ ساری کامرانیاں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا کا نتیجہ ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں میرے والدین اور بھائی بہن ہندوستان چلے گئے تو میں اپنے آبائی مکان میں منتقل ہو گیا۔ ۱۹۴۸ء سے محکمہ تعلیم میں ملازمت کی ابتدا ہوئی۔ ۱۹۵۸ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں لیکچرار رہا۔ ۱۹۶۲ء میں شعبۂ علومِ اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی میں کام کرتا رہا اور اب گورنمنٹ کالج بوچھال کلاں ضلع جہلم میں تدریسی فرائض انجام دے رہا ہوں۔[1]

اسلام قبول کرنے کے بعد میں نے اپنے اندر بہت بڑا ذہنی اور روحانی انقلاب محسوس کیا ورنہ اس سے پہلے میں متوسط ذہن کا مالک تھا۔ اسلام کے سایۂ عاطفت میں آنے کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے مجھ پر دینی و دنیاوی ترقی کے دروازے کھول دیے۔ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا کا اثر عملی طور پر یوں محسوس کیا ہے کہ آج تک کسی امر میں مجھے ناکامی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ آپ کی دعا میری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ انشاء اللہ قیامت کے دن بھی یہی دعا میری نجات کا باعث بنے گی۔

●......●......●

[1] جب یہ مضمون تحریر کیا گیا تو موصوف محترم اس کالج میں لیکچرار تھے' پھر ترقی پا کر یہیں پرنسپل ہوئے اور ۱۹۸۰ء میں ریٹائر ہو گئے۔

ڈاکٹر غریبیہ (فرانس)

(یہ واقعہ بھی "اسلام زندہ باد" سے ماخوذ ہے)

مصر کے مشہور صحافی اور ادیب محمود بے مصری روایت کرتے ہیں۔

"مَیں کئی سال تک فرانس میں مقیم رہا اور اپنے ملنے والوں سے ایک ڈاکٹر کی تعریف و توصیف سنتا رہا۔ شرافت، راست بازی، روشن خیالی، عالی ظرفی اور اخلاص مندی، کریم النفسی، مہمان نوازی، غرض کوئی بھی انسانی وصف ایسا نہ تھا جس سے میرے ملاقاتی اسے نسبت نہ دیتے ہوں۔ میں سمجھتا بیماروں پر اس کی شفقت عام ہوگی مگر تعجب ہے کہ بیماروں سے بڑھ کر تندرست اس کی محبت کے مریض لگتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کا نام غریبیہ تھا۔ وہ فرانسیسی پارلیمنٹ کے رکن بھی تھے۔ یہ ان کی ہر دلعزیزی کا واضح ثبوت تھا۔ لیکن لوگوں کا کہنا تھا کہ ڈاکٹر کی نیک دلی اور صاف باطنی اس اعزاز سے بہت بلند ہے۔ چنانچہ پارلیمنٹ کا ماحول اور اس کے ارکان کا عمومی کردار اور کھوکھلی تقریریں انہیں راس نہ آئیں۔ انہوں نے پارلیمنٹ سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ پیرس کی رہائش بھی ترک کی اور رونق و شہرت کے اس مرکز کو چھوڑ کر فرانس کے ایک پُرسکون گاؤں میں اقامت اختیار کر لی۔

محمود بے مصری لکھتے ہیں:

جب مجھے ان حالات کا علم ہوا اور ساتھ ہی یہ پتہ چلا کہ اس عظیم انسان نے اسلام قبول کر لیا ہے تو دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ اس سے ملاقات کی جائے اور کم از کم قبول اسلام کا سبب دریافت کیا جائے۔ چنانچہ مَیں اس گاؤں میں پہنچا جہاں ڈاکٹر صاحب کی رہائش تھی۔ مَیں نے یہ امر شدت سے محسوس کیا کہ اس بستی میں بھی ڈاکٹر موصوف غیر

معمولی طور پر ہر دلعزیز ہیں۔

ڈاکٹر غریبیہ کو پہلی نظر دیکھ کر ہی دل میں مسرت کے کنول کھل اٹھے۔ ان کی پیشانی پر محبت اور خوش اخلاقی کے معصوم ستارے کھیل رہے تھے۔ اگرچہ وہ اس وقت بہت مصروف تھے، تاہم بڑی گرمجوشی سے ملے۔ ایسی گرمجوشی سے جس سے اخوت اسلامیہ کا نام زندہ ہے۔ وہ اپنے کام سے فارغ ہوئے تو چند رسمی باتوں کے بعد مَیں نے دریافت کیا "ڈاکٹر صاحب! آپ کے مشرف بہ اسلام ہونے کے اسباب کیا ہیں"؟

"قرآن پاک کی صرف ایک آیت" ڈاکٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "تو کیا آپ نے کسی مسلمان عالم سے قرآن پڑھا اور اس کی کسی ایک آیت نے آپ پر یہ اثر کیا"؟ مَیں نے وضاحت چاہی۔

"نہیں، مَیں نے کسی مسلمان سے ملاقات نہیں کی۔" ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

"پھر قرآن کی کوئی تفسیر پڑھی ہے"۔ میرے سوال میں حیرت کا عنصر شامل تھا۔

"نہیں تفسیر بھی نہیں پڑھی"۔

"تو پھر یہ واقعہ کیونکر گزرا"؟

ڈاکٹر صاحب نے کہنا شروع کیا۔

"میری جوانی سمندری سفروں میں گزری ہے۔ مجھے سمندر کے نظاروں اور سفروں کا شوق اس قدر دامن گیر تھا کہ ہمیشہ آبی مخلوق بنا رہتا تھا۔ مَیں نے ایک بحری جہاز پر ملازمت حاصل کر لی۔ اس طرح مَیں اپنے شب و روز پانی اور آسمان کے درمیان بسر کرتا تھا اور اس قدر مسرور تھا کہ گویا میری زندگی کا مقصد یہی ہے۔ میرا دوسرا معمول کتابوں کے مطالعے میں منہمک رہنا تھا۔ جب بھی فارغ ہوتا کوئی کتاب لے کر بیٹھ جاتا۔ مطالعے کا یہی شوق مجھے قرآن کے ایک فرانسیسی ترجمے تک لے آیا۔ یہ ترجمہ موسیو ساقاری کے قلم سے تھا۔ مَیں اس نسخے کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ سورۂ نور کی ایک آیت پر نظریں جم کر رہ گئیں۔ اس میں ایک سمندری نظارے کی کیفیت بیان کی گئی تھی۔ اس آیت میں کسی گمراہ شخص کی حالت کے متعلق ایک نہایت ہی عجیب تمثیل بیان کی گئی تھی۔ یعنی "گمراہ شخص حالتِ کفر میں اس طرح ٹامک ٹوئیے مارتا ہے جیسے ایک شخص اندھیری رات میں، جبکہ بادل

بھی چھائے ہوئے ہوں' سمندر کی لہروں کے نیچے ہاتھ پاؤں مارتا ہو"۔

اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَاۤ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ؕ (سورہ نور آیت نمبر ۴۰) "اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گہرے سمندر میں اندھیرا کہ اوپر ایک موج چھائی ہوئی ہے اس پر ایک اور موج اور اس کے اوپر بادل' تاریکی پر تاریکی مسلط ہے۔ آدمی اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی نہ دیکھنے پائے"۔

جب میں نے یہ آیت پڑھی' میرا دل تمثیل کی عمدگی اور انداز بیان کی واقعیت سے بے حد متاثر ہوا اور میں نے خیال کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ضرور ایسے شخص ہوں گے جن کے دن اور رات میری طرح سمندروں میں گزرے ہوں گے۔ لیکن اس خیال کے باوجود مجھے حیرت تھی اور پیغمبر اسلام کے کمالِ اسلوب کا اعتراف تھا کہ انہوں نے گمراہوں کی آوارگی اور ان کی جدوجہد کی بے حاصلی کو کیسے مختصر مگر بلیغ اور جامع الفاظ میں بیان کیا ہے گویا وہ خود رات کی تاریکی' بادلوں کی دبیز سیاہی میں موجوں کے طوفان میں ایک جہاز پر کھڑے ہیں اور ایک ڈوبتے ہوئے شخص کی بدحواسی کو دیکھ رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ سمندری سفروں کا کوئی بڑے سے بڑا ماہر بھی اس قدر کفتی کے الفاظ میں ایسی جامعیت کے ساتھ خطراتِ بحری کی صحیح کیفیت بیان نہیں کر سکتا۔

لیکن تحقیق کو اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد مجھے معلوم ہوا کہ محمد عربی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے اور انہوں نے زندگی بھر کبھی سمندر کا سفر نہیں کیا تھا۔ اس انکشاف کے بعد میرا دل روشن ہو گیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ یہ محمد کی آواز نہیں بلکہ اس خدا کی آواز ہے جو رات کی تاریکی میں ہر ڈوبنے والے کی بے حاصلی کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ میں نے قرآن کا دوبارہ مطالعہ کیا اور خصوصاً متعلقہ آیت کا خوب غور سے تجزیہ کیا۔ اب میرے سامنے مسلمان ہوئے بغیر کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ چنانچہ شرح صدر کے ساتھ کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔

●……●……●

فارض رحمت اللہ

(وینز ویلا)

اور یہ ہیں فارض رحمت اللہ۔ اسلام لانے سے پہلے فیادورایوان جفرز کہلاتے تھے۔ وینز ویلا (جنوبی امریکہ) کے شہر کاراکاس میں پیدا ہوئے۔ عمر ستائیس اٹھائیس سال کے لگ بھگ ہے۔ کولمبیا یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں اور فلمی صنعت کے ماہر۔ اپنی زندگی کے اوراق پلٹتے ہوئے انہوں نے کہا:

"میرا خاندان وینز ویلا سے ترک وطن کر کے امریکہ چلا گیا۔ جہاں میں نے اعلیٰ درسگاہوں میں تعلیم پائی۔ پھر میں نے اٹلی کی راہ لی۔ جہاں روما یونیورسٹی کے شعبہ فنون لطیفہ میں داخلہ لے لیا۔ کچھ مدت بعد امریکہ میں واپس آ گیا اور کولمبیا یونیورسٹی میں فلمی صنعت کے شعبے میں داخل ہو گیا۔

......اب میرا شعور خاصا پختہ ہو چکا تھا۔ مجھے امریکی معاشرے اور طلبہ کی زندگی میں شدید تناقض محسوس ہوا۔ اس تناقض پر جس قدر غور کرتا میرا احساس اسی قدر شدید ہو جاتا۔ یونیورسٹی سے نکل کر عملی زندگی میں آیا۔ نیویارک' ہالی وڈ' کیلیفورنیا اور شکاگو میں کام کیا۔ جہاں بھی گیا' وہاں کے شب و روز میں غرق ہو گیا۔ یہ زندگی مکمل عیش و عشرت کی زندگی تھی۔ کوئی مادی آسائش ایسی نہ تھی جو میسر نہ ہو۔ یہاں ایک اور بات کا تجربہ ہوا۔ امریکی فلمیں دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ لوگ جب انہیں دیکھتے ہیں تو ان کے دل میں یہ آرزو مچلنے لگتی ہے کہ امریکیوں کی سی شاندار زندگی بسر کریں اور اب بھی جب لوگوں کو پتہ چلتا ہے کہ میں امریکہ سے آیا ہوں تو ان کے پردۂ ذہن پر فلموں میں دیکھی ہوئی امریکی زندگی کے مناظر ابھرتے ہیں۔

مگر مجھے یہ زندگی یوں لگی جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ ایسا خواب جو اپنے پیچھے ہولناک تعبیر چھوڑ جاتا ہے۔ مجھے دنیا کی ہر متاع حاصل تھی اس کے باوجود میری زندگی

کھوکھلی اور بے بنیاد تھی۔ مجھے چاروں طرف دھوکے اور فریب کی دنیا پھیلی ہوئی نظر آتی۔ میرا جی چاہتا اس فریب زدہ زندگی کو چھوڑ چھاڑ کر کہیں دور نکل جاؤں' مگر کہاں؟ اس کا کوئی جواب میرے پاس نہ تھا۔ اس بیچارگی کا شدید ردِ عمل ہوا اور مَیں لہو و لعب اور شہواتِ نفسانی میں مزید ڈوب گیا اور ایسی پستیوں میں جا پہنچا کہ احساس ہونے لگا' مَیں فی الواقع جہنم میں آ گرا ہوں...... وہ جہنم جس میں داخل ہونے کے لئے ہر انسان بے قرار رہتا ہے......

اب میرے سامنے صرف دو راستے رہ گئے تھے۔ اس جہنم زار میں بدستور زندگی بسر کرتا رہوں یا کوئی اور طرزِ حیات اپنا لوں...... لیکن وہ نیا طرزِ حیات کون سا ہو سکتا ہے؟ اس سوال نے مجھے ایک تکلیف دہ صورتحال سے دوچار کر دیا اور پھر ایک روز دل کی گہرائیوں سے روشنی کی کرن نمودار ہوئی جو رفتہ رفتہ سرگوشی میں ڈھل گئی۔ ''زندگی کے جس راستے کی تمہیں تلاش ہے وہ مذہب ہی دکھا سکتا ہے۔''

مَیں پیدائشی کیتھولک تھا۔ مَیں نے نیویارک کے مختلف مدارس میں کیتھولک تعلیم حاصل کی تھی۔ اب جو اس مذہب کا پختہ شعور کے ساتھ مطالعہ کیا تو مجھے اس سے نفرت ہو گئی۔ پھر بدھ مت' ہندومت اور مختلف اصنام پرست مذاہب کا مطالعہ کرتا رہا' لیکن ان میں سے کوئی بھی میرے ذہن و قلب کے اضطراب کا مداوا نہ کر سکا۔ رہا اسلام' تو اس مدت میں مجھے اس کی خبر تک نہ ہو سکی۔ امریکہ میں آپ کو اسلام کے سوا ہر مذہب پر بے شمار کتابیں مل سکتی ہیں۔ اسلام پر کوئی کتاب کیوں آسانی سے نہیں ملتی' اس کے دو سبب ہیں:

اول یہ کہ یہودی تنظیمیں' ذرائع ابلاغ' صحافت' سینما' تھیٹر اور لائبریریوں ہر شے پر چھائی ہوئی ہیں۔ وہ پوری کوشش کرتی ہیں کہ اسلام کی تعلیمات لوگوں تک اپنی حقیقی شکل و صورت میں نہ پہنچنے پائیں۔

دوم۔ یہاں زیادہ تر مسلمان کالے ہیں اور کالوں کو امریکی گورے شیطان یا موت سے کم نہیں سمجھتے۔ یونیورسٹیوں میں بھی کالے ہی اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہی امریکہ میں انقلاب کے ہراول بنے ہوئے ہیں' جس سے عام امریکی سخت خائف ہیں۔ اس طرح وہ اسلام کو بھی خطرناک دین سمجھنے لگے ہیں۔

بہرحال مَیں نے جن مذاہب کا مطالعہ کیا ان کے دامن میں مجھے اپنی بیمار روح کی

شفایابی کا کوئی سامان نہ ملا۔ آخر اللہ کی طرف رجوع کیا اور اس سے دعائیں مانگنے لگا کہ وہ مجھے ہدایت بخشے اور گمراہی کی اس ہولناک دلدل سے نکالے۔ دعا مانگتے مانگتے مَیں (شاید اپنی فطرت کے تقاضے سے) سجدے میں گر جاتا۔ ایک مرتبہ مَیں اسی طرح سجدے میں پڑا دعا مانگ رہا تھا کہ لوگوں نے دیکھ لیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو مسلمان وہی کچھ اپنی نماز میں کرتے ہیں۔

تجسس کا شعلہ میرے دل میں بھڑک اٹھا' ذرا اسلام کا مطالعہ بھی کر دیکھوں۔ مطالعے کا آغاز ناقدانہ انداز میں کیا۔ پھر رہ رہ کر مایوسی بھی آلیتی۔ دوسرے مذاہب کی طرح اس کے دامن میں بھی کیا خبر کچھ ملے گا یا نہیں؟ لیکن رفتہ رفتہ مایوسی کی جگہ امید اور ناقدانہ انداز کی جگہ خوشگوار حیرت نے لے لی۔ علامہ یوسف علی کا ترجمۂ قرآن پڑھا تو مجھے اپنے نفس کی گرہیں کھلتی ہوئی دکھائی دیں۔ قرآن کے معانی دل کی گہرائیوں میں نقش ہوتے چلے گئے۔ یوں محسوس ہوا جیسے میری فطرت اسی طریقِ زندگی کی تلاش میں تھی۔ قرآن کے مطالب پر غور و تدبر میں اضافے کے ساتھ ساتھ واضح ہوتا چلا گیا کہ اسلام کی تعلیمات انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں۔

اب وقت کا زیادہ حصہ قرآن پڑھنے اور سمجھنے میں گزرنے لگا۔ مَیں نے دیکھا اس مقدس کتابِ ہدایت میں میری روح کی ہر احتیاج کا سامان موجود ہے۔ چنانچہ مَیں مسلمان ہو گیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد مَیں نے اسلامی کتابوں کا بھی مطالعہ کیا۔ یہ مطالعہ جیسے جیسے بڑھتا گیا' نئے نئے حقائق منکشف ہوتے چلے گئے اور اسلامی نظامِ زندگی پر میرا یقین محکم ہو گیا۔ جس معاشرے میں پیدا ہوا اور پھر پروان چڑھا اس نے میری اخلاقی اور روحانی زندگی تباہ کر کے رکھ دی تھی' لیکن اسلام جو معاشرہ قائم کرتا ہے وہ نہ صرف روح کی احتیاج پوری کرتا ہے بلکہ مادی زندگی کو بھی معقول' معتدل اور متوازن بنیادوں پر استوار کرتا ہے اور انسان کی فلاح و کامیابی کا ضامن ہے۔ اسلام کے اس پہلو نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔

میری والدہ نے جب سنا کہ مَیں مسلمان ہو گیا ہوں اور مَیں نے انہیں اسلامی تعلیمات بتائیں تو وہ بھی حلقہ بگوش اسلام ہو گئیں۔

میں نے فارض بھائی سے پوچھا کیا وہ اپنے مسلمان بھائیوں کو کوئی پیغام دیں گے؟ کہنے لگے میں انہیں صرف ایک بات کہوں گا کہ مادی زندگی کی طرف دیکھنے کی بجائے اللہ نے ان کو دین حق کی صورت میں جو سرمایۂ حیات دیا ہے وہ اس کی طرف دیکھیں، اس کی تعلیمات اور احکام پر عزم وثبات سے عمل پیرا ہوں اور اس کو اپنی انفرادی واجتماعی زندگی میں نافذ کریں۔ مادی زندگی اور اس پر مبنی تمام نظریۂ حیات ناپائیدار اور ستم کیش ہیں اور محض شیطان کے پیدا کردہ۔ جاز اور راک اینڈ رول کی موسیقی میں گم ہونے کی بجائے وہ اس مترنم آواز کی طرف متوجہ ہوں جو مؤذن دن رات میں پانچ مرتبہ بلند کرتا ہے اور انہیں اللہ کی کبریائی اور فوز وفلاح کی زندگی اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ حی علی الصلوٰۃ۔ حی علی الفلاح۔

●......●......●

محترمہ فاطمہ ہیرین (جرمنی)

(FATIMA HEREEN)

میری پیدائش ۱۹۳۴ء میں ہوئی۔ اس زمانے میں جرمنی میں ایک نئے فیشن کی ابتدا ہوئی تھی۔ لوگ ہر طرح کے چرچ (کیتھولک یا پروٹسٹنٹ) کی رکنیت ترک کر کے GOTTG LUBIG مسلک اختیار کر رہے تھے۔ جس کا مطلب ہے خدا پر برائے نام اعتقاد تو رکھنا مگر اعمال کی بنیاد اور عمارت اس کے بالکل برعکس ہونا۔ میں سات برس کی تھی کہ ایک روز ایک بڑی عمر کی لڑکی نے مجھے بتایا کہ ''خدا کا کہیں وجود نہیں ہے''۔ اس عمر میں مجھے وہ لڑکی خاصی سمجھ دار لگتی تھی' اس لیے اس کی بات پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اس سے قبل مجھے یہ پتہ بھی چل گیا تھا کہ کرسمس کے موقع پر ''سانتا کلاز'' کے نام سے جو بوڑھا خدا کی طرف سے کھلونے لے کر آتا ہے' وہ محض بچوں کا بہلاوا ہے اور بس۔ ان دونوں باتوں سے مذہب اور خدا پر میرا ایمان اٹھ گیا اور یہ دنیا ہی میری توجہات کا مرکز بن گئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دوسری عالمگیر جنگ اپنے شباب پر تھی۔ دن رات بموں کے خوفناک دھماکے کانوں کے پردے پھاڑتے رہتے۔ ماں چوبیس گھنٹے فوجیوں کے لیے دستانے اور جرابیں بناتی اور باپ کبھی کبھار ایک دن کے لیے گھر آتا اور پھر ہفتوں کے لیے غائب ہو جاتا۔ ہمارے پڑوس میں ایک بہت بڑا مکان تھا جو زخمیوں کے ہسپتال میں تبدیل ہو چکا تھا۔ جنگ ختم ہوئی تو اجنبی قسم کے لوگوں نے ہمارے مکان پر قبضہ کر لیا۔ جنگ کے موضوع پر امریکی فلمیں عام طور پر دکھائی جانے لگیں جن کے مناظر مجھے رلا دیتے اور میرا دل پگھل کر موم ہو جاتا۔ ابھی میں یہ فیصلہ تو نہ کر سکی کہ حق پر کون ہے اور غلط کون؟

تاہم ہر چیز سے ظلم اور حماقت ٹپکتی نظر آنے لگی۔ ذہن میں بے شمار سوال پیدا ہوتے مگر کسی کے پاس ان کا تسلی بخش جواب نہ تھا۔ اب مجھے خدا بہت یاد آنے لگا مگر مصیبت یہ تھی کہ وہ کیتھولک چرچ میں نظر آتا تھا نہ پروٹسٹنٹ عقائد میں اور نہ بظاہر پارسا قسم کے پادریوں میں۔ پھر مسئلہ یہ بھی تھا کہ ان سارے عقائد کی بنیاد جن اصولوں پر قائم تھی وہ سراسر خلاف عقل اور ناممکنات میں سے دکھائی دیتے تھے اور جن تعلیمات کا پرچار کیا جاتا تھا وہ قطعی ناقابلِ عمل تھیں۔ ظاہر ہے میں اس عقیدے کو کیوں قبول کرتی کہ اگر میں اپنے گناہوں کا اقرار کر بھی کرلوں اور ان پر ندامت کا اظہار بھی، تب بھی مجھے سزا ضرور ملے گی۔

یہ بات کسی معجزے سے کم نہیں کہ جرمنی کی تمام لڑکیوں میں سے میں ہی وہ پہلی لڑکی تھی جو ایک ایسے یورپین نوجوان سے ملی جس نے سات برس پہلے اسلام قبول کر لیا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں میں نے اس سے مذہب کے بارے میں دریافت کیا اور جب مجھے پتہ چلا کہ وہ اسلام کا پیروکار ہے تو میں نے اسلام کے متعلق جاننے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ اُن دنوں تمام مذاہب کی طرف سے مایوس ہو کر میں روحانی طور پر اپنے آپ کو زخم خوردہ محسوس کر رہی تھی۔ چنانچہ جب اس نوجوان نے لفظ اسلام کے معنی کی وضاحت کی یعنی بغیر کسی خارجی جبر کے اللہ کی حاکمیت کے آگے سر جھکا دینا تو یوں لگا جیسے میرے اندر کوئی روشنی سی کروٹیں لینے لگی ہے۔ پھر اس نے مجھے بتایا کہ دنیا کی تمام مخلوقات یعنی انسان، حیوانات، اشجار وغیرہ اکل و شرب، افزائشِ نسل اور دیگر مادی ضروریات کی حد تک سختی کے ساتھ قوانینِ الٰہی کی پابند ہیں اور یوں بنیادی طور پر مسلمان ہیں۔ اگر ان امور میں وہ خدائی قوانین کی خلاف ورزی کریں گے تو اپنا وجود کھو بیٹھیں گے۔ یہ صرف انسان ہے جو روحانی طور پر بھی مسلمان ہونے کی اہلیت رکھتا ہے اور اس معاملے میں اس پر کوئی جبر نہیں ورنہ جہاں تک مادی ضرورتوں کا تعلق ہے وہ بھی خدا کے قانون کا اسی طرح پابند ہے جس طرح دیگر مخلوقات۔

یہ منطق بڑی زبردست تھی۔ اسے کوئی بھی عقلِ سلیم کا مالک جھٹلا نہیں سکتا۔ اسلام کی دیگر تعلیمات میں مجھے عقلِ عام (COMMON SENSE) کی یہی کارفرمائی نظر آئی۔ اس کے بعد میں نے جرمن زبان میں اسلام پر وہ ساری کتابیں پڑھ ڈالیں جو غیر

متعصب اور منصف مزاج مصنفین نے لکھی تھیں۔ خصوصاً محمد اسد کی کتاب ''اے روڈ ٹو مکہ'' نے میرے ذہن پر گہرے اثرات مرتب کیے اور مجھے پتہ چل گیا کہ اسلام کی ہر تعلیم اپنے پس منظر میں کوئی نہ کوئی زبردست حکمت رکھتی ہے۔ ساتھ ہی متذکرہ نوجوان جواب میرے شوہر تھے' کے لیکچر بھی جاری رہے۔ وہ ہر سوال کا جواب شرح وبسط کے ساتھ دیتے حتیٰ کہ خدا نے مجھے کلی اطمینان قلب عطا فرما دیا اور میں مسلمان ہو گئی۔

قلبی طور پر تو میں پہلے ہی مسلمان تھی۔ اب میں نے اندازہ کرنا چاہا کہ آیا میں اسلامی قوانین پر عمل بھی کر سکتی ہوں یا نہیں۔ چنانچہ قبول اسلام کے بعد ۱۹۵۹ء کا پہلا رمضان آیا تو میں نے روزے رکھنے کا عزم کر لیا۔ اس وقت تک مجھے یہ کام سب سے مشکل اور سخت لگتا تھا مگر خدا کا شکر ہے کہ میں نے سارے روزے پابندی سے رکھے اور یوں مجھے احساس ہو گیا کہ جب کوئی کام اللہ کی محبت کے ساتھ کیا جاتا ہے تو وہ اتنا مشکل نہیں رہتا جتنا شروع میں دکھائی دیتا ہے۔

میرے قبول اسلام کے بعد ہم دونوں میاں بیوی نے جرمنی چھوڑ کر کسی اسلامی ملک میں چلے جانے کا ارادہ کر لیا۔ ہمیں شدت سے احساس ہوا کہ جب تک ہم مالی طور پر آزاد وخود مختار نہیں ہوں گے ہم یہاں اسلامی اصولوں پر عمل نہیں کر سکتے۔ مثال کے طور پر میرے خاوند ایک فرم میں ملازم تھے۔ انہوں نے ظہر کی نماز کے لیے صرف پندرہ منٹ کی چھٹی کر لی تو ان کی ملازمت خطرے میں پڑ گئی۔ پھر ان کے دفتر میں تین لڑکیاں سیکرٹری کی حیثیت سے کام کرتی تھیں اور پردے کے اسلامی تقاضے سخت مجروح ہوتے تھے۔ خود میرے لیے اس سوسائٹی میں باپردہ ہونا سخت دشوار بن گیا۔

ہم نے کئی اسلامی ملکوں میں ہجرت کرنے کی کوشش کی اور بالآخر یہ پاکستان تھا جہاں ہمیں پناہ ملی۔ یہاں میرے خاوند کو ایک معقول ملازمت مل گئی اور ہم اس نئے وطن میں چلے آئے۔ میں نے اپنی والدہ' والد' بھائیوں اور بہنوں کو چھوڑا تھا' وطن اور اس کی رنگینیوں کو خیر باد کہا تھا اور یورپین معاشرے کی تمام تر آزادیوں' لذتوں اور راحتوں کو ٹھوکر ماری تھی مگر میں بہت خوش تھی اور ناقابل بیان قسم کا روحانی سکون محسوس کر رہی تھی۔

یہ ساری داستان سنانے کا واحد مدعا یہ ہے کہ مغرب کی ساری چمک دمک اور خوشحالی

اسلام کی نعمتِ خداوندی کے سامنے قطعی ہیچ ہے۔ اسی میں روحانی خوشی ہے' اسی میں دنیاوی برکتیں ہیں اور اسی میں اخروی نجات ہے۔

●......●......●

وضاحت: محترمہ فاطمہ ہیرین اور ان کے خاوند ڈاکٹر عمر عبدالعزیز کراچی آ کر مقیم تو ہو گئے مگر افسوس کہ وہ یہاں کے ماحول سے سخت بددل ہوئے اور چند ہی سالوں کے بعد واپس جرمنی چلے گئے اور آج کل وہیں دعوت و تبلیغ میں مصروف ہیں۔ محترمہ فاطمہ ہیرین نے مولانا مودودیؒ کی ''دینیات'' کے علاوہ متعدد دینی کتابوں کا جرمن میں ترجمہ کیا ہے۔ دونوں میاں بیوی آج بھی راسخ العقیدہ اور باعمل مسلمان ہیں۔

علامہ محمد اسد (پولینڈ)

نامور مصنف، ممتاز عالمِ دین اور مبلغ علامہ محمد اسد (سابق لیوپولڈ ویس) ۱۹۲۶ء میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ تقریباً چھ برس تک مدینہ منورہ اور سعودی عرب کے دیگر شہروں میں مقیم رہے اور اس دوران میں سلطان ابنِ سعود کا خصوصی تقرب حاصل کیا۔ پھر برصغیر میں آگئے اور سالہا سال شاعرِ اسلام علامہ اقبال کے قریب رہنے کا شرف حاصل کیا۔ کچھ عرصہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ہمراہ دارالاسلام (پٹھانکوٹ) میں گزارا۔ قیامِ پاکستان کے بعد انہیں حکومت کی زیرِ سرپرستی ایک جدید محکمہ "اسلامی تعمیرِ جدید" کی تنظیم و نگرانی پر مامور کیا گیا۔ ازاں بعد ان کی خدمات محکمہ خارجہ کو منتقل کر دی گئیں اور ان کا تقرر وزارتِ خارجہ میں شعبۂ مشرقِ وسطیٰ کے افسرِ اعلیٰ کی حیثیت سے ہوا۔ آخر میں وہ اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے وفد اور اس کی مہم سے متعلق بھی رہے۔ بعد میں وہ مراکش چلے گئے اور اپنے آپ کو دینی تصنیف و تالیف کے لئے وقف کر دیا۔ موصوف کئی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ "اسلام ایٹ دی کراس روڈز" اور "اے روڈ ٹو مکہ" ان کی معروف تصانیف ہیں۔ انہوں نے قرآنِ پاک کا انگریزی ترجمہ کیا اور حواشی بھی لکھے۔ نیز صحیح بخاری کے مختلف حصوں کو بھی انگریزی میں منتقل کیا۔ علامہ محمد اسد نے بھرپور علمی، دینی اور تبلیغی زندگی بسر کی اور مارچ ۱۹۹۲ء میں سپین میں وفات پائی۔ ذیل کا مضمون ان کی خود نوشت "اے روڈ ٹو مکہ" کی تلخیص پر مشتمل ہے۔

میں ۱۹۰۰ء میں پولینڈ کے ایک یہودی ربی خاندان میں پیدا ہوا۔ میرا بچپن شہر لووو (LOWOW) میں گزرا جو اس وقت آسٹریا کے قبضے میں تھا۔ میرے دادا ربی (یہودی

مذہبی عالم) تھے اور ان کی زبردست خواہش تھی کہ میرے والد بھی ربی بنیں، مگر ایسا نہ ہو سکا اور وہ قانون کی تعلیم حاصل کر کے وکیل بن گئے۔ میرے والد مجھے ریاضی اور طبیعیات پڑھا کر سائنس دان بنانا چاہتے تھے، مگر میں ان کی توقعات پر پورا نہ اترا۔ مجھے سائنسی مضامین کی بجائے عمرانیات سے دلچسپی تھی۔

خاندانی روایات کے مطابق میں نے بچپن میں عبرانی اور آرامی زبانیں سیکھیں اور تلمود، بائبل اور فارغوم جیسی مذہبی کتابوں کی تعلیم حاصل کی۔ اس زمانے میں میں مختلف مذہبی کتابوں کے فرق پر اعتماد کے ساتھ بحث کر سکتا تھا۔

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو میں اسکول کا طالب علم تھا۔ میں اسکول سے بھاگا اور جعلی نام سے فوج میں بھرتی ہو گیا۔ مگر میرے والد کی شکایت پر کم عمری کی وجہ سے مجھے واپس بھیج دیا گیا۔ جنگ کے خاتمے کے بعد دو سال تک میں ویانا یونیورسٹی میں فلسفہ اور آرٹ کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔

جوں جوں میرے شعور کی آنکھیں کھلتی گئیں، میں نے شدت سے محسوس کرنا شروع کیا کہ سارا یورپ زبردست روحانی بے قراری میں مبتلا ہے۔ مذہبی اور روحانی قدریں تحلیل ہو رہی تھیں۔ زر پرستی اور مادیت کے جھنڈے بڑی تیزی سے گڑ رہے تھے۔ خطرہ اور خوف ہر فرد بشر پر مستولی تھا۔ خصوصاً نوجوان نسل گھور اندھیروں میں سرگرم عمل تھی اور ان سوالات کا کسی کے پاس کوئی جواب نہ تھا جنہوں نے نوجوان ذہنوں کو سخت پریشان کر رکھا تھا۔ طول طویل جنگ نے رہی سہی کسر نکال دی تھی اور معاشی پریشانیوں اور سماجی افراتفری نے یورپ کے انسان کو ایک ایسے خلا میں پھینک دیا تھا جہاں بے یقینی، نفسانفسی، خودغرضی، دنیا پرستی اور عارضی لذت اندوزی کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں اکثر سوچتا کہ کیا انسان کی احتیاج محض روٹی ہے اور کیا زندگی کا مقصد صرف مادی خواہشات کو پورا کرنا ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ یورپ صرف مادی ترقی کے بل پر روحانی خلا کو پُر کرنا چاہتا ہے، حالانکہ یہ طریق علاج اصل بیماری یعنی بے اطمینانی اور بے قراری کو مزید بڑھانے کا سبب بن رہا تھا۔ میں یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا مگر میرے دل میں یہ خیال کبھی نہ آیا اور شاید میری طرح کوئی بھی اس نہج پر نہیں سوچتا تھا کہ یورپ کے ثقافتی تجربات کا سہارا ترک

کئے بغیر ان سوالات کا جواب پالینا ممکن نہ تھا۔ یورپ ہی ہماری فکر کی ابتدا تھا اور وہی انتہا۔

میری بے اطمینانی میں برابر اضافہ ہوتا گیا حتیٰ کہ میرے لئے تعلیم جاری رکھنا مشکل ہوگیا۔ میں نے یونیورسٹی کو خیر باد کہنے اور صحافت کے میدان میں قسمت آزمانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس مقصد کے لئے ۱۹۲۰ء کی گرمیوں میں ویانا چھوڑ کر پراگ چلا گیا۔
پراگ میں مجھے بہت دنوں تک بے روزگاری اور فاقہ کشی کا سامنا کرنا پڑا۔ اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے لئے سخت تگ ودو کرنی پڑی۔ تب کہیں جا کر میں ایک خبر رساں ایجنسی ''یونائٹڈ ٹیلیگراف ایجنسی'' میں پہلے ٹیلی فونسٹ اور پھر رپورٹر بن گیا۔ اس طرح مسلسل جدوجہد کے بعد صحافتی دُنیا نے مجھے آخر قبول کر ہی لیا۔
مگر وقت کے ساتھ ساتھ میرا سکون ختم ہوگیا۔ مجھے اپنی زندگی کا صحیح مقصد معلوم نہ تھا اور میں نہیں جانتا تھا کہ سچی ذہنی مسرت کیسے اور کہاں سے حاصل کروں؟ میرے بیشتر نوجوان دوستوں کی یہی کیفیت تھی۔ ان میں سے کوئی بھی بدقسمت یا مصیبت زدہ نہ تھا، مگر حقیقی اطمینان اور سکون سے سبھی محروم تھے۔ بار بار احساس ہوتا تھا کہ ہم کسی اندھے جنگل میں محوِ سفر ہیں جہاں درندوں کا خوف بھی لاحق ہے اور منزل کا سراغ بھی نامعلوم۔

میرے ایک ماموں ''ڈوریاں'' بیت المقدس کے ہسپتال میں ذمہ دار آفیسر تھے۔ ۱۹۲۲ء کے موسمِ بہار میں انہوں نے خط لکھ کر مجھے اپنے پاس بلا بھیجا۔ میں نے یہ دعوت فوراً قبول کرلی اور سمندری جہاز کے ذریعے ایک دن مصر کی بندرگاہ اسکندریہ جا پہنچا جہاں سے میں نے ٹرین کے ذریعے بیت المقدس کا سفر اختیار کیا۔
ہماری ٹرین صحرائے سینا سے گزر رہی تھی۔ میں بے حد تھکا ہوا تھا مگر ٹرین کی لڑکھڑاہٹ اور بے ہنگم شور کی وجہ سے میں رات بھر ایک لمحہ کے لئے بھی نہ سوسکا۔ میرے سامنے والی سیٹ پر ایک بدو...... ایک بڑی سی عبا میں لپٹا ہوا بیٹھا تھا۔ سر کے پاس پڑی ہوئی تلوار اس کے گھٹنوں تک پہنچ رہی تھی اور مفلر کے باوجود بھی وہ سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔

صبح ہوئی اور ٹرین ایک جھٹکے سے ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی۔ بدو نے اپنا مفلر کھولا تو پہلی بار مجھے اس کا چہرہ نظر آیا۔ اس کا رنگ سانولا اور چہرہ عقابی تھا۔ اس نے خوانچہ فروش سے ایک روٹی خریدی۔ اپنی جگہ بیٹھ کر اس روٹی کے دو ٹکڑے کیے اور ایک مجھے دینے لگا۔ میرے تردّد اور تعجب پر وہ مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ بھی اس کے چہرے پر اسی طرح موزوں تھی جس طرح عزم اور قوتِ ارادی۔ اس نے ایک لفظ کہا جس کا مفہوم اس وقت تو میں نہیں سمجھا مگر اب سمجھتا ہوں۔

"تفضل" یعنی نوش فرمایئے۔ مَیں نے وہ ٹکڑا لے لیا اور سر کے اشارے سے اس کا شکریہ ادا کیا۔ یورپین لباس میں ملبوس ترکی ٹوپی والے ایک مسافر نے رضا کارانہ طور پر ترجمانی کے فرائض انجام دیے اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھے بتایا کہ "یہ کہتے ہیں کہ آپ بھی مسافر ہیں اور میں بھی مسافر ہوں اور ہم دونوں کا راستہ ایک ہے"۔

جب مَیں اس معمولی واقعہ پر غور کرتا ہوں تو میرا دل کہتا ہے کہ عربی اخلاق سے میری وابستگی اور محبت کی بنیاد یہیں سے پڑی تھی۔ اس بدو کے رویّہ میں، جس نے اجنبیت کی تمام دیواروں کے باوجود اپنے رفیقِ سفر کو اپنی آدھی روٹی دے دی تھی' انسانیت کی ایک ایسی تصویر اور جھلک تھی جو ہر تصنع اور تکلف سے پاک تھی۔

گاڑی غزہ پہنچی تو میرے بدو ساتھی نے اپنا سامان سمیٹا۔ ایک باوقار مسکراہٹ کے ساتھ سر کے اشارے سے مجھے سلام کیا اور باہر چلا گیا۔ باہر پلیٹ فارم پر اس کے استقبال کے لئے دو بدو کھڑے تھے۔ انہوں نے اس سے بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا پھر سب نے ایک دوسرے کے رخسار کا بوسہ لیا۔ مَیں نے خلوص اور محبت کی یہ فضا دیکھی تو میرے اندر ان کی زندگی کو سمجھنے کی شدید خواہش پیدا ہو گئی۔

بیت المقدس میں' مَیں نے اپنے روبرو زندگی کا ایک ایسا مفہوم پایا جو میرے لئے یکسر نیا تھا۔ روحانی خراشوں اور اذیتوں سے ناآشنا۔ وہ اذیتیں' جنہوں نے خوف' حرص اور گھٹن کا بھوت بن کر مغربی زندگی کو بے حد بھدا' بے ہنگم اور کریہہ المنظر بنا دیا تھا۔ مَیں عربوں میں وہ چیز پانے لگا' جس کی غیر شعوری طور پر مجھے ایک عرصہ سے تلاش تھی' جس کو ہم زندگی کے تمام مسائل میں ایک خاص قسم کی جذباتی لطافت اور بلند تر حسی شعور سے تعبیر

کر سکتے ہیں۔ یہاں اپنے ماموں کے گھر کے عین سامنے ایک کھلے صحن میں عربوں کو دن میں کئی مرتبہ نماز پڑھتے دیکھتا تھا۔ ان کی باوقار حرکات و سکنات اور غیر معمولی ڈسپلن نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا۔ اسلامی طریق عبادت کے بارے میں ان کے امام سے میری جو گفتگو ہوئی سچی بات یہ ہے کہ اس نے میرے لئے اسلام کا پہلا دروازہ کھول دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس وقت میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اسلام کبھی میرا دین بھی بن سکتا ہے۔

۱۹۲۲ء کے اواخر کی بات ہے جرمنی کے اخبار فرانکفرٹر نے مجھے مشرقِ وسطیٰ کے لئے اپنا گشتی نمائندہ مقرر کر دیا اور یوں مجھے دیگر ممالک کی سیاحت کا موقع ہاتھ آ گیا اور اسی فرض نے مجھے عربوں کی زندگی اور مسائل کو زیادہ گہرائی سے پرکھنے پر آمادہ کیا اور میں نے غیر جانبداری سے محسوس کیا کہ یورپ کی ساری طاقتیں یکساں طور پر مسلمانوں کو اپنے ظلم کا نشانہ بنا رہی ہیں اور انہیں مذہبی' تہذیبی' سماجی' اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے مفلوج کر کے ان کی عزت اور خودداری کو ختم کرنے کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ خصوصاً فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کے معاملے میں انگریزوں کی پالیسی سراسر غیر انسانی اور بین الاقوامی بددیانتی پر مبنی ہے۔

۱۹۲۳ء میں' میں مصر آ گیا۔ گزارے کی خاطر مجھے ایک جز وقتی ملازمت مل گئی اور ایک قدیم محلے میں مختصر سا مکان لے کر گزر بسر کرنے لگا۔ میرے گھر کے بالکل سامنے پکے مینار کی ایک چھوٹی سی مسجد تھی جہاں پنج وقتہ نماز کے لئے اذان ہوتی تھی۔ سفید عمامہ باندھے ہوئے ایک شخص مینارہ پر اللہ اکبر' اللہ اکبر' اشھد ان لا الہ الا اللہ کی صدا بلند کرتا۔ یہ آواز پرسوز تھی اور بارعب بھی۔ صاف احساس ہوتا تھا کہ وہ آرٹ یا فن نہیں تھا بلکہ ایمان اور غیرت کا جوش تھا جس نے اذان میں اتنا حسن بھر دیا تھا۔ اندازہ ہوا کہ یہ بات قاہرہ تک محدود نہیں' بلکہ ساری اسلامی دنیا میں مشترک ہے۔ یوں میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مسلمانوں کا اندرونی اتحاد' یکسانیت اور ہم آہنگی کتنی گہری ہے اور انہیں تقسیم اور متفرق کرنے کی چیزیں کتنی مصنوعی' سطحی اور بے اثر۔ مجھے ایسا لگا کہ میں نے پہلی بار ایک ایسی

سوسائٹی میں قدم رکھا ہے جس میں انسان کے درمیان رشتہ و تعلق کی بنیاد اقتصادی مصلحتوں یا رنگ و نسل پر نہیں بلکہ اس سے زیادہ گہری، مضبوط اور پائیدار چیز پر تھی اور وہ زندگی کے متعلق اس مشترک نقطہ نظر کا رشتہ تھا جس نے انسانوں کے درمیان سے علیحدگی اور بے تعلقی کی دیواروں کو گرا دیا تھا۔

۱۹۲۳ء کی گرمیوں میں، مَیں واپس بیت المقدس گیا اور وہاں سے دمشق کا قصد کیا۔ بیت المقدس میں میری ملاقات ایک دمشقی مدرّس سے ہوئی تھی اور اس نے مجھے دمشق آنے کی دعوت دی تھی۔ یہاں مجھے عربوں کے اندرونی سکون و اطمینان کا سراغ مل گیا۔ دراصل یہ اس معاشرت اور برتاؤ کا نتیجہ تھا جو وہ ایک دوسرے کے ساتھ کرتے تھے۔ یہاں ایک دکاندار اپنے پڑوسی دکاندار کی غیر حاضری میں جس ایثار اور دیانت کے ساتھ اس کی قائم مقامی کرتا تھا وہ حد درجہ حیرت انگیز تھا۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں ملبوس یہ لوگ وقار اور طمانیت کا پیکر تھے۔ وہ فضول باتیں نہیں کرتے تھے، خودداری، تواضع اور ذکاوتِ احساس ان کے خاص وصف تھے۔

جمعہ کے روز دمشق میں زندگی کا نقشہ خاصا بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ خوشی اور مسرت اور رعب و دبدبہ کی ایک ملی جلی فضا شہر پر طاری رہتی تھی۔ اس روز مجھے یورپ کا اتوار یاد آ جاتا۔ خالی دکانیں، گھٹن اور انقباض کی اداس کن فضائیں -- میں نے غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ یورپ میں روزمرہ کی زندگی لوگوں کے لئے ایک بھاری بوجھ بن چکی ہے جس سے وہ اتوار کو چھٹکارا حاصل کرتے ہیں اور مصنوعی طریقے سے مسرت پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ایک پُرفریب بھول میں گرفتار ہیں جس کے لئے وہ ہفتے کے چھ دن منتظر رہتے ہیں۔ جبکہ اس کے برعکس مسلمانوں کے لئے جمعہ کاموں سے فرار کا دن نہیں، وہ چند گھنٹوں کے لئے دکانیں کھولتے ہیں، پھر نماز پڑھتے ہیں، قہوہ خانوں میں بیٹھ کر ہلکی خوش گپیاں کرتے اور دوبارہ کاروبار میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

ایک جمعہ کو مَیں اپنے میزبان کے ساتھ جامع اموی میں گیا۔ قیام، رکوع، اور سجدوں

میں یہ لوگ جس طرح خشوع وخضوع کا مظاہرہ کرتے اور اپنے امام کی اقتدا کر رہے تھے اس سے مجھے خدا اور دین سے ان لوگوں کے قرب اور تعلق کا اندازہ ہوا۔ ان کی نماز ان کی روز مرہ زندگی سے الگ نظر نہیں آتی تھی' بلکہ وہ اس کا ایک حصہ تھی۔ وہ زندگی کو بھلانے کے لئے نہیں' بلکہ اس میں خدا کی یاد شامل کرنے اور اسے زیادہ بہتر طریقے سے بسر کرنے کے لئے پڑھی جاتی ہے۔

مسجد سے نکلتے ہوئے میں نے اپنے دوست سے کہا کہ کتنی حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ آپ لوگ خدا کو اس حد تک قریب سمجھتے ہیں۔ میری آرزو ہے کہ میں بھی اسی طرح سمجھ سکوں۔

''ہاں کیوں نہیں'' میرے میزبان نے کہا ''اس کے سوا اور چارہ بھی کیا ہے۔ خدا خود کہتا ہے کہ وہ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے''۔

اس نئے احساس اور نئی فکری دریافت کا مجھ پر گہرا اثر ہوا۔ چنانچہ دمشق میں میں نے اپنا بیشتر وقت اسلامی کتابوں کے مطالعے میں صرف کیا۔ میں عربی میں معمولی شد بد حاصل کر چکا تھا۔ قرآن کے جرمن اور فرانسیسی ترجموں سے بھی کام لیا اور اپنے دوست سے بھی گفتگو کرتا رہا۔ نتیجۃً یہ ہوا کہ میری نگاہوں سے ایک پردہ سا ہٹ گیا۔ میں افکار کی ایک ایسی دنیا کا مشاہدہ کر رہا تھا جس سے اب تک میں مطلق ناواقف تھا۔

اسلام میرے سامنے مذہب کے ایک روایتی اور اصلاحی مفہوم سے زیادہ زندگی کا ایک نظام بن کر آیا۔ وہ مجھے لاہوتی نظام سے زیادہ شخصی اور اجتماعی سلوک کا ایک پروگرام اور لائحہ عمل معلوم ہوا جس کی بنیاد خدا کی یاد پر تھی۔ میں نے قرآن میں کسی جگہ ''چھٹکارے'' کا تصور نہیں دیکھا۔ وہاں کوئی پہلا موروثی گناہ بھی نہیں تھا جو انسان اور اس کی تقدیر کے درمیان حائل ہو گیا ہو۔ وہاں تو تھا لَیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی یعنی انسان جیسی کوشش کرے گا ویسا ہی پھل پائیگا۔ وہ کسی کی رہبانیت اور فطرت کشی کا بھی طالب نہ تھا جس کے ذریعے طہارت اور تقدس کا کوئی خفیہ دروازہ کھل جاتا ہے اس لئے کہ قرآن کے نزدیک طہارت اور پاکیزگی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے اور گناہ صرف انسان کی منفی فطرت کی ایک لغزش ہے۔ وہاں فطرت انسانی کی کوئی تقسیم نہیں ملتی اس لئے کہ اس کے

نزدیک روح اور جسم مل کر ایک صحیح اور مکمل یونٹ بناتے ہیں۔

ابتدا میں' میں یہ دیکھ کر بہت پریشان ہوا کہ قرآن زندگی کے بعض بظاہر حقیر شعبوں کا ذکر بھی اہتمام کے ساتھ کرتا ہے لیکن بعد میں یہ بات میری سمجھ میں آ گئی۔ ظاہر ہے اگر انسان روح اور جسم کا مجموعہ ہے تو پھر اس کی زندگی کے کسی شعبے اور پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس کو دین کے دائرۂ عمل سے خارج کیا جا سکتا ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ قرآن ایک لمحہ کے لئے بھی یہ فراموش کرنے کے لئے تیار نہیں کہ دنیا بہر حال انسان کی ترقی کے سفر کا ایک مرحلہ ہے۔ اس سفر کی آخری منزل روحانی ترقی ہے۔ مادی خوشحالی قرآن کے نزدیک مستحسن اور مستحب ہے مگر بذاتِ خود مقصود نہیں اس لئے انسان کی نفسانی خواہشات کو ان کی اہمیت و ضرورت کے باوجود اخلاقی حس کے مقابلے میں دبایا جاتا ہے۔ اسلام کا نقطۂ نظر ہے کہ یہ اخلاقی حس صرف خدا اور بندے کے مابین ہی محدود نہیں رہنی چاہئے' بلکہ اس کا دائرہ انسانوں کے باہمی تعلقات تک وسیع ہونا چاہئے۔ اس کا مقصد صرف فرد کی روحانی تکمیل نہ ہو بلکہ سوسائٹی میں ایسے حالات پیدا کرنا بھی اس کا مقصود ہے جو دوسرے انسانوں کو روحانی ترقی اور نشو و نما کے لئے سازگار ماحول اور فضا مہیا کریں جن کے سائے میں وہ مکمل اور پُرسکون زندگی گزارنے کے قابل ہو جائیں۔ میں نے صاف محسوس کیا کہ روحانی مسائل کے سلسلے میں قرآن کا طریقہ عہدِ قدیم کے طریقے سے کہیں زیادہ گہرا ہے۔ یہاں کسی خاص قوم کی پاسداری نہیں۔ مادی مسائل میں اس کا طریقہ عہدِ جدید کے برعکس بہت زیادہ ایجابی ہے۔ روح اور جسم اس کی نظر میں انسانی زندگی کے دو ایسے رخ ہیں جو یکساں اہمیت کے حامل ہیں۔

میں نے اپنے دل میں سوال کیا کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ تعلیمات اس قلبی طمانیت (EMOTIONAL SECURITY) کا باعث ہوں جن کا میں نے عربوں میں رہ کر مشاہدہ کیا ہے؟

۱۹۲۳ء کے موسم خزاں میں' میں شام سے یورپ روانہ ہو گیا۔ یورپ کے مناظر اب مجھے اجنبی لگ رہے تھے۔ اب مجھے یہاں کے لوگ بہت مکروہ اور حقیر دکھائی دیتے تھے۔ ان کی حرکات بہت بھدی اور پھوہڑ نظر آتی تھیں جن میں ان کے ارادہ و شعور کا کوئی

دخل نہ تھا۔ اگرچہ وہ اس امر کی نمائش کرتے تھے کہ وہ ہر کام پورے شعور کے ساتھ کرتے ہیں، مگر درحقیقت وہ کسی قسم کے مقصد اور نصب العین کے بغیر برابر اندھے راستوں پر چلے جا رہے تھے۔ اس مرتبہ میں نے پہلی بار عیسائیت کا مطالعہ کیا اور اسے سمجھنے کی کوشش کی، مگر اس اعتبار سے بہت جلد مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کہ عیسائیت جسم و روح اور عقیدہ و عمل کے درمیان افسوسناک تفریق کا حامل ہے اور گوناگوں مسائل سے لبریز، اس زمانے کے انسانوں کی رہنمائی کرنے سے قطعی قاصر۔

۱۹۲۴ء کے موسمِ بہار میں ''فرانکفرٹر'' کی طرف سے دوبارہ مصر گیا۔ اس وقت تک صحافتی دنیا میں میرا ایک مقام بن چکا تھا، اس لئے مجھے گرانقدر مشاہرے کی پیشکش کی گئی تھی۔ یہاں پہنچا ہی تھا کہ رمضان کا چاند طلوع ہوا اور مسلسل ایک ماہ تک سارا ماحول خاص قسم کی پاکیزگی اور تقدس میں ڈوبا رہا۔ نماز کے بعد میں روزوں کی حکمت پر جتنا غور کرتا رہا، اتنا ہی اسلام کی عظمت کا قائل ہوتا گیا۔ اس ضمن میں الازہر کے نوجوان اور متبحر عالمِ دین شیخ مصطفیٰ المراغی سے بھی تفصیلاً گفتگو ہوئی۔ انہوں نے بڑی صاف بیانی سے بتایا کہ موجودہ مسلمانوں نے اعلیٰ اسلامی تعلیمات اور اصولوں سے روگردانی کر لی ہے اور اس سے بڑی غلطی کوئی نہ ہوگی کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیغام کی قوتوں اور وسیع امکانات کو موجودہ مسلمانوں کی زندگی اور طرزِ فکر کے پیمانہ سے جانچا جائے۔ بالکل اسی طرح جس طرح یہ غلطی ہوگی کہ ہم عیسائیوں کے خلافِ محبت اور خلافِ رواداری کاموں کو دیکھ کر مسیح علیہ السلام کے پیغامِ محبت کو قصوروار قرار دینے لگیں۔

شیخ مراغی نے لگی لپٹی رکھے بغیر بتایا کہ علمائے اسلام کی اکثریت لکیر کی فقیر بن چکی ہے اور ان میں تجدید و احیائے دین کا جذبہ دم توڑ چکا ہے اور یہی امت کے زوال کا بنیادی سبب ہے۔

قرآن کا جتنا کچھ میں نے مطالعہ کیا تھا، عربوں کی معاشرتی زندگی کا جو مجھے مشاہدہ ہوا تھا اور اب شیخ المراغی سے جو کھل کر گفتگو ہوئی تھی، اس نے مجھے اس نتیجے پر پہنچایا کہ اہلِ

یورپ کے دماغ میں اسلام کی جو تصویر ہے وہ بالکل مسخ شدہ اور بگڑی ہوئی ہے۔ اب میں اس امر پر بالکل مطمئن ہو چکا تھا کہ اسلام میں بحیثیت دین اور ضابطۂ حیات کوئی نقص نہیں اور مسلمانوں کا زوال اسلام کی خامی کی بنا پر نہیں بلکہ اسلامی تعلیمات پر ان کے عمل پیرا ہونے کی وجہ سے ہوا ہے۔

اس اطمینان کے بعد میں نے عربی زبان کی تعلیم باقاعدہ حاصل کرنا شروع کر دی۔ مجھ میں یہ احساس قوت پکڑنے لگا کہ یورپ کے لئے اسلام کی مکمل تصویر اخذ کرنا ناممکن نہیں۔ اپنی اس رائے کا اظہار میں نے چند ماہ پیشتر اپنی ایک کتاب میں بھی کیا تھا۔ اسلامی دنیا یورپی تہذیب میں اس حد تک خلط ملط نہیں ہوئی تھی کہ اس کو سمجھنا دشوار ہو جائے۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ اگر کوئی شخص اپنے ماضی کی فکری عادات سے علیحدہ ہو سکے اور یہ تسلیم کر لے کہ محض اسی کا طرزِ فکر درست نہیں تو عالم اسلام اس کے لئے اسی وقت قابلِ فہم ہو سکتا ہے۔

۱۹۲۵ء کے اواخر کی بات ہے میں ہرات سے کابل جا رہا تھا۔ وسطِ افغانستان کی برف پوش وادیوں نے قلب ونظر کو مسحور کر رکھا تھا۔ ایسے میں میرا گھوڑا لنگڑانے لگا۔ اس کی نعل ڈھیلی ہو گئی تھی اور صرف دو کیلوں کے سہارے لٹک رہی تھی۔ میرے افغان ساتھی نے بتایا کہ تین میل کے فاصلے پر ایک گاؤں "دہ زنگی" ہے وہاں کوئی موچی مل جائے گا۔ علاقہ ہزارجات کا گورنر بھی وہیں رہتا تھا۔

دہ زنگی میں حاکم صوبہ سے ملاقات ہوئی تو وہ بے حد خوش ہوا۔ اس کے چہرے پر مسرت اور فارغ البالی کے اثرات نمایاں تھے۔ وہ امان اللہ شاہ کا قریبی رشتہ دار تھا' لیکن افغانستان میں جتنے آدمیوں سے ملاقات ہوئی' میں نے اسے سب سے زیادہ ملنسار اور متواضع پایا۔ اس نے بڑے اصرار سے دو دن کے لئے مجھے اپنے پاس ٹھہرا لیا تھا۔ دوسرے دن شام کو پرتکلف کھانے سے فارغ ہوئے تو ایک افغان نے ستار پر داؤد اور جالوت کا قصہ چھیڑ دیا۔ گیت پشتو میں تھا اور حاکم نے مجھے اس کا خلاصہ بتا دیا تھا۔ آخر میں

اس نے تبصرہ کیا کہ واؤد کمزور تھے مگر ان کا ایمان طاقتور تھا۔

مَیں نے برجستہ جواب دیا:

''اس کے برعکس آپ لوگ تعداد میں بہت ہیں، مگر ایمان کے اعتبار سے کمزور ہیں''۔

میرا میزبان حیرت سے میرا منہ تکنے لگا۔ مَیں کچھ گھبرا گیا اور اپنی بات کی تاویل میں سوالوں کی بوچھاڑ کر دی ''مسلمانوں نے خود اعتمادی کیوں کھو دی ہے؟ ان کی عظمت کا سورج کیوں گہنا گیا ہے؟ ان کے علم و فن کی صلاحیتیں کیوں ماند پڑ گئی ہیں؟ کیا ایسا ممکن ہے کہ ہمت سے کام لے کر مسلمان پھر اسی روشنی اور عظیم دین کی طرف پلٹ جائیں۔ کتنا عبرت ناک منظر ہے یہ کہ وہ کمال پاشا جس کی نظر میں اسلام کی کوئی وقعت نہیں مسلمانوں کی نگاہ میں اسلامی نشاۃِ ثانیہ کا ہیرو بن گیا ہے''۔

میرا میزبان ٹکٹکی باندھے حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ مَیں خاموش ہوا تو وہ کہنے لگا:

''آپ تو مسلمان ہیں''۔

''نہیں نہیں یہ بات نہیں'' مَیں نے کہا ''مَیں مسلمان نہیں محض اسلام کے حسن و لطافت کا قدردان ہوں''۔

میرے میزبان نے سر ہلاتے ہوئے کہا ''نہیں بھائی! بات وہی ہے جو میں نے کہی تھی۔ آپ مسلمان ہیں لیکن خود آپ کو اس کی خبر نہیں۔ آپ کلمہ پڑھ کر مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے جبکہ دل کی گہرائیوں سے آپ اسلام قبول کر چکے ہیں''۔

مَیں افغانستان کی کئی ہفتے کی سیاحت کے بعد روس چلا گیا اور وہاں سے اپنے وطن لوٹ گیا۔ میری غیر حاضری میں میرا نام صحافتی حلقوں سے نکل کر علمی دنیا میں خاصی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ چنانچہ برلن کی جغرافیائی سیاسی اکیڈمی نے لیکچرز کے ایک سلسلے میں مجھے دعوت دی۔ اس وقت میری عمر ۲۶ سال تھی اور اس عمر میں یہ اعزاز آج تک کسی کو نہیں ملا تھا۔

اسی زمانے میں مَیں نے شادی کر لی۔ میری اہلیہ نے میرے خیالات سے اتفاق کیا۔ ہم میاں بیوی پہروں قرآن کا ترجمہ پڑھتے اور اس کی تعلیمات پر بحث کرتے تھے۔

اسی بحث و تجسس میں میرے سامنے اسلام کی ایک ایسی مکمل تصویر آ گئی جو مجھے حیرت زدہ اور مدہوش کیے رکھتی تھی۔ روح اور مادہ کی یکساں اہمیت' عقل کی کارفرمائی' پیغمبر اسلامؐ کی بھرپور روحانی' معاشرتی اور سیاسی زندگی اور اسلام کا بین الاقوامی مزاج۔ اسلام کے لئے میرا استغراق بڑھتا چلا گیا۔

ستمبر ۱۹۲۶ء کی ایک شب مَیں برلن میں اپنی اہلیہ کے ہمراہ زمین دوز ٹرین میں سفر کر رہا تھا۔ میرے سامنے کی سیٹ پر ایک جوڑا بیٹھا ہوا تھا۔ لباس اور ہیرے کی انگوٹھیوں اور وضع قطع سے دونوں بہت متمول نظر آتے تھے۔ مگر ان کے چہرے اطمینان یا مسرت سے خالی تھے۔ وہ بہت غم زدہ اور حرماں نصیب دکھائی دیتے تھے۔ مَیں نے ڈبے میں چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا۔ ہر وہ شخص جو خوش حال معلوم ہوتا تھا اس کے چہرے پر مَیں نے ایک مخفی الم کی جھلک دیکھی۔ اتنی مخفی کہ خود ان سب کو بھی اس کا احساس نہ تھا۔

مَیں نے اپنے اس احساس کا ذکر بیوی سے کیا تو اس نے بھی میری تائید کی۔ "واقعی یوں لگتا ہے جیسے یہ لوگ جہنم کی زندگی گزار رہے ہیں۔ سوچتی ہوں جو ان پر گزر رہی ہے اس کی انہیں خبر بھی ہے یا نہیں"؟

گھر واپس آیا اور نگاہ میز پر گئی تو اس پر قرآن کا وہ نسخہ رکھا تھا جو اکثر میرے مطالعے میں رہتا تھا۔ مَیں اس کو بند کر کے الماری میں رکھنا ہی چاہتا تھا کہ میری نگاہ کھلے ہوئے صفحے پر پڑ گئی۔ اس پر یہ آیات لکھی تھیں:

الھٰکم التکاثر حتیٰ زرتم المقابر کلا سوف تعلمون ثم کلا سوف تعلمون کلا لو تعلمون علم الیقین لترون الجحیم ثم لترونھا عین الیقین ثم لتسئلنّ یومئذٍ عن النعیم۔

"تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے۔ یہاں تک کہ (اسی فکر میں) تم لب گور تک پہنچ جاتے ہو۔ ہرگز نہیں عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا۔ پھر ہرگز

لو کہ ہرگز نہیں اگر تم یقینی علم کی حیثیت سے (اس روش کے انجام کو) جانتے ہوتے (تو تمہارا یہ طرز عمل نہ ہوتا) تم دوزخ دیکھ کر رہو گے۔ پھر (سن لو کہ) تم بالکل یقین کے ساتھ اسے دیکھ لو گے۔ پھر ضرور اس روز تم سے ان نعمتوں کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی''۔

مَیں ایک لمحے کے لئے گم سم ہو گیا۔ میرا خیال ہے کتاب میرے ہاتھ میں جنبش میں تھی۔ میں نے اپنی بیگم کو آواز دی۔ ''دیکھو کیا یہ اس کا جواب نہیں جو گزشتہ رات ہم نے ریل میں دیکھا تھا''۔ ہمیں ہمارے سوال کا جواب ہی نہیں مل گیا تھا' بلکہ متعلقہ شکوک و شبہات بھی ختم ہو گئے تھے۔ ہم نے سوچا یہ کتاب خدا ہی کی نازل کردہ ہے۔ یہ تیرہ سو سال پہلے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اتری تھی مگر اس میں بہت وضاحت کے ساتھ ایسی پیش گوئی کر دی گئی تھی' جو ہمارے پیچیدہ مشینی دور سے زیادہ شاید ہی کسی اور دور میں سامنے آئی ہو گی۔

اب مجھے یقین ہو گیا کہ قرآن کسی انسان کی حکمت و دانائی کا نتیجہ نہیں۔ انسان لاکھ سمجھدار' حکیم اور دانا سہی' مگر وہ اس عذاب کی پیشگوئی نہیں کر سکتا تھا جو بیسویں صدی کے لئے خاص تھا۔ دوسرے ہی روز مَیں برلن میں مسلمانوں کی انجمن کے صدر کے پاس گیا اور قبول اسلام کی خواہش ظاہر کی۔ انہوں نے مجھے کلمۂ شہادت پڑھایا اور بولے آپ کا نام لیوپولڈ ہے اور یونانی میں لیو (LEO) شیر کو کہتے ہیں اس لئے ہم آپ کو آج سے محمد اسد کہیں گے۔

چند ہفتے بعد میری اہلیہ نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ جس کے کچھ ہی عرصہ بعد ہم نے یورپ کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔ اس لئے کہ وہاں رہنا اب ہمارے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ چنانچہ ہم مصر سے ہوتے ہوئے جزیرۃ العرب آ گئے جہاں ہماری زندگی ایک نئے اور انقلابی دور میں داخل ہو گئی۔

●......●......●

پروفیسر محمد المہدی (انگلستان)

اہلِ مغرب اور قبولِ اسلام کے درمیان سب سے بڑی رکاوٹ وہ کتابیں ہیں جو مغربی مصنفین بغض اور تعصب میں ڈوب کر لکھتے ہیں جن میں یا تو اسلام کی تعریف ایسے بھونڈے اور مضحکہ خیز انداز میں کی جاتی ہے کہ پڑھنے والا ان سے منفی تاثر لئے بغیر نہیں رہتا یا پھر مسلمانوں کی کوتاہیوں اور غلطیوں کو اسلام کے سر منڈھ کر ایک بھیانک اور خوفناک تصویر پیش کی جاتی ہے۔ خصوصاً ان معرکہ آرائیوں کو خوب نمک مرچ لگا کر پیش کیا جاتا ہے جو چند صدیاں قبل مسلمانوں اور اہلِ یورپ کے درمیان برپا ہوئی تھیں۔ اس معاملے میں اس قدر بدنیتی سے کام لیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی بعض بدترین خصوصیات کا مقابلہ عیسائیت کی بہترین خوبیوں سے کیا جاتا ہے اور اس امر پر کبھی غور نہیں کیا جاتا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ جب مسلمان تہذیبی طور پر پورے عروج پر تھے تو اسلامی احساس و عمل بھی اپنی انتہا پر تھا' مگر اس کے برعکس یورپین تہذیب جب کمال پر پہنچی تو اس نسبت سے عیسائیت زوال کی نذر ہو کے رہ گئی۔

الحمد للہ میرا معاملہ اس عام روش سے مختلف رہا۔ میں ان کتابوں سے ہٹ کر بھی غور کرنے کا عادی تھا اور صرف میں ہی نہیں یورپ میں بے شمار ایسے لوگ ہیں جو عیسائیت کو قابلِ قبول نہیں سمجھتے۔ وہ دل سے اسلامی تعلیمات کے بہت قریب ہیں مگر چونکہ انہوں نے کبھی اسلام کی سادگی و پرکاری کا مشاہدہ نہیں کیا اس لئے وہ اسے قبول کرنے سے گریزاں رہتے ہیں۔ تاہم اسلام قبول کرنے والوں میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو ایک ''ضابطہ حیات'' کی تلاش میں ہوتے ہیں اور زندگی کی بے مقصدیت سے تنگ آ چکے ہوتے ہیں۔

میرا معاملہ اس سے کچھ مختلف ہے۔ میں نے اسلام کی کبھی طلب نہیں کی تھی۔ میں انگلستان کے ''عیسائی'' معاشرے میں پیدا ہوا اور وہیں پلا بڑھا۔ یہ معاشرہ کہنے کو تو

عیسائی معاشرہ ہے مگر حقیقی زندگی کے تصور سے بہت دور ہے۔ ایک ایسا تصور جو شاذ ہی کہیں نظر آتا ہے۔ تاہم جزوی طور پر اسے سمجھنے کی ناکام سی کوشش ضرور کی جاتی ہے۔ اگرچہ وہاں ایسے لوگ بھی ہیں جو عیسائی بھی ہیں اور انسانیت کی فلاح و ترقی کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔

تعلیم سے فارغ ہو کر میں نے افریقہ اور یورپ کے ممالک کی خوب سیر کی۔ براعظم افریقہ کا کوئی ملک ایسا نہ تھا جہاں میں نے سفر نہ کیا ہو۔ میرا ردِعمل یہ تھا کہ یورپین اقوام اور معاشرے کے مقابلے میں جہاں جہاں لوگ مسلم سوسائٹی کے تحت زندگی گزارتے ہیں' وہاں خلوص اور زندگی کی دلکشی کا ایک خاص اور نمایاں انداز ملتا ہے۔ چنانچہ میں شمالی نائجیریا کے شہر کانو کی عظیم الشان مسجد سے بے پناہ متاثر ہوا اور وہاں کے دوستوں میں جو خلوص اور محبت اور ایثار نظر آیا' اس کا تجربہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ خوش قسمتی سے مجھے اس کے بعد سری نیکا (SIRINIKA) کے خالص مسلم معاشرے میں لمبی مدت تک ٹھہرنے کا موقع ملا۔ مسلمانوں کے حوالے سے اسلام کے لئے میرے دل میں جو نرم گوشہ پیدا ہو گیا تھا' اس میں گہرائی اور وسعت آ گئی اور میں قبولِ اسلام کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنے لگا۔

تاہم میں نے اپنی زندگی کا یہ اہم ترین فیصلہ کرنے سے پہلے مختلف مذاہب کا تقابلی مطالعہ خوب توجہ سے کیا...... میرا اندازہ ہے کہ کوئی بھی ذہین شخص جو مختلف ادیان کا تقابلی مطالعہ کرے گا وہ ان کی بنیادی صداقتوں کا قائل ہو جائے گا اور یہ وہ مقام ہے جہاں سے اسلام کا فاصلہ بس چند قدم کا رہ جاتا ہے۔ منطق اور دلیل تقاضا کرتی ہے کہ ایسا شخص لازماً اسلام کی آغوش میں آ جائے۔ میں اس معاملے میں مبالغہ سے کام نہیں لے رہا۔ آج بھی ساؤتھ وارک (انگلستان) کے بشپ اور امریکہ کے ڈاکٹر ٹیلچی کی مثال سامنے ہے جو ہر طرح کے توہمات سے بچ کر صرف خدائے وحدہٗ لاشریک پر ایمان رکھتے ہیں۔ بہرحال میں آخرکار شرحِ صدر کی منزل پر پہنچ گیا اور اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔

جہاں تک میرا اندازہ ہے یورپ میں اشاعتِ اسلام کے حیرت انگیز امکانات ہیں۔ محمد جان ویبسٹر اس سلسلے میں بہت کام کر رہے ہیں اور اس کے خوشگوار نتائج برآمد ہو

رہے ہیں۔ خود میں ایک یونیورسٹی میں یہی خدمت انجام دے رہا ہوں اور میرے تاثرات یہ ہیں کہ یورپ میں اسلام کا فروغ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے کی وساطت سے ہوگا۔ جب کہ اس کے برعکس جو لوگ عیسائیت قبول کرتے ہیں وہ ابتدا میں انجیل کی اس تعلیم سے متاثر ہوتے ہیں کہ نجات کے لئے ایمان ضروری ہے، عمل نہیں۔ لیکن اس عقیدے کا اثر ہپناٹزم سے ملتا جلتا ہے۔ چنانچہ جب بھی انسان حقائق کی دنیا میں آتا ہے اور شعور سے کام لیتا ہے تو اپنے آپ کو ایک ایسے لق و دق صحرا میں پاتا ہے جہاں سرابوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ وہ عقیدے کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا رہتا ہے اور باہر آنے کا کوئی راستہ نہیں پاتا۔ چنانچہ میں نے خود افریقہ میں دیکھا ہے کہ عیسائی مشنری، قبائل کے آبائی عقائد کی بجائے انہیں ایسے تصورات سے روشناس کراتے ہیں جو انہیں توہم پرستی کے سوا کچھ نہیں دیتے اور ان پر زندگی کا اعلیٰ تر تصور کبھی روشن نہیں ہوتا۔

اسلام اس کے برخلاف شعور اور عقل کو اپیل کرتا ہے۔ شاید ہی کسی نے راتوں رات اسلام قبول کیا ہوگا اور یہی بات اسلام کے حق میں جاتی ہے۔ یہاں ادراک اور حسیات کو پس پشت نہیں ڈالا جاتا۔ چنانچہ جب ایک مرتبہ کوئی شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لائی ہوئی صداقت کا معترف ہو جاتا ہے تو اس کے بعد جو غور و فکر بھی کیا جائے گا اور جو اعتراض بھی پیدا ہوگا وہ یقین اور ایمان کو مزید پختہ کرتا چلا جائے گا اور یہ اسلام کے مبنی برحق ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

بہر حال میری روح پیاسی تو تھی ہی، اس لئے پوری توجہ سے صداقت کی تلاش میں منہمک ہو گیا۔ متذکرہ دونوں باتوں نے مجھے بہت سہارا دیا۔ عربی پہلے سے جانتا تھا۔ اسلامی تہذیب و ثقافت سے بھی کچھ نہ کچھ واقفیت تھی، چنانچہ میں نے سب سے پہلے اسلام کی طرف رجوع کیا اور یورپین مصنفین کی بجائے براہ راست صحیح اسلامی ماخذوں سے اسلام کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کے لئے میں نے ساری دنیائے اسلام میں مختلف اداروں سے رابطہ قائم کیا۔ اسی سلسلے میں کراچی کے انگریزی جریدہ ''مسلم نیوز انٹرنیشنل'' (نومبر ۱۹۷۴ء) میں میرا ایک خط چھپا۔ میں نے برسلز کے مقامی مسلمانوں سے بھی بات کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تانگانیکا سے سنگاپور اور پاکستان سے سعودی عرب تک مختلف لوگوں نے مجھے

خطوط بھی لکھے اور کتابیں بھی ارسال کیں۔

لیکن میں نے اسلام فوراً ہی قبول نہیں کر لیا۔ منطق و دلیل کی سخت رہنمائی میں میں نے مہینوں تک اسلام کے ایک ایک پہلو کا مطالعہ کیا۔ مختلف اصحاب سے گفتگوؤں کا سلسلہ بھی جاری رہا اور اس کے لئے میرے مسلم دوستوں نے بہت تعاون کیا۔ چنانچہ اسلام کی تعلیم میں نے بتدریج حاصل کی۔ مثال کے طور پر سب سے پہلے میں نے اللہ کی وحدانیت اور اس کے ننانوے اسمائے مبارکہ کا یقین حاصل کیا۔ دوسرے مرحلہ پر میں نے یہ ادراک حاصل کیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واقعی اللہ کے سچے نبی اور آخری پیغمبر تھے۔ تیسرے نمبر پر میں نے یہ اذعان پایا کہ قرآن واقعتاً اللہ کا کلام ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی کیا گیا اور یہی صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور چوتھے درجے میں میں اس وثوق تک پہنچا کہ قرآن ہر قسم کے تغیر سے پاک بالکل اسی حالت میں چلا آرہا ہے جس حالت میں یہ آج سے چودہ سو سال پہلے تھا۔

اس کے ساتھ ہی میرا دل اس امر پر کامل مطمئن ہو گیا کہ صرف اسلام ہی وہ سچا مذہب اور مکمل ضابطۂ حیات ہے جو ہر دور میں نوع انسانی کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ چنانچہ مندرجہ بالا تعلیمات پر میں نے ایک ایک کر کے عمل شروع کیا۔ میں نے اپنے آپ کو اچھی طرح سمجھا لیا کہ مسلمان ہونے کے بعد مجھے بہت سی باتوں کو ترک کرنا ہوگا اور بہت سے اعمال کو اختیار کرنا پڑے گا۔ مجھے اپنی زندگی کو مکمل تبدیل کرنا ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ میں نے ایسا کرنا شروع بھی کر دیا اور جب میں نے مقبول باتوں کو اختیار کر لیا اور مردود کو چھوڑ دیا تو ایک روز میں نے باقاعدہ اسلام قبول کر لیا اور نام بدل کر اسلام کے زیر سایہ ملت مسلمہ کا رکن بن گیا۔

میں جانتا ہوں کہ بات محض قبول اسلام پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ یہ تو اللہ کے راستے میں ایک نئی زندگی کا آغاز ہے۔ دعا ہے کہ اللہ ہمیں نماز، روزہ، حج، زکوۃ اور جہاد کے ذریعے اپنی رضا کو پانے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

●……●……●

محمد الیگزینڈر رسل ویب (امریکہ)

(MOHAMMAD ALEXAMDER RUSSEL WEBB)

ڈپلومیٹ' مصنف اور صحافی الیگزینڈر رسل ویب ۱۸۴۶ء میں نیویارک کے قریب ہڈسن کے مقام پر پیدا ہوئے۔ تعلیم ہڈسن اور نیویارک میں پائی۔ علمی زندگی کا آغاز انہوں نے مضمون نگار اور افسانہ نگار کی حیثیت سے کیا۔ پھر وہ میدانِ صحافت میں اترے اور ''سیلیسٹ جوزف گزٹ'' اور ''میسوری ریپبلکن'' کے ایڈیٹر بن گئے۔ ۱۸۸۷ء میں انہیں منیلا (فلپائن) میں ریاست ہائے متحدہ امریکا کا قونصل مقرر کیا گیا۔ یہیں انہوں نے اسلام کا مطالعہ کیا اور بالآخر اس کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ قبولِ اسلام کے بعد انہوں نے اسلامی دنیا کا وسیع اور طویل دورہ کیا اور باقی زندگی اشاعتِ اسلام کے لئے وقف کر دی۔ وہ امریکہ میں ادارۂ اشاعت اسلام کے صدر بھی تھے۔ ان کا انتقال اکتوبر ۱۹۱۶ء میں ہوا۔

مجھ سے دریافت کیا گیا ہے کہ امریکہ کا باشندہ ہو کر جہاں برائے نام حد تک سہی عیسائیت کا دور دورہ ہے اور جہاں کی زندگی پر مادیت' لامذہبیت اور الحاد کا تسلط ہے' میں نے اسلام کو کیوں قبول کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ میں گہرے اور وسیع مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اسلام وہ واحد اور بہترین نظام حیات ہے جو انسان کی روحانی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ میں اس امر کا اعتراف بھی کرتا چلوں کہ بعض نوجوانوں کے برعکس میں ابتدا میں مذہب سے اچھا خاصا لگاؤ رکھتا تھا' مگر بیس سال کی عمر میں' کہ جونہی شعور مند ہوا' چرچ کی خشک اور بے معنی رسومات و قیود سے سخت بیزار ہو گیا اور پھر اس سے یوں دور ہوا کہ دوبارہ کبھی قریب نہ آ سکا۔ خوش قسمتی سے میں نے تحقیق و تجسس کا وافر ذوق

پایا تھا اور کسی چیز کو بغیر دلیل کے قبول نہ کرتا تھا' لیکن جب دیکھتا کہ نہ تو عام آدمی نہ پادری مذہب عیسوی کی عقلی توجیہہ کرتا ہے' بلکہ اسے پُر اسرار اور فہم ادراک سے بالاتر قرار دے کر اس پر غور وفکر سے منع کرتا ہے تو اس رویّے سے میرا ذہن بغاوت کی طرف مائل ہوتا گیا۔

عیسائی مذہب سے مایوس ہو کر مَیں نے مشرقی مذاہب کا مطالعہ شروع کیا اور یورپ کے نامور فلسفیوں اور علما مثلاً لاک' کنسٹ' ہیگل' نطشے' ہکسلے اور بہت سے دیگر مفکرین و مصنفین کی کتابوں کا بغور مطالعہ کر ڈالا۔ یہ سب حضرات فلسفہ اور منطق اور عقلیات میں بڑی شہرت رکھتے تھے' مگر کوئی بھی میرے اس سوال کا جواب نہ دے سکا نہ مجھے مطمئن کر سکا کہ روح کیا ہے اور موت کے بعد اس کا حشر کیا ہوتا ہے؟ لیکن جب فلپائن میں میری تقرری ہوئی اور یہاں مجھے قرآن اور اسلامی لٹریچر پڑھنے کا موقع ملا تو ذہن کی ساری گتھیاں حل ہو گئیں اور حق واضح ہو کر سامنے آ گیا۔ یاد رہے کہ مَیں نے اسلام کسی جذباتی ردعمل' اندھی عقیدت یا محض سطحی جوش سے متاثر ہو کر قبول نہیں کیا بلکہ اس کے پیچھے ایک طویل' مسلسل' مخلصانہ' دیانت دارانہ اور قطعی غیر متعصبانہ مطالعہ اور تحقیق کارفرما ہے اور سب سے بڑھ کر تلاشِ حق کی بے پایاں آرزو نے اس منزل تک میری رہنمائی کی۔

اسلام پر سچے ایمان کی روح رضائے الٰہی کا حصول اور اس کی غیر مشروط اطاعت ہے۔ اس کے "کونے کا پتھر" عبادت ہے۔ یہ مذہب عالمگیر اخوت و مساوات' ہمہ گیر موافقت و یگانگت' وسیع القلبی اور کریم النفسی کی تعلیم دیتا ہے۔ صفائی قلب' نفاستِ عمل' طہارتِ لسان' اور جسم کی پاکی پر زور دیتا ہے۔ اگر کسی شخص کو سادہ ترین اور عملی و اخلاقی اعتبار سے نہایت سر بلند کرنے والی راہِ حیات سے واقفیت ہو سکتی ہے تو وہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔

●......●......●

محمد امین

(انگلستان)

سب تعریفیں اللہ رب العالمین کے لئے اور ہزار بار درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دیگر انبیائے کرام پر۔ آج میں اپنے مسیحی بھائیوں پر یہ امر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے دینِ اسلام کو طویل اور گہرے غور و فکر کے بعد قبول کیا ہے۔ مجھے کبھی کسی مسلمان نے اسلام کی دعوت نہیں دی' بلکہ میری چالیس سالہ تحقیق نے ثابت کر دیا کہ یہ مذہب افراط و تفریط سے بچتے ہوئے اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کے برعکس مسیحیت افراط و تفریط میں مبتلا ہے اور اس نے انبیا کی اصل تعلیم کو مسخ کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اسے ترک کر دیا۔

میرے والد ولیم جان شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ میری والدہ ایڈمرل فنر جارج کے۔ سی۔ وی۔ او کی اکلوتی بیٹی اور فیلڈ مارشل ہز رائل ہائی نس سابق ڈیوک آف کیمبرج کی پوتی تھیں۔ یہ ڈیوک آف کیمبرج ملکہ وکٹوریا کے رشتہ میں بھائی لگتے تھے۔ میری پیدائش ۱۹۰۷ء میں فرانس میں ہوئی۔ میرے والد کی خواہش تھی کہ میں پادری بنوں اور خداوند یسوع مسیح کی منادی کروں۔ چنانچہ میں آٹھ برس کا تھا جب انہوں نے مجھے اس مقصد کے لئے کلیسا کے حوالے کر دیا' جہاں پچیس برس کی عمر تک مذہبِ عیسوی کی تعلیم دی گئی اور میں نے اس میں اتنی استادانہ مہارت حاصل کر لی کہ دور دور سے مرد اور عورتیں میرا لباس چھونے اور برکت حاصل کرنے کے لئے آنے لگیں۔

تعلیم مکمل ہوئی تو مجھے مغربی ہندوستان' پرتگیزی نو آبادی گوا میں بھیج دیا گیا۔ قیامِ ہندوستان کے دوران تبلیغ کے ساتھ ساتھ میں نے دیگر مذاہب کا تقابلی مطالعہ بھی کیا۔ تبلیغی

فرائض کے سلسلے میں مجھے بمبئی، لکھنؤ، جبل پور، حیدرآباد دکن، مدراس اور آسام کے علاوہ برما، سیام، اور ملایا میں بھی بار بار جانا پڑا۔ میری تبلیغی کوششیں کبھی بے کار نہیں گئیں اور کتنے ہی سادہ لوح لوگ مسیحیت کی آغوش میں آتے چلے گئے۔

مجھے مطالعے کا شوق تو تھا ہی، ایک روز ایک دوست کی لائبریری میں سیل کا ترجمۂ قرآن جو دیکھا تو اسے لے کر پڑھنے بیٹھ گیا۔ یہ قرآن سے میرا پہلا براہِ راست تعارف تھا۔ اس سے قبل مَیں نے اسلام اور قرآن کے بارے میں جو کچھ پڑھا یا سنا تھا اس کا تاثر بڑا ہی منفی تھا۔ سیل نے بھی ترجمے میں جگہ جگہ مخاصمانہ تنقید و تبصرے کا انداز اختیار کیا تھا، مگر اس کے باوجود توحیدِ خداوندی کا ایک نہ مٹنے والا نقش میرے دل میں بیٹھتا چلا گیا اور مَیں بالکل نئی روشنی سے آشنا ہوا۔

اس کے بعد تو یہ حال ہوا کہ اسلام کے بارے میں مجھے جو کتاب بھی ملتی وہ پڑھ ڈالتا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ ان کتابوں کے بیشتر مصنفین تعصب اور تنگ نظری کا شکار تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ لوگ اسلام کے بارے میں اچھی رائے قائم کریں۔ تاہم قرآن سے شناسائی ہوئی اور مَیں نے انجیل پر نئے سرے سے غور شروع کیا تو اس کے تضادات کھل کر سامنے آ گئے۔ مثال کے طور پر حضرت مسیح کہتے ہیں کہ مَیں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا (متی ۱۵:۲۴) جبکہ قرآن کے مطابق پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ پھر یوں بھی انجیل متی باب ۵ آیت ۱۷، ۱۸ کی رو سے حضرت مسیح موسوی شریعت کے پابند تھے۔ جبکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ایک مکمل خود مختار ضابطہ لے کر آئے تھے۔ میرے دل میں اسلام کے لئے محبت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

مَیں ایک تبلیغی قافلے کے ساتھ کراچی میں مقیم تھا۔ جب برصغیر کی تقسیم عمل میں آئی اور پاکستان کی نئی اسلامی مملکت وجود پذیر ہوئی تو خوراک، لباس اور نقد رقمیں لے کر عیسائی مشنریاں میدان میں کود پڑیں اور سادہ دل مسلمانوں کو ہمدردی کے نام پر اپنے جال میں پھانسنے لگیں۔ بچپن میں تعلیم کے دوران بتایا گیا تھا کہ مسلمان قرآن اور تلوار پر ایمان رکھتے ہیں۔ عیسائیت کی نجات اسی میں ہے کہ قرآن میں شگاف ڈال دیا جائے۔

(یعنی مسلمانوں میں تفرقے ڈالے جائیں) اور تلوار کو کند کر دیا جائے (یعنی مسلمانوں کو کمزور اور بے بس بنا دیا جائے)۔ عیسائی پادری برملا کہتے تھے کہ ہمارا مقصد مریضوں کا علاج نہیں' بلکہ ہم صرف یہ چاہتے ہیں' کہ ان کے کانوں تک مسیح کی آواز پہنچ جائے' جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مسلمان توحیدِ خداوندی کے عقیدے سے ہٹ جائیں گے اور تین خداؤں کا تصور ان کا ایمان متزلزل کر دے گا۔ یہ منظر میں نے ۱۹۴۷ء کے زمانے میں عام دیکھا جب امداد کے پردے میں بہت سے مسلمانوں کا ایمان لوٹا گیا اور انہیں عیسائی بنانے کی کوشش کی گئی۔

اسی زمانے میں لاہور کے ایک عالم دین مولانا محمد علی سے مناظرے کی صورت میں میری طویل گفتگو ہوئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اسلام کا نظریہ توحید اور اللہ کی ربوبیت کا عقیدہ کتنا جاندار' فطری اور جامع ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں مسیحیت کا نظریہ محبت اور خدا کے لئے باپ ہونے کا تصور غیر عقلی اور غیر فطری ہے اور سراسر بے ہودگی کا حامل ہے۔ دل کی آنکھوں پر پڑے ہوئے پردے ہٹتے جا رہے تھے۔

اب میں نے عیسائیت کا تنقیدی مطالعہ شروع کیا تو بعض خوفناک قسم کے انکشاف ہوئے۔ مجھے تعلیم دی گئی تھی کہ میں گناہ کی وجہ سے اور گناہ کے نتیجے میں پیدا ہوا ہوں' اس کا ایک ہی مطلب نکلتا ہے کہ میرے ماں باپ پر بہتان باندھا گیا ہے اور ان کی توہین کی گئی ہے۔

پھر مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ سارے انسانوں کی طرح میں بھی فطرتاً گنہگار ہوں۔ خدا نے گناہ کو میری فطرت اور جبلت کا ایک لازمی جزو بنایا ہے' اس لئے میں گناہ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ اپنی ہمت اور طاقت کے مطابق بہت زیادہ گناہ کر کے اور بہت بڑا گنہگار بن کر میں خدا تعالیٰ کی رضا کا موجب بنوں گا۔ مجھے انسانی سرشت کا یہ نقشہ بڑا ہی بھدا اور مضحکہ خیز نظر آیا۔ اس میں خالقِ حقیقی پر افترا بھی باندھا گیا ہے اور اس کی توہین کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ یہ عقیدہ اسلام کی تعلیم کے کس قدر خلاف ہے جو بعد میں مجھے معلوم ہوئی کہ تمام بچے فطرتاً اسلام پر پیدا ہوتے ہیں اور ان کے والدین انہیں عیسائی' یہودی اور مجوسی بناتے ہیں۔

بائبل کی مختلف آیتوں نے خدائے رحیم و کریم کی جو تصویر پیش کی ہے وہ کسی خونخوار

دیوٗ کسی مغلوب الغضب ہستی اور مایوس انسان سے ملتی جلتی ہے۔ یعنی خدا نے نوع انسان کو پیدا کیا مگر انسانوں نے بعد میں اس کام کو اتنا بگاڑا کہ اس نے مایوس اور غضب ناک ہو کر یہودیوں کے سوا تمام دوسری قوموں کو تباہ کر دینا چاہا اور اس مقصد کے لئے یہودیوں کو حکم بھی دے دیا کہ وہ ہر انسان کو قتل کر دیں اور اپنے سوا کسی کو زندہ نہ چھوڑیں۔

پھر بائبل کے مطابق خدا نے انسانوں کی ہدایت کے لئے بے شمار پیغمبر بھیجے مگر انسان ضدی واقع ہوا ہے اور ہدایت کو قبول نہیں کرتا' اس لئے خدا نے بنی نوع انسان کو ابدی جہنم میں دھکیل دینا چاہا مگر خداوند کے اکلوتے بیٹے نے نسل انسانی کی حمایت کی اور اپنی قربانی دے کر اسے جہنم کے عذاب سے بچا لیا۔ اس عقیدے میں اللہ تعالیٰ کی جو تصویر کشی کی گئی ہے' اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ مایوسی' ظلم وغضب' بے انصافی اور ایسی ہی حتی و غیر فطری خصوصیات خدا کی طرف منسوب کی گئی ہیں۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ)

عیسائیت کی تاریخ میں یہ امر بھی اچنبھے کا کوئی پہلو نہیں رکھتا کہ مسیحیت کے انتہائی عروج کے زمانے میں جس کسی نے اپنے اطمینان اور تسلی کے لئے ان عقائد پر جرح کی' اسے زندہ جلا دیا گیا یا حوالۂ زنداں کر دیا گیا اور اِس زمانے میں بھی دنیا کے مختلف حصوں میں خلقِ خدا پر جتنا ظلم عیسائیوں نے کیا ہے' اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

تمام عیسائی مذاہب تثلیث کو بنیادی عقیدے کی حیثیت سے مانتے ہیں۔ کائنات کے نظام پر غور کیا' اسلام کی تعلیمات سے مقابلہ کیا تو اس سارے عقیدے کی چولیں ہلتی ہوئی نظر آئیں۔ باپ' بیٹا اور روح القدس کا تصور سراسر غیر عقلی اور غیر فطری ہے اور اس تصور نے پوری عیسائی دنیا کو فی الواقع دہریت والحاد کی گود میں لا ڈالا ہے۔

بائبل ایمان کی عجیب وغریب کسوٹی پیش کرتی ہے۔ حضرت مسیح صاف لفظوں میں کہتے ہیں (انجیل مرقس باب ۱۶ آیت ۱۷' ۱۸) ''اور ایمان لانے والوں کے درمیان یہ معجزے ہوں گے وہ میرے نام سے بدروحوں کو نکالیں گے۔ نئی نئی زبانیں بولیں گے۔ سانپوں کو اٹھا لیں گے اور اگر کوئی ہلاک کرنے والی چیز پئیں گے تو انہیں کچھ ضرر نہ پہنچے گا۔ وہ بیماروں پر ہاتھ رکھیں گے تو اچھے ہو جائیں گے''۔ متی کی انجیل باب ۱۷ فقرہ ۱۹' ۲۰ میں ایک واقعہ کے ضمن میں آتا ہے'' تب شاگردوں نے یسوع کے پاس خلوت میں کہا کہ ہم

اس (بدروح) کو کیوں نہ نکال سکے؟ اس نے ان سے کہا اپنے ایمان کی کمی کے سبب سے' کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اگر تم میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہوگا تو اس پہاڑ سے کہہ سکو گے کہ یہاں سے سرک کر وہاں چلا جا اور وہ چلا جائے گا اور یہ بات تمہارے لئے ناممکن نہ ہوگی"۔

اب ایمان کی اس کسوٹی کو دیکھئے اور پوری عیسائی تاریخ کا مطالعہ کیجئے۔ آپ کو دور دور تک ایک بھی ایسا عیسائی نظر نہ آئے گا جو اس معیار پر پورا اترتا ہو۔ صاف ظاہر ہے یا تو یہ معیار غلط ہے یا پھر کسی عیسائی میں مطلوبہ ایمان رائی کے برابر بھی موجود نہیں جبکہ اس کے برعکس اسلامی تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ خدا کے بندوں نے جو اشارہ کیا' مظاہر قدرت نے اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ اصل میں ان مثالوں سے یہ بات روشن ہوتی چلی گئی کہ عیسائیت کے مختلف اصولی مسائل اور عقائد اکثر پہلوؤں سے انسانی ضمیر و وجدان سے ٹکراتے ہیں اور عقل عام انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔

شب و روز کا یہ مشاہدہ میرے لئے سخت تکلیف کا باعث تھا کہ عیسائیت رنگ و نسل کے قضیے میں بہت بری طرح ملوث ہے۔ سیاہ فام عیسائیوں کے گرجے سفید فام عیسائیوں سے الگ ہیں اور اگر کسی مقام پر ایک ہی گرجا ہے تو سفید فام اگلے حصے میں مخملین صوفوں اور کرسیوں پر براجمان ہو کر عبادت کرتے ہیں جبکہ سیاہ فام پچھلے حصے میں دریوں یا لکڑی کے تختوں پر بیٹھتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اسلام میں گورے کالے یا عربی و عجمی کا کوئی امتیاز نہیں۔ مسجد میں سب مسلمان بلا تمیز نسل و رنگ ایک صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے ہیں۔ میں نے دنیا کے مختلف ممالک میں یہی دیکھا ہے کہ سارے مسلمان خواہ وہ افغان ہوں یا عرب' ترک ہو یا مصری' مراکشی ہوں یا انڈونیشی یا پاکستانی سب ایک دوسرے کو دین کی بنیاد پر بھائی بھائی سمجھتے ہیں اور محض طبقے کی وجہ سے ان میں باہم کوئی تفریق نہیں۔

تلاشِ حق کا آخری مرحلہ:

مجھ پر عیسائیت کی ایک ایک کمزوری واضح ہو گئی اور اسلام کی خوبیاں اجاگر ہوئیں تو میں نے پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ شروع کیا اور بہت

جلد اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ آپ کی زندگی دنیا جہاں کی خوبیوں کا زندہ جاوید مرقع ہے اور اتنی بھرپور و مکمل ہے کہ قیامت تک کے لئے پوری بنی نوع انسان کی رہنمائی کرسکتی ہے جبکہ اس کے برعکس حضرت مسیح کی زندگی کا ایک پہلو بھی نکھر کر سامنے نہیں آتا اور کوئی انسان دنیاوی یا روحانی طور پر ان سے استفادہ نہیں کرسکتا۔

میرے خاندان والوں نے میرے بدلتے ہوئے رجحانات کو بھانپ لیا تھا۔ انہوں نے تہدید آمیز خط بھی لکھے جس میں مجھے ڈرایا گیا تھا کہ اگر میں نے مسیح کی الوہیت سے انکار کیا تو میری نجات کی کوئی صورت نہیں رہے گی۔ مگر اب میں ان باتوں کو حد درجہ احمقانہ اور مضحکہ خیز سمجھتا تھا اور اسلام سے زیادہ دیر تک دور رہنا سراسر نقصان دہ خیال کرتا تھا۔ چنانچہ اللہ کا شکر ہے کہ ۱۹۶۴ء میں میں نے عیسائیت کو چھوڑا اور...... اسلام قبول کر لیا۔ اللہ تعالیٰ مجھے استقامت عطا کرے اور دینِ اسلام کی برکتوں سے مستفید ہونے کی توفیق عطا کرے (آمین)

●......●......●

محمد علی

(بھارت)

بھارت کے صوبہ اتر پردیش میں اعظم گڑھ خاصا معروف شہر ہے۔ اس ضلع کی تحصیل گھوسی میں مانی پور اسنا نام کا ایک گاؤں ہے' جو دریائے گنگا سے چوبیس پچیس کلومیٹر دور واقع ہے۔ گاؤں ڈیڑھ دو سو گھروں پر مشتمل ہے جن میں اکثریت مسلمانوں کی ہے جبکہ ہندوؤں کے گھر بمشکل سولہ سترہ ہوں گے۔ مسلمان زیادہ تر زمیندار ہیں یا پھر باہر کے ممالک میں ملازم ہیں۔ پٹھان اور شیخ برادریوں سے ان کا تعلق ہے جبکہ ہندو آبادی کا تعلق کمہار اور بنیا ذاتوں سے ہے۔ مانی پور اسنا کے اردگرد شودروں اور ہریجنوں کے گاؤں ہیں۔

مانی پور اسنا میں ایک ہندو بنیے جمنا داس کے ہاں اس کا تیسرا بیٹا رام چندر ۱۹۶۲ء میں پیدا ہوا جو ۱۳۔ اپریل ۱۹۸۳ء کو مسلمان ہو گیا۔ مسلمان ہونے کے بعد وہ لاتناہی مصائب و مشکلات کا شکار رہا اور بلا مبالغہ اس پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے۔ اس کی داستان سن کر ذہن میں حضرت بلال ؓ حضرت خبیب ؓ اور حضرت مصعب بن عمیر ؓ کی داستانوں کی فلم چلنے لگتی ہے۔ اس کے ایمان افروز سفر آزمائش کی روداد اسی کی زبانی سنئے۔ یہ داستان ملک احمد سرور صاحب نے مذکورہ نومسلم سے انٹرویو کے بعد رقم کی اور ''اردو ڈائجسٹ'' کے شمارہ جولائی ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی۔

ہمارے گاؤں میں زیادہ تر گھر مسلمانوں کے تھے۔ تبلیغی جماعت والے وہاں تبلیغ کرنے اکثر آیا کرتے۔ سات آٹھ سال کی عمر میں میرا ان سے واسطہ پڑا۔ میرے والد کی

پرچون کی دکان تھی۔ وہ مجھ سے کہتے کہ میں تبلیغی جماعت والوں کی خدمت کروں تاکہ وہ اپنی ضرورت کے لئے سودا سلف ہماری دکان سے خریدیں۔ اپنے والد کی اس ہدایت کے مطابق میں ان لوگوں کے ساتھ رہتا۔ ان کے لئے پانی بھر کر لاتا اور انہیں لکڑیاں خرید کر دیتا۔ ان کا رہبر بن کر ان کے ساتھ مسلمانوں کے گھر جاتا۔ ان کے علاوہ بھی جو کام وہ کہتے، میں کرتا۔ تبلیغی جماعت والے اس سے بہت خوش ہوتے اور مجھے شاباش دیتے۔ میرا نام پوچھتے۔ میں بتاتا کہ رام چندر ہے تو سن کر تعجب کا اظہار کرتے۔ وہ کہتے کہ حیرت ہے اس گاؤں میں مسلمان ہمارے ساتھ تعصب کا مظاہرہ کرتے ہیں جبکہ ایک ہندو بنیے کا بچہ اتنا تعاون کرتا ہے۔ نتیجتاً وہ لوگ ہماری دکان سے سودا سلف خریدتے۔ بیماری کے وقت ہم لوگ ان سے تعویذ بھی لیتے۔ اس طرح مجھے تبلیغی جماعت والوں کے قریب آنے کا مسلسل موقع ملتا رہا۔ گاؤں کی اکثریت مسلمانوں کی تھی اس لئے مسلمانوں کے رسم و رواج میرے لئے کوئی نئے نہ تھے مگر تبلیغی جماعت والوں سے جب واسطہ پڑا تو میں شعوری طور پر مسلمانوں کی طرف کچھ زیادہ ہی توجہ دینے لگا اور ان کے متعلق میری سوچ کے دائرے پھیلتے چلے گئے۔ اتنی چھوٹی عمر میں مجھ پر یہ اللہ تعالیٰ کا خاص کرم اور احسان تھا جس نے میرے ذہن کو اسلام کے بارے میں سوچنے پر لگایا ورنہ سب جانتے ہیں یہ عمر غور و فکر کی نہیں بلکہ صرف اور صرف کھانے پینے کی اور شرارتیں کرنے کی ہوتی ہے۔

میں نے جب پہلی بار تبلیغی مسلمانوں کو اکٹھے بیٹھ کر ایک ہی برتن میں کھانا کھاتے دیکھا تو مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ ہم ہندوؤں میں اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہاں تو چھوت چھات کا راج ہے۔ چنانچہ جب میں نے پہلے دن ان لوگوں کو یکجا کھاتے دیکھا تو میرا خیال تھا کہ ایک دوسرے کی بیماریاں ان سب کو لگ جائیں گی اور کل وہ لوگ بیمار ہو جائیں گے۔ دوسرے دن میں انہیں غور سے دیکھتا رہا مگر ان میں سے کوئی بھی بیمار نہ پڑا تھا۔ وہ جتنے دن بھی رہے تندرست رہے، مگر مجھے حیرانیوں اور پریشانیوں میں ڈال گئے۔ میں اپنے والدین سے پوچھا کرتا تو وہ ٹال جاتے۔ مگر میں سوچتا رہتا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہندو اکٹھے کھائیں تو انہیں ایک دوسرے کی بیماریاں لگ جائیں مگر مسلمانوں کو کچھ بھی نہ ہو۔ میں ابھی انہی سوچوں میں گم اپنے ذہن میں الجھنے

والے سوالوں کے جواب ڈھونڈھ رہا ہوتا کہ دوسری تبلیغی جماعت آ جاتی اور وہ میرے ذہن میں اسلام کی کوئی نئی بات ڈال جاتی۔ تبلیغی جماعت کے جانے کے بعد میں ان کی بتائی ہوئی باتوں کا مقابلہ اپنے مذہب سے کرنے لگ جاتا مگر میرا چھوٹا سا ذہن کسی نتیجے تک نہ پہنچ پاتا۔ یہ باتیں میرے ذہن میں گردش کرتی رہتیں مگر زبان پر نہ آتیں۔

میں عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ مجھے ہندو مت سے محبت تھی' پیار تھا' عشق تھا۔ ہندو مت میرا ایمان تھا۔ مجھے اپنے دیوتاؤں اور بھگوان کی مورتیاں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھیں' لیکن تبلیغی جماعت والوں کی باتیں مجھے پریشان کر دیتیں۔ فیصلہ نہ کر پاتا کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔ انہی سوچوں میں دن گزرتے رہے۔

ہمارے گاؤں کے اکثر مسلمان شیعہ تھے۔ محرم میں تعزیے نکالتے۔ ہندو عورتیں بھی تعزیوں کو بہت مانتی تھیں۔ جن کے اولاد نہ ہوتی وہ تعزیوں کے نیچے سے گزرتیں' منتیں مانتیں اور نذرانے پیش کرتیں۔ میں بھی دیکھا دیکھی تعزیے کے جلوسوں میں شریک ہوتا اور مسلمان لڑکوں کی آواز میں آواز ملا کر مرثیے پڑھتا۔

ہمارے گاؤں سے کوئی سوا کلو میٹر دور چھبریا گاؤں کے قریب شنکر مندر تھا جہاں میں اکثر جایا کرتا تھا۔ وہاں کرشن اور گائے ماتا کی مورتیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ گائے ماتا کا منہ اور سری کرشن کا پاؤں آپس میں ملتے تھے۔ عورتیں دودھ لاتیں اور دونوں کے چرنوں میں ڈالتیں۔ سادھو دودھ اکٹھا کر کے فروخت کر دیتے۔

تبلیغی جماعت والے اسلام کی نئی نئی باتیں میرے ذہن میں ڈالتے اور میں پریشان ہونے لگتا تو مندر چلا جاتا مگر وہاں بھی ذہن کو سکون نہ ملتا۔ مجھے ایسے محسوس ہوتا کہ میں جنگل میں بھٹک رہا ہوں۔ دور سے کسی کی آواز سنائی دیتی ہے' میں آواز کی طرف بھاگنا چاہتا ہوں مگر کوئی راستہ بھائی نہیں دیتا۔ میں مزید پریشان ہو جاتا۔

میرے ماں باپ مجھے سری کرشن' رام چندر' لچھمن' سیتا اور سادھوؤں کی کہانیاں سنایا کرتے۔ کبھی میں وہ کہانیاں سن کر جھوم اٹھتا تھا اور وہ بہت اچھی لگتی تھیں اور میں اپنی والدہ اور دادی سے یہ کہانیاں سننے کی بار بار فرمائش کرتا تھا۔ مگر اب یہ کہانیاں کوئی سناتا تو مجھے اچھی نہ لگتیں۔ مجھے مسلمانوں کے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت اور

حضرت علیؓ، حسنؓ اور حسینؓ کے واقعات بہت اچھے لگتے۔ جب تبلیغی جماعت والے یا دوسرے مسلمان یہ واقعات بیان کرتے تو میں بڑے غور سے سنتا۔ میرے دل میں ان ہستیوں کے لئے ایک محبت اور عقیدت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ میں تفصیل سے جاننا چاہتا تھا کہ یہ لوگ کون تھے۔ میں اپنے مذہب پر غور کرتا تو پریشان ہو جاتا۔ میں ڈرتا کہ اگر میرے بھگوان کو میرے خیالات کا پتہ چل گیا تو وہ مجھے جلا کر بھسم کر دے گا۔ میں خیالات کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کرتا مگر ناکام رہتا۔ یہ کشمکش جو آٹھ سال کی عمر میں شروع ہوئی وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی گئی۔

ہمارے گاؤں سے دو کلومیٹر دور بڑا گاؤں بازار ہے میں وہاں کے پرائمری اسکول میں پڑھتا تھا۔ میرے ہم جماعت زیادہ تر مسلمان تھے۔ ان میں جعفر علی بھی تھا جو میرا دوست تھا۔ اسی اسکول میں میرے گاؤں کے ایک استاد نسیم صاحب بھی پڑھاتے تھے۔ میں جعفر علی سے اسلام کے بارے میں معلومات لینے لگا۔ وہ میری ہی طرح کم عمر تھا مگر اسلام کے بارے میں کافی معلومات رکھتا تھا۔ وہ اکثر اسلام کے متعلق مجھے بتاتا اور میں بھی اس سے طرح طرح کے سوالات پوچھتا رہتا۔ کبھی کبھی وہ ماسٹر نسیم صاحب سے میرے سوالوں کے جواب پوچھ کر بتاتا۔

پرائمری اسکول کے بعد میں اور جعفر جونیئر مڈل اسکول گھوسی میں آ گئے۔ یہاں بھی ایک مسلمان استاد عبدالغنی صاحب تھے۔ یہ مدھوبن گاؤں کے رہنے والے تھے۔ جعفر علی عبدالغنی صاحب کا رشتے دار بھی تھا۔ اس نے میرے بارے میں عبدالغنی صاحب کو بتایا تو انہوں نے مجھ میں خصوصی دلچسپی لینی شروع کر دی۔ انہوں نے اسلام کے متعلق میری معلومات میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔

مجھے معلوم تھا کہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ خدا صرف ایک ہے میں سوچتا ہندو بھی تو کہتے ہیں کہ بھگوان ایک ہے پھر مسلمانوں کے اللہ اور ہندوؤں کے بھگوان میں ناموں کے سوا کیا فرق رہ جاتا ہے؟ میں نے یہی سوال ایک دن جعفر اور عبدالغنی صاحب سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ مسلمان اس خدا کو مانتے ہیں جس نے اس پوری کائنات کو بنایا۔ پھر انسان کو پیدا کیا اور اس کی ضرورت اور خدمت کے لئے جمادات، نباتات اور حیوانات

پیدا کئے۔ مسلمان اس خدا پر ایمان رکھتے ہیں جو سورج اور چاند کی گردش کو کنٹرول کرتا ہے اور آسمانوں سے بارش برساتا ہے۔ ہوائیں چلاتا ہے اسے کبھی اونگھ نہیں آتی وہ خود کسی کی اولاد ہے نہ اس کی آگے کوئی اولاد ہے۔ وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا اور اسے کسی مٹی یا پتھر کے بت میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اتنی قوت والا ہے کہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں بلکہ سب اس کے محتاج ہیں۔ وہ انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکالنے کے لئے انبیا بھیجتا ہے اور انسانوں کو سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔ لیکن ہندو جن مٹی، پتھر اور لکڑی کے بتوں کو بھگوان سمجھ کر پوجتے ہیں وہ سب انسان کے اپنے ہاتھوں کے تراشے ہوئے ہیں۔ یہ سب انسان کی تخلیق ہیں اور خالق ہمیشہ اپنی مخلوق سے اعلیٰ و ارفع ہوتا ہے اور اعلیٰ کبھی ادنیٰ کے سامنے نہیں جھکتا۔ اس لحاظ سے بھی انسان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے ہی ہاتھوں سے تراشے ہوئے بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہو۔ پھر ہندو جن بتوں کو بھگوان اور ایشور کا درجہ دے کر خدا کی طرح پوجا کرتے ہیں ان کے اندر اتنی بھی سکت نہیں کہ وہ اپنے اوپر بیٹھی ہوئی کسی مکھی کو بھی اڑا سکیں یا کسی ایک تنکے ہی کو تخلیق کر سکیں۔ پھر بھگوان یا ایشور کے بت خدا کیسے ہو سکتے ہیں؟ حقیقی خدا تو وہ ہے جس کی مرضی کے بغیر کسی درخت کا ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا اور جس کے تخلیق کردہ اس نظام میں بھگوان یا ایشور کے سارے بت مل کر بھی کوئی تبدیلی نہیں لا سکتے۔ کیا بھگوان یا ایشور کے یہ بت کبھی سورج کو مغرب سے طلوع کر سکتے ہیں؟ کیا وہ بارش برسا سکتے ہیں؟ وہ تو اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے اگر کوئی انہیں گندے نالے میں پھینک دے تو وہ باہر نہیں نکل سکتے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں: اگر آسمان اور زمین میں ایک اللہ کے سوا کوئی اور معبود بھی ہوتے تو زمین و آسمان درہم برہم ہو جاتے۔

ان کی اس گفتگو نے میرے ذہن کے دریچے کھول دیے تھے اور میرے سوچنے کی راہیں اور وسیع ہو گئی تھیں، مگر صراط مستقیم سے میں ابھی بہت دور تھا۔

جعفر اور عبدالغنی صاحب کی گفتگو کے بعد میں سوچتا تو مجھے اپنا مذہب ایک فریب نظر آتا۔ ہندوؤں کی ایک ایک رسم اور عبادت کے مناظر میرے ذہن میں فلم کی طرح چلنے لگتے۔ کس طرح لڑکیاں اور لڑکے مل کر ہولی اور دیوالی کے تہواروں میں غیرت کا جنازہ

نکالتے ہیں۔ گن پتی کے دن ہندو اپنے دیوتاؤں کا کیا حال کرتے ہیں۔ وہ مٹی کے بھگوان بناتے ایک ہفتہ ان کی پوجا کرتے اور گن پتی کے دن پتھر اور مٹی کے اپنے ان خداؤں کو دریاؤں اور سمندر میں پھینک دیتے۔ وہ مٹھائی کے بھگوان بنا کر لاتے۔ ان کی سیوا یعنی پوجا کرتے پھر سب مل بیٹھتے کوئی اپنے اس مٹھائی سے بنے ہوئے بھگوان کی ناک اتار کر کھانے لگتا' کوئی کان' کوئی دانت اور کوئی دوسرا حصہ کھا رہا ہوتا اور یہ بھگوان اپنے ہی پجاریوں سے اپنے آپ کو بچا نہ سکتے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر مجھے یقین آنے لگتا کہ جعفر صحیح کہتا ہے کہ جو اپنی حفاظت نہیں کر سکتے وہ خدا کیسے ہو سکتے ہیں اور پھر ہم ان کی پوجا کیوں کریں؟ یقینا جعفر کا خدا ہی حقیقی خدا ہے اور وہی پوجا کے لائق ہے۔ لیکن نہ جانے لاشعور میں ابھی تک ان بتوں کا خوف کیوں میرے دل کو گھیرے ہوئے تھا اور یہ خوف زبان سے ایک لفظ بھی ان بتوں کے خلاف نہیں نکلنے دیتا تھا۔ ایک طرف دل جعفر کے خدا کی سچائی کی گواہی دینا چاہتا تھا تو دوسری طرف پنڈتوں' سادھوؤں اور والدین کے کرشن' ایشور' بھگوان اور دوسرے دیوتاؤں کے بارے میں سنائے ہوئے مافوق الفطرت واقعات ذہن میں گھومنے لگتے اور میں ڈر جاتا۔ سچائی کی روشنی میرے دل و دماغ میں جلتی اور بجھتی رہتی۔

میری عجیب کیفیت تھی۔ رات دن میرے ذہن میں بھگوان اور خدا کے تصور گڈمڈ ہوتے رہتے۔ جعفر مجھے اکثر اسلام کے بارے میں بتاتا رہتا۔ ماسٹر نسیم اور عبدالغنی صاحب بھی کبھی کبھی اسلام کے بارے میں بتاتے۔ جعفر مجھے اپنے نبیوں کے قصے سناتا۔ مثال کے طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام انسانی ہاتھوں کے بنائے ہوئے ان بتوں کو خدا نہیں مانتے تھے۔ پھر ایک رات اور دن کو وہ ستاروں' چاند اور سورج کو طلوع اور غروب ہوتے دیکھ کر کس طرح ان کے خدا ہونے کے اقرار و انکار کی کیفیت سے گزرے۔ جعفر نے یہ سارا واقعہ تفصیل سے بتایا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ سننے کے بعد مجھے محسوس ہونے لگا کہ ایک دن یقینا میں بھی سچائی کو پا لوں گا۔ میں میٹرک میں تھا جب جعفر علی اور عبدالغنی صاحب کے کہنے پر میں نے اسلامی کتب کا مطالعہ شروع کیا۔ قرآنِ مجید کا ہندی ترجمہ' موت کا منظر' مرنے

کے بعد کیا ہوگا' قیامت کب آئے گی وغیرہ کتب کا مطالعہ کیا۔ کلمہ طیبہ' کلمہ شہادت اور آیت الکرسی تو میں نے زبانی یاد کر لی۔

جب کوئی مشکل پیش آتی یا خوف کی فضا ہوتی تو میں دل ہی دل میں کلمہ طیبہ پڑھتا اور اللہ سے مدد مانگتا۔ مجھے یاد ہے جس رات سکائی لیب گرنے کا واقعہ ہونے والا تھا والدین بتوں کی پوجا کر رہے تھے اور میں دل ہی دل میں رات بھر کلمہ طیبہ پڑھتا رہا۔

جن دنوں میں اسلامی کتب اور قرآن مجید کا مطالعہ کر رہا تھا' مجھے رات کو خواب میں اکثر ایک بزرگ نظر آتے' اُن کی سفید ڈاڑھی اور چہرے پر ایک نور ہوتا اور میں ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا۔ خواب میں اگر میں گھبرا جاتا تو وہ مجھے تسلی دیتے اور کہتے "اے راہِ حق کے مسافر! کامیابی کے لئے تجھے ابھی آگ کے دریا میں سے گزرنا ہوگا' ایمان کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رکھو گے' مشکلات میں صبر اور ہمت سے کام لو گے تو آگ کے دریا سے بسلامت گزر جاؤ گے۔ مجھے ان کی باتیں اس وقت سمجھ میں نہ آتی تھیں کہ یہ آگ کا دریا کیا ہے اور یہ ایمان کی رسی کیا ہے لیکن بعد میں جب واقعی آگ کے دریا آئے تو ساری باتیں سمجھ میں آ گئیں۔

۸۲'۱۹۸۱ء میں ضلع اعظم گڑھ میں تقریباً دس ہزار کی تعداد میں شودر مسلمان ہوئے تھے۔ ۱۹۸۳ء میں بھی مسلمان ہونے والے شودروں کی تعداد بہت زیادہ رہی۔ یہ سب کچھ ہندوؤں کے تعصب اور چھوت چھات کی وجہ سے ہو رہا تھا۔

میں بھی ذہنی طور پر مسلمان ہونے کے لئے بالکل تیار تھا لیکن گھر والوں' پنڈتوں اور دوسرے ہندوؤں سے ڈرتا تھا کہ وہ مجھے بہت ماریں گے۔ شودر جو مسلمان ہو رہے تھے ان کے تو پورے پورے خاندان اور برادریاں مسلمان ہو رہی تھیں اس لئے انہیں کسی قسم کا ڈر نہیں تھا جبکہ میرے ساتھ یہ معاملہ نہیں تھا۔ گاؤں کے دوسرے افراد کے مسلمان ہونے کے واقعات میرے سامنے تھے کہ مسلمان ہونے کے بعد کس طرح ان پر ظلم و تشدد ہوا۔

۱۹۷۷ء کا واقعہ ہے ایک دن میں اسکول سے واپس آرہا تھا کہ راستے میں ایک جگہ لوگوں کا اکٹھ دیکھا۔ قریب پہنچا تو دیکھا کہ کسی شخص کو جلایا گیا ہے' اب وہاں صرف لکڑیوں کا دھواں اٹھ رہا تھا لیکن گاؤں میں تو کوئی ہندو نہیں مرا تھا اور یہ ہندوؤں کے جلانے کی جگہ

بھی نہیں تھی" "یہاں کسے جلایا گیا ہے؟" "میں نے وہاں کھڑے کئی افراد سے پوچھا مگر مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ بعد میں پتہ چلا کہ ۲۰ سالہ معصوم ارمیلا کو جلایا گیا ہے۔ ارمیلا ایک خوبصورت' ذہین اور نوجوان ہندو لڑکی تھی۔ جب وہ کالج میں پڑھتی تھی تو ایک مسلمان طالب علم عاشق علی سے اس کا رابطہ قائم ہوا۔ عاشق علی ہی کے ذریعے اس نے اسلام کا مطالعہ کیا۔ اسلامی کتب کا مطالعہ کرنے اور عاشق علی سے بحث مباحثے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اسلام ہی صراط مستقیم اور راہ نجات ہے۔ اس نے اسلام قبول کرلیا مگر اپنے مسلمان ہونے کو خفیہ رکھا۔ بی اے پاس کرلنے کے بعد...... ایک دن گھر والوں نے اسے نماز پڑھتے دیکھ لیا۔ اس پر تشدد کا ہر طریقہ آزمایا گیا کہ وہ اسلام چھوڑ کر دوبارہ ہندو ہو جائے۔ ارمیلا نے سوچ سمجھ کر اسلام قبول کیا تھا اس لئے اس نے ہر قسم کا تشدد برداشت کیا مگر اسلام کو چھوڑنا قبول نہ کیا۔ جب گھر والے اور ہندو پنڈت مایوس ہو گئے تو اسے گاؤں سے باہر لے جایا گیا اور کرسی سے باندھ کر زندہ جلا دیا گیا۔ وہ زندہ جل کر شہید ہو گئی اور ہندو اس قدر ظلم و تشدد کے باوجود اس کے قدم راہ حق سے ایک انچ بھی ہٹا نہ سکے۔ وہ ایسی چٹان تھی جسے باطل اپنے سامنے جھکا نہ سکا۔

ایک اور آدمی لطیف الرحمٰن جو غالب پور کا رہنے والا تھا' اس کا انجام بھی میرے سامنے تھا۔ جب وہ مسلمان ہوا تو اس کے گاؤں کے ہندوؤں نے مل کر اس پر ناقابل برداشت تشدد کیا' اس کے باوجود اس نے دوبارہ ہندو بننے سے انکار کر دیا تو ہندوؤں نے اس کی جبری نس بندی کر دی۔ ان کے علاوہ بھی کئی واقعات میرے سامنے تھے۔ میں سوچتا کہ کیا مسلمان ہونے کے بعد اس تشدد سے بچ جاؤں گا اور اگر تشدد ہوا تو کیا میں اس قدر سختی برداشت کرلوں گا۔ سچی بات ہے میں اپنے اندر اتنا تشدد برداشت کرنے کی ہمت نہیں پاتا تھا۔

ہمارے ہی علاقے کا ایک اور ہندو پنڈت بانکے رام مسلمان ہو کر ضیاء الرحمٰن بن گیا تھا۔ یہ اس وقت مسلمان ہوا تھا جب میں ابھی بہت چھوٹا تھا۔ ضیاء الرحمٰن صاحب آج کل سعودی عرب میں استاد ہیں۔ ۱۹۸۳ء میں میری بھابی مایا کی چھوٹی بہن ریشماں سے میری منگنی ہو گئی۔ اس منگنی نے اب میرے مسلمان ہونے کے راستے میں ایک اور رکاوٹ

کھڑی کردی تھی۔ پہلے میں صرف اپنے ماں باپ اور بھائیوں سے خوف زدہ تھا اب یہ بھی خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ سالے بھی ماریں گے۔ایک طرف مار اور تشدد کا خوف تھا اور دوسری طرف اسلام قبول کرنے کے لئے دل بے قرار ہو رہا تھا۔ میں رات دن اپنے خدا کو پکارنے لگا کہ یا اللہ میری مدد کر جو راستہ تو نے دکھایا ہے' اس پر چلنے کی ہمت اور توفیق دے۔

میں اس بات سے بھی خوفزدہ تھا کہ مسلمان ہو گیا تو میرے ماں باپ اور بہن بھائی سب مجھ سے چھوٹ جائیں گے۔ جب میں نے اس کا ذکر جعفر علی سے کیا تو اس نے مجھے قرآن کی آیات سنائیں۔اس نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں'' اے مسلمانو! تمہارے رفیق تو حقیقت میں صرف اللہ اور اللہ کا رسول اور اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول اور اہل ایمان سے دوستی رکھے گا تو وہ اللہ کے گروہ میں سے ہے اور بلاشبہ اللہ ہی کا گروہ غالب رہنے والا ہے۔'' (المائدہ: ۵۵۔۵۶) پھر سورہ توبہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

'' اے اہل ایمان! اگر تمہارے ماں باپ اور بھائی ایمان کے مقابلے میں کفر کو عزیز رکھیں تو ان سے دوستی نہ رکھو اور جو ان سے دوستی رکھیں گے تو وہی ظالم ہیں۔ کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ بیٹے اور بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہاری برادری اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو اور وہ مکانات جن کو پسند کرتے ہو اللہ اور اس کے رسولؐ سے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے تمہیں زیادہ عزیز ہوں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ لے آئے اور اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا''۔

ان کے علاوہ بھی اس نے کئی آیات اور احادیث سنائیں اور میں یہ سب کچھ سن کر حیران رہ گیا کہ کتنا مکمل دین ہے اور قرآن کتنی مکمل کتاب ہے کہ جو سوچو اس کا جواب پہلے ہی اس کتاب میں موجود ہے۔ آخر وہ دن آ پہنچا جب اللہ تعالیٰ نے مجھے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کرنے کی توفیق دے ہی دی۔ یہ بدھ ۱۳۔ اپریل ۱۹۸۳ء کو صبح دس بجے کا وقت تھا جب میں کریم الدین پور میں جہاں پانچ ہزار مسلمان رہتے ہیں' مولانا رضوان احمد رضوی

صاحب کے پاس پہنچ گیا اور اسلام قبول کر لیا۔ میرا نام محمد علی رکھا گیا۔

میں نے شروع میں اپنے اسلام کو خفیہ رکھا۔ جمعے کے دن میں مسجد میں جا کر جمعہ پڑھنا چاہتا تھا مگر یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ اس روز مسجدوں کے دروازں پر بہت بڑی تعداد میں ہندو اپنے مریضوں اور بچوں کو دم کرانے کے لئے کھڑے ہوتے ہیں اور کئی ہندو چیزیں بیچنے کے لئے بھی آئے ہوتے ہیں' اس لئے پہچان لئے جانے کا خطرہ تھا۔ اس خطرے سے بچنے کے لئے مولانا رضوان صاحب میرے لئے جعلی ڈاڑھی اور مونچھیں لے آئے اور مجھے لگا دیں۔ علی گڑھ کا کرتہ پاجامہ اور کھڑی ٹوپی پہنی۔ مولانا صاحب نے شیروانی بھی دی۔ آنکھوں پر لگانے کے لئے چشمہ بھی دیا۔ اس طرح حلیہ بدل کر میں مولانا کے ساتھ مسجد میں آیا۔ میری شکل کسی بہت بڑے عالم کی طرح لگ رہی تھی۔

میں نماز کی عملی ترکیب سے آگاہ نہیں تھا' جب امام صاحب دو فرضوں کے لئے کھڑے ہوئے تو میں بھی کھڑا ہو گیا سجدے میں گیا تو ڈاڑھی گر پڑی۔ میں نے مونچھیں بھی اتار کر جیب میں ڈال لیں۔ دوسرے سجدے میں عینک بھی اتر گئی۔ نماز سے فارغ ہو کر لوگ میری طرف تعجب سے دیکھنے لگے۔ میں اس صورت حال سے گھبرا گیا۔ مولانا رضوان صاحب نے تسلی دی۔ وہ کھڑے ہو گئے اور انہوں نے اعلان کر دیا کہ رام چندر ولد جمنا داس مسلمان ہو گیا ہے' ابھی کسی ہندو کو اس کے مسلمان ہونے کا علم نہیں اس لئے آپ بھی اسے خفیہ رکھیں۔ اس کے بعد انہوں نے بتایا کہ ہم چاہتے ہیں کہ رام چندر کو جس کا نام اب محمد علی ہے دہلی بھیج دیا جائے تاکہ وہاں وہ ہندوؤں کے ظلم و ستم سے بچ کر تعلیم حاصل کر سکے۔ یہ اعلان مسجد کے اندر کیا گیا اس لئے باہر کھڑے لوگوں کو یہ آواز سنائی نہیں دے سکتی تھی۔ نمازیوں نے یہ سن کر نعرۂ تکبیر بلند کیا اور بہت خوش ہوئے۔ مجھے مبارکباد دی اور سب نے میرے لئے استقامت کی دعا کی۔

اتفاق سے جمعے کو میری دادی بیمار تھی۔ وہ بھی دم کرانے مسجد کے دروازے پر آئی ہوئی تھی۔ میں مسجد سے باہر نکلنے لگا تو اس نے مجھے پہچان لیا اور چیخ کر پوچھا ''تو مسجد سے کیوں نکل رہا ہے؟''

''ہاں دادی اماں' میں مسلمان ہو گیا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

یہ سننا تھا کہ اس نے میرے منہ پر زور کا تھپڑ رسید کیا۔ برا بھلا کہنے لگی' شور مچا دیا اور چیخ چیخ کر ہندوؤں کو پکارنا شروع کر دیا۔ چیخ و پکار سن کر ارد گرد کے ہندو و مسلمان اکٹھے ہو گئے۔ مسلمان خوش تھے جبکہ ہندوؤں کے چہروں پر غیظ و غضب دیکھنے والا تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر میں پریشان ہو گیا اور دل ہی دل میں اللہ سے مدد کی دعا کرنے لگا۔ ہندو بڑے چالاک اور مکار تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کی موجودگی میں وہ مجھے نہیں پکڑ سکتے اس لئے پولیس کو بلا لائے۔ پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا اور گھوسی تھانے میں لے گئی۔ میرے ایمان کی آزمائش کا دَور یہاں سے شروع ہو گیا۔

تھانے دار نے پہلے پیار سے پوچھا کہ تمہیں کس نے ورغلایا ہے۔ اس مُسلے کا نام بتا دو ہم اس کی ہڈی پسلی ایک کر دیں گے اور تمہیں چھوڑ دیں گے۔ "مجھے میرے دل نے ورغلایا ہے' میرے رب نے ورغلایا ہے' مجھے سچائی نے ورغلایا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "تھانے دار صاحب! اس معصوم بچے پر مُسلوں نے جادو کر دیا ہے' یہ رام چندر نہیں اس کے اندر کوئی مُسلا بول رہا ہے۔" ایک ہندو نے آواز لگائی۔

تھانے دار پھر پیار سے پوچھنے لگا: "دیکھو بیٹا! ہم جانتے ہیں کہ یہ مُسلے بڑے چالاک اور مکار ہوتے ہیں۔ ہمارے بچوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔ تم ابھی بچے ہو اور سیدھے سادے ہو' اس عمر میں ان چالاکیوں کو نہیں سمجھتے۔ اگر تمہیں مُسلوں نے روپے پیسے کا لالچ دیا ہے تو وہ بھی بتا دو"۔

"مجھے کسی مسلمان نے روپے پیسے کا لالچ نہیں دیا' میں نے اسلام کو سچائی جان کر قبول کیا ہے"۔ میں نے بتایا۔ "دیکھ بیٹے! ان مکار مسلوں کی خاطر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو' یہ لوگ تمہیں تنہا چھوڑ دیں گے اور کسی مصیبت میں تمہارا ساتھ نہ دیں گے۔ مصیبت کے وقت ہمیشہ اپنے بہن بھائی ہی کام آتے ہیں اس لئے تم بھگوان سے معافی مانگ لو۔ بھگوان بہت اچھے ہیں وہ تمہیں معاف کر دیں گے۔ پنڈت جی اور ہم سب مل کر بھگوان سے تمہارے لئے معافی کی پرارتھنا کریں گے۔ اگر بھگوان کو تم نے جلد راضی نہ کیا تو اس کا غصہ تمہیں تباہ کر دے گا"۔ تھانے دار نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ میں نے جواب دیا: "میں تمہارے کسی بھگوان کو نہیں مانتا اور نہ مجھے تمہارے کسی بھگوان کی خوشی اور ناراضی

کی پروا ہے۔تمہارا بھگوان اپنے اوپر بیٹھی ہوئی مکھی کو تو اڑا نہیں سکتا میرا کیا بگاڑ لے گا؟ میری زندگی اور موت صرف میرے اللہ کے لیے ہے۔ مجھے صرف اسی کی خوشی اور ناراضگی کی فکر دامن گیر ہے اور میں صرف اسی سے ڈرنے والا ہوں"۔ میرا یہ جواب سن کر تھانے دار اور اس کے پاس بیٹھے ہوئے متعصب ہندو سیخ پا ہو گئے۔ زناٹے کا تھپڑ میرے منہ پر پڑا اور میں گر پڑا۔ "ذلیل' کمینے! ہمارے سامنے ہمارے بھگوان کی شان میں گستاخی کرتا ہے۔ میں تمہاری ہڈی پسلی ایک کروں گا"۔ تھانے دار چیخا۔

مجھے زمین پر لٹا دیا گیا اور ڈنڈوں سے پٹائی شروع ہو گئی۔ تشدد نا قابل برداشت تھا۔ میں ذہنی طور پر اس تشدد کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ میرے ایمان کی آزمائش کا وقت ہے۔ یہ وہی آزمائش کی بھٹی ہے جس میں سے حضرت بلالؓ ' حضرت صہیبؓ اور حضرت خبیبؓ جیسے صحابی گزر کر سونا بنے تھے۔ ان عظیم ہستیوں کے واقعات جعفر مجھے سنا چکا تھا۔ مشرکین مکہ کے مظالم اور صحابہؓ رسول کی استقامت مجھے یاد تھی۔ مجھے آج انہی کی سنت پر چلنا تھا۔ مجھے قرآن میں دیا جانے والا خدا کا یہ حکم بھی یاد تھا جو میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا "کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ یہ ضرور معلوم کر کے رہے گا کہ اظہار ایمان میں سچے کون ہیں اور جھوٹے کون؟"

مجھے اپنی سچائی کو ثابت کرنا تھا اس لئے میں نے اپنے اللہ سے استقامت کی دعا کرتے ہوئے کہا "اے اللہ میں کمزور ہوں۔ اس ظلم و تشدد کے مقابلے میں مجھے ثابت قدم رکھنا جس طرح تو نے مجھے اسلام قبول کرنے کی توفیق دی اب اسی طرح اس کی سچائی کی شہادت کی توفیق بھی دینا"۔

مشرکین مکہ ۳۶۰ بتوں کی پوجا کرتے تھے تو یہاں بھی مشرک اور کافر ہندو ہزاروں بتوں کی پوجا کرتے تھے بلکہ ان کافروں نے تو گائے اور ہنومان (بندر) کو بھی دیوتا کا درجہ دے رکھا تھا' ایک بات اور مشترک تھی کہ دونوں ظالم اور ہٹ دھرم تھے۔

ہر چوٹ پر میری زبان سے آہ کے ساتھ نکلتا "یا اللہ میری مدد کر"۔ اللہ کا لفظ سن کر

تھانیدار کے ڈنڈے میں اور زور آ جاتا اور غصے میں اور زیادہ زور سے مارتا۔ تشدد بڑھتا جارہا تھا۔ میں ڈر رہا تھا کہیں میرا حوصلہ، میری ہمت نہ جواب دے جائے۔ جب بھی ہمت جواب دینے لگتی تو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے یہ الفاظ میرے ذہن میں گونجنے لگتے ''جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور خوش ہو جاؤ اس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی۔ وہاں جو کچھ تم چاہو گے تمہیں ملے گا اور ہر چیز جس کی تم تمنا کرو گے وہ تمہاری ہوگی۔ یہ ہے سامانِ ضیافت اس ہستی کی طرف سے جو غفور اور رحیم ہے''۔ (حم السجدہ: ۳۰ تا ۳۲)۔

اس سے مجھے حوصلہ ملتا، پھر ارمیلا کی استقامت بھی میرے سامنے تھی کہ ایک لڑکی ہو کر وہ زندہ جل گئی لیکن اس کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی اور میں تو جوان مرد ہوں۔ یہ سوچ کر میری ہمت بندھ جاتی۔ جس قدر وہ مار سکتے تھے انہوں نے مجھے مارا۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ جب وہ میرے پاؤں کے تلووں پر ڈنڈے مارتے تھے تو ان کی چنگاریاں مجھے اپنی آنکھوں سے نکلتی محسوس ہوتی تھیں۔ اگر میرے اللہ کی مدد میرے شاملِ حال نہ ہوتی اور وہ مجھے ہمت واستقامت نہ دیتا تو یہ تشدد میں کبھی برداشت نہ کر پاتا۔

مسلمانوں نے مقدمہ دائر کیا۔ جب معائنے کے لئے مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا تو اس نے مجھے پاگل قرار دے دیا اور اس پر جج نے مقدمہ خارج کر دیا اس لئے کہ دونوں متعصب ہندو تھے۔ انہیں اپنے فرائض سے زیادہ اپنے جھوٹے بھگوان کی خوشنودی عزیز تھی۔ مجھے ڈیڑھ ماہ تک جیل میں رکھا گیا۔ جب بھی میں کچھ کہنا چاہتا دو دو تین تین ہندو سپاہی مجھے مارنا شروع کر دیتے اور اس وقت تک مارتے رہتے جب تک میں بے ہوش نہ ہو جاتا۔ بعض اوقات میں مار سے گھبرا جاتا اور شیطان مجھے ورغلانے لگتا کہ بہتر ہے تم دوبارہ ہندو ہو جاؤ۔ یہ بات مجھے اور پریشان کر دیتی، میں خدا کے حضور جھک جاتا اور دستِ دعا دراز کرتا ''اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں کو ہدایت کے بعد غلط راستے پر نہ پھیر اور اپنے پاس سے مجھ پر رحمت فرما۔ بے شک تو ہی رحمت فرمانے والا ہے''۔

اور بھی بہت سی دعائیں جو یاد تھیں میں اللہ کے حضور مانگتا رہا۔ ان میں سے دو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک وہ دعا جو بنی اسرائیل ظالم فرعون کے مظالم سے نجات کے لئے خدا سے مانگا کرتے تھے: "اے ہمارے پروردگار! ہم کو ظالم لوگوں کے ظلم کا تختۂ مشق نہ بنا اور اپنی رحمت سے ہم کو ان لوگوں سے نجات دے جو کافر ہیں"۔ (سورہ یونس) دوسری دعا کا تعلق بھی فرعون کے ظلم سے ہے اور یہ وہ دعا ہے جو فرعون کے دربار میں جادوگروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کے بعد اللہ سے مانگی تھی۔ "اے ہمارے پروردگار! ہمیں صبر عطا فرما دے اور فرمانبرداری کی حالت میں ہم کو موت دے"۔ (سورہ اعراف)۔

ڈیڑھ ماہ بعد مجھے ہندوؤں کے حوالے کر دیا گیا۔ ہندوؤں نے پہلے میرے ماں باپ کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی، طرح طرح کے لالچ اور دھمکیاں دیں مگر میں کسی طرح بھی دوبارہ ہندو بننے کو تیار نہ تھا۔ تنگ آ کر انہوں نے میرے قتل کا منصوبہ بنا لیا۔ مجھے اپنا انجام ارمیلا کی طرح نظر آنے لگا۔ میں سوچنے لگا نہ جانے ہندو مجھے کیسی اذیتیں دے کر قتل کریں گے یا پھر ارمیلا کی طرح مجھے بھی زندہ جلا دیں گے۔ کیا میں یہ سب کچھ برداشت کر پاؤں گا۔ دل کہتا کہ جس اللہ نے پہلے والا ظلم وتشدد برداشت کرنے کی ہمت دی تھی وہی اللہ آئندہ بھی برداشت کرنے کی توفیق دے گا۔ میں نے ہندوؤں کے قبضے سے بھاگنا چاہا مگر انہوں نے مجھے پکڑ لیا اور مارنا شروع کر دیا۔ یہ مار اب میرے لئے کوئی نئی نہیں تھی۔ پچھلے ڈیڑھ ماہ سے میرے ساتھ یہی سلوک ہو رہا تھا۔ اب بھی متعصب ہندو بھوکے کتوں کی طرح مجھ پر پل پڑے۔ کوئی بال کھینچ رہا تھا کوئی ٹھڈے مار رہا تھا۔ کوئی ڈنڈوں سے پیٹ رہا تھا اور کوئی گالیاں دے رہا تھا۔ ان سب اپنوں اور بیگانوں میں صرف ایک میری بھابھی مایا تھی جو مجھے ان خونیں ہندوؤں سے بچانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی، گاؤں کے مسلمان بھی بے بس تھے۔ پولیس کے خوف سے وہ میری کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔

ایک روز دور دور سے پنڈت، ٹھاکر اور سادھو آئے ہوئے تھے۔ وہ ہر حالت میں مجھے ہندو بنانا چاہتے تھے۔ مجھے اس قدر مارا گیا کہ میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو میرے

پاؤں میں موٹی رسی بندھی ہوئی تھی اور مجھے گھسیٹتے ہوئے شنکر مندر کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ آزمائش کے اس لمحے میں ماں باپ' بہن بھائی سب میرا ساتھ چھوڑ چکے تھے بلکہ وہ بھی دوسرے ہندوؤں کی طرح میرے خون کے پیاسے بن چکے تھے۔ وہ مجھے مسلسل گھسیٹتے رہے میری ساری پشت شدید زخمی ہو چکی تھی۔ راستے میں کبھی بے ہوش ہو جاتا اور کبھی ہوش میں آ جاتا۔ معلوم نہیں وہ اس قدر اذیتیں دے کر مجھے کیوں قتل کرنا چاہ رہے تھے۔ وہ مجھے ارمیلا کی طرح آگ کیوں نہیں لگا دیتے تاکہ میں جلد جل کر مر جاؤں اور اس قدر اذیت سے جان چھوٹ جائے۔ شاید ارد گرد کے دیہات میں جو شودر اور ہریجن مسلمان ہوئے تھے ان سب کا بدلہ وہ مجھ سے لے رہے تھے۔ میں ایک بے بس شکار کی طرح ان کے قابو میں آ چکا تھا اور ہر کوئی مجھے نوچ رہا تھا۔ قہقہے لگائے جا رہے تھے اور میرے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو بھی گندی گالیاں دی جا رہی تھیں۔ اس اذیت کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا جو اسلام قبول کرنے کے جرم میں مجھے دی جا رہی تھی۔ تکلیف سے میرا بُرا حال تھا۔ راستے کے کنکر اور کانٹے میرے جسم میں چبھتے جا رہے تھے۔ میں خدا سے دعا مانگنے لگا یا اللہ میری موت کو آسان کر دے اور میری زندگی کا خاتمہ ایمان پر کرنا۔ یا اللہ مجھے اس اذیت سے نجات دلا۔ اس حالت میں بھی جب میں کلمہ طیبہ کا ورد کرتا تو مجھے سکون محسوس ہوتا اور یوں لگتا جیسے کوئی تکلیف ہی نہیں۔ شنکر مندر ہمارے گاؤں سے تقریباً سوا کلومیٹر دور ہے۔ گھوسی کے قریب مدول اور چھبریا گاؤں کے بیچ میں ایک جنگل ہے اور جنگل میں یہ مندر ہے۔ مندر کے سامنے ایک تالاب ہے اس کا نام ڈگواں تالاب ہے۔ اس کے کنارے شمشان گھاٹ ہے جہاں ہندو اپنے مردوں کو جلاتے ہیں۔

میرا خیال تھا کہ اب ہندو مجھے یہاں زندہ جلا دیں گے۔ اللہ سے ملاقات کی خوشی میں ایک لہر سی میرے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ میں اپنے آپ کو اس دنیا سے بہت دور دوسری دنیا میں دیکھنے لگا۔ موت کا منظر' مرنے کے بعد کیا ہو گا جو کتاب پڑھی تھی اس کا بیان کردہ ایک ایک منظر میرے ذہن میں گھومنے لگا۔ اللہ کے حضور میرے دل سے دعا نکلنے لگی۔ ''یا اللہ! دوزخ سے بچانا۔ قبر کا حساب آسان کرنا۔ اپنے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت نصیب کرنا اور اپنے دیدار کی سعادت بخشنا''۔

مندر میں لے جا کر میرے کپڑے اتار کر جلا دیے گئے اور پیلے رنگ کی دھوتی پہنا دی گئی۔ راکھ لا کر میرے بدن پر ملی گئی اور ماتھے پر تلک لگایا گیا۔ انہوں نے میرا سر منڈا دیا اور چٹیا (بودی) چھوڑ دی۔ سُور کے دو بچے لائے گئے ان کو قتل کر کے ان کے خون سے مجھے غسل دیا گیا۔ پھر پنڈت آیا اس نے کتھا شروع کی اور رامائن پڑھنے لگا۔

یہ سب کچھ ہوتا دیکھ کر مَیں سوچ رہا تھا کہ ہندو مجھے زندہ جلانے سے پہلے اپنی مذہبی رسومات ادا کر رہے ہیں۔ ان سب رسومات کو دیکھ کر مَیں خدا سے عرض کرنے لگا کہ یا اللہ میرا ان رسومات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تو جانتا ہے مَیں یہاں بے بس ہوں، اس لئے مجھے معاف کر دینا۔ مَیں انہی سوچوں میں تھا کہ کتھا مکمل کرنے کے بعد پنڈت نے اعلان کیا کہ محمد علی اب رام چندر ہو گیا ہے۔ یہ اعلان سن کر ہندو خوشی سے ناچنے لگے، مٹھائی تقسیم کی گئی اور ہندو ایک دوسرے کو مبارک باد دینے لگے۔ میرے لئے یہ فیصلہ غیر متوقع ہی نہیں بلکہ تکلیف دہ بھی تھا۔ مرنے کے لئے مَیں تیار ہو چکا تھا اور جس طرح کی زندگی مجھے دینا چاہتے تھے وہ مجھے قبول نہیں تھی۔ مَیں رام چندر بن کر ایک لحہ بھی نہیں گزارنا چاہتا تھا اور محمد علی بن کر ہزار بار بھی موت کو گلے لگانے کو تیار تھا۔ میرے لئے زندگی کے یہ لحات پہلی تمام اذیتوں سے بھی زیادہ اذیت ناک تھے۔ ان کی مبارک بادیں اور خوشی کے قہقہے میرے سینے میں خنجر کی تیز نوک بن کر چبھ رہے تھے۔ مَیں زیادہ دیر برداشت نہ کر سکا اور اعلان کر دیا: ''ہندوؤ! سن لو تم لوگ مجھے دوبارہ ہندو نہیں بنا سکتے' مَیں خدائے واحد کو چھوڑ کر پتھر کے تراشے ہوئے بتوں کے سامنے سجدہ ریز نہیں ہو سکتا۔ اعلان کرتا ہوں کہ مَیں مسلمان ہوں مجھے مسلمانوں کے پاس جانے دو''۔

یہ کہنا تھا کہ انہوں نے پھر مجھے مارنا شروع کر دیا۔ وہ وقفوں وقفوں سے مارتے رہے یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ رات کو انہوں نے مجھے مندر کے اندر بند کر دیا اور تالے لگا کر سارے ہندو اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ مندر میں بند کرتے وقت پنڈت نے کہا ''تم بھگوان کے دشمن ہو' تم بھگوان کی شکتی کے منکر ہو' تم ہمارے دیوتاؤں کو برا کہتے ہو آج رات بھگوان کی کرپا (طفیل) سے جن اور بھوت تمہیں کھا جائیں گے''۔

''اگر رام چندر ہوتا تو شاید کھا جاتے مگر خدائے وحدہٗ لاشریک کی قسم مَیں اب محمد علی

ہوں جن بھوت میرا نام سن کر ہی خاک ہو جائیں گے"۔ میرے منہ سے نکلا ۔ مندر میں کالی مائی کلکتے والی کا خوفناک بت تھا۔ اس کے علاوہ گنیش اور سری کرشن کے بت تھے ۔ گائے ماتا کے بت بھی تھے ۔ رات کے سناٹے میں میں مندر کے اندر تنہا تھا اور وہاں ایک خوفناک منظر تھا۔ اگر مسلمان ہونے سے پہلے مجھے یہاں اس طرح رات گزارنی پڑتی تو شاید خوف کے مارے میں چند لمحوں میں مر جاتا' لیکن اب تو مجھے اپنے خدا پر کامل یقین تھا کہ یہ پتھر اور مٹی کے بت میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے لیکن اس کے باوجود دل میں ایک خوف تھا۔ آخر اپنی زندگی ان بتوں کو بھگوان سمجھ کر پرستش کرتے ہوئے اور ان کے مافوق الفطرت کارناموں کے بے شمار من گھڑت قصے سنتے ہوئے گزاری تھی' اس لئے ابھی تک لاشعور میں ان کا خوف باقی تھا۔ شاید اس خوف کو ذہن سے نکالنے کے لئے ہی میرے اللہ نے یہاں مجھے بند کرایا تھا۔ اس خوف کو دور کرنے کے لئے میں ساری رات اللہ کا ذکر کرتا رہا جو آیات اور دعائیں یاد تھیں وہ پڑھتا رہا۔

میری پشت زخمی تھی اس لئے رات کو چت لیٹ کر نہیں سو سکتا تھا۔ ویسے بھی درد کی ٹیسیں پورے جسم سے اٹھ رہی تھیں اور روآں روآں دکھ رہا تھا۔ جانے رات کو کس وقت اور کس طرح اللہ نے نیند دے دی اور شدید تکلیف میں اس نیند سے اللہ تعالیٰ بعد میں بھی مجھے نوازتا رہا۔ دوسرے دن سارے ہندو مجھے زندہ دیکھ کر حیران رہ گئے مگر ان بت پرستوں کی قسمت میں گمراہی لکھی جا چکی تھی اس لئے یہ سب کچھ دیکھ کر بھی وہ حق کو قبول کرنے کو تیار نہ تھے ۔ بجائے اس کے کہ وہ تسلیم کر لیتے کہ مٹی اور پتھر کے بھگوان کسی شکتی یا طاقت کے مالک نہیں ہوتے اور نہ وہ کسی انسان کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں الٹا کہنے لگے "ہمارا بھگوان رحم دل ہے۔ وہ تمہیں سیدھے راستے پر آنے کا مزید موقع دینا چاہتا ہے۔ اس نے تجھے جنوں اور بھوتوں سے بچائے رکھا' اس لئے ہم تم سے کہتے ہیں جتنی جلدی ہو سکے ہندو مت کو دوبارہ قبول کر لو۔ اگر تم نے ہندومت کو جلدی قبول نہ کیا تو پھر بھگوان کی ناراضی تمہیں بھسم کر کے رکھ دے گی"۔ میں ان کی بات سن کر ہنسا کہ پتھر کے بتوں میں بھی دل ہے اور وہ بھی رحم دل ہیں۔ میں نے ان سے کہا "تمہارے یہ مٹی اور پتھر کے بھگوان میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ہاں اگر تم اپنی سلامتی چاہتے ہو اور دوزخ کی آگ

میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نہیں جانا چاہتے تو اسلام قبول کر لو"۔

ایک دفعہ پھر مجھ پر تشدد شروع ہو گیا۔ میں سوچنے لگا کہ ان ظالموں سے مجھے بچانے والا یہاں کوئی نہیں لیکن دل نے اس کی تردید کرتے ہوئے گواہی دی کہ میرا اللہ تو یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہا ہے اور اللہ سے بڑا محافظ کون ہو سکتا ہے۔" اللہ تمہارا مولیٰ ہے اور کیسا اچھا مددگار"۔ پچھلے چوبیس گھنٹے سے میں نے کچھ نہیں کھایا تھا اور نہ کھانے کو مجھے کچھ دیا گیا تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کرم تھا کہ اس نے بھوک برداشت کرنے کی ہمت دی ہوئی تھی۔ میرے ماں باپ اور بہن بھائی تو دوسرے ہندوؤں کے ساتھ مل کر مجھے مار ڈالنے پر تلے ہوئے تھے ایک میری بھابھی ہی رحم دل تھی جس نے مجھے گھر میں بھی ان ظالموں سے بچانے کی کوشش کی تھی اور پھر قید سے رہائی کے لئے اس نے دن رات ایک کر دیا تھا۔ اب بھی اس نے بڑی منتوں اور کوششوں سے ان پنڈتوں اور پجاریوں سے میرے لئے کھانا لانے کی اجازت لی تھی۔ جانے اس کے لئے اس نے کیا کیا جھوٹ بولے ہوں گے۔ میری اس حمایت پر میرے بھائیوں سے اسے مار بھی پڑی تھی لیکن جس طرح اس نے میرا ساتھ دیا وہ میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے ایک رحم دل بہن اور پیار کرنے والی ماں کا حق ادا کیا۔ وہی صبح و شام مندر میں کھانا لے کر آتی۔ مندر کے دن اور راتیں میرے لئے بہت اذیت ناک تھیں۔ زخموں کا درد نہ دن کو چین سے بیٹھنے دیتا نہ رات کو آرام سے سونے دیتا۔ میں اس بت کدے میں دن رات رو رو کر اللہ سے دعا کرتا" اے اللہ تو حق ہے۔ اسلام حق ہے۔ تیرا رسول بھی برحق' اے اللہ اگر میری زندگی ہے تو پھر مجھے ان ظالم کافروں سے نجات دلا دے۔ اگر نہیں ہے تو پھر مجھے جلد اپنے پاس بلا لے۔ کافروں کی مار اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتی"۔ اللہ نے میری دعا قبول کر لی۔ میرے ذہن میں اللہ نے ایک بات ڈال دی کہ مجھے یہاں سے رات کو فرار ہو جانا چاہئے۔ مندر بہت وسیع و عریض تھا اور رات کو یہاں کوئی نہیں ہوتا تھا۔ فرار مشکل ضرور تھا مگر ناممکن نہیں تھا۔ مندر کی دیواریں بہت اونچی تھیں۔ میں نے جائزہ لیا کہ میں بتوں کے اوپر چڑھ کر روشن دان تک پہنچ سکتا ہوں اگر ایک عدد رسی مل جائے تو میں اسے بت کی گردن سے باندھ کر اور روشندان کے ذریعے باہر لٹکا کر آرام سے باہر نکل سکتا ہوں۔

میں نے بھابھی سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ دوسرے دن جب وہ کھانا دینے آئی تو میں نے اپنے منصوبے کا اس سے ذکر کیا۔ منصوبہ سن کر اس نے کہا "ہائے آپ بھگوان کے سر پر چڑھ کر بھاگیں گے" لیکن ساتھ ہی اس نے کہا کہ میں اپنے بھائی کو اس مصیبت سے نجات دلانے کے لئے سب کچھ کروں گی"۔

رات کو جب وہ کھانا دینے آئی تو اپنی کمر سے باندھ کر ایک رسی بھی لیتے آئی۔ میں نے اس سے کہا کہ جہاں تم نے اب تک میری اتنی مدد کی ہے وہاں میرا ایک آخری کام بھی کر دینا۔ فلاں مسلمان کو پیغام دے دینا کہ میں آج رات یہاں سے بھاگ کر آؤں گا اور وہ مجھے پیپل کے درخت کے قریب ملیں۔ بھابھی میرے یہاں سے فرار ہونے پر خوش بھی تھی اور افسردہ بھی۔ اس نے جاتے ہوئے کہا "رام چندر" "نہیں بھابھی میرا نام محمد علی ہے" میں نے تصحیح کی۔ "چلو محمد علی ہی سہی" مجھے تم اپنے سگے بھائیوں سے بھی زیادہ عزیز ہو" مجھے اس بات کا دکھ تو ہے کہ تم جب یہاں سے چلے گئے تو پھر شاید میں زندگی بھر تمہیں کبھی نہ دیکھ سکوں" لیکن تمہیں یہاں اس طرح پٹتے بھی تو نہیں دیکھ سکتی۔ تم نے جتنے دکھ اٹھائے ہیں میرے دل پر بھی اتنے ہی زخم لگے ہیں۔ میں راتوں کو تمہارے لئے روتی رہی ہوں۔ میں نے تمہارے بھائی" ماں اور باپ کو بہت سمجھایا ہے مگر میری کوئی نہیں سنتا۔ یہاں سے جانے کے بعد تم مجھے بہت یاد آؤ گے مگر مجھے ایک اطمینان اور خوشی ہے کہ تم اس عذاب سے تو چھوٹ جاؤ گے۔ میری دعا ہے تم جہاں بھی جاؤ بھگوان تمہاری حفاظت کرے اور تمہیں خوش رکھے"۔

"بھگوان نہیں" اللہ کہو بھابھی جان" میں نے کہا تو وہ ہنس کر بولیں "چلو اللہ ہی کہہ لو"۔ اتنی رحم دل بھابھی سے بچھڑنے کا مجھے بھی بہت دکھ ہو رہا تھا۔ وہ جانے لگی تو میں نے سوچا کہ اس مدد پر اس کا شکریہ ہی ادا کر دوں میں نے آواز دے کر اسے واپس بلایا اور کہا "بھابھی جان! مصیبت میں جب ماں باپ اور بہن بھائی سب ساتھ چھوڑ گئے اور خون کے پیاسے ہو گئے تو میرے خدا کے بعد صرف تم ہو جس نے میری مدد کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کن الفاظ میں تمہارا شکریہ ادا کروں میں تمہاری محبت اور شفقت زندگی کے آخری سانس تک نہیں بھولوں گا۔ میری خاطر تم نے جس طرح مار کھائی اور تکلیفیں اٹھائی

ہیں' میں اس احسان کا بدلہ کبھی نہیں اتار سکتا''۔ میں نے دیکھا کہ بھابھی کی آنکھوں میں آنسو بھر چکے تھے اور وہ دوپٹے سے انہیں پونچھ رہی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر ان کی آواز سسکیوں میں دب کر رہ گئی اور وہ روتی ہوئی چلی گئی۔

کالی مائی کی پتھر کی لمبی زبان باہر نکلی ہوئی تھی' میں نے رسی اس کی زبان سے باندھی اور روشن دان سے باہر نکال دی۔ میں اس کام سے فارغ ہوا تو یک لخت میرے ذہن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ گھوم گیا جب شہر کے لوگ باہر میلے میں گئے ہوئے تھے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بت خانے میں داخل ہو کر کسی بت کا سر اڑا دیا کسی کا کان' کسی کی ناک اور کسی کے ہاتھ۔ میں نے سوچا کیوں نہ میں بھی اس بت خانے کا وہی حشر کر کے سنت ابراہیمی کا ثواب کماؤں۔

میرا جسم زخموں سے چور چور تھا۔ زخم خراب ہو چکے تھے لیکن اس کے باوجود میں نے سنت ابراہیمی کی یاد تازہ کرنے کا فیصلہ کر لیا میں نے مندر کے اندر لگے ہوئے پوسٹر پھاڑ دیئے اور ایک اینٹ اٹھا کر بتوں کا حلیہ بگاڑنے لگا اور کسی کی ناک' کسی کا ہاتھ' کسی کا کان اور کسی کی آنکھ ضائع کر دی۔

مرغ کی اذان سے وقت کا اندازہ لگایا اور رسی کے ذریعے روشن دان کے باہر کود گیا۔ مسلمان پیپل کے قریب میرا انتظار کر رہے تھے۔ میرے جسم پر صرف ایک دھوتی تھی۔ میں نے اپنے اوپر گزرنے والے حالات سے مختصراً مسلمانوں کو آگاہ کیا۔ انہوں نے مجھے کار میں سوار کیا اور جونپور کے ریاض العلوم میں لے آئے۔ جونپور ہمارے گاؤں سے ۱۰۰ کلو میٹر دور ہے۔ مولانا علیم صاحب وہاں کے مہتمم تھے۔ ہم لوگ کچھ دیر ان کے پاس رہے اور پھر مولانا صاحب کے حکم کے مطابق بمبئی روانہ ہو گئے۔ بمبئی میں حاجی شمس الدین صاحب کے پاس قیام ہوا۔ یہ بھی میرے گاؤں کے رہنے والے اور ہمسائے تھے۔ حاجی صاحب دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں۔ ان کا بمبئی میں بہت بڑا کاروبار ہے۔ وہ جمعیت العلمائے ہند کے اہم عہدیدار بھی ہیں اور طبیہ کالج مدن پورہ کی انتظامیہ کے سیکرٹری بھی ہیں۔ میں شدید زخمی تھا' مجھے فوراً ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ میری پشت کی کھال سے کئی آپریشنوں کے بعد سینکڑوں کنکریاں اور کانٹے نکالے گئے جو گھسیٹنے کے

دوران میں میری کھال میں چھ چکے تھے۔ چھ ماہ تک میں ہسپتال میں زیر علاج رہا۔ اسی دوران میں میرے ختنے بھی ہوئے۔

حاجی صاحب کے پاس میں تقریباً ایک سال رہا۔ اس کے بعد دارالعلوم امدادیہ بمبئی میں داخل کرا دیا گیا۔ یہاں میں تین سال تک رہا۔ ان تین برسوں میں ابتدائی اردو، قرآن ناظرہ اور درجہ اول کا امتحان پاس کیا۔ اس دوران میں مجھے اپنی بھابھی کی یاد آتی رہی لیکن اس سے جا کر مل نہیں سکتا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ گھر والے بھی مجھے تلاش کرتے رہے کیونکہ مجھے دوبارہ ہندو بنانے کی ان کی خواہش پوری نہیں ہوئی تھی۔ ایک دن مجھے پتہ چلا کہ حاجی صاحب بمبئی سے گاؤں جا رہے ہیں۔ میں نے بھابھی کے نام انہیں ایک خط دیا اور تاکید کی کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔ گھر والوں کو نجانے کس طرح پتہ چل گیا اور وہ مجھے پکڑنے کے لئے دوسرے ہندوؤں سمیت بمبئی آ پہنچے۔ ان کے ایما پر پولیس مدرسے اور حاجی صاحب کے گھر بار بار چکر لگاتی رہی۔ یہ صورت حال دیکھ کر حاجی صاحب نے دوسرے علما سے میرے بارے میں مشورہ کیا۔ کسی نے صلاح دی کہ اسے سعودی عرب بھیج دیا جائے اور کسی نے کہا ایران۔ آخر فیصلہ ہوا کہ پاکستان سب سے اچھا رہے گا۔ اس طرح ۱۸ مئی ۱۹۸۶ء کو میں پاکستان آ گیا۔ پاکستان میں مولانا عبداللہ خطیب مرکزی جامع مسجد اسلام آباد میرے سرپرست مقرر ہوئے اور اسلام آباد ہی میں میں نے دینی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ مولانا عبداللہ صاحب نے صدر ضیاء الحق سے بھی میری ملاقات کرائی۔ اسلام آباد ہوٹل میں علما و مشائخ کی کانفرنس تھی۔ میں بھی اس میں شریک تھا۔ مولانا مجھے صدر صاحب کے پاس لے گئے اور میرے بارے میں بتایا۔ صدر پاکستان میرے اسلام قبول کرنے کا سن کر بہت خوش ہوئے۔ میں نے پاکستانی شہریت کی بات کی تو انہوں نے فوراً رقعہ لکھ دیا۔ میں نے صدر ضیاء الحق کی اسلام دوستی کے بارے میں جو کچھ سنا تھا اس سے بڑھ کر پایا۔ وہ واقعۃً اس دور کے ایک عظیم جرنیل اور درویش صفت، خدا ترس حکمران تھے۔

مولانا عبداللہ صاحب کا تعلق حرکۃ الجہاد الاسلامی سے بھی ہے۔ مذکورہ بالا کانفرنس میں میں نے علما اور حرکۃ الجہاد کے لوگوں کو جہاد افغانستان پر بحث کرتے سنا۔ ان کی باتیں

سن کر مجھے بھی جہاد افغانستان میں دلچسپی ہوئی اور میرا دل میدانِ جہاد میں جانے کے لئے بے قرار ہونے لگا۔ جہاد میں شرکت کی سعادت حاصل کرنے کی خواہش انگڑائیاں لینے لگی۔

اسی شوق کی تکمیل میں مَیں نے ۱۹۸۷ء میں افغانستان کی طرف سفر کیا۔ صوبہ پکتیا میں الفتح غنڈ کے قریب فیض پوسٹ پر قیام ہوا۔ سرفراز صاحب ہمارے کمانڈر تھے۔ مَیں وہاں سولہ دن رہا۔ اس دوران میں اسلحے کی ابتدائی ٹریننگ لی اور جاجی چھاؤنی پر حملے میں بھی شرکت کی۔ دوسری دفعہ جمعیت مجاہدین کے امیر مولانا مسعود احمد کاشمیری کے ساتھ خوست کے قریب باڑی کے علاقے میں گیا۔ یہاں ایک ہفتہ رہا اور لڑائی میں شرکت بھی کی۔ اس لڑائی میں ایک بارودی سرنگ سے مولانا مسعود صاحب کی بائیں ٹانگ اڑ گئی۔ خون فوارے کی طرح بہنے لگا لیکن وہ اللہ کا بندہ اپنی زندگی کے آخری سانسوں تک بھی مجھے جہاد کی تلقین کرتا رہا۔ آدھ گھنٹے کے بعد وہ شہید ہو گئے۔ اسی معرکے میں ایک مجاہد عبدالستار ملتانی کا بھی پاؤں شدید زخمی ہو گیا۔ ٹانگ کاٹنے کا کہا تو اس نے خود ہی اپنی پنڈلی جو تھوڑے سے گوشت کے ساتھ لٹکی ہوئی تھی کھینچ کر علیحدہ کر دی۔ بروقت طبی امداد نہ ملنے اور خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے یہ بھی شہید ہو گئے۔

مَیں صوبہ پکتیکا میں اور خوست کے قریب ماشری کنڈو کے محاذ پر بھی گیا۔ باڑی کے محاذ پر کمانڈر خالد زبیر بھی میرے سامنے شہید ہوئے اور خالد محمود اور عبدالرحمن کی ٹانگیں بھی کٹ گئیں۔ مَیں جب بھی افغانستان گیا میری ہمیشہ خواہش رہی کہ اللہ تعالیٰ مجھے شہادت کے اعزاز سے نوازے لیکن شاید ابھی تک مَیں اپنے آپ کو شہادت کے قابل ثابت نہیں کر سکا۔

●......●......●

محمد سلیمان ٹاکنچی

(جاپان)

(MOHAMMAD SULEMAN TAKENCHI)

خدا کے فضل سے میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ میرے قبول اسلام کی وجوہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ میں نے اسلام میں اخوت کا ایسا نظام دیکھا ہے جو مستحکم بنیادوں پر استوار ہے۔

۲۔ اسلام انسانی زندگی کے مسائل کا بڑا کامیاب عملی حل پیش کرتا ہے۔ یہ عبادات کو انسان کی سماجی زندگی سے الگ نہیں کرتا بلکہ مسلمان تو اجتماعی عبادت کا تصور رکھتے ہیں۔ (یعنی نمازیں باجماعت ادا کرتے ہیں اور خلقِ خدا کی خدمت رضائے الٰہی سمجھ کر کرتے ہیں)

۳۔ اسلام انسانی زندگی میں مادیت اور روحانیت کا خوبصورت امتزاج پیش کرتا ہے۔

اب میں ان تینوں پہلوؤں کی تھوڑی سی وضاحت کروں گا۔

اسلامی اخوت کسی نوعیت کی قومی، خاندانی یا لسانی حد بندیوں کو قبول نہیں کرتی بلکہ سارے مسلمانوں کو محض عقیدے کی بنا پر بھائی چارے کے مضبوط بندھن میں باندھ دیتی ہے، پھر اسلام کسی ایک طبقے یا مخصوص گروہ تک محدود نہیں۔ یہ تمام انسانوں کا مذہب ہے خواہ وہ امیر ہوں یا غریب۔ کالے ہوں یا گورے، عرب ہوں یا پاکستانی، افغان ہوں یا ہندوستانی وغیرہ۔ الغرض اسلام ایک بین الاقوامی مذہب ہے۔

اسلام زندگی سے فرار حاصل نہیں کرتا۔ یہ ہر طرح کی مصروفیات کا چیلنج قبول کرتا ہے۔ بلکہ صرف یہی وہ مذہب ہے جو وقت جیسی قیمتی نعمت کی ناقدری نہیں کرتا۔ اسی لئے یہ

آج بھی اسی طرح قابلِ عمل ہے جس طرح آج سے چودہ سو سال پہلے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں تھا۔ اسلام دینِ فطرت ہے' اس لئے اس میں اتنی لچک ہے کہ یہ ہر دور میں ہر ملک کے عوام کے لئے توازن و اعتدال کا ایک معیّن خاکہ پیش کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اپنی مختصر سی تاریخ میں اس مذہب نے انسانی تہذیب کے ارتقا میں زبردست رول ادا کیا ہے۔

اسلام میں نجات کا راستہ سماج کے اندر سے ہو کر گزرتا ہے۔ یہ زندگی گزارنے کا کوئی درمیانی راستہ نہیں نکالتا۔ میں بدھ مت اور عیسائیت کے بارے میں جو کچھ جانتا ہوں اس کے مطابق دونوں مذاہب ترکِ تعلقات کی ترغیب دیتے اور انسانی معاشرے سے کٹ کر رہنے پر بخشش و انعام کا مژدہ سناتے ہیں۔ کچھ ایسے بدھ فرقے بھی ہیں جو پہاڑوں کی خطرناک ڈھلوانوں پر مندر تعمیر کرتے ہیں' تاکہ جو بھی وہاں پہنچنے کا قصد کرے پہلے جان جوکھوں میں ڈالے پھر وہاں پہنچے۔ چنانچہ جاپانی مذاہب میں بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ خدا تک کسی عام آدمی کی رسائی ممکن نہیں۔ یہی حالت عیسائیت کی ہے۔ عیسائی راہبوں کی خانقاہیں عموماً انسانی بستیوں سے دور پہاڑوں یا جنگلوں میں ہوتی ہیں۔ یہاں بھی مذہبی زندگی اور معاشرتی زندگی میں ناقابلِ عبور خلیج حائل ہے۔ مگر اسلام کا معاملہ ان سارے مذاہب سے بالکل مختلف ہے۔ مسجد عام طور پر گاؤں' قصبے یا کاروباری مراکز کے عین قلب میں واقع ہوتی ہے۔ نماز جماعت کے ساتھ ادا ہوتی ہے اور معاشرے کی خدمت دین کا ایک لازمی جزو سمجھی جاتی ہے۔

حیاتِ انسانی روح اور مادے کا مجموعہ ہے۔ خالقِ اکبر نے ہمیں جسم بھی دیا ہے اور روح بھی اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم ان دونوں کے تقاضوں کو بروئے کار لائیں اور مادیت و روحانیت کے درمیان کوئی خط نہ کھینچیں۔ اسلام اس معاملے میں بھی نہایت معقول رویہ اپناتا ہے اور روح اور مادے دونوں کی اہمیت کو یکساں تسلیم کرتا ہے۔ دونوں کو ان کے اصل مقام پر رکھتے ہوئے وہ ایسی حکمتِ عملی اختیار کرتا ہے جو زندگی کے سارے تقاضوں پر محیط ہوتی ہے۔

آج حالت یہ ہے کہ جاپان صنعتی اعتبار سے ایشیا کا سب سے ترقی یافتہ ملک ہے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کی بے پناہ ترقی اور اس کے اثرات نے ہمارے معاشرے کو کلیتہً بدل دیا ہے اور مادی نقطۂ نظر ہر بات پر حاوی ہے۔ چونکہ ہمارے ملک میں قدرتی وسائل کا فقدان ہے اس لئے تمامتر انحصار سخت کوشی پر ہے۔ ہمیں اپنا معیار زندگی برقرار رکھنے کے لئے شب و روز محنت کرنی پڑتی ہے اور صرف یہی وہ ذریعہ ہے جس کے سبب ہماری تجارت اور صنعت بھی زندہ رہ سکتی ہے۔ چنانچہ ہم ایک ایسی مادی دوڑ میں مصروف ہیں جہاں روحانیت کا دور دور تک کہیں پتہ نشان نہیں ملتا۔ جاپانیوں کی ساری جدوجہد محض دنیاوی مفادات کے لئے ہے۔ انہیں مابعد الطبیعاتی مسائل پر سوچنے کی فرصت نہیں ملتی۔ ان کا کوئی مذہب ہے نہ روحانی معیارات' وہ ان نقوش پر سجدہ کرتے ہیں جو یورپ کی مادیت نے زمانے پر مرتسم کئے ہیں۔ اس ساری یک طرفہ دوڑ کا نتیجہ ہے کہ روحانی طور پر جاپان زبردست افلاس کا شکار ہوتا جا رہا ہے اور خوبصورت لباس میں ملبوس ان کے صحت مند جسموں کے اندر بیمار اور مایوس روحیں کراہ رہی ہیں۔

مجھے یقینِ واثق ہے کہ جاپان میں اسلام کی اشاعت اور فروغ کے لئے موجودہ دَور فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ نام نہاد ترقی یافتہ قوموں نے مادی ترقی تو بلاشبہ کی ہے مگر وہ زبردست روحانی خلا کا شکار ہیں۔ اسلام اور صرف اسلام ہی اس خلا کو پُر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اگر جاپان میں اسلام کی اشاعت کے لئے مناسب اور مؤثر تدابیر اختیار کی جائیں تو مَیں یوں محسوس کرتا ہوں کہ دو یا تین نسلوں کے اندر اندر پورے کا پورا جاپان اسلام کی آغوش میں آسکتا ہے اور اگر یہ قلعہ سر ہو جائے تو مَیں سارے مشرق بعید میں اسلام کے روشن مستقبل کی پیش گوئی کر سکتا ہوں۔ مسلم جاپان پوری انسانیت کے لئے باعثِ رحمت بن سکتا ہے۔

●......●......●

محمد صدیق

(انگلستان)

جب میں مسلمان ہوا تو میرا اسلامی نام ''صدیق'' قرار پایا۔ میں شروع ہی میں اعتراف کرتا چلوں کہ میں اس انتہائی باعزت اور عظیم نام کا اہل نہیں ہوں' تاہم اس کے معنی ومفہوم اس اعتبار سے میرے لئے خاص اہمیت کے حامل ہیں کہ میں پچھلے سالہا سال سے ''صدق'' یعنی صداقت اور سچائی کی تلاش میں سرگرداں تھا اور اب اللہ کے فضل سے بجا طور پر اعلان کرسکتا ہوں کہ میں نے اسے صحیح معنوں میں پالیا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:

وَ مَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ الرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیۡقِیۡنَ وَ الشُّہَدَآءِ وَ الصّٰلِحِیۡنَ ۚ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیۡقًا۔

(النساء:۶۹)

''یعنی جو لوگ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں وہ نبیوں' صدیقوں' شہیدوں اور صالحین کی ان جماعتوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا ہے اور کتنی اچھی ہے ان لوگوں کی رفاقت۔''

میں نے ایک SCOTTISH PRESBYTERIAN مسیحی گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ ہمارا خاندان کچھ زیادہ مذہبی واقع نہیں ہوا تھا۔ تعلیم بھی بس واجبی سی تھی۔ ہر اتوار کو رسمی طور پر گرجے میں حاضری بھی دی جاتی تھی اور بائبل کا درس بھی سنا جاتا مگر دلچسپی اور اخلاص کا عنصر مفقود تھا۔ چنانچہ ہفتے کے باقی چھ دن ہمارے گھر میں مذہب یا بائبل کے بارے میں کبھی کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے' میں نے بائبل کا پرانا اور نیا عہد نامہ بالکل اسی نقطۂ نظر سے پڑھا تھا جس طرح عام طور پر نئی اور

پرانی کہانیاں پڑھی جاتی ہیں۔ لیکن جب ذرا ہوش سنبھالا اور شعور نے آنکھیں کھولیں تو میں نے ان کہانیوں پر اعتراض کرنے شروع کر دیئے۔ خصوصاً ان کی ثقاہت کے بارے میں ذہن شکوک وشبہات سے بھر گیا۔ ایسا کیوں ہے؟ ویسا کیوں ہے؟ کیا خدا کی منشا یہی ہے کہ میں عقل وخرد سے بے نیاز ہو کر بائبل پر اندھا اعتقاد رکھوں؟ اگر ایسا ہے تو انسانی شعور وادراک کا کیا مصرف ہے اور خدا نے انسان کو یہ نعمتیں کیوں عطا کی ہیں؟ پھر مسیحیت کے مختلف فرقے کیوں ہیں جبکہ ہر گروہ دوسرے کی شد ومد سے مخالفت کرتا ہے؟ ان سارے سوالوں نے مجھے شدید الجھن میں مبتلا کر دیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کروں اور کدھر جاؤں؟ چنانچہ سالہا سال تک یہ حالت رہی کہ زندگی میں زبردست خلا محسوس ہوتا رہا۔ کسی بات میں جی نہیں لگتا تھا۔ معمولات پر اکتاہٹ کی کیفیت طاری رہتی تھی۔

میں پیشے کے اعتبار سے معالج ہوں یعنی MALE NURSE۔ میں ہسپتالوں اور عام گھروں میں کام کرتا ہوں اور اس سلسلے میں بیرونِ ملک کے کئی سفر بھی کیے ہیں۔ میں نے ان گنت مرتبہ زندگی' موت اور جسمانوں اذیتوں کو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ چنانچہ میں اکثر سوچتا تھا' اس سب کچھ کا آخر مطلب کیا ہے؟ کیا ہم دنیا میں صرف اس لئے آئے ہیں کہ تھوڑا عرصہ زندہ رہیں اور پھر مر جائیں اور ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں؟ نہیں' میرا ضمیر پکار اٹھتا تھا کہ ایسا ہرگز نہیں۔ میرا یقین پختہ ہوتا چلا گیا کہ خدا موجود ہے جو ہماری حفاظت کرتا ہے اور موت ہمارا خاتمہ نہیں کرتی۔ میرا یہ اعتقاد بھی تھا کہ خدا نے ہی حضرت مسیح کو انسانوں کی رہنمائی کے لئے بھیجا تھا۔ مگر میں تثلیث کو ماننے سے سخت انکاری تھا۔

صرف یہی نہیں' میں فطرت اور کائنات کے نظام پر غور کرتا تو کسی شک وشبے کے بغیر یہ بات عیاں ہو جاتی کہ اس سارے نظام کے پیچھے ایک قانون' ضابطہ اور حکمت کارفرما ہے اور اس کی باگ ڈور کسی برتر وبالا ہستی کے ہاتھ میں ہے۔ اس امر میں بھی کوئی شک نہ تھا کہ اگرچہ انسان قوانینِ طبیعی کو بدلنے پر قادر نہیں مگر دنیا کی ہر چیز اس کے فائدے کے لئے ہے۔ چنانچہ میرے ذہن میں یہ بات آئینے کی طرح صاف ہوتی چلی گئی کہ خدا نے انسانی زندگی اور عمومی رویّے کے لئے یقیناً ایک صحیح قانون' متوازن دستور العمل اور حکیمانہ ضابطہ مقرر فرمایا ہوگا۔ میں اس ضابطے کی جستجو میں لگ گیا اور ایک غیر متوقع واقعہ

نے مجھے میری منزل کے قریب کر دیا۔

ہوا یوں کہ ایک ایرانی مسلمان کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھا۔ مجھے اس کی نگہداشت کرنی پڑی۔ وہ جسمانی اور ذہنی کرب کی جس غیر معمولی حالت میں مبتلا تھا اس کا مشاہدہ مجھے اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ مگر حیرت ناک بات یہ تھی کہ اس کے لبوں پر مسکراہٹ رہتی اور خدا پر اس کا یقین ایک لمحے کے لئے بھی نہیں ڈگمگاتا تھا۔ وہ مر گیا اور مرنے سے تھوڑی دیر پہلے اس نے قرآنِ پاک منگایا اور اسے دیکھا۔ مجھے اس عظیم انسان کی تیمارداری پر بڑا فخر تھا۔ بار بار خیال آتا کہ وہ کون سا جذبہ تھا جو آخری دموں پر بھی اس شخص کو مسکرانے کی جرأت عطا کرتا تھا اور اس کی امید ٹوٹتی نہیں تھی۔ یہی تجسس مجھے اس کی قبر پر لے گیا۔ قبرستان کے قریب ایک عمارت میں ایک مسلمان مقیم تھا۔ اس نے مرحوم کی قبر تک میری رہنمائی کی اور میری خواہش پر اسلام کے بارے میں مجھے کچھ لٹریچر بھی فراہم کیا۔

میں نے فرصت کے اوقات میں اس لٹریچر کا مطالعہ کیا تو یوں لگا جیسے گھپ اندھیروں میں روشنی کی ایک پاکیزہ کرن میرے سینے میں اتر آئی ہے۔ میں کئی مرتبہ وہاں گیا اور اسلام کے بارے میں کتابیں لیتا رہا۔ زبانی گفتگوئیں بھی ہوئیں اور مسلمانوں نے میرے تمام سوالوں اور اعتراضات کا جواب دیا۔ آخر میں میں نے قرآن کو سمجھنے کا ارادہ کیا اور اسے پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ خدا کا شکر ہے' جلد ہی گوہرِ مقصود ہاتھ آ گیا۔ میں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے واسطے سے خدا کو پہچان لیا۔ میں نے دیکھا کہ قرآن میں ہر وہ چیز موجود ہے' جس کی انسان کو ضرورت ہے۔ قانون' ضابطۂ حیات' رہنما اصول اور سب سے بڑھ کر عقل و شعور کی کارفرمائی۔ یہ عقل و شعور ہی ہے جو حق یعنی صدق کی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ قرآن میں ہے:

أَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا أَنْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ رَجُلٍ مِنْهُمْ أَنْ أَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا أَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ. (سورہ یونس:۲)

ترجمہ: کیا لوگوں کو تعجب ہے کہ ہم نے انہی میں سے ایک شخص پر وحی کی تاکہ وہ لوگوں کو (خدا کے عذاب سے) ڈرائے اور اہلِ ایمان کو خوشخبری دے کہ اللہ کے ہاں ان کا مرتبہ بلند ہے''۔

''قَدَمَ صِدقٍ'' کے معنی مضبوطی سے جم جانے کے بھی ہیں۔ مَیں یہ آیت پڑھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ خوشخبری میرے لئے بھی ہے۔ اب شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ حق عیاں ہو کر سامنے آ گیا تھا۔ چنانچہ ۲۸ ستمبر ۱۹۵۸ء کا یادگار دن تھا جب مَیں نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔

الحمد للہ ربِ العالمین، مسلمانوں میں مجھے بہت سے اچھے اور مخلص دوست ملے۔ اب میری زندگی اور معاملات با مقصد بھی ہیں اور با معنی بھی۔ اب مَیں دن میں پانچ مرتبہ نماز پڑھتا ہوں تو مجھے اکیلے ہونے کا کبھی احساس نہیں ہوتا۔ خدا ہر وقت میرے ساتھ ہے جو میری رہنمائی کرتا ہے۔

(ترجمہ از ''الیقین انٹرنیشنل'' کراچی: ۷ اکتوبر ۱۹۶۸ء)

●......●...●

محمد یحییٰ

(پاکستان)

۲۵ سال کا ایک خوش شکل نوجوان پادری' پادریوں کے مخصوص لباس میں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ میرپور خاص مسٹر دھنی بخش سومرو کی عدالت میں پیش ہوا۔ اس نے ایک درخواست پیش کر کے اے ڈی ایم مسٹر سومرو کو چونکا دیا۔ درخواست میں لکھا تھا کہ بقائی ہوش و حواس' برضا و رغبت' کسی جبر و اکراہ کے بغیر اور پورے خلوص دل کے ساتھ میں عیسائیت ترک کر کے اسلام قبول کر رہا ہوں اور اپنے عیسوی نام جون جوزف کی بجائے اسلامی نام محمد یحییٰ اختیار کر رہا ہوں۔ درخواست گزار نے اے۔ ڈی۔ ایم کے روبرو کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اور کلمہ شہادت پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔

نومسلم محمد یحییٰ نے ایک تفصیلی ملاقات میں نامہ نگار '' جنگ '' کے مختلف سوالات کے جواب دیئے' جن کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

ایک سوال کے جواب میں جناب محمد یحییٰ نے بتایا کہ میں ۱۹۴۲ء میں ہندوستان کے شہر الٰہ آباد میں ایک عیسائی گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ میرے والد بھی پادری تھے۔ انٹرنس کرنے کے بعد میرے والد نے مجھے مسیحی خدمت کے لئے مشنری کے سپرد کر دیا۔ میرے والدین کی آرزو تھی کہ میں حکیم الٰہیات کا کورس کروں چنانچہ مجھے جھانسی بھیجا گیا۔ ۱۹۵۸ء میں تعلیم سے فارغ ہو کر واپس الٰہ آباد آ گیا اور دین مسیح کی تبلیغ میں مصروف ہو گیا۔

ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ میرے دادا جزائر مالدیپ کے مقامی باشندے تھے اور بدھ مت کے پیرو تھے۔ انہوں نے ایک مسیحی نرس سے شادی کی

اور اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ شادی کے آٹھ سال بعد ان کا انتقال ہو گیا اور پسماندگان میں میری دادی' ایک بیٹی اور دو بیٹے چھوڑ گئے۔ دادی اپنے تینوں بچوں کو لیکر ہندوستان آگئیں اور بمبئی کے قریب کلیان میں رہنے لگیں۔ میرے والد' چچا اور پھوپھی کی تعلیم و تربیت مشن کی سرپرستی میں ہوئی۔ ان تینوں کی شادی کلیان ہی میں ہوئی۔ میرے والد مشنری خدمات انجام دیتے رہے اور الٰہ آباد میں بود و باش اختیار کی۔ انہوں نے مزید بتایا کہ میرے والد اب بھی الٰہ آباد (بھارت) میں یونیورسٹی روڈ پتھر والا گرجا میں پادری کی خدمات انجام دے رہے ہیں اور میرے بڑے بھائی بمبئی میں انفارمیشن سنٹر کے جنرل سیکرٹری ہیں۔

محمد یحییٰ نے کہا کہ میں دو ماہ تک الٰہ آباد میں دینِ مسیحی کی تبلیغ میں مصروف رہا۔ جب میرے والد نے محسوس کیا کہ میں دیگر شہروں میں بھی خدمات انجام دے سکتا ہوں تو مجھے ہندوستان کے دوسرے شہروں ہوشنگ آباد' بھوپال' رائے سین' جے پور' چیلڈ دن' جودھ پور اور آگرہ بھیجا گیا۔ اکتوبر ۱۹۶۱ء میں مجھے کلکتہ بھیجا گیا جہاں سے میرا تبادلہ ڈھاکہ پاکستان کر دیا گیا۔ چنانچہ میں ندیا پور کے راستے ڈھاکہ آگیا۔ ڈھاکہ آکر میں چرچ ہاؤس عظیم پورہ میں قیام پذیر ہوا اور دینِ مسیحی کی تبلیغ میں مصروف ہو گیا۔ ڈھاکہ میں کچھ عرصہ قیام کے بعد میں کراچی آگیا جہاں میں نے پوری سرگرمی سے غریبوں کی بستیوں میں عیسائیت کی تبلیغ شروع کر دی۔ خصوصاً خاکروبوں کی کالونیوں میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد غریب مسلم آبادیوں میں بھی مختلف طریقوں سے خدمات انجام دیتا رہا۔ میں نے ان آبادیوں میں تعلیم بالغاں کے مراکز اور شفاخانے وغیرہ قائم کیے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد حیدر آباد میں پاکستان بائبل ٹریننگ انسٹیٹیوٹ (پی بی ٹی آئی) میں مسٹر پاتھ کے ساتھ سرگرم ہو گیا۔ اسی دوران میں نے کوٹری میں مقامی باشندوں کو مسیحیت کی تعلیم دی اور ایک چرچ تعمیر کرایا۔ بعد میں بھان' سعید آباد' دادو' لاڑکانہ' خیر پور' ناتھن شاہ' شکار پور' خیر پور میرس کے دورے کیے۔ اس کے بعد میں لاہور چلا گیا۔ وہاں سے پھر واپس کراچی آیا۔ جب میں دوبارہ کراچی آیا تو میری زندگی میں ایک انقلاب شروع ہوا۔ ہوا یہ کہ کراچی میں چند تعلیم یافتہ مسلمانوں سے ملاقات ہوئی جن سے بحث کے دوران

میرے عقائد متزلزل اور میرے علم کی عمارت ڈانواں ڈول ہونے لگی۔ میں نے دوبارہ بائبل کا لفظ بلفظ مطالعہ کیا۔ چاروں انجیلیں غور سے پڑھنی شروع کیں تو معلوم ہوا کہ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں انجیلوں میں آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشارت دی گئی ہے۔ اب میں نے مسیحی علما اور یہودی علما سے تبادلۂ خیالات شروع کیا۔ کراچی میں یہودیوں کے بعض علما سے یہودی عقائد' مسیحی عقائد اور مسلم عقائد پر بات چیت کی۔ پادری عالموں سے بھی تبادلۂ خیال ہوا لیکن میری تسلی نہ ہو سکی۔

اسی دوران ایک مسلمان دوست نے مجھے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر ''تفہیم القرآن'' مطالعے کے لئے دی۔ جس نے میرے اندر حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا۔ تفہیم کے مطالعے کے بعد معلوم ہوا کہ نبی آخر الزماں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت پر ایمان لانے کی بشارتیں انجیل مقدس میں خاصے اہتمام اور وضاحت کے ساتھ پائی جاتی ہیں اور عقیدۂ تثلیث حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم کے سراسر خلاف ہے۔ خود انجیل عقیدۂ تثلیث والوہیتِ مسیح کو رد کر رہی ہے۔ اب میری ملاقاتیں مسلم دوستوں سے بڑھتی جا رہی تھیں۔ اگرچہ میں بظاہر عیسائی تھا لیکن دل میں تقریباً مسلمان ہو چکا تھا۔ میرے افسرانِ بالا کو میری اس تبدیلی کا کچھ شک ہوا تو انہوں نے مجھے تبلیغی کام کے بجائے دفتری کام پر لگا دیا اور بعد میں سزا کے طور پر مجھے میرپور خاص بھیج دیا گیا۔ یہاں سے مجھے دو ماہ کے لیے بائبل کی مزید تعلیم و تربیت کی خاطر ڈیرہ اسماعیل خان بھیجا جانے والا تھا' لیکن اللہ نے میری مدد کی اور میں نے میرپور خاص آنے کے ایک ماہ بعد ہی ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں حاضر ہو کر حلف نامہ داخل کرا دیا اور اسلام قبول کر لیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب میں مسلمان ہوں۔ میرا مذہب اسلام ہے۔ میرے لئے تمام مسلمان بھائی دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اسلام پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(بشکریہ ''جنگ'' کراچی: ۴ جولائی ۱۹۶۷ء)

●......●......●

محمود نور ٹنگٹن

(انگلستان)

میں انگلستان کے ایک عیسائی گھرانے میں پیدا ہوا مگر بلوغت کی عمر تک پہنچتے پہنچتے مکمل طور پر دہریہ ہو گیا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر میں نے برطانیہ کی شاہی بحریہ میں ملازمت کر لی اور اسی سلسلے میں ۱۹۶۵ء کے اوائل میں ہمارا جنگی بیڑہ ۴۵ کمانڈو عدن کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ یہاں ہمیں ایک سال تک مقیم رہنا تھا۔

میں زندگی میں پہلی مرتبہ گھر سے اتنی دور آیا تھا' اس لئے دل میں مہم جوئی کے جذبات کروٹیں لے رہے تھے، لیکن میں پریشان بھی تھا۔ گھر میں میری نو بیاہتا بیوی اکیلی تھی اور میں اطمینان سے اس کے پاس بھی نہیں رہ سکا تھا۔ تاہم میں نے اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنے کی کوشش کی اور گرد وپیش کے ماحول سے لطف اندوز بھی ہوا۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد بیوی کا خط ملا کہ عنقریب میں ایک بچے کا باپ بننے والا ہوں۔ قدرتی طور پر مجھے بے پناہ خوشی ہوئی۔

لیکن مسرت کا یہ احساس بہت عارضی ثابت ہوا۔ حالات نے ایسی کروٹ بدلی کہ میرے دل ودماغ رنج وآلام کی غیر معمولی گرفت میں آ گئے۔ مجھ پر راتوں کی نیند حرام ہو گئی اور دنوں کا سکون لٹ گیا۔ خواب آور ادویہ بھی مجھے سکون بخشنے سے عاری تھیں۔ تنگ آ کر میں نے شراب نوشی شروع کر دی' مگر اس سے بھی اعصاب کے شدید تناؤ میں کوئی فرق نہ آیا۔ آخری چارہ کار کے طور پر میں نے مذہب کا سہارا حاصل کیا اور دوبارہ عیسائی ہو گیا لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی' گرجے کی حاضری اور بائبل کا مطالعہ بھی مجھے کوئی افاقہ نہ دے سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بے خوابی' اعصابی وبا کا اور ذہنی گھٹن نے مجھے بالآخر

بیمار کر دیا اور میں ہسپتال کے ایک بستر پر پہنچ گیا۔

ہسپتال سے چھٹی ملی' مَیں کام پر واپس آیا تو زندگی کا سب سے بڑا انقلاب میرا منتظر تھا۔ ایک بڑے جہاز کے ایک مسلمان باورچی علی نور سے تعارف ہوا۔ وہ صومالیہ کا رہنے والا تھا۔ وہ مجھ سے خاص محبت اور اشتیاق سے پیش آتا۔ چنانچہ میرے دل میں بھی اس کے لئے نرم گوشہ پیدا ہو گیا۔ ایک روز باتوں باتوں میں وہ کہنے لگا'' جناب! آپ اسلام کا مطالعہ ضرور کریں''۔

اسلام کا مطلب کیا ہے؟ مَیں نے تجسس سے دریافت کیا۔ '' امن' سلامتی'' علی نور کا جواب بڑا سادہ تھا۔ وہ انگریزی روانی سے نہیں بول سکتا تھا اس لئے اس نے ایک اور مسلمان کو بلایا جس نے وضاحت سے بتایا کہ اسلام پیامبر امن ہے اور دنیا میں امن و سلامتی کی فضا قائم کرنا چاہتا ہے۔ حوالے کے طور پر اس نے قرآن کی یہ آیتیں پڑھیں: ''یعنی آگاہ ہو جاؤ کہ جو اللہ کی اطاعت کرے گا اور دوسروں سے بھلائی کرے گا وہ اللہ سے انعام پائے گا۔ ایسے آدمی کے لیے نہ کوئی خوف ہے نہ ہی پریشانی کی کوئی بات''۔ اس نے مجھے بتایا کہ چونکہ ایک مسلمان ہی حقیقی طور پر امن و سلامتی کی کیفیت میں رہتا ہے اس لئے وہ ذہنی سکون و قناعت کی لازوال نعمت سے فیض یاب ہوتا ہے۔

علی نور اور اس کے ساتھی کی باتوں نے میرے دل میں گہرا اثر کیا۔ مَیں دلی اطمینان اور ذہنی سکون کا متلاشی تھا' اس لئے اسلام کے اس پہلو نے بطور خاص متاثر کیا کہ یہ سکون و قناعت کا علمبردار ہے۔ یہ نعمتیں عیسائیت میں ناپید ہیں۔ یہ مذہب تحریف و تغیر سے محفوظ نہیں رہا اور انسانی رہنمائی کے اعتبار سے نامکمل ہے۔ دنیا میں کتنے ہی ملکوں میں خود عیسائیت کے پیروکار ایک جگہ مل کر عبادت نہیں کر سکتے کیونکہ ان میں رنگ و نسل کا اختلاف ہوتا ہے اور گوری رنگت کے عیسائی کالے عیسائیوں کو گرجے میں جانے کی اجازت نہیں دیتے۔ ظاہر ہے اس صورت میں یہ مذہب پوری نوع انسانی کی رہنمائی کیسے کر سکتا ہے اور دنیا کو امن و آشتی کا پیغام کیسے دے سکتا ہے؟

عدن میں فرائض کی مقررہ مدت گزار کر مَیں واپس انگلستان آ گیا۔ ذہن کی کیفیت ہنوز وہی تھی اور دل میں اسلام کے لئے دلچسپی کا بھی وہی عالم تھا۔ مجھے رہ رہ کر وہ منظر یاد

آتا جب علی نور خضوع و خشوع سے نماز پڑھ رہا ہوتا۔ چنانچہ جب بھی میں اکیلا ہوتا بے اختیار اس کی نقل کرنے لگتا۔ خدا سے دعائیں بھی خوب مانگتا کہ الٰہی میرا دل کھول دے اور میری زندگی کو صراط مستقیم پر ڈال دے۔

اللہ نے میری دعائیں سن لیں۔ میں ایک روز ایک پاکستانی کریانہ فروش کی دکان پر کھڑا تھا کہ ایک اور مسلمان آیا اور دکاندار سے السلام علیکم کہہ کر مخاطب ہوا۔ ان لفظوں نے سماعت میں مصری گھول دی۔ میں خوشی سے جھوم اٹھا۔ یوں لگا جیسے مدت کے بعد کوئی کھوئی ہوئی چیز مل گئی ہے۔ میں نے دکان کے مالک سے دوستی کر لی اس نے مجھے ایک قریبی مسلم تنظیم کا پتہ دیا چنانچہ میں پورٹسماؤتھ کے اسلامی مدرسے میں گیا اور شیخ عالم ریاحی (ناظم مدرسہ) سے ملا۔ میں نے ان سے کھل کر گفتگو کی۔ بہت سے سوالات بھی کئے اور آخر کار مجھے یقین ہو گیا کہ اسلام ہی دین حق ہے اور یہی وہ راستہ ہے جو سچے امن و سلامتی کا علمبردار اور پاسباں ہے۔ چنانچہ میں نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔ الحمد للہ رب العالمین

●……●……●

محترمہ مریم جمیلہ (امریکہ)

محترمہ مریم جمیلہ نیو یارک (امریکہ) کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئیں۔ قبولِ اسلام سے قبل ہی وہ عام امریکی و یہودی خواتین کی ڈگر سے ہٹ کر پاکیزہ طور و اطوار اور باوقار زندگی کی حامل تھیں۔

مسلمان ہونے کے بعد وہ پاکستان آگئیں اور انہوں نے غیر معمولی قسم کی قابلِ قدر علمی و دینی خدمات انجام دی ہیں۔ اب تک ان کی ایک درجن سے زیادہ انگریزی تصانیف منظرِ عام پر آ چکی ہیں جو اپنی وقعت، سند اور مضامین و خیالات کی گہرائی و معنویت اور وسیع اثرات کی وجہ سے دنیا بھر کے علمی حلقوں سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہیں۔ ان کی تصانیف میں:

ISLAM AND MODERNISM, ISLAM IN THEORY AND PRACTICE, WESTERN CIVILISATION CONDEMNED BY ITSELF

(دو جلدیں) وغیرہ شامل ہیں۔ ذیل کا مضمون محترمہ موصوفہ کی متعدد خود نوشت تحریروں کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے۔

قرآن سے میرا تعارف عجیب و غریب طریقے سے ہوا۔

میں بہت چھوٹی تھی جب میرے کانوں کو موسیقی سے غیر معمولی رغبت ہو گئی۔ مختلف گیتوں اور کلاسیکل اوپیرا کے ریکارڈ پہروں میری سماعت کو لوریاں دیتے رہتے۔ چنانچہ میری عمر تقریباً گیارہ برس کی تھی جب ایک روز محض اتفاق سے میں نے ریڈیو پر عربی

موسیقی سن لی جس نے دل و دماغ کو مسرت کے ایک عجیب احساس سے بھر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں فرصت کے لمحوں میں بڑے اشتیاق سے عربی موسیقی سنتی۔ حتیٰ کہ ایک وقت آیا کہ پسند اور ذوق کا دھارا ہی بدل گیا۔ میں اپنے والد کے ساتھ نیویارک کے شامی سفارتخانے میں گئی اور عربی موسیقی کے بہت سے ریکارڈ لے آئی۔ انہی میں سورہ مریم کی بے حد دلنواز اور فردوس گوش تلاوت بھی تھی۔ جو ام کلثوم کی نہایت سریلی آواز میں ریکارڈ کی گئی تھی۔ (یاد رہے ام کلثوم بنیادی طور پر قاریہ تھی۔ اس بدبخت نے گلوکارہ کا ذلیل پیشہ بعد میں اختیار کیا)۔ اگرچہ میں ان گیتوں کے فہم سے بے خبر تھی مگر عربی زبان کی آوازوں اور سُروں سے مجھے بے پناہ محبت ہو گئی تھی۔ سورہ مریم کی تلاوت تو مجھے مسحور کر دیتی تھی۔

عربی زبان سے اس گہرے لگاؤ ہی کا نتیجہ تھا کہ میں نے عربوں کے بارے میں کتابیں پڑھنی شروع کیں۔ خصوصاً عربوں اور یہودیوں کے تعلق پر ڈھونڈ ڈھونڈ کر کتابیں حاصل کرتی اور یہ دیکھ کر بہت حیران ہوئی کہ اگرچہ عقائد کے اعتبار سے یہودی اور عرب ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں مگر یہودی عبادت خانوں میں فلسطینی عربوں کے خلاف زبردست زہر اگلا جاتا ہے۔ ساتھ ہی عیسائیت کے رویے نے مجھے بہت مایوس کیا۔ میں نے عیسائیت کو پیچیدہ اور لاینحل مسائل کے گورکھ دھندے کے سوا کچھ نہ پایا اور چرچ نے مختلف اخلاقی، سیاسی اور اقتصادی و تہذیبی قباحتوں کے ساتھ جس لامتناہی مصالحت کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے' اس نے مجھے بہت پریشان کیا۔ میں نے یہودی اور عیسوی عبادت خانوں کو بہت قریب سے دیکھا اور دونوں کو منافقت اور بدی کی دلدل میں ڈوبے ہوئے پایا۔

میں نسلاً یہودی تھی' اس لئے یہودیت کا مطالعہ کرتے ہوئے جب میں نے محسوس کیا کہ اسلام تاریخی اعتبار سے اس کے بہت قریب ہے تو فطری طور پر اسلام اور عربوں کے بارے میں جاننے کا اشتیاق پیدا ہوا اور عربی زبان کی محبت نے اس اشتیاق کو دوچند کر دیا۔

۱۹۵۳ء کے موسم گرما میں میں سخت بیمار پڑ گئی۔ میں صاحب فراش تھی' جب ایک شام میری والدہ نے پبلک لائبریری جاتے ہوئے مجھ سے دریافت کیا کہ میں کوئی کتاب تو نہیں منگانا چاہتی؟ میں نے قرآن کے ایک نسخے کی فرمائش کی اور وہ آتے ہوئے جارج سیل کا ترجمہ لے آئیں اور یوں قرآن سے میرے رابطے کی ابتدا ہوئی۔

جارج سیل اٹھارہویں صدی کا عیسائی عالم اور مبلغ تھا مگر سخت متعصب اور تنگ نظر۔ اس کے ترجمے کی زبان الجھی ہوئی اور مشکل ہے اور حاشیوں پر بلا ضرورت اور سیاق و سباق سے کٹ کر البیضاوی اور زمخشری کے حوالے دیے گئے ہیں تاکہ عیسوی نقطۂ نظر سے انہیں غلط ثابت کیا جا سکے۔ چنانچہ ایک مرتبہ تو میں اسے بالکل نہ سمجھ سکی۔ قرآن مجھے بائبل کی بے ہنگم کہانیوں کے غیر مربوط ملغوبے سے کچھ ہی بہتر نظر آیا مگر میں نے اس کا مطالعہ ترک نہ کیا اور اسے تین دن اور رات تقریباً مسلسل پڑھتی رہی حتیٰ کہ تھک کر ادھ موا ہو گئی۔

اسی عرصے میں قسمت نے یاوری کی اور کتابوں کی ایک دکان پر میں نے محمد مارماڈیوک پکتھال کا ترجمۂ قرآن دیکھا۔ جونہی میں نے اس کتاب کو کھولا' ایک زبردست انکشاف نے میرا استقبال کیا۔ زبان کا حسن اور بیان کی فصاحت مجھے اپنے ساتھ بہا لے گئی۔ دیباچے کے پہلے ہی پیرے میں مترجم نے بہت خوبصورت طریقے سے وضاحت کی ہے کہ یہ قرآنی مفاہیم کو...... جیسا کہ عام مسلمان اسے سمجھتے ہیں انگریزی زبان میں پیش کرنے کی ایک کوشش ہے اور جو شخص قرآن پر یقین نہیں رکھتا' اس کے ترجمے کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ دنیا کا کوئی ترجمہ عربی قرآن کی جگہ نہیں لے سکتا۔ وغیرہ۔

میں فوراً سمجھ گئی کہ جارج سیل کا ترجمہ ناگوار کیوں تھا؟ اللہ تعالیٰ پکتھال مرحوم کو بے پایاں رحمتوں سے نوازے۔ انہوں نے برطانیہ اور امریکہ میں قرآن کو سمجھنا آسان بنا دیا اور میرے سامنے بھی روشنیوں کے دروازے کھول دیے۔ چنانچہ پہلی مرتبہ میں نے توریت کی تنگ اور جامد قوم پرستی کے مقابلے میں قرآن کی ہمہ گیر بین الاقوامیت کا مشاہدہ کیا۔ ازلی اور حتمی قدروں کے لئے میری بیقراری کو سکون مل گیا۔ میں نے اسلام میں ہر وہ اچھی' سچی اور حسین چیز پالی جو زندگی (اور موت) کو معنی اور مقصد عطا کرتی ہے جبکہ دیگر مذاہب میں حق مسخ ہو کر رہ گیا ہے' اس کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ اس کے گرد کئی طرح کے حصار کھینچ دیے گئے ہیں۔ قرآن اور اس کے بعد مسلمانوں کی تاریخ کے مطالعے سے مجھے یقین ہو گیا کہ عربوں نے اسلام کو سربلندی عطا نہیں کی بلکہ یہ اسلام ہے جس کے طفیل عرب دنیا بھر میں کامیاب و بامراد ہوئے۔

میری علالت کا سلسلہ برسوں پر محیط رہا حتیٰ کہ ۱۹۵۹ء میں مکمل صحت یاب ہو کر میں

نے اپنے اوقات کا بیشتر حصہ پبلک لائبریری نیویارک کے شعبہ شرقیات (اور مخطوطات ڈویژن) میں گزارنا شروع کیا۔ یہیں پر مجھے پہلی مرتبہ حدیث کی مشہور کتاب مشکوٰۃ المصابیح کے انگریزی ترجمے کی چار ضخیم کتابوں کا تعارف حاصل ہوا۔ یہ کلکتہ کے مولانا فضل الرحمٰن کی کاوش کا نتیجہ تھیں۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ حدیث کے متعلقہ حصوں سے شناسائی کے بغیر قرآن پاک کا مناسب اور مفصل ادراک ممکن نہیں۔ ظاہر ہے پیغمبر علیہ السلام کہ جن پر براہ راست وحی نازل ہوتی تھی' کی رہنمائی اور تشریح کے بغیر کلام الٰہی کو کیونکر سمجھا جا سکتا ہے' اسی لئے اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ جو لوگ حدیث کو نہیں مانتے' دراصل وہ قرآن کے بھی منکر ہیں۔

مشکوٰۃ کے تفصیلی مطالعے کے بعد مجھے اس حقیقت میں ذرہ برابر شبہ نہ رہا کہ قرآن وحی الٰہی ہے۔ اس بات نے اس امر کو تقویت دی کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور یہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دماغی کاوشوں کا نتیجہ نہیں۔ یہ ایک ابدی حقیقت ہے کہ قرآن زندگی کے بارے میں تمام بنیادی سوالات کا ایسا مسکت' ٹھوس اور اطمینان بخش جواب دیتا ہے' جس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔

میں بچپن سے موت کے تصور سے سخت خوفزدہ رہتی تھی۔ یوں بھی ہوتا کہ آدھی رات کو میں موت کے ڈر سے زور زور سے چلانے لگتی۔ اکثر والدین سے دریافت کرتی کہ مجھے موت کیوں آئے گی اور مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ تو وہ جواب دیتے کہ موت بہرحال اٹل حقیقت ہے مگر میڈیکل سائنس جس انداز میں ترقی کر رہی ہے' عین ممکن ہے اس سے تمہاری عمر سو سال سے بھی زیادہ ہو جائے۔ تاہم وہ زندگی بعد موت کے تصور کو سختی سے مسترد کر دیتے اور قیامت یا جنت دوزخ کو محض واہمہ قرار دیتے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میرے والدین اصلاح یافتہ (یعنی ترمیم شدہ) یہودی تھے جو بڑی حد تک مسیحی معاشرے میں جذب ہو چکے تھے۔ امریکہ میں رہنے والے یہودیوں کی غالب اکثریت اصلاً روسی ہے مگر ہمارا گھرانہ جرمن تھا۔ ہم لوگ روسیوں کی طرح جبر و تشدد کے تحت نہیں نکالے گئے تھے بلکہ سوسوا سو سال پہلے اقتصادی ترقی کی تلاش میں اپنی مرضی سے امریکہ آئے تھے۔ چنانچہ میرے والدین اور اقربا اپنے عبادت خانوں کو سینا گاگ

(CYNAGOGUE) کے بجائے ٹیمپل (TEMPLE) کہا کرتے تھے۔ جہاں عبادت پروٹسٹنٹ عیسائیوں کی طرز پر ہوا کرتی تھی۔ مختصر یہ کہ سوائے شادی بیاہ کے بندھنوں کے ہمارے گھرانے میں راسخ العقیدہ یہودیوں والی کوئی بھی فکری یا عملی بات نہ تھی اور امریکی معاشرت کی عام دہریت اس پر بھی ہر لحاظ سے اثر انداز ہو چکی تھی۔

دوسرا سبب اس خالص مادی نقطۂ نظر کا یہ تھا کہ توریت' تلمود اور انجیل میں عقیدۂ آخرت بہت ہی مبہم ہے اور تمام پیغمبروں' ولیوں اور نیک لوگوں کو ان کے اعمال کی جزاو سزا اسی دنیا میں ملتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر حضرت ایوب علیہ السلام پر آزمائش آتی ہے' ان کے بیٹے انتقال کر جاتے ہیں۔ ان کی جائیداد اور مال و متاع تباہ ہو جاتا ہے اور وہ خود سخت تکلیف دہ مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ جاتے ہیں اور بیزاری کے عالم میں خدا سے شکوہ کرنے لگتے ہیں کہ وہ نیک لوگوں کو مصیبت میں گرفتار کر دیتا ہے۔ یہ کہانی اس انجام پر ختم ہوتی ہے کہ بالآخر ان کا مرض بھی جاتا رہتا ہے اور بچے اور مال و متاع بھی دوبارہ مل جاتا ہے مگر آخرت کے امکانی نتائج کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ تلمود تو برملا اس امر کا پرچار کرتی ہے کہ "بدترین زندگی موت سے اچھی ہے"۔

انہی وجوہ کی بنا پر میرے والدین بھی عام لوگوں کی طرح زندگی کے محض دنیاوی اور مادی رخ کے قائل تھے۔ "زندگی کا مقصد خوش رہنا اور عیش کرنا ہے"۔ وہ میری باتوں کے جواب میں کہا کرتے "خوب صورت آرام دہ مکان ہو' بنیادی سہولتیں ہوں' دوستوں کا ایک حلقہ ہو اور تفریح کے مختلف سامان ہوں تو زندگی مثالی ہے اور بس"۔ سوچنے کا یہی وہ سطحی نقطۂ نظر تھا جو پورے امریکی معاشرے میں جاری و ساری تھا۔ مگر میری سوچ اس عام دھارے سے مختلف تھی۔ بہت بچپن ہی سے میں "اہم اور بنیادی چیزوں" کی تکمیل کی فکر کرتی تھی حتیٰ کہ موت سے پہلے اس امر کا یقین چاہتی تھی کہ میں نے اپنی زندگی گناہوں میں یا فضولیات میں نہیں گزاری۔ سنجیدگی ہمیشہ سے میری سوچوں کی ہمرکاب رہی ہے۔

چنانچہ ہم عصر طرز زندگی پر حاوی چھچھورے پن سے مجھے شدید نفرت تھی۔ میں آغاز ہی میں ان بہت سی باتوں سے متنفر تھی جو میری سوسائٹی میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں۔ میرا ردِ عمل ہر اس بات کے خلاف بڑا شدید ہوتا تھا جو احمقانہ اور سطحی ہو' غیر واقعی

اور غیر شائستہ ہو یا تصنع پر مبنی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے ریڈیو' ٹیلی ویژن اور سینما سے کوئی رغبت نہ تھی۔ مغربی لٹریچر' آرٹ' موسیقی اور رقص و سرود مجھے کبھی نہیں بھائے۔ میں دولت کی نمائش کو اور عیش و عشرت کی زندگی کو ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھتی رہی۔ میرے دل میں یہ تاثر رفتہ رفتہ بڑا طاقتور ہو چکا تھا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو انسانی زندگی میں اوّلیت اور برتری حاصل نہیں بلکہ دونوں کے ڈانڈے غیر انسانی سرحدوں سے ملتے ہیں۔ اسکول کی تعلیم کے دوران میرے پسندیدہ موضوع تاریخ اور لسانیات رہے اور دونوں میں' میں نے خاصا عبور حاصل کیا۔ بلوغت کے زمانے میں میری ہم جماعت لڑکیوں کے پسندیدہ مشاغل فیشن' اعلیٰ لباس' بناؤ سنگھار' مخلوط رقص' پارٹیاں یا ہم عمر دوست لڑکوں سے تنہائیوں میں ملاقاتیں تھیں۔ مگر میں نے ان حالات میں اپنے اوپر جبر کر کے اپنی حفاظت کی۔ شراب یا سگریٹ پینے سے انکار کیا۔ ممکن حد تک سادہ لباس پہنا تاکہ صنفِ مخالف کے لئے میرے اندر کشش یا جاذبیت کم سے کم تر ہو جائے۔ اپنے آپ کو ڈھکے چھپائے رکھا۔ نتیجۃً کتابوں اور مختلف قسم کے گہرے فکری مشاغل سے میری دلچسپیاں بڑھتی گئیں۔

میرے والد نے ایک مرتبہ مجھے بتایا کہ دنیا میں کوئی قدر دوامی حیثیت نہیں رکھتی' اس لئے ہمیں بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ خود کو بدل لینا چاہئے' تو میرے دل نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور میری یہ پیاس بڑھتی ہی چلی گئی کہ مجھے وہ چیز ملے جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہو اور خدا کا شکر ہے کہ جب میں نے قرآن پاک کا مطالعہ کیا تو میری پیاس بجھ گئی اور مجھے میری مطلوبہ چیز مل گئی۔ مجھے پتہ چل گیا کہ اللہ کی رضا کے لئے جو بھی نیک کام کیا جائے گا' وہ کبھی ضائع نہیں ہو گا اور دنیا میں اس کا کوئی صلہ نہ ملے' تب بھی آخرت میں اس کا انعام یقینی ہے۔ اس کے مقابلے میں' قرآن نے بتایا کہ جو لوگ کسی اخلاقی ضابطے کے بغیر زندگی گزارتے ہیں اور خدا کی خوشنودی کو پیشِ نظر نہیں رکھتے' دنیاوی زندگی میں خواہ کتنے ہی کامیاب ہوں مگر آخرت میں صریح خسارے میں رہیں گے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہمیں ہر وہ فضول اور بے فائدہ کام ترک کر دینا چاہئے جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کے راستے میں رکاوٹ بنتا ہے۔

قرآن کی ان تعلیمات کو میرے سامنے مزید واضح اور روشن حدیث اور رسول پاک

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مقدسہ نے کیا جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ایک مرتبہ فرمایا: ''آپؐ کے اخلاق قرآن کے عین مطابق تھے'' چنانچہ وہ قرآنی تعلیمات کا مکمل و اکمل نمونہ تھے۔ میں نے دیکھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ اقدس کا ایک ایک پہلو مثالی ہے: ایک خاوند کی حیثیت سے' ایک باپ کی حیثیت سے' ایک پڑوسی' ایک تاجر' ایک مبلغ' ایک دوست' ایک سپاہی اور ایک فوجی جرنیل کے اعتبار سے' ایک فاتح' ایک منصف' ایک قانون ساز' ایک حکمران اور سب سے بڑھ کر اللہ کے ایک عاشق صادق کے لحاظ سے وہ خدا کی کتاب کی ہو بہو مثال تھے۔

پھر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دن بھر کی مصروفیات کی تفصیل نے مجھے بہت متاثر کیا۔ وہ دن کا ایک لحہ ضائع نہ کرتے اور سارا وقت اللہ اور اس کی مخلوق کے لئے وقف رکھتے۔ ان کا اپنی بیویوں سے سلوک نہایت منصفانہ اور مثالی تھا۔ انصاف اور عدل اور تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ ان کی لاڈلی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا نے جائز ضرورت کے تحت ایک غلام کے لئے درخواست کی تو اسے تقویٰ کی تلقین کی اور اپنے کنبے پر دیگر مسلمانوں کی ضرورتوں کو ترجیح دی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زندگی کا مقصد عیش پسندی نہیں بلکہ ''کامیابی'' قرار دیا۔ چنانچہ آپؐ کی تعلیم کے مطابق جو شخص آخرت کی کامیابی کے لئے بالارادہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے' اسے اس جذباتی سکون کے نتیجے میں خوشی اور مسرت خود بخود حاصل ہو جاتی ہے' جو ہزار مادی عیش کے بعد بھی نہیں ملتی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپؐ دنیاوی زندگی سے بے نیاز تھے۔ وہ روزمرہ زندگی کی ضروریات کا خاص لحاظ کرتے تھے' شگفتہ مزاج اور خوش بیان تھے۔ بچوں کے ساتھ کھیل بھی لیتے تھے مگر اصل توجہ کے قابل انہوں نے آخرت کی زندگی ہی کو سمجھا اور مادی و روحانی زندگی میں حددرجہ توازن پیدا کر دیا۔

قرآن اور حدیث کے علاوہ میں نے اسلام پر متعدد دوسرے تراجم بھی پڑھے۔ مثلاً کتاب الہدایہ جو اسلامی فقہ کی تشریح ہے۔ امام غزالی کی احیائے العلوم الدین کے جستہ جستہ حصے' مقدمہ ابنِ خلدون' علامہ اقبال کی نظمیں اور محمد اسد کی خود نوشت ''روڈ ٹو مکہ''۔ موخر الذکر نے میرے احساسات کو فیصلہ کن مرحلے تک پہنچانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ آسٹریا کے ایک یہودی نے مغربی تہذیب کی کھوکھلی اقدار کو کس طرح ٹھکرایا اور اسلام میں اس کو کس طرح اپنی تشنگی کا سامان ملا۔

مطالعہ و جستجو کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ میری اعصابی حالت بڑی تیزی سے خراب ہونی شروع ہو گئی۔ میں صاحب فراش ہو کر رہ گئی اور مکمل طور پر ناکارہ ہو گئی۔ ہر علاج آزمایا گیا۔ ایک سال تک نفسیاتی اور طبی دونوں طرح کا معالجہ ہوا مگر بے سود۔ دوسرے سال صرف نفسیاتی علاج پر اکتفا کیا گیا' مگر مرض بڑھتا ہی چلا گیا۔ بالآخر مجھے دماغی امراض کے ایک شفا خانے میں داخل کرا دیا گیا۔ جہاں مجھے دو سال سے زیادہ عرصہ قیام کرنا پڑا۔ میری بیماری نے ڈاکٹروں کو بالکل عاجز کر دیا اور ایک مرحلے پر آ کر انہوں نے تشخیص و معائنہ بھی بند کر دیا۔ مختصر یہ کہ میں اس وقت طبی نقطۂ نظر سے لا علاج ہو چکی تھی' مگر کچھ ہی عرصے کے بعد میں معجزانہ طور پر شفایاب ہونے لگی۔ میری شفایابی کو طبی علاج معالجے کا مرہونِ منت قرار نہیں دیا جا سکتا' نہ میری قوتِ ارادی بہت زیادہ طاقتور ہو گئی تھی۔ میرا صحت یاب ہونا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے کرم کا نتیجہ تھا۔

جب میں نے اپنے والدین کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ مجھے ہسپتال سے واپس لے جانے کا بندوبست کریں اور اس کے بعد میں گھر آ گئی تو میں نے تہیہ کر لیا کہ اب اسلام کے اثرات عملاً اپنی زندگی پر غالب کروں گی۔ ابتدا میں نے اپنے طور پر نیو یارک کے اسلامی مرکز میں مسلمانوں سے ملاقات اور تبادلۂ خیالات کی راہیں پیدا کیں اور بڑی خوشی ہوئی کہ جن لوگوں سے میرا رابطہ قائم ہوا وہ بہترین لوگ تھے۔ اسلامی مرکز کی مسجد میں میں نے مسلمانوں کو نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا اور اس مشاہدے نے میرے اس یقین کو پختہ کر دیا کہ صرف اسلام ہی مکمل آسمانی مذہب ہے۔ باقی مذاہب میں سچائی کے محض منتشر اجزا موجود ہیں۔

اب میں اس حتمی نتیجے پر پہنچ گئی تھی کہ اسلام بہر صورت دینِ حق ہے اور اسلام ہی میں دورِ حاضر کی تہذیبی برائیوں کا مقابلہ کرنے اور ان پر غالب آنے کی صلاحیت موجود ہے۔ چنانچہ میں نے جو نئے نظریات اپنائے تھے' ان کے اظہار کے لئے میں نے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ یہ مضامین انگلستان' جنوبی افریقہ' ترکی' سوئٹزرلینڈ' سیلون'

بھارت اور پاکستان کے مختلف انگریزی جرائد میں شائع ہوئے۔ سب کا موضوع اور مرکزی خیال ایک ہی تھا۔ یعنی اسلام اور مغربیت کے مختلف پہلوؤں سے بحث کر کے دونوں کا تقابلی جائزہ لیا گیا تھا۔ خصوصیت سے میں نے ان نام نہاد جدید اصلاحات کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی جن کا مقصد اسلام کی بنیادوں کو متزلزل کرنا ہے۔ ان مضامین میں' میں نے یہ ثابت کیا کہ مغرب کی جدید تہذیب کس طرح نظری و عملی پہلوؤں سے اسلام سے متصادم ہے اور ان دونوں میں کسی مرحلے پر مصالحت نہیں ہو سکتی۔ میں محمد اسد کی ایک اور کتاب "اسلام ایٹ دی کراس روڈز" سے بہت زیادہ متاثر تھی۔ میرا خیال ہے یہ کتاب اپنے موضوع پر شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔

بہر حال میرے مضامین محمد اسد صاحب کی کتاب سے نسبتاً زیادہ براہ راست قسم (DIRECT) کے تھے اور ان میں' میں نے اصل مسئلہ پر ذرا تفصیل سے بحث کی تھی۔ میرے مضامین کی اشاعت نے دنیا کے ہر حصہ کے مسلمان رہنماؤں سے مراسلت اور خط و کتابت کی راہیں پیدا کر دیں۔ انہی حضرات میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی بھی شامل تھے۔ انہوں نے میرے ایک خط کے جواب میں لکھا:

"آپ کی ذہنی پریشانیوں اور صدمات کی سرگزشت میں میرے لئے کوئی غیر متوقع بات نہیں۔ اگر کوئی فرد اپنے اردگرد کے معاشرتی ماحول سے مسلسل ٹکراتا ہوا گزر رہا ہو اور اسے کہیں سے معمولی سی ہمدردی اور حوصلہ افزائی میسر نہ آئے تو ایسے حالات میں اس آدمی کے خواہ وہ مرد ہو یا عورت' اعصاب کا برقرار رہنا غیر معمولی اور غیر فطری بات ہوگی۔ آپ کے رجحانات' آپ کا ذوق' آپ کے نظریات و تصورات اور آپ کی عادات و اطوار ساری چیزیں آپ کی سوسائٹی سے متصادم ہیں۔ جن حالات نے آپ کو ماہر نفسیات یا شفاخانہ امراضِ دماغی تک پہنچایا وہ آپ کے اندر کسی نفسیاتی خلل کا نتیجہ نہیں بلکہ آپ اور آپ کے ماحول کے درمیان جو واضح عدم مطابقت اور تصادم موجود چلا آ رہا ہے' ان سے ایسے حالات کا پیدا ہونا بالکل فطری امر ہے۔ جس سوسائٹی میں آپ رو رہی ہیں' وہ آپ کو اس عورت کی حیثیت سے کبھی قبول کر ہی نہیں کر سکتی جو حیثیت آپ کے پیش نظر ہے۔ وہاں تو آپ کی ہر خوبی کو خامی ہی تصور کیا جائے گا"۔

اسی مکتوب میں مولانا محترم نے تحریر فرمایا:

''اگر آپ پاکستان آ جائیں تو یہاں آپ اپنے آپ کو بہت سے ہم خیال لوگوں کے درمیان محسوس کریں گی۔ علاوہ ازیں یہاں لاہور میں بعض صالح نوجوان بھی مل سکتے ہیں جنہیں آپ دائمی رفیقِ حیات بنا سکتی ہیں۔ آپ یقیناً کسی مغرب زدہ ''اعتدال پسند'' سے شادی کرنا پسند نہیں کریں گی بلکہ آپ کو حقیقی مسرت کسی باعمل مسلمان نوجوان کو رفیقِ حیات بنانے ہی سے حاصل ہو گی۔ میں امید کروں گا کہ آپ اپنے والدین پر یہ واضح کر دیں گی کہ کیوں آپ کے لئے امریکہ میں مزید قیام ناممکن ہو گیا ہے اور یہ بات بھی کہ آپ کی بھلائی اور فلاح کا تقاضا یہ ہے کہ آپ پاکستان میں مستقل سکونت اختیار کر لیں۔ آپ اپنے والدین کو یہ بھی بتا دیں کہ جس شخص نے آپ کو یہ نازک قدم اٹھانے کا مشورہ دیا ہے' اس نے صرف یہ رائے دینے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ وہ مستقبل کی تمام ذمہ داریوں سے بھی عہدہ برآ ہونے کے لئے تیار ہے۔ اگر آپ اور آپ کے والدین مجھ پر اعتماد کریں تو انشاء اللہ آپ کے اس اعتماد کو کبھی دھچکا نہیں لگے گا''۔

میں نے مولانا کو حسب ذیل جواب دیا:

''یہ خدا کا کرم ہے کہ آپ میری دستگیری فرما رہے ہیں۔ خدا کا شکر ہے اب میں تنہا جدوجہد کرنے پر مجبور نہیں ہوں۔ میں آپ کی پیش کش قبول کرتی ہوں اور تہِ دل سے آپ کی شکر گزار ہوں۔ اللہ آپ کو جزائے خیر عطا کرے۔''

اس کے بعد میں نے نیویارک سے ایک یونانی مال بردار بحری جہاز میں کراچی تک کا سفر کیا۔ منزلِ مقصود تک پہنچنے کا یہ کم خرچ ممکن ذریعہ ہو سکتا تھا۔ یہ سفر تقریباً چھ ہفتے تک جاری رہا۔ جہاز کے مسافر اور عملہ کے لوگ چونکہ اخلاقی اور روحانی طور پر انتہائی پست لوگ تھے' اس لئے سفر کے دوران مجھے زندگی کے بعض تلخ ترین تجربات سے گزرنا پڑا۔ پورٹ سوڈان میں تو مجھے اس قدر خطرہ محسوس ہوا کہ اپنے تحفظ کی خاطر پولیس کی نگرانی کی درخواست کرنی پڑی۔ بہرحال اسکندریہ' پورٹ سوڈان اور جدہ میں میرے ساتھ مسلمان بھائیوں نے جو حسنِ سلوک کیا' وہ باعثِ صد مسرت و اطمینان تھا۔ اس سے میری کدورت کا غبار یک گونہ چھٹ گیا۔

جب میں کراچی پہنچ گئی تو وہاں مولانا مودودی کے معتقدین اور احباب نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور بے حد خاطر مدارات کی۔ چند روز بعد بذریعہ طیارہ کراچی سے لاہور آ گئی اور مولانا محترم کے گھر قیام کیا۔ میں مولانا کی بچیوں کی ہم عمر تھی اس لئے مجھے اس گھر میں کوئی اجنبیت محسوس نہ ہوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد میرا نکاح جماعتِ اسلامی کے ایک سرگرم اور مخلص رکن محمد یوسف خاں سے ہو گیا۔ خاں صاحب پہلے سے شادی شدہ اور عیال دار تھے مگر میں نے اس رشتے کو بخوشی قبول کر لیا کہ جاہلیت کے ہر شعار کی نفی اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہر سنت کی پیروی میرا مقصدِ حیات ہے۔ الحمد للہ تعالیٰ میں اپنے نئے گھر میں مسرت و سکون کی زندگی گذار رہی ہوں اور آج تک کسی الجھن یا پریشانی کا شکار نہیں ہوئی۔

●......●......●

موسیٰ ریوچن گورا (تنزانیہ)

(MUSA RWECHUNGURA)

۱۹۴۵ء میں جبکہ میری عمر چھ برس کی تھی' مجھے رومن کیتھولک چرچ میں بپتسمہ دیا گیا اور یوناس کے نام سے موسوم ہوا۔ اس وقت میرے والدین لا مذہب تھے' مگر وہ رومن کیتھولک میں دلچسپی ضرور رکھتے تھے کہ ہمارے علاقے میں یہی مذہب متعارف تھا۔ اس صورت میں عیسوی مذہب کے اختیار کرنے میں میرے ارادہ و اختیار کا کوئی دخل نہ تھا۔

دس برس کی عمر میں مَیں رومن کیتھولک اسکول میں داخل ہوا جہاں مروجہ نصاب کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ ۱۹۶۰ء تک مَیں اسی اسکول میں پڑھتا رہا بلکہ اگر صحیح الفاظ استعمال کروں تو یہ کہوں گا کہ قیدی کی زندگی گزارتا رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوشش کے باوجود مَیں کسی اور مذہب کے بارے میں کچھ معلومات حاصل نہ کر سکا۔ حالانکہ میرا جذبہ تجسس اس کا پرزور تقاضا کرتا تھا۔

۱۹۵۹ء میں تاریخ کے گھنٹے میں پہلی مرتبہ مجھے اسلام اور عیسائیت کے بارے میں جاننے کا اتفاق ہوا اور میرے ذہن میں کچھ وسعت سی پیدا ہوئی۔ اس سے قبل مَیں مسلمانوں کو بے دین اور کافر سمجھتا تھا اور پروٹسٹنٹوں کو بھٹکی ہوئی بھیڑیں' مگر اب میرے خیالات میں بیداری کی لہر پیدا ہو گئی اور خصوصاً اسلام کے بارے میں تفصیل سے جاننے کی جستجو زور پکڑتی گئی مگر افسوس کہ مجھے اس کا کوئی موقع نہ ملا۔ عیسائیت کا مطالعہ کیا تو مارٹن لوتھر اور انگلستان کے ہنری ہشتم پر بات آ کر رک گئی تاہم یہ سوالات ذہن میں طوفان مچانے لگے:۔

۱۔ کیا یسوع مسیح خدا ہیں؟

۲۔ تثلیث کی کوئی حقیقت ہے' اس کے ثبوت کیا ہیں؟
۳۔ جہنم کیا ہے' کیا یہ امید اور آرام کی جگہ ہے یا خوف اور سزا کی؟
۴۔ کیا پوپ کو واقعی وہ اختیارات حاصل ہیں جن کا وہ مدعی ہے؟ آخر کیسے؟
۵۔ پادری گناہوں کی بخشش کی ضمانت کیوں دیتے ہیں جبکہ خود مسیح نے ایسی کوئی بات نہیں کی؟
۶۔ بائبل عوامی نفسیات وادراک کے قریب کیوں نہیں ہے؟
۷۔ کیا بائبل بت پرستی کی اجازت دیتی ہے۔ اگر ایسا نہیں تو پھر رومن کیتھولک چرچ میں ایسا کیوں ہوتا ہے؟
۸۔ مریم کو خدا کی ماں کیوں کہا جاتا ہے جبکہ مسیح نے اسے کبھی اس لقب سے یاد نہیں کیا؟
۹۔ جیسا کہ چرچ کی طرف سے دعویٰ کیا جاتا ہے' روٹی مسیح کے جسم میں کیسے تبدیل ہو جاتی ہے (یہ روٹی عشائے ربانی کے موقع پر لوگوں میں تقسیم کی جاتی ہے۔)
۱۰۔ پطرس کے بارے میں کیوں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ چرچ کی بنیاد ہے؟

یہ اور اس طرح کے کئی اور سوالوں نے میرے دل ودماغ میں اضطراب کی لہریں پیدا کردیں۔ میرا علم بڑا ناقص تھا۔ پادری کے پاس گیا اور اس نے جواب دینے کی کوشش کی مگر اطمینان نہ ہوا۔ سوال دہرائے تو سختی سے منع کر دیا گیا کہ چپکے سے اپنے ایمان پر قائم رہوں اور مین میخ نہ نکالوں۔ "دراصل ان باتوں میں کچھ بھید ہیں جو ہماری سمجھ میں نہیں آسکتے"۔ پادری صاحب نے زور دے کر کہا اور ئیں واقعی خاموش ہو گیا۔ اضطراب کی لہریں سہم کر وقتی طور پر سو گئیں حتیٰ کہ ئیں نے تعلیم مکمل کر لی اور اسکول سے فراغت پالی۔

۱۹۶۳ء میں ایک مسلمان سے میری دوستی ہو گئی' اس نے مجھے اسلام کے بارے میں بہت کچھ بتایا اور پوری کوشش کی کہ میں اس کا دینی بھائی بن جاؤں مگر اسے کامیابی نہ ہوئی تاہم اگرچہ وہ ناکام رہا مگر میرے دل میں اس نے اسلام کے لیے ایک زبردست داعیہ پیدا کر دیا۔ ئیں ان دنوں ٹانگانیکا جھیل کے کنارے قیام پذیر تھا۔ جلد ہی مجھے یہ جگہ چھوڑ کر شمالی علاقے میں جانا پڑا جہاں ئیں نے ایک مرتبہ پھر عیسائیت کے بارے میں اپنے شکوک

وشبہات کا اظہار کیا۔ میں چاہتا تھا کہ مجھے ان سوالات کے جواب مل جائیں' میرا اطمینان ہو جائے اور بدستور اپنے مذہب پر قائم رہوں۔ وہاں چرچ کے متعلقہ لوگوں نے مجھے ایک کتاب دی جس کا عنوان تھا (LET GOD BE TRUE) اس میں بہت سی باتیں بائبل کے حوالے سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

انہی دنوں ایک اور مسلمان سے میرا تعارف ہو گیا۔ یہ مسلمان بھی اپنے مذہب پر بہت ناز کرتا تھا۔ مَیں نے وجہ دریافت کی تو کہنے لگا "میرا مذہب بالکل سچا ہے۔ اس کے عقائد بڑے ہی سادہ ہیں۔ ان میں کوئی اینچ پینچ نہیں اور ہم ہو بہو اسی انداز میں عبادت کرتے ہیں جس میں ہمارے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا کرتے تھے"۔ یہ باتیں ایسی تھیں کہ نظر انداز نہیں کی جا سکتی تھیں اور اپنے اندر زبردست دلکشی رکھتی تھیں، مگر مذکورہ بالا کتاب بھی میرے زیر مطالعہ تھی اور مَیں اپنے آپ کو نسبتاً پُرسکون محسوس کرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مَیں سخت الجھ گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں؟ گھبرا کر ایک روز اپنے مسلمان دوست سے کہا:

"مَیں ان پیچیدگیوں سے سخت بیزار ہو گیا ہوں جو ہر مذہب میں پائی جاتی ہیں"۔

میرا دوست میری بات پر مسکرایا اور بڑے حوصلے' دردمندی اور ہمدردی سے اسلامی تعلیمات کی وضاحت کی۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی اور مسرّت بھی کہ یہاں کسی قسم کی کوئی پیچیدگی تھی نہ الجھن' تضاد بیانی تھی نہ توہم پرستی۔ یہ باتیں میرے دل میں اتر گئیں۔ مَیں اس دوست کے پاس تین مہینے تک ٹھہرا رہا۔ اسلام کے بارے میں میرا ذہن صاف ہو گیا تھا۔

روزگار نے مجھے اس دوست سے بھی جدا کر دیا۔ جنوری ۱۹۶۴ء میں ایک اور مقام پر میری ایک ایسے مسلمان سے شناسائی ہوئی جو پہلے دونوں مسلمانوں سے زیادہ پڑھا لکھا تھا۔ اس نے میرے ذہن سے اسلام کے بارے میں رہے سہے شبہات بھی کھرچ ڈالے۔ مَیں نے چرچ جانا چھوڑ دیا۔ زیادہ وقت سوچ بچار اور اپنے آپ کو سمجھانے میں صرف ہوتا۔ ایک ماہ تک یہی کیفیت رہی۔ مَیں اس حتمی نتیجے پر پہنچ گیا کہ اسلام ہی خدا کا سچا دین ہے اور اب اس سے دور رہنا بدقسمتی کے سوا اور کچھ نہیں۔ چنانچہ ۲۳ فروری ۱۹۶۴ء کو مَیں نے مسلمانوں کے ایک اجتماع میں اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔ میرا

اسلامی نام موسیٰ رکھا گیا۔

الحمدللہ اب میں مسلمان ہوں۔ ایک ایسے دین کا پیروکار جو سراپا صداقت ہے۔ مکمل نظامِ زندگی پیش کرتا ہے۔ جس میں تین خداؤں کی بجائے اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت ہوتی ہے اور بالکل پیغمبر اسلام کے طریقے پر، جس میں کسی آسمانی کتاب یا پیغمبر کا انکار نہیں کیا جاتا اور جس میں بت پرستی کا کہیں شائبہ تک نہیں ہے۔

●......●......●

میوس بی جولی (انگلستان)

(MAVIS B. JOLLY)

میں ایک عیسائی خاندان میں پیدا ہوئی۔ چرچ آف انگلینڈ میں بتسمہ دیا گیا اور ہوش سنبھالنے پر ایک چرچ اسکول ہی سے تعلیم کا آغاز کیا جہاں میں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں وہ کہانیاں پڑھیں جو بائبل میں بیان کی گئی ہیں۔ ان کہانیوں نے اور چرچ کی فضا نے مجھے جذباتی طور پر بہت متاثر کیا۔ اونچی قربان گاہ پر بھڑکتی ہوئی شمعیں، تیز خوشبو کی لپٹیں، لانبے چوغوں میں ملبوس پادری اور عبادت کے وقت سرگوشیوں کا ماحول۔ یہ سب کچھ مجھے بہت پراسرار لگتا اور میرے ننھے سے ذہن پر رعب سا طاری رہتا۔ ان دنوں میں واقعی مخلص اور پُرجوش عیسائی تھی، لیکن جوں جوں عمر بڑھتی گئی اور بائبل اور عیسائیت کا مطالعہ تسلسل سے جاری رہا، میں سوچنے لگی کہ جو کچھ میں پڑھتی ہوں، جس پر میرا ایمان ہے اور جسے میں عبادت کی عملی صورت بھی دیتی ہوں، آخر اس کی حقیقت کیا ہے؟ اسی سوچ کا نتیجہ تھا کہ عیسائیت پر مجھے کامل اطمینان نہ رہا اور کئی باتوں میں یقین ڈگمگانے لگا۔ حتیٰ کہ حالت یہ ہوئی کہ جب میں اسکول سے فارغ ہوئی تو مکمل طور پر دہریت کی نذر ہو چکی تھی۔

دہریہ بننے کے باوجود دل کو سکون حاصل نہ ہوا تو میں نے دیگر مذاہب کا مطالعہ کرنے کی ٹھانی۔ آغاز بدھ مت سے کیا اور بہت دلچسپی سے اس کی پیچیدہ فلاسفی کا مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ بلاشبہ اس مذہب کے کچھ نیک مقاصد بھی ہیں لیکن انسانی رہنمائی اس کے مقدر میں نہیں ضروری تفصیلات کا بھی وہاں غیر معمولی قحط نظر آیا۔

ہندو مت کا مطالعہ کیا تو میں بہت سٹپٹائی۔ میں عیسائیت کے تین خداؤں سے بیزار

تھی مگر یہاں تو ہزاروں خدا کلبلا رہے تھے اور ان کی کہانیاں اتنی مضحکہ خیز تھیں کہ انہیں قبول کرنا تو در کنار پڑھتے ہوئے بھی گھِن آتی تھی۔

مَیں نے یہودیت کو جاننے کی کوشش بھی کی۔ عہد نامہ قدیم (توریت) کو مَیں پہلے ہی پڑھ چکی تھی اور اندازہ کر چکی تھی کہ میرے معیار کے مطابق ایک مذہب کو جیسا ہونا چاہئے' یہودیت اس کے بالکل برعکس ہے۔ ایک دوست نے روحانیت کی طرف توجہ دلائی اور مشورہ دیا کہ روحوں کو بلانے کے لئے چلّہ کشی کروں۔ مَیں نے یہ کام شروع بھی کیا' مگر اسے زیادہ دیر تک جاری نہ رکھ سکی۔ دراصل مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ کم از کم میرے معاملے میں یہ شغل سراسر خود فریبی کے مترادف ہو گا بلکہ اگر اسے مزید جاری رکھا گیا تو سخت نقصان دہ ثابت ہو گا۔

دوسری عالمی جنگ ختم ہو گئی۔ مَیں نے لندن کے ایک دفتر میں نوکری کر لی۔ بظاہر مصروف ہو گئی مگر میرا ذہن مذہب کی جستجو سے بے نیاز نہ رہ سکا۔ انہی دنوں کی بات ہے' ایک اخبار میں کسی کا خط چھپا جس کی تردید میں مَیں نے بائبل کے حوالوں سے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مسیح کا تقدس واہمے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ میرا یہ خط بہت سے لوگوں سے رابطے کا سبب بن گیا۔ جن میں سے ایک مسلمان بھی تھا۔ اس نے قرآن کے حوالوں سے ثابت کیا تھا کہ مسیح کی عظمت اور تقدس ہر قسم کے شک و شبے سے بالا ہے۔ واقفیت بڑھی تو مَیں نے اپنے اس مسلمان دوست سے اسلام کے بارے میں مراسلت شروع کی۔

مَیں اعتراف کرتی ہوں کہ ہر گزرتے دن میرے اندر اسلام کی مخالفت کا جذبہ دم توڑتا گیا۔ اگرچہ یہ بات ناممکن لگتی تھی' مگر مَیں یہ تسلیم کیے بغیر نہ رہ سکی کہ انسانی تاریخ میں مکمل انقلاب ایک فرد واحد محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی نے برپا کیا تھا جبکہ بیسویں صدی کے تمام تر وسائل کے باوجود آج کی بہترین حکومتیں اس انقلاب کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکیں اور تہذیبی و فکری اصلاح کے لئے اسلام کی مرہونِ منت ہیں۔

اس موقع پر مَیں چند دیگر مسلمانوں سے بھی ملی اور نومسلم انگریز خواتین سے بھی تبادلۂ خیال کیا مگر شرح صدر حاصل نہ ہو سکا۔ اس دوران میں مَیں نے کئی کتابوں

کا مطالعہ کیا جن میں "ریلیجن آف اسلام" محمد اینڈ کراسٹ" اور "سورسز آف کرسچینٹی" قابلِ ذکر ہیں۔ آخر الذکر کتاب کے مطالعے سے انکشاف ہوا کہ عیسائیت اور قدیم بت پرستی کے درمیان حیرت انگیز مشابہت پائی جاتی ہے۔ پھر میں نے قرآن مجید کا مطالعہ بھی کیا۔ شروع میں غیر معمولی تکرار کا احساس ہوا۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ میں اس سے کوئی اثر قبول کرتی تھی یا نہیں، مگر یہ ضرور محسوس ہوا کہ قرآن نہایت خاموشی سے روح پر اثر انداز ہوتا ہے۔ راتوں پر راتیں بیت گئیں اور میں نے قرآن کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ تاہم میں یہ سوچ کر اکثر حیرت میں ڈوب جاتی کہ ایک انسان پوری نوعِ انسانی کو مکمل رہنمائی کیسے دے سکتا ہے؟ مسلمان کبھی دعویٰ نہیں کرتے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فوق البشر تھے۔ مجھے یہ بھی پتہ چل گیا کہ اسلامی عقیدہ کے مطابق تمام پیغمبر انسان ہوتے ہیں، وہ ہر قسم کے گناہ سے محفوظ ہوتے ہیں اور یہ کہ وحی کوئی نئی چیز نہیں ہے، بنی اسرائیل کے پیغمبروں پر بھی وحی اترتی رہی ہے بالکل اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی پیغمبر تھے۔ یہاں ایک نیا سوال میرے ذہن میں پیدا ہوا کہ پھر بیسویں صدی میں کوئی پیغمبر مبعوث کیوں نہیں ہوا؟ اس کا جواب مجھے قرآن سے مل گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے آخری پیغمبر اور نبی تھے ذہن نے بھی یہ بات قبول کی۔ واقعی مناسب بھی یہی تھا کہ جب قرآن جیسی کتاب اپنی مکمل صورت میں موجود ہے جو ہر معاملے میں انسان کی رہنمائی کر رہی ہے، اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا ہے تو اس صورت میں کسی نئے پیغمبر یا نئی کتاب کی ضرورت بھی کیا ہے؟

اسلام کے بارے میں خاصی معلومات حاصل کر لینے کے باوجود میرا ذہن ان تعصبات سے چھٹکارا نہیں حاصل کر سکا تھا جو عیسائی مبلغین نے ہر طرف پھیلا دیے تھے۔ مثال کے طور پر اب تعدد ازدواج (POLYGAMY) کے نظریے نے مجھے پریشان کر دیا۔ میں نے سوچا کہ کم از کم اس معاملے میں مغرب نے اسلام پر ضرور سبقت حاصل کی ہے اور یک زوجی (MONOGAMY) کا نظریہ فطری بھی ہے اور ترقی پسندانہ بھی۔ اس کا ذکر میں نے ایک مسلمان دوست سے کیا تو انہوں نے متعدد اخباری تراشوں اور مضمونوں کی مدد سے مجھے مغرب کی یک زوجی تصویر دکھا دی کہ کس طرح قانونی بیوی تو

بلاشبہ ایک ہوتی ہے مگر مرد اس کے علاوہ بیک وقت دس دس عورتوں سے تعلقات قائم کر لیتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ مغرب میں خفیہ جنسی تعلقات جو تباہ کن صورت اختیار کر رہے ہیں اس کا ایک ہی حل ہے کہ محدود پیمانے پر تعدد ازدواج کو جائز قرار دے دیا جائے اور واقعی یورپ میں جنگ کے بعد مردوں کی تعداد عورتوں کے مقابلے میں بہت کم ہو جانے سے عورتوں کی ایک کثیر تعداد مجرد رہنے پر مجبور ہو رہی تھی' جس کی وجہ سے ان گنت قسم کی قباحتیں پیدا ہو رہی تھیں۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ DEAR SIR کے عنوان سے ایک ریڈیو پروگرام میں ایک غیر شادی شدہ انگریز لڑکی نے کچھ لگی لپٹی رکھے بغیر برملا کہہ دیا تھا کہ "تعدد ازدواج کو قانونی صورت دی جانی چاہیے اور وہ تنہا زندگی گزارنے کے مقابلے میں اپنے خاوند کی کسی بھی قانونی بیوی کے ساتھ رہنے کو ترجیح دے گی"۔ مجھے بتایا گیا کہ اسلام میں تعدد ازدواج پر کسی کو مجبور نہیں کیا جاتا۔ لیکن چونکہ یہ مذہب ایک مکمل ضابطہ حیات پیش کرتا ہے اس لئے کسی بھی ہنگامی اور اضطراری صورت حال سے نپٹنے کے لئے اس امر کی اجازت دی گئی ہے کہ ایک سے زیادہ بیویاں نکاح میں لائی جا سکیں۔

یہ مرحلہ طے ہوا تو اسلام میں طریق عبادت کا مسئلہ سامنے آ کھڑا ہوا۔ آخر نمازوں کی اتنی کثرت میں کیا تک ہے اور ان کا تواتر تو بالکل بے معنی لگتا ہے۔ میرے مسلمان دوست نے اس کا برجستہ جواب دیا "موسیقی کی اس پریکٹس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جس میں تم لوگوں کا جی چاہے نہ چاہے ضرور حصہ لیتے ہو اور روزانہ آدھ گھنٹہ اس میں صرف کرتے ہو۔ یورپ میں لوگوں نے موسیقی کو روحانی غذا قرار دے دیا ہے اور بالکل یہی معاملہ اسلامی عبادت کا ہے۔ حالانکہ موسیقی سکون حاصل کرنے کا ایک مصنوعی اور عارضی طریقہ ہے جبکہ عبادت انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور دیرپا اثرات کی حامل ہے۔ میرے مسلمان دوست نے بتایا کہ عبادت خدا کے فائدے کے لئے نہیں کی جاتی اس کے فوائد براہ راست خود انسانی ذات کو پہنچتے ہیں۔

یوں میں مرحلہ وار اسلامی صداقت کی قائل ہوئی اور آخر کار اسلام قبول کر لیا۔ میں نے یہ فیصلہ مکمل ذہنی و قلبی اطمینان کے ساتھ کیا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ میرا جذباتی فیصلہ ہے بلکہ تقریباً دو سال تک میں نے ایک ایک معاملے پر غور و خوض کیا ہے۔ ایک ایک بات کو

عقل کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور جب میں نے یقین حاصل کرلیا ہے کہ اسلام وہ زرِ خالص ہے جو ہر معیار پر پورا اترتا ہے تو میں نے اسے شرحِ صدر کے ساتھ قبول کرلیا ہے۔ الحمد للہ ربّ العالمین۔

●.....●.....●

ولیم برشل بشیر پکارڈ (انگلستان)

(WILLIUM BASHIR PICKARD)

ولیم برشل بشیر پکارڈ بی اے (کینٹب) ایل ڈی (لندن) ایک مصنف' شاعر اور ناول نگار کی حیثیت سے زبردست شہرت کے حامل ہیں۔ ان کی تصانیف میں "لیلیٰ اور مجنوں" "القاسم کے سفر" اور "نئی دنیا" خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

پیغمبرِ اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مشہور مقولہ ہے:

"ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ یہ اسکے والدین ہیں جو اسے یہودی یا مجوسی یا عیسائی بنا دیتے ہیں"۔ اس قولِ صادق کی رُو سے مَیں بھی پیدائشی مسلمان تھا' مگر اس حقیقت سے باخبر مَیں سالہا سال کے بعد ہوا۔

اسکول اور کالج کی زندگی میں میری ساری دلچسپیاں نصابی سرگرمیوں تک محدود تھیں یا پھر اچھا کھانا اور اچھا پہننا طبیعت کو بہت مرغوب تھا۔ میرا شمار غیر معمولی ذہین طلبہ میں نہیں ہوتا تھا' مگر بلند عزائم سینے میں ہر وقت مچلتے رہتے تھے۔ مذہب عیسوی کے جیسے بھی معیار ہیں' مَیں نے ان کے مطابق خدا اور عبادت کے تصورات کو پہچاننے کی کوشش کی۔ اس وقت یہ ساری باتیں مجھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ اس کے علاوہ مَیں جن انسانی خصوصیات کو پرستش کی حد تک پسند کرتا تھا' وہ شرافت اور جرأت تھی۔

کیمبرج سے فارغ ہو کر مَیں ملازمت کے سلسلے میں وسطی افریقہ کے ملک یوگنڈا چلا گیا۔ یہاں انسانی زندگی کے بعض انوکھے اور دلچسپ پہلوؤں کا مشاہدہ ہوا۔ مَیں نے دیکھا کہ یہ لوگ اگرچہ سیاہ فام ہیں مگر ان کے دل خلوص اور انسانی ہمدردی کی روشنی سے منور ہیں۔ ان کی زندگی سادہ ہے' مگر پھر بھی خوشیوں سے بھرپور ہے۔ یہ لوگ مسلمان تھے اور

اسلام سے میرا پہلا تعارف انہی کی وساطت سے ہوا۔

یوگنڈا میں میری تنہائیوں کی رفیق الف لیلیٰ (ARABIAN NIGHTS) تھی۔ میں نے اسے پہلے پہل کیمبرج میں پڑھا تھا۔ اسی کے مطالعے کا اثر تھا کہ غیر محسوس طریقے سے مشرقی اقدار کی محبت میرے دل میں جاگزین ہو گئی تھی۔ یوگنڈا کے قیام نے اس نقش کو مزید گہرا بنا دیا۔

۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ چھڑ گئی تو میں اپنے وطن انگلستان آ گیا۔ یہاں آتے ہی میں بیمار پڑ گیا۔ صحت بحال ہوئی تو میں نے فوج میں کمیشن کے لئے درخواست دے دی مگر کمزوری صحت کی بنیاد پر مجھے کمیشن نہ ملی۔ میں نے ہمت نہ ہاری اور ایک رضا کار گروپ میں شامل ہو گیا اور بعد میں باقاعدہ فوجی کی حیثیت سے جنگ میں شامل ہوا۔ مغربی محاذ پر فرانس کے مقام سوے پر لڑتے ہوئے زخمی ہوا اور دشمنوں کے ہتھے چڑھ گیا جو قیدی بنا کر مجھے جرمنی لے گئے جہاں مجھے سسکتے بلکتے انسانوں کی حالت زار کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ خصوصاً میں ان روسی قیدیوں کو نہیں بھول سکتا جو پیچش میں مبتلا ہو کر کتوں کی موت مر رہے تھے۔ میرا دایاں بازو شدید زخمی ہو کر تقریباً بیکار ہو گیا تھا۔ اس لئے مجھے ہسپتال میں رکھا گیا تھا۔ بعد میں مجھے سوئٹزرلینڈ کے ایک ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا۔

رنج و مصیبت، غریب الوطنی اور زندانی کی اس حالت میں مجھے قرآن اکثر یاد آتا تھا۔ میرے تصورات پر الف لیلہ کا ایک منظر چھایا رہتا تھا۔ اس میں ایک ناگہانی آفت پورے کے پورے شہر کو مکمل طور پر ملیا میٹ کر دیتی ہے' مگر ایک نوجوان دنیا و مافیہا سے بے نیاز قرآن کے مطالعے میں اس طرح مستغرق ہوتا ہے کہ اسے گردوپیش کی تباہی کی خبر تک نہیں ہوتی' نہ یہ تباہی اسے کچھ نقصان پہنچاتی ہے۔ چنانچہ میں جرمنی ہی میں تھا جبکہ میں نے اپنے گھر خط لکھ کر سیل (SALE) کا ترجمہ قرآن منگوانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ یہ بھیجا گیا تھا مگر مجھ تک نہ پہنچا۔

سوئٹزرلینڈ میں میرے بازو اور ٹانگ کا آپریشن ہوا۔ میری صحت بحال ہوئی اور میں چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تو میں نے ساواری (SAVARY) کا فرانسیسی ترجمہ قرآن خرید لیا۔ (یہ آج بھی میرے پاس موجود ہے اور جان سے زیادہ عزیز ہے) میں

بیان نہیں کر سکتا کہ اس موقع پر قرآن نے مجھے مسرت و اطمینان کی کن انتہاؤں سے ہمکنار کیا۔ یوں لگتا تھا کہ ابدی صداقتوں کی کوئی کرن اپنی تمام تر برکتوں کے ساتھ میرے دل پر نازل ہو رہی ہے، جس کی ٹھنڈک اور روشنی روح کی گہرائیوں میں اترتی جا رہی ہے۔

اب میرے دل میں قرآن لکھنے کی خواہش شدت سے ابھرنے لگی۔ دایاں ہاتھ ابھی تک بیکار تھا' اس لئے بائیں ہاتھ سے مشق شروع کر دی۔ قرآن کے حروف لکھتے ہوئے میں وہی خوشی اور کامرانی محسوس کرتا تھا جو ایک ننھا بچہ شروع شروع میں کچھ لکھتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں سوئٹزر لینڈ ہی میں تھا جبکہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھنے لگا تھا۔

جنگ بند ہوئی تو میں دسمبر ۱۹۱۸ء میں رہا ہو کر وطن واپس آ گیا۔ ۱۹۲۱ء میں میں نے لندن یونیورسٹی کے شعبہ ادبیات میں داخلہ لے لیا۔ میرا ایک مضمون عربی تھا جس کے لئے مجھے کنگز کالج میں لیکچر سننے کے لئے جانا ہوتا تھا۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ عربی کے استاد (عراق کے مرحوم بلال شاہ) نے لیکچر کے دوران قرآن کا ذکر کیا اور کہا ''خواہ آپ کا اس پر ایمان ہو یا نہ ہو لیکن آپ اس کتاب کو بے حد دلچسپ اور قابل قدر پائیں گے''۔

''لیکن میں تو اس کتاب کی صداقت پر یقین رکھتا ہوں''۔ میں نے فوراً جواب دیا۔

اس پر وہ پہلے تو بہت متعجب ہوئے پھر خوشی کا اظہار کیا اور تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد انہوں نے لندن کے نوٹنگھم گیٹ پر واقع مسجد میں آنے کی دعوت دی۔ میں وہاں گیا' نماز میں شریک ہوا اور اسلامی تعلیمات کو سمجھنے کی مزید کوشش کی۔ میں بعد میں بھی اکثر مسجد میں چلا جاتا اور نماز میں شامل ہو جاتا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے شرح صدر عطا کر دیا اور میں نے یکم جنوری ۱۹۲۲ء کو مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔

میری زندگی کے اس مقدس انقلاب پر تقریباً نصف صدی کا عرصہ گذر چکا ہے۔ الحمدللہ کہ میں اسلام پر نظری اور عملی دونوں اعتبار سے پختہ اعتقاد رکھتا ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ اللہ کی قوت و حکمت اور رحم و کرم بے کنار ہے اور علم کی حدود جتنی پھیلتی جاتی ہیں اس کی قدرتیں اتنی ہی روشن ہو رہی ہیں۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ خدا کی اطاعت' اس کی تسبیح و تہلیل اور عقیدت و محبت ہی ہمارا سرمایہ افتخار اور توشۂ آخرت ہے۔ الحمدللہ رب العالمین۔

● ...... ● ...... ●

ڈاکٹر ہارون مصطفیٰ لیون (انگلستان)

(DR.HAROON MUSTAFA LEON)

پروفیسر ڈاکٹر ہارون مصطفیٰ لیون ایم اے (شیخ عبداللہ کوئیلم) ڈاکٹر آف فلاسفی' ڈاکٹر آف لٹریچر' ڈاکٹر آف سائنس' ڈاکٹر آف لاز۔ ایف ایس پی کا اصل نام ڈبلیو ایچ کوئیلم تھا۔ انہوں نے ۱۸۸۲ء میں اسلام قبول کیا۔ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کے ماہر لسانیات اور ماہر ارضیات تھے اور یورپ اور امریکہ کی بہت سی اعلیٰ اور ثقہ ترین علمی انجمنوں اور یونیورسٹیوں کے فیلو و اعزازی ممبر تھے۔ وہ متعدد مشرقی زبانوں مثلاً عبرانی' عربی' فارسی' ترکی اور پشتو پر استادانہ مہارت رکھتے تھے۔ وہ ایک وقیع جریدے ISLE OF MAN EXAMINER میں لسانیات پر محققانہ مضامین لکھا کرتے نیز مختلف زبانوں کی گرائمر اور ساخت پر انہوں نے بہت سی قسطوں میں نہایت قابل قدر محققانہ بحث کی اور علمی حلقوں سے اپنی محنت و ژرف نگاہی کا لوہا منوالیا اور بہت سے اداروں اور یونیورسٹیوں نے انہیں اعزازات سے نوازا۔

ڈاکٹر ہارون مصطفیٰ علم الارض پر بھی کامل عبور رکھتے تھے اور یورپ و امریکہ کے ثقہ علمی حلقوں میں ان کے لیکچر توجہ اور شوق سے سنے جاتے تھے انہی غیر معمولی صلاحیتوں کی بناء پر انہیں لسانیات کے ایک بین الاقوامی ادارے کا سیکرٹری جنرل چنا گیا اور لندن سے چھپنے والے ایک مستند سائنسی رسالے ''فلومتھ'' کا ایڈیٹر بھی بنالیا گیا۔ انہوں نے عربی اور ترکی لٹریچر پر بھی کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ترکی کے سلطان عبدالحمید خان اور آسٹریا کے بادشاہ نے انہیں متعدد تمغوں اور تعریفی اسناد سے سرفراز کیا۔

ڈاکٹر موصوف اسلام کے پُر جوش اور ان تھک مبلغ تھے۔ ان کی تبلیغی مساعی کے نتیجے

میں کم و بیش پانچ سو تعلیم یافتہ اور اعلیٰ حیثیت کے انگریزوں اور یورپینوں نے اسلام قبول کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ چرچ کے حلقے بوکھلا گئے۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے خلاف نہایت اوچھا پروپیگنڈا شروع کر دیا اور برطانوی حکومت نے انہیں ۱۹۰۸ء میں جلا وطن کر دیا۔ ۱۹۱۲ء تک چار برس کا عرصہ انہوں نے دنیا کے مختلف ملکوں میں گزارا مگر تبلیغ کے دینی فریضے سے ایک لمحے کے لئے بھی غافل نہ رہے۔ ۱۹۱۲ء میں واپس انگلستان پہنچے اور اب لندن کی بجائے لیورپول میں رہائش اختیار کر لی اور وہیں ۱۹۳۶ء میں وفات پائی۔

مجھے اسلامی تعلیمات کے جس پہلو نے سب سے زیادہ متاثر کیا اور جو مجھے بالآخر اس مقدس حلقے میں کھینچ لایا' وہ انسانی عقل کا احترام ہے۔ اسلام زندگی کے اس شعبے یعنی عقل یا غور و فکر کو ضروری اہمیت دیتا ہے اور اپنے پیروکاروں سے اندھی عقیدت اور جاہلانہ پرستش کا ہرگز مطالبہ نہیں کرتا۔ جبکہ اس کے برعکس عیسائیت سمیت دیگر سارے مذاہب اپنے ماننے والوں سے توقع رکھتے ہیں کہ بلا سوچے سمجھے اور عقل کو درمیان میں لائے بغیر آنکھیں بند کر کے ''چرچ'' کی اطاعت کی جائے۔ اسلام ہر شخص کو دعوت عام دیتا ہے کہ اس کے حلقے میں داخل ہونے سے پہلے وہ عقل کو پوری طرح بروئے کار لا کر تحقیق، تجسس اور جستجو کے سارے تقاضے پورے کرے۔ پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عقل کی اہمیت یوں واضح فرمائی ہے:

''اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز عقل سے زیادہ قیمتی پیدا نہیں فرمائی۔ زندگی میں جتنے فوائد حاصل ہوتے ہیں وہ عقل ہی کا نتیجہ ہیں۔ بصیرت و حکمت اور سمجھ بوجھ جیسی نعمتیں بھی عقل ہی کی پیداوار ہیں''۔

ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''لوگو! سن لو' خواہ کوئی کتنی ہی نمازیں پڑھتا ہو' روزے رکھتا ہو' خیرات دیتا ہو' اکبر کرتا ہو اور اعمال صالحہ کا خوگر ہو لیکن ان کا اجر و ثواب جبھی ملے گا جب اس نے اپنی عقل یا ارادے کا استعمال ٹھیک کیا ہو گا''۔

وہ لوگ جو اندھی تقلید کرتے ہیں اور اپنے ذہن و فکر سے کام نہیں لیتے' قرآن انہیں ایسے گدھے سے تمثیل دیتا ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں۔

چوتھے خلیفہ راشد حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''دنیا تاریکی ہے جبکہ علم روشنی ہے لیکن علم بغیر صداقت کے محض واہمہ ہے''۔

مسلمانوں کا ایمان ہے کہ اسلام صداقت ہی کا دوسرا نام ہے لیکن اس صداقت تک پہنچنے کے لئے فہم وادراک کی رہنمائی انتہائی ضروری ہے۔ اسلام میں عقل یا فہم وادراک کو اس قدر بنیادی اہمیت حاصل ہے کہ قرآن بار بار انسانوں کو اور مسلمانوں کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ نبی اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اس پر خاصا زور دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ حتیٰ کہ آپ نے اپنی رحلت سے چند ہی روز قبل اس پہلو کو خاصا اجاگر کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عائشہ کے حجرے میں ان کے زانو پر سر رکھے سفر آخرت کی تیاری میں مصروف تھے۔ مدینہ کے مرد و زن' بچے' بوڑھے' رنج والم کی تصویر بنے آپ کے بستر مبارک کے گرد بیٹھے تھے۔ آنسو تھمنے کا نام نہیں لیتے تھے اور وفور غم سے ہچکیاں رکنے میں نہیں آتی تھی۔ وہ ہستی جس نے انہیں کفر و جہالت اور گمراہی کے اندھیروں سے نکال کر حق و صداقت اور شہرت و عظمت کی روشن شاہراہ پر لا کھڑا کیا' خوف و ہراس کی بجائے امن و عافیت سے ہمکنار کیا اور جس کی رہنمائی میں دنیا و آخرت کی ساری بھلائیاں ان کے قدموں میں آ پڑی تھیں' اب وہ ہستی انہیں چھوڑ کر جا رہی تھی۔

اس بوجھل اور غم زدہ فضا میں ایک آواز آئی ''اے اللہ کے محبوب' شاید اللہ آپ کو اپنے پاس بلا لینا چاہتا ہے اس صورت میں ہمارا کیا بنے گا''؟

''اللہ کی کتاب تمہارے پاس ہے'' رسول اللہ صلی اللہ وآلہ وسلم نے جواب دیا۔

''لیکن اس کے باوجود اگر ہمیں کسی وقت مزید رہنمائی کی ضرورت پڑی' تو ہمیں کیا کرنا چاہئے۔'' سائل نے وضاحت چاہی۔

''کتاب اللہ کے بعد میری سنت اور اقوال کو حرز جان بنائے رکھنا''۔ حبیب خدا ﷺ نے کمال اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔

''لیکن میرے ماں باپ آپ پر قربان'' سائل نے بڑے ادب سے تیسرا سوال کیا۔

"حالات میں تغیر آتا رہے گا' مسائل سر اٹھاتے رہیں گے' عین ممکن ہے' ہمیں کسی سوال کا جواب قرآن اور سنت سے بھی نہ ملے' پھر ہمارے لئے کیا حکم ہے؟"

رسولِ خدا نے سر اقدس ہولے سے اٹھایا۔ نقاہت کے باوجود آپ کے مبارک چہرے سے نبوت کا نور کرنوں کی طرح پھوٹ رہا تھا۔ آپ نے غیر معمولی وقار اور تحمل سے فرمایا:

"اللہ نے ہر انسان کو ایک نگہبان عطا فرمایا ہے اور وہ اس کا ضمیر ہے۔ دوسرا ہر وقت کا رہنما ساتھ لگا دیا ہے اور وہ عقل ہے' ان دونوں کو حکمت اور سوجھ بوجھ کے ساتھ استعمال کرنا۔ اللہ اپنے فضل سے تمہیں صراط مستقیم پر گامزن رکھے گا"۔

ظاہر ہے یہ خصوصیات رکھنے والا دین اگر ایک سائنس دان کو اپیل نہ کرتا تو اور کسے کرتا؟

●......●......●

لارڈ ہیڈلے فاروق (انگلستان)

(LORD HEADLEY AL FAROOQ)

رائٹ آنریبل سر رولینڈ جارج ایلن سن ہیڈلے ۱۸۵۵ء میں پیدا ہوئے۔ وہ انگلستان کے طبقۂ امراء میں اونچا مقام رکھتے تھے۔ سیاست دان بھی تھے اور مصنف بھی۔ کیمبرج سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اپنی خدمات فوج کے سپرد کر دیں' جہاں وہ کرنل کے عہدے تک پہنچے۔ اگرچہ پیشے کے اعتبار سے انجینئر تھے' تاہم وسیع علمی مطالعہ کے حامل تھے۔ چنانچہ ایک زمانے میں "سالسبری جرنل" کے مدیر بھی رہے۔ ۱۶۔ نومبر 1918ء کو انہوں نے اسلام قبول کیا اور شیخ رحمت اللہ ہیڈلے الفاروق کے اسلامی نام سے موسوم ہوئے۔ دنیا بھر کی سیاحت کے سلسلے میں وہ ۱۹۲۸ء میں برصغیر میں بھی آئے تھے۔ ان کی تصانیف میں A WESTERN AWAKENING TO ISLAM خاصی معروف ہے۔

عین ممکن ہے میرے بعض دوست سوچتے ہوں کہ میں نے مسلمانوں کی زندگی کے کس پہلو سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا ہے حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں۔ میری زندگی کا موجودہ تغیر دراصل نتیجہ ہے برسوں کے غور و فکر کا' چنانچہ جب میں نے حال ہی میں بعض تعلیم یافتہ مسلمانوں سے گفتگو کی اور اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو یہ دیکھ کر میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ جن نتائج اور نظریات تک میرے تفکر نے مجھے پہنچایا وہ ہو بہو اسلام سے مطابقت رکھتے ہیں۔

جیسا کہ قرآن کہتا ہے' مذہب کی تبدیلی انسان کی ذاتی پسند کے تابع ہے' اس

معاملے میں اس پر کوئی جبر نہیں' اسی سے ملتی جلتی بات حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ا۔ پنے حواریوں سے کہی تھی...... مگر عجیب بات یہ ہے کہ آج کی عیسائی اقوام اس اصول کو پیش نظر نہیں رکھتیں۔ میرے پیش نظر پُر جوش پروٹسٹنٹ عیسائیوں کی کئی ایسی مثالیں ہیں جو رومن کیتھولک گھروں میں گھس جاتے ہیں اور مختلف افراد خانہ کا مذہب تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کے نتیجے میں ناخوشگوار ماحول پیدا ہوتا ہے اور نوبت مذہبی منافرت سے بڑھ کر باقاعدہ تصادم تک جا پہنچتی ہے۔ کچھ ایسا ہی رویہ عیسائی مشنری مسلمانوں کے بارے میں روا رکھتے ہیں۔ حالانکہ مسلمان ان مشنریوں کے مقابلے میں "زیادہ اچھے عیسائی" ہیں۔ میں "زیادہ اچھے عیسائی" کی ترکیب استعمال کرتے ہوئے معذرت خواہ ہوں۔ دراصل جہاں تک سخاوت' رواداری اور وسعت ظرفی کا تعلق ہے' اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان ان خوبیوں کے اعتبار سے عام عیسائیوں کے مقابلے میں حضرت عیسیٰ کے کہیں زیادہ قریب ہیں۔

عیسائیت کے جس عقیدے نے مجھے ہلا کر رکھ دیا وہ تثلیث کا عقیدہ ہے۔ تفصیل میں جائے بغیر یہ کہوں گا کہ یہ عقیدہ نہ عقل کو اپیل کرتا ہے نہ وجدان کو' پھر کئی طرح کے تضادات ہیں جو عیسائیت کا جزو بن گئے۔ ایک طرف خدا کو غفور الرحیم بھی کہا جاتا ہے اور دوسری طرف اسے ظالم اور غیر منصف بھی ثابت کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی حضرت عیسیٰ کو مرتبۂ الوہیت پر فائز کر دیا گیا ہے حالانکہ ان کا اصل کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے خلقِ خدا کو نیکی اور ہدایت کی طرف، دعوت دی تھی۔ میں اس خیال کا بارہا اظہار کر چکا ہوں کہ اس مذہب میں جس کی تبلیغ حضرت عیسیٰ نے کی تھی اور اسلام میں کوئی فرق نہیں۔ فقط تعصبات اور فروعی موشگافیوں نے دونوں میں تفریق پیدا کر دی ہے۔ چنانچہ اگر غیر جانبداری اور نیک نیتی سے تھوڑا سا غور کیا جائے تو انسان اس نتیجے تک پہنچے بغیر نہیں رہتا کہ موجودہ عیسائی مذہب انسانیت کی رہنمائی نہیں کر سکتا اور صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو انسان کے ذاتی اور اجتماعی مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔ اسی بنا پر میرے خیال میں ہزاروں مرد اور عورتیں ایسے ہیں جو دل سے مسلمان ہیں مگر عملی زندگی کے کچھ خطرات ہیں' مخالفانہ طعن و تشنیع ہے' جن کے ڈر سے وہ اس حقیقت کا برملا اعتراف نہیں

رتے۔ خدا کا شکر ہے میں نے ہرچہ بادا باد کہہ کر یہ قدم اٹھالیا ہے حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ میرے بہت سے دوست اور رشتہ دار کہیں گے کہ میں گمراہ ہو گیا ہوں یا سٹھیا گیا ہوں حالانکہ انہیں یہ جان کر تعجب ہوگا کہ خیالات کے اعتبار سے میں آج بھی وہی کچھ ہوں جو آج سے بیس برس پہلے تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ اب میں نے اپنے نظریات کا برملا اظہار کر دیا ہے اور یہی اظہار انہیں پسند نہیں آیا۔

میں نے مختصر طور پر وہ وجوہ بیان کر دی ہیں جو میرے قبولِ اسلام کی بنیاد بنیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اسلام قبول کرنے کے بعد حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات سے دور نہیں ہوا بلکہ صحیح عیسائیت کے قریب آیا ہوں اور اپنے آپ کو پہلے سے بہتر عیسائی محسوس کرتا ہوں۔ میں توقع کرتا ہوں کہ میرے سابق ہم مذہب اس مثال کی تقلید کریں گے کہ یہی میرے خیال میں بہترین رویّہ ہے۔ اس اقدام سے انہیں وہی مسرّت حاصل ہوگی جو عیسائیت سے دور جانے کے مقابلے میں اس کے قریب آنے والے کو حاصل ہو سکتی ہے۔

●……●……●

یوسف مظفرالدین

(امریکہ)

یوسف مظفر الدین شمالی امریکہ کی اسلامک پارٹی کے بانی چیئرمین ہیں جس کی بنیاد ۱۹۷۱ء میں رکھی گئی۔ وہ پولیٹیکل سائنس کے استاد رہے ہیں اور پیشے کے اعتبار سے پبلشر ہیں۔ اسلامک پارٹی صحیح العقیدہ امریکی مسلمانوں کی سب سے بڑی' سب سے فعال اور سرگرم جماعت ہے اور سیاست' مذہب' تعلیم اور رفاہِ عامہ کے معاملے میں قابلِ قدر خدمات انجام دے رہی ہے۔ یوسف مظفر الدین نے سترہ سال کی عمر میں اسلام قبول کیا تھا۔ وہ شعلہ بیان خطیب' پُرجوش مبلغ اور انقلابی رہنما ہیں۔ مطالعے کے بے پناہ شوقین ہیں اور اب تک صرف اسلامی معیشت پر پانچ سو منتخب کتابیں پڑھ چکے ہیں۔ ان کا مشورہ ہے کہ اگر لوگ اسلام کی انقلابی روح کو پوری طرح سمجھنا چاہتے ہیں تو انھیں سید مودودی کی تفسیر ''تفہیم القرآن'' اور سید قطب کی تفسیر ''فی ظلال القرآن'' کا بیک وقت مطالعہ کرنا چاہیے۔ وہ اسلامی دنیا کا وسیع مطالعاتی دورہ بھی کر چکے ہیں۔

اکتوبر ۱۹۷۷ء میں یوسف مظفر الدین نے اپنے خاندان کے ہمراہ پاکستان کا دورہ کیا۔ مشہور ہفت روزہ ''زندگی'' لاہور کے رکن ادارہ ہارون الرشید صاحب نے ان سے انٹرویو کیا۔ ذیل کی تحریر اسی انٹرویو سے ماخوذ ہے۔

میرا تعلق امریکہ میں آباد ایک افریقی خاندان سے ہے جس نے صدیوں پہلے مسیحیت قبول کر لی تھی۔ میرے والد اور والدہ دونوں مشنری تھے اور مذہب سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ مَیں خود بھی خدا کے وجود اور محض انسانیت کی فلاح پر اعتقاد رکھتا تھا۔

اس لحاظ سے شروع ہی سے ایک مذہبی آدمی تھا' لیکن سیاسی ذوق بھی رکھتا تھا۔ چنانچہ نوعمری ہی میں مَیں نے افریقیوں کی تحریک آزادی میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ یہیں سے اس خلش کا آغاز ہوا جو بالآخر مجھے اسلام کے دامن میں لے گئی۔ مسیحی مذہب بائبل کی ہدایت کے مطابق مجھے سیاست میں حصہ لینے سے روکتا تھا کہ وہ محض عبادت اور خدا سے تعلق کا نام ہے۔ میرے سامنے دو راستے تھے' سچا عیسائی بن کر ہمیشہ کے لئے سیاست کو خیرباد کہہ دیتا یا قوم پرست بن کر مذہب سے ناطہ توڑ لیتا۔ آج تک لاکھوں کروڑوں انسان ان دو میں سے ایک کا انتخاب کر چکے ہیں یا اس تضاد کو کسی نہ کسی طرح نبھاتے چلے آ رہے ہیں لیکن میرے لئے ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ مَیں تضادات کو ساتھ لے کر نہیں چل سکتا۔ مَیں نے دوسرے مذاہب اور کمیونزم کا مطالعہ شروع کیا۔ کمیونزم کے سلسلے میں تو مجھے وہی پہلی دقت درپیش ہوئی کہ وہ میرے روحانی تقاضوں کا کوئی جواب نہیں دیتا۔ اسلام کا مطالعہ کیا تو راستے روشن ہونے لگے۔ الجھی ہوئی ایک ایک گرہ سلجھنے لگی۔ مَیں نے مسلمانوں کے ساتھ اچھے رابطے اور مطالعے سے معلوم کیا کہ اسلام مذہب نہیں بلکہ دین ہے' مکمل نظامِ زندگی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ اب تک کی ساری زندگی مَیں نے تاریکی میں گزاری ہے۔ حقیقی راستہ تو وہ ہے جو اب نظر آیا ہے۔ اسلام کی صورت میں مجھے منزل کا سراغ مل گیا۔ ذہن میں پیدا ہونے والے سب سوال اور سب عقدے حل ہو گئے۔ سارے اندیشے اور وسوسے ختم ہو گئے۔ دینِ اسلام میری سیاسی اور انقلابی سرگرمیوں میں رکاوٹ نہیں ڈالتا تھا۔ انہیں اور مہمیز کرتا تھا۔ یہ ۱۹۶۱ء کی بات ہے' میری عمر صرف سترہ برس تھی۔ جب مَیں نے شرحِ صدر کے ساتھ اسلام قبول کر لیا۔

اسلام کے جس پہلو نے مجھے بطورِ خاص متاثر کیا ہے وہ اس کی انقلابی روح تھی۔ البتہ عصرِ حاضر کے پیچیدہ مسائل کو اسلام کی روشنی میں دیکھنے اور اسلامی انقلاب کے طریقِ کار کو سمجھنے کے لیے اخوان المسلمون کے شیخ امام حسن البناءؒ سید مودودیؒ اور سید قطب کی بعض کتابوں سے رہنمائی حاصل کی۔ ان کتابوں نے بتایا کہ مشرقِ وسطیٰ اور پاکستان میں اسلامی انقلاب کا قافلہ کن مرحلوں سے گزر رہا ہے اور انقلاب کے اس قافلے نے اپنے لئے کون سا راستہ چنا ہے۔ تب امریکہ میرے لئے کانٹوں کا بستر بن گیا۔ میرے اردگرد

ایک ایسا ماحول پھیلا ہوا تھا جو یکا یک اجنبی ہو گیا تھا۔ بالآخر میں نے بوریا بستر باندھا اور ۱۹۶۷ء میں سعودی عرب آ گیا جہاں مدینۃ النبیﷺ کی دینی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور حجاز کے نامور اساتذہ سے دین کا فہم حاصل کرنے کی کوششوں کا آغاز کیا۔ یہاں کچھ عرصہ قیام کیا اور واپس امریکہ چلا گیا۔ جہاں میں اہل اسلام کو منظم کرنے میں مصروف ہوں۔

●.....●.....●

ہم کیوں مسلمان ہوئے

ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

محترمہ ثریا

"جناب ریحان خاں امریکہ کی ایسٹرن مشی گن یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ ان کی ایک نوجوان سفید فام شاگرد ثریا نے حال ہی میں اسلام قبول کیا ہے اور اپنے آپ کو اسلامی لباس سمیت دینی تقاضوں سے ہم آہنگ کر لیا ہے۔ ریحان خان صاحب اس لڑکی کے لباس اور باوقار دینی اطوار سے بہت متاثر ہوئے۔ اس سے انٹرویو کی صورت میں گفتگو کی اور شمالی امریکہ میں مسلمانوں کے ایک ماہوار جریدہ "یونٹی ٹائمز" میں شائع کرا دیا۔ انٹرویو کا یہ تراشہ برادر عزیز پروفیسر سید وقار علی کاری صاحب نے بھجوایا ہے۔ اس کا ترجمہ ذیل میں دیا جا رہا ہے"۔

سوال: قبول اسلام سے قبل آپ کے مذہبی رجحانات کیا تھے؟

جواب: میرا تعلق ایک پروٹسٹنٹ عیسائی خاندان سے ہے جس کے سب افراد مذہب سے دور ہیں لیکن میں بچپن ہی سے مذہب کی جانب رجحان رکھتی تھی چنانچہ میری عمر دس سال کی تھی جب میں نے اپنے پڑوسیوں سے فرمائش کی کہ وہ اتوار کو چرچ جایا کریں تو مجھے بھی ساتھ لے جایا کریں۔ چنانچہ میں وقتاً فوقتاً ان کے ساتھ گرجا جانے لگی اور جب ہائی اسکول میں پہنچی تو عیسائیت کی مختلف شاخوں اور فرقوں کے بارے میں علم حاصل کرنے لگی۔ اس سلسلے میں میں نے کیتھولک مذہب کا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا اور METHODIST, JEHOVAHS WITNESS, MORMONS اور PRESBYTERIAN جیسے مذاہب کے بارے میں بھی ضروری مطالعہ کیا مگر افسوس

کہ میری روح پیاسی کی پیاسی رہی۔ میرا وجدان جو کچھ طلب کرتا تھا مجھے کہیں نہ ملا۔ مثال کے طور پر میرا ضمیر کہتا تھا کہ اس کائنات کا خالق و مالک وحدہٗ لاشریک ہے جبکہ عیسائیت کے سب فرقے شرک میں مبتلا ہیں اور ابہام کا شکار ہیں۔

سوال: اس صورت حال میں دین اسلام سے آپ کا تعارف کیسے اور کب ہوا؟

جواب: میں ہائی اسکول ہی میں پڑھ رہی تھی جب مجھے مشرق وسطیٰ کے بارے میں خاصی تفصیل کے ساتھ مطالعہ کرنے کا موقع ملا اور اسی حوالے سے پہلے پہل ''اسلام اور مسلم'' کے الفاظ سے میری شناسائی ہوئی مگر اسکول کے زمانے میں میری معلومات کا دائرہ بس یہیں تک محدود رہا۔ کالج میں پہنچی تو خوش قسمتی سے وہاں مشرق وسطیٰ سے تعلق رکھنے والے مسلمان طلبہ بھی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ان سے ملاقاتیں ہوئیں تو اسلام سے تعارف حاصل ہوا اور میں اس مذہب کے اس پہلو سے بہت متاثر ہوئی کہ یہ عیسائیت اور یہودیت کی طرح جز وقتی (پارٹ ٹائم) مذہب نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے پر محیط ہے۔ اسلام چونکہ دن اور رات کے ایک ایک لمحے میں رہنمائی کرتا ہے اور عیسائیت کی مانند اس کی رفاقت کا دائرہ ایک ہفتے میں محض ایک گھنٹے تک محدود نہیں ہوتا اس لئے جب ایک شخص اسے عملی طور پر اختیار کرے تو اس کی زندگی میں نظم و ضبط' سلیقہ اور استحکام پیدا ہو جاتا ہے اور اسلام کی یہ دوسری خوبی تھی جس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اسلام ایک مکمل دین اور فطرت کے عین مطابق ہے۔ چنانچہ میں نے اسے دل و جان سے قبول کر لیا۔

سوال: اور اس کا ردِعمل آپ کے خاندان پر کیا ہوا؟

جواب: خاندان کے ہر فرد کا ردعمل مختلف نوعیت کا تھا۔ میرے والد کا سلوک مجھ سے بہت ہی مشفقانہ رہا ہے چنانچہ اگرچہ میں نے اسلام قبول کرنے کے ساتھ اپنا لباس بھی تبدیل کر لیا اور عام طرز زندگی کو یکسر نیا رنگ دے ڈالا مگر ان کی محبت اور سلوک میں کوئی فرق نہیں پڑا بلکہ ایسا ہوا کہ ایک بار میری ایک پھوپھی آئی اور اس نے مجھے خوب برا بھلا کہا۔ مجھے سنکی اور قنوطی کے طعنے دیئے تو میرے والد نے میری مدافعت کی۔ تاہم میری والدہ کا طرزِ عمل خوشگوار نہ تھا اور وہ میری زندگی کے انقلاب پر قطعی خوش نہ ہوئی لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض دشواریوں کے باوجود میں خوش نصیب ہوں کہ اپنے والدین کے

ہاں رہ رہی ہوں اور مجھے ان پریشانیوں سے سابقہ نہیں پڑا جس کی عموماً توقع کی جاتی ہے۔

سوال: مَیں حیران ہوں کہ آپ کے اندر اتنا بڑا اقدام کرنے کی جرأت کیسے پیدا ہوگئی؟

جواب: آپ کی بات درست ہے کہ امریکہ کے اس ماحول میں جہاں مادیت کا دور دورہ ہے اور عیش پرستی اور تفریح پسندی ہی کو زندگی کی معراج سمجھا جاتا ہے' وہاں اسلام قبول کرنا اور اس کی تعلیمات پر عمل کرنا بے حد مشکل کام ہے چنانچہ یہ فیصلہ کرنے سے پہلے مَیں نے ہزار بار سوچا کہ میرے والدین مجھ سے کیا سلوک کریں گے؟ میری تعلیم کا کیا بنے گا؟ اور میں اپنے حلقۂ احباب میں کیسے زندہ رہوں گی؟ چنانچہ اس نوعیت کے خدشات نے مجھے بہت پریشان کئے رکھا مگر طویل اور گہرے غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کہ ایک وقتی اور عارضی پریشانی کے مقابلے میں جو اسلام قبول کرنے کے نتیجے میں پیش آسکتی تھی' مسلمان نہ ہونے کے نتائج ذہنی اور روحانی اعتبار سے زیادہ گھمبیر ہوسکتے ہیں چنانچہ مَیں نے اللہ سے خوب دعائیں کیں' اس سے مدد اور اعانت طلب کی اور واقعی اللہ نے میری دعائیں سن لیں اور حیرت انگیز طور پر مجھے وہ ہمت اور حوصلہ عطا ہوا کہ مَیں اتنا بڑا فیصلہ کرنے کے قابل ہوگئی۔

سوال: آپ تو ابھی نوعمر ہیں' آپ کا کیا خیال ہے' آپ واقعی اس فیصلے پر مستقل مزاجی سے قائم رہیں گی؟

جواب: مجھے یقین ہے کہ مَیں نے یہ فیصلہ خوب سوچ سمجھ کر کیا ہے اور اس میں کوئی کمزوری پیدا نہیں ہوگی۔ اندازہ کریں کہ جب مَیں قبولِ اسلام کے لئے ایک مسجد میں گئی تو وہاں کے خطیب اور امام نے مجھ پر ذرا بھی دباؤ نہ ڈالا بلکہ مشورہ دیا کہ مَیں پہلے اسلام کے بارے میں خوب مطالعہ کرلوں اور اگر اس کے بارے میں کوئی معمولی سا بھی اعتراض ہے تو سوالات کرکے اسے رفع کرلوں' پھر اسلام قبول کرلوں۔ اس کے برعکس جن دنوں مَیں کیتھولک مذہب کا مطالعہ کررہی تھی ایک مرتبہ میں کیتھولک چرچ میں گئی تو میرے جاننے والوں نے بہت اصرار کیا کہ مَیں اس مذہب کو فوراً قبول کرلوں۔

مجھے اس امر کا بھی اعتماد ہے کہ چونکہ مَیں نے بہت سے مذاہب کا مطالعہ کیا ہے اور میرے شعور نے انہیں مسترد کیا ہے' اس لئے مَیں نے جس مذہب کا انتخاب کیا ہے وہ ہر

لحاظ سے بہترین اور عقل کے عین مطابق ہے۔ اسی طرح میں یہ بھی بتاتی چلوں کہ میں نے دو سال سے زائد عرصے تک خوب جم کر اسلام اور اس کی تعلیمات کا مطالعہ کیا ہے اور بہت سے لوگوں سے اس کے بارے میں گفتگوئیں کی ہیں۔ اس لئے یہ سمجھ لیجئے کہ اسلام قبول کرنے میں نہ تو کسی جذباتیت اور عجلت پسندی کا عمل دخل ہے نہ اس سے کوئی دنیاوی مفاد وابستہ ہے۔ میں نے یہ فیصلہ خوب سوچ سمجھ کر کیا ہے اور انشاء اللہ اس پر عمر بھر ثابت قدم رہوں گی۔

سوال: آپ نے اسلام قبول کر کے کیا حاصل کیا ہے؟

جواب: اعداد و شمار کے حوالے سے یا دو اور دو چار کے انداز میں یہ بتانا کہ مسلمان ہو کر میں نے یہ اور یہ کچھ حاصل کیا ہے' خاصا مشکل ہے۔ تاہم اسلام قبول کر کے سب سے بڑی کامیابی یہ ملی کہ زندگی میں وقار اور ڈسپلن کا چلن پیدا ہوا۔ شب و روز کو مقصدیت نصیب ہوئی اور وہ خلا کی کیفیت جو دل و دماغ پر چھائی رہتی تھی' ختم ہو گئی۔ پھر یہ نعمت بھی کچھ کم نہیں کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی اطاعت انسان کے اندرون کو سکون اور تزکیہ سے مالا مال کرتے ہیں۔ روح میں رفعت اور مقاصد میں بلندی کا احساس پیدا ہوتا ہے اور انسان سخت سے سخت حالات میں پریشانی اور مایوسی سے محفوظ رہتا ہے۔ اللہ کا احسان ہے کہ اسلام کی تعلیمات پر عمل نے میری زندگی کے ہر پہلو کو مثبت طور پر تبدیل کیا ہے۔ ان میں سے بعض تبدیلیاں واضح اور انقلابی نوعیت کی ہیں جبکہ بعض کا تعلق ذہن اور ارادے سے ہے اور وہ اسی نسبت سے لطیف اور غیر نمایاں ہیں۔

سوال: آپ نے اپنے بالوں کو ڈھانپا ہوا ہے' امریکہ کے عریاں ماحول میں آپ کو یہ کیسا لگتا ہے؟

جواب: اس ضمن میں میرے وہی احساسات ہیں جو ایک باعمل مسلمان عورت کے ہو سکتے ہیں۔ میں نے اپنا سر ڈھانپ کر دراصل اس ماحول کی آلودگیوں کے خلاف تحفظ حاصل کیا ہے اور عام عورت نیم برہنگی کی وجہ سے جس خوف اور سراسیمگی کی کیفیت میں مبتلا رہتی ہے' اس سے خاصی حد تک نجات پائی ہے۔ پھر میرا سر کو ڈھانپنا ایک قسم کا اعلان بھی ہے کہ میں مسلمان ہوں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں اللہ نے جو حکم دیا ہے'

میں اس کی پیروی کر رہی ہوں۔

سوال: آپ کے نزدیک اس کا سبب کیا ہے کہ امریکہ میں جو لوگ اپنا مذہب تبدیل کرتے ہیں' ان کی غالب اکثریت اسلام کی آغوش میں آتی ہے؟

جواب: میرا یقین ہے کہ جو بے شمار لوگ اسلام کی طرف لپکے چلے آرہے ہیں' انھیں اس امر کا احساس ہو گیا ہے کہ موجودہ مغربی طرز زندگی نہ تو اخلاقی قدروں کی پرورش کرتی ہے نہ یہ کسی باوقار اور صاف ستھرے اسلوب حیات کو پروان چڑھاتی ہے۔ جبکہ اس کے برعکس اسلام کی صورت میں وہ ایسی صداقت سے بہرہ ور ہوتے ہیں جو انہیں بلند ترین اخلاقی معیارات عطا کرتی ہے اور ان معیارات کو حاصل کرنے کا وہ مطمح نظر دیتی ہے جو حقیقت پسندی پر مبنی ہے' فطری ہے اور باوقار بھی۔ خاص اور اہم ترین بات یہ ہے کہ اسلام مغرب کی تنگ نظری سے بہت بلند و بالا ہے اور انسانوں کو مادیت اور نسل پرستی سے ہٹا کر خالص انسانی شرف کی بنا پر مخاطب کرتا ہے۔

سوال: امریکہ میں اسلام قبول کرنے والوں کی اکثریت سیاہ فاموں پر مشتمل ہے۔ آپ کے خیال میں یہ مبارک پیغام سفید فاموں تک رسائی حاصل کرنے میں کیوں کامیاب نہیں ہو سکا؟

جواب: اس معاملے میں میں کوئی ماہرانہ رائے تو نہیں دے سکتی تاہم میرا ایک نقطۂ نظر ہے اور وہ یہ کہ جو لوگ اسلام قبول کرتے ہیں وہ بالعموم موجودہ نظام کے ستم زدہ ہوتے ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امریکہ میں بے چارے سیاہ فام بڑے ہی مظلوم ہیں اور جب وہ دائرہ اسلام میں آتے ہیں تو انہیں حقارت اور ظلم و جور کی بجائے محبت' مساوات اور احترام ملتا ہے تو ان کی پریشان اور افسردہ روحوں کو قرار مل جاتا ہے۔

سیاہ فاموں کے اسلام کی طرف لپکنے کا ایک سبب اور بھی ہے۔ وہ جان گئے ہیں کہ افریقہ میں ان کے آباؤ اجداد کا مذہب اسلام تھا اور جب انہیں زبردستی اغوا کر کے امریکہ لایا گیا تو ان سے یہ نعمت چھین لی گئی چنانچہ اسلام قبول کر کے دراصل وہ اپنے اصل دین کی طرف لوٹتے ہیں۔

سوال: امریکہ کے اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ یہ واویلا کرتے نہیں تھکتے کہ

اسلام کا رویہ عورت کے معاملے میں غیر مناسب ہے۔ آپ ایک تعلیم یافتہ سفید فام خاتون ہیں' اس کے بارے میں آپ کا تاثر کیا ہے؟

جواب: اس سوال کا جواب اتنے تھوڑے وقت میں نہیں دیا جا سکتا۔ یہ موضوع تو ایک کتاب کا متقاضی ہے۔ مختصراً کہوں گی کہ یہ بات حقیقت کے برعکس ہے اور یہ الزام عموماً ان لوگوں کی طرف سے دہرایا جاتا ہے جو اسلامی تعلیمات سے یکسر بے خبر ہیں۔ وہ فرض کر لیتے ہیں کہ جب اسلامی معاشرت میں مرد اور عورت کا میدان کار الگ الگ ہے تو لازماً عورت ظلم کا شکار ہوتی ہے حالانکہ معاملہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔

اس کے برعکس...... میں اپنے ملک کی صورت حال پیش کرتی ہوں۔ یہاں برابری اور مساوات کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ معاشرے میں عورت وہ سب کچھ کرے جو مرد کرتا ہے۔ لیکن عملاً ہوتا یہ ہے کہ عورت مرد کی طرح کماتی بھی ہے اور گھر کا بھی سارا کام کرتی ہے جہاں مرد اس کے ساتھ شراکت نہیں کرتا۔ پھر ظاہر ہے مساوات کہاں رہی؟ اور جن گھرانوں میں ماں اور باپ دونوں کام کرتے ہیں وہاں بچوں کا جو حال ہوتا ہے وہ ظلم اور استحصال کی ایک افسوسناک مثال ہے۔ اس معاملے کا ایک اور پہلو بھی ہے' یورپ کے ذرائع ابلاغ اور اخبارات عام طور پر عالم اسلام کی حکومتوں کے طرز عمل اور مختلف افراد کے ذاتی رویے سے سمجھ لیتے ہیں کہ یہی کچھ اسلام کی تعلیم ہے' حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ان دونوں میں فرق کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم اسلامی تعلیمات پر ان کی صحیح روح کے ساتھ عمل کریں اور غیر مسلموں کے سامنے اسلام کے سچے ترجمان بنیں۔

سوال: امریکہ میں جو غیر مسلم خواتین اسلام قبول کرنا چاہتی ہیں' ان کے نام آپ کا پیغام کیا ہے؟

جواب: ان بہنوں کے لئے میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ اسلام کے بارے میں زیادہ سے زیادہ کتابوں کا مطالعہ کریں اور خوب توجہ سے غور و فکر کریں۔ میں اسی راستے سے اسلام کی منزل مقصود پر پہنچی ہوں۔ دوسری بات یہ کہ خوف زدہ ہرگز نہ ہوں اگر آپ نے صراط مستقیم تک پہنچنے کا ارادہ کر لیا تو خدا اپنے فضل سے آپ کی مدد فرمائے گا۔

سوال: آپ میری لائق شاگرد ہیں' مَیں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ مستقبل میں آپ اپنی صلاحیتوں کو خدمتِ دین کے لئے کس طرح کام میں لائیں گی؟

جواب: میرا ارادہ ہے کہ مَیں کسی اسلامک اسکول میں ٹیچر بن جاؤں' اپنے شاگردوں تک اسلام کی سچی تعلیم منتقل کروں اور دوسرے لوگوں تک بھی اسلام کا سچا پیغام پہنچاؤں۔ مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ مَیں اپنے اس ارادے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔

●......●......●

پروفیسر رجا گارودی

(فرانس)

نامور سیاست دان' مفکر' مصنف اور دانشور راجر گارودی ۱۹۱۳ء میں مارسیلز (فرانس) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۹ء میں جنگ عظیم کے آغاز پر وہ فرانسیسی فوج میں بھرتی ہو گئے اور فرانس کی شکست پر وہ بھی گرفتار ہوئے اور تین سال تک ایک جنگی قیدی کی حیثیت سے الجزائر کے ایک کیمپ میں مقید رہے۔ جنگ کے خاتمے پر وہ رہا ہوئے اور ۱۹۴۵ء کے انتخابات میں فرانسیسی پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوئے اور ۱۹۸۵ء تک مسلسل اس منصب پر منتخب ہوتے رہے۔ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۲ء تک وہ سینٹ کے رکن بھی رہے۔ تقریباً بارہ سال تک فرانسیسی کیمونسٹ پارٹی کے چیئر مین رہے اور اس دوران میں انہوں نے Problems of Maxim, The theory of Materialism اور Leninn,s Studies کے عنوان سے تین کتابیں تصنیف کیں۔ وہ پارٹی کے نظریاتی جریدے کے ڈائریکٹر بھی تھے اور انہوں نے مارکسزم کی تعلیم و تحقیق کی خاطر ایک انسٹیٹیوٹ بھی قائم کیا تھا۔ مگر طویل مطالعے اور گہرے غور و خوض کے نتیجے میں وہ بتدریج اسلام کے قریب آتے چلے گئے حتیٰ کہ ۱۹۸۲ء میں انہوں نے باقاعدہ مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا اور رجا گارودی کا نام اختیار کیا۔ قبولِ اسلام کے بعد موصوف محترم نے مغربی تہذیب و ثقافت کی مذمت اور اسلام کے اثبات میں متعدد کتابیں لکھیں جن میں ISLAM THE RELIGION OF FUTURE اور ISLAM PLANS FOR THE FUTURE خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ وہ صیہونیت کو دنیا کے لئے ناسور سمجھتے ہیں جس کا اظہار انہوں نے THE CASE OF ISRAEL میں کیا ہے۔ یہ کتاب منظرِ عام

پر آئی تو یورپ بھر میں تہلکہ مچ گیا اور یہودیوں اور یہود نواز حلقوں نے بڑا واویلا کیا اور نوبت مقدمہ بازی تک جا پہنچی۔ آج کل وہ PALESTINE, THE LAND OF THE PROPHETS پر کام کر رہے ہیں۔ رجا گارودی نے سعودی عرب' عرب امارات اور ایران کے علاوہ مسلم تنظیموں کی دعوت پر ہندوستان کا دورہ بھی کیا ہے اور مختلف یونیورسٹیوں میں انہوں نے متعدد لیکچر بھی دیئے ہیں۔

مختلف جراید و رسائل کو انٹرویو دیتے ہوئے رجا گارودی نے اپنے قبول اسلام کی سرگزشت یوں بیان کی ہے:۔

میں سب سے پہلے اس امر کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ میں عقل و شعور کی وادی میں قدم رکھتے ہی کیمونسٹ ہو گیا تھا اور اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ میرے والدین کٹر دہریے تھے اور ہر قسم کے مذہب کو فریب سے تعبیر کرتے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب اس صدی کی تیسری دہائی تک پہنچتے پہنچتے امریکہ سے اٹھنے والا الحاد و دہریت اور فکری انارکی کا زبردست طوفان پورے یورپ میں پھیل گیا تھا اور خصوصاً فرانس کو اس نے غیر معمولی طور پر متاثر کیا تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں فرانس کے تمام ادیب' شاعر' صحافی' اساتذہ' نوبل انعام یافتہ شخصیات اور مصور و فن کار کیمونزم کے اسیر ہو گئے تھے اور میری سرگرمیوں اور جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ میں بیس برس کی عمر ہی میں (یعنی ۱۹۳۳ء میں) فرانسیسی کیمونسٹ پارٹی کی مرکزی کونسل کا رکن بن گیا تھا۔

جیسا کہ ابھی بیان کر چکا ہوں یہ دور یورپ میں فکری انارکی اور عملی انتشار کے عروج کا دور تھا۔ ہٹلر اسی زمانے میں نمودار ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے جرمن قوم کا ہیرو بن گیا۔ ذاتی طور پر میرا یہ عالم تھا کہ ان گنت لوگوں کی طرح ساری آسائشوں اور عیش و مسرت کے ذرائع رکھنے کے باوجود ذہنی آسودگی اور روحانی سکون سے محروم تھا اور یوں لگتا تھا جیسے زندگی کسی خلا میں گزر رہی ہے۔ جب بھی تنہا ہوتا تو غور کرتا کہ ساری مادی سہولتوں کے باوجود آخر میں مضطرب و غمگین کیوں ہوں اور یورپ کا معاشرہ ہر طرح کی نعمتوں کے باوجود سکون و اطمینان سے کیوں محروم ہے؟ چنانچہ ہفتوں اور مہینوں کے غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ کائنات خود بخود نہیں بنی اور خدا کا سہارا روح کی

بنیادی ضرورت ہے۔ چنانچہ میں عیسائیت پر ایمان لے آیا اور "کیتھولک مسیحی نوجوانوں کی تنظیم" کا چیئرمین بن گیا۔ کیمونسٹ پارٹی سے بھی میرا تعلق بدستور قائم رہا اور کسی کیمونسٹ نے مسیحی تنظیم سے میرے تعلق کو ہدف تنقید نہ بنایا۔ شاید اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ کیمونزم اصل میں عیسائیت کی وہ اصطلاح ہے جو اقتصادی مسائل کے حل کے لئے وضع کی گئی ہے۔

دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو ۱۹۳۹ء میں میں ملکی سالمیت کی خاطر فوج میں بھرتی ہو گیا اور ۱۹۴۰ء میں فرانس کو جرمنی کے مقابلے میں شکست ہوئی تو مجھے بھی گرفتار کر لیا گیا اور ہموطنوں کے ساتھ الجزائر کے ایک جنگی کیمپ میں منتقل کر دیا گیا۔ یہاں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جس نے مجھے مسلمانوں اور اسلام سے سب سے پہلے متعارف کرایا اور آخرکار میری نظریاتی اور عملی زندگی کے لئے سنگ میل بن گیا۔ ہوا یوں کہ کیمپ کمانڈر نے ایک روز برہم ہو کر مجھے گولی مارنے کا حکم دے دیا اور اس مقصد کی خاطر دو فوجیوں کے حوالے کر دیا۔ یہ دونوں فوجی مسلمان تھے۔ انہوں نے مجھے گولی مارنے سے انکار کر دیا اور جان بخشی کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ سب کچھ میرے سامنے ہوا۔ میں عربی زبان سے نابلد تھا اس لئے میری سمجھ میں کچھ نہ آیا تاہم زندہ بچ جانے کی خوشی سے زیادہ تجسس یہ تھا کہ وہ کونسے اسباب ہیں جنہوں نے اجنبی فوجیوں کے دلوں میں میرے لئے ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبات پیدا کر دیئے۔

اس مقصد کی خاطر میں نے ایک ایسے الجزائری مسلمان کی مدد حاصل کی جو عربی کے ساتھ ساتھ فرانسیسی زبان سے واقف تھا۔ اس نے بتایا کہ مسلمان فوجیوں نے یہ کہہ کر مجھ پر گولی چلانے سے انکار کر دیا تھا کہ "اسلام نہتے انسان پر ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں دیتا"۔

اس واقعہ نے میرے ذہن کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہ الفاظ میرے ذہن میں گونجتے رہتے اور میں سوچتا رہتا کہ وہ کیسا مذہب ہے جس نے اپنے پیروکاروں کو اس قدر اعلیٰ اخلاقی قدروں کا پابند بنا دیا ہے۔ چنانچہ جنگ ختم ہونے پر جب میں رہا ہوا تو اولین فرصت میں میں نے اسلامی تعلیمات سے واقفیت حاصل کرنے کا پروگرام بنایا اور سوربورن یونیورسٹی

۱؎ یہ مضمون متعدد تحریروں کی مدد سے مرتب کیا گیا ہے۔

میں دس سال تک ''اسلامی اخلاقیات'' کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔

اسی دوران مجھے دوبارہ الجزائر جانے کا موقع ملا اور میری ملاقات الجزائری علما کی تنظیم کے صدر شیخ بشیر الابراہیمی سے ہوئی اور ان کی شخصیت میں مجھے اسلام عملی شکل میں نظر آیا اور ان کی وساطت سے میں الجزائر کے قومی ہیرو جناب عبدالقادر الجزائری کے حالات سے آگاہ ہوا اور ان کے شاندار مجاہدانہ کردار نے میرے دل و دماغ کو مسخر کر لیا۔ میں الجزائر پر فرانس کے استعماری قبضے کے سخت خلاف تھا اور اخبارات میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا رہتا تھا۔

۱۹۴۵ء میں میں فرانسیسی پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہو گیا تھا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر میں نے جز وقتی طور پر تدریس کا پیشہ اختیار کر لیا۔ اس زمانے میں مجھے کمیونزم' عیسائیت اور اسلام کا تقابلی مطالعہ کرنے کا بھرپور موقع میسر آیا اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ بحیثیت ضابطۂ حیات عیسائیت میں کوئی دم خم نہیں اور یہ اپنے پیروکاروں میں کسی نوعیت کا اخلاقی انقلاب پیدا کرنے سے عاجز ہے۔ کلاس روم میں سرمایہ داری نظام پر بھی خوب بحثیں ہوتیں اور میں اور میرے شاگرد یہی نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہوتے کہ عالم انسانی کے سارے بحرانوں' معاشرتی اور اخلاقی انتشار' اقتصادی ناہمواری اور روحانی خلا کا باعث سرمایہ داری نظام اور مغربی تہذیب ہے۔ چنانچہ اسی دور میں ایک مرتبہ یونیسکو کے زیر اہتمام ثقافت کے حوالے سے ایک عالمی مذاکرہ ہوا۔ مجھے بھی اس میں مدعو کیا گیا اور میں نے برملا کہا کہ مغربی تہذیب و ثقافت نے انسان کو نہ صرف انسانیت سے دُور کیا ہے بلکہ روح جیسی مقدس چیز کا بھی مذاق اڑایا ہے۔

جہاں تک مارکسزم کا تعلق ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس نے معاشرے میں پائی جانے والی طبقاتی اونچ نیچ کے خلاف قابلِ قدر عملی اور تحقیقی خدماتِ انجام دیں' مگر بدقسمتی سے اس نظام کی ساری تگ و تاز کا مرکز و محور طبقاتی کشمکش کے سوا کچھ نہیں اور انسان کی روحانی اور اخلاقی ضرورتوں کو اس میں کلیۃً نظر انداز کیا گیا ہے چنانچہ انسانیت کے ساتھ مجموعی طور پر جو سلوک روس میں روا رکھا گیا اور روس نے نئی استعماری طاقت کی حیثیت سے جو طرزِ عمل مشرقی یورپ کے ساتھ اختیار کیا وہ اتنا بہیمانہ تھا کہ جب روس نے چیکو

سلواکیہ پر فوج کشی کی تو میرے صبر کا بند ٹوٹ گیا اور میں نے برملا احتجاج کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے ۱۹۷۲ء میں کمیونسٹ پارٹی سے نکال دیا گیا جس کا مجھے فی الحقیقت بہت صدمہ ہوا۔

میں اہلِ یورپ کے اس ظالمانہ رویے پر بھی بہت پریشان ہوا جو انہوں نے فلسطین کے بارے میں اختیار کیا۔ اسکولوں کے نصاب میں بائبل کی یہ تحریف شامل کر دی گئی کہ حضرت ابراہیمؑ نے ارضِ فلسطین کو یہودیوں کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ میں نے اس رویئے کے خلاف فرانس کے مشہور اخبار "لی مونڈ" میں مضامین لکھے جس کے نتیجے میں مجھے اور اخبار کے ناشر کو خوب ہدفِ تنقید بنایا گیا حالانکہ یہ حقیقت یورپ کے کسی اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں رہی کہ صیہونیت کسی مذہبی فرقہ کا نام نہیں بلکہ یہ دراصل ایک دہشت پسند، انسان دشمن اور مکروہ عزائم رکھنے والی تنظیم ہے جس کی بنیاد اٹھارویں صدی میں ایک ملحد و خبیث طالع آزما تھیوڈور ہرٹزل نے رکھی اور انسانیت کو ناقابلِ تلافی المیوں کے سپرد کر دیا۔ افسوس اس نے انجیلِ مقدس میں جو تحریف کی، یورپ کے مسیحی حلقوں نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

مسلسل مطالعے، غور و فکر اور مغربی تہذیب، کمیونزم اور صیہونیت اور اسلام کے تقابلی تجزیے کے بعد میں بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ اسلام ہی وہ دینِ واحد ہے جو عقلی اور وجدانی دونوں اعتبار سے خدا کی وحدانیت کا ثبوت مہیا کرتا ہے۔ یہ وہ مکمل اور جامع ضابطۂ حیات ہے جس کی جستجو میں عیسائیت اور کمیونزم میں کرتا رہا مگر ناکام رہا۔ بالفاظ دیگر میں ایسے عقیدے کی تلاش میں تھا جو نجی اور اجتماعی زندگی کے جملہ تقاضوں پر محیط ہو، مذہب اور سماج کو ساتھ لے کر چلتا ہو اور بندے اور خدا کے تعلق کو مضبوط بناتا ہو اور یہ خصوصیات مجھے صرف اسلام میں نظر آئیں۔ مثال کے طور پر قرآن میں باون مقامات پر غربا اور ان کے مسائل کا ذکر آیا ہے اور اسلامی تعلیمات میں یہ بات بڑی واضح ہے کہ وہی شخص خدا کا قرب حاصل کر سکتا ہے جس کے تعلقات و معاملات اپنے ہم جنسوں سے بہتر اور عدل و توازن پر مبنی ہوں۔ اس کے برعکس بلاشبہ عیسائیت کسی حد تک انسان کے اندرون کی اصلاح کرتی ہے مگر عملی زندگی میں یہ ایک قدم بھی ساتھ نہیں چلتی۔ یہاں خدا اور بندے کو دو الگ الگ خانوں میں بانٹ دیا گیا ہے اور یہ المیہ حضرت مسیحؑ کے دنیا سے اٹھ جانے کے

جلد بعد ہی ظہور پذیر ہو گیا تھا۔ رومن دور میں حکمران طبقہ کی خوشنودی کے لئے مسیحی علما نے فتویٰ دے دیا کہ جو شخص کاروبارِ حکومت سے دور رہتا ہے اور اسلحہ سے بے تعلق ہو جاتا ہے وہ خدا کا زیادہ مقرب ہے۔ چنانچہ انسانوں کی ذاتی زندگی اور سیاسی کردار میں بُعد پیدا ہوتا چلا گیا۔ چرچ نے مقتدر طبقے سے مسلسل مصالحت کا رویہ اختیار کیے رکھا حتیٰ کہ یہ عملی زندگی سے دُور ہٹتا چلا گیا۔

اس کے برخلاف اسلام ایک متحرک، انقلابی اور زندہ مذہب ہے۔ یہ مختلف مسائل کا عقلی اور قابلِ عمل حل پیش کرتا ہے اور ہر دور کے انسان کو زندگی کے ہر شعبۂ حیات میں رہنما اصول دیتا ہے۔ قرآن کو بغور پڑھ کر دیکھیے۔ یہ بہترین سوشل جسٹس کا علمبردار ہے اور اقتصادی، سیاسی، ثقافتی، تمدنی اور اخلاقی شعبوں میں ہر مرد و زن کی رہنمائی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ قرآن کا اصل موضوع انسان ہے چنانچہ اس کے مطالعے سے صاف نظر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو انسان سے بے حد محبت ہے اور انسان کو دنیاوی اور رُوحانی طور پر روبہ ترقی اور خوشحال و مطمئن دیکھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر صاحبانِ اقتدار قرآنی احکام کو عملاً نافذ کر دیں تو کسی شعبے میں کوئی الجھن نہ رہے اور انسانوں کے سب دکھ دلدر دُور ہو جائیں۔ سارے مسائل کا واحد سبب یہ ہے کہ خدائی احکامات کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے اور انسان انسان کا آقا و مولیٰ بن گیا ہے۔ ورنہ خدا تو اپنے بندوں کو دکھی اور مصیبت زدہ نہیں دیکھنا چاہتا۔

یہ تھیں وہ نظریاتی اور عملی خوبیاں جنہوں نے میرے دل و دماغ کو مسخر کر لیا اور مَیں حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا۔ اس طرح گویا مَیں نے اپنی کھوئی ہوئی منزل پالی اور ایک بامقصد زندگی کا باقاعدہ آغاز کیا۔

●……●……●

محترمہ ڈاکٹر خدیجہ

(آسٹریلیا)

محترمہ خدیجہ نے جولائی ۱۹۸۰ء میں منصورہ لاہور میں میاں طفیل محمد سابق قائد تحریک اسلامی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ دو ماہ کے بعد وہ واپس آسٹریلیا چلی گئیں اور اگست ۱۹۸۱ء میں دوبارہ پاکستان آئیں اور یہیں ۲۰ر ستمبر کو وفات پا گئیں۔ راقم الحروف نے ان سے قبول اسلام کے چند ہی روز بعد منصورہ میں ذیل کا انٹرویو ریکارڈ کیا تھا' وہ مکمل باپردہ اسلامی لباس میں ملبوس تھیں۔

سوال: براہ کرم سب سے پہلے اپنا تفصیلی تعارف کرا دیجیے۔

جواب: اسلام قبول کرنے سے پہلے میرا نام مس مارلینا گارسیا تھا۔ میرا آبائی وطن برازیل تھا مگر میرے والد ڈاکٹر آرتھر ایڈورڈ گارسیا جو ایک ماہر معالج تھے' برطانوی فوج کی میڈیکل کور میں اعلیٰ افسر تھے اور برما میں تعینات تھے۔ وہیں ۱۹۲۹ء میں مَیں پیدا ہوئی۔ میٹرک تک تعلیم رنگون میں حاصل کی۔ پھر والد صاحب نے ملازمت سے ریٹائر منٹ لے لی اور کیلیفورنیا میں رہائش اختیار کر لی۔ وہاں انہوں نے پرائیویٹ پریکٹس شروع کر دی جو بڑی کامیابی سے چلنے لگی مگر افسوس کہ جلد ہی انہیں موت کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ اس وقت میری عمر اٹھارہ انیس برس کی تھی۔ والدہ اس صدمے سے جانبر نہ ہو سکیں اور دو تین سال کے اندر اندر وہ بھی وفات پا گئیں۔

مَیں دنیا میں یک و تنہا رہ گئی۔ مَیں اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ بہن بھائی کوئی

نہ تھا۔ تاہم میں نے ہمت نہ ہاری۔ میں ہمیشہ سے ایک اچھی سٹوڈنٹ تھی۔ والد مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے چنانچہ میں نے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور یونیورسٹی آف میڈیسن کیلیفورنیا سے گریجوایشن کر لی۔ لکھنے پڑھنے کا شوق بھی تھا، اس لئے مختلف اخبارات میں وقائع نگاری اور مضمون نویسی کا سلسلہ بھی شروع کر دیا اور پرائیویٹ پریکٹس کے ساتھ ساتھ شراب، تمباکو نوشی اور دیگر منشیات کے خلاف لیکچر بھی دینے لگی۔ ان لیکچروں کے سلسلے میں مجھے امریکہ اور یورپ کے بہت سے ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے دنیا بھر کی سیاحت کی۔ حتیٰ کہ بالآخر میں نے آسٹریلیا کے شہر سڈنی میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ وہیں کلینک بنا لیا اور فری لانسر صحافی کا مشغلہ بھی جاری رہا۔ اس سے مجھے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے۔

سوال: اسلام سے آپ کب اور کیسے متعارف ہوئیں؟

جواب: میرا آبائی مذہب عیسائیت ہے۔ میں کیتھولک فرقے سے تعلق رکھتی تھی، مگر سچی بات ہے کہ اس مذہب نے مجھے کبھی متاثر نہ کیا۔ ذہن میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے تھے اور میں پادریوں اور دیگر متعلقہ لوگوں سے بحث بھی کرتی تھی مگر کہیں سے کوئی تسلی بخش جواب نہ ملتا تھا۔ مثال کے طور پر تثلیث کا عقیدہ اتنا مہمل اور مضحکہ خیز ہے کہ کوئی باہوش انسان اسے قبول نہیں کر سکتا۔

اس کے ساتھ یہ بھی بتاتی چلوں کہ میرے ضمیر نے مجھے شراب نوشی اور عیش پرستی سے دور رکھا ہے۔ میں نے کبھی گوشت نہیں کھایا، کافی تک نہیں پی۔ سبزیوں اور پھلوں کے جوس پر گزارہ کرتی رہی ہوں۔ میرا وجدان کہتا تھا کہ معاشرت کا جو انداز یورپ نے اختیار کر رکھا ہے، یہ خلاف فطرت ہے۔

چنانچہ تلاش حق کی خاطر میں نے دیگر مذاہب کا مطالعہ شروع کیا مثلاً جوڈازم، کنفیوشزم اور ہندومت، مگر کسی سے بھی میری تسکین نہ ہوئی۔ اس ضمن میں میں نے اسلام کے بارے میں بھی کچھ کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس کے اچھے اصولوں سے میں متاثر تو ہوئی مگر تصویر واضح نہ ہوئی۔ شاید اس لئے کہ ان کتابوں کے مصنف یورپ کے متعصب عیسائی تھے۔ چنانچہ میں اپنے دل میں اسلام کے بارے میں نرم گوشہ رکھنے کے باوجود اس سے

دُور رہی۔ اسی حالت میں ایک عرصہ گزر گیا۔

یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں نے محترمہ مریم جمیلہ کی کتب کا مطالعہ کیا اور پھر جب ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ صحافیوں کے ایک وفد کے ساتھ میں پاکستان آئی اور مریم جمیلہ سے ملی تو میں ان کی سادگی اور باوقار شخصیت سے بہت متاثر ہوئی۔ انہوں نے ایک ایسے شخص سے شادی کی جو پہلے ہی شادی شدہ تھا اور اس کے بچے بھی تھے۔ وہ اپنی ضعیف العمر ساس کی خوب خدمت کرتیں اور خاموشی اور وقار سے خدمتِ دین میں مصروف رہتی ہیں۔ مریم جمیلہ نے مجھے مولانا مودودی سے بھی متعارف کرایا اور ان کی ایک کتاب "ٹوورڈز انڈرسٹینڈنگ اسلام" پڑھنے کو دی۔ اس کتاب سے مجھے اسلام کا بھرپور تعارف حاصل ہوا۔ میں نے اندازہ کر لیا کہ اسلام ایک وسیع اور فطری مذہب ہے۔ توحید کائنات کی سب سے بڑی سچائی ہے اور نظر آنے والی ہر چیز خدا کی وحدانیت پر شاہدِ عادل ہے۔ آسٹریلیا واپس جا کر میں اپنے آپ کو قبولِ اسلام کے لئے تیار کرنے لگی مگر بدقسمتی سے ایک روز ایک حادثہ رونما ہوا۔ میں گر پڑی اور ٹخنے کے قریب سے میری ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ میں ایک عرصے تک ہسپتال کے بستر پر پڑی رہی۔ اس عالم میں صرف خدا کی یاد اور دعا ہی ایک سہارا تھا جس نے مجھے دوبارہ صحت یاب کیا۔ میں دوسری مرتبہ پاکستان آئی۔ مریم جمیلہ سے ملی' قبولِ اسلام کی خواہش ظاہر کی اور انہی کے مشورے پر منصورہ آکر میاں طفیل محمد صاحب کی وساطت سے اس مقدس اور عظیم نعمت سے سرفراز ہوئی۔ اس سعادت پر میں اللہ کا جس قدر بھی شکر ادا کروں کم ہے۔

سوال: آپ کے اس فیصلے کا آپ کے خاندان اور سوسائٹی پر کیا ردِعمل ہوگا؟

جواب: جیسا کہ میں بتا چکی ہوں میرا کوئی خاندان نہیں۔ میں نے شادی نہیں کی اور اس کا سبب یہ تھا کہ یورپ کے معاشروں میں مرد عورت سے خلوص کا رشتہ ہرگز نہیں رکھتے۔ وہ عورت کو کھلونا اور تفریح اور عیش پرستی کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور مجھے ان کی ان حرکتوں سے ہمیشہ بیزاری رہی ہے۔ مجھے کوئی مخلص اور انسانی قدروں کا حامل مرد نظر ہی نہیں آیا' اس لئے میں شادی نہیں کر سکی۔

بہرحال جہاں تک عام ملنے والوں اور سوسائٹی کا تعلق ہے تو میں جانتی ہوں کہ

انکارِ دِعمل خوشگوار نہیں ہوگا۔ وہ ناک بھوں چڑھائیں گے' مضحکہ اڑائیں گے مگر مجھے اس کی پروا نہیں۔ یوں بھی اب میں آسٹریلیا نہیں رہنا چاہتی۔ واپس جا کر فلیٹ بیچوں گی۔ مصروفیات کو سمیٹوں گی اور پاکستان یا سعودیہ چلی جاؤں گی۔ میری خواہش ہے کہ میری باقی ماندہ زندگی مدینہ میں گزرے یا لاہور میں۔ مَیں مکہ معظمہ جا کر حج کرنے کا بھی فوری ارادہ رکھتی ہوں۔ یوں بھی شاید آپ جانتے ہوں کہ آسٹریلیا کی معاشرتی زندگی میں عام یورپ کی طرح سکون اور چین نام کی کوئی چیز نہیں ملتی۔ چوری' قذاقی اور جرائم کی بھرمار ہے۔ بچے' بوڑھے' عورتیں منشیات کی عادی ہیں۔ جنسی بے راہ روی آخری حدوں کو پھاند چکی ہے اور معمولی بات پر مکان جلا دیئے جاتے ہیں۔ چنانچہ کچھ بعید نہیں کہ مَیں واپس جاؤں تو اپنا فلیٹ جلا ہوا دیکھوں۔ سڈنی میں تھوڑی دیر کے بعد فائر بریگیڈ کی موٹریں شور مچاتی' بھاگتی دکھائی دیتی ہیں اور یہ وہاں کی زندگی کا المناک معمول بن گیا ہے۔

سوال: آپ کے خیال میں تبلیغ اسلام کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

جواب: صرف ایک اور وہ یہ کہ مسلمان اپنے کردار اور عملی زندگی کو اسلام کے سانچے میں ڈھال لیں۔ یورپ کا انسان اندھیروں میں بھٹک رہا ہے۔ اس کے مذہب میں اتنی سکت نہیں کہ اس کی رہنمائی کر سکے۔ اس کی تہذیب نے پوری زندگی کو جہنم میں بدل دیا ہے۔ اس کی روح پیاسی ہے اور یہ پیاس اسلام اور صرف اسلام ہی بجھا سکتا ہے۔ مگر افسوس کہ عام مسلمان اسلامی زندگی سے دُور ہو گئے ہیں۔ چنانچہ جب یورپ کا تعلیم یافتہ انسان اسلام کے بارے میں پڑھتا ہے تو وہ اس کی حقانیت کا قائل ہو جاتا ہے مگر جب عالمِ اسلام کی ناگفتہ بہ صورتِ حال کو دیکھتا ہے تو وہ پریشان اور مایوس ہو کر اسلام سے دُور رہتا ہے۔ اس کی تلافی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ مسلمان اسلام کو صحیح معنوں میں عملی طور پر اختیار کریں۔ تب پورا یورپ' امریکہ و آسٹریلیا اور جاپان سمیت اسلام کی آغوش میں آ رہے گا۔

سوال: کوئی ایسی اسلامی شخصیت جس نے آپ کو بہت متاثر کیا ہو؟

جواب: جی ہاں مَیں محترمہ مریم جمیلہ سے بے حد متاثر ہوئی ہوں۔ انھوں نے اپنی قدیم خاندانی ملکی روایات کو ترک کر کے اسلامی انداز اپنا لیا ہے۔ وہ بہت ہی سادہ

خاموش زندگی بسر کرتی ہیں۔ خاوند اور ان کی ۹۰ سالہ بوڑھی والدہ کی خدمت کرتی ہیں۔ بچوں کی شفقت و محبت سے پرورش کرتی ہیں اور ملنے والوں سے بہت ہی تپاک سے پیش آتی ہیں اور سب سے بڑھ کر انہوں نے ایسی گرانقدر کتابیں لکھی ہیں جنہوں نے ایک طرف مغربی تہذیب کا ملمع اتار پھینکا ہے اور دوسری جانب اسلام کی حقانیت واضح اور روشن کردی ہے۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوئی ہوں کہ محترمہ مریم جمیلہ ٹی وی نہیں دیکھتیں، میک اپ اور آرائش کے سامان کی پروا نہیں کرتیں تعیشات سے بے نیاز ہیں۔ میں نے اس خاتون کو عظمت کی انتہائی بلندیوں پر دیکھا ہے اور انہی کی کتابوں اور شخصیت سے متاثر ہو کر اسلام کے حلقے میں آئی ہوں۔ میں اس عظیم عورت کی شکرگزار ہوں اور اسے سلام کرتی ہوں۔

سوال: مولانا مودودی کے بارے میں آپ کے تاثرات کیا ہیں؟

جواب: میرے دل میں مولانا کا بے حد احترام ہے۔ میں نے قبول اسلام سے پہلے ان کی کتابیں بھی پڑھی تھیں اور اسلام کی ایک صحیح تصویر انہی کی تحریروں سے واضح ہوئی تھی۔ میری مخلصانہ رائے ہے کہ مولانا نے اسلام کی غیر معمولی خدمت انجام دی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دنیا بھر میں ان کے احترام میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات میں اضافہ کرے اور ان کے مشن کو کامیابی عطا کرے۔

سوال: کوئی پیغام جو آپ پاکستانی مسلمانوں کو دینا چاہتی ہیں؟ خصوصاً خواتین کو۔

جواب: میں اپنی مسلمان خواتین بہنوں تک یہ پیغام پہنچانا چاہتی ہوں کہ وہ اسلام کے نظام عدل کو اختیار کریں اور جو طریق زندگی پیغمبر اسلام نے ان کے لئے وضع کیا ہے وہی اختیار کریں۔ میں نے شلوار قمیص، چادر اور برقعے سے بڑھ کر اچھا لباس خواتین کے لئے کوئی نہیں دیکھا۔ اسی سے خواتین کی عزت ہے اور یہی چیز معاشرے کو مختلف قباحتوں سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ میں ان تک یہ بات پہنچانا چاہتی ہوں کہ یورپ میں عورتوں کا لباس انتہائی لچر اور توہین آمیز ہوتا ہے۔ خدا کے لئے ان کی نقالی سے بچیں اور پردے کا وہ انداز اختیار کریں جس کی تلقین اسلام نے کی ہے''۔

وضاحت: محترمہ ڈاکٹر خدیجہ کے بارے میں یہ امر خاصا ایمان افروز ہے کہ اس پر فالج کا حملہ ہوا تو اسے نیم بیہوشی کی حالت میں ''یو سی ایچ'' میں داخل کرایا گیا۔ تین چار روز کے بعد اسے ہوش آیا اور پتہ چلا کہ وہ یونائٹڈ کرسچین ہسپتال کے بستر پر پڑی ہے تو سخت پریشان اور برہم ہوئی۔ بار بار کہتی تھی کہ مر جاؤں گی مگر کسی عیسائی کے ہاتھ سے دوا نہیں کھاؤں گی۔ وہ کرب سے کہتی تھی ''کیا میں نے عیسائیت ترک کر کے اس لئے اسلام قبول کیا ہے کہ مجھے عیسائیوں کے ہسپتال میں موت آئے۔ اس نے بے حد اصرار کیا کہ مجھے جلد از جلد اس ہسپتال سے نکالا جائے۔ چنانچہ اسے سروسز ہسپتال میں منتقل کیا گیا جہاں وہ ۲۹ ستمبر ۱۹۸۱ء کو خالق حقیقی سے جاملی۔ اسی شام منصورہ میں میاں طفیل محمد ہی نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی اور عقیدت و احترام سے قریبی قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ یوں اس کی یہ خواہش عجیب و غریب طریقے سے پوری ہوگئی کہ وہ آسٹریلیا چھوڑ کر مستقلاً پاکستان میں مقیم ہونا چاہتی ہے۔

●......●......●
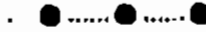
عبدالمجید ابراہیم

(جمیکا)

عبدالمجید ابراہیم کا تعلق جزیرہ جمیکا سے ہے جو وسطی امریکہ کے قریب بحر اوقیانوس میں واقع ہے۔ موصوف کا آبائی نام جارج رچرڈ تھا۔ قبولِ اسلام کے بعد انہوں نے ذیل کا انٹرویو لندن کے انگریزی جریدہ "دی مسلم" کو دیا تھا جو اپریل ۱۹۶۹ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

سوال: اسلام کے بارے میں آپ کی دلچسپی کا آغاز کیسے ہوا؟

جواب۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میری زندگی اوائل عمری ہی سے تلاش و جستجو کا نمونہ بنی رہی ہے۔ شاید میں اسے لفظوں میں بیان نہ کر سکوں کہ میرا ذہن ہمیشہ ہی سے مستقلاً ایک سوالیہ نشان بنا رہا ہے اور یہی بات بالآخر مجھے اسلام کے قریب لے آئی۔

ہوش سنبھالنے پر مجھے کیتھولک فرقے میں بپتسمہ دیا گیا۔ یہ امر بظاہر بڑا حیران کن تھا کہ میرے والدین اس عقیدے سے تعلق نہ رکھتے تھے، نہ بعد میں میرے چھوٹے بھائی اور بہن نے یہ مسلک اختیار کیا۔ میری والدہ عیسائیوں کے اس فرقے سے تعلق رکھتی تھیں جو یوم سبت کو خصوصی تقدس کا درجہ دیتا ہے۔ یہ لوگ ہفتے کے دن سوائے عبادت اور بائبل کی تلاوت کے کوئی کام نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ کھانا جمعے کی شام کو پکا لیتے ہیں۔ اس فرقے سے وابستہ لوگ سؤر کا گوشت کھاتے ہیں نہ شراب پیتے ہیں۔

میرے والد غیر مذہبی آدمی تھے بلکہ کسی بھی مذہب کے قائل نہ تھے۔ اس طرح ہمارے شہر کنگسٹن میں مختلف قسم کے مذاہب نظر آتے تھے مگر حیرت ہے کہ وہاں اسلام کا

کہیں وجود نہ تھا۔ جمیکا کے عام لوگ اسلام کے بارے میں بس اتنا جانتے تھے کہ یہ ہندوستانی قسم کا ایک مذہب ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ صرف ہندوستان سے آئے ہوئے کچھ لوگ ہی ایک غیر ملکی زبان میں عجیب قسم کی حرکتیں کرتے ہوئے نظر آتے تھے جن کے بارے میں بعد میں پتہ چلا کہ ان میں ہندوؤں کی کئی رسومات کی بھی ملاوٹ ہوگئی ہے۔ اس وقت جمیکا میں کوئی مسجد نہ تھی اور شاید اب تک مسجد کے وجود سے یہ جزیرہ محروم ہے۔

ہوش سنبھالنے پر مجھے ایک کیتھولک بوائز اسکول میں داخل کرایا گیا۔ وہاں کی زندگی کا ایک عام پہلو جو میرے حافظے کی لوح سے چپکا رہتا ہے اور جس نے میری زندگی کو ایک نئے رخ پر ڈالنے میں اہم کردار ادا کیا وہ "اعتراف گناہ" (CONFESSION) کی ہفتہ وار محفل تھی۔ سب لڑکوں کو قطاروں میں کھڑا کر دیا جاتا اور باقاعدہ فوجیوں کی طرح مارچ کرتے ہوئے ہم لوگ چرچ کی طرف روانہ ہو جاتے جو اسکول سے تقریباً دو میل دور تھا۔ چرچ کے اندر ہم باری باری ایک ایک کرکے اعتراف والے کمرے (CONFESSIONAL CHAMBER) میں داخل ہوتے۔ یہ مربع شکل کا ایک کمرہ تھا جس کے درمیان میں پردہ تھا۔ پردے کے دوسری جانب پادری صاحب بیٹھتے تھے اور اس طرح لکڑی کے ایک تخت پر طالب علم دو زانو ہو کر پردے کے سامنے بیٹھ جاتا اور اپنے ہفتے بھر کے گناہوں کا اعتراف کرنے لگتا۔ پھر وہ نادیدہ پادری طالب علم کی طرف سے مختصر سی دعا کرتا اور کفارے کے طور پر بائبل کی چند آیتیں پڑھنے کی ہدایت کرتا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ اتفاق سے ہفتہ بھر مجھ سے کوئی گناہ نہ ہوتا یا وہ میرے حافظے میں محفوظ نہ رہتے تو میں سخت فکر مند ہوتا کہ گناہ کرنے کا اعتراف نہ کرنا بذاتِ خود گناہ شمار ہوتا تھا۔ چنانچہ مجھے زبردستی کوئی چھوٹا موٹا گناہ کرنا پڑتا۔ مثال کے طور پر میں ماں کی نظر بچا کر چینی کا چمچہ چرا لیتا یا کسی پھل فروش کا گرا ہوا آم غائب کر لیتا۔ اندازہ کریں کہ ہم سب ساتھی نئے نئے اور دلچسپ گناہوں کے ارتکاب میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ بائبل کا اپنے طور پر مطالعہ کرنا اور کسی دوسرے چرچ میں جانا ہم سب کے لئے سختی سے ممنوع تھا' مگر میں نے اس کی پابندی نہ کی اور جب اسکول میں

میرا آخری سال تھا ایک روز مَیں نے بائبل میں پڑھا کہ "جب دو افراد خدا کو حاظر و ناظر جان کر ایک دوسرے کے سامنے اپنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں تو ان کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں" میری سوچ کو پر لگ گئے۔ ذہن میں سوال پیدا ہوا کہ گزشتہ کئی سالوں سے مَیں تو اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہا ہوں' مگر پردے کے عقب میں "فادر" نے کبھی بھی اپنے کسی گناہ کا اقرار نہیں کیا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میرے گناہ بھی معاف نہیں ہوئے۔ مَیں نے پادری کے سامنے اپنی اس خلش کو بیان کرنے کا تہیہ کر لیا۔

اور آئندہ ہفتہ کو مَیں نے ایسا ہی کیا اور جب میری باری آئی تو مَیں نے معذرت کے بعد یہ سوال دہرایا۔ پردے کے پیچھے ایک لمبا سکوت طاری رہا۔ پھر فادر نے کہا "ابھی باہر چلے جاؤ اور صحن میں میرا انتظار کرو۔ مَیں فارغ ہو کر آؤں گا اور اطمینان سے تمہارے سوال کا جواب دوں گا"۔ مَیں باہر آ گیا اور (CONFESSION) ختم ہونے کے بعد ایک گھنٹہ تک صحن میں فادر کا انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئے۔ مَیں گھر چلا گیا اور پھر کبھی اس چرچ کا رخ نہ کیا بلکہ عشائے ربانی کی دعا (MASS) میں شمولیت کرنے سے بھی کترانے لگا۔ مَیں نے عیسائیت کے بارے میں وسیع مطالعہ شروع کر دیا اور غور و فکر بھی کرتا رہتا جس کے نتیجے میں یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہو گیا کہ اس مذہب کو انسان کی انسان پر حاکمیت کے لئے آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد اگرچہ مَیں نے تھوڑی مدت میں آزمائشی طور پر کتنے ہی ٹریڈ بدلے لیکن کثرتِ مطالعہ کا میرا شوق کم نہ ہوا اور آج تک جاری ہے۔ چنانچہ نفسیات پر مجھے جتنی کتابیں ملیں سب پڑھ ڈالیں۔ اس ضمن میں مَیں نے خصوصاً ینگ (JUNG) کے افکار کو فرائیڈ کے مقابلے میں کہیں بہتر اور فطرت کے قریب پایا کہ فرائیڈ کے نظریات پر میکانیت غالب ہے۔ بہر حال مَیں نے عمل تنویم (HYPNOSIS) کے بارے میں خوب پڑھا اور اسے عملاً اختیار بھی کیا۔ مطالعہ اور مشق کے دوران سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اپنے اور عامۃ الناس کے بارے میں بہت سے مخفی حقائق کا انکشاف ہوا۔

۱۹۵۶ء میں انگلستان آ گیا۔ میں ملک بھر میں خوب گھوما پھرا مگر زیادہ عرصہ لیسٹر میں مقیم رہا۔ پھر میں لندن منتقل ہو گیا جہاں ایک لائبریری میں مَیں نے روس کے ایک ریاضی

دان اور صوفی پوسنسکی کی ایک کتاب "مافوق الفطرت کی تلاش میں" (IN SEARCH OF MIRACULOUS) کا مطالعہ کیا جس میں مصنف نے اپنے ان تجربات کا ذکر کیا ہے جو اسے روس ہی کے ایک دوسرے صوفی گرد جیف کی شاگردی کے دوران حاصل ہوئے تھے۔ گرد جیف نے اپنی عمر کے اوائل میں خاصی طویل مدت جنوب مشرقی ایشیا میں گزاری تھی اور اس کی تعلیمات کا خلاصہ یہ تھا کہ انسان دراصل حالتِ خواب میں ہے اور اور عرفانِ ذات کی مسلسل کوشش ہی سے وہ بیداری اور شعور مندی حاصل کر سکتا ہے لیکن یہ کوشش تنہا کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی بلکہ ایسے لوگوں کی رفاقت اور شراکت میں یہ پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتی ہے جو اسی نوعیت کی کوششوں میں مصروف ہوں۔ ان نظریات کو بروئے عمل لانے کے لئے گرد جیف نے پیرس میں ایک ادارہ قائم کیا اور اپنے شاگردوں اور معتقدوں کا ایک حلقہ بھی بنا لیا جو بتدریج پھیلتا چلا گیا حتیٰ کہ یورپ بھر میں اس کی شاخیں قائم ہو گئیں۔ انگلستان میں اس مکتبِ فکر کے ایک صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ گرد جیف کے نظریات سے متاثر ہوا اور بعد ازاں مسلمان ہو گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ اسلوبِ فکر بڑا منطقی اور مدلل ہے اور غور و فکر کرنے والوں کو اسلام کی دہلیز تک لے آتا ہے۔

اس کتاب کے مباحث نے مجھے بھی بہت متاثر کیا اور خصوصاً عرفانِ نفس اور خود احتسابی کے نظریے نے میری سوچوں کا رخ تبدیل کر دیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ صومالیہ کے ایک باشندے سے ملاقات ہوئی تو باتوں کے دوران اس نے اچانک سوال کیا "کیا آپ مسلمان ہیں؟" "نہیں تو' آپ کو کیسے شبہ ہوا"؟ میں نے حیران ہو کر کہا۔ "زندگی کے بارے میں آپ کی سوچ بالکل مسلمانوں کی سی ہے"۔ اس نے جواب دیا اور جب میں نے اسے بتایا کہ میں فکری اعتبار سے تجسس کے کن مراحل میں بھٹک رہا ہوں تو اس نے مشورہ دیا کہ مجھے کسی ہفتے کی شام کو لندن کے اسلامک کلچرل سنٹر جانا چاہیے شاید وہاں مجھے اپنے سوالوں کا جواب مل جائے۔

میں اسلامک سنٹر میں پہنچا تو لائبریری ہال میں مختلف قومیتوں کے نوجوانوں پر مشتمل ایک گروپ حلقہ بنائے بیٹھا تھا۔ جس چیز نے مجھے بے حد متاثر کیا وہ ان لوگوں کی سادگی اور آپس کا غیر معمولی اخلاص اور باہمی محبت تھی۔ میرے وجدان نے کہا کہ جس منزل کی میں

تلاش میں تھا وہ مجھے مل گئی ہے۔ چنانچہ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ میں حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا۔

تاہم یہ عرض کرتا چلوں کہ میرے نزدیک ایک مسلمان ہونا دراصل ایک مسلسل عمل کا نام ہے۔ یہ وہ ترقی ہے جو پیہم جاری رہنی چاہئے اور یہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک انسان کا عزمِ صمیم اس کا ساتھ نہ دے۔ اس بات کو میرے ایک عزیز بھائی نے یوں بیان کیا تھا کہ ایک شخص محض فارم بھرنے سے مسلمان نہیں ہو جاتا بلکہ یہ تو کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ سے محکم اور مسلسل و مستقل وابستگی کا نام ہے۔ یعنی اللہ کے سوا ہرگز کوئی معبود نہیں۔ کلمہ طیبہ دراصل بیج ہے' گٹھلی ہے جس کے گرد دینِ حنیف 'اسلام' کا درخت اپنی شکل بناتا ہے یعنی باقی جو کچھ بھی ہے وہ دراصل اس مختصر فقرے کے صحیح ادراک و شعور کا لازمی نتیجہ ہے۔

سوال: براہ کرم اس فرق کی وضاحت فرما دیجیے جو آپ قبلِ اسلام کی زندگی اور موجودہ زندگی میں محسوس کرتے ہیں۔

جواب: میں اپنے احساس کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ ایک ایسے آدمی کا تصور کیجیے جو عمر بھر ایک گھپ اندھیرے کمرے میں مقفل رہا ہو' روشنی کو ترس گیا ہو اور راستے کی تلاش میں ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھاتا ہو۔ اسی عالم میں ایک روز اس کا نصیبہ جاگ اٹھے' دیوار میں بہت باریک شگاف پڑ جائے اور اس میں سے روشنی کی ایک پتلی سی کرن تاریکی کا سینہ چیرتی ہوئی کمرے میں آ جائے۔ کیا آپ ایسے شخص کی مسرتوں کا اندازہ کر سکتے ہیں؟ وہ خوشی سے ناچنے لگے گا اور دونوں ہاتھوں سے دیوانہ وار دیوار کو کھرچنے لگے گا تاکہ کسی طرح یہ شگاف چوڑا ہو اور مکمل روشنی کی برکتوں سے پوری طرح فیض یاب ہو سکے۔

چنانچہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام میرے خانۂ دل میں بہت بڑے انقلاب کی نوید بن کر آیا اور اہم ترین بات تو یہ ہے کہ مجھے سکون کی دولت مل گئی اور وہ بے شمار سوالات جو اوائلِ عمر سے مجھے پریشان کیے ہوئے تھے حل ہو گئے۔ زندگی کو ایک اعلیٰ و ارفع اور اصول نصب العین مل گیا ورنہ اس وقت تک میری روح مضطرب حالت میں پتہ نہیں کہاں کہاں بھٹک رہی تھی۔ چنانچہ جب میں نے اپنی والدہ کو خط لکھا کہ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے تو انہوں نے برہمی سے لکھا "یہ آوارہ گردی اب چھوڑ دو اور ڈھنگ سے کوئی سنجیدہ مطالعہ کرو"۔ اس کے بعد تین ماہ تک انہوں نے مجھے کوئی خط نہ لکھا تاہم میں انہیں اسلام کے

بارے میں مختلف کتابچے بھی بھیجتا رہا اور اپنے خطوں میں اسلامی تعلیمات کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں وضاحت بھی کرتا رہا۔ اللہ کا شکر ہے کہ ان کے رویے میں مصالحت اور نرمی کے آثار پیدا ہو گئے ہیں۔

بہر حال اسلام کے بارے میں مَیں نے ہر اس کتاب کا مطالعہ کر لیا ہے جس تک میری رسائی تھی۔ مگر پھر بھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے زمین کی اوپری سطح کو کھرچ رہا ہوں اور گہرائی تک میری رسائی نہیں ہوئی۔ چنانچہ مَیں نے عربی کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا ہے تاکہ بغیر کسی واسطے کے اس حسن، حکمت اور ہدایت تک پہنچ سکوں جو قرآن کے لفظوں میں مستور ہے۔

سوال: ظاہر ہے کہ ایک نومسلم کو جو اپنے آبائی مذہب سے قطع تعلق کرتا ہے بہت سے مسائل درپیش آتے ہوں گے جن کا ادراک ایک عام مسلمان نہیں کر سکتا کیا آپ ایسے مسائل کی کچھ وضاحت کرنا پسند کریں گے۔

جواب: مسائل کی نشاندہی کرنے سے پہلے مَیں ایک بہت بڑے فائدے کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جو ایک نومسلم کو حاصل ہوتا ہے جس سے عموماً عام مسلمان محروم رہتے ہیں۔ وہ فائدہ یہ ہے کہ جب ایک نومسلم اپنے مذہب مثال کے طور پر عیسائیت کو (جیسا کہ میری مثال موجود ہے) چھوڑ کر اسلام قبول کرتا ہے تو وہ دیوار کے دونوں طرف کی دنیاؤں سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ اسے اپنے آبائی مذہب کی خامیوں سے بھی آگاہی ہوتی ہے اور وہ اسلام کی خوبیوں سے بھی شناسا ہوتا ہے۔ اس طرح اسے شرح صدر حاصل ہوتا ہے کہ اسلام سب مذاہب پر ہر طرح سے فوقیت رکھتا ہے اور اعتماد اور یقین و ایمان کی اس نعمت سے متمتع ہوتا ہے جو عام مسلمانوں کو مشکل سے حاصل ہوتی ہے۔

مشکلات کے ضمن میں سب سے پہلی الجھن تو یہ پیش آتی ہے کہ ایک نومسلم کو صحیح اسلامی تعلیمات اور نسلی مسلمانوں کی غیر اسلامی رسوم و روایت کی چھان پھٹک کرنی پڑتی ہے اور وہ چکرا کر رہ جاتا ہے کہ دونوں میں اتنا تفاوت، کیوں ہے؟ مثال کے طور پر کچھ ہی عرصہ پہلے مجھ سے پوچھا گیا کہ میں شیعہ ہوں یا سنّی۔ ظاہر ہے وہ دین جس کی بنیاد کلمہ پر استوار ہو، اس میں اس طرح کے سوال اسے دہشت زدہ کر دیتے ہیں اور وہ سخت حیران

و پریشان ہو جاتا ہے کہ ملتِ واحدہ کے پرستار کس طرح غیر اہم باتوں پر بحث و جدال میں وقت ضائع کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک نومسلم کو جو تلخ حقیقت پریشان کرتی ہے وہ تبلیغ دین کا فریضہ ہے۔ یورپ کے مختلف ملکوں میں کچھ طالب علم اور ملازمت پیشہ لوگ ہی اس کام کو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن ناکافی فنڈز اور محدود وسائل کی وجہ سے اس سے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوتے ورنہ مجھے یقین ہے کہ اگر تبلیغ دین کو مسلمان ترجیح اوّل دیں اور اسلام کو اس کی بے میل اور خالص شکل میں پیش کیا جائے اور باقاعدہ پلاننگ کے ساتھ جدوجہد کی جائے تو لاکھوں کروڑوں لوگ اسے غیر معمولی اشتیاق کے ساتھ لپک کر قبول کرلیں گے۔

●......●......●

عبداللہ اڈیار

(بھارت)

جناب عبداللہ اڈیار سے میری ملاقات ۲۵ نومبر ۱۹۸۷ء کو سکھر میں ہوئی۔ پروفیسر اسد اللہ بھٹو کی تنظیم "فکرونظر" نے نومسلموں کے بارے میں میری کتاب "ہم کیوں مسلمان ہوئے؟" کا سندھی زبان میں ترجمہ کرایا تھا۔ اسی حوالے سے شاہ عبداللطیف بھٹائی کانفرنس میں مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ کانفرنس کے پروگرام سے پتہ چل گیا تھا کہ جنوبی ہندوستان کے مشہور نومسلم عبداللہ اڈیار بھی تشریف لا رہے ہیں۔

مہمانوں کو سکھر کے مشہور اور خوش منظر ہوٹل "انٹرپرائز" میں ٹھہرایا گیا تھا۔ عبداللہ اڈیار دوسری منزل کے ایک کمرے میں مقیم تھے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے پسندیدہ موضوع کے حوالے سے ان سے اپنا تعارف کرایا تو بہت خوش ہوئے اور جلد ہی بے تکلفانہ فضا میں تبادلۂ خیال ہونے لگا۔ کانفرنس دو دن جاری رہی اور مختلف وقتوں میں ان سے بار بار گفتگو ہوئی۔

مفکر، صحافی، شاعر، ادیب اور سیاست دان عبداللہ اڈیار کا تعلق جنوبی ہند کے مشہور شہر مدراس سے ہے جو تامل ناڈو کا صدر مقام ہے۔ اگرچہ انٹرمیڈیٹ کے بعد تعلیم جاری نہ رکھ سکے مگر غیر معمولی تحریری صلاحیتوں کی وجہ سے وہ مشہور تامل اخبار "نترا سولی" کے ادارتی عملے میں شامل ہو گئے جہاں انہوں نے سترہ برس تک نیوز ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ اس اخبار کے ایڈیٹر ڈاکٹر کروناندھی تھے جو بعد میں تامل ناڈو کے وزیر اعلیٰ بنے۔ عبداللہ اڈیار ایک شعلہ بیان مقرر ہیں اور صحافت سے وابستگی کے ساتھ ساتھ وہ ڈی ایم کے پارٹی کے رکن بھی تھے۔ انہوں نے بہت سے ڈرامے بھی لکھے۔ دو فلموں میں بھی کام

کیا اور فلم ڈائریکٹر اور پروڈیوسر کی حیثیت سے بھی نام پایا۔ افسانہ نگار بھی ہیں اور تامل زبان کے مختلف رسائل میں ان کی کہانیاں چھپتی رہی ہیں۔ وہ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ صرف اسلام پر ان کی تیرہ کتابیں چھپ چکی ہیں جن میں سے ''اسلام جس سے مجھے عشق ہے'' خاص شہرت رکھتی ہے اور اس کا ترجمہ اردو اور سندھی زبان میں بھی ہو چکا ہے۔ وہ شاعر بھی ہیں اور ایک کثیر الاشاعت ہفت روزہ ''کرودان'' (KARUDAN) کے مدیر بھی۔ چنانچہ مختلف النوع ادبی' علمی اور صحافیانہ خدمات کی بنیاد پر انہیں ۱۹۸۲ء میں تامل ناڈو گورنمنٹ ادبی ایوارڈ...... اور KALAIMAMANI کا خطاب دیا گیا جس کا مطلب ہے'' دنیائے علم و ادب کا گرانقدر ہیرا''۔

مَیں اسے اپنی خوش بختی سمجھتا ہوں کہ مجھے سکھر میں دو دن تک اس گرانقدر ہیرے کی شعاعوں سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا اور مَیں نے ان کے ذاتی احوال اور قبولِ اسلام سے متعلق ضروری تفصیلات حاصل کر لیں جواب نذرِ قارئین کی جا رہی ہیں۔

س...... براہِ کرم اپنی ابتدائی زندگی' خاندانی حالات اور دیگر ضروری تفصیلات سے آگاہ فرمایئے۔

ج...... میں ۱۶۔ مئی ۱۹۳۵ء کو تامل ناڈو کے ایک قصبہ تری پور میں پیدا ہوا جو ضلع کالمبا ٹور میں واقع ہے۔ میرا تعلق ایک ہندو خاندان سے تھا مگر میرے والد ونگاٹا چالام (WINGATCHALAM) ایک راسخ العقیدہ کیمونسٹ تھے اور والدہ کٹر مذہبی ہندو تھیں۔ پیدائش کے وقت میرا نام اڈیار رکھا گیا۔ یہ تامل ناڈو کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں خدا کا بندہ۔

آپ کو یہ جان کر خوشی ہو گی کہ جنوبی بھارت کے ہندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف تعصب اور تنگ نظری کا وہ انداز نہیں ہے جو شمالی ہندوستان میں کارفرما ہے۔ وہاں باہمی رواداری اور مفاہمت کی فضا عام نظر آتی ہے۔ چنانچہ اندازہ کریں کہ نمازوں کے اوقات میں ہندو عورتیں اپنے بچوں کو گود میں اٹھائے مساجد کے دروازوں پر کھڑی رہتی ہیں تاکہ نمازیوں سے بچوں کو دم کرائیں اور برکت و شفا حاصل کریں۔ اسی طرح جنوبی ہند کے بہت سے مقامات پر یہ روایت نظر آتی ہے کہ ہندو اپنے باہمی جھگڑوں میں مسلمانوں سے فیصلے کراتے

ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان جانبدار نہیں ہوتے اور وہ مکمل انصاف سے فیصلہ کرتے ہیں۔

میں نے اس معاشرتی ماحول میں آنکھیں کھولیں۔ حسن اتفاق سے میری پرورش و پرداخت میں ایک مسلمان خاتون نے اہم رول ادا کیا۔ یہ خاتون ہمارے گھر میں آیا کا کام کرتی تھی اور سادگی اور خلوص کا خاص مزاج رکھتی تھی۔ پھر لڑکپن میں میرے دوستوں میں مسلمان لڑکے بھی تھے۔ اس طرح مسلمانوں سے میرا تعارف خاصا گہرا اور دیرینہ ہے اور میں ان کی شرافت' انصاف پسندی' نیک دلی اور مکروریا سے پاک اسلوب حیات کو ہمیشہ سے پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اسی دوران میں متعدد بار یہ منظر بھی دیکھا کہ میرے والد اور ان کے مسلمان دوستوں میں عقائد و نظریات پر گفتگوئیں ہوتی تھیں اور میرے دل و دماغ کو مسلمانوں کا نقطۂ نظر زیادہ اپیل کرتا تھا جبکہ والد کی باتوں میں کھوکھلا پن جھلکتا دکھائی دیتا تھا۔ تاہم اس سب کچھ کے باوجود میرے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک روز میں بھی حلقہ بگوشِ اسلام ہو کر عظیم مسلمان برادری کا ایک فرد بن جاؤں گا۔ اس وقت میں اپنے باپ کی طرح دہریہ تھا۔ مذہب میرے نزدیک ایک بیکار شے تھی۔

س...... پھر وہ کیا وجوہات تھیں جنہوں نے آپ کو اسلام کی چوکھٹ پر لا بٹھایا؟

ج...... میری تعلیم اگرچہ انٹرمیڈیٹ سے آگے نہ بڑھ سکی اور میں تامل ناڈو زبان کے مشہور روزنامہ "تراسولی" سے منسلک ہو گیا مگر مختلف موضوعات پر میں نے خوب مطالعہ کیا۔ اتفاق سے حلقۂ احباب بھی بڑے فاضل دوستوں پر مشتمل تھا جن سے متنوع مسائل پر تبادلۂ خیال ہوتا رہتا تھا۔ خصوصاً اخبار کے ایڈیٹر کرونا ندھی سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرے طرز فکر میں استدلالیت اور منطقیت حاوی ہوتی گئی اور زندگی کے بارے میں ایک متوازن اور باوقار نقطۂ نظر ابھرتا گیا۔

چونکہ میں ڈاکٹر کرونا ندھی سے بہت متاثر تھا اور وہ تامل ناڈو کی سیاست میں عملاً دخیل تھے اس لئے میں بھی ان کی سیاسی پارٹی "ڈی ایم کے" کا رکن بن گیا اور مقامی سیاست میں فعال کردار ادا کرنے لگا۔ میری پُر جوش مگر منطقی و مدلل تقریروں کی خصوصی حیثیت اور اہمیت بن گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صوبائی انتخابات میں حکمران کانگرس پارٹی کو شکست فاش ہوئی۔ D.M.K کو مکمل اور بھرپور کامیابی حاصل ہوئی' مگر وزیراعظم اندرا گاندھی

اس شکست کو ہضم نہ کر سکی۔ ۱۹۷۶ء میں اس نے ڈی ایم کے کی وزارت کو برطرف کر کے وزراء اور دیگر قائدین کو جیل میں ڈال دیا۔ محبوسین میں میں بھی شامل تھا۔

ہم لوگ اگرچہ سیاسی قیدی تھے مگر جیل میں ہمارے ساتھ بڑا بہیمانہ سلوک روا رکھا گیا اور اخلاقی قیدیوں کی طرح خوب زدوکوب کیا جاتا۔ چونکہ اس ظلم وستم کے خلاف میں احتجاج سے باز نہ آتا تھا اس لئے جیل کا عملہ مجھ پر زیادہ ہی مہربان تھا۔ وہ بڑی بے رحمی سے میری پٹائی کرتے۔ تشدد کا اندازہ اس امر سے کیجئے کہ ایک بار مسلسل ضربات سے میرا پیٹ پھٹ گیا اور آنتیں نظر آنے لگیں۔

خوف اور دہشت کے اس عالم میں میری روح بے اختیار کسی ایسی چیز کا تقاضا کرنے لگی جو مجھے خوف اور پریشانی کے احساس سے نجات دے چنانچہ میں نے پہلی مرتبہ سنجیدگی سے مذہب کے بارے میں سوچنا شروع کیا اور پہلی بار میرے ذہن میں کائنات اور اس کے خالق اور زندگی کے دیگر حقائق کے بارے میں سوالات ابھرے۔ تب میں نے اپنی بیوی سے جو عیسائی تھی' مذہبی کتابوں کی فراہمی کا مطالبہ کیا۔ وہ عیسائیت کے بارے میں بہت سی کتابیں لے آئی۔ میں نے سب کا مطالعہ کیا مگر مطمئن نہ ہوا۔ اسی طرح میں نے ہندومت' بدھ مت' جین مت' اور یہودیت کا بھی غور سے مطالعہ کیا مگر کہیں سے میرے سوالات کا جواب نہ ملا اور میری روح کی پیاس ختم نہ ہوئی۔

آخر میں نے اسلام کا مطالعہ شروع کیا اور قرآن مجید کے انگریزی ترجمے نے میرے دل و دماغ پر چھائے ہوئے غبار کو دھو دیا۔ مجھے میرے سوالات کے جوابات مل گئے۔ خوف اور مایوسی کی فضا تحلیل ہو گئی۔ قرآن کی اس تعلیم نے میری بڑی ڈھارس بندھائی کہ "خوف صرف خدا کا ہونا چاہئے اور اس سے ڈرنے والے پھر کسی سے نہیں ڈرتے"۔ میں مطمئن ہو گیا کہ اسلام واقعی مکمل اور فطری ضابطۂ حیات ہے اور اس میں انسانوں کی مادی اور روحانی مشکلات کو حل کرنے کی بھرپور صلاحیت ہے۔

چنانچہ جیل سے رہا ہونے کے بعد میں نے اسلام کا مزید گہرائی سے مطالعہ کیا۔ مولانا مودودی کی ساری کتابیں پڑھ ڈالیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی جن کتب کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا تھا ان سے بھی استفادہ کیا اور تامل ناڈو زبان کے مشہور عالم پی ایس اے

محمد (جو تقریباً ایک سو کتابوں کے مصنف ہیں) کی تصانیف پڑھ لیں۔ خصوصاً مولانا مودودیؒ تو میرے محسن اور مرشد ہیں کہ ان کی تحریروں ہی نے مجھے اسلام کے بارے میں یکسو کیا۔ جب اسلام کے بارے میں میرا ذہن مطمئن ہو گیا تو ۱۹۸۰ء میں مَیں نے تامل روزنامہ ''نیروٹم'' میں اسلام کی حقانیت کے بارے میں مضامین کا سلسلہ شروع کر دیا۔ عنوان تھا ''اسلام جس سے مجھے عشق ہے''۔ اس میں مَیں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلام کے مقابلے میں ہر دوسرا مذہب نامکمل اور انسان کی رہنمائی کے لئے ناموزوں ہے۔ یہ اسلام اور صرف اسلام ہی ہے جو مکمل ضابطۂ حیات کی حیثیت سے ہر دور میں انسانوں کے ہمہ پہلو مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔ یہ مضامین بعد میں کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے اور ہندوستان کی دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کیے گئے۔ یہ سلسلہ مضامین اور کتاب پڑھ کر بے شمار ہندوؤں نے مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ وہ اسلام کی تفہیم کے لئے مزید تفصیلات چاہتے تھے چنانچہ بہت سے ہندو مسلمان ہو گئے۔

مسلمانوں نے میری اس کاوش کی بہت حوصلہ افزائی کی۔ میری اس کتاب کی وسیع پیمانے پر اشاعت ہوئی اور ہندوستان بھر کی مسلم تنظیموں نے مجھے خطاب کی دعوت دی۔ اس سے مَیں اسلام کے قریب تر ہوتا چلا گیا۔ اگرچہ مَیں نے اسلام قبول نہ کیا' مگر کلمہ یاد کر لیا' نماز کا طریقہ سیکھ لیا اور تنہائی میں جب جی چاہتا اپنے رب کے حضور سربسجود ہو جاتا۔

اسلام اور مسلمانوں سے میرے گہرے قلبی تعلق کا اندازہ اس امر سے لگا لیجئے کہ جب مسلم پرسنل لاء کے بارے میں ہندوستان میں شور اٹھا تو مَیں نے اس کی مدافعت میں ایک کتاب مرتب کی جس میں مَیں نے بھارتی حکومت اور ہندو جنتا کو خبردار کیا تھا کہ وہ شرعی قوانین میں ہرگز مداخلت نہ کریں۔ اس کے علاوہ مَیں نے اپنے مسلمان دوستوں کے تعاون سے تحفظِ نظامِ شریعت کے نام سے ایک کانفرنس بھی کر ڈالی۔

اس دوران میں اسلام کے بارے میں میری تیرہ کتابیں چھپ گئی تھیں' جنہیں پڑھ پڑھ کر تعلیم یافتہ ہندو خاصی تعداد میں مسلمان ہو رہے تھے۔ انہی میں اتر پردیش کا ایک ہندو شیام لال بھی تھا جس نے میری کتابیں پڑھ کر اسلام قبول کر لیا تھا۔ وہ محض میری ملاقات کے لئے مدراس آیا مگر جب اسے پتہ چلا کہ مَیں ہندو ہوں تو وہ سخت پریشان ہوا۔

اس کے آنسو نکل آئے اور بڑی دردمندی سے کہنے لگا " آپ دوسروں کو روشنی دکھا رہے ہیں مگر افسوس کہ خود اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں"۔ میری سٹی گم ہو گئی، جیسے کسی نے گھڑوں پانی ڈال دیا ہو۔ لاجواب ہو کر میں خاموش ہو گیا۔ مگر اس کی بات پھانس بن کر میرے دل میں چبھ گئی اور تہیہ کر لیا کہ اب مَیں خود بھی اس چشمۂ فیض سے دور نہیں رہوں گا۔

چنانچہ مَیں نے ۷ جون ۱۹۸۶ کو جماعتِ اسلامی مدراس کے امیر جناب اعجاز اسلم سے رابطہ قائم کیا کہ مَیں فوری طور پر اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا ضروری انتظام کیا جائے۔ انہوں نے جواب دیا کہ مَیں مزید ایک ہفتہ غور کر لوں مگر مَیں مُصر تھا کہ یہ کام آج ہی ہو گا۔ چنانچہ انہوں نے ساؤتھ انڈیا اشاعتِ اسلام سبھا کے ذمہ داروں سے بات کی اور طے پایا کہ آج عصر کے بعد مدراس کی مشہور مسجد "مسجد معمور" میں یہ فریضہ انجام دیا جائے گا۔

وقتِ مقررہ پر مسجد شہر کے مسلمان عمائدین اور عام اہلِ اسلام سے بھر گئی تھی۔ مَیں نے سب کی موجودگی میں کلمہ طیبہ پڑھا اور حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا۔ مسجد نعرۂ تکبیر سے دیر تک گونجتی رہی۔ بعد میں مَیں نے مختصر خطاب بھی کیا کہ آج میں اپنوں کے درمیان آ گیا ہوں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے مجھے ہدایت دی اور میرا سینہ ایمان کی روشنی سے منور ہوا۔ مَیں گزشتہ کئی سالوں سے اسلام کا مطالعہ کر رہا ہوں اور یہ مطالعہ عقل و دلیل اور منطق کی رو سے ہے۔ اس میں جذباتیت کا کوئی عمل دخل نہیں۔ اللہ کے فضل سے آج مَیں نے مستحکم ایمان والی زندگی میں قدم رکھا ہے اور ساری علمی معلومات کے باوجود آپ حضرات کے سامنے بچہ ہوں۔ مہربانی فرما کر میری دینی تربیت کیجئے اور میرا ہاتھ پکڑ کر میری رہنمائی فرمایئے۔

تقریب کے بعد شرکائے جلسہ نے مجھے گھیر لیا ہر شخص میری طرف محبت اور عقیدت سے دیکھ رہا تھا اور مصافحہ اور معانقہ کرنا چاہتا تھا۔ یوں لگتا تھا یہ سب لوگ مجھے سگے بھائیوں سے زیادہ چاہتے ہیں۔ مَیں ایک تنگنائے سے نکل کر ایک وسیع و عریض پُر فضا مقام پر آ کھڑا ہوا تھا۔

س......آپ کے اس فیصلے کا آپ کے خاندان اور حلقہ احباب میں کیا ردِ عمل ہوا؟

ج......جیسا کہ پہلے بتا چکا ہوں میرے والد کمیونسٹ ہیں جبکہ والدہ جذباتی مذہبی

ہندو ہیں چنانچہ میرے قبول اسلام پر دونوں سخت برہم ہوئے لیکن مَیں نے ان کے ساتھ حسنِ سلوک میں کمی نہ آنے دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ ان کا مزاج اعتدال پر آ گیا۔ میری بیوی پختہ عقیدے کی عیسائی خاتون تھیں۔ انہیں سمجھانے اور قائل کرنے میں خاصی مشکلات حائل رہیں لیکن بحمد للہ وہ چند ہی ماہ کے بعد مسلمان ہو گئیں۔ رہا دوست احباب اور عام لوگوں کا ردِعمل تو تامل ناڈو میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے بڑی رواداری اور فراخدلی پائی جاتی ہے اور میرے مضامین اور کتابوں سے لوگوں کو پہلے ہی توقع تھی کہ یہ شخص اسلام قبول کئے بغیر نہیں رہ سکے گا چنانچہ میرے اس اقدام سے بہت کم حضرات کو تعجب ہوا اور تقریباً سبھی نے اس تبدیلی کو خوش دلی سے قبول کر لیا۔ مثال کے طور پر میرے والدین کا حالیہ تاثر یہ ہے کہ اسلام نے تم پر اچھے اثرات مرتب کئے ہیں۔ مَیں پاکستان آ رہا تھا تو انہوں نے مجھے مخلصانہ دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔"

س...... اسلامی تعلیمات کے وہ کون سے پہلو ہیں' جنہوں نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا؟

ج...... میں اس کا تفصیلی جواب اپنی کتاب '' اسلام جس سے مجھے عشق ہے'' میں دے چکا ہوں۔ اجمالی تفصیل یوں ہے:

قرآن کا اعجاز:

- قرآن کے الفاظ کے صوتی آہنگ سے مَیں بے حد مسرور ہوا ہوں۔ '' کیا آواز کو کسی قسم کا تقدس حاصل ہے؟'' میں کہوں گا ہاں ہے۔ آواز ہی دنیا کی بنیاد ہے۔
- وید کہتا ہے کہ 'اوم' کی آواز سے دنیا کی تخلیق ہوئی۔
- بائبل کا کہنا ہے کہ سب سے پہلے خدا کا کلمہ تھا پھر یہ دنیا پیدا ہوئی۔

قرآن کریم کی آواز جہاں ایک بہترین نثر کی آواز ہے' وہاں وہ اپنے اندر ایک بہترین شعر کا آہنگ لئے ہوئے ہے۔ اس میں ایک بہترین منظر کا حسن موجود ہے۔ نثر اور نظم و شعر کی گنگناتی نغمہ بار کائنات کا حسن۔

- کیا یہ کلام اتنا حسین ہے کہ اس کے مثل کوئی دوسرا کلام ممکن نہیں؟

کیا یہ سوال آج بھی کیا جا سکتا ہے اور اس دور میں بھی اٹھایا گیا تھا۔ قرآن نے اس سوال کا جواب اسی وقت دے دیا تھا کہ ہمت ہے تو اس جیسا کلام لے آؤ۔

اس چیلنج کا جواب دینے سے دنیا آج بھی قاصر ہے۔ اس کی کوشش جس نے بھی کی' منہ کی کھائی۔

□ تورات حضرت موسیٰ پر عبرانی میں نازل ہوئی تھی۔ سینکڑوں برس بعد اس کو لکھا گیا۔ پھر یہ لکھا ہوا مجموعہ ضائع ہو گیا مگر اس کے لاطینی اور یونانی ترجمے باقی رہ گئے جن سے یہودیوں نے اسے دوبارہ عبرانی میں منتقل کر لیا۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ترجمہ سے اس الہامی کتاب کی زبان کی کیا حیثیت رہ گئی ہو گی۔

حضرت عیسیٰ پر نازل ہونے والی کتاب ''سریانی'' زبان کی ایک بولی ''آرامی'' میں تھی' لیکن اس کو سب سے پہلے یونانی زبان میں لکھا گیا پھر یونانی سے لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ بائبل بھی تورات کی طرح اپنی اس زبان اور الفاظ میں موجود نہیں ہے جس میں نازل ہوئی تھی مگر قرآن جس زبان میں نازل ہوا تھا اسی زبان میں آج بھی دنیا میں موجود ہے۔

□ زبان کے اعتبار سے قرآنِ کریم کی ایک اور خصوصیت بھی قابلِ غور ہے۔

□ ہندومت کے وید اپنی اصل زبان کی بجائے سنسکرت میں لکھے گئے' لیکن سنسکرت آج عام بول چال کی زبان نہیں۔ یہودیوں کی مذہبی کتاب کی زبان عبرانی بھی صدیوں تک بول چال کی زبان نہیں تھی۔ اب اسے مصنوعی طور پر زبردستی فروغ دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔

حضرت عیسیٰ کی زبان آرامی اور گوتم بدھ کی زبان پالی بھی قصۂ پارینہ بن چکی ہیں مگر قرآن کی زبان عربی آج بھی کروڑوں انسانوں کی روزمرہ زبان ہے اور قرآن نے اسے بھی زندہ و پائندہ بنا دیا ہے۔

اسی طرح چار وید' توریت' انجیل اور بدھ مت کی مذہبی کتاب ''تماپدم'' مختلف پیغمبروں اور مذہبی رہنماؤں کی وفات کے عرصہ بعد مرتب ہوئیں' مگر قرآن پاک نبی اکرمؐ کی حیاتِ مقدسہ ہی میں جیسے جیسے نازل ہوتا گیا ویسے ویسے اسے لکھا جاتا رہا اور ترتیب دے دیا گیا۔

❑ دیگر مذاہب کی کتابیں کچھ خاص طبقات کے لئے ہوتی ہیں' چنانچہ ہندو مذہب کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ بعض انسانوں کو وید پڑھنے اور سننے کے جرم میں سزائیں دی گئیں۔ عیسائیوں اور یہودیوں میں بھی مذہبی کتابوں کی تعبیر و تشریح پر پادریوں اور ربیوں کو اجارہ داری حاصل رہی' مگر قرآن تک ہر طبقے اور ہر گروہ کی دسترس ہے۔ ہر انسان بلا امتیاز اس کا مخاطب ہے اور پیغمبر اسلامؐ کے فرمان کے مطابق بہترین مسلمان وہ ہے جو خود قرآن سیکھے اور دوسروں کو سکھائے۔

❑ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ عام مذاہب کی کتابیں حکمرانوں' جاگیرداروں اور زرداروں کے ہاتھ مضبوط کرتی رہی ہیں اور کمزوروں پر ظلم ڈھانے میں ان کی معاون و مددگار رہی ہیں' مگر قرآن ظالم حکمرانوں اور زبردستوں کی بار بار مذمت کرتا اور کمزوروں' ناداروں کو سہارا دیتا ہوا نظر آتا ہے۔ بلا مبالغہ قرآن حکیم کو انسانی آزادی کا چارٹر اور میگنا کارٹا قرار دیا جا سکتا ہے۔

❑ قرآن کی تعلیمات بھی فطری اور اٹل نوعیت کی ہیں۔ یہ کتاب انسانوں کو خدا کا تقویٰ اختیار کرنے کی تلقین کرتی ہے۔ حکم دیا کہ صرف معبود حقیقی سے ڈرو اور دل سے ہر دوسرا خوف نکال دو۔ اسی تعلیم کی برکت سے انسانوں کو جابر حکمرانوں کے خلاف بغاوت کرنے اور صرف خدائی قوانین کے آگے جھکنے کا حوصلہ ملا۔

❑ قرآن نے عام انسانوں میں ظالم حکمرانوں' غیر منصفانہ قوانین اور استحصالی قوتوں کے خلاف ڈٹ جانے کا داعیہ پیدا کیا۔ انہیں جنگ' بیماری' موت' غربت و افلاس اور مال و عزت کے زیاں کے خوف سے بے نیاز کیا اور شدید ترین خطروں میں بھی مستقل مزاجی اور عزیمت کی تعلیم دی۔ اس طرح قرآن نے انسانوں کو بہادر' باوقار اور صاحب شرف و عزت ہستی بنا دیا اور دور اول سے لے کر آج تک اسلامی تاریخ میں اس حوالے سے ان گنت مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

❑ اس کتاب مبین کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر حالت میں عدل و انصاف پر قائم رہنے کی تلقین کرتی ہے اور کسی حال میں بھی انصاف کا دامن چھوڑنے کی اجازت نہیں دیتی۔ حکم دیا کہ ہر حال میں انصاف سے کام لو خواہ معاملہ تمہارے قریبی رشتہ داروں ہی کا کیوں نہ ہو۔

□ آزادی، مساوات اور حق و انصاف، ان تین بہترین اساسی اصولوں پر قرآن حکیم انسانی معاشرے کو تشکیل دیتا ہے۔

□ بہت سی مذہبی کتابیں انسان کی دنیوی زندگی کو پاپ کی زندگی قرار دیتی ہیں۔ اس سے جلد از جلد دامن چھڑانے اور اس کو تج دینے کی تلقین کرتی ہیں۔ مگر قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ انسان خدا کی بہترین تخلیق ہے اور اسے اعلیٰ و ارفع مقاصد کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے اور ان پاکیزہ ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے وہ جو اعمال بھی سرانجام دیتا ہے قرآن انھیں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ انھیں ثواب قرار دے کر دینا و آخرت کے انعامات کا اعلان کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اور اس کی دنیاوی زندگی کو احترام اور تکریم صرف قرآن نے عطا کی ہے۔

سیرت النبیؐ کا اعجاز:

□ قرآن کے بعد مجھے پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کی سیرت پاک نے بے پناہ متاثر کیا ہے۔ فی الحقیقت آپؐ کی زندگی اور کردار کا ہر پہلو عدیم النظیر ہے۔ مثال کے طور پر دنیا کے مختلف مذاہب کا اپنے رہنماؤں کے بارے میں دعویٰ ہے کہ فلاں خدا کے اوتار ہیں، فلاں خدا کے جزو ہیں، فلاں خدا کے بیٹے ہیں...... اور عجیب بات یہ ہے کہ دنیا ان دعووں کو سچ مانتی رہی ہے لیکن اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ محمد رسول اللہ کو نہ خدا کہا جاتا ہے، نہ خدا کا بیٹا اور نہ خدا کا اوتار...... وہ ایک انسان ہیں، ایک پاکباز انسان، بلند ترین اخلاق کے حامل انسان...... قرآن اعلان کرتا ہے کہ "اے نبیؐ! کہو میں تو بس تمھی جیسا ایک انسان ہوں، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمھارا خدا بس ایک ہی خدا ہے"۔ قرآن میں مختلف مقامات پر نبی کریمؐ کی زبانی یہ اعلان کر دیا گیا ہے کہ:

□ میں کسی اعجوبہ کا مظاہرہ نہیں کروں گا۔

□ میرے پاس آسمانوں کے خزانوں کی کنجیاں نہیں ہیں۔

□ میں غیب کی باتیں نہیں جانتا۔

□ میں انسان ہوں، تم جیسا انسان۔

اور ان دعووں کے ساتھ اگر کسی نے کوئی دین قائم کیا ہے تو وہ صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔

☐ پھر یہ بات بھی لائق غور ہے کہ کتنے ہی مذہبی قائدین انسان کی حیثیت سے پیدا ہوئے' زندگی میں انسان کی حیثیت سے اپنا کردار انجام دیا' انسانی معاشرے میں اصلاح اور بھلائی کے کام کئے اور وفات پا گئے۔ لیکن ان کی آنکھیں بند ہوتے ہیں انہیں خدا کا درجہ دے دیا گیا۔ گوتم بدھ اور حضرت مسیحؑ کے ساتھ یہی کچھ ہوا۔ ہندومت کا تو ہر مذہبی رہنما خدا کا درجہ رکھتا ہے۔

☐ لیکن نبی کریمؐ کو کبھی خدا کا درجہ نہیں دیا گیا۔ کسی معقول مسلمان نے انہیں الوہیت کے مقام پر فائز نہیں کیا۔

☐ مَیں اپنے قلب کی گہرائیوں سے اعلان کرتا ہوں کہ پوری انسانی تاریخ میں مجھے محمد رسول اللہؐ جیسی جامع اور مکمل شخصیت کہیں نظر نہیں آتی۔

عرب کا مطلق العنان حکمران ہونے کے باوجود آپ اپنے کام خود کرتے تھے۔ اپنے جوتے تک خود مرمت کر لیتے' اپنے کپڑوں کو پیوند بھی خود لگاتے تھے۔ بکریوں کو اپنے ہاتھ سے چارہ ڈالتے اور اپنے ہاتھ سے دودھ دوہتے تھے۔

دودھ نوش کرنے والے اور دودھ ہی میں نہانے والے حکمرانوں کو تو دنیا جانتی ہے' لیکن دودھ دوہنے والے واحد حکمران صرف آپؐ ہیں۔

☐ ہنس مکھ چہرہ لئے ہوئے نہ جھنجھلانے والے' نہ غصہ کرنے والے' نہ قہقہہ لگانے والے' ہر کسی کا ہاتھ بٹانے والے' باوقار چال چلنے والے' کسی کے سلام کا انتظار کئے بغیر ہر شخص کو آگے بڑھ کر سلام کرنے والے' چھوٹوں کو ازراہِ شفقت سلام میں پہل کرنے والے' کوئی پکارنے والا خواہ دنیاوی طور پر کتنا ہی بے حیثیت اور حقیر کیوں نہ ہوتا' اس کی پکار پر دردمندی اور گرم جوشی سے لبیک کہہ کر تعاون کے لئے لپکنے والے...... یہ ہے عظیم و بلند کردار اس پاکیزہ نبی کا۔

آپ نے زندگی بھر نہ کسی کو جھڑکا نہ لعنت کی نہ کسی کو گالی دی۔ بہت سے بزرگوں کا حال ہم جانتے ہیں کہ وہ باہر والوں پر تو نرم خو اور صابر و متحمل مزاج نظر آتے ہیں' لیکن

اپنے اہل و عیال' نوکر چاکر' اپنے ماتحتوں کے لئے سخت گیر' درشت مزاج اور سخت کلام ہوتے ہیں۔ لیکن نبی کریمؐ کی شان نرالی ہے' جیسے وہ باہر شفیق و حلیم اور شگفتہ مزاج اور خوش کلام تھے ویسے ہی گھر کے اندر اپنے اہل و عیال' نوکر چاکر اور ماتحتوں کے ساتھ بے حد نرم مزاجی' تحمل' محبت اور شگفتہ روئی سے پیش آتے تھے۔

آپؐ سے ملنے والے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے تو آپ مخاطب کا ہاتھ تھام کر گفتگو فرماتے اور جب تک دوسرا شخص اپنا ہاتھ پیچھے نہ ہٹاتا' آپ ہاتھ بڑھائے رکھتے۔ ہر کسی کو محبت اور اکرام کے ساتھ پکارتے۔ کوئی آپ سے سخت کلامی کرتا تو آپ مسکرا کر خاموش ہو جاتے اور صبر کرتے۔ آپ کی حیا مثالی تھی' شریف خاندان کی باعفت دوشیزہ کی حیا سے بھی بڑھ کر۔

نبیِ عربیؐ کی شان دیکھیے۔ وہ سرِ بزم گفتگو میں جتنے نرم تھے' جدوجہد کے میدان میں اتنے ہی گرم تھے۔ مصائب و مشکلات میں پہاڑ کی طرح ثابت قدم نظر آتے ہیں۔

رسول اللہؐ نے اپنے ساتھیوں کو جہاں نرم خوئی سکھائی' وہاں اصولوں میں بے لچک رویہ اختیار کرنے کی تعلیم بھی دی۔ دشمنوں کے ہاتھوں آپ کے اور آپ کے ساتھیوں نے شدید مظالم برداشت کئے لیکن فتح مکہ کے موقع پر جب آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ شہر میں فاتحانہ داخل ہوئے تو ان پر نہ تو فتح کا نشہ چھایا ہوا تھا نہ دلوں میں انتقام کا کوئی جذبہ موجزن تھا۔ بلکہ اس کے برعکس دنیا نے دیکھا کہ آپ کا سر عاجزی سے جھکا ہوا تھا اور ریش مبارک اونٹ کے کوہان کو چھو رہی تھی۔

سرداران قریش لرز رہے تھے کہ ہم نے ان لوگوں پر اتنے بھیانک مظالم ڈھائے ہیں' آج ہمارا کیا حشر ہوگا؟

مگر نبی کریمؐ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ موتیوں کی طرح ٹپکے۔

''لوگو! آج تم سے کوئی انتقام نہیں لیا جائے گا۔ خدا تمہیں معاف کرے' جاؤ تم سب آزاد ہو''۔

آپ نے اپنے جاں نثار شہید چچا کے کلیجے کو نکالنے اور چبانے والی عورت کو بھی معاف کر دیا۔ کیا انسانی تاریخ ایسی کوئی نظیر پیش کر سکتی ہے۔

عورتوں پر حضورؐ کے احسانات:

واہ! کتنی بلندی اور کتنی عظمت کی بات ہے یہ۔ یوں تو ہر طبقے پر نبی کریمؐ کے احسانات بے پناہ ہیں مگر عورتوں سے آپ کے حسن سلوک اور کرم فرمائیوں کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ آپ کی بعثت سے پہلے عام طور پر ہر سماج اور ہر سوسائٹی میں عورت کو حقیر گردانا جاتا تھا' اس کی تحقیر کی جاتی تھی' اسے مال تجارت سمجھا جاتا تھا اور وہ ہر طرح کے ظلم و ستم کی سزاوار سمجھی جاتی تھی۔

آپ تاریخ انسانی کے پہلے رہنما اور اولین قانون ساز ہیں جنہوں نے صنف نازک کو ذلت و نکبت کی اس غیر معمولی حالت سے نجات دلائی۔ آپ نے عورت کو مرد کے برابر مساویانہ درجہ دیا۔ وراثت میں اسے حصہ دار قرار دیا۔ حالانکہ انسانی حقوق اور تہذیب کا بلند بانگ دعویٰ کرنے والے کئی یورپی ممالک میں آج بھی عورت کو جائیداد میں حصے کا حق حاصل نہیں۔ ہندوستانی سماج میں عورت کو جائیداد کا حق کچھ ہی عرصہ پہلے حاصل ہوا ہے' لیکن پیغمبر اسلام نے چودہ سو سال قبل ہی یہ سارے حقوق عورتوں کو عطا فرما دیے تھے۔ عورت کے حقوق کی وضاحت کے لئے قرآن میں بھی احکام و فرامین نازل ہوئے۔

آپ کی تعلیمات میں عورتوں کے حقوق پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کے چند فرمودات ملاحظہ ہوں:

- اپنی بیوی کو مارنے والا اچھے اخلاق کا مالک نہیں ہے۔
- تم میں بہترین شخص وہ ہے جو اپنی بیوی سے اچھا سلوک کرے۔
- اللہ عورتوں کے ساتھ اچھے طریقے سے پیش آنے کا حکم دیتا ہے کیونکہ وہ تمہاری مائیں' بہنیں اور بیٹیاں ہیں۔
- جنت ماں کے قدموں میں ہے۔
- کوئی مسلمان اپنی بیوی سے نفرت نہ کرے۔ اگر اس کی کوئی ایک عادت بری ہے تو اس کی کسی دوسری اچھی عادت کو دیکھ کر مرد کو خوش ہونا چاہئے۔
- اپنی بیوی کے ساتھ غلاموں جیسا سلوک نہ کرو۔ ان کی پٹائی نہ کرو۔
- جب تم کھاؤ تو اپنی بیوی کو بھی کھلاؤ' جب تم پہنو تو اپنی بیوی کو بھی پہناؤ۔

❑ بیوی کو طعنہ نہ دو' چہرے پر نہ مارو' اس کا دل نہ دکھاؤ' اس کو چھوڑ کر نہ چلے جاؤ۔
❑ بیوی اپنے شوہر کی جگہ جملہ اختیارات کی حامل ملکہ ہے۔
☆ اتنے حقوق عطا کر کے نبی کریمؐ نے عورتوں کو بھی بعض فرائض اور حدود کا پابند بنایا:
❑ جب شوہر کو دیکھے تو خوش ہو جائے۔ جب حکم دے تو اطاعت کرے۔ شوہر اگر دور ہو تو اس کی ملکیت اور اپنی عفت کی حفاظت کرے۔ ایسی ہی عورت معیاری بیوی سمجھی جائے گی۔
❑ اچھے اخلاق کی بیوی کا میسر ہونا بے مثال دولت کے مترادف ہے۔
❑ جو پنجگانہ ادا کرے' رمضان کے روزے رکھے' اپنے شوہر کی اطاعت کرے اور اپنی عصمت کی حفاظت کرے۔ ایسی خاتون جس راہ سے چاہے جنت میں داخل ہو۔
دنیا کی ساری دولت سے زیادہ قیمتی شے عفت مآب بیوی ہے۔
❑ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ عورتوں کو اتنے سارے حقوق عطا کرنے والے اسلام میں تعددِ ازدواج کی اجازت کیوں ہے؟ کیا یہ عورتوں پر صریح ظلم نہیں ہے؟ اس سلسلہ کی تفصیلات تو میری متذکرہ کتاب میں دیکھی جا سکتی ہیں مختصراً عرض کروں گا کہ ایک سے زائد شادیوں کی کچھ شرائط کے ساتھ اجازت دیکر دراصل اسلام نے مرد اور عورت کی جسمانی ساخت' ان کی نفسیات اور عملی ضرورت کا پورا لحاظ کیا ہے۔ زنا اور بدکاری کو حرام قرار دے کر تعددِ ازدواج کی قانونی اجازت دینے والا حکیمانہ دین فی الحقیقت دینِ اسلام ہے۔

المختصر میں اپنی بات کو سمیٹتے ہوئے کہوں گا کہ یہ ہیں اسلام کے وہ اجمالی پہلو جنہوں نے مجھے غیر معمولی طور پر متأثر کیا اور میں باقاعدہ اسلام قبول کرنے سے پہلے ہی اس کے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ دراصل اسلام اپنی ساری خوبیوں اور آب و تاب کے ساتھ ہیرے کی طرح آج بھی جگمگا رہا ہے۔ اب یہ ذمہ داری داعیانِ اسلام کی ہے کہ وہ دینِ اسلام کو مخلصانہ طور پر اپنائیں۔ اس طرح وہ اپنے رب کی خوشنودی اور رضا بھی حاصل کر سکتے ہیں اور غریبوں اور مجبوروں کے مسائل بھی حل ہو سکتے ہیں اور انسانیت مادی اور روحانی ترقی کی طرف تیز رفتاری سے آگے بڑھ سکتی ہے۔

●......●......●

ڈاکٹر عطاء اللہ بوگڈان کوپانسکی

(پولینڈ)

اگر ان کی ڈاڑھی کا رنگ بھورا اور آنکھیں نیلی نہ ہوتیں تو پہلی نظر میں میں ڈاکٹر عطاء اللہ بوگڈان کوپانسکی کو ایک افغان مجاہد سمجھتا۔ شلوار قمیص واسکٹ اور پگڑی کے ساتھ ۲۱۔ دسمبر ۱۹۸۷ء کو میں نے انہیں منصورہ کی جامع مسجد میں دیکھا تو ان کی شخصیت اور سراپا نے بے اختیار میری توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ سرخ و سفید متشرع اور متبسم چہرے پر بچوں کی معصومیت رقصاں تھی' جسے اندر کے بے پایاں اخلاص اور ایمانی حرارت نے عجیب سی دلکشی بخش دی تھی۔ چنانچہ میں بے اختیار ان کے قریب گیا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھائے تو انہوں نے گرم جوشی سے مجھے گلے لگا لیا۔ ...... اور اپنا نام بتایا تو میں خوشی سے جھوم اٹھا۔ بحمد للہ مجھے ان کا پہلے ہی سے بھرپور تعارف حاصل تھا۔ میں "تکبیر" کراچی کے حوالے سے پولینڈ کی سالیڈیریٹی تحریک کے ضمن میں ان کے مجاہدانہ کردار سے باخبر تھا۔ ان دنوں وہ جہاد میں عملی شرکت کی خاطر افغانستان آئے ہوئے تھے اور چند روز کے لئے آج ہی منصورہ پہنچے تھے۔ چنانچہ کچھ دیر تک ان سے باتیں ہوئیں اور پھر میں نے انہیں دوسری صبح اپنے گھر پر ناشتے کی دعوت دے دی جسے انہوں نے بخوشی قبول فرما لیا۔

ڈاکٹر عطاء اللہ بوگڈان کوپانسکی اصلاً پولینڈ کے رہنے والے ہیں۔ پی ایچ ڈی ہیں۔ پولینڈ کی ایک یونیورسٹی میں پڑھاتے بھی رہے ہیں۔ وہاں کی تحریک آزادی سالیڈیریٹی میں بھی وہ خاصے سرگرم تھے' لیکن جب انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور افغانستان کی جہاد حریت کی کھلم کھلا حمایت کرنے لگے تو پہلے انہیں جیل میں ڈالا گیا اور بعد ازاں جلاوطن کر دیا گیا۔ چنانچہ آج کل وہ امریکہ کے شہر ٹیکساس میں مقیم ہیں۔

۲۲ دسمبر ۱۹۸۷ء کی صبح ڈاکٹر صاحب میرے گھر ناشتے پر تشریف لائے تو کئی گھنٹوں تک انہوں نے ملاقات کا شرف بخشا۔ ان کی ایمانی کیفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ سراپا اخلاص، سراپا عمل اور دینی غیرت و جوش کا زندہ پیکر ہیں۔ اس کے بعد دو مرتبہ پھر میں نے انہیں کھانے پر بلایا اور ہر ملاقات میں ایمان کو ایک نئی تازگی اور حرارت نصیب ہوئی۔ اسلام کی ہر تعلیم کے حوالے سے ان کا مکمل شرح صدر اور غیر معمولی یکسوئی دیکھ کر خوشی اور حیرت بھی ہوتی اور اپنا عمل و کردار دیکھ کر بار بار شرم بھی محسوس ہوتی۔ پوری اسلامی تاریخ پر ڈاکٹر صاحب کی گہری نظر ہے۔ امید اور یقین ان کی بات بات سے عیاں ہے۔ سنتِ نبویؐ کی پابندی انکا خاص شعار ہے۔ ناشتے کے دوران میں نے کہا" آپ سرخ مرچ نہیں کھاتے، اس لئے آپ کے لئے یورپین ناشتہ (یعنی ڈبل روٹی) کا انتظام کیا گیا ہے" تو کہنے لگے" جس طرز زندگی کو میں کلیتہً ترک کر چکا ہوں، آپ مجھے دوبارہ وہیں لے جانا چاہتے ہیں۔ اب آپ کا کھانا میرا کھانا ہے، آپ کا لباس میرا لباس ہے۔ اسلام اور مسلمان ہی میری برادری ہے"۔ چنانچہ انہوں نے کھانے کی فرشی نشست کو بہت پسند کیا اور اس انداز کی تعریف کرتے رہے۔

ڈاکٹر عطاء اللہ کو پاکستانی ترکوں سے بہت متاثر ہیں۔ لادینیت کے خلاف ان کی دینی بیداری اور جوشِ عمل کی تعریف کرتے رہے۔ افغانستان کے بارے میں ان کا ردِ عمل یہ تھا کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا سورج اسی سرزمین سے طلوع ہوگا اور پوری دنیا کے اندھیروں میں اجالوں کا نقیب بن جائے گا۔ پاکستان کی تحریک اسلامی سے بھی وہ بڑے پُر امید تھے مگر پنجاب یونیورسٹی خصوصاً اسلامک سنٹر (شعبہ اسلامیات) میں پاکستانی طالبات کی بے پردگی پر افسوس کا اظہار کرتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ کم از کم اسلامیات کی طالبات کو پردے کا سخت پابند ہونا چاہئے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کی للہیت اور تقویٰ کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ بنک میں ان کا کوئی اکاؤنٹ نہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ہر اکاؤنٹ میں کسی نہ کسی صورت میں سودی نظام ضرور ملوث ہوتا ہے۔" میں نے بنک میں صرف ایک لاکر لیا ہوا ہے اسی میں اپنی رقوم اور بیوی کا مختصر ساز یور رکھا ہوا ہے"۔

ان کی فلسطینی نژاد اہلیہ قدیم وضع کا برقع اوڑھتی ہیں اور اسی برقعے کو وہ پردے کی روح کے مطابق قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ اس سفر میں وہ بطورِ خاص ملتان گئے اور وہاں سے انہوں نے اپنی اہلیہ کے لئے اسی ساخت کے برقعے حاصل کئے۔ امریکہ واپس جا کر انہوں نے کچھ عرصے بعد مجھے خط میں کسی دوسری نومسلمہ امریکی خاتون کے لئے اسی طرح کے برقع کی فرمائش کی۔ میں نے اندرونِ مزنگ کے ایک بزرگ درزی سے وہ برقع بنوایا اور ڈاکٹر صاحب کو ارسال کیا۔

دینِ اسلام اور اسلامی شعار کے ساتھ ڈاکٹر عطاء اللہ کو پالسکی کی گہری وابستگی کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ امریکہ واپس جا کر انہوں نے مجھے جو خط لکھے ان پر عیسوی تاریخ کے بجائے صرف ہجری تاریخ لکھی ہوئی تھی اور خط کے مندرجات سے ان کی ایمانی حرارت، رجائیت پسندی اور خوش طبعی کا نمایاں اظہار ہوتا ہے۔ ان کے ایک خط کا ترجمہ پیش کرتا ہوں:

ٹیکساس، یو ایس اے

۳ شعبان ۱۴۰۸ھ

پیارے دینی بھائی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

میں ان خوشگوار یادوں کو کبھی نہیں بھلا سکتا جو پاکستان اور افغان مجاہدین کے کیمپوں سے وابستہ ہیں۔ اب بھی جب میں آنکھیں بند کرتا ہوں تو یہ مناظر میری آنکھوں میں گھومنے لگتے ہیں۔ میں پاکستانی بھائیوں کی مہمان نوازی، سادگی اور وسعتِ قلبی سے بڑا متاثر ہوں۔ یہاں امریکہ میں ہر طرف لوگ طرح طرح کے منفی احساسات (COMPLEXES) اور حماقت اور بے حسی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ صنعتی ترقی بے پناہ ہے مگر زندگی بے مقصدیت، اخلاقی زوال، فکری انحطاط اور ہمہ نوع ژولیدگی میں گھر کر رہ گئی ہے۔ اللہ کے فضل سے دارالاسلام پاکستان کی غالب اکثریت نے ابھی تک شریعت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور پاکستان اور افغانستان کے لوگ حیا اور تقویٰ کے تقاضوں سے دستکش نہیں ہوئے اگرچہ مغرب پرستی کی گناہ آلود بیماری کی واضح علامتیں بھی جگہ جگہ نظر آتی ہیں تاہم اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے فضل وکرم سے مجھے یقین ہے کہ ہم امتِ محمدیؐ کے اس عارضی مرض پر قابو

پانے میں کامیاب ہو جائیں گے اور ایک وقت آئے گا کہ رسول اللہ کی سنت کفر' شرک' فواحشات' ظلم' طاغوت اور باطل پر حاوی ہو جائے گی۔ اللہ اپنے اطاعت گزار بندوں کی یقیناً مدد کرتا ہے اور اسلام پوری نوع انسانی کے لئے مکمل ضابطہ حیات بن کر آیا ہے۔

ہماری کوشش ہونی چاہئے کہ ہم امتِ مسلمہ کو مصنوعی حد بندیوں سے نکال کر اتحاد اور اخوت کی لڑی میں پرو دیں۔ اس غرض کے لئے خلافت کا نظام بے حد ضروری ہے اور اس کے بغیر امتِ محمدی ایک پرچم تلے کبھی جمع نہیں ہو سکتی اور اس کے بغیر ہم ہمیشہ اسلام دشمن طاقتوں اور بدعتوں کا شکار بنتے رہیں گے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نظامِ خلافت کے احیا کا مطالبہ کیا جائے جو شریعت کے احکامات کے تحت علمائے حق کی مشاورت سے قائم کیا جائے۔ یہ بات بھی خصوصیت کی حامل ہے کہ جہاد اور دعوت اسلامی نظامِ حیات میں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور شریعت اور خلافت ایک اسلامی ریاست کے دو ستون ہیں جو لوگ اللہ کا پرچم بلند کریں گے اور اس کے راستے میں جان و مال سے جہاد کریں گے وہ ضرور ان کی مدد کرے گا۔

آپ کا بھائی

ڈاکٹر عطاء اللہ بوگڈان کوپالسکی

ڈاکٹر صاحب غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک بیحد لائق انسان ہیں۔ پولش زبان کے علاوہ انگریزی' روسی' لاطینی' یوکرائنی' سربائی' اور سلاوی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ امریکہ میں وہ سہ ماہی اسلامی رسالے "میسج" کے مضمون نگار اور ادارتی عملے سے وابستہ ہیں۔ کینیڈا سے چھپنے والے ایک پولش ہفت روزہ کے مدیران میں شامل ہیں اور انگریزی سے پولش زبان میں دینی لٹریچر کا ترجمہ کرتے ہیں۔

موصوف بے پناہ علم و فضل اور تقویٰ و للّٰہیت کے باوجود بڑے شگفتہ مزاج' خوش کلام اور شفیق انسان ہیں۔ جب میرے گھر آتے بچوں سے گھل مل جاتے۔ اپنے بچوں کا ذکر والہانہ محبت سے کرتے۔ اس وقت تک ان کے دو بیٹے (خالد اور طارق) اور ایک بیٹی سمیہ تھی۔ انکا عزم ہے کہ ان کے سارے بچے دینِ حق کے سپاہی بنیں گے اور امریکہ کو اسلامک سٹیٹ بنانے کی جدوجہد کریں گے۔ ایک روز ایک صاحب کے جواب میں

انہوں نے مسکراتے ہوئے انگریزی میں کہا:

''میں مسلم امریکہ کی اسلامک ری پبلک آف ٹیکساس سے آیا ہوں''۔

میں نے اپنی عادت کے مطابق ڈاکٹر عطاء اللہ کی خدمت میں ایک تفصیلی سوالنامہ پیش کیا جس کے جوابات انہوں نے امریکہ سے ارسال فرمائے۔ان کا ترجمہ ذیل میں دیا جا رہا ہے۔

سوال: میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کا خاندانی پس منظر' آبائی عیسوی نام اور ابتدائی تعلیم و حالات وغیرہ کیا ہیں؟

جواب: میرا پیدائشی نام بوگڈان انطونی کوپالسکی ہے۔قدیم پولش زبان میں بوگ ڈان کے معنی عطاء اللہ ہیں۔بوگ بمعنی خدا کا اور ڈان بمعنی دیا ہوا۔(ہمارے ہاں اس قسم کا نام اللہ دتہ ہے)۔''انطونی'' کا اضافہ میرے نام کے ساتھ اس وقت ہوا جب میں نوزائیدہ بچہ تھا اور مجھے کیتھولک مذہب میں بپتسمہ دیا گیا تھا۔

میں ۸۔مئی ۱۹۴۸ء کو پولینڈ کے علاقہ شمالی سلیشیا کے ایک قصبہ کاٹووائس میں پیدا ہوا۔میرے والدین پولینڈ کے ایک معروف اور معزز قبیلے کوپالسکی سے تعلق رکھتے تھے اور پولینڈ میں رہنے کے باوجود جرمن معاشرت کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔میری والدہ دانجیکسک خاندان سے تعلق رکھتی تھیں جو پولینڈ کے ایک حریت پسند انقلابی خاندان کی حیثیت سے شہرت رکھتا ہے اور جس کے بہت سے افراد نے آزادی کی مختلف تحریکوں میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا ہے۔میرے خاندان کا تعلق رومن کیتھولک چرچ سے ہے۔لیکن اس کے بیشتر افراد اس مذہب کے عقائد کو خیرباد کہہ چکے تھے۔میرے والد کو دوسری عالمگیر جنگ کے دوران جرمنوں نے قیدی بنا لیا۔۱۹۴۴ء میں انہیں رہائی ملی تو وہ برٹش آرمی کے پولش یونٹ میں بھرتی ہو گئے اور ازاں بعد کوئلے کی ایک کان میں ملازم ہو گئے۔آج کل وہ پولینڈ میں ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔میری والدہ زینا باربرا جو بحمد اللہ اب اسلام قبول کر چکی ہیں' کئی برسوں تک نازی جرمنوں کے ٹارچر کیمپوں میں ظلم و

ستم سہ چکی ہیں۔ میرے والد کے دو بھائی روس میں موت کے گھاٹ اتار دیے گئے جبکہ ایک ماموں جرمنوں کے تشدد کا نشانہ بن گئے۔ میری اکلوتی بہن ڈونا تا اقتصادیات میں پی ایچ ڈی ہے وہ ریاضی دان بھی ہے اور پولینڈ کی اکنامک اکیڈمی میں پڑھاتی ہے۔

بحمداللہ میں نے ۱۹۷۴ء میں اسلام قبول کیا۔ ۱۹۷۵ء میں میں نے سلیشین یونیورسٹی کاٹووائس سے ایم اے ہسٹری آنرز کی ڈگری لی اور ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۱ء تک میں اسی یونیورسٹی میں پہلے اسسٹنٹ پروفیسر اور پھر پروفیسر کی حیثیت سے تدریسی فرائض انجام دیتا رہا۔ میں فلسفہ کی اور مذاہب کی تاریخ پڑھانے پر مامور تھا۔ ۱۹۸۹ء میں میں سالیڈیریٹی موومنٹ کے تربیتی کورسوں میں لیکچر دیتا تھا اور اس کی حمایت میں لکھتا بھی تھا۔

سوال: آپ اسلام کی طرف کیسے اور کب آئے؟

جواب: ایک نوعمر طالب علم کی حیثیت سے میں فرانسیسی استعمار کے خلاف الجزائری مسلمانوں کی مسلح جدوجہد سے بہت متاثر ہوا۔ ''اسلام کا یہ پہلا تیر تھا جو میرے سینے میں پیوست ہوا''۔ اس کے بعد مسلمانوں سے میری دلچسپی بڑھتی چلی گئی اور میں نے مختلف اسلامی ملکوں کے بارے میں بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں، مگر یہ کتابیں اسلام کے بارے میں عموماً منفی نوعیت کا جامد تصور پیش کرتی تھیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ کمیونسٹ پروپیگنڈے نے اسلامی ثقافت کا چہرہ دھندلائے رکھا۔ چھ روزہ عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کے کردار نے بھی مجھے سخت الجھاوے میں ڈال دیا۔ میں ''مسلم مذہب'' کو پی ایل او کی انقلابیت، عرب سوشلزم اور ناصرازم کے تناظر میں دیکھتا رہا اور اسلام کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیوں کا شکار ہوگیا۔

اُن دنوں میں پکا مارکسسٹ اور لینسٹ تھا اور چی گویرا کی یاد میں قائم مختلف تربیتی شعبوں میں سرگرمی سے کام کر رہا تھا۔

۱۹۷۱ء میں میری ملاقات سوڈان کے مسلمان طالب علموں سے ہوئی اور انکی وساطت سے مجھ پر اسلام کی اصل خوبیوں کا انکشاف ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ مارکسزم کا مطالعہ بھی گہری تنقیدی نظروں سے کرتا رہا اور آخرکار اس نظام کے بارے میں سارے پردے میری آنکھوں سے ہٹتے چلے گئے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ روسی استعمار دراصل

یورپ کے بدنام زمانہ نوآبادیاتی نظام کا انتہائی جدید اور پرلے درجے کا انسانیت کش ایڈیشن ہے۔ اس دور کے بیشتر یورپی نوجوانوں کی طرح میرا واسطہ بھی ایک بدترین نوعیت کے اخلاقی' سیاسی اور نفسیاتی بحران سے تھا اور میں اپنے آپ کو دیوالیہ مغربی تہذیب اور بے رحم مردم بیزار اشتراکیت کے درمیان خلا میں محبوس پا رہا تھا' چنانچہ اس گھٹن اور حبس کی فضا سے نکلنے کے لئے میں نے مختلف ازموں کا مطالعہ شروع کیا۔ ان میں بدھ ازم' جین ازم' یوگا' انارکزم وغیرہ شامل ہیں مگر ذہن کو کسی طرح آسودگی نہ ملی۔ حق کی پیاس تھی کہ بڑھتی جارہی تھی اور روح تھی کہ اپنی منزل اور مرکز کی جستجو میں ہلکان ہو رہی تھی۔ آخر میرے ضمیر نے آواز دی کہ اسلام کو آزمانا چاہئے کیا عجب کہ یہی سارے دکھوں کا درماں بن جائے۔

اس مقصد کے لئے میں نے ترکی جانے کا عزم کرلیا۔ استنبول پہنچا اور ایک مسجد کے میناروں سے زندگی میں پہلی بار اذان کی آواز سنی تو گویا مبہوت ہو کر رہ گیا۔ آواز اور الفاظ میں وہ کشش تھی کہ میں بے اختیار مسجد کی طرف کھنچتا چلا گیا اور دیگر مسلمانوں کے ساتھ جا کر صف میں کھڑا ہو گیا۔ نماز ختم ہوئی تو میں اسی چھوٹی سی مسجد میں امام صاحب کے پاس پہنچا اور کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔ میری یہ پہلی نماز مغرب کی تھی اس کے بعد اللہ کے فضل سے تاایں دم میں ایک مطمئن و مسرور مسلمان ہوں۔ میں نے مغربی تہذیب کی مادر پدر آزادیوں سے آلودہ معاشرت سے مکمل نجات پالی ہے اور بحمد للہ میری زندگی ہر طرح کے خوف و خطرے سے آزاد و بے نیاز ہے۔ اسلام نے مجھے خلوص' استقلال اور مقصدیت عطا کی جبکہ شریعت نے میرے بے ہنگم طرز حیات کو نظم و ضبط بخشا اور میری زندگی ایک بھرپور معنویت سے روشناس ہوئی۔ اس پر مزید خوش قسمتی یہ ہوئی کہ میری شادی ایک باعمل راسخ العقیدہ فلسطینی خاتون سے ہو گئی جس نے میرے ایمان اور عمل کو پختہ بنانے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔

سوال: اسلام کو سمجھنے کے لئے آپ نے کون کون سی کتابوں اور مصنفین کا مطالعہ کیا؟

جواب: قرآن و سنت کے بعد میں جن علماء کرام کی کتابوں سے بہت متاثر ہوا ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: امام غزالیؒ' مولانا تھانویؒ' نورسیؒ مولانا مودودیؒ' مریم جمیلہ'

مولانا ابو الحسن علی ندوی' علامہ اقبالؒ اور پروفیسر عبدالحمید صدیقی۔

سوال: آپ نے اسلام اور عیسائیت میں کیا نمایاں فرق محسوس کیا ہے؟

جواب: اسلام پوری انسانیت کے لئے ایک مکمل ضابطۂ حیات اور بے عیب راہِ ہدایت ہے جبکہ اس کے برعکس عیسائیت ایک ایسا معجون مرکب ہے جس میں اگرچہ کہیں کہیں حضرت مسیح کی مسخ شدہ تعلیمات بھی مل جاتی ہیں لیکن دراصل اس پر یونانیوں کی مشرکانہ رسومات اور یہودیوں کی ریو مالیت حاوی ہو گئی ہے اور یہ کسی بھی انسان میں مثبت نوعیت کی کوئی تبدیلی لانے میں قطعی ناکام ثابت ہوئی ہے۔

سوال...... آپ کے اسلام قبول کرنے پر آپ کے دوست احباب اور خاندان کا ردِ عمل کیا تھا؟

جواب...... مختلف لوگوں کا مختلف ردِ عمل تھا۔ کچھ دوستوں اور عزیزوں کے طرزِ عمل میں کوئی فرق نہ آیا۔ انہوں نے مجھے مسلمان کی حیثیت سے خوشدلی سے قبول کیا۔ کچھ نے نفرت اور بیزاری کا رویہ اختیار کیا مگر میں نے ایسے لوگوں کی پروا نہ کی۔ میں کافروں اور مشرکوں کی رائے کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ کچھ ایسے خوش بخت بھی ہیں جنہوں نے میری تقلید کی اور اسلام قبول کر لیا۔ مثال کے طور پر چند ہی سال کے بعد والدہ بھی حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئیں۔

سوال...... پولینڈ کی کمیونسٹ حکومت کا طرزِ عمل آپ کے ساتھ کیسا رہا؟

جواب...... قبولِ اسلام سے قبل ۱۹۶۸ء میں مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ قصور یہ تھا کہ میں نے ملٹری اکیڈمی میں چیکوسلواکیہ پر روسی حملے کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کرایا تھا۔ اس وقت میری عمر بیس سال تھی اور میں ملٹری اکیڈمی کا کیڈٹ تھا۔ مجھے ایک سال کی سزائے قید دی گئی اور اکیڈمی سے نکال دیا گیا۔

دوسری مرتبہ ۸۲-۱۹۸۱ء میں مجھے ایک خطرناک ملک دشمن اور کمیونزم کے شدید مخالف کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ ان دنوں میں نے تقریباً ڈیڑھ سال تک روس' بلغاریہ' البانیہ اور یوگوسلاویہ میں مسلمانوں کے بنیادی حقوق کی تباہی پر تنقید کی تھی اور افغان مجاہدین کے انقلابی کردار کی کھل کر حمایت کرتا رہا تھا۔ چنانچہ مجھے جیل میں ڈال دیا گیا جہاں سے بین الاقوامی احتجاج اور بندرگاہ میں ہڑتالوں کے بعد جنرل جروزلسکی کی

حکومت نے مجھے ایک سال کے بعد رہا کیا۔ چنانچہ اس کے بعد جب مَیں نے دیکھا کہ پولینڈ میں ایک باعمل مسلمان کی حیثیت سے زندگی گزارنا مشکل ہو گیا ہے اور میری باپردہ بیوی کے لئے شرعی زندگی محال ہو گئی ہے تو مَیں نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے سفارت خانے سے رجوع کیا اور مجھے اور میرے خاندان کو ۱۹۸۳ء میں امریکہ کی شہریت مل گئی۔ آج کل مَیں ٹیکساس میں مقامی مسلمانوں کی معیت میں رہ رہا ہوں۔ آرلنگٹن اسلامک کونسل کی مجلس شوریٰ کا رکن بھی ہوں اور ایک صحافی اور مترجم و مضمون نگار کی حیثیت سے برسرِ عمل ہوں۔

سوال...... آپ کے نزدیک عہدِ حاضر میں تبلیغ اسلام کا بہترین طریقہ کیا ہے؟

جواب...... دورِ حاضر میں میرے نزدیک تبلیغ اسلام کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہر مسلمان ذاتی حیثیت میں اسلام کا عملی نمونہ بنے اور نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کو ساری جزئیات سمیت اپنی زندگی کا حصہ بنا لے۔ اجتماعات' وڈیو' تصاویر' ٹی وی وغیرہ محض آلات کی حیثیت رکھتے ہیں ان سے بھی کام لینا چاہئے' مگر اصل اہمیت ذاتی کردار کی ہے اور یہی دوسروں کو متاثر کرتا ہے۔ میری رائے میں اس کے علاوہ کتابیں' مختلف تحریریں اور بالمشافہ ملاقاتیں بھی اسلام کے پیغام کو دوسروں تک منتقل کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔

سوال...... موجودہ عالمِ اسلام پر آپ کا کیا تبصرہ ہے؟ اسلام کے مستقبل کے بارے میں آپ کیسی رائے رکھتے ہیں؟

جواب...... سارے اسلامی ملکوں میں استعماری دور کی یادگاریں عام ہیں یعنی مغرب پرست' زبانی کلامی مسلمان جن کی برین واشنگ یا تو کمیونسٹوں نے کی ہے یا پھر وہ یورپی تہذیب کے اندھے مقلد ہیں اور وہاں سے آنے والی ہر آواز کو وحی و الہام کی طرح قبول کرتے ہیں۔ مغربیت کے یہ بے مغز مقلد دراصل اپنے استعماری آقاؤں کی صدائے بازگشت اور اسلامی ملکوں میں لادین یورپی طاقتوں کے ایجنٹ ہیں۔ مَیں انہیں ''مشرق کے بیمار لوگ'' بلکہ ''اسلام کے سچے دشمن'' قرار دیتا ہوں۔ یہ نفس کے بندے اور پیٹ کے پجاری ہیں اور رسمِ نکاح اور چند تہواروں کے سوا اسلام سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلامی دُنیا کی یہ تصویر بڑی ہولناک ہے۔ مگر الحمد للہ کہ احیائے اسلام کی تحریکیں بھی جگہ جگہ سر اٹھا رہی ہیں اور ان کے خوف سے متذکرہ مغرب پرست بااقتدار طبقہ سہما سکڑا ہوا

نظر آ رہا ہے اور دینی تحریکوں کو کچلنے کی سازشیں بھی کر رہا ہے۔ لیکن مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ آخر کار مغرب پرستوں کو شکست ہوگی اور مشرق کے وہ لاکھوں مسلمان جنہوں نے شعوری طور پر اسلامی تعلیمات کو قبول کر کے اپنی زندگیوں پر نافذ کیا ہے وہ ''مغرب'' کے تازہ دم پر جوش مسلمانوں کے ساتھ مل کر جہان تازہ کی تخلیق کریں گے اور احیائے اسلام کا سورج لادینیت کے دبیز بادلوں کا پردہ چاک کر کے دنیا بھر کو منور کر دے گا۔ اس سلسلے میں میں پاکستان سے خاص قسم کی امید رکھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ پاکستانیوں کی اسلام سے محبت اور وابستگی پوری دنیا کے مسلمانوں کو ایک نیا ولولہ عطا کرے گی اور وہ وقت دور نہیں جب مستقبل کی تاریخ ''ریاست ہائے متحدہ اسلام'' سے روشناس ہوگی۔ تب نوع انسانی انصاف، سچی آزادی، امن وسکون، اور احترام ووقار سے بہرہ یاب ہوگی اور ظلم و طاغوت کے اندھیرے چھٹ جائیں گے۔ اس کے لئے شرط یہ ہے کہ تقویٰ، علم، دعوت اور جہاد کا راستہ اپنایا جائے اور جہالت کے اندھیروں میں بھٹکتے ہوئے انسانوں تک دین کا پیغام پہنچایا جائے۔

●......●......●

محترمہ فاطمہ
(چیکوسلواکیہ)

سوال: آپ کا تعارف اور قبولِ اسلام کی وجوہات؟

جواب: میرا مسیحی نام مونیکا تھا۔ اسلامی نام فاطمہ۔ ۲ ستمبر ۱۹۴۳ء کو چیکوسلواکیہ میں پیدا ہوئی تھی لیکن بعد میں مغربی جرمنی میں رہائش اختیار کر لی۔ وہیں ۲۱ اپریل ۱۹۶۳ء کو بیس برس کی عمر میں ایک ترک عالم استاذ عمر کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔

جہاں تک قبولِ اسلام کی وجوہ کا تعلق ہے تو بچپن ہی سے میرا ذہن غور و فکر کا عادی رہا ہے۔ ہر معاملے کی عقلی توجیہ کرنا اور حالات و واقعات کی فلسفیانہ بنیادیں تلاش کرنا میرا پسندیدہ عمل تھا۔ اس پہلو سے جب اپنے آبائی مذہب عیسائیت پر غور کیا تو ذہن کو شدید دھچکے لگے اور یہ مذہب مجھے قطعی غیر عقلی و غیر منطقی نظر آیا۔ گھبرا کر دوسرے مذاہب مثلاً یہودیت اور ہندومت کا مطالعہ شروع کیا مگر دماغ نے انہیں بھی قبول نہ کیا۔ گوہرِ مراد اگرچہ ہاتھ نہ آیا مگر میرا وجدان کہتا تھا کہ خالقِ کائنات نے انسان کو ازلی ہدایت سے محروم نہیں رکھا اور میں اس ہدایت کو ایک روز ضرور پا لوں گی۔

یہ وہ ایام تھے جب میرے والد چیکوسلواکیہ کو خیر باد کہہ کر مغربی جرمنی میں آباد ہو گئے تھے۔ مغربی جرمنی میں لاکھوں کی تعداد میں ترک باشندے کام کرتے ہیں۔ مذاہب کے معاملے میں میرا تجسس مجھے ان کے قریب لے گیا اور مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ یہ لوگ اپنے خاندانی و معاشرتی نظام کے اعتبار سے یورپ کے اندھیروں میں روشنیوں کے مینار دکھائی دیتے تھے اور یہیں سے میں ان کے مذہب اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنے پر مجبور ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کے بارے میں میرا ابتدائی تاثر کچھ

زیادہ اچھا نہیں تھا' کیونکہ میرے جاننے والے مسلمانوں میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو محض موروثی طور پر اسلام سے منسوب تھے یا جو اسلام کی ایسی بگڑی ہوئی شکل سے وابستہ تھے جو مشرق میں رواج پا گئی ہے۔ اس کے باوجود میں ان کے بلند اخلاق سے متاثر ہوئی اور میں نے اسلام کو سمجھنے کے لیے اس کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا۔ اسلام کے بارے میں کتب کا مطالعہ کیا۔ قرآن کا ترجمہ پڑھا اور ایک فاضل ترک استاد عمر سے طویل گفتگوئیں کیں ۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اسلام کی اصل تعلیمات اور مسلمانوں میں مروّج رسوم و رواج ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں اور اسلام بعینہٖ وہی مذہب ہے جس کی تلاش میرے وجدان اور روح کو ایک عرصے سے تھی۔

میں نے قرآن میں پڑھا کہ اللہ جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا دل اسلام کے لئے کھول دیتا ہے۔ فوراً ہی مجھے احساس ہوا کہ اسلام مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور اس کی بے میل' پاکیزہ تعلیمات میری عقل اور فطرت کو اپیل کرنے لگی ہیں۔ میرے لئے سب سے زیادہ پُرکشش اسلام کا مثالی معاشرتی نظام تھا جو بلاتمیز رنگ و نسل سب انسانوں میں برابری اور مساوات پر استوار ہے۔ پھر روحانی و دنیاوی معاملات میں بے پناہ آسانی اور رخصت اور دونوں کے تقاضوں کو توازن و اعتدال کے ساتھ انجام دینے کی ترغیب۔ علم و عقل کی یہ کارفرمائی کہ طلب علم مرد و عورت سب پر فرض کر دیا گیا۔ پھر عورت کو جو بلند مرتبہ اور عزت و احترام دیا گیا اس سے تو میری روح جھوم جھوم اٹھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خدا اور انسان کے درمیان بلاواسطہ تعلق۔ ان سب چیزوں نے میرے دل و دماغ کو مسحور کر دیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فلسفی نہیں تھے' اللہ کے سچے پیغمبر تھے۔ اسلام ان کے ذہن کی پیداوار نہیں' بلکہ وحی الٰہی کا نتیجہ ہے۔ یہی وہ واحد راستہ ہے جس کی طرف اللہ نے شروع ہی سے انسانوں کی رہنمائی کی ہے اور آج بھی صرف اسی مذہب میں یہ حوصلہ ہے کہ زمانے کے مسائل کا سامنا کر سکے اور دکھی انسانیت کے زخموں پر مرہم رکھے۔ اس یقین کے فوراً بعد میں نے اسلام قبول کر لیا۔

سوال: آپ کے قبولِ اسلام کا ردِ عمل آپ کے خاندان اور حلقۂ تعارف میں کیا ہوا؟

جواب: ردِ عمل مختلف نوعیت کا تھا۔ والدہ بے اختیار رو پڑیں اور مجھے اس ارادے

سے باز رکھنے کے لئے کہا "میری خواہش کا احترام اسلام قبول کرنے سے زیادہ اہم اور باسعادت ہے"۔ میری دادی نے اسلام کے بارے میں مجھ سے گفتگو کی اور اعلان کر دیا کہ یہ ایک عمدہ دین ہے' اسے قبول کر کے مونیکا نے غلط حرکت نہیں کی۔ میری ایک سہیلی نے میرے اس عمل کو گناہ قرار دے کر مجھ سے قطع تعلق کر لیا۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے برملا استہزا اور طنز کا رویہ اختیار کیا' مگر مَیں نے کسی کے منفی ردِ عمل کا کوئی اثر نہ لیا۔ مَیں نے یہ فیصلہ خوب سوچ سمجھ کر کیا تھا اور اس سے بال برابر پیچھے ہٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

سوال: آپ کے خیال میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا بہترین طریقہ کیا ہے؟

جواب: میرے خیال میں اشاعتِ اسلام کا آسان طریقہ جو ایک مبلّغ یا طالب علم اختیار کر سکتا ہے' وہ یہ ہے کہ اپنے عمل اور کردار سے عمدہ مثال پیش کرے...... اخلاقی اعتبار سے انحطاط پذیر یورپین معاشرے کا ایک فرد جب کسی شخص کو ایثار' شرافت' دیانت' بے غرضی اور انسانی احترام کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھے گا تو یقیناً متاثر ہو گا اور اسلام کے قریب آنے کی کوشش کرے گا' لیکن افسوس کہ اسلامی دنیا اس اہم معاملے کی طرف سے غافل ہے اور باعمل و باکردار مسلمان بننے کی کوششیں نہیں کی جاتیں۔ فروغ اسلام کے راستے میں یہی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

اشاعتِ اسلام کے لئے دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ مسلمان کسی تبلیغی اور اشاعتی اسلامی جماعت سے رہنمائی حاصل کریں اور اہلِ علم کے تعاون سے بھرپور علمی و دینی معلومات سے مالا مال ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں اسلام کے لئے حالات بہت ہی سازگار ہیں۔ اس میں ایک عالمگیر دین بننے کی ساری صلاحیتیں موجود ہیں اور وہ اس دور کے انسان کی تمام روحانی و مادّی ضرورتیں پوری کر سکتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسلام کے پیروکار اس موقع سے کس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں؟

●......●......●

پروفیسر ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی

(بھارت)

ذیل کا انٹرویو پروفیسر الیف الدین ترابی نے مرتب کیا تھا اور ''اردو ڈائجسٹ'' کے جنوری ۱۹۷۸ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ ضیاء الرحمٰن اعظمی پہلے رابطۂ عالم اسلامی میں اہم ذمہ داریاں نبھا رہے تھے لیکن آج کل وہ مدینہ یونی ورسٹی کے کلیۃ الشریعہ میں پروفیسر کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

میں نے ان کا تذکرہ پہلی بار مارچ ۱۹۷۷ء کے ''فاران'' میں پڑھا۔ ماہر القادری نے اپنے سفرِ حجاز کے رپورتاژ میں ان سے مکہ مکرمہ میں ملاقات کا ذکر کیا تھا۔ وہ ہندو مذہب چھوڑ کر حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے تھے۔ میرے دل میں اس خوش نصیب نوجوان سے ملاقات کی تڑپ پیدا ہوگئی جسے اللہ تعالیٰ نے کفر کی تاریکیوں سے نکال کر اسلام کی روشنی کی طرف بڑھنے کی توفیق بخشی اور جب خوش بختی مجھے سرزمینِ حجاز لے آئی تو اس تڑپ نے کشاں کشاں اس نوجوان تک پہنچا دیا۔ میرے سامنے ایک باوقار نوجوان کھڑا تھا۔ گندمی رنگت، نکلتا ہوا قد، چہرے پر سلیقے سے ترشی ہوئی خوبصورت ڈاڑھی، عینک کے شیشوں کے پیچھے ذہانت کی لو سے چمکتی ہوئی آنکھیں، سعادت کے نور سے روشن کشادہ پیشانی، گفتگو میں متانت اور ٹھہراؤ، اور دل و دماغ دونوں کو یکساں اپیل کرنے والی علمیت کا حسین امتزاج۔ یہ تھے ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن۔ ڈاکٹر صاحب نے قبولِ اسلام کے بعد ابتدائی اسلامی تعلیم جنوبی ہند کی ایک درس گاہ میں حاصل کی۔ پھر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلہ مل گیا۔ یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر جامعۃ الملک عبدالعزیز مکہ مکرمہ سے ماجستر

(ایم۔اے) کیا۔ پھر جامعۃ الازہر قاہرہ سے پی ایچ ڈی کیا۔ آج کل آپ رابطہ عالم اسلامی میں ایک ذمہ دار منصب پر فائز ہیں۔

پہلے سے طے شدہ وقت کے مطابق مَیں ان کا انٹرویو لینے ان کے دولت کدے پر پہنچا تو انہوں نے خندہ پیشانی سے میرا استقبال کیا۔ مجھے اپنے مطالعے کے کمرے میں لے گئے جہاں ایک طرف الماریوں میں منتخب کتابیں بڑے سلیقے سے رکھی تھیں۔ زیادہ تر عربی زبان کی بلند پایہ کتب تھیں۔ کچھ اردو کی بھی تھیں۔

چائے کے ساتھ ساتھ گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔ مَیں نے سب سے پہلا سوال ان کے خاندانی پس منظر اور ابتدائی زندگی کے بارے میں کیا۔

''مَیں ۴۴ سال پہلے ۱۹۴۳ء میں اعظم گڑھ (بھارت) کے قریب ایک قصبے میں ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوا''۔ ڈاکٹر صاحب نے ماضی کے دریچے وا کرتے ہوئے کہا ''میرے والد برادری کے چودھری تھے۔ ہمارا کلکتے میں خاصا وسیع کاروبار تھا۔ مَیں نے مڈل تک تعلیم اپنے قصبے کے مڈل اسکول میں حاصل کی پھر شبلی کالج اعظم گڑھ میں، جس کے ساتھ ہائی کلاسز بھی تھیں، داخلہ لیا۔ یہیں تحریکِ اسلامی سے متعارف اور متاثر ہوا اور زندگی کی گاڑی کا رُخ ہی بدل گیا''۔

''تحریکِ اسلامی سے کس طرح متعارف اور متاثر ہوئے''؟ مَیں نے پوچھا۔

۱۹۵۹ء میں میٹرک کا امتحان دینے کے بعد گھر آیا تو ایک صاحب نے مجھے سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب ''دینِ حق'' کا ہندی ترجمہ پڑھنے کے لئے دیا۔ کتابوں کے مطالعے سے مجھے فطری رغبت تھی چنانچہ بڑے شوق سے کتاب پڑھی اور اس مطالعے نے میرے دل کی دنیا ہی بدل ڈالی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ مَیں اب تک مہیب تاریکیوں میں کھویا ہوا تھا، اب وہ تہہ در تہہ تاریکیاں چھٹ رہی ہیں اور پہلی بار روشنی کی کرنیں دکھائی دے رہی ہیں۔ اس احساس نے میرے دل میں اس روشنی سے ہمکنار ہونے کی تڑپ پیدا کر دی۔ مَیں نے اس کتاب کو کئی بار پڑھا اور ہر بار گرمئ شوق دو آتشہ ہوتی گئی۔ مَیں نے فیصلہ کیا کہ اس مصنف کی ہندی میں ترجمہ شدہ تمام کتابیں حاصل کر کے پڑھوں گا''۔

''کیا آپ نے اس سے پہلے ہندو مذہب کا باقاعدہ مطالعہ بھی کیا تھا؟'' میرا اگلا

سوال تھا۔

"میں نے ہندو مذہب کی باقاعدہ تعلیم تو حاصل نہیں کی تھی البتہ ایک ہندو گھرانے میں پیدائش اور اپنے گرد و پیش کے شدید مذہبی ماحول کی وجہ سے میں ہندو مذہب کے لئے شدید عصبیت رکھتا تھا اور اس کے سوا کسی دوسرے مذہب کو برسرِ حق نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن اسلام کا مطالعہ شروع کیا اور میرے سامنے اسلام کا یہ دعویٰ آیا کہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامَ۔ یعنی صرف اسلام ہی دینِ حق ہے تو میں نے ایک بار پھر ہندو مذہب کو نئے سرے سے سمجھنے کی کوشش کی۔ اس مقصد کے لئے اپنے کالج کے سنسکرت کے لیکچرار کی طرف رجوع کی۔ وہ گیتا اور ویدوں کے بہت بڑے عالم تھے لیکن مجھے مطمئن نہ کر سکے۔ امرِ واقعہ تو یہ ہے کہ ہندو مذہب کے دیومالائی نظامِ عقائد اور ناقابلِ فہم رسوم میں اطمینانِ قلب کے لئے سرے سے کوئی سامان ہی موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں کے نوجوان طبقے میں اپنے مذہب کے دیومالائی تصورات اور عجیب و غریب رسوم کے متعلق سخت بے اطمینانی پائی جاتی ہے۔ اگر ان لوگوں سے رابطہ قائم کیا جائے اور ان کی ذہنی سطح اور مخصوص پس منظر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے لٹریچر تیار کر کے ان میں پھیلایا جائے تو ان میں دعوتِ اسلامی کے پھیلنے کے بڑے مواقع ہیں۔ اس کا مجھے ذاتی تجربہ ہے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد جب میں کالج گیا تو میرا یہ معمول تھا کہ تفریح کے پیریڈ میں مولانا مودودی کی ہندی میں ترجمہ شدہ کتابوں کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے دوست ہندو طلبہ کو ایک علیحدہ جگہ بٹھا کر سید مودودی کی مشہور کتاب "دینیات" پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔ وہ نہ صرف یہ کہ بڑی توجہ اور دلجمعی سے سنا کرتے بلکہ اس سلسلے میں ان کی دلچسپی اس قدر زیادہ تھی کہ اگر بوجوہ میرے مسلمان ہونے کا فوری انکشاف نہ ہوتا تو شاید وہ سب لوگ بھی میرے ساتھ ہی قبولِ اسلام کا اعلان کرتے۔"

"مطالعۂ کتب سے باقاعدہ قبولِ اسلام تک کا مرحلہ کتنے عرصے میں اور کس طرح طے ہوا"؟ میں نے دریافت کیا۔

"چھٹیوں کے بعد کالج کھلا تو میرے اندر مزید اسلامی کتابوں کا مطالعہ کرنے کا شوق فراواں ہو چکا تھا۔ خوش قسمتی یہ تھی کہ مجھے سید مودودی کی ہندی میں ترجمہ شدہ کتابیں

آسانی سے مل جاتیں۔ اس مطالعے کے دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ سید مودودی نے ۱۹۵۳ء میں صرف اسلامی نظام کے قیام کے لئے سزائے موت کو خندہ پیشانی سے لبیک کہا تھا اور رحم کی اپیل کی پیشکش یہ کہہ کر مسترد کر دی تھی کہ میرے لئے اللہ کی راہ میں شہید ہونا ظالموں سے رحم کی اپیل کرنے کے مقابلے میں بدرجہا بہتر ہے۔ اس واقعہ نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ پہلے میں یہ سمجھتا تھا کہ محض رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لئے موت کو خندہ پیشانی سے لبیک کہنے والے لوگ صرف تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ اب پتہ چلا کہ اسلام میں آج بھی ایسے عظیم لوگ موجود ہیں جو راہِ حق میں ہنسی خوشی جان دے دینے کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی سعادت سمجھتے ہیں۔ اس انکشاف نے مجھے اسلام کے اور زیادہ قریب کر دیا"۔

ڈاکٹر صاحب چند لمحے خاموش رہے پھر کہنے لگے "اسی دوران میں مجھے خواجہ حسن نظامی کا ہندی ترجمۂ قرآن مجید پڑھنے کا موقع ملا۔ اللہ نے مزید مہربانی یہ کی کہ شبلی کالج ہی کے ایک استاد نے جو سید مودودی کی فکر سے گہرے متاثر تھے اور جنہوں نے ایک ہفتہ وار حلقۂ درس بھی قائم کر رکھا تھا' اسلام کے لئے میرا ذوق وشوق دیکھ کر مجھے اپنے حلقۂ درس میں شامل ہونے کی خصوصی اجازت دے دی۔

سید مودودی کی کتابوں کے مسلسل مطالعے اور حلقۂ درسِ قرآن میں باقاعدگی سے شمولیت نے میرے قبولِ اسلام کے جذبے کو دوآتشہ کر دیا۔ مگر بعض خدشات دل ودماغ میں ابھرا ابھر کر میرے اس روحانی سفر کی راہ میں حائل ہو جاتے اور میں ٹھٹھک کر رہ جاتا۔ سب سے زیادہ پریشانی یہ بھی تھی کہ میں دوسرے اہلِ خاندان کے ساتھ کس طرح نباہ کرسکوں گا۔ خصوصاً چھوٹی بہنوں کے مستقبل کے متعلق بہت پریشان تھا۔ مگر اسی دوران میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ مجھے نتائج کی پروا کئے بغیر فوراً اسلام قبول کر لینے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ ہوا یہ کہ ایک دن انہی استاد صاحب نے جن کے حلقۂ درس میں میں بلاناغہ شامل ہوتا تھا' سورہ عنکبوت کا درس دیا۔ پہلے انہوں نے یہ آیت پڑھی:

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اتَّخَذَتْ بَيْتًا
وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ. (آیت ۴۱)

"جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا کارساز بنا رکھا ہے ان کی مثال مکڑی کی سی ہے جو گھر بناتی ہے اور سب سے بودا گھر مکڑی کا ہوتا ہے کاش وہ لوگ اس حقیقت سے باخبر ہوتے"۔

پھر اس کی تشریح کرتے ہوئے بتایا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسرے تمام سہارے مکڑی کے جالے کی طرح کمزور اور بے بنیاد ہیں۔ ان کی اس تشریح اور دل میں کھب جانے والے انداز بیان نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور مَیں نے بغیر کسی تاخیر کے اسلام قبول کرنے اور تمام سہاروں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کا سہارا پکڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی مجلس میں' مَیں نے اپنے استاد سے کہا میں فوری طور پر اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں۔ ساتھ ہی ان سے نماز سے متعلق کوئی مناسب کتاب بھی مانگی۔ انہوں نے مجھے ادارہ "الحسنات" رام پور کی آسان ہندی زبان میں شائع کردہ کتاب "نماز کیسے پڑھیں" ؟ دی جس سے مَیں نے چند گھنٹوں کے اندر اندر نماز سیکھ لی۔ مغرب کے قریب دوبارہ استاد کے پاس پہنچا۔ ان کے ہاتھ پر باقاعدہ اسلام قبول کر لیا اور انہی کی اقتدا میں مغرب کی نماز ادا کی۔ یہ میری سب سے پہلی نماز تھی اور اس کی کیفیت مَیں کبھی بھول نہ سکوں گا"۔

"کیا آپ نے اسلام قبول کرتے ہی اس کا اعلان بھی کر دیا یا اسلام قبول کرنے اور اس کے انکشاف اور اعلان کے درمیان کچھ عبوری دور بھی گزرا" ؟ مَیں نے دریافت کیا۔

قبولِ اسلام' انکشاف اور اعلان کے درمیان کئی ماہ کا وقفہ رہا۔ حلقہ بگوشِ اسلام ہونے کے فوراً بعد مجھے ایک زبردست ذہنی کشمکش سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ دراصل اس عملی کشمکش کا نقطۂ آغاز تھا جو چند ماہ بعد میرے قبولِ اسلام کے انکشاف اور اعلان کے بعد شروع ہونے والی تھی۔ اس ذہنی کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرا سلسلۂ تعلیم منقطع ہو کر رہ گیا۔ میرا سارا وقت یا تو سید مودودی کی کتابوں کے مطالعے میں گزرتا یا ان کتابوں کے منتخب حصے اپنے ساتھی طلبہ کو سنانے میں۔ نماز کے وقت مَیں چپ چاپ گھر سے نکل جاتا اور کسی الگ تھلگ جگہ جا کر نماز ادا کرتا۔ یہ سلسلہ کوئی چار ماہ تک جاری رہا۔ لیکن میری یہ سرگرمیاں زیادہ مدت تک پوشیدہ نہ رہ سکیں۔ مَیں اعظم گڑھ میں اپنے ایک عزیز کے ہاں رہتا تھا۔ اس کا لڑکا میرا دوست اور ہم راز تھا۔ اس نے جو مجھ میں یہ تبدیلیاں دیکھیں تو

پہلے خود مجھے سمجھانے کی کوشش کی اور کہا کہ اس طرح اسلام قبول کرنے کے بعد میں اپنے والدین اور عزیز واقارب سے کٹ جاؤں گا لیکن جب مجھے "ناقابلِ اصلاح" پایا تو والد صاحب کو کلکتے میں خط لکھ دیا کہ فوراً اعظم گڑھ پہنچیں ورنہ لڑکا ہاتھ سے نکل جائے گا۔ والد صاحب خط ملتے ہی پہنچ گئے اور پھر مجھے بتدریج ان حالات سے دوچار ہونا پڑا جن کی توقع تھی اور جن کے لئے میں اپنے آپ کو ذہنی طور پر پہلے سے تیار کر چکا تھا"۔

"کیا آپ ان حالات کی تفصیل بتانا پسند کریں گے"؟ میں نے پوچھا۔

"تفصیلات تو میری زیرِ تصنیف کتاب "گنگا سے زمزم تک" میں آرہی ہیں البتہ مختصراً چند باتیں بیان کئے دیتا ہوں۔ والد صاحب کلکتے سے اعظم گڑھ پہنچے تو انہوں نے ابتدا میں براہِ راست مجھے کچھ کہنے کے بجائے میرے حالات کا جائزہ لیا۔ پھر یہ سمجھتے ہوئے کہ شاید کسی جن یا بھوت سے متاثر ہو گیا ہوں' مختلف پنڈتوں اور پروہتوں سے میرا علاج کرانے لگے لیکن کوئی جن یا بھوت ہوتا تو جھاڑ پھونک سے چلا جاتا۔ یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔ چنانچہ جو چیز بھی پنڈتوں اور پروہتوں سے لا کر دیتے' میں بسم اللہ پڑھ کر کھا لیتا۔ بہرحال جب وہاں میرا علاج نہ ہو سکا تو والد صاحب نے مجھے اپنے ساتھ کلکتے لے جانے کا فیصلہ کیا تاکہ تحریکِ اسلامی کے افراد سے جو ان کے نزدیک اس "بیماری" کی اصل جڑ تھے' رابطہ برقرار نہ رہ سکے' لیکن بھلا یہ رابطہ کہیں اس طرح کے حیلوں بہانوں سے ٹوٹ سکتا تھا۔ چنانچہ کلکتے پہنچتے ہی وہاں کے تحریکی رفقا سے رابطہ قائم ہو گیا اور میرا سب سے بڑا یعنی نماز پڑھنے کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ والد صاحب کو علم ہوا تو وہ بھونچکے رہ گئے۔ انہوں نے فوراً مجھے الٰہ آباد میں مقیم اپنے ایک عزیز کے ہاں بھیج دیا۔ یہاں اب جھاڑ پھونک کے ساتھ ساتھ مختلف پنڈتوں اور پروہتوں نے مجھے سمجھانا بجھانا بھی شروع کر دیا۔ کہنے لگے "ہندو مذہب اسلام کے مقابلے میں زیادہ مکمل مذہب ہے"۔ لیکن جب میں نے ہندو مذہب کے بارے میں سوالات کئے تو وہ جواب نہ دے سکے' زچ ہو کر بولے:

"اچھا اگر ہندو مذہب چھوڑنا ہی ہے تو پھر مسلمان بننے کی بجائے عیسائی بن جاؤ کیونکہ مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی اور اس کے مقابلے میں عیسائیوں کی فارغ البالی سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ عیسائیت اسلام کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر مذہب ہے۔"

میں نے جواب میں کہا ''دراصل میں مسلمانوں سے نہیں بلکہ اسلام سے متاثر ہو کر مسلمان ہو رہا ہوں''۔

آخر کچھ عرصہ کی جھاڑ پھونک اور بحث مباحثے کے بعد مجھے لاعلاج قرار دے دیا گیا اور والد صاحب دوبارہ اپنے گھر لے آئے۔ گھر والوں کا پہلے ہی رو رو کر برا حال ہو چکا تھا۔ مجھے مکان کے ایک کمرے میں رکھا گیا اور تحریکی رفقا سے رابطہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔ ساتھ ہی والدہ صاحبہ' بہنوں اور دوسری رشتہ دار خواتین نے مجھے اسلام سے باز رکھنے کے لئے اپنے طور پر رونے دھونے اور منت سماجت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ادھر جھاڑ پھونک بھی جاری رہی' لیکن یہاں ہر چیز بے اثر ثابت ہو رہی تھی۔ تنگ آ کر گھر والوں نے سخت قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھ پر دباؤ ڈالنے کے لئے ان سب نے بھوک ہڑتال کر دی۔ میرے لئے یہ بڑا ہی سخت اور صبر آزما مرحلہ تھا۔ والدین اور بہن بھائی کوئی بھی کھانے کی کسی چیز کو ہاتھ تک نہ لگاتا۔ وہ میری نظروں کے سامنے بھوک سے نڈھال پڑے سسکتے رہے لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے استقامت بخشی اور اسلام سے باز رکھنے کا یہ حربہ بھی کارگر نہ ہوا۔

اس کوشش ناکام کے بعد گھر والوں نے ایک اور حربہ آزمایا۔ ایک مولوی صاحب کو لے آئے جنہوں نے مجھے بتایا کہ اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی شخص اپنے والدین کی زندگی میں ان کی مرضی اور اجازت کے بغیر اسلام قبول کرنے کا اعلان یا کوئی بھی ایسا دوسرا کام کرے جس سے اس کے قبول اسلام کا اظہار ہوتا ہو' اس لئے جب تک آپ کے والدین زندہ ہیں' آپ اپنے اسلام کو دل میں رکھیں اور نماز اور دوسرے اسلامی احکام پر عملدرآمد سے سختی سے اجتناب کریں۔ مولوی صاحب کی یہ بات مجھے کچھ عجیب سی لگی لیکن اس وقت مجھے اس سلسلے میں مزید کچھ زیادہ معلومات نہیں تھیں اس لئے میں نے مولوی صاحب کے اس مشورے کو واقعی اسلام کا ایک حکم سمجھتے ہوئے سر تسلیم خم کر دیا۔ اس پر گھر اور برادری میں خوب خوب خوشیاں منائی گئیں۔ چند دن بعد انکشاف ہوا کہ ان مولوی صاحب کا تعلق ایک ایسے فرقے سے ہے جو خود اپنے آپ کو مسلمانوں کے سواد اعظم سے علیحدہ سمجھتا ہے اور یہ کہ ان کے اس فتوے کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

یہ پتہ چلتے ہی مَیں نے اپنے معمولات کو دوبارہ اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کا فیصلہ کرلیا اور باقاعدگی سے پانچوں وقت کی نماز پڑھنے لگا۔ ساتھ ہی ہندو مذہب سے کھلے بندوں اظہار برأت شروع کر دیا۔ چند دن بعد مَیں ایک مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا کہ مقامی ہندوؤں کے ایک گروہ نے مسجد میں گھس کر نمازیوں پر حملہ کر دیا۔ مَیں نے یہ صورتِ حال دیکھی تو فیصلہ کرلیا کہ اب قبولِ اسلام کے باقاعدہ اعلان کا وقت آ چکا ہے۔ چنانچہ مَیں نے مسجد ہی میں سرِ عام اپنے قبولِ اسلام کا اعلان کر دیا اور واضح کیا کہ اب میرا ہندو مت یا ہندوؤں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ ہندوؤں کے لئے ایک کھلا چیلنج تھا اور مجھے ان کی طرف سے اس چیلنج کا جواب دینے کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ تھی۔

گھر پہنچا تو گھر والوں کا رنگ ہی بدلا ہوا تھا۔ ان کی وہ خوشیاں جو چند دن پہلے میرے اسلام کو پوشیدہ رکھنے کے فیصلے سے پیدا ہوئی تھیں' کافور ہو چکی تھیں اور سب کے چہرے غم سے نڈھال ہو چکے تھے۔ لیکن بحمد للہ ایسی کسی بھی چیز سے میرے پائے استقامت میں لغزش نہ آئی۔ ادھر والد صاحب نے یہ سمجھ کر کہ اب مجھے اسلام سے باز رکھنا ان کے بس کا روگ نہیں' میرا معاملہ ایک ہندو تنظیم کے سپرد کر دینے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ تنظیم اپنی انتہا پسندی اور اسلام دشمنی کے لئے بُری طرح بدنام ہے۔ اب ابتلا اور مصائب کا ایک نیا اور نہ ختم ہونے والا بہت سخت اور صبر آزما سلسلہ شروع ہو گیا اور اگر اللہ مجھے استقامت نہ دیتا تو شاید مَیں ان حالات کا مقابلہ نہ کر سکتا''۔

''ان مصائب کی کی تفصیل بتانا پسند کریں گے؟'' مَیں نے پوچھا

''مجھے ہندوؤں کی جس تنظیم کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا' وہ مذہب کے معاملے میں انتہا پسند ہی نہیں تشدد پسند بھی ہے۔ اس تنظیم کے مقاصد میں دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی شامل ہے کہ ان مسلمانوں اور عیسائیوں کو ہر ممکن طریقے سے دوبارہ ہندو بننے پر مجبور کیا جائے' جن کے آباؤ اجداد ہندو تھے۔ ظاہر ہے جن لوگوں کی انتہا پسندی کا یہ عالم ہو' وہ ایک ہندو نوجوان کے قبولِ اسلام کو کس طرح ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر سکتے تھے۔ ان کے ہتھے چڑھنے کے بعد کسی شخص کے سامنے صرف دو ہی راستے کھلے رہ جاتے ہیں ارتداد یا موت ...... تیسرے کسی راستے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے مجھے

بالکل ہی معجزانہ طور پر اس آزمائش سے بچالیا' لیکن جن دوسری آزمائشوں سے گزرنا پڑا وہ بھی کچھ کم صبر آزما نہ تھیں"۔

بعض مخلص دوستوں کے پُرزور اصرار پر جو مجھے انتہا پسند تنظیم کے حوالے کر دینے کے منصوبے سے آگاہ تھے' مجھے شہر سے باہر واقع ایک دوست کے گھر ایک ایسے کمرے میں پناہ گزین ہونا پڑا جہاں مویشی باندھے جاتے تھے۔ مذکورہ انتہا پسند تنظیم کو میری یوں اچانک گمشدگی کی اطلاع ملی تو اس کے کارکن میری تلاش میں پورے شہر میں پھیل گئے۔ شہر کی کوئی مسجد' کسی معروف مسلمان کا مکان' کوئی راستہ اور کوئی اڈہ ایسا نہ تھا جہاں پہرے نہ بٹھا دیئے گئے ہوں۔ مجھے اس ناکہ بندی کی برابر اطلاع ملتی رہی۔ یہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہا۔ یہ رمضان المبارک کا مقدس مہینہ تھا۔ سحری و افطاری اور نماز کی ادائیگی کا اہتمام بھی اسی مویشی خانے میں ہوتا۔ تقریباً ایک ہفتہ اس پناہ گاہ میں اسی حال میں گزرا۔ پھر اس تنظیم کے کارکنوں نے وہاں سے مایوس ہو کر اپنی تلاش کا رخ دوسرے شہروں کی طرف پھیر دیا۔ چنانچہ ایک روز رات کے پچھلے پہر بھیس بدل کر ایک ساتھی کے ہمراہ ریلوے اسٹیشن پہنچا اور ایک دوسرے بڑے شہر میں پہنچ گیا۔ وہاں کے تحریکی رفقا کو میرے قبولِ اسلام کے بارے میں پہلے سے پتہ تھا۔ دراصل میں انہی کی دعوت پر وہاں گیا تھا۔ مجھے ان لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور میری اپنی خواہش پر ایک دینی درسگاہ میں داخل کروا دیا لیکن ابھی وہاں تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ اس ہندو تنظیم کے کارکن آ وارد ہوئے اور وہاں رہنا ممکن نہ رہا۔ چنانچہ ان رفقا نے مجھے بدایوں کے ایک دور افتادہ قصبے کی ایک درس گاہ میں بھیج دیا۔ اس درس گاہ کا انتخاب اس اعتبار سے مناسب تھا کہ یہ علاقہ اس ہندو تنظیم کی رسائی سے باہر معلوم ہوتا تھا۔ وہاں میں نے دینی تعلیم کے حصول کے ساتھ ساتھ اردو زبان بھی سیکھنا شروع کر دی کیونکہ اس کے بغیر محض ہندی زبان کے بل بوتے پر اردو زبان میں موجود وسیع اسلامی لٹریچر پر حاوی ہونا ممکن نہ تھا۔ ابھی مدرسے میں بمشکل ڈیڑھ سال کا عرصہ گزرا ہوگا کہ اس تنظیم کے کارکن میری تلاش میں وہاں بھی پہنچ گئے۔ یہ محض ایک معجزہ تھا کہ ان کے آنے کی اطلاع مجھے پہلے مل گئی تھی اور وہاں سے نکل جانے میں آسانی رہی۔

اب میری منزل جنوبی بھارت کا صوبہ مدراس تھا۔ وہاں کی مشہور دینی درسگاہ "دارالاسلام" کے اربابِ حل وعقد میرے بارے میں پہلے سے جانتے تھے۔ انہوں نے مجھے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہاں تقریباً چھ سال مجھے پوری یکسوئی اور دلجمعی سے دینی تعلیم حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔

یہاں تقریباً پانچ سال گزارنے کے بعد میں نے کچھ عرصے کے لئے اپنے آبائی قصبے میں جانے کا فیصلہ کیا۔ وہاں مَیں نے اپنے انہی محسن کے ہاں قیام کیا' جنہوں نے مجھے سب سے پہلے سید مودودی کی ایک چھوٹی سی کتاب (دینِ حق) کے ذریعے اسلام سے روشناس کرایا تھا۔ لوگوں کو میری آمد کی خبر ہوئی تو وہ جوق در جوق مجھے ملنے کے لئے ٹوٹ پڑے۔ حیران کن بات یہ تھی کہ ان میں ہندو بھی تھے۔ اس کی وجہ مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔ وہ یہ کہ انہوں نے جب دیکھا کہ اس قدر مصائب اور شدائد کے باوجود میں نے اسلام پر استقامت دکھائی ہے اور مجھے کوئی لالچ اور خوف راہِ حق سے منحرف نہیں کر سکا تو ان کی نفرت عقیدت میں بدل گئی۔ اسی دوران میں عیدالفطر آ گئی۔ مسلمانوں نے اعلان کر دیا کہ عید کی نماز بھی میں ہی پڑھاؤں گا اور خطبہ بھی مَیں ہی دوں گا۔ اس اعلان کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ قرب وجوار کے ہزاروں مسلمان بڑے بڑے جلوسوں کی شکل میں عیدگاہ میں جمع ہونے لگے بلکہ عیدگاہ کے چاروں طرف ہزاروں ہندو بھی میری تقریر سننے کے لئے پہنچ گئے۔ وہ اس بات پر بے حد حیران تھے کہ مسلمانوں نے ایک ایسے شخص کو جو ابھی چند سال پہلے ہندو تھا' اپنی مذہبی پیشوائی اور امامت کے منصب پر کس طرح فائز کر لیا۔ وہ اسلام کے اس پہلو اور پھر میری تقریر سے حد درجہ متاثر ہوئے"۔

"اپنے والدین سے بھی ملے ہوں گے"؟ میں نے دریافت کیا۔

"جی ہاں اور خدا کا شکر ہے ان کے رویے میں بھی خاصی تبدیلی آ چکی تھی۔ بلکہ مَیں سمجھتا ہوں کہ اگر انہیں مجھ جیسے حالات سے دوچار ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو بعید نہ تھا کہ معمولی توجہ سے وہ بھی حلقہ بگوشِ اسلام ہو جاتے"۔

ڈاکٹر صاحب اپنے ابتلا ومصائب کی روداد بیان کر چکے تو مَیں نے پوچھا "آپ یہاں سرزمینِ حجاز تک کیسے پہنچے؟"

ڈاکٹر صاحب کی آنکھیں سرزمینِ حجاز کے ذکر سے چمک اٹھیں جیسے دل میں امڈتی ہوئی ساری عقیدت و محبت ان میں سمٹ آئی ہو۔ ''دارالاسلام'' مدراس سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد مَیں نے مزید تعلیم کے لئے جامعہ اسلامیہ مدینہ میں داخلہ لینے کا فیصلہ کیا جو بآسانی مل گیا۔ چار سال کے بعد وہاں سے فارغ التحصیل ہوا تو جامعۃ الملک عبدالعزیز مکہ المکرمہ میں ماجستر (ایم اے) میں داخلہ لے لیا۔ ماجستر میں میرا تحقیقی مقالہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کردہ احادیث کی نوعیت اور حیثیت سے متعلق تھا اور اس کا عنوان تھا ''ابوہریرہ فی ضوء مرویاتہ فی جمال شواہدہ وانفرادہ'' یہ امتحان بھی امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور رابطۂ عالمِ اسلامی سے منسلک ہو گیا۔ چنانچہ اب رابطہ میں ایک ذمہ دار منصب پر فائز ہوں۔ رابطہ میں رہتے ہوئے بھی مَیں نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ حال ہی میں جامعہ ازہر قاہرہ سے اعزاز کے ساتھ پی ایچ ڈی کیا ہے۔ پی ایچ ڈی میں مَیں نے اپنے تھیسس (THESIS) میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے عدالتی پہلو پر تحقیق کی ہے اور اس کا عنوان ہے ''اقضیۃ الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' یہ دونوں تحقیقی مقالے عنقریب کتابی صورت میں شائع کئے جا رہے ہیں''۔

''ڈاکٹر صاحب! اسلام قبول کرنے کے بعد آپ نے کیا محسوس کیا؟'' میرا اگلا سوال پہلے سوالوں سے ذرا ہٹ کر تھا۔

''مَیں نے محسوس کیا کہ مَیں یکایک اندھیروں سے نکل کر روشنی میں اور اتھاہ گہرائیوں سے اٹھ کر بلندیوں میں پہنچ گیا ہوں۔ مجھے اپنے مقصدِ زندگی کا پہلی بار صحیح شعور حاصل ہوا۔ مَیں نے یہ بات بھی بڑی شدت سے محسوس کی کہ اسلام اور موجودہ مسلمان معاشرے میں بہت بڑا فرق ہے اور غالباً یہی بات غیر مسلموں کے قبولِ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اگر ہم دعوتِ حق کا دائرہ غیر مسلموں تک وسیع کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس فرق کو ختم کرنا ہوگا ورنہ غیر مسلموں میں تبلیغ دعوت کا کام ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہے''۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ کو اسلامی نظامِ حیات کے کس پہلو نے سب سے زیادہ متاثر کیا؟'' مَیں نے اس ضمن میں ایک اور سوال پوچھا۔

"یوں تو اسلامی نظام حیات کے ہر پہلو کی کیفیت:

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا ست

کی سی ہے لیکن پھر بھی یہی کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اسلام کے رشتۂ اخوت و مواسات نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ آج اس گئے گزرے دور میں بھی اسلام کے ان تابناک اصولوں کی برکت سے مسلمان معاشرے میں انما المومنون اخوۃ کا جذبہ جاری وساری ہے۔ اسی طرح آج بھی مسلمان معاشرے میں معاشرتی مساوات کی جو روح کارفرما ہے اس کی نظیر کسی اور معاشرے میں نہیں ملتی۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ کے جس ارشادِ ربّانی نے دورِ رسالت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم میں عربی نخوت کے بت کو پاش پاش کر دیا تھا اور بلال حبشیؓ اور سلمان فارسیؓ کو ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کا ہم پلہ بنا دیا تھا' اس کے اثرات اس گئے گزرے دور میں بھی مسلمان معاشرے پر بڑے صاف اور واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں"۔

ڈاکٹر صاحب! عصرِ حاضر میں تحریکِ اسلامی کے سب سے بڑے داعی اور مفکرِ اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودی کے لٹریچر سے متاثر ہو کر حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے ہیں۔ اس لیے میرا اگلا سوال اسی مناسبت سے تھا۔ میں نے پوچھا "ڈاکٹر صاحب! آپ تحریکِ اسلامی کے کن پہلوؤں سے بہت زیادہ متاثر ہوئے"؟

"تحریکِ اسلامی میں مجھے سب سے زیادہ تحریک کے داعی سید مودودی کے ذاتی کردار نے متاثر کیا ہے۔ راہِ حق میں عزیمت و استقامت کی جو نظیر سید مودودی نے قائم کی' اس کی مثال ماضی قریب میں بمشکل ہی ملے گی۔ محض دعویٰ کرنا اور بات ہے لیکن پھانسی کی سزا ملنے پر بھی پائے استقامت میں لغزش نہ آنے دینا اور باطل کے ساتھ سمجھوتے کی پیش کش کو پائے استحقار سے ٹھکرا دینا کوئی معمولی بات نہیں۔

انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

مولانا محترم نے جو اسلامی لٹریچر تخلیق کیا ہے' میرا ایمان ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے مسلمانوں میں الحاد و لادینیت اور دہریت کو کبھی فروغ نہیں مل سکتا بلکہ میں یہ کہوں گا کہ اگر مولانا کا تخلیق کردہ یہ عظیم الشان لٹریچر موجود نہ ہوتا تو اب تک مسلمانوں کا جدید

تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ اسلام سے بالکل بیگانہ ہو چکا ہوتا۔

تحریکِ اسلامی کی دوسری چیز جس نے مجھے متاثر کیا' اس کی مثالی تنظیمی ہیئت ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ جماعتِ اسلامی کڑے سے کڑے حالات میں بھی اپنی تنظیمی ہیئت کو بطریقِ احسن برقرار رکھنے میں کامیاب رہی ہے۔ یہ بات مسلمانوں کی کسی دوسری تنظیم میں نہیں۔

تحریکِ اسلامی کی تیسری چیز جس نے مجھے متاثر کیا' اس کی وسعتِ ظرف ہے۔ یہ تحریکِ اسلامی کا بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کو فقہی مسلکوں کی بنیاد پر آپس میں الجھنے کی بجائے اختلافِ مسلک کے باوجود اقامتِ دین کی جدوجہد میں ایک دوسرے کے دوش بدوش چلنا سکھایا ہے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ تحریکِ اسلامی نے مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان محاذ آرائی کو ختم کرنے اور آپس میں رواداری کے جذبہ کو فروغ دینے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج اس جماعت کی صفوں میں ہمیں مختلف فقہی مسالک سے تعلق رکھنے والے مسلمان اپنے اپنے مسلک پر چلتے ہوئے بھی اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد میں قدم سے قدم ملائے چلتے دکھائی دیتے ہیں۔

تحریکِ اسلامی کی چوتھی چیز جس نے مجھے متاثر کیا ہے' یہ ہے کہ اس نے دنیا کے مختلف حصوں میں لاکھوں کی تعداد میں ایسے افراد کو تیار کیا ہے جو نہ صرف یہ کہ اسلام کا صحیح فہم اور شعور رکھتے ہیں بلکہ اسلامی نظام کے قیام کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد سمجھ کر اس کے لئے اپنی ہر متاع نچھاور کر دینے کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی آرزو سمجھتے ہیں۔ جنہیں کسی طاقت سے دبا کر اور کسی قیمت سے خرید کر اپنے موقف سے دستبردار نہیں کیا جا سکتا۔ پھر یہ لوگ عصرِ حاضر میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سرگرمِ عمل متخالف تحریکوں کو بھی پوری طرح سمجھتے ہیں اور ان کا ہر میدان میں مقابلہ کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ ان کی اکثریت ان نئے تعلیم یافتہ لوگوں پر مشتمل ہے جن کے بارے میں بجا طور پر یہ خدشہ تھا کہ فرنگی نظامِ تعلیم کی بدولت وہ اپنے دین' تہذیب اور جداگانہ تشخص سے بیگانہ ہو کر اسلام دشمن قوتوں کے ہاتھ میں آلہ کار بن جائیں گے"۔

"جماعتِ اسلامی کے علاوہ آپ دنیائے اسلام کی اور کون سی اسلامی تحریک سے

متاثر ہیں''؟ میں نے پوچھا۔

''جماعتِ اسلامی کے بعد مجھے سب سے زیادہ مصر کی اخوان المسلمون نے متاثر کیا ہے۔ جماعتِ اسلامی اور اخوان المسلمون میں بظاہر کوئی انتظامی ربط موجود نہیں لیکن مقصد کے لحاظ سے دونوں تنظیموں میں گہرا ارتباط موجود ہے۔ کیونکہ ان دونوں تحریکوں کا منبع ایک (کتاب وسنت) ہی ہے۔ پھر ان دونوں تحریکوں کی پشت پر سید مودودی' سید قطب' محمد قطب اور دوسرے مفکرین کا عظیم لٹریچر موجود ہے۔ میرے خیال میں دنیائے اسلام میں احیائے دین کی باقی تحریکیں بھی انہی دونوں تحریکوں سے بالواسطہ یا بلا واسطہ کسی نہ کسی حد تک متاثر ہیں۔ اس لئے امید کی جاتی ہے کہ مستقبل قریب میں یہ دونوں تحریکیں ایک عالمگیر اسلامی تحریک کے قیام کی راہ ہموار کریں گی''۔

ملتِ اسلامیہ کو درپیش سب سے بڑا چیلنج کون سا ہے''؟ میں نے ایک اور سوال پوچھا۔

''موجودہ دور میں ملتِ اسلامیہ کو درپیش سب سے بڑا چیلنج'' ڈاکٹر صاحب کہنے لگے'' وہ مختلف افکار و نظریات اور ازم ہیں جو گزشتہ صدی کے نصفِ آخر اور موجودہ صدی کے نصفِ اول میں خالص مادہ پرستانہ بنیادوں پر کام کر رہے ہیں۔ آج کی دنیا کا ایک بڑا حصہ انہی ملحدانہ افکار و نظریات کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ اگرچہ یہ نظریات نوعِ انسانی کو ذہنی استقرار اور قلبی سکون فراہم کرنے میں ناکام رہے ہیں اور ان کے نتیجے میں انسان کے مسائل اور مصائب میں بھیانک اضافہ ہوا ہے اور اب دنیا ان سے اکتا چکی ہے' لیکن اس کے باوجود انہیں ایک خاص مقصد کے تحت ایک منظم طریقے سے عالمِ اسلام میں پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور بدقسمتی سے انہیں مسلمانوں میں پھیلانے کے لئے خود مسلمانوں ہی میں سے ایجنٹ مل گئے ہیں''۔

''اس چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کی کوئی صورت ہے''؟ میں نے پوچھا:

''میرے خیال میں اس صورتِ حال سے پریشان ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ اسلام کسی انسان کا نہیں بلکہ اللہ کا اتارا ہوا دین ہے اور خود ساختہ افکار و نظریات اس کے مقابلے میں زیادہ عرصے تک ٹھہر نہیں سکتے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمانان

ارباب فکر و نظر اس چیلنج سے اسلام کی روشنی میں عہدہ برآ ہونے کے لئے میدان میں آجائیں اور ان گمراہ کن افکار و نظریات کے مقابلے میں اسلام کو پیش کریں۔ اگر ایسا ہو جائے تو مجھے یقین ہے کہ یہ ملحدانہ افکار و نظریات اسلام کے مقابلے میں ریت کی دیوار کی طرح بے بنیاد ثابت ہوں گے۔ میں اس سلسلہ میں مفکرِ اسلام سیّد ابوالاعلیٰ مودودی اور تحریکِ اسلامی سے وابستہ دوسرے مفکرین کے تخلیق کردہ لٹریچر کے حوالے سے یہ کہوں گا کہ بلاشبہ یہ لٹریچر اپنے اندر اس چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے، لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے دانشور اور اہلِ قلم ان کتابوں میں دیے گئے رہنما خطوط کی روشنی میں مزید لٹریچر تیار کریں تاکہ ہمارے لئے زندگی کے ہر میدان میں اسلام کی روشنی میں مکمل رہنمائی کا سامان موجود رہے''۔

مسلمان دانشوروں اور اہلِ قلم حضرات کی تصانیف کی بات چلی تو میں نے پوچھا

''ڈاکٹر صاحب! کیا آپ خود اپنی تصانیف کے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گے؟''

''اب تک میری چھ تصانیف مکمل ہو چکی ہیں یا زیرِ تکمیل ہیں۔ پہلی کتاب ''گنگا سے زمزم تک'' اردو زبان میں ہے۔ اس کتاب میں مَیں اپنے قبولِ اسلام کے حالات' واقعات اور تاثرات بیان کر رہا ہوں۔ اس میں بیسویں صدی کی احیائے اسلام کی تحریکوں کا ذکر بھی ہوگا اور اسلام اور ملتِ اسلامیہ کے خلاف داخلی و خارجی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا بھی۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں اس دَور کی ممتاز عالمی اسلامی شخصیتوں کا تذکرہ بھی آئے گا۔

دوسری کتاب ''قرآن کے سایہ تلے'' ہندی زبان میں ہے اور اس کتاب کو ہندو نوجوانوں میں ان کے مزاج کی مناسبت سے دعوتِ اسلامی کی توسیع کے لیے لکھا ہے۔ یہ کتاب ماہنامہ ''کانتی'' دہلی میں قسط وار شائع ہو چکی ہے اور اب بہت جلد کتابی صورت میں منصۂ شہود پر آ رہی ہے۔

تیسری کتاب ''ننگی تلواروں کے سائے میں'' اردو زبان میں ہے۔ اس میں قرنِ اول سے لے کر موجودہ دور تک کے ان اصحابِ عزیمت کا ذکر ہے جنھوں نے اپنی زبان و قلم اور جان و مال سے راہِ حق میں جہاد کی تابناک مثالیں قائم کی ہیں۔ اس کتاب سے

جہاں راہِ حق میں جہاد کرنے والوں کے لئے نقوشِ راہ واضح ہوتے ہیں وہاں یہ ناقابلِ انکار حقیقت بھی ثابت ہوتی ہے کہ صرف اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جس کا دامن تاریخ کے ہر دور میں اصحابِ عزیمت واستقامت کی متاعِ گرانمایہ سے مالا مال رہا ہے۔

چوتھی کتاب "الدراسۃ فی ادیان الہند" میں ہندوستان کے چار مذاہب ہندومت، بدھ مت، جین مت اور سکھ مت کا علمی اور تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ چاروں مذاہب بعض اختلافات کے باوجود اپنی موجودہ صورت میں بہت سی باتوں میں مشترک ہیں اور ان کی بنیادیں بعض ایسے دیومالائی عقائد وتصورات اور بے مقصد مذہبی رسوم پر کھڑی ہیں جنہیں عقلِ سلیم گوارا نہیں کر سکتی۔ یہ کتاب بھی جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ کے ماہانہ مجلہ میں قسط وار شائع ہو رہی ہے۔

پانچویں کتاب "ابوہریرہ فی ضوء مرویاتہ فی شواہدہ وانفرادہ" ہے۔ یہ دراصل میرا ماجستر (ایم اے) کا مقالہ ہے جو تقریباً سات سو صفحات پر مشتمل ہے۔ دین کی اساس کتاب وسنت پر قائم ہے اور حدیث سے صرفِ نظر کر کے احکامِ قرآنی کی روح تک پہنچنا اور ان کے مطابق عمل کرنا ناممکن ہے۔ مخالفینِ اسلام نے مسلمانوں کا تعلق ان کے دین سے منقطع کرنے کے لئے دین کی اس دوسری اساس یعنی حدیث کو ایک باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت اپنی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا ہدف بنایا ہے اور بدقسمتی سے انہیں اپنے عزائم کی تکمیل کے لئے خود مسلمانوں میں سے بعض آلۂ کار (منکرینِ سنت) مل گئے۔ ان لوگوں کے طرف سے احادیث کی صحت پر مختلف زمانوں میں مختلف پہلوؤں سے جو اعتراضات کئے گئے ہیں، ان میں سے ایک بڑا اعتراض ابوہریرہؓ کی روایت کردہ احادیث کے حوالے سے کیا جاتا ہے کہ غزوہ تبوک کے (۹ھ) کے موقع پر ایمان لانے والے حضرت ابوہریرہؓ نے صرف تین سال (حضورؐ کی وفات تک) کے عرصے میں ساڑھے پانچ ہزار کے قریب احادیث کس طرح روایت کی ہیں جبکہ وہ درمیان میں کچھ عرصے کے لئے یمن کے قاضی بھی رہے اور دربارِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ان کی حاضری کی مدت مشکل سے تین سال بنتی ہے، حالانکہ بعض دوسرے صحابہ کرام سے جو دربارِ رسالت میں بیس بیس سال سے بھی زیادہ عرصے تک حاضر رہے، بمشکل چند سو احادیث

مروی ہیں۔ لہذا ثابت یہ ہوا کہ احادیث کا بیشتر حصہ اپنی روایات کے اعتبار سے ناقابلِ اعتبار ہے۔ یہ احادیث کی صحت پر بڑا سخت حملہ ہے۔ میں نے اپنی کتاب میں حضرت ابوہریرہؓ کے حوالے سے احادیثِ رسول پر کئے جانے والے ان اعتراضات کا اور محدثینِ کرام کی طرف سے ان کے جوابات کا جائزہ لیا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ اپنی روایت کردہ احادیث میں تنہا ہیں یا یہ احادیث دوسرے صحابہ کرامؓ سے بھی روایت ہوئی ہیں اور پھر اس کے بعد دیکھا ہے کہ صرف حضرت ابوہریرہؓ کتنی احادیث کے راوی ہیں اور نقدِ حدیث کے مختلف معیاروں پر ان احادیث کی کیا حیثیت ہے؟

میری چھٹی کتاب ''اقضیۃ الرسول'' ہے۔ یہ دراصل میرا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جو ۷۲۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہ فیصلے بیان کئے گئے ہیں جو حضور نے اپنی ۲۳ سالہ پیغمبرانہ زندگی کے دوران سربراہِ مملکت اور قاضی کی حیثیت سے صادر فرمائے اور جو کتاب اللہ کے بعد اسلامی قانون کا سب سے بڑا ماخذ بھی ہیں اور مرجع بھی۔ یہ کتاب بھی جلد شائع ہو جائے گی''۔

ڈاکٹر صاحب اپنی تصانیف کا ذکر کر چکے تو میں نے ان سے پوچھا ''آپ آئندہ کس موضوع پر لکھ رہے ہیں؟''

میں ہندی زبان میں اسلام کے بنیادی عقائد اور اسلامی نظامِ حیات کے مختلف پہلوؤں کو ایک دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) کی صورت میں خالص علمی انداز میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہی پہلوؤں سے ہندومت' بدھ مت' جین مت اور سکھ مت کا تقابلی مطالعہ بھی کروں گا' کیونکہ میرے نزدیک ہندوؤں کی اسلام سے دوری کا' دوسری بہت سی باتوں کے علاوہ ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان کے سامنے اسلام کو خود ان کی زبان میں اور ان کی مخصوص ذہنی افتاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے پیش کرنے کی بہت کم کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں جماعتِ اسلامی ہند کے شائع کردہ ہندی لٹریچر کے علاوہ کوئی اور قابلِ ذکر چیز بمشکل ہی ملتی ہے۔ یہ لٹریچر خاصی مقدار میں ہونے کے باوجود کافی نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے اگر ہندوؤں کے سامنے ان کی مخصوص ذہنی افتاد کو سامنے رکھتے ہوئے خود ان کی اپنی زبان میں اسلام کو وسیع پیمانے پر پیش کیا جائے تو ہندوؤں میں اسلام کی

اشاعت کے خاصے مواقع پیدا ہو سکتے ہیں۔ خصوصاً اس لئے کہ اب ہندوؤں کا نوجوان طبقہ ہندومت کے دیومالائی عقائد اور رسم و رواج سے سخت غیر مطمئن ہوتا جا رہا ہے۔ وہ ذہنی سکون کی تلاش میں ہندومت کو چھوڑ کر کسی اور طرف جانا چاہتا ہے۔ اگر ہم اسلام کو خود ان کی زبان میں ان کی ذہنی سطح کے مطابق ان کے سامنے پیش کریں تو شاندار نتیجہ نکل سکتا ہے۔ یہی اس کتاب کے لکھنے کا بنیادی محرک ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کا ایک سبب اور بھی ہے۔ بھارت میں ہندی زبان کے سرکاری اور تعلیمی زبان قرار دیئے جانے کے بعد مسلمانوں کے لئے ناگزیر ہو گیا ہے کہ وہ ہندی زبان میں زیادہ سے زیادہ لٹریچر تخلیق کرنے کا اہتمام کریں ورنہ اندیشہ ہے کہ وہاں خود مسلمانوں کی آئندہ نسلیں بھی بتدریج اسلام سے بیگانہ ہوتی چلی جائیں گی"۔

ڈاکٹر صاحب گزشتہ دنوں دس سال کے بعد پہلی بار ہندوستان گئے تھے۔ ان کے اس سفر کا مقصد اپنے اعزا و اقارب سے ملنا اور ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی موجودہ حالت کا جائزہ لینا تھا۔ میں نے اگلا سوال اسی حوالے سے کیا اور ان سے اس دورے کے تاثرات دریافت کئے۔

"تقریباً دس سال بعد میں دوبارہ ہندوستان گیا تو میں نے ہندوستان کو کئی پہلوؤں سے مختلف پایا۔ سب سے اہم پہلو ہندو مسلم تعلقات کا ہے کیونکہ ہندوؤں میں اسلام کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں اس چیز کو بنیادی کردار ادا کرنا ہے۔ ہندوؤں میں اسلام سے دوری کا بڑا سبب مسلمانوں سے ان کی نفرت اور دوری رہا ہے' جس کا باعث کچھ تو ان کا اپنا تعصب تھا اور کسی حد تک خود مسلمانوں کا طرز عمل بھی۔ مسلمانوں سے اپنی شدید نفرت کی وجہ سے وہ اسلام کے زندگی بخش نظام کو قریب سے دیکھ ہی نہیں سکے اور ہمیں یہ بات تسلیم کرنا ہو گی کہ خود مسلمان بھی انہیں پوری طرح متاثر نہ کر سکے۔ وہ نہ تو انہیں اسلام کی دعوت صحیح طور پر پیش کر سکے اور نہ اپنے طرز عمل سے اس بات کی شہادت دے سکے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کو ذلت کی کن پستیوں سے اٹھا کر عظمت کی کن بلندیوں پر فائز کر سکتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ ہندوؤں میں کئی انتہا پسند تنظیمیں مثلاً ہندو مہاسبھا' جن سنگھ' راشٹریہ سیوک سنگھ وغیرہ پیدا ہو گئیں جو اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کو اپنی زندگی کا سب سے

بڑا مقصد سمجھتی ہیں کہ گزشتہ نصف صدی میں ان تنظیموں نے ہندوستان سے اسلام اور مسلمانوں کو ختم کرنے کے لئے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ انہوں نے یہ سب کچھ اعلانیہ کیا۔ کانگرس کی طرح دوستی کے پردے میں نہیں لیکن اب میں ہندوستان گیا تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اب ان میں سے بعض کے رویئے اور طرزِ عمل میں ایک خوشگوار تبدیلی آچکی ہے۔ خصوصاً جن سنگھ ایسی متعصب اور راشٹریہ سیوک سنگھ جیسی انتہا پسند تنظیموں کا رویہ بہت حد تک بدل چکا ہے۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ جب بھارت کی سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی نے اپنے مخالفین کو ظلم اور جبر و تشدد کا نشانہ بنا کر جیلوں میں ٹھونسنا شروع کر دیا تو اکثر ایسا ہوا کہ جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس کے لیڈر اور کارکن اور تحریک اسلامی کے قائدین اور کارکن ایک ہی جیل' بلکہ ایک ہی کمرے میں ٹھونس دیئے گئے۔ یوں جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس کے لیڈروں کو ایک عرصے تک تحریکِ اسلامی کے قائدین اور کارکنوں کو قریب سے دیکھنے اور ان کی وساطت سے اسلام کو اس کے صحیح رنگ میں سمجھنے کا موقع ملا...... اسلام کی دعوت ان کے سامنے اصل رنگ میں پیش کی گئی اور ساتھ ہی اپنے طرزِ عمل سے اس کی شہادت دی گئی تو اس نے اپنا اثر دکھایا۔ نتیجہ یہ کہ جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس کی اسلام اور مسلمانوں سے دشمنی اب رواداری میں بدل چکی ہے۔ اب ان کا رویہ معاندانہ کی بجائے خیر خواہانہ ہو چکا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی تبدیلی ہے جو ان جماعتوں کے رویئے اور طرزِ عمل میں آئی ہے۔

اب تو یہاں تک دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض اوقات ان لوگوں کی طرف سے تحریک اسلامی کے رہنماؤں کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ ان کے مندروں میں آکر ان کے اجتماعات سے خطاب کریں اور ان کے سامنے اسلام کو اس کے اصل رنگ میں پیش کریں۔ چنانچہ انہی دنوں کی بات ہے کہ امیر جماعتِ اسلامی ہند مولانا محمد یوسف نے جن سنگھی رہنماؤں کی دعوت پر احمد آباد جا کر ان کے مندر میں درسِ قرآن بھی دیا اور اسلامی نظامِ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر خطاب بھی کیا۔ اسی دوران نماز کا وقت آیا تو انہوں نے مندر ہی میں اذان دے کر اپنے احباب اور رفقا کے ساتھ نماز با جماعت ادا کی۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اسلام کے سلسلے میں افہام و تفہیم کی یہ کوششیں جاری رہیں تو انشاء اللہ یہ لوگ

اسلام سے قریب سے قریب تر آتے جائیں گے اور کعبے کو اس صنم خانہ سے کتنے ہی پاسبان مل جائیں گے"۔

ایک اور سوال کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے بتایا "میرا یہ دورہ انتہائی کامیاب رہا۔ بھارت میں، میں پچیس دن ٹھہرا اور یہ عرصہ شمالی ہندوستان سے جنوبی ہندوستان تک مسلسل سفر میں گزرا۔ جہاں بھی گیا میرا بڑا پر تپاک خیر مقدم کیا گیا۔ مسلمانوں کی مختلف تنظیموں کے زیر اہتمام منعقدہ جلسوں، طلبہ کے اجتماعات اور مسجدوں میں عامۃ المسلمین سے اکثر خطاب کرنے کا موقع ملا۔ میں نے ہر جگہ مسلمانوں کو یہ بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کی کہ ہندوستان کے بدلتے ہوئے حالات میں اسلام کی نشرو اشاعت کے سلسلے میں ان پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور وہ ان ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔

اس دورے کے دوران کئی ہندو نوجوان بھی مجھ سے ملنے آئے۔ وہ اس بات سے حد درجہ متاثر تھے کہ ایک ایسا نوجوان جو ابھی چند ہی سال پہلے حلقہ بگوشِ اسلام ہوا تھا، اسلام کے دامانِ عاطفت میں آنے کے بعد کیا سے کیا ہو گیا۔ نہ صرف یہ کہ اسے اسلام کے تصور مساوات کے مطابق باقی مسلمانوں کے برابر سمجھا گیا بلکہ اس کی صلاحیتوں کے بنا پر رابطہ عالم اسلامی ایسے اہم عالمی اسلامی ادارے میں ایک اہم منصب پر فائز کر دیا گیا ہے۔ ان میں اکثر نوجوان مجھ سے تخلیے میں ملنے کے خواہش مند تھے لیکن میرا پروگرام کچھ اس طرح ترتیب دیا گیا تھا کہ میں اپنی مسلسل مصروفیتوں کی بنا پر ان نوجوانوں سے الگ ملاقات کے لئے وقت نہ نکال سکا۔ بہر حال وہ لوگ میری شخصیت میں قبولِ اسلام کے نتیجے میں رونما ہونے والے انقلاب سے حد درجہ متاثر تھے۔ آئندہ کبھی مجھے بھارت کے دورہ پر جانے کا موقع ملا تو اپنا پروگرام کچھ اس طرح ترتیب دوں گا کہ میں ان نوجوانوں سے خصوصی ملاقات کے لئے وقت نکال سکوں"۔

"کیا آپ اپنے والدین سے بھی ملے تھے؟" میں نے پوچھا

"ہاں میں اپنے والدین سے بھی ملا تھا۔ وہ بھی میری شخصیت کے اندر اسلام کی برکت سے پیدا ہونے والی عظیم تبدیلی نیز میرے رابطہ عالم اسلامی میں ایک اہم منصب پر فائز ہو جانے کی وجہ سے بے حد متاثر تھے۔ انہیں مزید متاثر میرے طرزِ عمل نے کیا جو

میں نے پانچ چھ سال سے ان کے بارے میں اختیار کر رکھا ہے۔ میں نے ان کی کفالت کی ساری ذمہ داریاں سنبھال رکھی ہیں اور یہ بات ان پر واضح کر دی ہے کہ میرا ان کے ساتھ یہ طرزِ عمل اسلام کے واضح احکامات اور تعلیمات کی بنا پر ہے۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو حکم دیتا ہے کہ اگر کسی کے والدین اسلام نہ قبول کریں تو بھی ان کے ساتھ حسنِ سلوک کیا جائے۔ مَیں نے انہیں اسلام کی دعوت پیش کی تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم اسلام کو دل کی گہرائیوں سے پسند کرتے ہیں لیکن سرِدست ہم اپنے اندر قبولِ اسلام کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں پاتے۔ مَیں نے بھی زیادہ اصرار کرنے کے بجائے یہی مناسب سمجھا کہ ان کے حق میں اللہ سے دعا کرتا رہوں اور اس دن کا انتظار کروں جب اللہ کے فضل سے ان کے دل میں اسلام کے لئے شیفتگی خود بخود تڑپ میں تبدیل ہو جائے۔ وہ کسی خارجی دباؤ کے بجائے خود اپنے داخلی دباؤ سے حلقہ بگوشِ اسلام ہو جائیں۔ اللہ نے چاہا تو وہ دن دور نہیں ہے''۔

ڈاکٹر صاحب سے میری ملاقات صبح دس بجے ان کی رہائش گاہ پر جو مسجد الحرام سے فرلانگ بھر کے فاصلے پر ہے' شروع ہوئی تھی اور اب مغرب کی اذان کو صرف آدھا گھنٹہ باقی رہ گیا تھا۔ اس دوران میں ہماری گفتگو تقریباً تسلسل کے ساتھ جاری رہی۔ صرف ظہر اور عصر کی نمازیں پڑھنے کے لئے اٹھے۔ دوپہر کے کھانے اور چائے کے دوران بھی گفتگو ہوتی رہی اور اب جب مَیں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی تو مجھے اندازہ ہوا کہ ہماری اس گفتگو کو شروع ہوئے سات گھنٹے ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی دلچسپ باتوں نے وقت کا احساس ہی نہ ہونے دیا۔ مَیں نے اپنی گفتگو کو سمیٹتے ہوئے ڈاکٹر صاحب سے آخری سوال پوچھا:

''کیا آپ ملتِ اسلامیہ کے نام کوئی پیغام دیں گے؟''

''ملتِ اسلامیہ کے نام میرا پیغام یہ ہے کہ خیر الامت کی حیثیت سے وہ دنیا میں نوعِ انسانی کی قیادت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اس کا کام دوسری قوموں کے پیچھے چلنا نہیں' ان کی رہنمائی کرنا ہے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے' جب وہ خدا سے پھرے ہوئے انسانوں کو اسلام کے زندگی بخش نظام کی طرف دعوت دے اور انہیں تباہی اور بربادی سے ہمکنار ہونے سے بچائے۔ اس نے ایسا نہ کیا تو وہ خود بھی تباہ ہوگی اور

باقی نوع انسانی کی تباہی کا وبال بھی اسی کے سر ہو گا۔ اس سلسلے میں تحریک اسلامی کے کارکنوں پر شدید ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ انہیں چاہئے کہ وہ ملت اسلامیہ کو دین کی دعوت یعنی فریضہ اقامت دین سے روشناس اور وابستہ کرنے کے لئے اپنی ساری توانائیاں وقف کر دیں تاکہ صحیح اسلامی نظام کا قیام عمل میں آ سکے اور ملت اسلامیہ ایک بار پھر خیر امت کے منصب جلیلہ پر فائز ہو کر نوع انسانی کی قیادت کی ذمہ داری سنبھال سکے۔ یہ کام بلاشبہ جان و مال کی غیر معمولی قربانیوں کا طلب گار ہے لیکن اگر ہم اسلامی انقلاب برپا کرنے کے سلسلے میں واقعی مخلص اور سنجیدہ ہیں تو ہمیں جان و مال کی یہ قربانیاں بہرحال دینی پڑیں گی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم نے دنیا کے کسی ایک خطے میں بھی اسلامی نظام حیات کو عملاً قائم کر لیا تو وہ دن دور نہیں جب خدا سے بھری ہوئی وہ قومیں جو آج اپنے خود ساختہ لادینی نظام ہائے زندگی کے ہاتھوں تباہی کے کنارے پر کھڑی ہیں' اسلامی نظام زندگی کی برکتوں کو دیکھ کر اسلام کے دامن عاطفت میں آ جائیں گی"۔

انٹرویو مکمل ہو چکا تھا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کیا' ان سے اجازت لی اور حرم کی جانب روانہ ہو گیا کہ مغرب کی اذان میں صرف چند منٹ باقی تھے۔ حرم کی طرف چلتے ہوئے میں نے سوچا اسلام نہ صرف یہ کہ ایک مکمل نظام زندگی ہے بلکہ یہ ایک زندگی بخش نظام بھی ہے اور اگر اس کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر قرن اول میں عرب کے بدوؤں میں ابوبکرؓ اور عمرؓ جیسے انسان پیدا ہو سکتے ہیں تو ان کے اثر سے آج اس گئے گزرے دور میں بھی ایک ہندو نوجوان حلقہ بگوش اسلام ہونے کے بعد ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن بن سکتا ہے۔

●......●......●

عامر علی داؤد (پاکستان)

''بلاشبہ اسلام ہی آخری، مکمل اور سچا دین ہے۔ یہ درست ہے کہ اہلِ اسلام آج اپنی ذاتی کوتاہیوں، اسلامی اصولوں سے انحراف اور دنیوی لہو ولعب میں آلودہ زندگی بسر کرنے کے سبب عالمی برادری میں اپنا امتیازی مقام کھو چکے ہیں، لیکن یہ بات کسی شخص یا اشخاص کے ذاتی، انفرادی یا اجتماعی اعمال کی ہے۔ اس کا اسلام کے بنیادی، ٹھوس اور غیر متزلزل اصولوں سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔''

یہ تھے وہ پُر جوش الفاظ جو جناب عامر علی داؤد نے ارشاد فرمائے۔ موصوف نے ۲۰۔ جون ۱۹۶۹ء جمعۃ المبارک کے روز شاہی مسجد لاہور میں مولانا عبدالرحمٰن جامی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ وہ اس سے پہلے عیسائیت کے پیروکار تھے۔

۳۴ سالہ وجیہہ وشکیل داؤد صاحب کا پہلا نام پیٹرک ڈیوڈ تھا۔ وہ ۱۹۵۷ء سے برٹش کونسل لاہور میں ایجوکیشن سیکرٹری کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی اہلیہ، صاحبزادہ سہیل رضی اور صاحبزادی صبرینہ عالیہ بھی مسلمان ہو گئے۔ یہ خوش نصیب خاندان ریڈیو پاکستان کے بالمقابل ایک ذیلی سڑک پر رہائش پذیر ہے۔

عامر علی داؤد نے قبولِ اسلام کی وجوہات بیان کرتے ہوئے کہا:

''مَیں ایک عیسائی خاندان سے تعلق رکھتا تھا، مگر میرے دادا پیدائشی طور پر عیسائی نہ تھے۔ وہ ایک اونچی ذات کے برہمن تھے۔ انگریزوں نے برصغیر پر تسلط جمایا تو میرے دادا عیسائی ہو گئے اور والد نے بھی یہی مذہب اختیار کر لیا۔ خود مجھے بھی اوائل عمر ہی سے مذہب سے خاص لگاؤ تھا۔ مطالعے کا شوق گویا گھٹی میں پڑا تھا۔ اس لئے معمولی فرصت کے وقت بھی کتاب میری رفیق بنی رہتی۔ عیسائیت میرا خاص موضوع تھا۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ عیسائیت کا مطالعہ ذہن میں عجیب عجیب سوالات پیدا کرتا رہتا۔ ایک میں تین اور تین میں ایک۔ یہ فلسفہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ جتنا پڑھتا جاتا تھا ذہن اتنا ہی الجھتا جاتا تھا۔ عیسائیت پر عالمی شہرت کے مقررین کے لیکچر بھی سنے مگر اطمینان خاطر نصیب نہ ہوا، پھر محبت' محبت کی رٹ سخت پریشان کر دیتی اور مجھے وہ سارے ''کارنامے'' یاد آجاتے جو یورپ کی عیسائی طاقتیں ایشیا اور افریقہ میں انجام دے رہی تھیں۔ کیا محبت اسی کا نام ہے؟ میں اکثر سوچتا رہتا۔

پھر ایک اور سوال بھی مجھے اکثر پریشان کرتا رہتا اور وہ یہ کہ انسان کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ اس سوال کا جواب پانے کے لئے میں نے ہزاروں صفحات کی ورق گردانی کی' سینکڑوں لیکچر سنے اور بیسیوں راتیں غور و فکر میں جاگ کر گزار دیں، لیکن عیسائیت مجھے اس اہم ترین سوال کا جواب نہ دے سکی۔

بدقسمتی سے میں نہ تو عربی زبان سے واقف ہوں نہ اردو پڑھ سکتا ہوں تاہم میں نے قرآن کا انگریزی ترجمہ حاصل کیا اور پوری توجہ سے اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ابتدا ہی سے میرے ذہن کی گرہیں کھلنے لگیں اور مجھے میرے ہر سوال کا جواب مل گیا۔ قرآن کہتا ہے کہ جب آدم کی تخلیق کی گئی تو اللہ نے فرشتوں کو آدم کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ اس سے یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب و مرغوب سجدہ ہے۔ جب اس نے اپنی نورانی مخلوق کو سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا تو اس کا منطقی اور واحد نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اب انسان بارگاہِ ایزدی میں سربسجود ہو جائے۔

قرآن کے مطالعے نے فکر کی بہت سی الجھنیں صاف کر دیں اور انجیل کے تضادات ابھر کر سامنے آ گئے۔ یہ بات عیاں ہو گئی کہ انجیل اور زبور زبردست تحریف کا شکار ہو چکی ہیں اور اب انسانیت کی رہنمائی نہیں کر سکتیں۔ چنانچہ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ انجیل کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ازدواجی زندگی بسر نہیں کی' پھر ان کو ماننے والے کس بنیاد پر کرتے ہیں۔ ثانیاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عمر آٹھ سال تھی جب آپ کے ختنے ہوئے مگر عیسائی لوگ سرے سے ختنے کرانے ہی کے خلاف ہیں۔

قرآن کے بعد میں نے اسلام کے موضوع پر بہت سی دوسری کتابیں بھی پڑھیں اور میرا یہ خیال یقین کی صورت اختیار کرتا چلا گیا کہ قرآن اور اسلام کا پیغام فطری' مکمل اور

آفاقی ہے۔ اس کا خطاب براہ راست عوام الناس سے ہے۔ اس کی رسائی انسان کی پوری زندگی اور نفسیات تک ہے اور یہ امر حق الیقین تک پہنچ ہو گیا کہ نظریاتی اعتبار سے اسلام دنیا کے ہر مذہب سے بہتر مذہب ہے۔

میں نے عیسائیت اور اسلام کے بارے میں اپنے خیالات کا ذکر کئی ذمہ دار پادریوں سے کیا۔ میں انہیں واضح طور پر کہتا تھا کہ آخر تم لوگوں کو دھوکا کیوں دیتے ہو اور کیوں صاف صاف نہیں بتاتے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں۔ میری ان باتوں پر وہ سخت برہم ہوتے مگر جواب میں کوئی دلیل نہ لا سکتے۔

انہی ایام میں' میں نے پیغمبر اسلامؐ اور ان کے ساتھیوں کی زندگی کا مطالعہ کیا تو میری آنکھوں کے سامنے سے رہے سہے پردے بھی ہٹ گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میں اس مقدس و معتبر قافلے سے دور رہا تو بدقسمتی کی موت مروں گا اور پختہ ارادہ کر لیا کہ اس دین سے دور نہیں رہوں گا جس نے عمرؓ اور صلاح الدینؒ جیسے لوگ پیدا کیے اور جس کے پیروکار اس گئے گزرے دور میں بھی بہرحال اخلاقی طور پر سب سے اچھے لوگ ہیں۔ میں یہ ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

ہوا یوں کہ میری بچی عیسائیوں کے ایک اسکول میں پڑھتی تھی۔ وہاں کچھ مسلمان بچیاں بھی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ مذہبی تعلیم کا پیریڈ آیا تو استانی نے کہا جو بچیاں عیسائی ہیں وہ گرجے میں چلیں۔ میری بچی صبرینہ عالیہ اپنی نشست پر بیٹھی رہی۔ استانی نے دریافت کیا کہ تم گرجے میں کیوں نہیں گئیں تو اس نے تن کر جواب دیا کہ ہم مسلمان ہیں۔ یہ جواب سن کر عیسائی استانی تصویر حیرت بن گئی۔ ہیڈ مسٹرلیس نے ہمیں اس واقعہ کی اطلاع کی تو میں خود حیران رہ گیا۔ بہرحال میں نے سکول والوں سے کہا کہ یہ میری بیٹی کا ذاتی معاملہ ہے اور دو ایک سال گزرے تھے کہ بچی سارے خاندان کا معاملہ بن گیا۔ میں نے اسلام قبول کر لیا اور اس کے ساتھ ہی میری اہلیہ' میری بچی اور بچے نے بھی بخوشی دامن اسلام کے سائے میں پناہ لے لی۔ ہم سب اپنی اس سعادت پر اللہ تعالیٰ کے بے پناہ شکرگزار ہیں۔

(بشکریہ "محمد رسول اللہ ﷺ غیروں کی نظر میں")

●......●......●

محترمہ عائشہ برجٹ ہنی

(انگلستان)

یہ انٹرویو مشہور انگریزی کتاب ISLAM OUR CHOICE میں شائع ہوا تھا' ذیل میں اس کا ترجمہ دیا جا رہا ہے۔

سوال: آپ نے کب اسلام قبول کیا۔ اس وقت آپ کی عمر کیا تھی؟
جواب: آج سے ساڑھے تین برس پہلے اللہ تعالیٰ نے اسلام کی شمع میرے دل میں روشن کی۔ اس وقت میری عمر اکیس سال کی تھی۔
سوال: براہ کرام تفصیل سے بتایئے کہ آپ نے اسلام کیوں اور کیسے قبول کیا؟
جواب: میں نے جس گھرانے میں آنکھیں کھولیں اور پرورش پائی وہ عام انگریز گھرانوں سے مختلف نہ تھا۔ میری والدہ عیسائی مذہب کی پیروکار تھیں مگر میں نے انہیں کبھی عبادت کرتے دیکھا نہ عیسوی اصولوں کی کبھی انہوں نے پابندی کی۔ والد صاحب کی حالت اس سے بھی گئی گزری تھی۔ وہ سرے سے کسی مذہب پر اعتقاد ہی نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ ہمارے گھر کی حالت مکمل طور پر بے دینی کی تھی۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے وہاں کسی کی زبان سے کبھی خدا کا نام سنا ہو۔

بچپن میں مجھے ایک مذہبی اسکول میں داخل کرایا گیا۔ وہاں وہی نصاب پڑھایا جاتا تھا جو عام چرچ اسکولوں میں رائج تھا۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ جلد ہی عیسائیت کے بہت سے عقائد ذہن میں کھٹکنے لگے۔ خصوصاً تثلیث کے تصور سے تو وحشت سی ہونے لگی اور کفارہ کا تصور بے حد مضحکہ خیز نظر آنے لگا کہ حضرت یسوع (یعنی ابن خدا) تمام انسانوں

کے گناہوں کے بدلے صلیب پر چڑھ گئے اور اب بنی نوع انسان اپنے تمام افعال میں مکمل آزاد ہے۔ میں نے ان عقائد کے بارے میں بہت سی دلیلیں سنیں' مباحثے بھی سنے' مگر صاف احساس ہوتا تھا کہ تصویر کا ایک رخ پیش کیا جا رہا ہے۔ میں ساری تصویر دیکھنا چاہتی تھی۔ قصہ مختصر یہ کہ میں پڑھتی تو ایک مذہبی اسکول میں تھی مگر جب اسے چھوڑا تو مکمل بے دین ہو چکی تھی۔

اسکول کی تعلیم سے فارغ ہو کر میں نے فلسفہ پڑھنا شروع کیا۔ دراصل حق کو معلوم کرنے کی پیاس بڑی شدید تھی۔ چنانچہ جب میں نے پندرہ برس کی عمر میں مشہور چینی فلاسفر تاؤ کی کتاب TAOTEHCHING پڑھی تو بہت متاثر ہوئی۔ پھر جب میں نے بدھ مت کے بارے میں کچھ تعارفی باتیں معلوم کیں تو ان دونوں عقیدوں کے بارے میں مفصل معلومات حاصل کرنے کی خواہش بڑھ گئی۔ ایک ارادہ یہ کیا کہ چینی زبان سیکھوں اور چین جا کر ان مذاہب کا قریب سے مطالعہ کروں' لیکن ظاہر ہے پندرہ برس کی ایک لڑکی' جس کے پاس پیسے تھے نہ وسائل' یہ خواہش خیالِ خام سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رکھتی تھی۔ تاہم سترہ برس کی عمر میں ملازمت کے سلسلے میں کینیڈا چلی گئی اور دو سال میں اچھی خاصی رقم جمع کر لی۔ ارادہ یہ تھا کہ سیکنڈری اسکول کی ڈگری حاصل کر کے یونیورسٹی میں داخلہ لے لوں اور چینی زبان سیکھ سکوں۔

کینیڈا میں میرا تعارف ہندو مذہب سے ہوا اور میں نے ان کی تقریباً ساری مذہبی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ یوں میں نے اندازہ کیا کہ تاؤ ازم' بدھ مت اور ہندو مذہب میں حسن بھی ہے' عمق بھی اور سرفرازی کا انداز بھی' مگر ان میں سے کسی نے بھی میرے ذہن یا وجدان کو مطمئن نہ کیا۔ اس وسیع دنیا میں جہاں لوگ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے ہیں' یہ تینوں مذاہب روزمرہ کی زندگی میں کوئی توازن یا استحکام پیدا کرنے میں مکمل طور پر ناکام ہیں۔ وہ کسی نہ کسی پہلو کو کلی طور پر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر تاؤ فلاسفی کا بانی صوفی بن گیا اور ہر قسم کی لذتیں ترک کر کے دنیا کے دور دراز کونوں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ بدھ نے حق کی تلاش میں بیوی بچوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ہندو لٹریچر کی بنیاد گو اخلاقیات پر استوار ہے' مگر اس مذہب میں اجتماعی زندگی گزارنے کے سارے

نظریات بے بنیاد اور فریب نظر کے سوا کچھ نہیں دکھائی دیتے۔ اس تجزیئے نے مجھے سخت مایوس کیا اور میں ان میں سے کسی پر ایمان نہ لاسکی۔ میں اکثر سوچتی کیا حق محض اتفاق ہے؟ کیا یہ سارا کارخانہ محض حادثاتی ہے؟ ذہنی تناؤ اور پریشانی بڑھتی رہی حتیٰ کہ میں رات رات بھر سو نہ سکتی اور روحانی پیاس مجھے انگاروں پر لوٹاتی رہتی۔

انہی حالات میں میں نے سیکنڈری اسکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد لندن یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور چینی زبان بھی سیکھنے لگی مگر یہ سب کچھ تضیع اوقات نظر آتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ میں خود بھی نہیں جانتی تھی کہ خدا میری تلاش حق کی کوششوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے اور یونیورسٹی میں داخلہ ہی میری زندگی کے روشن انقلاب کا سبب بن جائے گا۔

یونیورسٹی میں میرا تعارف کچھ مسلمان طالب علموں سے ہوا۔ اس سے قبل میں نے اسلام کے بارے میں کچھ سنا تھا نہ پڑھا تھا اور سچی بات تو یہ ہے کہ تمام یورپین لوگوں کی طرح میں اس کے بارے میں تعصب اور غلط فہمیوں کی شکار چلی آرہی تھی۔ مگر یونیورسٹی میں مسلمان طلبہ نے تحمل اور پوری ہمدردی کے ساتھ اپنے بنیادی عقائد کی وضاحت کی۔ میں نے جو اعتراض بھی کیا اس کا جواب انہوں نے بڑے حوصلے اور شائستگی کے ساتھ دیا اور پڑھنے کو کتابیں بھی دیں۔ ابتدا میں میں نے ان کتابوں کی محض ورق گردانی کی اور چھوڑ دیا۔ میرا خیال یہ تھا کہ ان میں مضحکہ خیز کہانیوں اور ذہنی عیاشیوں کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ مگر جب میں نے واقعی سنجیدگی کے ساتھ ان کے کچھ حصوں کو پڑھا تو پتہ چلا کہ یہ کتابیں دوسرے مذاہب کی کتابوں سے بالکل مختلف ہیں۔ اسلام کے بارے میں میری غلط فہمیاں آہستہ آہستہ تحلیل ہونے لگیں۔

اب میں نے ان کتابوں کا مطالعہ بڑی احتیاط اور توجہ سے شروع کیا۔ ان کے اسلوب بیان اور طرز وضاحت کی ندرت اور تازگی اور تشریح کے انداز نے مجھے حیران کر دیا۔ خالق کائنات، مخلوقات اور حیات بعد الموت کے عقائد کو جن منطقی اور سائنسی دلیلوں کے ساتھ پیش کیا گیا تھا، اس نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ اس کے بعد ان مسلمان طلبہ نے مجھے قرآن کا ایک انگریزی ترجمہ پیش کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ خواہ میں کتنی کوشش کروں اس

تاثر کے تناسب کو بیان نہیں کر سکتی جو قرآن نے میرے دل میں نقش کیا تھا۔ چنانچہ بحمداللہ تعالیٰ میں اس وقت سے مسلمان چلی آ رہی ہوں۔ اسلام سے تعارف ہوئے بمشکل تین مہینے ہوئے تھے کہ میں اس کی پناہ میں آ گئی۔ ابھی میں اس کے بنیادی عقائد سے ہٹ کر اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ اس کے مختلف شعبوں کی تفصیلات جاننے کا مرحلہ بعد میں آیا اور میں نے ایک ایک معاملے میں اپنے مسلمان بھائیوں سے رہنمائی حاصل کی۔ جس میں مجھے کسی مایوسی یا شک کا سامنا نہ کرنا پڑا۔

مجھ سے اکثر سوال کیا جاتا ہے کہ میرے اسلام قبول کرنے کی بڑی وجوہات کیا تھیں۔ اس سوال کا جواب اتنا آسان نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کی مثال جیومیٹری کے ایک ایسے نقشے کی ہے جس کا ہر جزو دوسرے جزو کی تکمیل کرتا ہے اور نقشے کا اصلی حسن تمام اجزا کے تناسب اور ربط و تعلق میں ہوتا ہے۔ اسلام کی یہی وہ خصوصیت ہے جو انسانوں پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ ذرا فاصلے سے دیکھیں تو انسانی ارادوں' مقاصد' اعمال اور عام اشیا کی عمومیت میں اسلام گہری بصیرت کا ثبوت دیتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے سیاسی اور حکومتی نظام کا مطالعہ کریں تو عقل دنگ رہ جاتی ہے اور اگر سماجی و انفرادی نقطہ نظر سے دیکھیں تو یہ بھی اخلاقیات کی مشعل لئے ایک ایک پہلو میں زندگی کی صاف اور سیدھی شاہراہ کی طرف رہنمائی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور ان معاملات میں دنیا کا کوئی اور مذہب یا نظام اس سے لگا نہیں کھاتا۔ مسلمان جب بھی کوئی کام کرتا ہے اللہ کا نام لیتا ہے۔ جب اللہ کا نام لیتا ہے تو اس حوالے سے اپنا احتساب بھی کرتا ہے اور یوں وہ بہت اونچے معیار کو پالیتا ہے۔ اس طرح روزمرہ زندگی اور مذہبی تقاضوں میں کوئی بُعد باقی نہیں رہتا' بلکہ دونوں میں ایک متناسب سا تعلق قائم ہو جاتا ہے جو متوازن بھی ہوتا ہے اور دونوں کے لئے بے حد ضروری بھی۔

سوال: آپ کے قبولِ اسلام پر آپ کے خاندان اور اعزا کا ردِ عمل کیا تھا؟

جواب: جہاں تک والدین کا تعلق ہے' انہوں نے میرے قبولِ اسلام پر کوئی توجہ نہیں دی۔ انہوں نے سوچا کہ چینی زبان سیکھنے کی طرح یہ بھی میرا شوقِ فضول ہے جو وقت کے ساتھ اپنا ابال کھو دے گا۔ مگر جب انہوں نے دیکھا کہ میرے عقائد نے آگے بڑھ کر

میری زندگی کو تبدیل کرنا شروع کر دیا ہے اور میری عادتیں اور طرزِ معاشرت میں انقلاب آ گیا ہے تو وہ بہت گھبرائے اور پچھتائے بھی۔ میں نے شراب اور سور کا گوشت چھوڑا تو وہ خاصے برہم ہوئے۔ انہیں بالکل پسند نہیں تھا کہ میں ایک چادر میں ملفوف رہوں اور سر پر ہر وقت دوپٹہ لئے رہوں۔ دراصل انہیں فکر لوگوں کی چہ میگوئیوں کی تھی ورنہ میرے عقیدے یا ایمان سے ان کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ اس کے برعکس میرے واقف کار انگریزوں کا رویہ خاصا مختلف تھا۔ وہ مدلل گفتگو اور بحث و مباحثے سے نہیں بدکتے تھے اور عقلی طور پر انہیں کوئی بات بھی سمجھائی جاتی وہ اسے قبول کرنے پر تیار تھے۔ چنانچہ جب میں اسلامی عقائد اور اس کے سماجی نظریات پر گفتگو کرتی تو وہ اسلام کی حکمتوں کو تسلیم کرتے۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ تعددِ ازدواج کے بارے میں اسلامی نظریے پر بات ہوئی اور میں نے اس کا مقابلہ موجودہ مغربی تہذیب کے انہی پہلوؤں سے کیا تو میرے احباب نے تسلیم کیا کہ عائلی زندگی کے مسائل کا بہترین حل یہی ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔

سوال: کیا آپ نے اسلام قبول کرنے کے بعد کوئی مشکل یا الجھن محسوس کی؟

جواب: بات یہ ہے کہ انگلستان کے وہ لوگ جو سوچ سمجھ سے عاری ہیں' اسلام کے بارے میں سخت متعصبانہ رویہ اختیار کرتے ہیں اور مسلمانوں کا عموماً مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ حرکت وہ منہ پر نہ کرتے ہوں مگر پیٹھ پیچھے اہلِ اسلام کا مضحکہ اڑانا ان کا دل پسند مشغلہ ہے۔ اس کے برعکس وہ ان لوگوں کو کچھ نہیں کہتے جو لا مذہب اور بے دین ہیں۔ بلکہ ان کی ''آزادروی'' کی وہ جی بھر کے تعریف کرتے ہیں۔ میرے ہم وطنوں کی اس عمومی روش کے باوجود کم از کم میرے ساتھ یہ معاملہ پیش نہیں آیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں یونیورسٹی میں اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز کی طالبہ تھی اور جن لوگوں سے نیا نیا تعارف ہوتا تھا وہ عموماً مذہب اور عقائد سے آگاہ ہوتے تھے۔ تاہم میں بخوبی جانتی ہوں کہ دوسرے مسلمانوں کو کس قسم کے سلوک کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

سوال...... آپ کا کیا خیال ہے' آیا اسلام کسی طریقے سے موجودہ تہذیب پر اثر انداز ہو سکتا ہے؟ اگر آپ کا جواب اثبات میں ہے تو کیسے؟

جواب...... آج کا یورپ تاریکیوں میں بھٹک رہا ہے۔ یہاں روشنی کی کوئی ننھی سی

کرن بھی نہیں جو روح اور ذات کی ان تاریکیوں میں رہنمائی کر سکے۔ ہر وہ شخص جو یورپ کی صحیح صورتِ حال کو تھوڑا سا بھی سمجھتا ہے وہ جانتا ہے کہ ترقی کی جھوٹی چمک دمک اور مادیت کی معنوی شان وشوکت کے پیچھے دراصل ہمہ گیر قسم کے رنج وآلام اور شدید پریشانی پھنکار رہی ہے۔ لوگ ان مشکلات سے نجات کا کوئی راستہ چاہتے ہیں مگر انہیں کوئی ایسا ذریعہ نہیں ملتا۔ اس سلسلے کی ان کی ساری جستجو بیکار جا رہی ہے۔ اب ان کے سامنے ایک ہی راستہ رہ گیا ہے اور وہ سیدھا تباہی وبربادی کے جہنم کی طرف جاتا ہے۔ اسلام جسم کے تقاضوں اور روح کی ضرورتوں کے درمیان جو حسین تناسب پیدا کرتا ہے' یورپ میں آج اس کے لئے زبردست کشش پائی جاتی ہے۔ اسلام مغربی تہذیب کی سچی کامیابی اور صحیح نجات کی طرف رہنمائی کر سکتا ہے۔ یہ مغرب کے انسان کو زندگی کے حقیقی مقصد کا شعور دے سکتا ہے اور اسے صرف اللہ کی رضا کے لئے تگ ودو کرنے کی ترغیب دے سکتا ہے جو اس کی دنیوی کامیابی کے ساتھ ساتھ اُخروی نجات کا ذریعہ بنے گا۔ اللہ ہمیں دنیا وآخرت کی کامیابی عطا فرمائے۔

سوال: آپ کے خیال میں اشاعت وتبلیغ اسلام کے لئے کون سا طریقہ موزوں ہے؟

جواب: اغیار میں اسلام کی تبلیغ واشاعت سے پہلے ہمیں اپنی زندگی اور اعمال کا محاسبہ کرنا چاہئے۔ ان معیارات کو حاصل کرنا بے حد ضروری ہے جو اسلام نے متعین کئے ہیں۔ دراصل یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ اسلام کے مبلغ بننے کے بعد ہمیں کسی فکر کی ضرورت نہیں حالانکہ یہ ذمہ داری بہت ہی نازک اور اہم ہے۔ اسلام کے بارے میں مکمل معلومات رکھنے کے بعد ہی ہم اچھے مبلغ بن سکیں گے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس سلسلے میں مختلف کتابوں کی بھی خاصی اہمیت ہے اور ایک غیر مسلم زبانی بات چیت کے مقابلے میں کتاب پر زیادہ توجہ دے سکتا ہے' لیکن بدقسمتی سے انگریزی میں اسلام پر اچھی کتابیں بہت کم ہیں۔ تاہم میں پھر کہوں گی کہ ایک جیتی جاگتی زندہ مثال ہی اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لئے مفید رہے گی۔ اگر ہم اپنی زندگیوں کو لازماً اس سانچے میں ڈھالیں جس کا تقاضا قرآن کرتا ہے تو اسلام کو پھیلنے سے کوئی قوت نہیں روک سکے گی۔

سوال...... برطانوی مسلمانوں کو سماجی زندگی میں کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

جواب...... جہاں پورے کا پورا خاندان اسلام کی آغوش میں آ جاتا ہے' وہاں کوئی مشکل پیش نہیں آتی ' وہ لوگ اسلامی اقدار کو اختیار کر لیتے ہیں اور امن و راحت کی زندگی گزارتے ہیں، لیکن جب کوئی غیر شادی شدہ لڑکا یا لڑکی یا شادی شدہ مرد یا عورت اکیلے اسلام قبول کرتی ہے تو مشکلات کا ہجوم اس کے استقبال کے لئے موجود ہوتا ہے۔ انہیں ہر وقت یہ احساس تنگ کرتا ہے کہ یہ معاشرہ اور یہ ماحول ان کا اپنا نہیں ہے۔ انہیں نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے میں سخت رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خدا کا شکر ہے مسلم گھرانے اس سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں کو نبھا رہے ہیں۔

برطانیہ میں ہمیں ایسے مدرّس درکار ہیں جو اسلامی تہذیب کا نمونہ بھی ہوں اور نومسلموں کو قرآن اور اسلام کی تعلیم بھی دے سکیں۔ بہت سے نومسلم قرآن سمجھنا چاہتے ہیں مگر وہ ایسی سہولت نہیں پاتے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ لندن کا اسلامک کلچرل سنٹر اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر رہا۔ مسلمان طلبہ یہ فرض نبھا سکتے ہیں' مگر ایک تو انہیں اپنی نصابی سرگرمیوں سے فرصت نہیں ملتی' دوسرے وہ کما حقہٗ اپنے فرض کی عظمت کا احساس نہیں رکھتے۔ دراصل وہ یورپ کی جھوٹی اور مصنوعی چمک دمک سے مرعوب ہیں۔ ان کی آنکھیں ان بناوٹی روشنیوں سے چندھیا گئی ہیں اور وہ نہیں جانتے کہ یہ سب کچھ مداری کا کھیل ہے۔

آخر میں مَیں اسلامی ملکوں کے مضبوط خاندانی نظام اور صاف ستھری سماجی زندگی کو خراجِ تحسین ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اگر ہم اس کا مقابلہ یورپ کی معاشرتی اور خاندانی قباحتوں سے کریں تو پتہ چلتا ہے کہ مسلمان عظمت کی کن بلندیوں پر فائز ہیں۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر فی الواقع اسلام کا سماجی نظام برسرِ عمل آ جائے تو رحمت و برکت کا کیا عالم ہوگا۔

●......●......●

عبدالرحمٰن

(بھارت)

ذیل کا روح پرور اور معلومات افزا مضمون ہندوستان کے تمکین آفاقی نے مرتب کیا اور کتابچے کی صورت میں مکتبہ اسلامی دہلی نے شائع کیا۔ دونوں کے شکریے کے ساتھ ہدیہ قارئین کیا جا رہا ہے۔

جماعت اسلامی حلقہ آندھرا پردیش کے پہلے اجتماع ارکان کے موقع پر ایک کشیدہ قامت نوجوان پر نظر پڑتے ہی مَیں ٹھٹک کر رہ گیا۔ بڑی بڑی سوچ میں ڈوبی ہوئی آنکھیں، سیاہی مائل گہرا گندمی رنگ، کلین شیو اور قمیص پتلون میں ملبوس ان صاحب کو دیکھ کر مجھے الجھن سی ہونے لگی۔ کون ہو سکتے ہیں یہ صاحب؟ میں نے سوچا۔ یہ اجتماع ارکان ہے تو کیا یہ صاحب بھی رکن جماعت ہیں؟ مگر ڈاڑھی؟ اور اگر یہ صاحب رکن جماعت نہیں ہیں تو پھر غیر متعلق لوگوں کی یہاں موجودگی کا کیا مطلب؟ اونہہ! خیر کسی سے دریافت کر لوں گا اور پھر مَیں اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ دوسری بار جب مَیں ناشتے سے فراغت کے بعد چائے کے لئے عمارت کے صحن میں لگے ہوئے ٹی اسٹال کی طرف جا رہا تھا تو پھر ایک بار انہی صاحب پر نظر پڑی۔ وہ میری طرف پیٹھ کئے کسی گہری سوچ میں غرق تنہا کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے ایک بار پھر الجھن ہونے لگی کہ آخر یہ کون ہو سکتے ہیں؟ چنانچہ مَیں ٹی اسٹال کی طرف جانے کے بجائے ان کے پاس پہنچ گیا اور وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔

السلام علیکم! مَیں ان کے بالکل سامنے جا کھڑا ہوا۔

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! ان کے ہونٹوں پر ایک بااخلاق مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

جناب والا کی تعریف...... میں نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔
میں عبدالرحمٰن ہوں...... کا رہنے والا ہوں۔ انہوں نے اپنا تعارف کروایا۔ اگرچہ وہ صاف اردو بول رہے تھے لیکن لب ولہجہ کچھ اجنبی سا تھا' جیسے اردو ان کی مادری زبان نہ ہو۔ میری دلچسپی مزید بڑھ گئی۔

''آپ......؟'' میں نے استفہامی انداز میں جملے کو نامکمل چھوڑ دیا۔

وہ میرا مطلب سمجھ کر مسکرائے۔ میں رکنِ جماعت ہوں اور ان کے اس جواب کے ساتھ ہی بے ساختہ میری نظریں ان کی ٹھوڑی پر مرکوز ہو گئیں اور میں نے دیکھا کہ حقیقتاً وہ کلین شیو نہیں ہیں۔ ان کی ٹھوڑی پر چار پانچ بال تھے جو اگرچہ مضحکہ خیز لگ رہے تھے لیکن غالباً اتباعِ سنت کے جذبے کے تحت انہوں نے انہیں ہی بطور ڈاڑھی رکھ چھوڑا تھا۔ یہ بال دور سے بالکل نظر نہ آتے تھے' جس کی وجہ سے وہ کلین شیو لگتے تھے۔ دراصل ان کے چہرے پر بالوں کی فطری روئیدگی ہی نہیں تھی۔

''آپ کتنی مدت سے جماعتِ اسلامی کے رکن ہیں''؟ میں نے گفتگو کو طول دیا۔

''دس سال سے''۔ انہوں نے اطمینان سے جواب دیا۔

''دس سال'' مجھے حیرت ہوئی۔ ''مگر آپ کی عمر؟ میرا مطلب ہے کہ آپ کی عمر کچھ زیادہ نہیں''۔

''زیادہ کیوں نہیں''۔ وہ مسکرائے۔ میری عمر تینتیس سال ہے۔ سولہ سال کی عمر میں مسلمان ہوا اور تئیس سال کی عمر میں جماعتِ اسلامی کا رکن بنا۔ اب یہ اور بات ہے کہ ڈاڑھی مونچھ نہ ہونے کی وجہ سے ۲۵' ۲۶ سے زیادہ کا نہیں لگتا۔ انہوں نے ایک ہی سانس میں سب کچھ بتا کر میری الجھن کو رفع کر دیا۔

''مسلمان ہوا' یعنی کیا مطلب؟'' میں نے مزید وضاحت چاہی۔

''ارے آپ مسلمان ہونے کا مطلب نہیں سمجھتے'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ ''بھائی میں دراصل نومسلم ہوں۔ میرا سابق نام سوریا نائیڈو ہے۔ ہندو مت کا پیرو تھا اور اب الحمد للہ عبدالرحمٰن ہوں۔ رحمٰن کا بندہ''۔ انہوں نے بے تکلفی سے بتایا۔

''نومسلم''!! میرے قلب میں محبت کی ایک لہر سی اٹھی اور مجھے بے ساختہ رسول کریم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد یاد آ گیا کہ اگر تم اپنے بھائی سے محض اللہ کے لئے محبت کرتے ہو تو اس پر اپنی محبت کا اظہار بھی کر دو (او کما قال) اور مَیں نے معانقے کے لئے دونوں ہاتھ پھیلا دیے اور پھر ہم گرمجوشی سے بغل گیر ہو رہے تھے۔ ہمارے جسم ہی ایک دوسرے کے وجود کو محسوس نہیں کر رہے تھے بلکہ ہمارے قلوب کی دھڑکنیں بھی جیسے ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو گئی تھیں۔

آیئے چائے پی لیں۔ مَیں ان کا ہاتھ تھامے ٹی سٹال کی طرف بڑھا اور پھر ہم چائے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ اجتماع کی کارروائی کا اعلان ہوا اور ہم لپک کر اجتماع گاہ میں پہنچ گئے۔ دورانِ اجتماع آپس میں گفتگو کرنے کا تو سوال ہی نہیں تھا' البتہ شام میں نماز عشا کے بعد پھر ایک بار ہماری ملاقات ہو گئی اور مَیں بات چیت کرتا ہوا انہیں اپنی قیام گاہ میں لے آیا۔ ایک نئے رفیق کو میرے ساتھ دیکھ کر لیٹے اور بیٹھے ہوئے رفقا ہمارے پاس آ گئے اور مَیں نے سب سے عبدالرحمٰن صاحب کا تعارف کروایا۔ تعارف کے بعد جب سب لوگ بے تکلفی سے بیٹھ گئے تو مَیں نے ان سے مخاطب ہو کر کہا کہ اب ذرا تفصیل سے بتایئے کہ آپ کیوں مسلمان ہوئے اور پھر مسلمان ہونے کے بعد جماعتِ اسلامی کے رکن کیسے بنے اور اپنے اس ایمان و اسلام کی کیا قیمت آپ کو ادا کرنی پڑی؟

تفصیل سے؟ میرے بھائی یہ ایک طویل کہانی ہے اور کافی وقت چاہتی ہے۔ البتہ آپ چاہیں تو مَیں مختصراً اشارے کرتا چلا جاؤں گا۔ آپ خود کہانیاں لکھتے ہیں۔ آپ میری اس کہانی کے خلا کو پُر کر لیں اور یوں انہوں نے اپنے ماضی کے اوراق الٹنے شروع کر دیئے۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں میرا اصل نام سوریا نائیڈو تھا۔ میرے والد ایک پجاری تھے۔ مَیں بچپن ہی سے کافی سنجیدہ اور خاموش قسم کا لڑکا تھا اور غالباً اسی وجہ سے میرے بچپن ہی میں میرے والد نے یہ طے کر دیا تھا کہ ان کے بعد مَیں ہی ان کا روحانی جانشین ہوں گا۔ مجھ سے بڑے دو بھائی تھے لیکن والد صاحب ان کی فطرت سے اس لئے مایوس تھے کہ ان دونوں کو مذہبی امور سے بالکل دلچسپی نہ تھی۔ تیرہ سال کی عمر میں جب کہ مَیں ساتویں جماعت میں پڑھ رہا تھا' پہلی بار اپنے مذہب سے متعلق میرے قلب و ذہن میں بے اطمینانی پیدا ہوئی۔ والد صاحب ہی میرے اتالیق تھے اور ان کی موجودگی میں

مذہبی آداب و رسوم سیکھنے کے لئے مجھے مندر ہی میں رہنا پڑتا تھا۔ والد صاحب گھنٹوں اپنی پوجا میں مصروف رہتے اور میں غور و فکر میں کھویا رہتا۔ یہ بات میرا دل قبول کرنے کے لئے کسی طرح تیار نہ ہوتا تھا کہ انسانی ہاتھوں کے تراشیدہ یہ بت ہمارے خدا ہو سکتے ہیں۔ یعنی انسان خود جن بتوں کا خالق تھا وہی بت خود اس کے خالق و معبود کہلانے لگیں؟ ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ میری بے چینی اور اضطراب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہ ایک ایسی گتھی تھی جسے سلجھانے کی ہر کوشش کے بعد میں یہ محسوس کرتا تھا کہ یہ مزید الجھ گئی ہے اور مجبوری یہ تھی کہ کسی کے سامنے آزادانہ طور پر میں اپنی ان الجھنوں کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا۔

مندر میں میرے والد کے پچاس ساٹھ شاگرد رہتے تھے۔ ایک بار خیال ہوا کہ ان سے بحث مباحثہ کر کے اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کروں لیکن پھر یہ سوچا کہ ان سے گفتگو کرنے کی بجائے کیوں نہ والد صاحب ہی سے پوچھ لوں۔ وہی تو میرے اور ان تمام لوگوں کے استاد اور گورو تھے اور پھر ایک دن جبکہ مندر میں والد صاحب اور میں ہی تھے' اس موضوع پر میں نے پہلی بار اظہارِ خیال کیا۔ پہلے پہل جب والد صاحب کو میرے خیالات کا علم ہوا تو وہ نہ صرف یہ کہ چونک پڑے بلکہ خوف اور اندیشے سے انہوں نے ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں کوئی میرے ان "کافرانہ" خیالات کو سن تو نہیں رہا ہے۔ والد صاحب کا اندیشہ اس لحاظ سے بہر حال درست تھا کہ چونکہ ان کے بعد مجھے ہی اس مندر کا پجاری ہونا تھا' اس لئے اگر کسی کو میرے ان خیالات کا پتہ چل جاتا تو بڑا فتنہ اٹھ کھڑا ہوتا۔ بہر حال جب والد صاحب کو اطمینان ہو گیا کہ مندر میں ان کے اور میرے علاوہ کوئی تیسرا شخص موجود نہیں ہے تو انہوں نے بڑی جاں سوزی اور محبت سے میری اس ذہنی پھانس کو نکالنے کی کوشش کی۔ انہوں نے وید اور اپنشدوں کے حوالے سے فلسفیانہ انداز میں اس بت گری اور بت پرستی کی توجیہہ پیش کرنے کی کوشش کی اور میں خاموشی سے سنتا رہا۔ والد صاحب کو خود بھی اچھی طرح اندازہ تھا کہ اگرچہ عمر کے اعتبار سے میں بچہ ہوں لیکن ذہنی طور پر بہر حال بچہ نہیں ہوں۔ وہ مجھے سمجھانے کے لئے خود بھی الجھتے چلے گئے۔ میری خاموشی انہیں اور بھی بوکھلائے دے رہی تھی۔ اور یہ احساس غالباً انہیں پریشان کئے دے

رہا تھا کہ انہی کا ایک نوعمر بیٹا اپنے عجیب و غریب سوالات کے ذریعہ ان کے فلسفے اور آبائی ذہنی تصورات کی دھجیاں بکھیر رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فلسفیانہ الجھاوؤں سے وہ خود ہی کچھ دیر میں اکتا گئے اور آخر میں انہوں نے مجھے نصیحت کرنے کی کوشش کی کہ میں اس قسم کے کافرانہ خیالات سے اپنے دل و دماغ کو بچاؤں ورنہ میں گمراہ ہو جاؤں گا۔ یہ کہہ کر والد صاحب نے گویا خود اپنی شکست کا اعتراف کر لیا تھا کہ وہ علمی اور عقلی طور پر مجھے مطمئن کرنے میں ناکام ہو گئے ہیں۔ میں خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔

دوسری بار جب کہ پنڈت جی کلاس روم میں رامائن کے ایک واقعہ سے متعلق لیکچر دے رہے تھے' میں نے اٹھ کر شری رام چندر جی کے اپنے بچوں کے معاملے میں غیر عادلانہ رویئے پر اعتراض کر دیا کہ رام چندر جی اگر دیوتا ہیں تو پھر اس ناانصافی کی توقع ان سے کیسے کی جا سکتی تھی؟ جبکہ ایک عام آدمی کے معاملے میں بھی یہ رویہ سخت قابلِ اعتراض ہے۔ پنڈت جی نے میرا اعتراض سن کر بجائے اس کے کہ کوئی عقلی اور علمی توجیہ پیش کرتے' مجھے دھمکانے کی کوشش کی کہ اگر میں یوں ہی اعتراض کرتا رہا تو میرا دھرم بھرشٹ ہو جائے گا وغیرہ اور میں دل ہی دل میں ہنس پڑا۔

تیسری بار شری کرشن جی سے متعلق میں نے پنڈت جی کے سامنے اعتراض کر دیا کہ آپ کہتے ہیں کہ شری کرشن جی دیوتا تھے۔ چلئے مان لیتا ہوں کہ وہ دیوتا ہی تھے' لیکن پھر ان کا جو کردار گوپیوں اور دوسری عورتوں کے معاملے میں ہمارے سامنے آتا ہے' اس سے انہیں دیوتا ماننے والوں کو کیا سبق حاصل کرنا چاہئے؟ کیا آپ یہ بات پسند کریں گے میں یا کوئی اور نوجوان ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اسی کردار اور طرزِ عمل کا مظاہرہ کرے؟ میری بات سن کر پنڈت جی کا چہرہ فق ہو گیا اور بڑی دیر تک سوچنے کے بعد انہوں نے جواب دیا کہ دیوتا یا بزرگ جو غلطیاں کرتے ہیں وہ دراصل غلطیاں ہوتی ہی نہیں نہ ان غلطیوں کی اتباع کرنا چاہئے اور نہ ان پر تنقید۔ پنڈت جی کی اس عجیب تاویل سے میرے ہونٹوں پر ایک بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ آگ بگولہ ہو گئے۔ بڑی دیر تک جوش اور غصے میں نہ جانے کیا کیا بکتے جھکتے رہے اور پھر آخر میں انہوں نے چیلنج کے انداز میں مجھے اس بات کا مشورہ دیا کہ میں اپنشدوں کا مطالعہ کروں۔ میں نے سعادت مندی

سے کہا کہ ٹھیک ہے۔ آپ ہی کوئی مستند تلگو ترجمہ فراہم کر دیں اور انہوں نے بخوشی اپنی آمادگی کا اظہار کر دیا اور پھر اسی شام انہوں نے میرے ہاتھوں میں ایک کتاب تھما دی اور مَیں اسے گھر لے آیا اور کافی رات تک اس کا بغور مطالعہ کرتا رہا۔ دورانِ مطالعہ ایک فقرے پر میری نگاہ جم کر رہ گئی" بھگوان ایک ہی ہے اور ایک کے علاوہ کچھ نہیں"۔ دوسرے دن مندر میں مَیں نے والد صاحب سے پوچھا کہ فلاں کتاب میں تو لکھا ہے کہ بھگوان ایک ہی ہے اور ایک کے علاوہ کچھ نہیں جبکہ آپ اور دوسرے لوگ ہزاروں خداؤں کے پرستار ہیں۔ یہ کیا معاملہ ہے؟ براہِ کرم وضاحت فرما دیجئے۔ والد صاحب نے جزو اور کل کی فلسفیانہ بحث شروع کر دی اور جب انہوں نے دیکھا کہ میری آنکھوں میں اطمینان کی بجائے مزید سوالات کی بے چینی کروٹیں لے رہی ہے تو وہ یک بارگی خاموش ہو گئے۔ مجھے ان کی بے بسی پر رحم آ گیا۔ اسی دن اسکول میں مَیں نے پنڈت جی سے بھی یہی سوال کیا تو وہ بغلیں جھانکنے لگے۔ میری بیزاری بڑھتی جا رہی تھی۔ انہی دنوں مَیں نے ہندومت سے متعلق تمام لٹریچر کا مطالعہ کر لیا اور بجائے اس کے کہ میری تشنگی ہوتی میری پیاس اور بڑھ گئی۔

پنڈت جی سے ایک بار مَیں نے ذات پات کی غیر عادلانہ تفریق و تقسیم کے موضوع پر بھی گفتگو کی۔ برہمن، کھتری، ویش اور شودر۔ کسی کے سر پر عزت و عظمت کا تاج اور کوئی پیدائشی ذلیل اور حقیر؟ ...... انسانوں کے درمیان یہ اونچ نیچ اور اس قدر غیر فطری درجہ بندی؟ غرضیکہ مَیں تنہائیوں میں گھنٹوں اسی قسم کے موضوعات پر غور و فکر کیا کرتا اور پھر اپنے نتائج فکر کی بنیاد پر کبھی والد صاحب سے اور کبھی پنڈت جی اور دوسرے مذہبی رہنماؤں سے بحث و مباحثے کیا کرتا اور انہیں اس درجہ زچ کیا کرتا کہ وہ اپنی زبان سے اس بات کا اعتراف کرنے لگے کہ وہ میرے سوالات کے علمی جوابات دینے سے قاصر ہیں۔ اب لوگ پہلے کی طرح مجھے فلسفیانہ چنیں چناں میں الجھانے کی کوشش کرنے سے خود ہی بچنے لگے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اپنے جذبۂ تحقیق و تجسس کی وجہ سے مَیں نے پورے مذہبی لٹریچر کو کھنگال ڈالا تھا۔ اب مَیں وید، بھگوت گیتا اور اپنشدوں کے اشلوکوں ہی سے ان کا رد کرنے لگا تھا۔ مجھے کتنے ہی سنسکرت اشلوک زبانی یاد ہو گئے تھے۔ علمی اظہار سے

میری تیاری اس درجہ کی ہو گئی تھی کہ اچھے خاصے پنڈت اور مذہبی رہنما مجھ سے گفتگو اور بحث ومباحثہ کرنے سے کترانے لگے تھے۔ میں مختلف طریقوں سے انہیں دعوت مبارزت دیتا اور وہ جھنجھلا کر خاموش ہو جاتے۔

ایک روز میں نے اپنے والد صاحب کی زبان سے بھی اعتراف حق کروا کر چھوڑا کہ خدائے واحد کی پرستش ہی عقلی وعلمی طریقہ ہے اور خود ویدوں سے بھی یہی ثابت ہے اور جب میں نے ان سے پوچھا کہ جانتے بوجھتے آپ بتوں اور ایک سے زائد خداؤں کی پرستش کیوں کرتے ہیں؟ تو انہوں نے وہی جواب دیا جو ہر زمانے کے مشرک دیتے رہے ہیں کہ باپ دادا سے یونہی چلا آ رہا ہے اور پھر شرک اور بت پرستی آج اس درجہ عام ہے کہ کوئی شخص اس کے خلاف کوئی دوسری بات سوچنے کے لئے بھی تیار نہیں اور اگر کوئی ایسا کر بیٹھے تو پھر اس کا جینا دشوار ہو جائے۔ ان کا اشارہ دراصل میری طرف تھا اور وہ مجھے ڈھکے چھپے انداز میں دھمکا رہے تھے کہ خبردار کوئی جراتِ رندانہ نہ کر بیٹھنا۔ میں خاموش ہو گیا۔

اب تک جو باتیں عرض کر چکا ہوں یہ دراصل میرے قبولِ اسلام کا پس منظر ہے اور اب میں یہ بات عرض کروں گا کہ کس مرحلے پر میں اسلام کی طرف متوجہ ہوا۔ میں بچپن ہی سے مصوری اور پینٹنگ کا دلدادہ رہا ہوں۔ زمانۂ طالب علمی میں مجھے ڈرائنگ سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ تھا۔ انہی دنوں ہمارے اسکول میں ایک نئے مسلمان ڈرائنگ ماسٹر صاحب تبدیل ہو کر آئے۔ ڈرائنگ سے میری غیر معمولی دلچسپی کے پیش نظر ایک ٹیچر نے نئے ڈرائنگ ماسٹر صاحب سے میری سفارش کر دی کہ وہ مجھ پر خصوصی توجہ دیں۔ بعد میں اس ٹیچر نے مجھے بتا بھی دیا کہ میں نے ڈرائنگ ماسٹر صاحب سے تمہاری سفارش کر دی ہے اور انہوں نے خصوصی توجہ کا وعدہ کیا ہے اور تمہیں گھر پر ملنے کے لئے کہا ہے۔ چنانچہ اس ٹیچر کی ہدایت کے مطابق شام کو میں ان کے گھر جا پہنچا۔ وہ اس وقت کھانا کھا رہے تھے۔ اگرچہ میں پہلی بار ہی ان سے مل رہا تھا لیکن میری آواز سنتے ہی وہ فوراً باہر آئے اور بڑی شفقت ومحبت سے میرا ہاتھ تھام کر اندر لے گئے۔ وہ تنہا ہی تھے۔ غالباً ان کے بیوی' بچے کچھ دن بعد آنے والے تھے۔ انہوں نے لوٹے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ہاتھ دھو لیجیے اور کھانے میں شریک ہو جایئے۔ ''جی؟'' مجھے حیرانی کا شدید جھٹکا لگا۔

''کیوں بھئی''؟ وہ مسکرائے۔ ''جی...... میں...... میں دراصل ہندو ہوں'' مجھے خیال ہوا کہ شاید وہ مجھے مسلمان سمجھ رہے ہیں''۔

''ہاں' ہاں مجھے معلوم ہے۔ سوریا نائیڈو تمہارا نام ہے''۔

''پھر میں آپ کے ساتھ بیٹھ کر کیسے کھا سکتا ہوں؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''کیوں نہیں کھا سکتے؟'' انہوں نے بھی حیرت سے کہا'' کیا میں انسان نہیں ہوں یا تم انسان نہیں ہو' ہندو یا مسلمان ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ تمہیں بھی اسی خدا نے پیدا کیا ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور یہ غذا جسے کھانے کی میں تمہیں دعوت دے رہا ہوں' یہ بھی انسانوں ہی کے کھانے کی ہے اور اس کا پیدا کرنے والا بھی وہی خدا ہے' جس نے تمہیں اور مجھے پیدا کیا ہے...... آؤ! آؤ!''۔

''کیا آپ کا مذہب اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ ایک غیر مذہب کے ماننے والے کسی شخص کو اپنے دسترخوان پر بٹھائیں؟''

''ہاں! ہاں!! اجازت دیتا ہے' جبھی تو میں تمہیں کھانے کے لئے کہہ رہا ہوں۔ تم تو پھر بھی نائیڈو ہو اگر کوئی شودر بھی چاہے تو میرے ساتھ بیٹھ کر یہی کھانا کھا سکتا ہے اور پھر آخر کیوں نہ کھائے؟ بھئی دنیا کے تمام انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں اور اس رشتے سے آپس میں بھائی بھائی ہیں اور پھر خدا کی نظر میں بھی حقیقتاً تمام انسان برابر ہیں۔ نہ کوئی بڑا نہ کوئی چھوٹا۔ ہاں اگر ان کے درمیان کوئی فرق ہے اور کوئی خدا کو زیادہ پسند ہے اور کوئی ناپسند تو وہ محض اس بنا پر ہے کہ کون اللہ سے زیادہ ڈر کر دنیا میں اس کے احکام کے عین مطابق زندگی گزارنے والا ہے اور کون اس کا نافرمان ہے۔ ورنہ یہ ذات پات' اونچ نیچ' نسل و وطن اور رنگ و زبان کی بنیاد پر انسانوں نے اپنے درمیان جو تفریقیں پیدا کر لی ہیں' اس سے خدا کی ذات بری الذمہ ہے اور حقیقتاً وہ پاک ذات ان سطحی قسم کے جذبات سے بہت بلند اور پاک ہے''۔

مساوات اور انسانی اخوت کے جو تصورات میرے ذہن میں تھے' وہ بھی تو تھے جو ماسٹر صاحب بتا رہے تھے۔ میں گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔

''بھئی تم کیا سوچنے لگے۔ آؤ کھانا کھاؤ' ٹھنڈا ہوا جا رہا ہے اور پھر ہمیں ابھی

دوسرے کام بھی تو کرنے ہیں۔ انہوں نے مجھے ٹوکا تو میں اپنے خیالات کی دنیا سے نکل آیا اور یہ دیکھ کر مجھے بڑی شرمندگی ہوئی کہ وہ میرے انتظار میں ابھی تک ہاتھ روکے بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے جلدی سے لوٹا اٹھا کر ہاتھ دھویا اور دستر خوان پر بیٹھ گیا اور میں پھر ایک بار یہ دیکھ کر حیران سا ہو گیا کہ چاول کا برتن ایک ہی ہے۔

''بھئی کب تک سوچتے رہو گے؟ کھانا لیتے کیوں نہیں؟'' انہوں نے مجھے الجھن میں مبتلا دیکھ کر پھر ٹوکا۔

''جی کچھ نہیں' کیا اسی برتن سے کھانا لوں''؟

''ہاں ہاں۔ پھر اور کس سے لو گے؟ چلو شروع کرو''۔

اور میں نے کھانے کے برتن کی طرف ہاتھ بڑھا دیا اور خاموشی سے کھانے لگا۔

میرے دل و دماغ میں ایک عجیب سا ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ ہمارے اپنے طرز معاشرت اور آداب نشست و برخاست سے یہ طریقے کس درجہ ممتاز اور فطری تھے۔ کوئی تکلف نہیں' کوئی اجنبیت نہیں، کوئی اونچ نیچ نہیں اور پھر ماسٹر صاحب کی شفقت و محبت نے بھی مجھ پر سحر سا کر دیا تھا۔ میں نے چور آنکھوں سے ان کے سراپا کا جائزہ لیا۔ نکلتا ہوا قد' ورزشی جسم' بلند و بالا پیشانی' کھڑا جسم' بھرپور سیاہ ڈاڑھی' کانوں تک زلفیں' کپڑے کی دو پلی ٹوپی سر پر' آنکھوں میں سادگی' شرافت اور معصومیت۔ پیوستہ لب' بیک نظر بڑے خاموش اور سنجیدہ معلوم ہوئے۔ لیکن بات کرتے تو مسکراہٹ کی چاندنی چہرے پر پھیل جاتی اور پھلجڑیاں سی چھوٹنے لگتیں۔ اچانک انہوں نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا تو جیسے میری چوری پکڑی گئی۔

وہ میری گھبراہٹ دیکھ کر مسکرائے۔ ''بھئی تم کھاتے کیوں نہیں؟' کیا سوچ رہے ہو۔ تکلف بالکل نہ کرو اور اسے اپنا ہی گھر سمجھ کر اطمینان سے کھاؤ''۔

''ماسٹر صاحب''! بڑی دیر کے بعد میں نے زبان کھولی ''انسانی مساوات وغیرہ سے متعلق ابھی جو باتیں آپ نے بتائی ہیں' یہ آپ کے شخصی خیالات ہیں یا اسلام ہے ہی ایسا روادار اور فطری مذہب''؟

''میں نے تمہیں جو کچھ بتایا ہے وہ اسلام کے احکام اور اس کی تعلیمات ہی ہیں میری کوئی ذاتی حیثیت نہیں ہے۔ میں اول و آخر مسلمان ہوں' گھر میں بھی اور گھر سے باہر

بھی۔ اسلام میں دراصل اس قسم کی دورنگی اور ڈبل ایکٹنگ کی کوئی گنجائش موجود نہیں کہ آدمی ایک موقع پر خدا کی اطاعت کا پابند ہو اور ایک موقع پر اپنی مرضی اور خواہشات کا تابع۔ اسلام غیر مشروط اطاعت اور لامحدود دائرہ اقتدار چاہتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ معروف معنوں میں محض مذہب نہیں ہے بلکہ ایک دین ہے۔ ایک طریقۂ زندگی (WAY OF LIFE) ہے؟ مکمل ضابطہ حیات ہے۔ آئندہ کے لئے بھی یہ ہدایت نوٹ کرلو کہ تم مجھے جو کچھ بھی کرتے یا کہتے ہوئے دیکھو گے انشاءاللہ وہ سب اسلام کی ہدایات کے مطابق ہی ہوگا اور پھر میری اپنی پسند یا ناپسند کا سوال ہی کیا ہے۔ میں کیا جانوں کہ کون سی بات اور کون سا طرزِ عمل میرے لئے صحیح ہے یا غلط ہے۔ یہ تو ہمارا اور اس کائنات کا خالق و فرمانروا ہی جان سکتا ہے کہ میرے لئے کیا اچھا ہے اور کیا برا۔ جس طرح ایک مشین کا بنانے والا ہی صحیح طور پر یہ بات جان سکتا ہے کہ...... پرزے کیسے بنائے جائیں۔ کہاں فٹ کئے جائیں۔ اور کس طرح اس مشین کو استعمال کیا جائے کہ وہ اپنے بنائے جانے کے مقصد کو پورا کرے۔ بالکل ایسا ہی معاملہ ہمارا اور خالقِ کائنات کا ہے۔ وہی ہمارا خالق بھی ہے، علیم وخبیر بھی۔ اس مصلحت سے واقف بھی جو ہمارے مقصدِ وجود کی اصل وجہ ہے۔ وہی یہ بات قطعی طور پر بتا سکتا ہے کہ ہمارے لئے مفید و مضر اور خیر و شر کیا ہے اور ظاہر ہے کہ انسان کے لئے صحیح ترین طرزِ عمل یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے خالق کی ہدایات اور احکام کے مطابق ہی اپنی زندگی گزارے ورنہ اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو بندر کے ہاتھ میں استرا دینے کی صورت میں ہو سکتا ہے اور فی الواقع جب اور جہاں بھی انسان نے ان حدود سے تجاوز کی کوشش کی جو خالقِ کائنات نے اس کے لئے مقرر فرمائے تھے تو تاریخ شاہد ہے کہ انسان کا وہی حشر ہوا جو استرا بدست بندر کا ہو سکتا ہے۔

"لیکن سوال یہ ہے کہ خالقِ کائنات کی رہنمائی آخر کہاں سے ملے اور اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ جس چیز کو خدائی رہنمائی کہہ کر پیش کیا جا رہا ہے وہ فی الواقع خدا کی رہنمائی ہی ہے، کچھ خود غرض انسانوں یا طبقات کے حصولِ مفاد کا ذریعہ نہیں"؟ میں نے ماسٹر صاحب کی بات کاٹ کر پوچھا۔ میرا متجسس ذہن بیدار ہونے لگا تھا اور دیر سے اجنبی ماحول اور خود ماسٹر صاحب کی مسحور کن شخصیت کی وجہ سے میں اپنے دل و دماغ پر جو بوجھل

پن محسوس کر رہا تھا' وہ اب چھٹ رہا تھا۔
''یہ معلوم کرنا تو کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ ذرا سے غور و فکر سے ہم ایک ایسی کسوٹی فراہم کر سکتے ہیں جس پر پرکھ کر ہم کھرے اور کھوٹے میں فوراً تمیز کر سکتے ہیں''۔ ماسٹر صاحب نے بھی فوراً ہی جواب دیا۔

''ذرا براہِ کرم وضاحت فرما دیجئے''۔ مَیں نے گزارش کی۔

''بھئی ہم چاہیں تو اپنے ذہن میں چند سوالات متعین کر سکتے ہیں:

۱۔ کہ جس چیز کو خدائی رہنمائی کہہ کر پیش کیا جاتا ہے کیا وہ انسانی فطرت و مزاج سے کوئی مناسبت بھی رکھتی ہے یا نہیں؟

۲۔ کہ اس رہنمائی کا دائرہ کچھ مخصوص افراد یا کسی مخصوص قوم یا ملک کی حد تک ہی محدود ہے یا یہ کوئی ایسی آفاقی نوعیت کی رہنمائی ہے جو نہ صرف یہ کہ انسانی زندگی کے تمام گوشوں اور شعبوں کو محیط ہے اور ان سے متعلق واضح اور دوٹوک قسم کی رہنمائی دے سکتی ہے بلکہ اس کا دائرہ قوم و وطن' رنگ و نسل اور زبان و تہذیب کے امتیازات سے ماورا ہے کہ جو شخص چاہے اس کے اصولوں پر ایمان لا کر اور اسے اختیار کر کے فائدہ اٹھا لے۔

۳۔ دیکھنا چاہئے کہ اس رہنمائی کو اختیار کرنے کے نتیجے میں کس قسم کے افراد یا معاشرہ تیار ہوتا ہے۔ ایک ایسا معاشرہ کہ جس میں نیکیاں فروغ پا سکیں اور پروان چڑھ سکیں یا ایک ایسا معاشرہ جو انسانی زندگی کو فتنہ و فساد سے بھر دے۔

۴۔ پھر دیکھنا چاہئے کہ آیا یہ رہنمائی انسان کی صرف اُخروی نجات ہی سے بحث کرتی ہے یا انسانی زندگی کے عملی گوشوں پر بھی محیط ہے کہ اس کے اختیار کرنے کے نتیجے میں انسان کی دنیا سنور جائے یعنی وہ ایک مطمئن' خوشگوار اور پُرسکون دنیوی زندگی بھی گزار سکے اور جب وہ اس دنیا کو چھوڑ کر اپنے مالکِ حقیقی کے روبرو پہنچے تو اُخروی خسران اور گھاٹے سے دوچار نہ ہو اور اپنے رب کی رضا اسے حاصل ہو جائے۔

''کسی مذہب کی حقانیت اور صداقت کو پرکھنے کے لئے آپ نے جو کسوٹی فراہم کی ہے کیا اس معیار پر خود اسلام پورا اترتا ہے؟'' مَیں نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ''اور اگر اسلام پورا اترتا ہے تو کیا اسلام کے علاوہ بھی کوئی مذہب ایسا ہے جو اسی معیار پر پورا

اتر تا ہو اور اگر ہے تو پھر اسلام پر ہی آپ قانع کیوں ہیں''؟

''عزیزم! تم نے بیک وقت کئی سوالات کر دیئے ہیں اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تمہارا ذہن متجسس ہے اور یہ اچھی بات ہے۔ تمہارے سوالات کے سلسلہ وار جوابات تو مَیں ابھی دوں گا لیکن پہلے تم یہ بتاؤ کہ مَیں نے جس کسوٹی کا ذکر کیا ہے کیا تم اس سے متفق ہو''؟

''بڑی حد تک'' ! مَیں نے جواب دیا۔ 'مَیں نے اس موضوع پر کافی غور و فکر کیا ہے اور خود میرا خیال بھی بالکل یہی ہے کہ مذہب کو ایسا ہی ہونا چاہئے جیسا کہ آپ نے فرمایا''۔

''ٹھیک ہے' اب تم اپنے سوالات کے جوابات سنو''۔

''میری متذکرہ کسوٹی پر اسلام سو فیصد پورا اترتا ہے اور اسی لئے مَیں نے اسے شعوری طور پر اختیار کیا ہے۔ مَیں محض اس لئے مسلمان نہیں ہوں کہ میرے ماں باپ مسلمان تھے بلکہ اس لئے مسلمان ہوں کہ مَیں نے ہوش سنبھالنے کے بعد مختلف مذاہب کا تحقیقی مطالعہ کرنے کے بعد ہی اسلام کو بلا جبر و اکراہ شعوری آمادگی کے ساتھ اختیار کیا ہے''۔ ماسٹر صاحب نے سنجیدگی سے بتایا۔ تمہارے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے اسلام کے علاوہ حقیقتاً کوئی اور مذہب ایسا نہیں ہے جو ان شرائط پر پورا اترتا ہو اور تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ جب کوئی ایسا قابلِ ترجیح مذہب موجود ہی نہیں تو پھر اسے اختیار کرنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے''؟

اس دوران میں مَیں کھانا ختم کر چکا تھا۔ مَیں نے دیکھا کہ ماسٹر صاحب میرے اٹھنے تک دستر خوان ہی پر بیٹھے رہے اور تھوڑا تھوڑا کر کے چکھنے کے انداز میں کھاتے بھی رہے تا کہ مجھے یہ احساس نہ ہو کہ دستر خوان پر مَیں اکیلا ہی رہ گیا ہوں۔ ماسٹر صاحب کے اس طرزِ عمل نے بھی مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ کہاں تو ہمارے ہاں یہ طریقہ ہے کہ دور دور بیٹھ کر الگ الگ پتر ولیوں یا برتنوں میں کھاتے ہیں اور کہاں یہ یگانگت اور بے تکلفی کہ ایک ہی برتن میں سے سبھی لے رہے ہیں۔ یہ بظاہر ایک معمولی بات تھی لیکن مجھ جیسے شخص کے لئے یہ بھی فکر و نظر کی جلا کا سبب بنی اور مَیں صفائی کے ساتھ اس بات کا اعتراف کر لوں کہ اسی دن میرے قلب میں اسلام کا بیج پڑ گیا۔ اب یہ اور بات ہے کہ اس کی مکمل نشو و نما کے لئے مزید تین سال لگے۔

ماسٹر صاحب کے پاس سے لوٹ کر میں اپنے اندر ایک عجیب قسم کی حیات آفرین تبدیلی محسوس کرنے لگا تھا جیسے ایک مسلم کی حیثیت سے میرے وجود کی تشکیل شروع ہو گئی ہے۔ ماسٹر صاحب کی دی ہوئی کتابوں کو پڑھ کر میں گھنٹوں غور وفکر کیا کرتا۔ خوش قسمتی سے میری تعلیم اردو میڈیم ہی سے ہو رہی تھی اور اس کے نتیجے میں مجھے اسلامی لٹریچر کے مطالعے کی بڑی سہولت تھی۔ ماسٹر صاحب سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ جماعت اسلامی کے رکن ہیں۔

میرا ماسٹر صاحب سے دن بدن بڑھتا ہوا ربط وضبط' میرے والد' رشتہ داروں اور مدرسے کے دوسرے تنگ نظر اساتذہ خصوصاً پنڈت جی کے لئے ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ ظاہر بات ہے کہ توحید' رسالت اور آخرت سے متعلق میں جو باتیں بھی ماسٹر صاحب سے سنتا یا خود کتابوں میں پڑھتا' ان کی بنیاد پر میں اپنے والد اور اساتذہ کو آزادانہ تبادلۂ خیال کی دعوت دیتا۔ میری گفتگو سن کر ایک دن پنڈت جی نے پیش گوئی بھی کر دی کہ اگر یہی حال رہا تو کچھ تعجب نہیں کہ تم کسی روز مسلمان ہو جاؤ اور شاید پنڈت جی کی یہی ایک بات ایسی تھی جس کی میں نے بالکل تردید کرنے کی کوشش نہیں کی ورنہ عام طور پر وہ شرک وبت پرستی کو صحیح ثابت کرنے کے لئے جونہی زبان کھولتے' میں ان کا تعاقب شروع کر دیتا اور بہ دلائل ان کا رد کرتا۔ زچ ہو کر پنڈت جی نے مجھے دعوت دی کہ میں ہندومت کی فلاں فلاں کتب کا مطالعہ کروں تو میرے شکوک وشبہات دور ہو جائیں گے۔ میں نے بخوشی ان کی بات منظور کر لی اور ان کی دی ہوئی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ پنڈت جی کا خیال تھا کہ میں ان موٹی موٹی کتابوں اور بھاری اصطلاحوں سے مرعوب ہو جاؤں گا لیکن جب ان کی دی ہوئی پہلی کتاب کے مطالعے کے بعد ہی میں نے انہیں دعوت دی کہ آپ یہ ثابت کیجئے کہ ہندومت کا عقیدۂ تخلیقِ کائنات علمی وعقلی کسوٹی پر پورا اترتا ہے تو وہ بوکھلا گئے اور ہنس کر ٹال دیا۔ دوسری کتاب پڑھ کر میں نے انہیں دعوت دی کہ آپ یہ ثابت کیجئے کہ وید الہامی کتب ہیں اور یہ بھی ثابت کیجئے کہ آپ کے دعوے کے مطابق واقعی ان کا زمانۂ تصنیف وہی ہے جو آپ کہتے ہیں یا پھر میں انہی کتابوں سے اس کے برخلاف ثابت کرنے کو تیار ہوں۔ وہ میری بات سن کر پھر کنی کاٹ گئے۔ تیسری کتاب پڑھ کر میں نے انہیں

دعوت دی کہ آپ ثابت کیجئے کہ وید کتنے ہیں؟ تین یا چار؟ اور پھر جن کی طرف انہیں منسوب کیا جاتا ہے ان کی تعداد کتنی ہے یا پھر میں یہ ثابت کرتا ہوں کہ ویدوں کے وجود میں آنے سے متعلق اتنی متعدد حکایتیں موجود ہیں کہ ان پر اعتبار مشکل ہے۔ آخر کار تنگ آ کر پنڈت جی نے ہتھیار ڈال دیئے اور مجھے کتابیں دینا بند کر دیں لیکن مطالعہ اور تحقیق کا چسکا مجھے لگ چکا تھا۔ اب میں نے خود مختلف کتابیں فراہم کر لیں اور ان کا تحقیقی مطالعہ شروع کر دیا اور اس طرح پران' بھگوت گیتا' اپنشدوں اور ویدوں سے مجھے توحید کے اثبات اور شرک کے رد میں اتنے دلائل مل گئے کہ اس موضوع پر میرا مطالعہ تقریباً مکمل ہو گیا۔ جبکہ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ انہی کتابوں میں کہیں شرک کی تائید تھی کہیں پر ایک چیز پسندیدہ تھی تو دوسرے مقام پر وہی چیز ناپسندیدہ۔ تخلیقِ کائنات' برہما جی کی پیدائش' آسمان اور خدا کی پیدائش' دیوتاؤں کا وجود' ان کی تعداد' ان کی نسبتیں' ان کے عادات و اطوار اور طرزِ عمل' یہ تمام مباحث ایسے تھے جن پر میں نے بارہا اچھے اچھے جغادری قسم کے پنڈتوں کی زبان بند کر دی۔ میں علمی اور عقلی دلائل مانگتا تھا اور یہی جنس ان کے ہاں نایاب تھی۔

رفتہ رفتہ ہندو حلقوں میں میری یہ ''کافرانہ روش'' اور مزاج و طبیعت ایک دلچسپ موضوعِ بحث بن گئی۔ اشارے کنائے ہونے لگے۔ انگلیاں اٹھنے لگیں، لیکن میرے معاملے میں لوگ عجیب مصیبت کا شکار تھے۔ وہ مجھے دہریہ یا ناستک کہہ کر اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکتے تھے' اس لئے کہ میں حیاتِ انسانی کے لئے مذہب کو ناگزیر کہتا اور سمجھتا تھا۔ وہ کھلے بندوں میری مذمت بھی نہیں کر سکتے تھے اس لئے کہ میں ایک محترم پجاری کا لڑکا تھا اور دھاندلی نہیں کر رہا تھا بلکہ علمی تشفی چاہتا تھا۔

انہی دنوں مجھے ایک آریہ سماجی ہاسٹل میں کچھ دن قیام کا موقع ملا۔ یہ دور بھی بڑا دلچسپ گزرا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں میٹرک میں پڑھ رہا تھا اور کثیر اسلامی لٹریچر ہضم کر چکا تھا اور ان دنوں مولانا مودودی کی تفہیم القرآن کا مطالعہ کر رہا تھا۔ قرآنِ حکیم نہ صرف یہ کہ میرے قلب و روح میں اترا جا رہا تھا بلکہ اس کی ایک ایک آیت پر میں یہ محسوس کر رہا تھا جیسے یہی وہ سرچشمۂ حیات تھا جس کے لئے نہ جانے کب سے میں سرگرداں تھا۔ ایک

دن جب کہ تمام طلبہ اور مدرسین پوجا میں مصروف تھے، میں اپنے کمرے میں قرآن کھولے بیٹھا تھا۔ اتفاقاً ہوسٹل کا وارڈن ادھر سے گزرا تو مجھے کمرے میں بیٹھا دیکھ کر ٹھٹھک گیا اور پھر اس نے مجھے ڈانٹنے کی کوشش کی کہ سب لوگ کہاں ہیں اور تم کہاں ہو؟۔ میں نے اسے جواب دیا کہ آپ کے ہاسٹل میں ٹھہرنے کا یہ مطلب بہر حال نہیں کہ ہر طالب علم آپ کے نقطہ نظر سے اتفاق بھی کرے اور پھر آپ خود بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہائی اسکول سے آپ نے ہم طلبہ کو اپنی غرض کے لئے یہاں لا کر ٹھہرایا ہے ورنہ میں مقامی طالب علم ہوں۔ کھاتے پیتے گھرانے کا فرد ہوں اور اس ہاسٹل میں قیام کا ہرگز محتاج نہیں۔ میری یہ کھری کھری باتیں سن کر وارڈن خفیف ہو گیا اور پھر اپنی خفت مٹانے کے لئے اس نے قرآن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کہ یہ کیا ہے اور تم اردو کتابیں کیوں پڑھ رہے ہو۔ میں نے پورے اطمینان سے جواب دیا کہ یہ قرآن حکیم ہے اور میں اس کا تحقیقی مطالعہ کر رہا ہوں۔ رہا یہ سوال کہ میں اردو کتابیں کیوں پڑھ رہا ہوں تو یہ سوال کرنے کا آپ کو بہر حال اختیار نہیں ہے۔ وارڈن خاموشی سے چلا گیا اور پھر دوسرے ہی دن غالباً "سخت خطرناک" سمجھ کر مجھے ہاسٹل سے خارج کر دیا گیا۔

یہ میرا ہائی اسکول کا آخری سال تھا اور پھر اس کے بعد مجھے کالج میں تعلیم حاصل کرنا تھی لیکن میں نے اپنی زندگی کے لئے جو راستہ اختیار کیا تھا اس کے مطالبات کچھ اور ہی تھے۔ میری منزل سامنے تھی اور حق واضح ہو جانے کے بعد باطل پر ڈٹے رہنے کی منافقت یا بے حیائی مجھ سے ممکن نہ تھی۔ میں نے ماسٹر صاحب پر اپنے عزائم کا اظہار کر دیا تھا کہ میٹرک کے امتحان کے ساتھ ہی میں انشاء اللہ اپنے قبولِ اسلام کا باضابطہ اعلان کر دوں گا۔ میری بات سن کر ماسٹر صاحب نے کہا کہ خوب اچھی طرح سوچ لو' موجودہ دور بھی اس دور سے کچھ مختلف نہیں ہے جب ایمان و اسلام کی قیمت چکانے کے لئے جان کی بازی بھی لگا دینی پڑتی تھی اور پھر یہ بھی اچھی طرح سمجھ لو کہ تم نے جس راہ کا انتخاب کیا ہے اس کی نوعیت کچھ یک رخے راستے (ONE WAY) کی سی ہے کہ ایک بار اس پر قدم رکھ کر پھر لوٹنے یا پسپائی اختیار کرنے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ اس لئے خوب اچھی طرح غور کر لو کہ نتائج و عواقب سے تم عہدہ برآ ہو سکو گے یا نہیں۔ میں نے جواب دیا سَتَجِدُنِی

اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصَّابِرِیْن (انشاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے)۔ میں نے مزید کہا کہ بخدا مجھے خود بھی کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔ میں اپنے اس انقلابی اقدام کے نتائج سے بخوبی واقف ہوں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ:

جو راہ ادھر کو جاتی ہے مقتل سے گزر کر جاتی ہے

اللہ کی جنت سستے داموں ملنے والی نہیں۔ اگرچہ یہ بندہ حقیر اس کی قیمت چکانے سے بہر حال قاصر ہے لیکن اگر خود اسی کی توفیق ہو تو متاع جاں کو ترازو کے ایک پلڑے میں تو ضرور ہی ڈال سکتا ہے۔ اب اس کی قدر و قیمت اور وزن مولی کی نگاہ میں جو چاہے کچھ ہو اور پھر ویسے بھی مومنوں کی جان اور ان کے مال تو اللہ پہلے ہی جنت کے عوض خرید چکا ہے۔

ماسٹر صاحب کی پلکوں پر چراغ جل اٹھے اور انہوں نے مجھے سینے سے بھینچ لیا۔

آخر میری زندگی کی وہ صبح سعادت طلوع ہو کر رہی جس کا میں منتظر تھا۔ یہ جمعے کا دن تھا۔ میں نے غسل کیا' صاف ستھرے کپڑے پہنے' اور اپنی زندگی کی پہلی نماز' نماز جمعہ مسجد میں ادا کی اور نماز کے بعد کھڑے ہو کر میں نے اعلان کیا کہ:

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔

ترجمہ...... میں نے یکسو ہو کر اپنا رخ زمین و آسمان کے خالق کی طرف کر لیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

اور پھر کلمۂ شہادت پڑھنے کے ساتھ ہی لوگ مجھ سے مصافحہ کرنے' ملنے اور مجھے دیکھنے کے لئے اُمڈ پڑے۔

اپنے دینی بھائیوں سے مصافحہ و معانقہ نے میرے قلب و روح کو جیسے گرما دیا۔ لوگوں کی گرمجوشی کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص مجھ تک پہنچنا چاہتا تھا اور زندگی میں پہلی بار مجھے اس بات کا اندازہ ہوا کہ اخوت اسلامی کیسی نعمت ہے اور اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ کیوں کہا گیا ہے۔ لوگوں کے اس بے پایاں اخلاص کو سہارنا تک میرے لئے مشکل ہو رہا تھا۔ بیساختہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور پھر میں نے دیکھا کہ میں ہی آبدیدہ نہیں ہوں بلکہ کتنی ہی آنکھیں ہیں جن سے ستارے ٹوٹ رہے ہیں۔ اللہ اکبر! ایک گناہ گار بندے کے

لئے لوگوں کا یہ اخلاص؟ ابھی کل تک نہ یہ میرے کچھ لگتے تھے اور نہ میں ان کا کچھ لگتا تھا لیکن آج میری زبان سے نکلے ہوئے ایک معجز نما کلمہ نے دنیا میں میرے ۷۰ کروڑ بھائی پیدا کر دیئے تھے۔ اس کلمہ کا اعجاز تو مجھے آج ہی نظر آیا تھا۔ زبان کی ایک جنبش کے ساتھ میرے رب کے ان احسانات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو مومنوں کے لئے خاص تھے۔ آج سے میرا اور دنیا کے ستر کروڑ مسلمانوں کا درد ایک تھا۔ قطرہ دریا میں مل گیا تھا۔ ایک حقیر قطرہ آج دریا ہو گیا تھا۔ میرے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلی: "خداوندا! تو نے مجھے جو آج سب سے بڑی نعمت عطا فرمائی ہے' وہ پھر مجھ سے چھین نہ لینا' میرے قلب کو پھر کبھی اس کی طرف سے نہ پھیرنا"۔

ماسٹر صاحب نے میرا نام عبدالرحمٰن رکھا اور بخدا مجھے یہ نام بڑا بھلا لگا۔ کیا یہ کوئی معمولی اعزاز ہے کہ لوگ مجھے میرے مولیٰ کے نام کی اس نسبت سے پکاریں جس کا ہر انسان محتاج ہے۔ ربِّ رحمٰن! ہاں ہم تیرے رحم و کرم ہی کے محتاج ہیں۔ تیرے اسی اسمِ حسنیٰ کا ورد کرتے ہوئے میں قیامت میں کشاں کشاں تیرے حضور پہنچوں گا اور تجھے بتاؤں گا کہ میں تیرا وہ بندہ ہوں جسے دنیا میں لوگ رحمٰن کا بندہ کہا کرتے تھے۔ کیا آج تو اپنے اس نام کا پاس نہ فرمائے گا؟ کیا آج تو اپنے اس بندے کو ذلیل و رسوا کر دے گا جو تیرے اس نام کی صفت اور نسبت کی آس لگائے ہوئے ہی تیرے پاس آیا ہے۔ میرے کریم آقا! مجھے اپنے دامنِ رحمت میں ڈھانپ لے اور اپنے اس نام کا بھرم رکھ اور مجھے یقین ہے کہ میری یہ درد بھری صدا دریائے رحمت کو جوش میں لے آئے گی اور میں اس میں غرق ہو جاؤں گا۔ میرے آگے' پیچھے' دائیں' بائیں' اوپر' نیچے تیری رحمت ہو گی۔

میرے اعلانِ اسلام کے ساتھ ہی مرحلۂ ابتلا و آزمائش شروع ہو گیا۔ ذرّے نے پہاڑوں کا منہ چڑایا تھا۔ نور کی ایک کرن نے ظلمتوں کا کلیجہ چھید دیا تھا۔ باطل نے اعلانِ حق کے ساتھ ہی اپنے لاؤ لشکر سمیٹے اور یلغار کر دی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے آبادی میں بم پھٹ پڑا ہو۔ دور دور تک اس کی بازگشت سنی گئی۔ ہر شخص کی زبان پر یہی تذکرہ تھا۔ میرے

والدین، رشتہ داروں اور بھائیوں کو تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ میرے قریبی احباب تک نے کھلے طور پر جان کی دھمکیاں دیں، لعنت ملامت، طنز و تعریض، تحقیر و تذلیل غرض کتنے ہی زہریلے نشتر تھے جنہیں میں اپنے کلیجے پر سہہ رہا تھا۔ مجھے وراثت سے محروم کر دینے کا اعلان کر دیا گیا۔ بھائیوں نے اعلان کر دیا کہ میں اگر مر بھی رہا ہوں تو وہ صورت دیکھنا بھی پسند نہ کریں گے۔ کہا گیا کہ اگر میں نے گھر کی طرف رخ بھی کیا تو پھر میری گردن ماردی جائے گی۔

تیسرے دن میں اپنے گھر گیا اور سیدھا والد صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور بے رخی سے منہ پھیر لیا۔ ان کی اس بے رخی اور نفرت کا مجھے ذرہ برابر بھی ملال نہ تھا، اس لئے کہ اول تو میرے لئے یہ بات غیر متوقع نہ تھی اور پھر دوسری بات یہ کہ ان کے اس غم و غصے کے پس منظر میں جو جذبہ کارفرما تھا وہ بڑی حد تک فطری تھا۔ بھلا وہ اس سانحۂ عظیم کو آسانی کے ساتھ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ ان کا وہ بیٹا جس سے انہوں نے بڑی بڑی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں "بے دین" ہو جائے اور "ملیچھ" مسلمانوں کا ہم پیالہ و ہم نوالہ ہو جائے۔ میں ان کے سامنے پہنچ کر خاموشی سے اس بات کا انتظار کرتا رہا کہ وہ پہلے اپنے دل کی بھڑاس نکال لیں اور ان کا جی کچھ ہلکا ہو تو میں اپنی بات کہوں، لیکن جب مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس وقت وہ مجھے ڈانٹنے کے موڈ میں نہیں ہیں تو میں نے ہی زبان کھولنا مناسب سمجھا۔ میں نے کہا "پتا جی! اس واقعہ کا آپ کو جو رنج ہو سکتا ہے، مجھے اس کا اچھی طرح اندازہ ہے۔ لیکن آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میرا قبولِ اسلام کوئی جذباتی اقدام نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے میری برسوں کی تلاشِ حق کی تاریخ ہے۔ آپ اس بات سے بھی ناواقف نہیں ہیں کہ میں نے اپنے دینِ آبائی کو سمجھنے اور اس سے مطمئن ہونے کی پوری امکانی کوشش کی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ناکام رہا۔ آپ بخوبی واقف ہیں کہ مذہب کا تعلق انسان کی دُنیوی اور اُخروی زندگی کی فلاح سے ہے۔ اس قدر اہم معاملے میں تمیں ظاہر ہے آپ کو یا کسی اور کو خوش کرنے کے لئے ایک ایسی چیز کو اپنے سینے سے کیسے لگائے رکھ سکتا تھا، جس سے میرا قلب و ضمیر قطعاً مطمئن نہ ہو؟ آنکھوں دیکھی مکھی کون نگلے گا۔ میں نے امکانی تحقیق و جستجو کے بعد اسلام کو اپنی دنیوی اور اخروی زندگی کی فلاح و کامرانی کا ضامن سمجھ کر ہی اختیار کیا ہے۔ آپ میرے پتا جی ہیں۔ میرا وجودِ مادی آپ

اسی کے وجود کا پرتو ہے۔ پھر کیا میں آپ کو بھی اس راستے کی طرف دعوت نہ دوں، جس پر چل کر ہی ایک شخص اپنے مقصدِ وجود کو پورا کر سکتا ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا آپ کو میری طرح صراطِ مستقیم پر گامزن کرے"۔

میری بات سن کر پتا جی نے یکبارگی نگاہیں اٹھا کر مجھے بغور دیکھا اور کچھ سوچتے رہے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ میری بات کا کوئی معقول جواب سوچ رہے ہوں یا پھر یہ سوچ رہے ہوں کہ میں کس قدر گستاخ ہوں کہ اپنے پجاری باپ کو بھی دعوتِ اسلام دینے سے نہیں چوکتا۔ بہر حال میری بات کا جواب ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ انہوں نے بیزاری سے دوسری طرف منہ پھیر لیا اور میں اٹھ کر چلا آیا۔

میرے قبولِ اسلام کے تقریباً ایک ماہ بعد مجھے اچانک اطلاع ملی کہ پتا جی سخت علیل ہیں۔ اطلاع پاتے ہی میں ان کی خدمت میں پہنچ گیا۔ دراصل اسی بہانے میں ایک اور کوشش کر کے دیکھنا چاہتا تھا کہ کل قیامت کے دن مجھ پر یہ الزام نہ آئے کہ میں نے اتمامِ تبلیغ نہ کی تھی۔ والد صاحب نے اشارے سے مجھے قریب بلا کر بیٹھنے کے لئے کہا۔ گزشتہ ایک مہینے ہی میں وہ کچھ سے کچھ ہو گئے تھے۔ مجھے توقع نہ تھی کہ میں انہیں اس خراب و خستہ حالت میں دیکھوں گا۔ انہیں اس درجہ بیمار دیکھ کر میرا دل بھر آیا اور وہ خود بھی آبدیدہ ہو گئے۔ میں نے سوچا کہ شاید اس آخری وقت ہی میں سہی وہ کوئی صحیح فیصلہ کر لیں اور جہنم کی آگ سے بچ جائیں۔ میں ان کے قریب ہی چارپائی پر بیٹھ گیا اور وہ بڑی دیر تک آنکھیں بند کئے لیٹے رہے اور پھر جب انہوں نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا تو ان کی آنکھوں میں عجیب سی حسرتیں کروٹ لے رہی تھیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ مجھ سے بالکل مایوس ہو گئے تھے یا پھر ہنوز انہیں یہ توقع تھی کہ میں دینِ آبائی کی طرف لوٹ آؤں گا۔ انہوں نے میرا ہاتھ اپنے سرد ہاتھوں میں لے لیا اور اسے ہلکے سے دبایا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگے۔ غالباً وہ میرے عزائم کا جائزہ لے رہے تھے کہ یہ کس درجہ پختہ ہیں اور پھر شاید انہیں جلد ہی احساس ہو گیا کہ مجھ سے توقعات باندھنا فضول ہے۔

"پتا جی"! میں نے بھرائی ہوئی آواز میں انہیں مخاطب کیا "کیا آپ ضمیر کی پوری طمانیت اور تسکین کے ساتھ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ میں نے کوئی غلط اقدام کیا ہے؟"

میری بات سن کر ان کے چہرے پر شدید اندرونی کرب و اضطراب اور کشمکش کے آثار ظاہر ہوئے' جیسے وہ فیصلہ نہ کر پا رہے ہوں کہ انہیں کیا کہنا چاہئے۔ کچھ دیر ان پر تشنج کی سی کیفیت طاری رہی اور پھر ان کی مدھم سی آواز ابھری جیسے کسی گہرے کنویں سے بول رہے ہوں۔

''تمہارا فیصلہ..... شاید درست ہی ہے۔ اف''! میں نے سوچا'' حق کا اعتراف کرنا کتنا مشکل کام ہے' سچ کو سچ کہنے کے لئے بھی لوگوں کو اپنے آپ پر کتنا جبر کرنا پڑتا ہے''۔

''پتا جی! پھر آپ حق کو حق جاننے کے باوجود اپنے موقف پر غور کیوں نہیں کرتے'' میں نے پُرسوز لہجے میں ان کے اندر کے خیر پسند انسان کو جگانے کی کوشش کی۔

''بیٹے''! انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے مزید کچھ کہنے سے روک دیا'' تم میری مجبوری کو نہ سمجھ سکو گے۔ میں عمر بھی جس چیز کو حق کہتا رہا' آج اسے باطل کہنے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے اور پھر وہ بھی عمر کے اس مرحلے میں جب کہ چند سانسیں باقی رہ گئی ہوں؟ نہیں..... نہیں میں نہیں چاہتا کہ میری قوم میری موت کے بعد مجھ پر زبان درازکرے۔ تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں اس عمر میں تمہاری طرح کوئی انقلابی اقدام نہیں کر سکتا۔ تمہاری بات اور ہے۔ تم نے ابھی کارزارِ حیات میں قدم رکھا ہے۔ تمہاری توانائیاں اور صلاحیتیں تازہ ہیں' تم چاہو تو اپنے ماحول سے تنہا ہونے کے باوجود ایک بھرپور ٹکر لے سکتے ہو۔''

پتا جی کے پاس سے لوٹنے کے کچھ ہی دن بعد مجھے اچانک اطلاع ملی کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں دل مسوس کر رہ گیا۔ مجھے ان کی موت کا اتنا رنج نہ تھا جتنا اس بات کا کہ وہ حالتِ کفر میں مرے تھے۔ مرنا تو سبھی کو ہے' وہ آج نہ مرتے تو کل مرتے' اس سے کیا فرق پڑ جاتا۔ آج وہ' کل ہماری باری ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْت لیکن کتنا فرق ہوتا ہے اس موت میں جو حالتِ ایمان میں آئے اور اس موت میں جو حالتِ کفر میں آئے۔

بہرحال میں نے صبر کر لیا اور اپنے گھر گیا کہ کم از کم ان کا آخری دیدار کر لوں۔ مجھے دیکھتے ہی میرے ایک بھائی نے مجھ پر کلہاڑی اٹھائی کہ تمہیں بھی پتا جی کی ارتھی کے ساتھ جلا دیا جائے گا' اس لئے کہ تمہاری ہی وجہ سے پتا جی نے صدمہ اٹھا کر جان دی ہے۔ پورے اہلِ خاندان اس بات پر مصر تھے کہ وہ مجھ مسلمان کو پتا جی کی ارتھی کے قریب بھی جانے دیں گے چونکہ فتنہ پیدا ہونے کا اندیشہ تھا اور لوگ جذباتی ہو رہے تھے' اس لئے میں

بھابھی کی نعش دیکھے بغیر خاموشی سے واپس لوٹ آیا۔

لوگوں نے صبر تو کر لیا لیکن وہ مجھے بالکل میرے حال پر چھوڑ دینے کے لئے تیار نہ تھے اور نہ میں خود ایسا چاہتا تھا۔ مقصد اگر بحث برائے بحث نہ ہو تو باہمی تبادلۂ خیال اور مختلف موضوعات پر آزادانہ گفتگو اکثر مفید نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ اس میں نہ صرف یہ کہ اپنے موقف کی صحیح وضاحت کا موقع ملتا ہے بلکہ اگر یہ کاوشیں مخلصانہ ہوں تو مخاطب کو متاثر بھی کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اب یوں ہونے لگا کہ انتہا پسندانہ طرز فکر رکھنے والے غیر مسلم نوجوان، مختلف غیر مسلم مذہبی اور سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے افراد، جن میں سے اکثر میرے ہائی اسکول کے زمانے کے ساتھی تھے، ان سے روزانہ کسی نہ کسی موضوع پر بحث و گفتگو ہوتی۔ یہ موضوعات عام طور پر وہی ہوتے جن سے متعلق غیر مسلم ذہن یا تو کسی شدید غلط فہمی کا شکار رہتا ہے یا پھر ان کے نقطہ نظر کے مطابق اس میں کوئی بڑی قباحت موجود ہوتی ہے مثلاً گوشت خوری، جہاد، پردہ، تعدد ازدواج، خاندانی منصوبہ بندی، اور رنگ زیب کا مندروں کو گرانا، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مبارک پر اعتراضات وغیرہ وغیرہ۔ جماعت اسلامی کے لٹریچر کے تفصیلی مطالعے نے الحمدللہ مجھے علمی ہتھیاروں سے لیس کر دیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ میں ان تمام موضوعات پر سیر حاصل گفتگو بھی کر سکتا تھا اور مسائل کا سائنٹفک تجزیہ بھی کر کے دکھا سکتا تھا کہ اصل کیا ہے اور نقل کیا۔ جب ان دوستوں کے لئے کوئی راہ فرار نہ رہ جاتی تو وہ یہ کہہ کر بات کو ختم کر دیتے کہ بحث میں تم سے جیتنا مشکل ہے (گویا علمی دلائل تو ان کے پاس موجود ہیں لیکن مجھ جیسے "باتونی" کے سامنے وہ زبان کھولنے کے حق میں نہیں) حالانکہ یہ محض عذر لنگ تھا۔ دراصل دلیل کے نام پر ان کے ہاں تو، جذباتیت، اوہام اور سینہ بہ سینہ قسم کی غلط سلط روایات کے سوا کچھ نہ تھا اور ہاں اس معاملے کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ ان میں سے بعض سلیم الفطرت نوجوان، میرے یقین، دردمندی اور مدلل علمی موقف سے اس درجہ متاثر ہو گئے تو انہوں نے تنہائی میں مجھ سے مل کر کہا کہ تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں، تم اپنے موقف پر مضبوطی سے قائم رہو۔ آج سے ہم تمہاری طرف سے دفاع کریں گے"۔

ایک اور موقع پر ایک غیر مسلم دوست نے بڑے پُرسوز لہجے میں مجھ سے کہا کہ تم

اسلام اسلام کی رٹ لگاتے ہو' اس کے عدل و انصاف وغیرہ کا تذکرہ کرتے رہتے ہو' لیکن ذرا دیکھو تو سہی کہ گائے جیسے معصوم' بے ضرر اور نفع بخش جانور کے ساتھ مسلمان کیا سلوک کرتے ہیں اور پھر مسلمانوں کی شرارت تو دیکھو کہ وہ یہ جاننے کے باوجود کہ ہم اسے اپنی ماتا کہتے ہیں اور اسے دیوتا سمجھتے ہیں' اُسے ہمارے ہی سامنے کاٹ کر کھا جاتے ہیں۔ یہ بات اس نے بڑے جذباتی اور پُرسوز لب و لہجے میں کہی تھی اور اس سے مَیں خود بھی متاثر ہو گیا تھا۔ مَیں فوراً تو اسے کوئی جواب نہ دے سکا البتہ اتنا ضرور کہا کہ اس معاملے میں تم محض جذباتیت کا شکار ہو گئے ہو۔ مَیں اِنشاء اللہ تمہاری تشفی کرا دوں گا۔ میری بات سن کر وہ اپنی کامیابی پر نازاں مسکراتا ہوا چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی میں فوراً ماسٹر صاحب کے پاس پہنچا اور انہیں صورتِ حال بتائی۔ ماسٹر صاحب میری گھبراہٹ اور تردد کو دیکھ کر مسکرائے اور انہوں نے کہا کہ اپنے دوست سے پہلے یہ پوچھو کہ کیا وہ اپنے بڑکھوں کے نقشِ قدم پر چلنا باعثِ سعادت نہیں سمجھتا؟ اور پھر اسے یہ بتاؤ کہ ویدوں سے یہ بات ثابت ہے کہ دیوتاؤں پر گائے' بیل اور بھینسے ذبح کر کے بطور بھینٹ چڑھایا جاتا تھا' بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ اپنے معزز مہمانوں کی تواضع گائے کے نوعمر اور نوخیز بچھڑے سے کرتے تھے۔ اس سے کہو کہ سوامی دویکانند کہتے ہیں کہ (ویدک دور میں) ''وہ لوگ قربانی کی ایک چتا بناتے' کچھ جانوروں کو ذبح کرتے اور ان کا گوشت سیخوں پر بھونتے اور یہ گوشت اِندر دیوتاؤں کے اوپر چڑھا دیتے''۔ گاندھی جی اپنی کتاب ہندو دھرم صفحہ ۱۹۱ پر لکھتے ہیں کہ ''جانوروں کی قربانی کا عمل ایک زمانے میں عام تھا۔ کیا آج ہم اسے از سرِ نو زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایک زمانے میں ہم گوشت کھاتے تھے۔ کیا آج ہم ایسا کرنا چاہتے ہیں''؟

مشہور مورخ ڈاکٹر تاراچند کہتے ہیں: ''ویدک قربانیوں میں جانوروں کے چڑھاوے کی طرح پھل' دودھ' اور چاول کی روٹیاں شامل ہیں۔ بعد میں جانوروں کی قربانی مذہبی اعمال سے غائب ہو گئی''۔ (ہندوستانی تہذیب پر اسلام کا اثر۔ ص ۳)۔ پھر اس کے علاوہ یہ بھی ویدوں سے ثابت ہے کہ وہ مچھلی کے گوشت کو بطور غذا استعمال کرتے تھے۔ دراصل گائے کو تقدس حاصل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ آرین زراعت پیشہ تھے اور اس

کے ساتھ ہی گوشت خور بھی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ گوشت خوری کے نتیجہ میں زراعت کے لئے جانور کم ہو رہے ہیں (اور ظاہر ہے کہ زراعت ہی ان کا اصل ذریعہ معاش تھا) تو انہوں نے جانوروں کا ذبیحہ بند کر دیا اور اسے ممنوع ٹھہرا دیا۔ بالخصوص گائے کو' اس لئے کہ بہترین زراعتی جانور بیل گائے ہی فراہم کرتی تھی۔ بعد میں یہ امتناع قانون اور تقدس کی شکل اختیار کر گیا۔ ہمارے ہندو بھائی اس سادی سی حقیقت پر غور کئے بغیر اس معاملے میں جذباتی ہو جاتے ہیں۔ ورنہ خصوصیت نہ گائے کی ہے نہ کسی اور جانور کی۔ یہ سب انسان کی خدمت ہی کے لئے اللہ نے پیدا کئے ہیں۔

چنانچہ دوسرے دن میں نے یہ سب باتیں اپنے دوست کے سامنے رکھیں' وہ ہکا بکا سا رہ گیا۔ اسے کسی طرح اس بات کا یقین نہ آتا تھا کہ کسی زمانے میں دیوتاؤں پر جانوروں کا گوشت چڑھایا جاتا تھا۔ چنانچہ اس نے کہا کہ اگر پنڈت جی اس بات کی تصدیق کر دیں تو میں مان لوں گا۔ چنانچہ ہم پنڈت جی کے پاس گئے اور ان سے مسئلہ پوچھا۔ انہوں نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھورا اور گول مول سا جواب دیا کہ مجھے بھی نہیں معلوم۔ دیکھنا ہوگا' ویدوں میں دیکھنا ہوگا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ویدوں میں کیا لکھا ہے۔ میں خاموش ہو گیا۔ کتمان حق کی یہ روش کچھ نئی نہیں ہے اور پھر پنڈت جی ہی کی کیا خصوصیت ہے خود مسلمانوں میں کتنے ہی نام نہاد ملا اور مولوی کیا ایسے نہیں جو جانتے بوجھتے مسلمانوں کو مختلف بدعتوں اور مشرکانہ آداب و رسوم میں محض اس وجہ سے مبتلا کئے ہوئے ہیں کہ اس سے ان کی دال روٹی چلتی ہے۔ مختصر یہ کہ اس اعلان سے پہلے بھی' اس کے بعد بھی مجھے اس قسم کے کتنے ہی مناظروں اور مباحثوں میں الجھنا پڑا۔ حق و باطل کی یہ کشمکش تو ظاہر ہے کہ بہت قدیم ہے پھر میرے معاملے ہی میں یہ سنت کیوں نہ پوری ہوتی۔

●......●......●

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بارکر

(امریکہ)

معروف مستشرق، ماہر لسانیات، ادیب و محقق اور مبلغ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بارکر کا تعلق ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے ہے۔ ذیل کا انٹرویو "اردو ڈائجسٹ" کے مدیر گرامی جناب الطاف حسن قریشی نے مرتب فرمایا تھا۔ ان کے شکریے کے ساتھ یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔

اورینٹل کالج لاہور کی بالائی منزل میں جہاں گھنے درختوں کے شاداب سائے اور ماحول کی خاموشی میں تحلیل ہونے والی میٹھی سرگوشیاں زندگی کو حسین تر بنا دیتی ہیں ایک کشادہ کمرہ ہے، جس میں اردو زبان پر جدید انداز میں تحقیق کرنے والے ماہرین میزوں پر جھکے ہوتے ہیں۔ اس شعبے کے صدر جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن بارکر صاحب ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے حال ہی میں ایک کتاب اردو میں ترتیب دی ہے، جس کا نام "محفل" رکھا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے اردو کے ان شعرا کا منتخب کلام جمع کیا ہے جن کو لاہور کے مشاعروں میں وہ سن چکے ہیں۔ یہ کتاب جب میری نظر سے گزری تو مجھ میں ڈاکٹر صاحب سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ ایک تو اس لئے کہ وہ امریکی مسلمان ہیں، دوسرا اس لئے کہ وہ غیر ملکی ہونے کے باوجود اردو زبان میں حد درجہ دلچسپی لے رہے ہیں یعنی جو کام ہم پاکستانیوں کو کرنا چاہئے تھا وہ ڈاکٹر صاحب کر رہے ہیں۔

میں نے فون پر ڈاکٹر صاحب سے انٹرویو کے لئے وقت مقرر کیا۔ وقت معین پر اورینٹل کالج کی سیڑھیوں پر ماضی کی حسین یادوں کے نقوش ڈھونڈتا ہوا بالائی منزل

میں پہنچ گیا۔ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ سرخ و سپید چہرہ شباب کی رعنائیاں لئے ہوئے، کشادہ پیشانی، جس پر زندگی کے اتار چڑھاؤ کے غیر مرئی نقوش مرتسم تھے۔ بلند قامت، مسکراتی آنکھیں جیسے غصے کی کیفیت سے کبھی آشنا ہی نہیں ہوئیں، گفتگو میں انیس کے لہجے کی سی نفاست، چال میں متانت، اور دھیمے پن کا حسین امتزاج۔ گرمجوشی سے ملے۔ باتیں شروع ہوئیں۔ وقت بھی کچھ دیر کے لئے ہماری باتیں سننے کے لئے ٹھہر گیا۔ میں سوچنے لگا زندہ قوموں کے افراد کی باتیں بھی کتنی حیات آفرین ہوتی ہیں۔

میں نے بارکر صاحب سے سب سے پہلا سوال ان کی ابتدائی زندگی کے بارے میں کیا۔ اس سوال پر وہ ایسے کھو گئے جیسے گزرے ہوئے ایام کے دریچوں میں جھانکتے ہوئے وہ کسی منظر کی رعنائیوں میں گم ہو گئے ہوں۔ کہنے لگے:

"تینتیس سال پہلے کی بات ہے جب میں ریاست واشنگٹن میں، جو بحرالکاہل کے کنارے دارالحکومت واشنگٹن سے تین ہزار میل کے فاصلے پر واقع ہے، ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوا۔ والد صاحب محکمہ تعلیم میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ انہوں نے میری تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی۔ مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں علم کی پیاس بجھاتا رہا۔ ۱۹۵۱ء میں فلبرائیٹ سکالرشپ پر ہندوستان آیا۔ اس خطے میں میرے آنے کا مقصد مختلف باشندوں کی لسانی اور تہذیبی تاریخ و روایات پر تحقیق کرنا تھا۔ یہاں پانچ چھ سال گزارنے کے بعد میں واپس امریکہ چلا گیا۔ وہاں سے کینیڈا آیا۔ یہاں مشہور مستشرق سمتھ کی زیر نگرانی مختلف مذاہب پر کام کرتا رہا۔ ریڈ انڈینز پر تحقیقی کام کر کے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم و تدریس کے مختلف مراحل پر دس بارہ زبانیں سیکھنے کے مواقع ملے۔ انگریزی کے علاوہ عربی، فارسی، اردو، بلوچی، پشتو، براہوی، سیامی، فرانسیسی، جرمن، یونانی، سنسکرت اور ہندوستان کے وکئی باشندوں کی چار پانچ بولیاں سیکھیں۔ ۱۹۵۹ء میں فورڈ فاؤنڈیشن کی تحریک پر پاکستان آیا تاکہ اردو زبان پر جدید انداز میں تحقیق کی جائے۔

بارکر صاحب زندگی کے اوراق پلٹتے جا رہے تھے اور میں حیرت کا مجسمہ بنا سوچ میں غرق تھا کہ کتنا محنتی ہے یہ شخص۔ تیس بتیس سال کی چھوٹی سی عمر میں اس نے علم و فن کے کتنے

گہرہائے گرانمایہ اپنے دامن میں ٹانک لیے ہیں۔ کتنے ہی سمندر پی لیے ہیں اور ابھی تشنگی باقی ہے۔ علم کا غرور مزاج کو چھو کر بھی نہیں گیا۔ علم وفن کی باتیں ہو رہی تھیں اس لئے ذہن میں امریکہ کے تعلیمی نظام کے متعلق سوالات ابھرنے لگے۔ تاہم مَیں نے بار کر صاحب سے وہ سوال کر ہی دیا جو سب سے زیادہ اہم تھا۔

''آپ نے اسلام کیوں کر قبول کیا''؟

''اسلام'' وہ یہ کہہ کر خاموش سے ہو گئے۔ بھائی یہ ایک طویل داستان ہے۔ گو اس کے دہرانے میں ایک طرح کا لطف آتا ہے لیکن ماضی کی بے اعتدالیاں دل ودماغ میں تلخیاں گھول دیتی ہیں۔ پھر انہوں نے اختصار کے ساتھ وہ ایمان افروز واقعات سنائے جن میں عبرت بھی تھی اور دعوتِ غور وفکر بھی۔ انہوں نے بتایا کہ میرے والد مذہب سے کوسوں دور تھے۔ ایک دفعہ جب مَیں نے ان سے خدا کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے جواباً کہا: ''مَیں خدا کے بارے میں کیا بتا سکتا ہوں۔ میری اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی اور مجھے زندگی میں اس کی ضرورت بھی کیا ہے' جبکہ ہر آسائش میسر ہے''۔ والد صاحب کا یہ جواب میری تشفی نہ کر سکا۔ مَیں نے اپنے طور پر مختلف ادیان کا مطالعہ شروع کر دیا۔ یہودیت اور عیسائیت کی مقدس کتابیں بنظرِ غائر پڑھیں۔ اناجیلِ قدیم وجدید میں سوائے انتشار واختلاف کے اور کچھ نہ پایا۔ ان کی تاریخی حیثیت بھی میرے نزدیک مشکوک تھی۔ اسلام کے مطالعے کا اس ماحول میں سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اسلام کے بارے میں وہاں کے لوگوں کا عام تاثر یہ تھا کہ یہ وحشیوں' پاگلوں اور جنون زدہ لوگوں کا مذہب ہے اور ظاہر بات ہے کہ مَیں اپنے آپ کو اس وقت وحشی کہلوانے کے لیے کیسے تیار ہو سکتا تھا' پھر جب مَیں ہندوستان آیا اور مجھے یہاں کئی سال گھومنے پھرنے اور ہندو علما سے ملنے کے مواقع ملے تو مَیں نے ہندو مذہب کا مطالعہ کیا' مگر مَیں نے اس مذہب میں مستقل اقدار کا فقدان پایا۔ اس مذہب میں کچھ ایسا الجھاؤ تھا کہ مَیں خود الجھ کر رہ گیا۔ ہندوستان کے جنوب میں ایسے ہندو آباد ہیں جن کے مذہبی عقیدے کی رو سے ایک عورت کے ساتھ بیک وقت چھ سگے بھائی شادی کر سکتے ہیں اور وہ اپنے عقیدے کی بنیاد مہابھارت پر رکھتے ہیں۔ مَیں ذہنی اور روحانی طور پر اسی تذبذب' پریشانی اور گومگو کی حالت میں تھا کہ

ایک دن ایک نوجوان ملا' جس کے ذریعے آگے چل کر میری کایا ہی پلٹ گئی۔

یہ نوجوان مسلمان خاندان سے تعلق رکھتا تھا' لیکن ذہنی طور پر وہ دین اشتراکیت پر ایمان لائے ہوئے تھا۔ وہ میرے قریب اس لئے آیا کہ مجھے ایک امریکی ہونے کی وجہ سے ہدف طنز بنانا چاہتا تھا۔ میں شروع میں اس کی طنز آمیز باتیں سنتا رہا' لیکن ایک دن میں نے اسے بتایا کہ میں اس طرح کا امریکی نہیں ہوں جس پر تم پھبتیاں کسو۔ مجھے امریکی حکومت کی پالیسی سے کوئی سروکار نہیں۔ میں تو ایک طالب علم ہوں اور سب کا دوست ہوں۔ اس کے بعد میرے اس سے دوستانہ مراسم قائم ہو گئے۔ ایک دن اس نے مجھے اپنے گھر لے جانے پر اصرار کیا۔ میں ساتھ ہو لیا۔ راستے میں اس نے مجھے بتایا کہ میرے والد صاحب مولوی قسم کے آدمی ہیں' مجھے ان کی باتیں اچھی نہیں لگتیں کیونکہ وہ اوٹ پٹانگ گفتگو کرتے رہتے ہیں اس لئے تم بھی ان سے زیادہ باتیں نہ کرنا ورنہ اکتا جاؤ گے۔

جب ہم اس کے گھر پہنچے تو اس کے والد نے میرا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ ان کی شخصیت میں کچھ ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ میں ان کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ مجھے ان کی باتوں میں خلوص' صداقت اور محبت جھلکتی نظر آ رہی تھی۔ انہوں نے نہایت واضح اور صاف الفاظ میں مجھے اسلام کے متعلق کچھ بنیادی باتیں بتائیں۔ میں نے ان میں وزن محسوس کیا۔ ملاقاتوں کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ مجھے تحقیق کے سلسلے میں بہار کے جنگلوں میں جانا تھا۔ انہوں نے چلتے وقت مجھے کچھ کتابیں دیں' جو زیادہ تر انگریزی میں تھیں۔ ان میں پکتھال صاحب کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہوا قرآن بھی تھا۔ میں نے ان کتابوں کے پڑھنے کا وعدہ کیا اور بہار کے جنگلوں میں چلا گیا۔ وہاں تنہائی تھی۔ پورا ماحول قدرت کی دلفریبیوں اور رعنائیوں کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے تھا۔ طائرانِ خوش الحان اپنی نغمہ سنجیوں سے سازِ دل کے تار ہلا رہے تھے۔ وجدان ایک کیف آگیں سرور سے معمور تھا۔ خود بخود خیال آیا کہ قرآنِ حکیم کا مطالعہ کیا جائے۔ سورہ کوثر کھلی' پڑھنا شروع کیا۔ چھوٹے چھوٹے بول میرے دل میں تیر و نشتر کی طرح پیوست ہوتے چلے گئے۔ ان کے ترنم نے میرے کانوں میں رس گھول دیا۔ معلوم نہیں ان میں کیا جادو تھا کہ میری زبان بے اختیار انہیں دہرانے لگی۔ پڑھتا چلا گیا۔ میں نے یوں محسوس کیا کہ آبِ حیات کے قطرے مرجھائے ہوئے

پھولوں کو تازگی اور شگفتگی بخش رہے ہیں۔ دل چاہتا تھا کہ قرآن کی پاکیزہ تعلیمات پر ایمان لے آؤ' لیکن مادہ پرست ماحول میں پرورش پائے ہوئے ذہن کا کبر و غرور یقین میں شک کی آمیزش کر رہا تھا۔ دل اور دماغ کی یہ کشمکش جاری رہی۔ یہاں تک کہ میں پھر لکھنؤ آ گیا۔ آتے ہی مولوی صاحب سے ملا اور ان تمام شکوک و شبہات کو ان کے سامنے رکھا' جو میرے ذہن میں ابھی تک اسلام کے بارے میں موجود تھے۔ ان میں زیادہ تر رسالت کا مقام' اسلام میں عورت کی حیثیت اور حرام و حلال کے مسائل سے متعلق تھے۔ مولوی صاحب نے نہایت ہی حکیمانہ اور مدلل انداز میں میرے ہر شک کو رفع کیا۔ اب قلب و ذہن میں صداقت کو سینے سے لگا لینے کا بے پناہ جذبہ ابھر آیا تھا۔ شیفتگی و وارفتگی خود سپردگی میں ڈھلتی جا رہی تھی۔ آنکھیں بے یقینی کے اندھیاروں میں یقین و ایمان کے انوار مشاہدہ کرنے کے لئے بیتاب تھیں۔ میری زبان سے بے ساختہ کلمہ توحید بلند ہوا۔ میں کتنا خوش تھا الفاظ بیان نہیں کر سکتے اور شدت جذبات کے اظہار میں الفاظ کو ہمیشہ اپنی کوتاہی فن کا اعتراف کرنا پڑا ہے۔

میں جب امریکا واپس آ گیا' اس وقت مجھ میں کافی تبدیلی آ چکی تھی۔ میرے والد صاحب نے مجھ سے صرف ایک ہی سوال کیا' کیا تم اب بھی شراب پیتے ہو؟ میں نے کہا نہیں۔ شراب تو اسلام میں حرام ہے۔ اس پر انہوں نے بے انتہا خوشی کا اظہار کیا اور پھر وہ الفاظ ادا کئے جو مجھے زندگی بھر یاد رہیں گے...... "بیٹا جو مذہب تمہیں شراب پینے سے منع کرتا ہے وہ یقیناً ایک اچھا مذہب ہوگا"۔

وقت گزرتا گیا اور میں نے جلد ہی یہ محسوس کر لیا کہ اس معاشرے میں میرے لئے مسلمان کی حیثیت سے جینا بہت ہی مشکل ہے۔ یار دوست پھبتیاں کستے تھے۔ نئے عہد میں پرانے زمانے کی باتیں کرتے ہو! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ شراب اور عورت کے بغیر بھی کوئی زندگی ہے۔ تم تو وحشی بنتے جا رہے ہو۔ اپنی جوانی اور حسن کی رعنائیوں پر رحم کرو۔ شروع شروع میں یہ سب کچھ برداشت کرتا ہوا اپنی وضع پر قائم رہا' لیکن ادھر بھی نئے نقوش تازہ تازہ اور دھیمے تھے اور ادھر گرد و پیش کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں غیر شعوری طور پر ماحول کے دھارے پر بہنے لگا اور ایک دو سال ہی میں ان تمام آلودگیوں سے

دامن تر ہو گیا' جنہیں اسلام کی حرارت نے خشک کیا تھا۔

گناہ کی لذت کوشیوں' جوانی کی سرمستیوں اور لغزشوں کی دلربائیوں نے روح کی تسکین کا سامان بہم پہنچانے کی بجائے اسے مسلسل اضطراب اور پیہم التہاب کا مرکز بنا دیا۔ مَیں پہروں سوچتا کہ کیا زندگی بے مقصد ہے۔ سکوں کی کھنک' جام کی گردش' نگاروں کی محفل ہی وہ سب کچھ ہے جس کے لئے یہ انسان' یہ وسیع کائنات اور یہ چاند تارے تخلیق کئے گئے ہیں۔ ہر لحظہ میرا اضطراب بڑھتا چلا گیا۔ عموماً آنکھیں اشکبار رہتیں' ذہن کسی فکر میں کھویا رہتا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مَیں بالکل مایوس ہو گیا۔ سوچا جس زندگی کا مقصد ہی معلوم نہیں' اسے کیوں نہ ختم کر دیا جائے۔ اسی سوچ بچار کی حالت میں مجھے نیند آ گئی۔ نیند کے عالم میں ایک خواب دیکھا۔ دیکھتا ہوں ایک تنگ و تاریک کمرہ ہے جس میں پتھر اور کنکریاں بھری ہوئی ہیں۔ چاروں طرف دیواروں پر جالے لگے تھے۔ تاریکی میں ایک دو قدم چلتا ہوں اور پتھر سے ٹھوکر کھا کر بیٹھ جاتا ہوں۔ مجھ پر جنون کی سی کیفیت طاری ہے۔ روشنی کی تلاش میں اٹھتا ہوں' گرتا ہوں اور گر کر پھر اٹھتا ہوں۔ اتنے میں ایک کونے سے روشنی کی کرن نمودار ہوتی ہے۔ اس طرف لپکتا ہوں۔ ایک تنگ سا دروازہ ہے جس میں سے روشنی آ رہی ہے۔ مجھے کچھ سکون ملتا ہے۔ اس دروازے کی طرف بڑھتا ہوں۔ اتنے میں میری آنکھ کھل گئی۔

جب جاگا تو اپنے آپ کو حد درجہ مطمئن پایا۔ مجھے پختہ یقین ہو گیا کہ صرف اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو کامیابی اور ابدی سکون کا ضامن ہے گو اس پر چلنا اتنا آسان نہیں اور قدم قدم پر نفس پر پابندیاں اور قیود عائد کرنا پڑتی ہیں' لیکن راستہ صرف یہی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس واقعے کے بعد سے مَیں بتدریج اسلام کے قریب آتا جا رہا ہوں''۔

ہارکر صاحب کے بیان نے مجھے چونکا دیا۔ اپنے آپ کو ٹٹولنے لگا کہ راہِ عشق و عزیمت میں کتنے قدم اٹھائے ہیں۔ کیا اپنی زندگی بے مقصدیت کی دلدل میں دھنس کر نہیں رہ گئی ہے؟ قرآن کی تلاوت روزانہ کی جاتی ہے لیکن سوزِ محبت اور احساسِ عبودیت سے آنسو کا ایک قطرہ بھی آنکھ سے نہیں بہتا' جیسے آنکھوں کے چشمے سوکھ گئے ہوں۔

مَیں نے ہارکر صاحب سے سوال کیا کہ آخر امریکہ میں اسلام کے خلاف نفرت کا اتنا

شدید جذبہ کیوں پایا جاتا ہے''؟

وہ کچھ وقفے کے لئے خاموش رہے جیسے اسباب کا کھوج لگا رہے ہوں۔ پھر کہنے لگے،

''اس کے متعدد اسباب ہیں۔ سب سے بڑی وجہ تو صلیبی جنگیں ہیں۔ عیسائیوں نے ان جنگوں میں مسلمانوں کے ہاتھوں شکستوں کے جو زخم کھائے وہ انہیں ابھی تک نہیں بھولے۔ انہوں نے اس کا انتقام اس طرح لیا کہ اسلام کے متعلق گمراہ کن باتیں پھیلائیں اور مسلمانوں کے کردار کو کچھ اس انداز میں پیش کیا کہ وہ وحشی درندوں کی مانند ہاتھوں میں تلوار لئے' نعرہ ہائے تکبیر بلند کرتے ہوئے انسانوں کی بستیوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ قتل عام کرتے ہیں اور عورتوں کو گرفتار کر کے انہیں لونڈیاں بنا لیتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ موجودہ عیسائیت اتنی کھوکھلی اور بے جان ہے کہ کوئی معقول انسان اس مذہب سے وابستگی قائم نہیں رکھ سکتا۔ اس کے مقابلے میں اسلام کے اندر دماغ کو مسخر کرنے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔ اس خطرے کا سدِّ باب اس طرح کیا گیا کہ اسلام کے صاف و سفید دامن پر بڑے بڑے داغ ڈالے گئے تاکہ اپنے بدنما داغ چھپ جائیں اور عیسائیوں کا ذہین طبقہ اسلام کی طرف راغب نہ ہونے پائے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ اسلام کو امریکی مزاج کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی گئی۔ مجھے کامل یقین ہے کہ اگر اسلام کو خاص انداز میں اہلِ امریکہ کے سامنے پیش کیا جائے تو ایک بڑا حلقہ اس کا اس طرح خیر مقدم کرے گا کہ گویا وہ اسی کی تلاش میں برسوں سے سرگرداں تھا''۔

''پارکر صاحب! وہ خاص انداز کون سا ہے''۔ میں نے بے قراری کے عالم میں پوچھا۔ انہوں نے کہا ''ابھی بتاتا ہوں''۔ اتنے میں چائے آگئی۔ چائے کے ساتھ شاعروں کا ذکر چل نکلا۔ قمر میرٹھی صاحب ہمارے پہلو میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے اپنی غزل کے دو شعر سنائے۔

لگ گئی آگ بلا سے جو نشیمن کو مرے
اہلِ گلشن تو ہوئے برق و شرر سے آگاہ
چھوڑ جاتے جو نہ ہم نقشِ کفِ پا اپنے
کوئی ہوتا نہ تری راہ گزر سے آگاہ

''اہلِ گلشن تو ہوئے برق و شرر سے آگاہ'' اس مصرعے نے تصورات اور خیالات کی

دنیا میں ایک ہلچل مچا دی۔ کچھ وہ لوگ ہیں جو اپنا سب کچھ اس لئے لٹا دیتے ہیں کہ دوسروں کے لئے زندگی زیادہ حسین، زیادہ آسان اور زیادہ خوشگوار بن جائے اور ایک ہم ہیں کہ اپنی زندگی رنگین بنانے کے لئے دوسروں کی خواہشات اور ارمانوں تک کا خون چوس لیتے ہیں۔ حقیقت ہے بھی یہی کہ جب تک ہزاروں آشیاں بنا کر پھونک نہ ڈالے جائیں، اس وقت تک اہلِ گلشن کو برق اور شرر سے آگاہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ عشق و محبت اور دعوت و عزیمت کی راہ کچھ ہے ہی ایسی کہ یہاں سب کچھ لٹانا ہی ہوتا ہے۔

چائے ختم ہوئی تو میں نے سوال دہرایا۔ وہ کیا انداز خاص ہے جس میں اسلام کو اہلِ امریکہ کے سامنے پیش کیا جائے۔

ہارکر صاحب نے جواب دیا؟:

''دراصل وہاں کے لوگوں کا مزاج مشرق کے لوگوں سے بہت مختلف ہے۔ وہ کسی شخص کی بات پر یقین لانے سے پہلے اس بات کی تاریخی حیثیت دیکھتے ہیں۔ یعنی یہ کہ ہمارے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ بات اس شخص نے کہی ہے۔ اس اعتبار سے اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ مسلمانوں نے اسماء الرجال کے سلسلے میں جو بیش بہا اور عدیم المثال تحقیقی کام کیا ہے، اسے انگریزی میں منتقل کیا جائے۔ اہلِ مغرب پر یہ بات پورے اہتمام کے ساتھ واضح کر دی جائے کہ اسلام کا ذخیرۂ علم تاریخی اعتبار سے جتنا مستند اور یقینی ہے دنیا کے کسی اور مذہب کا نہیں۔ روایت، درایت اور جرح و تعدیل کے جو اصول مسلمان محدثین اور فقہا نے منضبط کئے، تاریخ کو محفوظ رکھنے اور اس پر تنقید کرنے کے، ان سے زیادہ معقول اور کڑے کوئی اور اصول نہیں ہو سکتے۔

قرآن اور حدیث کی تاریخی حیثیت ثابت کرنے کے بعد دوسرا قدم یہ اٹھایا جائے کہ انگریزی میں مذہبی کتابیں لکھوائی جائیں، جن میں حوالہ جات کا خاص اہتمام ہو۔ یورپ ہو یا امریکہ، وہاں کے لوگ حوالہ جات سے بہت مرعوب ہوتے ہیں۔ ایک نہایت ہی عمدہ کتاب اگر بغیر حوالوں کے ہے تو وہاں اسے کوئی وزن نہیں دیا جائے گا۔ تیسری اہم بات جسے پیشِ نظر رکھنا نہایت ہی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کی ان تعلیمات کو زیادہ نمایاں حیثیت دی جائے جن کا تعلق انسان کی معاشرتی، تمدنی اور اخلاقی زندگی سے ہے۔

پاکیزگی' طہارت' صفائی' سادگی' قرینہ جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمدنی زندگی کے نمایاں اوصاف تھے' انہیں وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے۔ مَیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس وقت مغرب میں اپنی زندگی کے طور وطریق سے حد درجہ بے اطمینانی پائی جاتی ہے۔ ایسے وقت میں اگر مسلمانوں کی طرف سے زندگی کا ایک ایسا واضح نقشہ پیش کیا جائے جو طمانیت' سکون' محبت اور معتدل روش اور دنیوی خوشحالی کا ضامن ہو تو یقیناً اُدھر کے لوگ اس کو خوشی خوشی قبول کریں گے۔ دراصل وہاں کے لوگ ہر چیز کو مادی افادیت کے نقطہ نظر سے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں' اس لئے اس امر کو بھی خاص طور سے واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ اسلام کا اقتصادی نظام نہ صرف روحانی پاکیزگی اور اخلاقی حس ابھارتا ہے بلکہ معاشرے کو خوشحالی اور مادی ترقی کی انتہا سے بھی ہمکنار کرتا ہے''۔

مَیں نے بارکر صاحب پر ایک پُر امید نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا: ''کیا آپ ان خطوط پر اسلام کو پیش کرنے کی کوشش نہیں کر سکتے''؟

''کیوں نہیں' میری زندگی کا اور مقصد ہی کیا ہے؟ اس سے زیادہ اور میری خوش نصیبی کیا ہو سکتی ہے کہ مَیں اسلام کے کسی کام آسکوں''۔ یہ تھے بارکر صاحب کے الفاظ جنھوں نے میرے جسم میں خوشی کی لہر دوڑا دی۔ وہ کہے چلے جا رہے تھے:

''مَیں نے اس سلسلے میں ایک پروگرام بھی وضع کر لیا ہے۔ مَیں اہم موضوعات پر پاک وہند کے علما سے مضامین لکھوانا چاہتا ہوں۔ مَیں نے ممتاز علما سے مضامین لکھنے کی درخواست کی ہے۔ کچھ علما تعاون کا ہاتھ بڑھانے میں فراخدلی کا ثبوت نہیں دے رہے۔ شاید ان کی عدیم الفرصتی اس کا سبب ہو۔ میری خواہش یہ ہے کہ ایک اسلامک ریڈر تیار کیا جائے۔ اردو اور انگریزی ـــــ دونوں میں۔ اردو کے اسلامک ریڈر کے ذریعے پاکستان میں تعلیم بالغاں کے اصولوں پر یہاں کے لوگوں میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کو پھیلایا جائے اور انگریزی زبان کے ذریعے سے مغربی دنیا کو اسلام سے روشناس کرایا جائے۔ یہ کام اتنا آسان نہیں لیکن اس شعر کے مصداق۔

منزل تو تھی ہی پیشِ نظر، راہِ شوق میں
کچھ پیچ و خم بھی ذوقِ سفر بخشتے رہے

راستے کی صعوبتیں ذوقِ سفر کو نکھارتی ہی جائیں گی۔

''اپنے سینے میں کتنے صحت مند جذبات لئے ہوئے ہے یہ شخص'' میں نے اپنے آپ سے کہا۔ کاش ہم بھی ان ذمہ داریوں کو پہچان لیں جو شہادتِ حق کا فریضہ ہم پر عائد کرتا ہے۔ ہم اپنی تمام صلاحیتوں' قابلیتوں اور مال و متاع کو اشاعتِ اسلام کے مقدس مشن میں کیوں نہ لگا دیں۔ عیسائی مشنریاں ہمارے ملک میں آ کر اپنے مذہب کی تبلیغ کر رہی ہیں اور ہم ردِ عمل کے طور پر حرفِ شکایت زبان پر لے آتے ہیں لیکن شاید ہم یہ نہیں جانتے کہ شکایت وہ لوگ کیا کرتے ہیں جو کم ہمت اور بے عمل ہوتے ہیں۔ ہمارے اپنے ملک میں عیسائیت تیزی سے پھیل رہی ہے اور ہم صرف تماشائی بنے ہوئے ہیں۔ کاش ہمارے دماغوں میں یہ سودا سما جائے کہ ہم نے خدا کا پیغام دنیا کے آخری کونے تک میں پہنچانا ہے' اسلام ایسے دیوانوں کا منتظر ہے۔

مَیں نے آخری سوال کیا۔ ''امریکہ میں جو مسلمان رہتے ہیں وہ اسلام کی اشاعت کے لئے کیا کچھ کر رہے ہیں''؟

بارکر صاحب نے کہا کہ ''کچھ حلقے اچھے خاصے مستعد نظر آتے ہیں' لیکن سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ وہاں کے مسلمانوں میں عجیب عجیب فرقے پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہاں مسلمانوں کا ایک ایسا فرقہ بھی ہے جس نے یہ تصور پیش کیا ہے کہ خدا کالے رنگ کا ہے۔ اس فرقے کے عقائد حبشیوں میں بڑی تیزی سے مقبولیت حاصل کر رہے ہیں''۔ ڈیڑھ بجنے والا تھا۔ مَیں نے بارکر صاحب سے رخصت ہونے کے لئے اجازت چاہی۔ انہوں نے خندہ پیشانی سے مصافحہ کیا' ان کے ہاتھوں کی گرمی اور چہرے کی شگفتگی آج بھی محسوس کر رہا ہوں۔

●......●......●

ڈاکٹر فاروق احمد

(بھارت)

ڈاکٹر فاروق احمد جنوبی ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں اور ناندیڑ نامی شہر میں جماعت اسلامی کی فری ڈسپنسری کے انچارج ہیں۔ آبائی مذہب ہندومت ہے۔ حال ہی میں انہوں نے اسلام کے معاشرتی پہلو سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا ہے۔ ذیل کا انٹرویو دہلی کے سہ روزہ ''دعوت'' مورخہ ۲۳۔ مارچ ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! آپ کا تعارف اور قبول اسلام کی وجوہات؟

جواب: میرا آبائی نام ڈاکٹر اندر ریڈی تھا اور مذہب ہندومت۔ جنوبی ہند کے شہر وشاکھاپٹنم میں پیدا ہوا۔ وہیں تعلیم پائی۔ ڈاکٹر کا کورس (G.C.I.M) کیا اور حیدر آباد میں پریکٹس شروع کی۔

عملی زندگی میں آئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ایک روز میرے پاس ایک ایسا مریض آیا جو طویل عرصے سے بیمار چلا آ رہا تھا۔ میرے مسلسل علاج اور توجہ سے وہ صحت یاب ہو گیا اور عقیدت مندی و اخلاص سے اصرار کرنے لگا کہ میں اس کے قصبے حمایت نگر میں آؤں۔ اس کا یہ اصرار بعد میں شدت اختیار کر گیا۔ وہ مسلسل خطوط لکھتا رہا کہ میں مستقلاً حمایت نگر منتقل ہو جاؤں۔ وہ یقین دلاتا تھا کہ وہاں مجھے ہر طرح کی سہولت اور تعاون ملے گا۔ اس کی اس دلیل میں بھی خاصا وزن تھا کہ حمایت نگر میں چونکہ کوئی ڈسپنسری یا ڈاکٹر نہیں اس لئے میرا وہاں جانا انسانی نقطۂ نظر سے بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ میرے

دوست مریض کا اصرار بالآخر رنگ لایا اور مَیں حمایت نگر منتقل ہو گیا۔

حمایت نگر ایک ایسا قصبہ ہے جس میں ہندو مسلم مخلوط سوسائٹی کارفرما ہے۔ چند دنوں میں میری پریکٹس اچھی خاصی چل نکلی۔ دوست احباب میں خاصی تعداد مسلمانوں کی بھی شامل ہو گئی اور مَیں ان کے معاشرتی نظام اور اطوار سے بڑا متاثر ہوا۔

سب سے زیادہ جس پہلو نے مجھے متاثر کیا وہ عورتوں کا پردہ تھا۔ مجھے شروع ہی سے ہندوؤں کی بے پردگی سے وحشت ہوتی تھی اور مَیں مندر میں پوجا کے لئے بھی اس لئے نہیں جاتا تھا کہ وہاں مرد اور عورتیں یکجا پوجا کرتی تھیں اور تقدس کے جذبات کے بجائے جنسی و سفلی احساسات غالب رہتے تھے۔ اسی سبب سے مَیں نے اہلیہ کو بھی کبھی مندر میں نہیں جانے دیا تھا۔

دوسری چیز جس سے مَیں نے گہرا اثر لیا وہ روزے کی عبادت ہے۔ مسلمان رمضان میں صبح سے شام تک منہ باندھے خالی پیٹ رہتے تو مَیں اس کے بدنی فوائد کے ساتھ ساتھ ان اثرات پر بھی غور کرتا رہتا جو نفسی طہارت و پاکیزگی پر مرتب ہوتے ہیں..... مَیں نے اس کا تجربہ روزہ رکھ کر کیا اور خود محسوس کیا کہ اس سے نیکی کے جذبات کس قدر نمایاں ہوتے ہیں..... یہی حال میری اہلیہ کا تھا۔ وہ بھی رمضان میں کئی روزے رکھتی اور ان کے فیوض سے متمتع ہوتی۔

تیسری چیز جس نے ہمیں اسلام کے قریب کیا وہ اردو زبان تھی۔ ہماری مادری زبان تیلگو تھی مگر حمایت نگر میں آئے اور یہاں ہم نے پندرہ برس کا طویل عرصہ گزارا تو ہمارے بچے اردو سیکھ گئے۔ وہ ہر وقت اردو میں باتیں کرتے اور تیلگو کو چنداں پسند نہ کرتے۔ ہم میاں بیوی بہت فکر مند ہوئے کہ ہماری ساری برادری تیلگو زبان بولتی ہے مگر بچیوں اور بچوں میں سے کسی کو یہ زبان پسند نہیں ہے اور وہ اردو ہی کو محبوب جانتے ہیں۔ پھر ان کی شادیوں کا کیا بنے گا اور ان کا مستقبل کیا ہوگا؟ سوچ سوچ کر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہمیں حمایت نگر کی سکونت ترک کر کے واپس اپنے شہر کو چلے جانا چاہئے۔ وہاں زمین بھی تھی اور عزیز رشتہ دار بھی۔

حمایت نگر میں رہتے ہوئے ہمیں پندرہ سال بیت گئے تھے۔ چنانچہ اس قصبے کو

چھوڑتے ہوئے وہاں کے لوگوں نے جس پریشانی اور خلوص و محبت کا مظاہرہ کیا وہ دیدنی تھا۔ وہ دور تک ہمیں الوداع کہنے آئے۔ ان کے بہتے ہوئے آنسو صاف بتا رہے تھے کہ ہماری جدائی ان پر شاق گزرے گی۔ ہم بھی رو رہے تھے مگر یہ فیصلہ ہم نے بامر مجبوری کیا تھا۔

وشاکھا پٹنم میں واپس آئے اور اپنے ان عزیزوں سے جو ہماری زمین کاشت کر رہے تھے، زمین واپس مانگی تو گویا ان کی نظریں ہی بدل گئیں۔ نفرت اور بغض ان کا شعار بن گیا اور کدورت ان کے ایک ایک عمل سے نمایاں ہونے لگی۔ اپنے باپ دادا کی یہ سرزمین اور جنم بھومی ہمیں زہر لگنے لگی۔ یہاں زندگی گزارنا دوبھر ہو گیا۔ رہ رہ کر حمایت نگر کے لوگوں کی اپنائیت اور محبت یاد آنے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد ہم نے دوبارہ بوریا بستر سمیٹا اور وشاکھا پٹنم کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ کر حمایت نگر لوٹ آئے۔

یہاں کے لوگوں نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کی مسرتوں کی کوئی انتہا نہ تھی۔ پریکٹس پہلے سے بھی زیادہ چلنے لگی اور وہ تلخیاں جو اپنے آبائی شہر کے عزیز رشتہ داروں کے ہاتھوں ملی تھیں، یکسر نابود ہو گئیں۔

حمایت نگر میں ہمیں محبت کا جو ماحول ملا تھا، اس میں غالب حصہ مسلمانوں کی طرف سے تھا۔ یوں بھی میں اسلامی معاشرت سے بہت متاثر ہوا تھا۔ بچوں کی دوستیاں بھی مسلمانوں ہی سے تھیں اور وہ مسلمانوں کی زبان اردو بولتے تھے۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ ہمیں مسلمان ہو جانا چاہیے۔ بیوی سے ذکر کیا تو اس نے بھی خوشدلی سے میری تائید کی اور بچوں کو تو گویا ان کی منزلِ مقصود مل رہی تھی۔ چنانچہ میرے سارے گھرانے نے نہایت جوش و خروش سے مگر طویل غور و فکر کے بعد آخرکار اسلام قبول کر لیا۔

سوال ...... قبولِ اسلام کے بعد عام لوگوں کا ردِ عمل کیا تھا؟

جواب ...... ردِ عمل بڑا عجیب تھا۔ ہندوؤں میں تو ناراضگی بلکہ غیظ و غضب کی لہر اٹھی ہی تھی مگر مسلمان بھی کھچے کھچے رہنے لگے۔ شاید اس لئے کہ کہیں میری اس حرکت سے مسلم کش فسادات نہ شروع ہو جائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بائیکاٹ کی سی صورتحال پیدا ہو گئی اور میری پریکٹس بری طرح متاثر ہوئی۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں استقامت بخشی اور ہم اس کے دین پر مضبوطی سے ڈٹے رہے۔

یہی ایام تھے کہ جب ایک روز نانڈیڑ کے سابق امیرِ جماعتِ اسلامی حمید اختر صاحب مجھے ملنے آئے۔ انہیں ہمارے قبولِ اسلام کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ موجودہ حالات سے بھی باخبر تھے۔ انہوں نے پیشکش کی کہ جماعتِ اسلامی نانڈیڑ میں ایک مفت شفاخانہ قائم کر رہی ہے میں اس کا انچارج بن جاؤں اور یہ کہ ابتدائی طور پر آٹھ سو روپے ماہوار مشاہرہ مقرر کیا جائے گا۔ میں نے یہ پیشکش قبول کر لی اور آج کل یہی فرائض انجام دے رہا ہوں۔

سوال.....قبولِ اسلام کے بعد آپ نے اسلام کو پورا پورا سمجھنے کے لئے کون کون سی کتابوں کا مطالعہ کیا؟

جواب...... سب سے پہلے میرے لئے وقت طلب مسئلہ نماز میں عربی سورتوں کا پڑھنا تھا۔ میں اردو اور عربی سے قطعی نابلد تھا۔ اس لئے قرآنی آیات آسانی سے زبان پر نہ چڑھتی تھیں۔ اس مشکل کا ذکر میں نے اپنے ایک مسلمان دوست سے کیا۔ انہوں نے میرا تعارف ایک مسلمان استاد اسد صاحب سے کرایا جو ایک گاؤں میں اسکول ماسٹر ہیں۔ انہوں نے مجھے نماز کی ایک ایسی کتاب لا دی جس کا عربی تلفظ تیلگو میں تھا اور ساتھ ہی ساتھ تیلگو اور انگریزی زبان میں ترجمہ بھی تھا۔ اس سے میں نے عربی سورتوں کو آسانی سے یاد کر لیا۔ میں نے قرآن کا مطالعہ بھی شروع کر دیا جس کا عربی متن تیلگو زبان میں تھا۔ قرآن کے مسلسل مطالعے نے مجھے ایسا ذہنی سکون بخشا جس کی لذت ناقابلِ بیان ہے۔ میں نے جماعتِ اسلامی کے لٹریچر اور مولانا مودودی کی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا جس سے مجھے اسلام کو سمجھنے میں بہت آسانی ہوئی۔ میری اہلیہ نے بھی اس لٹریچر کا مطالعہ کیا۔ اللہ کے فضل سے دین کے علم نے ہمارے دلوں کو منور کیا۔ یہ اسی کا کرم ہے کہ قبولِ اسلام کے بعد سے آج تک ہماری کوئی نماز قضا نہیں ہوئی۔ میرے ایسے مسلمان دوست جو بدقسمتی سے نماز نہیں پڑھتے' ملنے آتے ہیں اور نماز کا وقت ہو جاتا ہے تو میں معذرت خواہ ہوتا ہوں کہ نماز کی وجہ سے میں زیادہ وقت نہیں دے سکتا اور انہیں نماز کے بعد تک انتظار کا کہہ کر مسجد میں چلا جاتا ہوں تو ان پر خصوصی اثر ہوتا ہے۔ کتنے ہی لوگ ہیں جو میرے اس طرزِ عمل کی وجہ سے پکے نمازی ہو گئے۔

سوال.....قبول اسلام کے بعد آپ نے قبل اسلام کی زندگی اور موجودہ زندگی میں کیا فرق محسوس کیا؟

جواب.....قبول اسلام کے بعد میں نے موجودہ زندگی میں سب سے پہلے اطمینان قلب محسوس کیا اور سکون کی وہ مسرت پائی جو پہلے مجھے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ زیادہ کمانے اور دولت بنانے کی جس ہوس نے مجھے بے اطمینانی سے دوچار کر دیا تھا' جاتی رہی۔ اب قناعت کو میں نے بہت بڑی نعمت پایا ہے اور اس پر میں ربِ عظیم کا جتنا بھی شکر ادا کروں' کم ہے۔

سوال.....مسلمان برادری کے لئے آپ کا کوئی پیغام؟

جواب..... میں صرف اتنا کہوں گا کہ ہم سب کو اسلام کا عملی نمونہ بن جانا چاہئے۔ اس ماڈرن دور میں غیر مسلم صرف مسلمان کے عمل کو دیکھ کر ہی اسلام کو سمجھ سکتا ہے' جیسا کہ قبلِ اسلام خود میرا تاثر یہی تھا۔ اگر ہر مسلمان قرآن کا عملی نمونہ بن جائے تو دنیا اسلام کی نعمت سے مالا مال ہو جائے۔ اچھے مسلمان بھائیوں کے لئے بس یہی میرا پیغام ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن کا عملی نمونہ بننے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

●.....●.....●

محمد جان ویبسٹر

MOHAMMAD JHON WEBSTER

(انگلستان)

ذیل کا انٹرویو ماہنامہ ''چراغ راہ'' کراچی کے شمارہ جون ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا تھا۔اور اسے مدیر رسالہ پروفیسر خورشید احمد صاحب نے مرتب فرمایا تھا۔

ویبسٹر سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۸ء میں ہوئی تھی۔موصوف اسلامی کولوکیم میں شرکت کے لیے لاہور آئے تھے اس لئے لاعلمی کے باعث قادیانیوں کے چکر میں پھنس گئے تھے۔قادیانیت کے متعلق میرا ہمیشہ سے خیال ہے کہ اسے شعوری طور پر وہی قبول کر سکتا ہے جو یا تو اچھا خاصا غبی ہو یا کوئی مفاد اسے اس طرف لے جائے۔ویبسٹر میں ان دونوں میں سے کوئی بھی چیز نہیں تھی' اس لئے چند ہی دنوں میں قادیانیت کا پول ان کے سامنے کھل گیا۔ربوہ سے وہ مختلف شہروں میں گھومتے ہوئے کراچی تشریف لائے اور ہماری ملاقات چند ہی روز میں اچھی خاصی دوستی میں بدل گئی۔

ویبسٹر اور مجھ میں منجملہ اور چیزوں کے ایک چیز یہ بھی مشترک ہے کہ ہم دونوں خط لکھنے کے چور ہیں۔نتیجہ یہ ہوا کہ دو سال تک آنے جانے والوں کے ذریعے سلام برابر پہنچتے لیکن کسی نے بھی خط نہ لکھا۔عید سے دو تین دن پیشتر میں مطالعہ میں مصروف تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔دوسری طرف سے بولنے والے ہمارے دوست سرور صاحب تھے جو کہہ رہے تھے کہ مسٹر ویبسٹر آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ٹیلیفون پر ویبسٹر سے اس طرح اچانک گفتگو میرے لئے ایک خوشگوار SURPRISE تھا۔

ویبسٹر صاحب کراچی میں تقریباً ایک ماہ رہے۔اس اثنا میں درجنوں اجلاسوں کو

خطاب کیا اور بلا شبہ سینکڑوں افراد سے گفتگو کی۔ آج کا ویسٹر دو سال پہلے کے ویسٹر سے بہت مختلف تھا۔ اب اسلام پر اس کا مطالعہ بہت Up to Date ہے اور وہ صرف ایک مسلمان ہی نہیں ایک مبلغ بھی ہے۔ انگلستان میں اس نے ایک تبلیغی مشن میں بھی کام شروع کر دیا ہے اور اس کی مساعی کے نتیجے کے طور پر انگلستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ وہاں کے مشہور ہائیڈ پارک میں ایک اسلامک پلیٹ فارم قائم ہو گیا ہے' جہاں سے ہفتہ کی ہر شام کو اسلام پر تقاریر ہوتی ہیں اور ان تقاریر کو ہزاروں افراد سنتے ہیں۔ اس وقت سب سے اچھی حاضری اسلامک پلیٹ فارم پر ہو رہی ہے اور ایک سال میں ۱۱۲ غیر مسلم افراد حلقۂ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں۔ پھر ویسٹر کی ظاہری شکل و صورت میں بھی آ گئی ہے۔ اب اس کے چہرے پر ڈاڑھی بھی ہے جو بھلی معلوم ہوتی ہے اور یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ ویسٹر کی ڈاڑھی اور اس کے عام خط و خال مشہور جرمن نو مسلم علامہ محمد اسد سے بہت مشابہ ہیں۔

ویسٹر کے قیام کراچی کے دوران' میں نے ایک انٹرویو بھی لیا تھا جسے ہدیۂ قارئین کرتا ہوں:

سوال: سب سے پہلے کیا آپ اس بات پر روشنی ڈالیں گے کہ آپ نے اسلام کیوں قبول کیا؟

ویسٹر: آپ یقین جانیں کہ میرا قبولِ اسلام میرے لئے ایک ذاتی معجزہ سے کم نہ تھا۔ میں اسے معجزہ کسی عیسائی اثر کی بنا پر نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ یہ فیصلہ اتنا فوری اور اس درجہ غیر متوقع تھا کہ میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میرے اسلام لانے میں کسی مسلمان کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔ کبھی کسی شخص نے مجھے اسلام کی دعوت نہیں پہنچائی بلکہ حقیقت تو یہ ہے کبھی کسی مسلمان سے مجھے ربط ضبط کا موقع ہی نہیں ملا۔ اسلام کی نعمت مجھے اپنی ذاتی جستجو اور تلاش سے حاصل ہوئی اور ایسے غیر متوقع طور پر حاصل ہوئی کہ میں اسے معجزہ کہنے پر مجبور ہوں۔ دوسروں کے لیے نہیں صرف اپنے لیے ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ.

سوال: پھر تو آپ ذرا تفصیل سے بتائیں کہ آپ اسلام کس طرح لائے؟

ویسٹر: میں لندن کے ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ میری والدہ بڑی

نیک اور شریف خاتون ہیں اور بچپن میں مجھ پر سب سے زیادہ اثر اپنی والدہ کا پڑا۔ میں دیکھتا تھا کہ یہ نیک بی بی ہر اتوار کو گرجا جاتی ہیں اور اپنے تمام معاملات کو سچائی اور انصاف کے ساتھ پورا کرتی ہیں۔ اپنے محلہ کی تمام خواتین کی ہر ممکن مدد کرتی ہیں۔ کسی کو دوائی دے رہیں تو کسی کو نصیحت کر رہیں، کسی کے کام میں ہاتھ بٹا رہی ہیں۔ غرض ہر حیثیت سے ان کی زندگی ایک اچھی خاتون کی زندگی تھی اور یہی اقدار میرے دل و دماغ پر رقم ہو گئیں۔ میں نے باقاعدگی سے چرچ جانا شروع کر دیا اور اپنی ماں کا ہر ممکن تتبع کرنے لگا۔ جب میں دس سال کا تھا اور میرے جذبات عیسائیت کے لئے بڑے مخلصانہ تھے تو ایک دن میں نے اپنے رب سے دعا کی کہ ''اے مالکِ حقیقی! میں اپنی زندگی تیرے لئے وقف کرتا ہوں تو میری رہنمائی فرما اور مجھے سیدھا راستہ دکھا''۔ پھر میں نے عیسائیت کی تبلیغ کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ اس زمانے میں سالویشن آرمی SALVATION ARMY کا بڑا چرچا تھا، میں اس میں شریک ہو گیا اور پوری سرگرمی سے اس کے پروگراموں میں شامل ہونے لگا۔

چند ہی سالوں میں میں نے سالویشن آرمی میں ایسا مقام حاصل کر لیا کہ مجھے اندر کے حالات کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ پھر اب میں بچہ بھی نہ رہا تھا اور اپنی عمر کے اٹھارہ سال پورے کر چکا تھا۔

جب میں نے اندر سے حالات کا مطالعہ کیا اور سالویشن آرمی کے کرتا دھرتاؤں کے قریب ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ ادارہ تبلیغ کا ادارہ نہیں بلکہ تجارت کا ادارہ ہے۔ وہ حضرات اس میں کھلم کھلا نفاق کی تعلیم دیتے تھے۔ اس چیز نے میرے جذبات کو شدید دھچکا پہنچایا اور میں سالویشن آرمی کے ڈائریکٹروں سے متنفر ہو گیا اور اس ادارہ سے اپنا تعلق منقطع کر لیا۔

سالویشن آرمی کو چھوڑ دینے کے بعد بھی عیسائیت پر میرا اعتماد حسبِ سابق تھا، لیکن اب میں نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ میں عیسائیت کا مطالعہ کروں اور اس کے نظامِ فکر و عمل کو سمجھوں۔

عیسائیت کا مطالعہ میری زندگی کے اس دور کا سب سے تکلیف دہ اور جذبات کش

زمانہ تھا۔ جتنا میں اس کا مطالعہ کرتا تھا اتنا ہی میرا اعتماد اس پر متزلزل ہوتا جاتا تھا۔ نئے نئے کانٹے ذہن میں چبھتے جاتے تھے۔ کوئی چیز ایسی نہ تھی جو زخموں کو مندمل کرتی۔

"ایک میں تین اور تین میں ایک" کا عقیدہ ذہن کو سخت پراگندہ کرتا رہا اور حلق سے نہیں اتر پایا۔ یہ تصور کہ ایک شخص کے گناہ کی وجہ سے پوری انسانیت کو سزا دی گئی اور اسے زمین پر پھینک دیا گیا انصاف کے تقاضوں کے خلاف ہے اور پھر یہ نظریہ کہ تمام انسانوں کے گناہوں کی سزا ایک شخص کو دی گئی' دل و دماغ کے لیے اور بھی زیادہ ناقابلِ قبول تھا۔

میں نے عیسائیت کا مطالعہ اس لئے کیا تھا کہ اپنے عقیدہ کو مستحکم کر کے اس کا مبلغ بنوں گا' مگر جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا' پرانے خیالات کا تانا بانا بکھرتا گیا حتیٰ کہ میں نے محسوس کیا کہ عیسائیت میرے دل کی پکار کا جواب نہیں۔ ذہنی اور علمی حیثیت سے یہ مجھے مطمئن نہیں کر سکتی' اور اس سے بڑھ کر سماجی اور معاشرتی معاملات میں یہ میری کوئی رہنمائی نہیں کر سکتی۔ اسے انسانوں کے حقیقی مصائب سے کوئی سروکار نہیں۔ معاشی مسائل کا اس کے پاس کوئی حل نہیں۔ معاشرتی انصاف سے اسے کوئی علاقہ نہیں' جو مذہب انسان کے مسائل ہی کو حل نہ کر سکتا ہو آخر اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟

بالآخر اپنے آبائی خیالات کو میں نے ترک کر دیا اور صرف اپنے آبائی مذہب کو ہی ترک نہ کیا بلکہ مذہب کو ہی ترک کر دیا۔ میں سوچتا تھا کہ جو مذہب دنیا کے سدھار کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تو پھر وہ قطعاً بیکار ہے۔

میرے ذہن کی یہ حالت تھی کہ جب ۱۹۲۱ء میں عظیم معاشی بحران (GREAT DEPRESSION) واقع ہوا۔ لاکھوں افراد بے روزگار ہوئے۔ ہر طرف غربت اور فقر و فاقہ کا منظر نظر آتا تھا۔ بڑے بڑے سرمایہ دار موجود تھے مگر زمین پر سے روٹی اٹھ گئی تھی' روزگار ختم ہو گیا تھا' دلوں کی دنیا لٹ گئی تھی۔ ان حالات نے مجھے سرمایہ داری کا سخت ترین مخالف بنا دیا اور میں انگلستان کی کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گیا۔

تھوڑے ہی عرصہ کے بعد میں پارٹی ممبر بن گیا اور پھر آہستہ آہستہ اوپر اٹھتا رہا حتیٰ کہ انگلستان کی مجلس انتظامیہ (EXECTIVE COUNCIL) کا رکن اور نوجوانوں کی تنظیم کا سیکرٹری بن گیا۔

میں اشتراکیت کے نصب العین میں مگن پارٹی کے لئے ہر قسم کا کام کرتا رہا مگر جوں جوں میں اوپر بڑھ رہا تھا' میں محسوس کر رہا تھا کہ یہاں بھی وہی نفاق ہے جو سالویشن آرمی میں دیکھا تھا۔ عوام کی مشکلات کو ایکسپلائٹ تو برابر کیا جا رہا تھا مگر ان سے کوئی حقیقی ہمدردی نہ تھی ۔ بلکہ ان کے مسائل کو اور پیچیدہ بنایا جاتا تھا تا کہ سرمایہ داری نظام ناکام ہو اور اشتراکیت کو کام کرنے کا ماحول ملے ۔ اس چیز نے مجھے بہت شاک (SHOCK) کیا۔

پھر دو چیزیں ایسی ہوئیں جنھوں نے مجھے بغاوت پر مجبور کیا' ایک تو روسی کیمونسٹ پارٹی کی مدافعت اور دوسرے نازیوں کے سلسلہ میں کیمونسٹ پارٹی کی پالیسی ۔

مجھے جلد ہی اس چیز کا احساس ہو گیا کہ ملک کی کیمونسٹ پارٹی محض روسی پارٹی کی ایک برانچ ہے ۔ اس کی سفارت ہے ۔ اسے کوئی اختیار نہیں اور اس چیز نے میرے ضمیر کو جھنجوڑا ۔ دوسری چیز اس پارٹی کی وہ پالیسی تھی جو وہ نازیوں اور لیبر پارٹی کے متعلق اختیار کئے ہوئے تھی ۔ کیمونسٹ پارٹی نے کہا کہ لیبر پارٹی نازیوں سے زیادہ گئی گزری ہے اور اس کے ساتھ کسی قسم کا تعاون نہیں ہو سکتا ۔ جن ممبران نے لیبر پارٹی کے ساتھ مل کر نازیوں کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کی تجویز پیش کی تھی ان کو پارٹی سے نکال دیا گیا اور اس مسئلہ پر بڑا ہنگامہ رہا ۔ لیکن چند ہی ماہ کے بعد جب مالوٹوف نے کہا کہ نازیوں کے خلاف کیمونسٹ جدوجہد کریں گے تو روس کے اشارہ پر انگلستان کی پارٹی نے اس لیبر پارٹی سے جسے ابھی تک نہ معلوم کیا کیا کہا جا رہا تھا' مل کر متحدہ محاذ بنا لیا ۔ میں نے اس موقع پر مطالبہ کیا کہ جن ممبران کو ہم نے expell کیا تھا ان کو اب واپس لیا جائے کیونکہ وہ صحیح تھے اور ہم غلط' تو نہ صرف یہ کہ اس مطالبہ کو کوئی وزن نہیں دیا گیا بلکہ خود مجھے نکالنے کے مشورے ہونے لگے ۔

ان حالات نے مجبور کر دیا کہ میں پارٹی چھوڑ دوں ۔

کیمونسٹ پارٹی کو چھوڑنے کے بعد میں نے اشتراکیت اور دوسرے سیاسی نظاموں کا مطالعہ کیا اور اس سلسلہ میں جرمن مفکرین کا بھی مطالعہ کیا ۔ میں خاص طور پر فریڈرک نطشے سے بہت متاثر ہوا ۔ وسعتِ مطالعہ کے ساتھ ساتھ کیمونزم کی فکری کمزوریاں بھی میرے سامنے آتی گئیں اور اس کی معاشی تعبیرِ تاریخ جو اس کی اصل بنیاد ہے کا بودا پن مجھ

پر بالکل واضح ہو گیا۔

اس زمانہ میں امپریلزم کے خلاف برابر جدوجہد کرتا رہا اور اس سلسلہ میں ایک پارٹی بھی قائم کی۔

جنگ کے زمانے میں میں نے جنگ کی مخالفت کی۔ اس لئے نہیں کہ میں جنگ کو بُرا سمجھتا تھا بلکہ اس لئے کہ یہ جنگ محض استعماری طاقتوں کے درمیان استعماری مقاصد کے لیے ہو رہی تھی اور اس کا اصل نقصان صرف کمزور ممالک کو پہنچ رہا تھا۔ میری ان سرگرمیوں کی بنا پر مجھے گرفتار کر لیا گیا اور جب رہا کیا گیا تو مجھے انگلستان چھوڑنا پڑا۔

اب میں آسٹریلیا آ گیا۔ میرا مطالعہ برابر جاری تھا اور اشترا کی فکر کو ترک کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مذہب انسان کے لئے بیکار نہیں۔ مذہب کو محض مابعد الطبیعاتی نہیں ہونا چاہئے بلکہ اسے ایک نظام حیات دینا چاہئے اور ایسے اصول اور ایسے اداروں سے مسلح ہونا چاہئے جو معاشرے کو سنواریں اور زمین پر انصاف قائم کرنے کا موجب بنیں۔

آسٹریلیا میں بھی میری سامراج دشمن سرگرمیاں جاری رہیں۔ ہم جلسے کرتے تھے، پمفلٹ چھاپتے تھے اور اگر ضرورت ہوتی تو مخالفین کے خلاف پکٹنگ کرتے تھے اور انہیں تقاریر نہیں کرنے دیتے تھے۔

اس زمانے میں وہ واقعہ پیش آیا جس نے میری دنیا ہی بدل دی۔ ہوا یہ کہ پرتھ یونیورسٹی میں انڈونیشیا کا سفیر شالی آریان کے مسئلہ پر تقریر کرنے آیا۔ آسٹریلیا میں انڈونیشیا کے اس مطالبہ کو ایک سامراجی مطالبہ سمجھا جاتا تھا۔ ہم لوگ وہاں پہنچے اور ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ تقریر نہ ہو سکے۔ انڈونیشی سفیر بڑی خاموشی اور وقار کے ساتھ واپس چلا گیا۔

لیکن اس واقعہ نے مجھ پر دو اثر چھوڑے۔

پہلا یہ کہ جب ہم جمہوریت اور آزادی کے علمبردار بن گئے ہیں تو ہم نے آخر اس شریف آدمی کو یہ موقع کیوں نہیں دیا کہ وہ اپنا نقطۂ نظر بیان کرے۔ ہم اس پر تنقید کر سکتے تھے مگر ہم نے اسے آخر بولنے سے کیوں روکا؟ یہ غیر اخلاقی حرکت ہے۔

دوسرا یہ کہ اصل مسئلہ ہے کیا؟ اور یہ کیا بنیاد ہے کہ چونکہ وہاں کی آبادی مسلمان ہے اس لئے اسے ہمارے ساتھ ہونا چاہئے اور یہ کہ مسلمانوں کے عقائد کیا ہیں؟ ان کا مذہب کیا ہے؟ یہ سوالات میرے ذہن میں ابھرے اور مَیں نے مسلمانوں کے حالات اور ان کے مذہب کو پڑھنے کا ارادہ کر لیا۔

اسی زمانے میں مصر نے سویز کو نیشنلائز کرنے کا ارادہ کر لیا۔ یہ فیصلہ امپریلزم پر ایک ضرب کاری تھا اور مَیں خوشی سے اچھل پڑا۔ پھر مَیں نے سوچا کہ ناصر مسلمان ہے اور مسلمان امپریلزم کے خلاف لڑ رہے ہیں اور اس بات نے اسلام میں میری دلچسپی کو بڑھا دیا۔ مَیں اسلام پر کتابوں کی تلاش میں نکلا اور ایک سٹال پر میری نظر ایک کتاب پر جم گئی۔ ROAD TO MECCA میں نے کتاب خرید لی اور اس کو حرف بہ حرف پڑھا۔ اسے پڑھ کر مَیں اسلام کے بہت قریب آ گیا۔

اب مَیں نے قرآن کا مطالعہ شروع کیا۔

یونیورسٹی لائبریری سے مَیں نے ایک انگریز کا ترجمۂ قرآن لیا۔ لیکن اس کے پہلے ہی صفحے پر پیغمبر اسلام پر اعتراض تھا۔ مَیں نے اسے بند کر دیا کہ جو شخص کتاب کا آغاز ہی اعتراض سے کرتا ہے اس کا ترجمہ قابلِ اعتماد نہیں ہو سکتا۔ پھر مَیں نے لائبریرین سے کہا کہ ایسا ترجمہ دو جو کسی مسلمان نے کیا ہو۔ بڑی محنت کے بعد مجھے ایک ترجمہ ملا۔ محمد علی کا اور مَیں نے اس کا مطالعہ باقاعدگی سے کیا۔

پھر مَیں نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زندگی کا مطالعہ کیا اور مجھے اس عظیم انسان کی زندگی کے حالات نے بڑا متاثر کیا۔ حضرت عیسیٰؑ کے مقابلے میں آپ کی پوری زندگی محفوظ تھی۔ یہ زندگی بڑی صاف' بڑی پاکیزہ' بڑی متاثر کن تھی۔ یہ شخص جو کہتا تھا اس پر عمل کرتا تھا۔ اس کے دوست' اس کے جانثار اور اس کے دشمن اسے امین کہتے تھے۔ اس کا کردار ہر شبہ سے بالا تھا۔ اس کی سچائی روز روشن کی طرح ظاہر تھی۔

مَیں نے پڑھا کہ چالیس سال کی عمر میں اس شخص پر وحی کی گئی۔

فرشتے نے اسے کہا کہ پڑھ۔

اس نے جواب دیا: "مَیں ان پڑھ ہوں کیسے پڑھ سکتا ہوں۔" کتنا سچا تھا یہ

انسان۔

وحی کے اس واقعہ کو آ کر اس نے اپنی زوجہ کو بتایا۔ اس کی بیوی کا پہلا ردِ عمل یہ تھا: ''آپ اطمینان رکھیں اور گھبرائیں نہیں۔ آپ نے کبھی کسی سے برائی نہیں کی' آپ کو کوئی دھوکہ نہیں دے سکتا۔ آپ پر اللہ کا فرشتہ ہی نازل ہوا ہوگا''۔ ظاہر ہے بیوی ایک ایسی ہستی ہے جس سے انسان اپنا کوئی عیب چھپا نہیں سکتا۔ وہ ظاہر و باطن سب سے واقف ہوتی ہے۔ جس شخص پر سب سے پہلے اس کی بیوی ایمان لائی' وہ یقینا نہایت سچا آدمی ہی ہو سکتا ہے۔

پھر میں نے اس شخص کی تعلیم میں دنیا کے مسائل سے دلچسپی اور ان کو حل کرنے میں قوت بھی دیکھی۔ وہ زندگی سے کاٹتا نہیں' زندگی کو سنوارتا ہے۔ وہ معاشرتی اور تمدنی معاملات میں رہنمائی دیتا ہے اور ایک نئی تہذیب قائم کرتا ہے۔

جب میں نے اس عظیم شخص کی زندگی کا مطالعہ مکمل کر لیا تو میرے دل سے خود بخود یہ آواز نکلی: کہ اللہ ایک ہے اور محمد اس کے سچے رسول ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ جب میں یونیورسٹی لائبریری سے باہر نکلا تو میں نے دیکھا اور پہلی مرتبہ دیکھا حالانکہ میں اس سڑک سے بارہا گزر چکا تھا کہ قریب ہی ایک مسجد ہے جس پر لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا ہوا ہے۔ مسجد کا اس طرح میری آنکھوں کے سامنے ہونا ایک معجزہ تھا۔ میں اس میں داخل ہوا اور میں نے اعلان کیا:

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

یہ ہے میرے قبولِ اسلام کی داستان۔

سوال: عالم اسلام کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ جن حالات میں آج کل مسلمان گھرے ہوئے ہیں' ان کے متعلق آپ کا تجزیہ کیا ہے؟

جواب: ان حالات کے متعلق میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ اگر عالم اسلام کو دیکھ کر میرے اسلام لانے کا سوال ہوتا تو میں کبھی مسلمان نہ ہوتا۔ مسلم دنیا میں آج کوئی ایسی چیز نہیں جو قبولِ اسلام کی تحریک کرتی ہو اور یہ بڑی تکلیف دہ صورت حال ہے۔

میں نے ہند و پاکستان کا بڑی تفصیل سے دورہ کیا ہے۔ عرب ممالک کے مسلمانوں سے لندن میں ملنے اور ان کے حالات کو سمجھنے کا موقع ملا ہے۔ افسوس مسلمان ان تمام

خوبیوں کو چھوڑ چکے ہیں یا چھوڑتے جا رہے ہیں جو اسلام نے ان کو سکھائی تھیں بلکہ آپ یقین کریں کہ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یورپ 'لا دین یورپ' کئی حیثیتوں سے مسلمانوں سے زیادہ مسلمان ہے۔ اسلام نے ہمیں صفائی اور طہارت کی تعلیم دی۔ مسلمانوں کو صفائی اور حفظانِ صحت کا کچھ خیال نہیں۔ اسلام ہر حال میں وعدے کے ایفا کی تعلیم دیتا ہے' مسلمان کو آج عہد کا کوئی پاس نہیں۔ اسلام وقت کی پابندی کا مطالبہ کرتا ہے' ہمارے یہاں آج پاکستان میں ٹائم کے معنی وقتِ مقررہ سے دو گھنٹے پہلے یا دو گھنٹے بعد کے ہیں۔ اسلام حرکت اور عمل کی ترغیب دیتا ہے اور مسلمان آج بیٹھے بیٹھے انشاء اللہ اور ماشاء اللہ کہتے رہتے ہیں۔ یہ الفاظ ان کی نگاہ میں آج محض دو بغیر معنی کے بول بن کے رہ گئے ہیں جب وہ انشاء اللہ کہتے ہیں تو کبھی سوچتے نہیں کہ اللہ کی منشا کیا ہے اور اس نے اس کے پورا کرنے کا کیا راستہ بتایا ہے۔ جب وہ ماشاء اللہ کہتے ہیں تو یہ خیال ان کو نہیں آتا ہے کہ کامیابی کا ایک ایک طریقہ بھی اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے۔

مختصراً ہمارے تین بڑے طبقے ہیں اور تینوں کسی نہ کسی مرض میں مبتلا ہیں۔ عوام جہالت کا شکار ہیں۔ ان کے سامنے نہ کوئی مقصد ہے اور نہ وہ یہ جانتے ہیں کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ علماء دین کے حقائق سے کٹ گئے ہیں اور بسم اللہ کے گنبد میں محصور ہیں (Nory Tower of Salvation) جبکہ متوسط کاروباری طبقہ توہمات کا شکار ہے۔ وہ اسلام اور اس کے مطالبات کا کوئی واضح نقشہ اپنے سامنے نہیں رکھتا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج ہم عدمِ توازن اور بے اعتدالی کا شکار ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان تینوں طبقات میں پورا پورا تعاون ہو اور ہر ایک اپنا اپنا کردار بہتر انداز میں ادا کرے تاکہ تعمیر و ترقی رونما ہو سکے۔

سوال: مسٹر ویبسٹر حالات واقعی مایوس کن ہیں' لیکن کیا آپ کو امید کی کوئی کرن نظر آتی ہے؟

جواب: یقیناً اول تو اسلام اللہ کا دین ہے اور اس کی ترقی اور ترویج کے لئے وہ خود بندوبست کرتا ہے۔ اگر آج کے مسلمان اپنی ذمہ داری کو پورا نہیں کریں گے تو وہ کسی اور قوم کو اس کا علمبردار بنا دے گا تاکہ وہ اس کی حقیقی خدمت انجام دے۔ تاریخ ہماری محتاج نہیں۔ ماضی میں بھی اللہ تعالیٰ نے مختلف قوموں سے کام لیا اور مستقبل میں بھی وہ ایسا انتظام

کر سکتا ہے۔ چنانچہ حالات کی سنگینی کے باوجود میرے نزدیک مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔

پھر عالم اسلام میں بھی امید کی ایک کرن نظر آرہی ہے اور وہ جدید احیائی تحریکات ہیں۔ اخوان المسلمون اور جماعتِ اسلامی اس سلسلے میں بڑی اہم ہیں۔ ان تحریکات کے قائدین سے مل کر میں نے محسوس کیا کہ وہ اسلام کا حقیقی تصور پیش کر رہی ہیں۔ اسلامی ریاست کے ارتقا کی جس نہج کو وہ پیش کر رہی ہیں وہ بڑا امید افزا ہے لیکن ان تحریکات کے متعلق جو چیز کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے پروگرام میں تعلیمی اور عوامی کام اور سیاسی کام میں توازن قائم نہیں رکھا اور سیاست پر EMPHASIS کی وجہ سے بہت سی دوسری ضروری چیزیں پوری نہیں ہو سکی ہیں۔

سوال: آپ کے خیال میں مسلمانوں کا رویہ مغرب کے بارے میں کیا ہونا چاہئے؟

جواب: مغرب مادیت اور الحاد کا علمبردار ہے۔ اسلام کو اس سے کوئی علاقہ نہیں۔ مغرب سامراج اور امپریلزم کا حامی ہے۔ اسلام ان کا دشمن ہے۔ اسلام زندگی کو اخلاقی اور روحانی بنیادوں پر قائم کرتا ہے' وہ ترقی کا مخالف نہیں اس کی صحیح نہج کو متعین کرتا ہے۔ اس میں رہبانیت نہیں ہے' تصوف نہیں ہے' توہم نہیں ہے۔ اسلام تو زندگی کا سیدھا راستہ ہے جو روحانی اور اخلاقی دونوں قسم کی ترقی چاہتا ہے۔ میرے خیال میں مسلمانوں کے لئے بہت ضروری ہے کہ وہ اپنے کلچر پر قائم رہیں اور اس کو مستحکم کریں۔ مغربی کلچر' مغربی تہذیب' مغربی اصولوں کو اختیار کرنا ہمارے لئے مہلک ہوگا۔ ہماری ترقی مغرب کی نقالی میں نہیں' اپنے طریقہ کے اتباع میں ہے۔

پھر مغرب خود اخلاقی دیوالیہ پن کا شکار ہے اور جو خود دیوالیہ ہو وہ دوسروں کی رہنمائی کیا کرے گا؟ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا تھا کہ اگر ایک اندھا دوسرے کی رہبری کرے گا تو دونوں گڑھے میں گریں گے۔

ہمارے پاس اسلام کی روشنی موجود ہے پھر ہم بصیرت سے محروم یورپ کی تقلید کیوں کریں۔ لیکن کچھ چیزیں ہیں جن میں ہم یورپ سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً عمل اور جدوجہد کا جذبہ' صحت و صفائی کے اصول' سائنسی ترقی...... ان تمام چیزوں کو جو دراصل اسلام ہی سے مستعار ہیں' ہم اختیار کر سکتے ہیں اور اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر منیر احمد راشد (بہاماز)

دو ڈھائی سال گزرے گرمیوں کی ایک سہ پہر کو منصورہ کی جامع مسجد میں نماز عصر کے بعد میں نے ایک باریش، دراز قد، صحت مند سیاہ فام شخص کو دیکھا جس کے لباس نے خصوصاً میری توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ غیر ملکی ہونے کے باوجود پاجامہ اور کرتہ زیب تن کیے ہوئے تھا۔ تعارف ہوا تو پتہ چلا کہ موصوف بہاماز (BAHAMAS) سے آئے ہیں اور نو مسلم ڈاکٹر ہیں۔ چنانچہ میں نے ان سے تفصیلی ملاقات کا وقت لیا اور ان کی خواہش پر ایک سوالنامہ ان کے حوالے کر دیا جس کے تفصیلی جوابات انہوں نے اپنے قلم سے تحریر کر دیئے۔ اسی تحریر کو اردو میں منتقل کر کے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یاد رہے کہ بہاماز بحر اوقیانوس میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے جنوبی ساحلوں کے قریب ایک چھوٹی سی خود مختار ریاست ہے، جس کی اکثریت سیاہ فام آبادی پر مشتمل ہے۔ حسب ذیل سوالنامہ اور اس کے جواب ذیل میں ترتیب وار ملاحظہ کیجیے۔

سوالات:

۱۔ میرے دینی بھائی براہ کرم اپنا پورا اور مفصل تعارف رقم فرما دیجئے۔ آپ کہاں اور کس خاندان میں پیدا ہوئے؟ پرانا اور نیا نام کیا ہے اور تعلیم اور ملازمت کے مراحل کہاں طے کئے ہیں؟

۲۔ سب سے پہلے آپ اسلام سے کب متعارف ہوئے؟ اس ضمن میں آپ نے مثال کے طور پر کون کون سی کتابوں کا مطالعہ کیا اور آخر کار کیسے اسلام قبول کیا؟

۳۔ قبولِ اسلام کے بعد آپ نے اپنے اندر کس نوعیت کی تبدیلیاں محسوس کیں؟

۴۔ قبولِ اسلام کے بعد آپ کے والدین، حلقۂ احباب، خاندان اور اہلیہ کا ردِ عمل کیا تھا؟

۵۔ بہاماز کی عام معاشرتی حالت کیسی ہے؟ براہ کرم وہاں کی سماجی اور اخلاقی صورت حال پر کچھ روشنی ڈالیے۔ آپ نے اپنی گفتگو میں بتایا ہے کہ بہاماز میں آزاد معاشرت (فری سیکس سوسائٹی) پروان چڑھ رہی ہے' اس حوالے سے وہاں کی عورتوں کے بارے میں ضروری معلومات تحریر فرمایئے۔

۶۔ جب آپ کے ملک میں سارے کا سارا معاشرہ ہر نوع کی پابندی کے بغیر ''عیش'' کر رہا ہے تو کیا آپ کے ذہن میں نہیں آتا کہ اسلام قبول کر کے آپ کتنی ''مسرتوں'' سے محروم ہو گئے ہیں؟

۷۔ بہاماز میں مسلمان کتنے ہیں اور وہ کس حال میں زندگی گزار رہے ہیں؟ کفر و عصیان کی غلاظت سے وہ اپنا دامن کس طرح بچاتے ہیں؟

۸۔ ذاتی و اجتماعی تربیت کے لئے آپ کیا ذرائع استعمال کرتے ہیں اور کون سی کتابوں سے استفادہ کرتے ہیں؟

۹۔ پاکستان آ کر آپ نے کیا محسوس کیا؟ یہاں کی عام معاشرتی صورتحال کے بارے میں آپ کا تبصرہ کیا ہے؟

جوابات:

ا۔ میرا نام ڈاکٹر منیر احمد راشد ہے۔ میں ۲۸ ستمبر ۱۹۴۳ء کو بہاماز کے صدر مقام نساؤ (NASSAU) میں پیدا ہوا۔ میرا پیدائشی نام ویوان فرانسس رسل تھا۔ والد کا ایرک رسل ہے جبکہ والدہ ریتھ رسل کے نام سے موسوم ہیں۔ دونوں کیتھولک عیسائی ہیں۔ یہ گھرانا پانچ بیٹوں اور دو بیٹیوں پر مشتمل ہے۔ لڑکوں میں میرا تیسرا نمبر ہے۔ اللہ کے فضل سے ہم دو بھائی اسلام کی نعمت سے بہرہ ور ہو گئے ہیں۔ جبکہ باقی سب لوگ بدستور عیسائی ہیں۔

میں نے پرائمری تعلیم سینٹ جوزف کیتھولک سکول نساؤ سے حاصل کی۔ میٹرک سینٹ آگسٹن سیکنڈری سکول سے پاس کیا جبکہ اپنی سیکنڈری تعلیم (سینئر کیمبرج سرٹیفکیٹ) دسمبر ۱۹۶۰ء میں کیمبرج یونیورسٹی انگلینڈ سے حاصل کی۔ ستمبر ۱۹۶۱ء میں میں نے لوزیانہ (امریکہ کی کیتھولک یونیورسٹی) میں داخلہ لیا اور وہاں چار سال تک تعلیم حاصل کر کے مئی

۱۹۶۵ء میں سائنس کی بیچلر ڈگری حاصل کی۔ بہاماز واپس آ کر ناؤ کے ایک کیتھولک ہائی سکول میں بیالوجی، کیمسٹری اور ہیلتھ سائنس کی تعلیم دینے لگا۔ ۱۹۶۶ء میں میں نے ہاورڈ یونیورسٹی (واشنگٹن ڈی سی) میں داخلہ لے لیا۔ طفیلی پودوں اور کیڑوں کے شعبے (PARASITOLOGY) میں تحقیق کا کام کرنے لگا۔ ۱۹۶۷ء میں میں اسی یونیورسٹی کے شعبہ دندان سازی میں تعلیم حاصل کرنے لگا اور جون ۱۹۷۱ء میں مجھے ڈاکٹر آف ڈینٹل سرجری کی ڈگری مل گئی۔ ۱۹۷۴ء تک میں نے منہ، جبڑے اور چہرے کی سرجری میں بھی تخصص (SPECIALZATION) حاصل کیا۔

۲۔ میں ۱۹۶۸ء میں سب سے پہلے اسلام سے متعارف ہوا۔ ہاورڈ یونیورسٹی میں مشہور باکسر محمد علی آئے اور طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے اسلام کی بنیادی خصوصیات بیان کیں۔ جن سے میں بہت متاثر ہوا۔ ان دنوں محمد علی علیجاہ محمد کی تحریک ''نیشن آف اسلام'' سے وابستہ تھے۔ چنانچہ میں نے اس تحریک کے جرائد اور کتب کا مطالعہ شروع کر دیا اور یہ دیکھ کر مجھے خوشگوار حیرت ہوئی کہ اس تحریک کے نتیجے میں بے شمار سیاہ فام لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب آ گیا ہے۔ انہوں نے جرائم اور شراب نوشی کو ترک کر کے پاکیزہ زندگی اپنالی ہے اور محنت اور دیانت کو اپنا شعار بنالیا ہے۔ امریکہ میں سیاہ فام مردوں اور عورتوں کی حالت زار پر میں یوں بھی کڑھتا رہتا تھا چنانچہ اس تحریک کی صورت میں مجھے اندھیروں میں روشنی کی ایک کرن دکھائی دی اور میں نے جولائی ۱۹۷۱ء میں اسلام کو اسی صورت میں قبول کر لیا جس صورت میں علیجاہ محمد اس کی تعبیر اور تبلیغ کرتے تھے۔ اس سے ایک ہی ماہ پہلے مجھے ڈاکٹر آف ڈینٹل سرجری کی ڈگری ملی تھی۔ ۱۹۷۲ء میں میری اہلیہ بھی حلقہ بگوش اسلام ہو گئی۔

یہ میری خوش نصیبی ہے کہ مطالعے کے دوران مجھے مولانا مودودی کی کتاب TOWARDS UNDERSTANDING ISLAM (دینیات کا انگریزی ترجمہ) مل گئی جس سے اندازہ ہوا کہ اسلام کے بارے میں علی جاہ محمد کے خیالات قرآن و سنت سے خاصے مختلف ہیں۔ اس کے بعد میں نے مولانا مودودی ہی کی ''فنڈا منٹلوم آف اسلام'' اور ''اسلامک وے آف لائف'' کا مطالعہ کیا اور اسلام کی تعلیمات روز روشن کی

طرح واضح ہو کر سامنے آ گئیں۔ اس ضمن میں بہاماز ہی کے ایک راست فکر نو مسلم خلیل خلفانی سے بھی میری ملاقات ہوئی۔ میں نے علیجاہ محمد کی تحریک "نیشن آف اسلام" سے اپنا تعلق ختم کر لیا اور ۱۹۷۴ء میں جب تعلیم سے مکمل فراغت حاصل کر کے واپس بہاماز آ گیا تو ہم نے "جماعتُ الاسلام" کی تشکیل کی جس میں وہ مسلمان شامل تھے جو قرآن و سنت کے مطابق صحیح اور بے میل عقائد کے مالک تھے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس وقت تک میرا سب سے چھوٹا بھائی حنیف عبداللہ شاہد بھی مسلمان ہو گیا اور اس کا ایک گہرا دوست اور کلاس فیلو فرید یوسف عبداللہ بھی اسلام کی مقدس و مبارک چھتری تلے آ گیا۔ اس تنظیم کو قائم کرنے کا واحد مقصد یہ تھا کہ راست فکر مسلمان باہم متحد ہو کر خود بھی قرآن و سنت کے مطابق اپنی زندگی گزاریں اور غیر مسلموں تک بھی دینِ حنیف کی صحیح تعلیمات پہنچانے کی تگ و دو کریں۔

۲۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے میں شراب پیتا تھا، رقص کی مخلوط پارٹیوں میں شریک ہوتا تھا اور جیسا کہ یورپین معاشرت کا مزاج ہے، اپنا فارغ وقت عورت کی قربت میں گزارتا اور عیش کرتا تھا۔ معاشرت کے اعتبار سے بہاماز کا ماحول بھی یورپ کا ہو بہو چربہ ہے اور یہاں کا ہر فرد شراب، عورت اور لحمِ خنزیر کا والہ و شیدا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اسلام قبول کرتے ہی میں ان ساری خرافات سے دور ہو گیا اور اپنی روز مرہ زندگی کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے میں لگ گیا۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ عقائد کی کمزوریوں اور خامیوں سے قطع نظر علیجاہ محمد کی تحریک "نیشن آف اسلام" نے بھی ان گنت لوگوں کو مختلف اخلاقی قباحتوں سے بچا لیا تھا جن میں سے ایک میں بھی تھا۔ اسلام کی صحیح تعلیمات کے ادراک نے ان برائیوں سے نفرت میں مزید اضافہ کر دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ دورِ جاہلیت کی زندگی کو میں نے کبھی یاد نہیں کیا اس پر ندامت ضرور ہوتی ہے مگر یہ میرے لئے حسرت نہیں بنی۔

۳۔ عیسائیت کو ترک کر کے اسلام قبول کرنے پر میرے والدین خوش نہ تھے تاہم جب انہوں نے دیکھا کہ میری زندگی نے ایک نئی کروٹ لی ہے اور معمولات میں نیکی، پاکیزگی اور سلجھاؤ پیدا ہوا ہے تو ان کا رویہ خوشگوار ہو گیا۔ اب وہ اچھی طرح جان گئے

ہیں کہ اسلام ایک سچا اور اچھا مذہب ہے مگر وہ عیسائیت کو چھوڑتے ہوئے سخت ہچکچاہٹ محسوس کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ ایک دن آئے گا کہ وہ بھی حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں گے۔

۵۔ جہاں تک بہاماز کی معاشرت کا تعلق ہے وہ اخلاقی اعتبار سے مکمل زوال کی زد میں ہے۔ یقین کیجئے کہ وہاں قانون کا ذرا بھی احترام نہیں۔ جرائم کا تناسب تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ شراب نوشی اور منشیات کا استعمال عام ہے۔ اخلاقی قدریں معدوم ہیں اور خاندانی زندگی تباہ و برباد ہو چکی ہے۔ حکومت اس صورت حال پر قابو پانے میں اس لئے ناکام ہے کہ اعلیٰ افسران کی اکثریت خود ان قباحتوں میں ملوث ہے اور عوام کے اندر ان کا کوئی اخلاقی وقار برقرار نہیں رہا۔ چرچ بھی ان خرابیوں کے سامنے بے بس ہے کہ پادریوں کی اس نوعیت کی تبلیغ کے نتیجے ہی میں آخر کار یہ صورت سامنے آئی ہے کہ حضرت مسیح ان کے گناہوں کے بدلے سولی پر چڑھائے گئے تھے اور اگر لوگ ان کے عقیدت مند بن جائیں' اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے رہیں تو ان کی نجات ہی نجات ہے خواہ اعمال کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں۔ اس طرح عامۃ الناس کا عقیدہ بن گیا ہے کہ چونکہ وہ مذہب عیسوی کے پیروکار ہیں اس لئے ان کی نجات یقینی ہے اور انھیں اپنے دنیوی اعمال کو درست کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ ہر قسم کی اخلاقی قیود سے آزادی کا نتیجہ ہے کہ بہاماز امریکہ اور یورپ کی طرح خطرناک قسم کی جنسی بے راہ روی کے طوفان میں غرق ہو گیا ہے۔ بارہ بارہ تیرہ تیرہ سال کی لڑکیاں جنسی تجربہ حاصل کر لیتی ہیں بلکہ ان میں سے بہت سی حاملہ ہو جاتی ہیں اور ایک اور مصیبت میں پھنس جاتی ہیں۔ یعنی ملکی قانون کے مطابق جب تک ان کی عمر اٹھارہ سال نہ ہو جائے ان کی شادی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ انھیں لامحالہ سکول کی تعلیم ترک کرنی پڑتی ہے اور اگر لڑکی کے والدین اس کے بچے کی پرورش کا ذمہ لیں تو اس کی تعلیم جاری رہتی ہے ورنہ وہ کوئی ملازمت تلاش کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں جو تعلیم کی تکمیل کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔ نتیجتاً یہ لڑکیاں نہ صرف اپنی ذات میں مایوسی اور خوف کی علامت بن جاتی ہیں بلکہ پورے معاشرے کے لئے خطرناک ناسور کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں اور ان کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ حرامی بچے

پورے ملک کے لئے مسئلہ بن گئے ہیں اور کسی نوعیت کا اخلاقی نظام نہ ہونے کی وجہ سے خصوصاً یہ بچے جوں جوں بڑے ہو رہے ہیں' سب کے لئے مصیبت بنتے جا رہے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ امریکہ میں چلنے والی آزادیٔ نسواں کی تحریک اور ہمہ نوع اباحیت نے بہاماز کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا ہے اور خدا ہی جانتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہو گا؟

بہاماز چھوٹے بڑے جزائر پر مشتمل ایک ننھی سی ریاست ہے' جس کی آبادی تقریباً ڈھائی لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ اس میں مسلمانوں کی تعداد ایک سو سے کچھ ہی زیادہ ہو گی۔ ان میں اکثریت نومسلموں کی ہے۔ باقی کا تعلق پاکستان' بنگلہ دیش' مراکش' مصر' سری لنکا اور یورپ سے ہے جو تربیت یافتہ ٹیکنیشن ہیں اور مختلف محکموں میں ملازمت کرتے ہیں۔

٭ جماعت الاسلام کے ارکان کی کل تعداد ۳۵ ہے جن میں ۱۵ مرد' ۷ خواتین (جو مختلف ارکان کی بیگمات ہیں) اور ۱۳ بچے شامل ہیں۔ ہم نے اجتماعی دینی مطالعہ کے لئے سٹڈی سرکل بنا رکھے ہیں۔ مثال کے طور پر ہر روز نمازِ فجر کے بعد قرآن کی اجتماعی تلاوت ہوتی ہے۔ ہر منگل کو نمازِ مغرب کے بعد مرد حضرات کی دینی تربیت کے لئے سٹڈی سرکل ہوتا ہے۔ بدھ اور جمعہ کو نمازِ مغرب کے بعد اسلامی لٹریچر کے حوالے سے گروپ کی صورت میں گفتگوئیں اور مذاکرے (گروپ ڈسکشن) ہوتے ہیں۔ اسلامی لٹریچر میں یہ کتابیں شامل ہیں۔ سید مودودی کی "ٹو ورڈ زانڈرسٹینڈنگ اسلام" سید قطب کی "مائل سٹون" ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی "اسلام ان فوکس" اور مولانا مودودی ہی کی "اسلامک وے آف لائف"۔ ان پروگراموں میں بعض حضرات اپنی بیگمات کو بھی لے آتے ہیں۔ وہ پردے کے پیچھے بیٹھ کر گفتگو میں حصہ لیتی ہیں اور اس معاملے میں ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

ہفتے کو صبح دس بجے سے دوپہر تک کا وقت بچوں کی دینی تعلیم اور تربیت کے لئے مخصوص ہے۔ اتوار کی صبح کو نمازِ فجر کے بعد سارے بھائی پیغمبرِ اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے مختلف پہلوؤں پر باری باری اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ نیز ان مسائل پر بھی گفتگو ہوتی ہے جو ایک غیر مسلم سوسائٹی میں مسلمانوں کو درپیش ہیں۔ اتوار ہی کو نمازِ ظہر کے بعد خواتین کا اجتماع ہوتا ہے۔ ہر مہینے میں ایک مرتبہ بہاماز بھر کے تمام

مسلمانوں کی ایک جنرل میٹنگ بلائی جاتی ہے جس میں سب لوگوں کو جماعت کی رفتارِ کار اور دیگر مسائل سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ اجتماعی کھانا اس میٹنگ کا ضروری حصہ ہے۔ اس کے علاوہ گاہے گاہے رات بھر کا پروگرام بھی رکھا جاتا ہے جو ''جماعت الاسلام'' کے مرکز میں منعقد ہوتا ہے اور جہاں لوگ اکٹھے کھاتے اور دعوت و تربیت کے مختلف طریقوں پر تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ سال میں دو مرتبہ یعنی دسمبر اور جون میں ایک ایک ہفتہ کا تربیتی کیمپ بھی منعقد ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم مقامی اخبارات میں اسلام کے بارے میں معلوماتی مضامین بھی چھپواتے رہتے ہیں۔

جہاں تک لٹریچر کا تعلق ہے، ہمارے پاس مولانا مودودی کی بہت سی انگریزی کتب موجود ہیں۔ مختلف دینی اداروں مثلاً رابطۂ عالمِ اسلامی، افسوؔامی نے بھی ہمیں مطلوبہ کتابوں کے تحائف بھیجے ہیں اور انفرادی طور پر بھی اہلِ خیر ہماری مدد کرتے رہتے ہیں۔ ہماری سب سے بڑی ضرورت ایسے تربیت یافتہ باعمل کارکنان کی ہے جو ہماری تربیت بھی کریں اور اپنے عمل و کردار سے اس غیر اسلامی معاشرے میں اسلام کی جیتی جاگتی مثال بھی قائم کریں۔ اس سلسلے میں اگر پاکستان سے کوئی صاحب ہماری امداد فرمائیں تو ہم بے حد شکرگزار ہوں گے۔

۹۔ پاکستان کے بارے میں میرا تاثر یہ تھا کہ یہ اسلام کے نام پر معرضِ وجود میں آنے والا عظیم اسلامی ملک ہے جہاں ہر طرف اسلام کے عملی نمونے دیکھنے کو ملیں گے مگر افسوس کہ جب میں کراچی پہنچا اور اس شہر کی معاشرت کو ایک نظر دیکھا تو میری خوش فہمی کی عمارت دھڑام سے گر گئی۔ مجھے کراچی کے ماحول میں اسلامی کردار کا کوئی رخ نظر نہیں آیا۔ وہی مغربیت کا چلن، وہی مادہ پرستی کی روش اور اخلاقی قدروں سے پہلو تہی۔ ایئرپورٹ پر ٹیکسی ڈرائیوروں اور قلیوں کا طرزِ عمل بڑا منفی تھا اور اگر میں مسلمان نہ ہوتا تو یہ منظر مجھے اسلام سے بدظن کرنے کے لیے کافی تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ لاہور کی اس بستی منصورہ میں پہنچ کر میرا وہ منفی تاثر جو کراچی میں بنا تھا، زائل ہو گیا اور میں نے یہاں اسلامی اخوت، بھائی چارے اور اخلاص کا وہ مشاہدہ اور تجربہ حاصل کیا جو کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔ خدا کرے یہ جذبہ اس بستی میں ہمیشہ جاری و ساری رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اہلِ منصورہ کی طرف سے مجھے جو محبت ملی ہے وہ ہمیشہ یاد رہے گی۔

ڈاکٹر موریس بوکائے

DR. MAURICE BUCAILLE

(فرانس)

ڈاکٹر موریس بوکائے فرانس کے نامور سرجن، محقق اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں خصوصاً ان کی کتاب BIBLE ,QURAN AND SCIENCE نے عالمگیر شہرت حاصل کی ہے اور دنیا بھر کے علمی حلقوں میں اسے خاص وقعت دی جاتی ہے۔ ORIGIN OF MAN بھی انہی کی تصنیف ہے جس میں مصنف نے محکم دلائل سے ثابت کیا ہے کہ چودہ سو سال پہلے انسان کے آغاز کے بارے میں قرآن نے جو موقف اور نظریہ پیش کیا ہے جدید سائنسی تحقیقات اس کی ہو بہو تصدیق کرتی ہیں۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ چرچ نے بھی ڈاکٹر بوکائے کی ان تحقیقات کی تائید کی اور انسانی علوم میں اسے قابل قدر اضافہ قرار دیا۔ ڈاکٹر موصوف کے علمی مرتبہ کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ کیمبرج اور آکسفورڈ سمیت انگلینڈ، امریکہ اور دنیا بھر کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں کے سیمیناروں اور توسیعی لیکچروں میں انہیں مدعو کیا جاتا ہے اور قرآن پر ان کے خالص علمی، تحقیقی اور غیر جانبدارانہ مقالات کو خاص توجہ سے سنا جاتا ہے اور یورپ کے کتنے ہی نامور سکالر ان کے ہم خیال ہو گئے ہیں کہ قرآن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصنیف نہیں بلکہ الہامی کتاب ہے۔ اس کے برعکس وہ مسیحی سکالر اور متعصب مذہبی حلقے جو اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف یک طرفہ پروپیگنڈے میں مصروف رہتے تھے ڈاکٹر بوکائے کی ان تحقیقات پر سخت برہم

بھی ہیں اور خوفزدہ بھی جو موصوف نے بائبل' قرآن اور سائنس اور انسانی آغاز کے بارے میں پیش کی ہیں۔ ان کی یہ مشکل بھی ہے کہ ڈاکٹر بوکائے نے اسلام قبول کرنے کا اعلان نہیں کیا اور وہ اپنے آپ کو راسخ العقیدہ مسیحی قرار دیتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے مکہ مکرمہ کے اخبار "العالم الاسلامی" کے ایک نمائندہ خصوصی نے پیرس میں ڈاکٹر مورلیس بوکائے سے تفصیلی انٹرویو کیا تھا جو انگریزی میں منتقل ہو کر "یقین انٹرنیشنل کراچی" میں شائع ہوا تھا۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر ذیل میں اس کا ترجمہ دیا جا رہا ہے۔

سوال: آپ نے قرآن کا غیر معمولی تحقیقی مطالعہ کیا ہے' اس کا خیال آپ کو کیسے سوجھا؟

جواب: عام اہل فرانس کی طرح ابتدا میں میری رائے بھی یہی تھی کہ قرآن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصنیف ہے اور بلاشبہ وہ زبردست صلاحیتوں کے حامل نابغہ انسان تھے لیکن تعلیم سے فارغ ہو کر جب میں نے سرجن کی حیثیت نے باقاعدہ پریکٹس شروع کی اور اپنے مسلمان مریضوں اور واقف کار اہل اسلام سے گفتگوئیں ہوئیں تو انہوں نے مجھے احساس دلایا کہ قرآن اور پیغمبر اسلام کے بارے میں میری معلومات سطحی اور ناقص ہیں۔ ثبوت میں انہوں نے ایسے شواہد پیش کئے کہ مجھے اپنے بعض خیالات پر نظر ثانی کرنی پڑی اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ فرانس کے اساتذہ' مذہبی رہنما' مصنفین' صحافی اور ریڈیو' ٹی وی کے تجزیہ نگار سب اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں جھوٹ' مغالطہ انگیزی اور فریب کاری سے کام لیتے ہیں۔ اس صورت حال پر میں بہت پریشان ہوا اور بالآخر ایک حل ذہن میں آیا کہ مجھے عربی زبان سیکھنی چاہئے اور اس کی مدد سے براہ راست قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے چنانچہ اس وقت جبکہ میری عمر پچاس سے تجاوز کر چکی تھی میں نے دو سال کا عرصہ عربی زبان و ادب پر عبور حاصل کرنے کے لئے وقف کر دیا اور پھر جب قرآن کو سمجھا اور اس کے مطالب پر غور و فکر کیا تو اس نتیجے پر پہنچنے میں مجھے کوئی دقت پیش نہ آئی کہ یہ کتاب واقعۃً خدا کا کلام ہے اور محمد اللہ کے سچے پیغمبر ہیں۔

سوال: آپ سائنس دان ہیں اور آپ نے انسان کے آغاز کے بارے میں خاصی تحقیق کی ہے۔ اتفاق سے آج کل دنیا بھر میں ڈارون کی پہلی صد سالہ تقریبات منائی جارہی ہیں' براہ کرم ہمیں بتائیے کہ آپ ڈارون کے نظریۂ ارتقا کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

جواب: میں ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کا سخت مخالف ہوں۔ یہ قطعی طور پر مفروضوں پر مبنی ہے اور اس کی کوئی سائنسی بنیاد نہیں ہے۔ یہ نظریہ کہ انسان نے حشرات الارض سے بتدریج ارتقا کی منزلیں طے کی ہیں کسی سائنسی تحقیق پر مبنی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈارون کے نظریات ایک مادہ پرست ذہن کے گمراہ کن اور عیارانہ تخمینوں کے سوا کچھ نہیں۔ چنانچہ میں نے اپنی تازہ کتاب ORIGIN OF MAN میں ڈارون کے نظریۂ ارتقا کو باقاعدہ سائنسی تحقیق اور حوالوں سے باطل اور غلط ثابت کیا ہے۔

سوال: آپ کا کیا خیال ہے کہ ڈارون خود بھی اپنی فکر کی کمزوری سے آگاہ تھا؟

جواب: جی ہاں میرے خیال میں وہ خود بھی جانتا تھا کہ اس کے نظریات کی کوئی بنیاد نہیں۔ مادہ پرستی کی دنیا میں اس قسم کی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ خدا کے منکر سائنس دان اور سکالر عموماً غلط اور بے بنیاد نظریات پیش کرتے ہیں۔ وہ خود بھی جانتے ہیں کہ وہ خلق خدا کو دھوکا دے رہے ہیں مگر کمال ڈھٹائی سے اپنے کمزور لایعنی دلائل پر ڈٹے رہتے ہیں۔ میں نے اپنی متذکرہ کتاب میں اس نوعیت کے کتنے ہی نظریات کی دھجیاں بکھیری ہیں اور ستم ظریفی یہ ہے کہ ان کے پیش کرنے والے بعض ''سائنس دان'' اور ''سکالر'' نوبل انعام یافتہ ہیں۔

سوال: ہم آپ سے معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کیا فرانس سے باہر بھی کسی ملک میں آپ کے خیالات کو پذیرائی حاصل ہوئی ہے؟

جواب: جی ہاں تھوڑا ہی عرصہ پہلے شمالی اور مغربی افریقہ کے کئی ملکوں کا دورہ کر کے لوٹا ہوں۔ مجھے میری کتاب Bible,Quran and Science کے حوالے سے لاتعداد پُرہجوم اجتماعات میں خطاب کی بار بار دعوت دی گئی۔ یہ اجتماعات اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں اور سکالروں پر مشتمل تھے اور ان میں باخبر جہاندیدہ اساتذہ اور علماء نے میرے خیالات پر کھلے عام تنقید کی جس کے جواب میں بالآخر وہ میرے ہم خیال ہو گئے اور ان

کثت طلبا اور علما نے با قاعدہ ملاقات کر کے مجھے مبارک باد دی اور اعتراف کیا کہ میری گفتگو سن کر وہ پہلی بار قرآن کے تصورِ تخلیقِ کائنات اور نظریۂ خلقِ انسان کے قائل ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض مسلمانوں نے بے تکلفی سے اقرار کیا کہ میرے لیکچر سن کر اور میری کتابیں پڑھ کر ان کا ایمان از سرِ نو تازہ ہوا ہے اور اب وہ پکے باعمل مسلمان بن گئے ہیں اور عبادات میں واقعتاً انہیں سرور ملتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اس سے قبل وہ یورپ کے مادہ پرست فلسفیوں اور سائنس دانوں کے گمراہ کن نظریات کو صحیح سمجھتے تھے جس کے نتیجے میں وہ تشکیک اور بے یقینی میں مبتلا ہو کر رہ گئے تھے۔

سوال: انسان کے بارے میں سائنس کا دعویٰ کیا ہے؟ اور اس سلسلے میں آخر سائنس اور مذہب میں تصادم کیوں ہے؟

جواب: میں نے اپنی کتاب ORIGIN OF MAN میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ سائنسی تحقیق کے اعتبار سے کتنی بات معتبر ہے اور کتنی غیر معتبر۔ اس سلسلے میں میں نے ایسے نظریات پر بھی بحث کی ہے جو شروع میں مسلمات کی حیثیت رکھتے تھے مگر بعد کی سائنسی تحقیقات نے انہیں قطعی بے بنیاد ثابت کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۸۵۱ء میں ڈارون کی پہلی کتاب ORIGIN OF SPECIES شائع ہوئی جس میں اس نے ایک طرف تو یہ لکھا تھا کہ سارے حیوانات اپنی انواع کے اندر نسل بڑھاتے ہیں...... مگر پھر یہ دعویٰ داغ دیا کہ ''انسان کا سلسلۂ نسب بندر سے جا ملتا ہے'' جبکہ ثبوت میں اس نے کوئی سائنسی تجزیہ پیش نہیں کیا۔

سوال: آپ کے خیال میں پھر اس بے بنیاد اور لایعنی نظریے کی غیر معمولی اشاعت وفروغ کا سبب کیا ہے؟

جواب: حقیقت یہ ہے کہ بعض دوسرے لوگوں نے ڈارون کے نظریۂ ارتقا کی شکل تک بدل دی اور جس بات کو اس نے مبہم انداز میں کہا تھا اسے حتمی دعوے کی صورت میں پیش کر دیا کہ ''انسان بندر کی نسل سے ہے''۔ افسوس کہ ڈارون نے اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے معتقدین کے اس دعوے کی تردید نہ کی اور اس طرح ڈارون کے حامیوں اور چرچ میں تصادم کی کیفیت شروع ہو گئی۔ بہرحال اب وقت آ گیا ہے کہ

انسان کی ابتدا کے حوالے سے ڈارون پرستوں کے یکطرفہ' جارحانہ اور بے دلیل موقف اور سائنسی تحقیقات کے درمیان حدِ فاصل قائم کی جائے۔

سوال: عموماً یوں ہوتا ہے کہ اس نوعیت کے سائنسی مباحثوں' مذاکروں اور تجربوں میں مذہبی کتابیں بھی زیرِ بحث آتی ہیں اور اس طرح ان کی کمزوریاں اور خامیاں منکشف ہوتی ہیں' مَیں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس حوالے سے کیا خدانخواستہ قرآن کی کسی غلطی اور خامی کا انکشاف بھی ہوا ہے؟

جواب: جہاں تک غیر مسلموں کی مذہبی کتابوں کا تعلق ہے یہ مختلف شخصیات کی وساطت سے نقل ہوتی ہوئی ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتی رہی ہیں۔ JEHOVAH اس سلسلے کی قدیم ترین کتاب ہے جو نو سو قبلِ مسیح میں کسی وقت لکھی گئی اور اگر چہ زیادہ ضخیم نہیں ہے مگر اپنی نوعیت کی جامع ترین کتاب ہے۔ دوسری کتاب SACRODOTAL اگر چہ بائبل کا دیباچہ سمجھی جاتی ہے مگر ۶۰۰ قبلِ مسیح میں منصۂ شہود پر آئی۔ اس میں تخلیقِ کائنات اور زمین پر ظہورِ انسان پر بھرپور بحث کی گئی ہے اور کہانیوں کی صورت میں دونوں واقعات کی تفصیلات ملتی ہیں۔ بائبل اس کے بعد منظرِ عام پر آئی لیکن عہد نامۂ جدید NEW TESTAMENT کی کسی کتاب میں ظہورِ انسان کے بارے میں کوئی خاص روشنی نہیں پڑتی اور عہد نامۂ عتیق (OLD TESTAMENT) ہی کی باتوں کو جیسا کہ وہ سینٹ لوقا کے حوالے سے بیان ہوئی ہیں من وعن دہرا دیا گیا ہے۔ قرآن حضرت مسیح کے چھ سو سال بعد نازل ہوا اور اس میں انسان اور اس کی تخلیق کے بارے میں نہایت قابلِ قدر معلومات دی گئی ہیں۔ ایسی معلومات عہد نامہ عتیق میں تھیں نہ عہد نامہ جدید میں اور نہ کسی دوسری مذہبی کتاب میں۔ اس سلسلے میں اہم ترین بات یہ ہے کہ بائبل' توریت اور زبور کے برعکس قرآن اس حوالے سے ہر نوع کی غلطی' کمزوری اور تضاد سے مکمل پاک ہے۔

سوال: آپ کے خیال میں دیگر مذہبی کتابوں میں آخر اس قدر غلطیوں اور تضادات کی وجہ کیا ہے؟

جواب: میرے نزدیک عیسائیوں کی مذہبی کتب میں جملہ خامیوں اور تضاد بیانیوں

کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کتابوں کے مرتب کرنے والے اپنے غرور نفس اور ہلکے پن کی وجہ سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ انہیں خدا کی طرف سے القا ہو رہا ہے حالانکہ انسان اور اس کی تخلیق کے حوالے سے ان لوگوں نے جو کچھ اپنی مذہبی کتابوں میں لکھ مارا وہ دراصل اپنے عہد کی روایات' من گھڑت قصوں اور لوک کہانیوں ہی کی بازگشت تھا۔ یہ حقیقت بائبل کے تمام شارحین اور مفسرین نے تسلیم کی ہے خواہ ان کا تعلق کیتھولک فرقے سے ہو یا پروٹسٹنٹ سے۔

سوال: کیا چرچ نے بھی اس امر کا اعتراف و اقرار کیا ہے؟

جواب: جی ہاں چرچ نے اس حقیقت ثابتہ کا اقرار دوسری ویٹی کن کانفرنس کے دوران کیا اور اس کی کارروائی کے ریکارڈ میں باقاعدہ موجود ہے۔ یہ کانفرنس عہد نامہ قدیم اور جدید کو الہامی حیثیت دینے کے لئے منعقد ہوئی تھی اور اس کے شرکا نے تسلیم کیا کہ ان کتابوں کے بعض حصوں میں تضادات بھی ہیں اور نقائص بھی۔

سوال: اس حوالے سے قرآن کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: قرآن کا معاملہ تو بالکل ہی مختلف نوعیت کا ہے۔ تمام باخبر علما کا متفقہ فیصلہ ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے جو جبرائیل کے ذریعے محمد رسول اللہ پر نازل ہوا جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں نے قرآن کو خصوصی غور و توجہ سے پڑھا ہے اور سائنسی نقطہ نظر سے کسی خامی یا تضاد کی ایک مثال بھی میری نظر سے نہیں گزری۔ لیکن جہاں تک اعلیٰ تر صداقتوں اور حقیقتوں کا تعلق ہے جو قرآن کے الفاظ میں مستور ہیں وہ چودہ سو سال کی تاریخ میں عام انسان کے شعور و فہم سے بالا رہی ہیں اور یہ بذات خود اس امر کا ثبوت ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے اور اس میں یقیناً ایسے مقامات بھی ہیں جو عام انسان تو کجا بہترین عقل و شعور اور اعلیٰ ترین ذہانت کے حامل افراد کی گرفت سے بھی باہر ہیں اور وہ کوشش کے باوجود قرآن میں بیان شدہ قدرت خداوندی (NATURE) کے حقائق جدید سائنس کے نظریات سے مکمل طور پر ہم آہنگ کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔

اس کے برعکس انجیل کے متعدد دعوے جدید سائنسی نظریات سے ٹکراتے ہیں مثال کے طور پر انجیل کا واضح دعویٰ ہے کہ زندگی مختلف انواع کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی اور

ان کے افعال میں ارتقا یا ترقی کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی جبکہ قرآن کا یہ کہنا سائنسی حقائق سے مطابقت رکھتا ہے کہ انسان نے صدیوں کی تاریخ میں ارتقا کے زبردست مراحل طے کیے ہیں۔ میں عہد حاضر کے عیسائیوں کو بائبل کی ان فروگذاشتوں کی طرف متوجہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں ایک غیر جانبدار' حق پسند انسان ہوں اور ایک سائنس دان کی حیثیت سے مختلف بیانات اور معاملات کو خالص سائنسی حوالے سے دیکھتا ہوں اور مذہب اور چرچ کے دعاوی کی پروا نہیں کرتا۔ اس لئے میں یہ باتیں مختلف اوقات میں منتخب نوعیت کی مجالس میں کہتا رہتا ہوں اور اصحاب فکر و نظر میری تائید کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔

سوال: میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ نے اسلام قبول کر لیا ہے؟

جواب: میں یہ وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ عربی زبان سیکھنے کے بعد جب میں نے قرآن کو سمجھ کر پڑھنا شروع کیا تو مجھے فوراً ہی شرح صدر حاصل ہو گیا کہ اللہ وحدہ' لاشریک ہر چیز پر قادر ہے اور جوں جوں میں قرآن کے مطالب کے قریب ہوتا گیا میری روح پکار پکار کر گواہی دیتی رہی کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو اس کے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر براہ راست نازل کیا گیا ہے۔ چنانچہ میں نے اپنی کتاب "بائبل' قرآن اور سائنس" میں اسی نوعیت کے حقائق کو بیان کیا ہے اور پوری مسیحی دنیا میں میری کتاب نے متذکرہ نقطہ نظر سے خاص کامیابی حاصل کی ہے۔ میں نے اس کتاب میں خالص سائنسی اور تحقیقی انداز اختیار کیا ہے اور ذاتی پسند و ناپسند سے بالاتر ہو کر کسی عقیدے یا مسلک کی بات نہیں کی اور مکمل غیر جانبداری سے اپنی تحقیقات کے نتائج کو پیش کیا ہے۔ جہاں تک میرے مذہب کا اور عقیدے کا تعلق ہے' خدا اس سے خوب واقف ہے اور مجھے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اگر میں کسی خاص مسلک سے وابستگی کا اعلان کرتا ہوں تو اس وقت جو کام کر رہا ہوں وہ سب اکارت جائے گا اور لوگ مجھے ایک جانبدار آدمی قرار دے کر میری تحقیقات پر توجہ دینا چھوڑ دیں گے۔ میں فرانس اور یورپ کی ذہنیت اور نفسیات کو خوب جانتا ہوں اور ان کے اس یقین کو متزلزل نہیں کرنا چاہتا کہ میری تحریریں کسی خاص مذہب یا مسلک کی ترجمان نہیں بلکہ خالص سائنسی اور

تحقیقی حقائق پر مبنی ہیں۔

سوال: آپ کے خیال میں یورپ کے تعلیم یافتہ لوگوں میں حق و صداقت کی اشاعت کیسے کی جاسکتی ہے؟

جواب: تبلیغ کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ لوگوں سے ان کی اپنی زبان میں رابطہ قائم کیا جائے اور ان کی نفسیات، مزاج اور روایات کو لحوظ خاطر رکھتے ہوئے بات اس انداز میں کی جائے جو انہیں متاثر اور مطمئن کر سکے۔ مثال کے طور پر میں نے اپنی کتاب ''بائبل، قرآن اور سائنس'' میں قرآنی حقائق کو متعارف کرانے کا ایک نیا اسلوب اختیار کیا ہے جس کے نتیجے میں اعلیٰ ترین مسیحی حلقوں نے اسے نہ صرف پسند کیا ہے بلکہ قرآن کے بنیادی اور حتمی حقائق کو سمجھنے پر بھی آمادہ ہو گئے ہیں۔ میرے اس غیر جانبدارانہ اور غیر متعصبانہ نقطہ نظر ہی کے نتیجے میں میری دونوں کتابوں کو یورپ بھر میں وسیع پذیرائی حاصل ہوئی اور بے شمار عالم فاضل حضرات اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں نے خطوط کے ذریعے میرے حاصلِ مطالعہ کو قدر و تحسین سے نوازا۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ قرآن کسی انسان کی تصنیف نہیں اور یہ کہ بائبل میں واقعی وہ تضادات اور خامیاں موجود ہیں جن کی میں نے نشاندہی کی تھی۔ چند ہی روز قبل ایک محفل میں بعض ذمہ دار مسیحی سکالروں نے میری ان معلومات پر تحیر اور مرعوبیت کا اظہار کیا جو میں نے بائبل اور قرآن کے حوالے سے پیش کی ہیں۔

سوال: قرآن کی تفسیر و تشریح کے سلسلے میں آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟

جواب: یہ بات بڑی افسوسناک ہے کہ فرانسیسی زبان میں قرآن کی ایک بھی ایسی تفسیر نہیں ہے جو اس ملک کے شعور مند لوگوں کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ یہ امر انتہائی ضروری ہے کہ زمانے کے جدید ترین تقاضوں کے مطابق قرآن کی تفہیم و تفسیر کا ایسا انداز اختیار کیا جائے جو موثر اور سود مند ہو۔ میرے خیال میں جو شخص بھی قرآن کی تشریح کا فریضہ انجام دینا چاہے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ سب سے پہلے عربی زبان پر عبور حاصل کرے اور قرآن سے متعلقہ دیگر علوم پر بھی دسترس حاصل کرے تب وہ اس کتاب کے مفاہیم کو اپنی گرفت میں لے سکے گا۔ عام طور پر یورپ کے علما قرآن کے ایسے موضوعات

کا تجزیہ شروع کر دیتے ہیں جن سے وہ بالکل ہی بے خبر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن میں تقریباً ایک سو آیات ایسی ہی جن کا تعلق طبعیات (PHYSICS) سے ہے۔ اب ایک شخص جو فزکس سے نابلد ہے وہ ایسی آیتوں کی تفسیر کیسے کر سکتا ہے؟ پھر یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ ایک اچھا انشا پرداز اور صاحب طرز ادیب ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ ایک شخص قرآن کی تفسیر لکھنے پر قادر ہو جائے گا۔ بلاشبہ قرآن کی تفسیر کا کام بے حد نازک ہے اِس میں فکر کی کوئی خامی اور تعبیر کی کوئی غلطی قارئین پر غلط تاثر چھوڑے گی اور وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں گے کہ قرآن کی معلومات دورِ حاضر کے حقائق سے مطابقت نہیں رکھتیں اور یہ کہ قرآن خدا کا کلام نہیں ہے۔ بدقسمتی سے دیگر مذاہب کی الہامی کتابوں کے ساتھ یہی المیہ گزرا تھا اس لئے مفسرین کو اس معاملے میں خاص احتیاط برتنی چاہیے اور انہیں قرآن کی تعلیمات اور مقاصد کو عملی طور پر بھی بروئے کار لانا چاہیے۔

سوال: آج کل آپ کس منصوبے پر کام کر رہے ہیں؟

جواب: میں آج کل ایک فلم بنانے کی تیاری کر رہا ہوں اس کا عنوان ہے ''سائنس، قرآن اور انسان کی ابتدا'' (SCIENCE ,QURAN AND ORIGIN OF MAN) اس سلسلے میں میرے ساتھ ملائیشیا کی حکومت خاص تعاون کر رہی ہے اور وہاں کا محکمہ ''دعوتِ اسلامیہ'' اس کے لئے خاصا سرگرم ہے۔ متعلقہ فلم ساز کمپنی کے ڈائریکٹر نے اس مقصد کی خاطر پیرس کا دورہ بھی کیا ہے۔ یہ فلم ٹیکنی کلر اور ۵۵ منٹ پر محیط ہوگی۔ ۴۵ منٹ میں میں قرآن اور سائنس کے حوالے سے انسان کی ابتدا (ORIGIN) بیان کروں گا۔ باقی دس منٹ میں قرآن کا تعارف اور اس کی ضروری خصوصیات بیان ہوں گی۔ اس طرح یہ فلم غیر معمولی اہمیت کی حامل ہوگی۔ اس کے لئے چھ لاکھ ڈالر کی رقم فراہم ہو چکی ہے اور فلم کی تیاری کا کام شروع ہو چکا ہے۔ آغاز میں یہ دنیا کی پانچ زبانوں میں تیار ہوگی لیکن بعد میں اسے مزید پانچ زبانوں میں منتقل کیا جائے گا۔ پہلی فلم انگریزی میں ہوگی پھر عربی میں، پھر فرانسیسی اور پھر دیگر زبانوں میں...... اسے دنیا بھر میں پھیلایا جائے گا۔

●......●......●

یوسف اسلام

(انگلستان)

(یہ مضمون ماہنامہ ''الحق'' اکوڑہ خٹک کے نومبر ۱۹۸۲ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اسے بشیر محمود اختر صاحب نے مرتب کیا ہے)

مجھے ایک تربیتی کورس کے سلسلے میں اپریل تا جولائی لندن میں قیام کا موقع ملا۔ ایک روز اسلامی کتابوں کی ایک دکان پر جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک چھوٹی سی کتاب ISLAM MY RELIGION (اسلام میرا دین) پر نظر پڑی۔ مصنف کا نام کیٹ سٹیونز (CAT STEVENS) لکھا تھا اور اندر کے صفحے پر وضاحت کی گئی تھی کہ یہ صاحب برطانیہ کے مشہور موسیقار اور پاپ سنگر رہے ہیں' اب مشرف بہ اسلام ہو چکے ہیں اور یوسف اسلام کے نام سے موسوم ہیں۔ میں نے یہ کتاب خرید لی اور اسے شوق سے پڑھا۔ یہ دراصل یوسف اسلام کا ایک انٹرویو تھا جو مارچ ۱۹۸۰ء میں لیا گیا تھا۔ آپ بھی ملاحظہ کیجیے:

سوال: میں پہلا سوال یہ کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کو اسلام کے بارے میں معلومات کس ذریعے سے حاصل ہوئیں؟

جواب: اسلام کے بارے میں مجھے سب سے پہلے اپنے بھائی ڈیوڈ کے ذریعے معلومات حاصل ہوئیں۔ پانچ سال پہلے انہوں نے یروشلم کا سفر اختیار کیا تھا۔ وہاں انہوں نے جن مقدس مقامات کی زیارت کی ان میں ایک مسجد اقصیٰ بھی تھی۔ اس سے قبل وہ کبھی کسی مسجد کے اندر داخل نہیں ہوئے تھے۔ یہاں کی فضا مسیحی گرجوں اور یہودیوں کے معبدوں سے اس قدر مختلف تھی کہ انہوں نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ یہ دین (اسلام)

عیسائیت کی طرح پُر اسرار کیوں نہیں ہے؟ وہ مسلمانوں کے رویّے اور سکون بخش انداز عبادت سے بہت متاثر ہوئے۔ انگلستان واپس پہنچتے ہی انہوں نے قرآنِ حکیم کا ایک نسخہ خریدا اور لا کر مجھے دیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مَیں رہنمائی کا محتاج تھا۔ الحمدللہ۔

سوال: جب آپ نے قرآن کا مطالعہ کیا تو آپ کو کس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا؟

جواب: یہ اس پیغام کی دائمی نوعیت تھی۔ مَیں حیران تھا کہ الفاظ سب کے سب آشنا قسم کے تھے لیکن ہر اس چیز سے بے حد مختلف تھے جس کا مَیں پہلے مطالعہ کر چکا تھا۔ اس مرحلے تک زندگی کا مقصد میرے لیے ایک سربستہ راز کی حیثیت رکھتا تھا۔ ہمیشہ مجھے اس بات پر یقین رہا کہ زندگی کی اس تصویر کشی کے پس پردہ ایک زبردست تخلیق کار کا ہاتھ ہے۔ لیکن وہ ان دیکھا تخلیق کار کون ہے؟ اس کا پتہ نہ چلتا تھا۔ مَیں اس سے پیشتر بہت سے روحانی راستوں کی جادہ پیمائی کر چکا تھا لیکن تسکین کی پیاس کہیں نہیں بجھی۔ مَیں ایک ایسی ناؤ کی مانند تھا جو چپوار اور کھیون ہار کے بغیر چلی جا رہی تھی اور جس کی کوئی منزلِ مقصود نہ تھی' لیکن جب مَیں نے قرآن کا مطالعہ شروع کیا تو مجھے احساس ہوا کہ مَیں اس کے لئے اور یہ میرے لئے تخلیق کیا گیا ہے۔ مَیں ڈیڑھ سال سے زیادہ عرصہ تک اس کا بار بار مطالعہ کرتا رہا۔ اس دوران میری ملاقات کسی بھی مسلمان سے نہ ہوئی۔

مَیں قرآن کے پیغام میں پوری طرح مستغرق ہو چکا تھا۔ مَیں جانتا تھا کہ اب جلد ہی یا تو مجھے پوری طرح ایمان لانا ہوگا یا پھر اپنی ہی راہ پر چلتے چلتے موسیقی کی دنیا میں کھوئے رہنا ہوگا۔ یہ میری زندگی کا سب سے مشکل اقدام تھا۔ ایک روز مجھے کسی نے بتایا کہ لندن میں ایک نئی مسجد تعمیر ہوئی ہے۔ پس اب میرے لئے اپنا دین قبول کرنے کا وقت آ پہنچا تھا۔ ۱۹۷۷ء کے موسم سرما کی بات ہے کہ ایک جمعہ کے روز مَیں مسجد کی طرف چل پڑا۔ نمازِ جمعہ کے بعد مَیں امام صاحب کے پاس پہنچا اور انہیں بتایا کہ مَیں قبولِ اسلام کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ مسلم برادری سے یہ میرا پہلا رابطہ تھا۔

سوال...... اب آپ مسلمان ہیں۔ مسلمانوں کے بارے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

جواب...... میرا خیال ہے کہ بہت سارے مسلمان اپنا راستہ کھو بیٹھے ہیں کیونکہ انہوں نے صحیح طور پر قرآن کا مطالعہ نہیں کیا۔ یہ تو علم کا جوہر ہے اور جو لوگ اسے سمجھنا

چاہتے ہیں ان کے لئے بھی ہدایت کا حامل ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اسلام اصل میں صرف ایک ہی ہے یعنی اللہ کی اطاعت اور اس کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی فرماں برداری۔ میرے نزدیک جنت کا یہی واحد محفوظ راستہ ہے۔ ہمیں سچ اور جھوٹ میں امتیاز کرنا چاہئے۔ اس کے لئے ہمیں اپنے علم میں اضافہ کرنا چاہیے اور راہِ حق پر چلنے والوں کی صحبت اختیار کرنی چاہئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے علم کے خزانے کی بے شمار کنجیاں دنیا میں بکھیر کر اسے محفوظ فرما دیا ہے۔ ہم مسلمانوں کو صرف آپس میں قریب آنے کی ضرورت ہے تاکہ صحیح معنوں میں اسلام کی حقانیت کی زیادہ جامع تفسیر ہو سکے۔ تمام مسلمان ایک خدا' ایک قرآن اور ایک رسول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس کے بعد ہر فرد اپنی پسند کے مطابق اپنی راہ متعین کرتا ہے۔ آخرت میں ہر کوئی اپنے ہی اعمال کا ذمہ دار ٹھہرے گا۔

سوال..... آپ کے لئے یہ کس قدر دشوار ثابت ہوا ہوگا کہ اچانک وہ بہت ساری باتیں ترک کر دیں' جن کے آپ عادی ہو چکے تھے؟

جواب: یہ دشوار نہیں تھا کیونکہ میں بخوبی جانتا تھا کہ ان برائیوں کو ترک کر دینا ہی بہتر ہے۔ یہ برائیاں دراصل مجھے تباہ کر رہی تھیں۔ مثلاً شراب نوشی' سگریٹ نوشی اور سود خوری وغیرہ۔ لیکن اپنے پرانے دوستوں سے قطع تعلق کرنا میرے لئے سب سے زیادہ دشوار ثابت ہوا۔ میں یہ بات نہیں سمجھ سکا کہ وہ لوگ پیغامِ اسلام کا فہم کیوں نہیں پیدا کر سکے۔ جہاں تک مجھ سے ممکن ہو سکا' میں ان سے دوستی نبھاتا چلا گیا لیکن ایک ایسا وقت بھی آیا جب اپنے دین کی خاطر میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اپنے ماضی اور اسلام کے درمیان مجھے ایک خط کھینچنا ہوگا۔ اس کے لئے مجھے کئی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ مثال کے طور پر شروع میں جب میں غیر مسلموں کے درمیان ہوتا تو ان سے معذرت طلب کر کے چپکے سے نماز کے لیے نکل جاتا۔ میں یہ نہ بتاتا کہ میں کہاں جا رہا ہوں کیونکہ یہ ان کے لیے قدرے عجیب سی بات ہوتی۔ پھر ایک روز میں نے تہیہ کر لیا کہ اب میں سب کو بتا دوں گا کہ میں نماز کی ادائیگی کے لئے جا رہا ہوں۔ چنانچہ سب نے میرا نقطۂ نظر سمجھ لیا اور اس کے

لئے وہ میری عزت کرنے لگے۔ جب آپ اپنی بات پر ڈٹ جائیں اور اپنا فرض ادا کرتے چلے جائیں تو اللہ اس میں آسانی فرما دیتا ہے۔ اس کے بعد کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی۔

سوال...... آپ اپنے ماضی کی سرگرمیوں کے بارے میں کچھ بتائیں گے؟

جواب...... میں پندرہ برس کا تھا جب مجھے موسیقی سے بہت دلچسپی پیدا ہوگئی۔ میرے والد میرے لئے ایک گٹار لے آئے اور میں نے اپنے گیت لکھنے کا آغاز کر دیا۔ میں نے کیٹ سٹیونز کا نام منتخب کیا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں میرا پہلا ریکارڈ بہت مشہور ہوا۔ میں بہت کامیاب ہوا اور میرے گانوں کے ریکارڈ یورپ بھر میں فروخت ہونے لگے۔ لیکن یہ شو بزنس مجھے راس نہ آیا۔ ہر طرح کے عیش و آرام کے باوجود میرا سکون بھی چھن گیا' پریشانی اور بے خوابی میرا مقدر بن گئی۔ چنانچہ میں نے کثرت سے مے کشی اور سگریٹ نوشی شروع کر دی لہذا میں دق کا مریض بن گیا۔ اس سے میرا ذریعہ معاش ختم ہوگیا اور مجھے چند ماہ ہسپتال میں رہنا پڑا۔ اس دوران میں نے مشرقی فلسفے کا مطالعہ شروع کیا۔ میرے پاس ایک کتاب تھی۔ جس کا نام THE SECRET PATH (خفیہ راستہ) تھا۔ یہی کتاب روحانی معاملات سے میرا پہلا تعارف ثابت ہوئی۔ اسی کے ذریعے میں طمانیت و بصیرت کی تلاش کے لمبے سفر پر روانہ ہوا۔ اس سفر نے بالآخر مجھے اسلام کے دروازے پر پہنچا دیا۔ میں نے ایسے گیت لکھنے شروع کئے جن میں اس روحانی بیداری کا اظہار ہوتا تھا۔ چنانچہ میرے یہ گیت میری سرگزشت بنتے چلے گئے۔

میں اکیس برس کا تھا جب مجھے عالمی سطح کی پہلی بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ میرے ان گیتوں کا سلسلہ TEA FOR TILLER MAN کے نام سے مشہور ہوا اور اس طرح میرا شمار اعلیٰ درجے کے فنکاروں میں ہونے لگا۔ میں سوچتا ہوں کہ ایک لحاظ سے میرے گانوں کے سلسلے میری اگلی منزل اور میرے سفر کے مختلف مراحل ثابت ہوئے۔

سوال...... اس زمانے میں لوگ ساز و سنگیت کے متوالے ہو رہے ہیں حتیٰ کہ مسلمان بھی اس میں کھوئے جا رہے ہیں' اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب...... بدقسمتی سے آج کل لوگ اپنی ادنیٰ خواہشات کے مطابق چیزوں کی

خریداری کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ ریکارڈ، فلمیں، ٹیپ، رسالے۔ ان میں سے اکثر پیسہ کمانے کی غرض سے ہی بنائے جاتے ہیں۔ پاپ موسیقی سننا تو خواب دیکھنے کی طرح ہے۔ اس سے عارضی طور پر چین ملتا ہے۔ اس قسم کی موسیقی سننے والے عموماً حقیقت سے فرار کے آرزو مند ہوتے ہیں۔ موسیقی انہیں کچھ وقت کے لئے سکون پہنچاتی ہے۔ یعنی یہ اس بے رحم نظام سے تھوڑی دیر کے لئے فرار ہے، جسے ہم ماڈرن زندگی کہتے ہیں۔

سوال..... تو کیا آپ نے موسیقی سے قطع تعلق کر لیا ہے؟

جواب..... میں نے موسیقی کے مشاغل ترک کر دیئے ہیں۔ مجھے خطرہ تھا کہ یہ مشاغل مجھے صراط مستقیم سے بھٹکا نہ دیں۔ میرا یہ کہنا شاید بڑا بول نہ سمجھا جائے گا کہ میں اب کبھی موسیقی کا شغل اختیار نہیں کروں گا۔ لیکن اس کے ساتھ انشاء اللہ کہے بغیر بات مکمل نہیں ہو سکتی۔

سوال..... تو اب آپ کیا پیشہ اختیار کریں گے؟

جواب..... میں دراصل صرف اللہ کا کام کر رہا ہوں۔ وہی میری دست گیری کر رہا ہے اور اس نے ایسا انتظام فرما دیا ہے کہ میں اپنا کام جاری رکھ سکوں۔ میری خواہش ہے کہ میں برطانیہ میں تبلیغ اسلام کی خدمت بجا لا سکوں۔ اس کے لئے مجھے خواہ کچھ ہی کرنا پڑے اور کسی بھی حیثیت سے خدمت انجام دینی پڑے۔ اسلامی برادری روز بروز مستحکم ہو رہی ہے۔ اس وقت میرا کام عربی زبان کی تحصیل ہے۔ میری بڑی آرزو ہے کہ میں قرآن کو سمجھ سکوں۔ بہت سارے مسلمان عربی پڑھ سکتے ہیں اور ان کے لیے یہ کوئی خاص بات نہیں۔ لیکن مجھے ابھی تفہیم قرآن کا مرحلہ طے کرنا ہے۔ قرآنِ حکیم کی ہر آیت مکمل ہدایت ہے اور بذاتِ خود ایک باب کا درجہ رکھتی ہے۔ مجھے اکثر یہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوتا ہے کہ لوگ قرآن کا مناسب احترام نہیں کرتے، اسے معمولی بات سمجھتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور سب زمانوں کے لئے کارآمد ہے۔ یہ ہر سچے دیندار کے لئے ایک مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔

سوال..... برطانیہ کے غیر مسلموں میں تبلیغ دین کی سرگرمیوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب..... اس سلسلے میں ہمیں احتیاط برتنی چاہیے اور عیسائیوں کا طریق کار اختیار

نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ہم سب کی ایک بڑی ذمہ داری ہے۔ اسلام کا پیغام صرف زبان سے ہی نہیں پھیلانا چاہیے۔ پہلے تو آپ اس بات کو یقینی بنائیں کہ آپ کے اپنے اعمال درست ہیں' پھر سادہ اور واضح طریقے سے اتنی خوشخبری سنائیں کہ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ (کہیے کہ وہ اللہ ایک ہے) اس بات کی کوشش نہ کریں کہ اسلام کا پورا پیغام ایک ہی بار منتقل کر دیا جائے۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو یمن روانہ کیا تو ان سے فرمایا کہ ان لوگوں کی طرف جا رہے ہو جو اہل کتاب ہیں' لہٰذا انہیں سب سے پہلے توحید کی دعوت دینا۔ جب یہ بات ان کی سمجھ میں آ جائے تو انہیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے دن رات میں پانچ نمازیں پڑھنے کا حکم فرمایا ہے۔ اگر وہ نمازیں ادا کرنے لگیں تو انہیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنی جائیدادوں میں سے زکوٰۃ دینے کی تاکید فرمائی ہے۔ یہ زکوٰۃ ان میں سے مالدار لوگ ادا کریں گے اور محتاجوں میں تقسیم کی جائے گی اور اگر وہ اس پر رضا مند ہو جائیں تو ان سے زکوٰۃ وصول کر لینا۔ لیکن لوگوں کی بہترین جائیدادوں سے درگزر کرنا۔

ایک مسلمان کو اوّل تو خوش خلق' مہربان اور متواضع ہونا چاہئے کہ یہ اوصاف خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں موجود تھے۔ اگر ہم لوگوں کے سامنے بڑی منطقی بحثیں کرتے رہیں تو شاید وہ ہم سے متفق بھی ہو جائیں گے لیکن وہ ہم سے رخصت ہوتے ہی سب باتیں فراموش کر دیں گے کیونکہ انہوں نے ہمیں عملی طور پر کچھ کرتے نہیں دیکھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن مجسم تھے۔ یہی بنیادی بات ہے۔ قرآن کو صرف پڑھ لینا کافی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکام انسان کی تکمیل کے لئے صادر فرمائے گئے اور قرآن انہی احکام کا مجموعہ ہے۔ آپ اسے صرف زبانی تبلیغ و بیان کے لئے استعمال نہیں کر سکتے' بلکہ اس پر عملدرآمد بہت ضروری ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ باتیں کم کریں اور عمل زیادہ۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کے کرم سے ہی کسی شخص کو قبول اسلام کی توفیق ملتی ہے۔

سوال..... اس ملک میں ذرائع ابلاغ سے اسلام کے خلاف زبردست پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ اسلام کے بارے میں معلومات حاصل ہی نہیں کر سکتے یا صحیح صورت حال سے واقف نہیں ہوتے۔ ہم ان تک اپنی بات کیسے پہنچا سکتے ہیں یا انہیں کم

از کم اتنا بتانے کی کوشش کیسے کر سکتے ہیں کہ صحیح اسلام ہے کیا؟

جواب..... میں یہ بات آپ پر واضح کرنا چاہوں گا کہ لوگ اپنی مرضی کے آپ مالک ہوتے ہیں اور اپنی راہ کا آپ تعین کرتے ہیں۔ وہ سب اس قدر احمق نہیں کہ جو کچھ اخبار میں پڑھیں یا خبروں میں سنیں تو اس پر یقین کر بیٹھیں۔ تاہم جب وہ خود مسلمانوں کے اعمال و افعال میں کچھ خرابیاں دیکھتے ہیں تو پھر اس بات کا احتمال بڑھ جاتا ہے کہ وہ جو کچھ پڑھتے ہیں اس پر اعتبار کر لیں۔ آپ جانتے ہیں کہ دعوت تو ذاتی طور پر دی جانی چاہئے۔ تبلیغ اسلام کا کام بہترین طور پر رفاقت کے ذریعے سرانجام پا سکتا ہے۔ آج کی خبر کل پرانی ہو جاتی ہے۔ لوگوں میں اس طرح اشتعال تو پیدا کیا جا سکتا ہے' لیکن اس کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ انہیں حقیقی معنوں میں متاثر کرنے والے درحقیقت وہ لوگ ہوتے ہیں جن سے وہ گھلتے ملتے ہیں۔ اس لئے اگر آپ ایک مسلمان ہیں اور آپ کے قرابت داروں میں سے کوئی شخص اسلامی ضابطوں کا پابند نہیں ہے تو بلاشبہ آپ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ کسی غیر شخص کے پاس جانے سے پہلے اپنے اس قرابت دار کی خبر لیں۔ سب سے پہلے اپنے کنبے کی حفاظت کو یقینی بنانا ضروری ہے۔ صرف مسلمان کہلوانے سے ہم سزا سے نہیں بچ سکتے۔ ہم میں سے بہت سارے تو ابھی اسلام کے اصل پیغام سے ناآشنا ہیں۔

یوسف اسلام کا یہ انٹرویو پڑھ کر میں بہت متاثر ہوا اور ان کے بارے میں مزید جاننے کا شوق پیدا ہوا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ صاحب لندن ہی میں رہتے ہیں اور انہوں نے تبلیغ دین کے لئے اپنا ایک حلقہ قائم کر رکھا ہے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد یہ مژدۂ جانفزا سننے میں آیا کہ یہ صاحب ۲۸ مئی ۱۹۸۲ء کو اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز کے اسمبلی ہال میں جمعہ کی نماز کے بعد خطاب فرمائیں گے۔

میں اپنے کورس کے سلسلے میں لندن یونیورسٹی کے انسٹیٹیوٹ آف ایجوکیشن میں آیا کرتا تھا۔ مذکورہ اسکول وہاں سے قریب ہی تھا اور جمعہ کی نماز اکثر وہیں ادا کرتا تھا۔ اسکول کے ایک کمرے میں جائے نمازیں اور چادریں بچھا دی جاتی تھیں اور یونیورسٹی کے مسلمان اساتذہ اور طلبہ نماز ادا کرتے تھے۔ باقاعدہ خطبۂ جمعہ ہوتا اور نمازیوں کی تعداد

تمیں پینتیس کے قریب ہوا کرتی تھی۔ جمعے کی نماز کا وقت ہمارے انسٹیٹیوٹ میں دوپہر کے کھانے کے وقفے میں پڑتا تھا اور کلاس دوبارہ شروع ہونے تک جمعے سے فارغ ہو کر واپس پہنچ جاتا۔

اس اطلاع سے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ چنانچہ میں اور میرے ایک ساتھی پروگرام کے مطابق وہاں پہنچ گئے۔ اس روز اسمبلی ہال کے ایک حصے میں اسلامی کتابوں کی نمائش بھی ہو رہی تھی۔ ایک نظر ان کتابوں پر بھی ڈالی لیکن نگاہیں یوسف اسلام کی جستجو میں تھیں۔

نماز سے پہلے ایک صاحب نے خالص عربی لہجے میں اذان دی جو بڑی مسحور کن تھی۔ یہ صاحب لمبا سفید کرتہ پہنے ہوئے تھے۔ سر پر چھوٹی سی پگڑی' خوبصورت ڈاڑھی' متناسب مونچھیں' سرخ و سفید رنگت' نوجوانی کا عالم' چہرے پر اطمینان اور آنکھوں میں کشش...... بعد میں انکشاف ہوا کہ یہی یوسف اسلام ہیں۔

نماز سے فارغ ہوتے ہی جائے نماز' چادریں وغیرہ سمیٹ دی گئیں۔ ہال کی کرسیاں اور بنچیں ترتیب سے لگا دی گئیں۔ تقریب کا آغاز ہوا۔ یوسف اسلام کی تقریر شروع ہوئی۔ میں بڑے اشتیاق اور انہماک سے تقریر سن رہا تھا۔ نظریں مقرر کے چہرے پر جمی تھیں۔ رات کو وہ ساری تقریر یاد کر کے اردو میں قلم بندکی' آپ مطالعہ فرمایئے:

میں بچپن ہی سے ایک فنکار بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک گلوکار بننے کے لئے میں نے بڑی مشقت کی۔ پھر مجھے ایک رقاص بننے کی سوجھی۔ ان مشاغل کے ساتھ ساتھ میری روحانی جستجو کا سفر شروع ہو چکا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ اپنی عمر کے انیسویں برس' جبکہ میں اپنی شہرت کی بلندیوں پر تھا' مجھے شدید ذہنی کرب نے گھیر لیا۔ ساری مادی آسائشوں کے باوجود پریشانی تھی کہ دور نہ ہوتی تھی۔ ایک بار تو سکون کی تلاش میں میں نے بدھ مت کا پیرو کار بننے کی ٹھان لی لیکن اس کے مطالعے سے پتہ چلا کہ ایک بھکشو کی زندگی ایک عام شخص کی زندگی سے یکسر مختلف ہے۔ پھر وہ زندگی بھی کیا ہوئی کہ آپ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اور سب سے قطع تعلق کر کے جنگل بیابان کی راہ لیں اور زندگی کی کوئی سرگرمی باقی نہ رہے۔

پھر مجھے یوگا نے بڑا متاثر کیا۔ اس کی مختلف مشقیں مجھے پسند آئیں اور کبھی کبھی مجھے قدرے اطمینان کا احساس بھی ہوا۔ لیکن جلد ہی ظاہر ہو گیا کہ یوگا یا اس قسم کے اور سب

طریقے حقیقت سے بہت بعید ہیں۔ ان میں سے کسی کو آپ زندگی کا لائحہ عمل قرار نہیں دے سکتے۔ ان کے اصول قاعدے بظاہر کتنے ہی بھلے کیوں نہ لگتے ہوں، زندگی کی وسعتوں اور عملی ضرورتوں پر محیط نہیں ہیں۔ آپ اپنے سارے سوالوں کا جواب ان سے طلب نہیں کر سکتے۔ مختلف طریقوں اور مذہبوں میں بعض باتیں بہت عمدہ اور دلکش دکھائی دیتی ہیں، لیکن زندگی کی مکمل رہنمائی میسر نہیں آتی اور حقیقت کا انکشاف نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہ سوچ کر میرے گرد مایوسی اور اداسی کا ایک پردہ چھا گیا۔ میری عمر اب ۲۵ برس کے لگ بھگ ہو گئی۔

ان دنوں میں مَیں موسیقار کی حیثیت سے شہرت کی بلندیوں پر تھا۔ انہی دنوں میرے بڑے بھائی ڈیوڈ کو یروشلم جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ ایک ایسا سفر تھا جس کا ایک مقصد مقدس مقامات کی زیارت بھی تھا۔ شاید وہ وہاں جا کر دیکھنا چاہتے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہاں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے دن کہاں کہاں گزارے اور کس کس مقام پر تبلیغ دین کا فریضہ انجام دیا۔ شاید وہ اطمینانِ قلب کی خاطر وہاں گئے تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انہیں وہاں سے کچھ نہیں ملا۔

ایک روز وہ گھومتے پھرتے مسجدِ اقصیٰ میں جا نکلے۔ وہ اس کے جمال اور وقار سے قدرے متاثر ہوئے اور وہاں ایک خاص طرح کا روحانی سکون محسوس کیا۔ یہودی اور عیسائی عبادت گاہوں کے برعکس یہاں ان کو ایک مختلف تجربہ ہوا۔ ماحول کی کشادگی اور نمازیوں کی سجدہ ریزی کے پُرسکون منظر نے انہیں بڑا متاثر کیا۔ وہ اس سے پہلے کبھی کسی مسجد کے اندر نہیں گئے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ یہاں کوئی راز نہیں، ہر شے عیاں اور کھلی ہے۔ بہر حال انہوں نے انگلستان پہنچتے ہی قرآن شریف کا ایک ترجمہ خرید لیا۔ انہوں نے شاید اس کا تھوڑا بہت مطالعہ بھی کیا۔ اگرچہ ہم بھائیوں کے درمیان تحفوں کا تبادلہ شاید ہی ہوا تھا، لیکن انہوں نے یہ انگریزی ترجمہ بطور تحفہ مجھے عنایت فرمایا۔ شاید یہ سوچ کر کہ مجھ پریشان خاطر کو ہدایت کی زیادہ ضرورت تھی۔

الحمد للہ کہ مَیں نے قرآن شریف کا مطالعہ شروع کیا۔ جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا مایوسی اور اداسی کا پردہ چاک ہوتا چلا گیا۔ رفتہ رفتہ زندگی کا ایک واضح مفہوم میری سمجھ میں آنے لگا۔ زندگی کی روشنی مجھ پر طلوع ہونے لگی اور حقیقت کے انکشاف کا آغاز ہو گیا۔ مَیں آہستہ آہستہ گرد و پیش، اپنے ماحول اور اپنے دوستوں سے بیزار ہونے لگا اور ان سے

کنارہ کشی اختیار کرتا گیا۔ اس سلسلے میں مجھے بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔

قرآن شریف کے مطالعے سے مجھ پر یہ حقیقت کھل گئی کہ میں جو مکمل نظام حیات تلاش کر رہا تھا اور جس حقیقت کے حصول کے لئے بھٹکتا پھر رہا تھا' وہ اسلام کی راہ پر چلنے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ شک کے سب کانٹے نکل چکے تھے اور ایمان کے تازہ پھول کھلنے لگے تھے۔ میں کوئی ڈیڑھ سال تک قرآن حکیم کو بار بار پڑھتا رہا اور سوچتا رہا کہ شاید میں اسی کے لیے پیدا کیا گیا ہوں اور یہ میرے لئے تخلیق ہوا ہے۔ میں اب تک کسی مسلمان سے نہیں ملا تھا' لیکن مجھے احساس ہونے لگا کہ مجھے جلد ہی یا تو مکمل ایمان لانا ہوگا یا موسیقی کے دھندے ہی میں پھنسے رہنا ہوگا۔ یہ وقت میرے لئے بڑا کٹھن تھا۔

ایک روز کسی نے لندن کی ایک نئی مسجد کا تذکرہ کیا۔ قبول دین کا لمحہ آ پہنچا تھا۔ ۱۹۷۷ء کا موسم سرما تھا کہ ایک جمعے کے روز میرے قدم مسجد کی طرف اٹھنے لگے۔ جمعے کی نماز کے بعد میں نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا اور اس طرح مسلمانوں سے میرا پہلا رابطہ قائم ہوا۔

مجھے قرآن شریف میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی نظر آئے جن کی اپنی ایک شخصیت تھی اور جن کا اپنا ایک پیغام تھا۔ بلاشبہ وہ اللہ کے نیک بندے اور رسول تھے۔ ان کی صرف ایک ہی تصویر ابھرتی ہے اور وہ ایک انسانی تصویر ہے۔ دنیا کے مختلف گرجا گھروں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بنی ہوئی تصویریں اور مورتیاں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ وہ مختلف شخصیتوں کو نمایاں کرتی ہیں لیکن وہ خدا نہ تھے نہ خدا کے بیٹے۔ قرآن شریف میں ان کی صحیح شخصیت کا تصور واضح ہوتا ہے۔

بہر حال سب پیغمبر خدا کے بھیجے ہوئے ہیں لہذا قابل احترام ہیں اور سب کے بعد تشریف لانے والے حضور اکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں جن کا پیغام رہتی دنیا تک کے لیے ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ان کی بتائی ہوئی راہ پر گامزن رہیں اور دنیا و آخرت کی سعادتیں حاصل کریں۔

الحمد للہ میں ایک مسلمان کی حیثیت سے بہت خوش ہوں۔ میری بیوی بہت اچھی مسلمان ہے۔ ہم اپنے بچوں کو بھی بہت اچھا مسلمان دیکھنا چاہتے ہیں اور اسلام کی خدمت میں زندگی گزار دینا چاہتے ہیں۔

ہم کیوں مسلمان ہوئے

ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

ہم کیوں مسلمان ہوئے

ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

پروفیسر شاہین گلفام

(ہالینڈ)

(یہ مضمون میرے بہت عزیز دوست اور غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل معروف صحافی تنویر قیصر شاہد صاحب نے مرتب کر کے میرے حوالے کیا۔ ان کے شکریے کے ساتھ شاملِ کتاب کر رہا ہوں۔)

شاہین گلفام جس طرح اسلام کی تمام تر مبادیات اور اسلامی قوانین پر سختی سے عمل پیرا ہے' اس کے پیش نظر ان کی سابقہ ہم مذہب سہیلیاں حتیٰ کہ والدین اور رشتہ دار بھی انہیں ایک ''جنونی مسلمان'' کے لقب سے پکارتے ہیں۔ لیکن شاہین گلفام ان لوگوں کی طنزیہ باتوں کے جواب میں کہتی ہیں ''میں نہ تو جنونی مسلمان ہوں نہ اپنے سابقہ ہم مذہبوں کی طرح مذہب کا مذاق اڑانے والی ہوں۔ میں تو سیدھی سادی مسلمان ہوں کیونکہ اسلام تو ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے جس میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ ہر شے خدا اور خدا کے رسولؐ نے کھول کھول کر بیان کر دی ہے۔ یہ لوگ مجھے جنونی مسلمان شاید اس لئے کہتے ہیں کہ خود ان کی زندگیاں روحانی لطافتوں سے خالی ہیں۔ مصنوعی رویوں اور خدا سے دوری نے فی الحقیقت ان کی زندگیوں کو اندر سے کھوکھلا کر دیا ہے''۔

شاہین گلفام قبولِ اسلام سے قبل عیسائی مذہب کی پیروکار تھیں۔ کرونی ان کا نام تھا۔ قبولِ اسلام کی سعادت خدا نے ان کے مقدر میں لکھ دی تھی کہ وہ فطرتاً سلامتِ طبع کی مالک ہیں۔ ہر شے کو اصل کے روپ میں دیکھنے کی متمنی! عیسائیت کو مشرق و مغرب کے پادریوں نے اپنے مفادات کی خاطر جس طرح پراگندہ کر دیا ہے' اس کی وجہ سے وہ

اوائلِ عمر ہی سے اس مذہب سے بیزار رہنے لگی تھیں اور حقیقتِ حق کی تلاش میں سرگرداں رہیں۔ اپنی انہی کوششوں کے بارے میں شاہین کا کہنا ہے "میں ایک کٹر عیسائی گھرانے میں پیدا ہوئی جہاں یسوع مسیح کا نام بکثرت لیا جاتا تھا۔ اس لئے میں بچپن ہی سے کم از کم خدائے واحد کی ذات پر کامل یقین رکھتی تھی۔ سولہ سال کی عمر کو پہنچی تو حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں جو کہانیاں بچپن میں ازبر کرائی گئی تھیں' ان کے بارے میں میرے دل میں شبہات نے جنم لینا شروع کر دیا۔ دل کے نہاں خانہ سے یوں لگتا تھا آوازیں آ رہی ہیں کہ یہ کہانیاں محض کہانیاں ہیں' حقیقت سے ان کا قطعی کوئی تعلق نہیں ہے۔ رفتہ رفتہ یسوع مسیح پر میرا یقین ہی اٹھ گیا۔ پھر میں پریشان رہنے لگی کہ کیا میں دہریہ ہو گئی ہوں؟ خدا پر میرا ایمان اٹھ گیا ہے؟ ایک نہ سمجھ آنے والی بے قراری نے مجھے پریشان کر دیا۔ چنانچہ میں نے دوسرے مذاہب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ہندوازم' بدھ ازم اور سکھ ازم کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا مگر میری نہ تو تشنگی بجھی نہ سکونِ قلب ملا۔ لگتا تھا ان سب مذاہب میں کہیں نہ کہیں کھوٹ ضرور ہے۔ ان کا خدا سے کیا تعلق؟"

ماضی کی کروانی اور حال کی خوش قسمت شاہین گلفام سے جب پوچھا گیا کہ آپ نے مطالعہ کی فہرست میں اسلام کو کیوں نہیں شامل کیا تھا؟ انہوں نے جواب دیا: "اسلام کے بارے میں میں جو تھوڑا بہت جانتی تھی اور مجھے جو کچھ گھر سے سکھایا گیا تھا اس کے پیشِ نظر اسلام کے متعلق میرے خیالات و افکار درست نہیں تھے۔ انہی نظریات و خیالات کی وجہ سے میں نے اسلام کا مطالعہ کرنا ضروری خیال نہ کیا۔ میں سمجھتی تھی کہ اسلام جاہلوں اور غیر مہذب انسانوں کا مذہب ہے۔ ایسا مذہب جس میں عورتوں کو ہمیشہ مردوں کی غلامی سہنا پڑتی ہے۔ ان کے پیچھے پیچھے چلنا پڑتا ہے۔ سر سے پاؤں تک اپنے آپ کو ڈھانپ کر رکھنا پڑتا ہے اور اگر کوئی عورت سے زیادتی کر جائے تو جواب میں عورت کے لیے خاموش رہنا ناگزیر ہے۔ ان خیالات میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میری تربیت ہی ایسے گھرانے میں ہوئی تھی جہاں کے تمام افراد کے دلوں میں اسلام دشمنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ پھر مغرب میں جس طرح اسلام کو مطعون کیا جاتا ہے اس کے اثرات بھی میرے قلب و ذہن پر مرتسم ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں جن مسلمانوں سے میں ملتی تھی' وہ عملی مسلمان

نہیں تھے۔ اسلام ان کی زندگیوں میں بھرپور انداز میں نظر نہیں آتا تھا اور میں نے جب کبھی اپنے واقف کار مسلمانوں سے اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیں' جواب میں انہوں نے اسلام کے بارے میں ایسی مافوق الفطرت کہانیاں مجھے سنا ڈالیں جن کی وجہ سے میں اسلام کی طرف راغب نہ ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں نے روحانی تسکین کے لئے اور عیسائیت سے مایوس ہو کر دوسرے مذاہب کا مطالعہ کرنا شروع کیا تو اسلام میرے مطالعہ کی فہرست میں شامل نہیں تھا۔ دنیا کے معروف مذاہب کا مطالعہ میں نے کالج کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد شروع کیا تھا۔ میں یونیورسٹی اس وقت تک جوائن کرنا نہیں چاہتی تھی جب تک میرا قلب و ذہن صاف نہ ہو جاتا۔ کوئی راہ نہ ملی تو میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ دوسرے مضامین کے ساتھ میں نے عربی کا مضمون بھی منتخب کیا۔ اس حوالے سے میں نے اسلام' اسلامی تاریخ اور اسلامی ثقافت کا بڑی محنت سے عرق ریزی سے مطالعہ کیا۔ اسی دوران میں میری ملاقات ایک لڑکے سے ہوئی جو پاکستانی مسلمان تھا۔ خوش قسمتی سے اس لڑکے کا تعلق دنیائے اسلام کے ان بیشتر نوجوانوں سے نہیں تھا جو بظاہر ہیں تو مسلمان مگر اسلام ان کی زندگیوں میں نظر کہیں نہیں آتا۔ یہ پاکستانی نوجوان جو ایک ہسپتال میں استقبال کنندہ (RECEPTIONIST) کے عہدے پر کام کر رہا تھا اس کے عملی مسلمان ہونے نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں نے اس سے شادی کر لی۔ یہ شادی دراصل قبول اسلام کے لئے میرا پہلا دروازہ ثابت ہوئی"۔

وہ خوش قسمت لمحہ بالآخر پہنچ ہی گیا تھا جس کے لئے شاہین کی روح برسوں سے تڑپ رہی تھی مگر تکمیل کی گھڑیاں ابھی بہت دور تھیں۔ شاہین ابھی تک کرونی کی شکل میں تھی۔ انہوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ وہ کہتی ہیں "میرا شوہر کم گو اور صابر انسان تھا۔ میں نے شادی کی پیشکش کی تو اس نے قبول کر لی۔ ایک بار اس نے بہر حال یہ ضرور کہا کہ تم مسلمان ہو جاؤ تو بہتر ہے' مگر میرا اسے اور اس کے ان تمام دوستوں کو جن کا خیال تھا کہ میں شادی سے پہلے اسلام ضرور قبول کر لوں' فقط ایک جواب تھا کہ میں ایک مسلمان شوہر کے ساتھ رہتے ہوئے بھی ایک خالص عیسائی بیوی کا کردار ادا کرنا چاہتی ہوں اور دوسرے یہ کہ جب تک میں اسلام کی تمام مبادیات اور اسلام کے حقیقی فلسفے کو نہ سمجھ جاؤں'

اسے میرا دل اور دماغ قبول نہ کرلے' میں اسلام قبول نہیں کروں گی''۔

کرونی نے ایک مسلمان پاکستانی سے شادی رچالی۔ ان کی شادی کو دو سال گزر گئے۔ اس دوران میں بقول شاہین' کبھی ایک لحہ بھی ایسا نہ آیا کہ اس کے شوہر نے اسے زبردستی اسلام قبول کرنے کو کہا ہو...... مگر ہاں اتنا ضرور تھا کہ وہ دنیا کے نامور اسلامی مفکرین اور مصنفین کی وہ کتابیں اپنی بیوی کو ضرور پیش کرتا رہا جن میں اسلام کی سچی تصویر کشی کی گئی تھی اور مسائل کے حل کے لیے کسی بھی پیچیدگی سے ہٹ کر بحث کی گئی تھی۔ شاہین کے شوہر نے اسے آڈیو اور ویڈیو کیسٹس بھی لا کر دیں جن میں اسلام کے اوّلین فرائض کے بارے میں بالصراحت بتایا گیا تھا۔ شاہین گلفام کہتی ہیں ''اس دوران میں مجھے جس کتاب نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ معروف سکالر جناب علامہ محمد اسد کی تصنیف ''دی روڈ ٹو مکہ'' ہے۔ یہ کتاب ہی دراصل میرے لئے عظیم ساعتوں کا سندیسہ لے کر آئی۔ میں نے ایک بار پھر اسلام کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ ڈھائی سال کی طویل مدت کے بعد بالآخر وہ گھڑی آ ہی پہنچی جب میرے دل نے گواہی دی کہ اسلام ہی دراصل دنیا کا سچا' حقیقی اور کامل مذہب ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے آخری رسول ہیں اور یہ کہ قرآن مجید اللہ کی آخری غیر متبدّل کتاب ہے۔ چنانچہ ایک روز عصر کے بعد میں اپنے شوہر اور ان کے پانچ باعمل مسلمان دوستوں کی موجودگی میں کلمہ پڑھ کر باقاعدہ اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئی۔ یہ خدا کا مجھ پر عظیم احسان تھا کہ مجھے اس سعادت کا شرف عطا فرمایا''۔

قبولِ اسلام کی سعادت حاصل کرنے کے بعد کرونی کا نام شاہین گلفام رکھا گیا۔ وہ کہتی ہیں ''میرے نام کا دوسرا لفظ مجھے بے حد پسند ہے۔ میں نے نام رکھنے کی تقریب کے بعد اپنے شوہر سے پوچھا کہ اس کا مطلب کیا ہے تو اس نے کہا پھول کی طرح۔ مجھے بچپن ہی سے پھولوں کی لطافت سے خاص انس رہا ہے۔ اسلام کے دائرے میں داخل ہونے کے بعد میری ذات' میری روح میں بے پناہ تبدیلیاں ہونا شروع ہو گئیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں پتنگے (CATERPILLER) سے تتلی (BUTTERFLY) کا روپ دھار رہی ہوں۔ میرا باطن منقلب ہو رہا تھا اور یہ سب کچھ میرے شوہر کی بدولت تھا جس کے

ضمیر اور عمل و کردار نے مجھے اس حقیقت مطلقہ سے روشناس کروایا''۔

مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد شاہین گلفام کے قلب و ذہن پر طاری عبوری دور کی دھند خود بخود چھٹ گئی۔ یہ آشتی اور تسکین کے لمحے تھے۔ شاہین گلفام کا تعلق ولندیزی ملک نیدرلینڈ سے ہے جس کے شہریوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا کی سب سے زیادہ حقیقت پسند قوم ہے۔ شاہین سے جب پوچھا گیا کہ اسلام قبول کرنے پر اس کے والدین کا کیا ردِ عمل تھا تو ان کا جواب تھا ''میرے والدین چونکہ کٹر عیسائی تھے' اس لئے انہیں میری حرکت ایک آنکھ نہیں بھائی۔ وہ جہاں بھی مجھے ملتے' خوب کوسنے دیتے' وہ کہتے تھے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد تمہارا شوہر تمہارا استحصال کرے گا' تمہیں لونڈی بنا کر رکھے گا۔ اسلام ان کے لیے واقعی ایک اجنبی مذہب تھا۔ وہ اس کی فضیلتوں اور عظمتوں سے واقف ہی نہیں تھے' اس لئے ان کا غیر حقیقی تبصرہ مجھے متاثر نہ کر سکتا تھا۔ ان کے لئے یہ بات بھی شرمناک تھی کہ لوگ کیا کہیں گے کہ اتنے کٹر عیسائی گھرانے کی بیٹی نے اسلام قبول کر لیا ہے...... لیکن رفتہ رفتہ انہیں یہ بات سمجھ میں آنے لگی کہ ان کی بیٹی نے جو قدم اٹھایا ہے وہ درست ہی تھا''۔

شاہین گلفام سے جب یہ پوچھا گیا کہ ماضی میں وہ عیسائی تھیں اور اب خدا کے فضل سے وہ مسلمان ہیں' دونوں مذاہب کا انہوں نے گہری نظر سے جائزہ لیا ہے' اگر دونوں کا تقابل کیا جائے تو سماجی اعتبار سے دونوں مذاہب میں انہوں نے کیا فرق محسوس کیا ہے؟ شاہین کا جواب تھا: ''اسلام انسانی زندگی میں ایک توازن پیدا کرتا ہے۔ اسی لئے تو اسلام کو مکمل ضابطۂ حیات کہا جاتا ہے۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں' سماج کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس کا یہ احاطہ نہ کرتا ہو۔ اسلام میں انسان کی روحانی اور مادی زندگی میں کوئی امتیازی لکیر نہیں کھینچی جا سکتی۔ اگر میں عیسائی رہتی تو اب تک نن بن چکی ہوتی کیونکہ عیسائیت میں عورتوں کے لئے روحانی زندگی کو بالیدگی بخشنے کے لئے سوائے نن بننے کے اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔ مگر اسلام میں ایسا نہیں۔ اسلام میں تو روزمرہ کا ہر کام ہی عبادت ہے بشرطیکہ نیت درست ہو اور اخلاص کے ساتھ کام کیا جائے۔ اسلام کا کسی بھی لحاظ سے عیسائیت سے تقابل' میں سمجھتی ہوں' اسلام سے زیادتی کے مترادف ہوگا۔ صرف نماز ہی کو لے لیجئے۔

اسلام سے پہلے میں روحانی سکون کے لئے یوگا کیا کرتی تھی مگر اب میں نماز پڑھتی ہوں تو اس سے کئی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ روحانی بالیدگی بھی ملتی ہے' جسمانی اعصاب کی تھکن بھی ختم ہو جاتی ہے اور اللہ کا قرب بھی حاصل ہو جاتا ہے''۔

اپنے پہلے رمضان المبارک کے روزوں کے بارے میں شاہین کی روداد بھی دلچسپ ہے۔ انہوں نے کہا '' رمضان شریف آیا تو میرے شوہر نے مجھے روزے رکھنے کو کہا۔ میں اس سے قبل دو سال تک اپنے شوہر کو روزے رکھتے دیکھتی آ رہی تھی۔ اس مرتبہ خود بھی روزے رکھنے کا وقت آیا تو پہلے تو میں' نئی بات ہے بڑی گھبرائی ...... مگر اس دوران مجھے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے صحابہؓ کے ان روزوں کی تاریخ یاد آ گئی جب انہوں نے تپتے ہوئے دنوں میں روزوں کے ساتھ کفار عرب کے ساتھ جہاد کیا تھا۔ اس چیز نے میری ہمت بندھائی اور اللہ کے فضل سے سارا رمضان میں پورے استقلال سے روزے رکھتی رہی۔ عید کے روز میرے شوہر کے چہرے پر جو خوشی تھی' میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ایک مغربی اور عیسائیت پر عمل پیرا لڑکی کا مغرب زدہ شوہر اسے ایسی خوشی سے کبھی ہمکنار نہیں کر سکتا۔ یہ میرا دعویٰ ہے''۔

نومسلموں کے لئے بالخصوص' شاہین گلفام نے سات کتابیں تصنیف کی ہیں۔ انہوں نے اسی حوالے سے ایک دلچسپ واقعہ سنایا: '' میں اسلام میں عورت کے مقام پر ایک کتاب لکھنا چاہتی تھی۔ میری ایک ہمنوا یونیورسٹی پروفیسر نے مجھے بتایا کہ مجھے اس حوالے سے لندن کی انڈیا آفس لائبریری ضرور جانا چاہئے۔ میں لندن گئی۔ کتاب کے لئے سارا مواد تیار کر لیا۔ جس روز مجھے واپس آنا تھا' مجھے لائبریری میں پاکستان کے ایک سکالر شاہ عبدالعلیم صدیقی کا لکھا ہوا وہ مکتوب مل گیا جو انہوں نے کبھی غالباً برنارڈ شا کو لکھا تھا۔ ان کے اندر تحریر اور اپنے دین پر مضبوط یقین نے مجھے بڑا سہارا دیا۔ میں نے اس کی ایک فوٹو سٹیٹ بنوائی اور واپس آ کر اسے ڈچ زبان میں ترجمہ کر کے لوگوں میں تقسیم کیا''۔

محترمہ شاہین گلفام کے تین بچے ہیں اور تینوں بیٹیاں جن کی عمریں پندرہ اور تین سال کے درمیان ہیں۔ شاہین کا خیال ہے کہ مغرب میں رہ کر اسلام پر عمل پیرا رہنا یقینا ایک کار دشوار ہے کیونکہ سماج کی آلودگی قدم قدم پر انسان کی راہ روکتی ہے۔ اس حوالے

سے وہ اپنی بیٹیوں کے بارے میں یقیناً فکر مند ہیں۔ شاہین کا کہنا ہے: ''مغرب کی مادر پدر آزادی نے انسان کے اخلاق پر بڑے منفی اثرات مرتب کئے ہیں۔ مروّج اخلاقِ رذیلہ کی بدولت بچوں کی تربیت ایک بڑا مسئلہ ہے۔ میری بڑی بیٹی کلاس روم میں سر ڈھانپ کر نہیں جا سکتی حالانکہ وہ ایسا کرنا چاہتی ہے۔ مَیں اپنی بیٹیوں کو روزانہ یہ درس دیتی ہوں۔ دیکھو! میں ہر جگہ تمہاری نگرانی نہیں کر سکتی مگر ایک ذات ایسی بھی ہے جو ہر آن تم پر' تمہارے اعمال پر نظر رکھے ہوئے ہے اور وہ ذات خدا کی ہے۔ تم لوگ مسلمان ہو اور مسلمان کی اولاد ہو۔ تمہیں خدا کو حاضر و ناظر جان کر اپنے فرائض دینی اور دنیوی ادا کرنے ہوں گے۔ خدا کا خوف ہی تمہیں صراطِ مستقیم پر قائم رہنے کا سبب ہو گا۔ اس کے علاوہ دنیا کی کوئی طاقت تم لوگوں کو اس راستے پر چلنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔''

بیٹیوں کے حوالے سے شاہین نے مشرقی ممالک میں ایک گھناؤنے مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''۸۸ء میں مَیں اپنے شوہر کے ساتھ پاکستان آئی تو میرے سسرال بالخصوص میری نندوں کا اصرار تھا کہ مَیں نے ابھی تک کسی بیٹے کو جنم کیوں نہیں دیا؟ مجھے نہیں معلوم تھا کہ پاکستان میں اس طرح کے دقیانوسی خیالات بھی لوگوں میں پائے جاتے ہیں جبکہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ میری جن نندوں نے یہ سوال کیا تھا' پیشے کے اعتبار سے دونوں ڈاکٹر تھیں مگر اسلام کی حقیقی روشنی ان تک نہیں پہنچ سکی تھی اور نہ ہی خدا نے ان کو وسیع النظری کی نعمت سے سرفراز فرمایا تھا''۔

یونیورسٹی کی پروفیسر شپ سے پہلے شاہین گلفام دس برس تک ایک بین الاقوامی ایئر لائن میں ملازمت کرتی رہی ہیں۔ اس دوران میں انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہ بات شاید ہر قاری کے لیے تعجب انگیز ہو کہ شاہین دنیا کی پہلی ایئر ہوسٹس تھیں جو دورانِ پرواز بھی اپنا سر ڈھانپ کر رکھتی تھیں۔ اس دوران میں انہیں بڑے مسائل کا سامنا کرنا پڑا مگر انہوں نے پردہ ترک نہ کیا۔ وہ کہتی ہیں: ''سکارف پہنے ہوئے دورانِ پرواز جب مَیں مسافروں کی خدمت کرتی تو سب لوگوں کے لئے یہ لباس بڑا اچنبھے کا باعث بنتا۔ میرا رنگ و روپ دیکھ کر ان کا پہلا اندازہ ہوتا کہ شاید یہ مراکشی یا ترکی نژاد ہے مگر جب یہ بات ان کے علم میں آتی کہ مَیں ولندیزی ہوں تو ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ جاتے ...''

حوالے سے میں بہتوں کے نزدیک شاید بے چارگی کی علامت تھی مگر اسلام کی حقانیت بہرحال میں نے اپنی مستقل مزاجی سے ثابت کر دی''۔

اسکارف کے حوالے سے ملازمت کرتے ہوئے جب مسائل میں اضافہ ہوا تو شاہین گلفام نے ملازمت سے استعفیٰ دیکر ڈچ یونیورسٹی میں ملازمت اختیار کر لی جہاں انہیں شعبۃ الشرقیہ کا صرف تین سال کے قلیل عرصے میں سربراہ تعینات کر دیا گیا۔

حالیہ سرکاری ولندیزی اعداد و شمار کے مطابق ہالینڈ میں تقریباً چار ہزار مسلمان خواتین ہیں مگر جب شاہین گلفام نے تیرہ برس قبل اسلام قبول کیا تھا تو شاہین کے بیان کے مطابق ''وہاں مسلمان خواتین کی تعداد بہت کم تھی۔ ہم باقاعدگی سے ہر جمعہ کو کسی ایک گھر کا انتخاب کر لیتیں اور وہاں بیٹھ کر اپنے مسائل اور تجربات پر تفصیلی بات چیت ہوتی۔ ہماری کوششوں سے اور بھی خواتین ہمارے مرکز میں جمع ہونے لگیں کیونکہ اس ملک میں ڈچ زبان میں اسلام کے بارے میں بہت کم کتابیں میسر تھیں۔ مساجد کی تعداد اول تو نہ ہونے کے برابر تھی اور جو تھیں بھی' ان میں مسلمان اماموں اور خطیبوں کی اکثریت وہ تھی جو عربی' ترکی اور مراکشی تو بول لیتے تھے مگر ولندیزی زبان پر انہیں عبور حاصل نہیں تھا کہ اپنے مخاطب کے سوال کا مافی الضمیر سمجھ کر اس کی استعداد اور اہلیت کے مطابق جواب دے سکتے اور ہمارے پاس ایسی خواتین بھی آتی تھیں جو مرد اماموں کے پاس اپنے مختلف مسائل اور سوالات کے جوابات حاصل کرنا مناسب خیال نہیں کرتی تھیں۔ خواتین کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا تو ہمیں روحانی مسرت کا احساس ہوا کہ ہماری کوششوں سے خدا کا پیغام اور خدا کے رسولؐ کے ارشاداتِ مقدسہ کا نور اس کفرستان کی اندھیر نگری میں پھیلنے لگا تھا' اگرچہ اس کی رفتار کتنی ہی مدھم کیوں نہ تھی۔ ایک روز خواتین نے میرے نام قرعۂ فال نکال دیا کہ میں ہر جمعہ بعد از نماز عصر ان کے مختلف سوالات کے جوابات دیا کروں اور یہ کہ پہلے سے اعلان شدہ ایک موضوع پر خطاب بھی کیا کروں۔ حقیقی بات یہ ہے کہ میں نے اسے اپنے لئے ایک سعادت سمجھا کہ اس طرح مجھے تبلیغ کا موقع مل رہا تھا اگرچہ اس میں بہت سی دشواریاں بھی تھیں۔ مجھے اس مہم کو سر کرنے کے لئے بہت زیادہ مطالعہ کرنا پڑتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے قدم قدم پر اپنی تائید اور نصرت سے نوازا۔ اس

مقصد کے لئے ہم نے ایک ادارہ "النساء" کے نام سے قائم کیا۔ پہلے تو ہمیں امید تھی کہ حکومت ہمیں اس کے لئے کچھ امداد فراہم کرے گی مگر مسلمانوں کا ادارہ سمجھ کر اسے قطعی نظر انداز کر دیا گیا۔ ہم نے ہمت نہ ہاری اور اپنی مدد آپ کے تحت اسے اپنے پاؤں پر کھڑا کر ہی لیا۔ ہماری تمام مسلمان خواتین اس ادارے کی رکن ہیں اور اس پر فخر کر سکتی ہیں۔ شاہین گلفام کو اس ادارے کا صدر بنایا گیا۔ ان کی مساعیٔ جمیلہ کی بدولت اس تنظیم "النساء" کی ہالینڈ میں آٹھ شاخیں کھل چکی ہیں اور اسلام کے لئے بھرپور خدمت انجام دے رہی ہیں۔

"النساء" کا مرکزی کام' بقول شاہین گلفام' یہ ہے کہ وہ مسلمان خواتین کے علاوہ غیر مسلم خواتین کو بھی اسلام اور اسلامی زندگی کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کرے۔ اس کے علاوہ اسلام کے بڑے فرائض یعنی نماز' روزہ اور زکوۃ کے بارے میں بھی لوگوں کو آگاہ کرے۔ اسی تنظیم کے تحت اسلام کے فلسفیانہ مقاصد کے بارے میں ماہانہ لیکچروں کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے جن میں خواتین بڑے ذوق و شوق اور ایمانی جذبے سے سرشار ہو کر شریک ہوتی ہیں۔ شاہین کہتی ہیں: "یہ اجتماع ہمیں اللہ کی بندگی پر مجبور کر دیتے ہیں۔ خواتین' جن میں غیر مسلم بھی ہوتی ہیں' کی کثیر تعداد سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس ملک میں اسلام کے بارے میں جاننے کی لوگوں میں کس قدر تڑپ موجود ہے مگر اس کے لئے باعمل مسلمانوں کو سامنے لانے کی اشد ضرورت ہے"۔ لیکچروں کا اہتمام یونیورسٹیوں' کالجوں اور اسکولوں میں بھی ان کی خواہش کے مطابق کیا جاتا ہے۔ نومسلموں کو نماز پڑھنا سکھایا جاتا ہے اور خواتین کو اس بات کی بھی تربیت دی جاتی ہے کہ مسلمان خاتون کی وفات پر غسل اور تجہیز و تکفین کا طریقہ کیا ہے؟ بچوں اور بچیوں کو قرآن مع ترجمہ پڑھانے کا بھی بندوبست بھی کیا گیا ہے۔

اللہ کے آخری پیام کو دور دور تک پھیلانے کے لئے شاہین گلفام نے ایک ماہانہ جریدے کی اشاعت کا بھی اہتمام کیا ہے۔ وہ کہتی ہیں: "اس رسالے کے اجرا کا واحد مقصد یہ ہے کہ خواتین اور بچیاں جنہوں نے تازہ تازہ اسلام قبول کیا ہے اور جو ہمارے مراکز میں آنے سے کسی وجہ سے قاصر ہیں' ان کی اسلامی تربیت کا اہتمام ان کے گھر دں

ہی میں کر دیا جائے۔ شروع شروع میں یہ سارا کام مجھے ہی کرنا پڑتا تھا''۔

''میں اس رسالے میں اسلامی لیکچروں اور قرآن کی کسی سورت کا ڈچ زبان میں ترجمہ کیا کرتی تھی۔ خواتین کی طرف سے آئے ہوئے سوالات کے جوابات بھی لکھتی۔ عربی زبان سے زیادہ سے زیادہ رغبت پیدا کرنے کی غرض سے اسلامی کہانیوں کو عربی اور ڈچ زبان دونوں میں ترجمہ کر کے شائع کرتی۔ الحمد للہ اس رسالے کو خدا نے بڑی مقبولیت بخشی اور یہ منافع میں جانے لگا جسے ہم نے اپنے مراکز کے اخراجات کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا''۔

شاہین گلفام کے اس جریدے کا نام'' وائس آف اسلام'' ہے۔ ان کے اس رسالے کی گونج ولندیزی دانش وروں کے حلقوں تک پہنچ گئی تو شاہین کو ڈچ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اسلامی نظامِ زندگی کے مختلف موضوعات پر تقریروں کے لئے بلایا جانے لگا۔ شاہین نے بتایا:'' ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر لوگوں کے ایک چھوٹے سے اجتماع سے خطاب کرنا پڑتا تھا اور ان کے سوالات کے جوابات بھی دینے پڑتے تھے اور بعد ازاں اس گفتگو کو ریڈیو اور ٹی وی پر نشر کر دیا جاتا تھا۔ مجھ سے اکثر ایک سوال یہ پوچھا جاتا کہ اسلام قبول کرنے کے بعد خواتین کو ان کے شوہر پردے کی چادروں میں کیوں لپٹنے پر مجبور کر دیتے ہیں؟ اور ان کے اس مشترکہ سوالوں کے جواب میں مَیں اکثر یہ کہتی کہ پردے کے لئے ہمیں ہمارے شوہر مجبور نہیں کرتے بلکہ یہ سب کچھ ہم اپنی خواہش کے مطابق کرتی ہیں کیونکہ ایسا خدا اور اس کے رسول نے مسلمان خواتین کے لئے حکم دے رکھا ہے۔ اسلام قبول کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ خدا کی رضا کے سامنے اپنا سر جھکا دینا اور جب اسلام کی قبولیت کے بعد بھی ہم نے ہر کام میں اپنی ہی مرضی کرنی ہے اور سرکشی کا دامن نہیں چھوڑنا تو پھر اسلام قبول کرنے کا فائدہ کیا''؟ ''اس جواب پر لوگوں کا ردعمل کیا ہوتا ہے؟'' شاہین نے کہا:'' بعض اوقات تو لوگوں کی سمجھ میں آجاتا ہے اور بعض اوقات وہ ان باتوں کو احمقانہ خیالات پر محمول کرتے ہیں''۔

باہمت، پُر عزم اور پُر وقار شاہین گلفام سے جب یہ پوچھا گیا کہ آپ نے بلوغت کی عمر میں اسلام قبول کیا اور اس کے لئے عیسائیت کے علاوہ دنیا کے دوسرے مذاہب کا بھی

تقابلی جائزہ لیا' آپ کے خیال میں عورت کو دنیا کے کس مذہب میں زیادہ آزادی اور عزت حاصل ہے؟ شاہین گلفام نے کہا: ''کہا جاتا ہے کہ مغرب کی عورت کو بڑی آزادی ہے' اسے معاشرے کے ہر شعبے میں برابری کے حقوق حاصل ہیں۔ وہ مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں اور ان کے برابر معاوضہ پاتی ہیں۔ مگر میں کہتی ہوں کہ مغرب نے اس آزادی کے پردے میں عورت کے اصل حقوق پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ مغرب میں یعنی دنیائے عیسائیت میں اگر عورت گرہستن ہے' صرف گھر کے کام کاج کے لئے مختص ہے تو اسے جوتی کی نوک کے برابر بھی نہیں سمجھا جاتا اور اگر وہ ملازمت پیشہ ہے تو اس کو عزت کے کچھ قابل خیال کیا جاتا ہے' مگر اسلام میں ایسا نہیں ہے۔ اس عظیم مذہب میں عورت خواہ کسی بھی روپ اور سماجی مرتبے میں ہو' اسے یکساں عزت' محبت اور توقیر سے نوازا جاتا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں کہ عالم اسلام کی خواتین پر اللہ کے آخری رسول کا یہی احسان کیا کم ہے کہ ان کی بعثت نے معاشرے کی سب سے کمزور مخلوق کو سب سے زیادہ طاقتور بنا دیا۔ مجھے آج تک وہ منظر کبھی نہیں بھولتا جب میں نے اپنے مرکز میں آئی ہوئی غیر مسلم خواتین کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث کہ جنت ماں کے قدموں تلے ہے سنائی ہے تو عورتوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے تھے اور جب میں نے انہیں حضورؐ کے مزید وہ ارشادات بتائے جن میں آپؐ نے عورت کی عظمت کے بارے میں کھل کر ارشاد فرمایا ہے تو ''النساء'' کے مرکز میں آئی ہوئی دس کی دس خواتین جب مرکز سے نکلی ہیں تو وہ اسلام کی دولت سے مالا مال ہو چکی تھیں۔ یہ ۲ دسمبر ۱۹۸۶ء کا واقعہ ہے۔

●......●......●

پروفیسر صوفی محبوب الٰہی

(پاکستان)

عالم دین، معلم، خطیب اور مصنف پروفیسر صوفی محبوب الٰہی (سابق سردار سنت سنگھ) ضلع گوجرانوالہ کے ایک معتبر سکھ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے (تاریخ) کے طالب علم تھے جب نومبر ۱۹۱۶ء میں انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور نوع بہ نوع آزمائشوں کے باوجود نہ صرف اس پر قائم رہے بلکہ پوری زندگی اس کی تبلیغ و اشاعت کے لئے وقف کر دی۔ قرآن اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے انہیں غایت درجہ کا عشق تھا۔ ۷ نومبر ۱۹۷۴ء کو گوجرانوالہ میں انتقال فرمایا۔ ذیل کی تحریر جناب ارشد میر ایڈووکیٹ (گوجرانوالہ) کے اس مضمون کی تلخیص اور متعلقہ حصوں پر مبنی ہے جو موصوف نے صوفی صاحب مرحوم کے بارے میں رقم فرمایا۔ میں اس کے لئے ارشد میر صاحب کا بے حد ممنون ہوں۔ (مرتب)

صوفی محبوب الٰہی ۱۷۔ اکتوبر ۱۸۹۴ء کو ضلع گوجرانوالہ کے معروف قصبہ واہنڈو میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق ایک باعزت سکھ گھرانے سے تھا۔ ان کے دادا گوبند داس کا شمار پنجاب کے رؤسا اور نامور ساہوکاروں میں ہوتا تھا۔ والد کیسر رائے پہلوانی اور شہسواری میں اپنی مثال آپ تھے۔ مگر ان کا انتقال صوفی صاحب کی پیدائش سے دس دن پہلے ہو گیا اور موصوف پیدائش سے پہلے ہی یتیم ہو گئے۔ تاہم دادا نے ان کی پرورش اور تربیت بڑے ناز و نعم سے کی اور پوتے کو یتیمی کا بالکل احساس نہ ہونے دیا۔

ابتدائی تعلیم قصبے میں حاصل کرنے کے بعد ۱۹۱۲ء میں میٹرک خالصہ ہائی اسکول گوجرانوالہ سے امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے مہندرا کالج پٹیالہ میں داخلہ لے لیا۔ وہاں سے ۱۹۱۴ء میں ایف اے اور ۱۹۱۶ء میں بی اے کیا۔ بی اے میں کالج میں اول آئے اور نارتھ بروک گولڈ میڈل حاصل کیا۔ دوران تعلیم انہیں انگریزی ادب اور تاریخ سے خاص دلچسپی تھی۔ تاریخ سے گہری وابستگی ہی کا نتیجہ تھا کہ ایک مرتبہ انہوں نے کالج کی ایک تقریب میں پیغمبر اسلام محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایک پُر اثر اور بھرپور تقریر کر ڈالی۔ دراصل اسلام اور مسلمانوں سے انکے قرب کا سبب واہنڈو کے حق شناس بزرگ پیر جلال الدین ہے، جن سے صوفی صاحب بہت متاثر ہوئے اور اکثر ان کے پاس جا کر بیٹھتے حتیٰ کہ ان سے نقشبندی انداز میں ذکر کرنے کا طریقہ بھی سیکھ لیا۔ اس وقت صوفی صاحب ابھی کالج ہی میں پڑھتے تھے۔

اسی زمانے میں اتفاق یوں ہوا کہ گوجرانوالہ کے ایک صاحب قاضی عالم دین نے حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات اردو میں ترجمہ کر کے شائع کر دیئے۔ صوفی صاحب نے قاضی صاحب موصوف سے کتاب عاریتاً طلب کی اور بعد میں یہی کتاب ان کے قبولِ اسلام کی محرک بن گئی۔ وہ حضرت مجدد الف ثانی کی نادرِ روزگار شخصیت سے اور بے مثال کارناموں سے بہت متاثر تھے اور اکثر ان کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ فرماتے تھے "یوں تو سارے ہی خطوط اپنے اندر معانی کے سمندر سموئے ہوئے ہیں، لیکن بعض فقروں نے قلب و ذہن پر انمٹ نقوش چھوڑے۔ مثلاً" فقر خادم شریعت ہے۔ قیامت کو شریعت کے حوالے سے سوال ہوگا نہ کہ فقر کی نسبت سے" اور اگر اسی ایک فقرے کو سیاق و سباق سے دیکھا جائے تو پورے اسلامی فلسفہ کی ماہیت سمجھ میں آجاتی ہے۔

مکتوبات امام ربانی کے مطالعہ سے جب صوفی صاحب اسلام کے بہت قریب آگئے اور مزید تحقیق سے ان پر اسلام کی حقانیت واضح ہو گئی تو وہ راولپنڈی کے صاحب دل بزرگ حافظ عبدالکریم کی مجلسوں میں بھی بیٹھنے لگے۔ حافظ صاحب موصوف سے بھی انہوں نے بہت روحانی فیض حاصل کیا۔

اس زمانے میں صوفی صاحب گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے تاریخ میں پڑھتے

تھے اور تاہمہ ہاؤس کے قریب واقع ہوسٹل میں رہائش پذیر تھے۔ اسلام کے بارے میں وہ اتنے یکسو ہو گئے تھے کہ اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے وہ باقاعدہ نمازیں پڑھتے تھے۔ ایک روز وہ نماز میں مشغول تھے کہ حکیم مرتضٰی ملتانی اور چودھری نذیر احمد (سابق اٹارنی جنرل) نے جو صوفی صاحب کے کلاس فیلو تھے' دروازے کے ایک سوراخ سے انہیں دیکھ لیا اور پھر دونوں نے انہیں گلے سے لگا کر خوب بھینچا۔

انہی ایام میں ان کے مسلمان پروفیسر نے جو گورنمنٹ کالج میں پڑھاتے تھے' انہیں مشورہ دیا کہ دوران تعلیم اسلام قبول نہ کریں مبادا انہیں کالج سے نکال دیا جائے اور ان کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو جائے، مگر صوفی صاحب نے اس مشورے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا: ''میرا رزق ایم اے پر موقوف نہیں' یہ بی اے کی بنیاد پر بھی مل سکتا ہے''۔ چنانچہ ۲۴ نومبر ۱۹۱۶ء کو انہوں نے قبولِ اسلام کا اعلان کر دیا اور حافظ عبدالکریم کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ بعد میں ان کی شادی حافظ صاحب موصوف کے ایک مرید عبدالعزیز ڈپٹی پوسٹ ماسٹر جنرل کی ہمشیرہ سے ہو گئی۔

صوفی صاحب کے مسلمان ہونے کا اعلان پورے خاندان اور سکھ برادری میں زبردست دھماکہ ثابت ہوا۔ برملا دھمکی دی گئی کہ اگر مسلمان ہو کر گاؤں میں آنے کی جرأت کی تو جان سے مار دیئے جاؤ گے، مگر آپ کے یقین و ایمان کی پختگی کا یہ عالم تھا کہ آپ نہ صرف بے دھڑک اپنے گاؤں میں گئے بلکہ تبلیغ اسلام کا کام بھی کھلم کھلا شروع کر دیا اور اس سلسلے میں خاندانی روایات کے بالکل برعکس غریب اور نیچ ذات کے لوگوں سے بھی میل ملاقات کرنے لگے۔ خاندان کے لوگوں نے اور خصوصاً ان کے چچا نے اسے اپنی توہین قرار دیا اور صوفی صاحب کو مختلف حیلوں سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر موصوف اپنے موقف پر مستقل مزاجی سے ڈٹے رہے حتیٰ کہ مخالفتوں کے سارے طوفان اس چٹان سے ٹکرا کر ختم ہو گئے۔

خاندانی حلقے سے باہر ہندوؤں' سکھوں اور انگریزوں نے بھی صوفی صاحب کے قبولِ اسلام پر اعلانیہ بیزاری اور برہمی کا مظاہرہ کیا۔ تاریخ کے ایک غیر مسلم پروفیسر نے کہا: ''اب تمہیں گائے کا گوشت بھی کھانا پڑے گا' کیا تمہاری غیرت برداشت کر لے

گی"، مگر بقول صوفی صاحب "میں یہ بات سن کر مسکرا دیا کہ جسے یہ غیرت کہہ رہا ہے' میرا مذہب تو اسے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے"۔

ڈی اے وی کالج کے پرنسپل پنڈت ہنس راج نے کہا: "تمہیں شرم آنی چاہئے کہ مسلمان ہو کر تم نے باپ دادا کا نام ڈبو دیا۔ تم شاید عیش پرست ہو گئے ہو۔ اگر ایسی کوئی بات ہے تو بتاؤ تمہارا رشتہ ایف سی کالج کے ایک پروفیسر کی لڑکی سے کرا دیتا ہوں۔ سواری یا روپیہ چاہئے تو اس کا بندوبست بھی ہو سکتا ہے"۔ صوفی صاحب نے جواب دیا: "آپ مجھے غلط سمجھے ہیں' مجھے ایسی کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ مجھے روشنی کی طلب تھی اور وہ مجھے اسلام سے مل گئی ہے جبکہ دوسرے مذاہب میں منزل کا کوئی سراغ نہیں ملتا"۔

صوفی محبوب الٰہی نے ۱۹۱۸ء میں ایم اے تاریخ اور ۱۹۲۰ء میں ایم اے انگریزی کا امتحان پاس کیا۔ انگریزی میں وہ پنجاب یونیورسٹی میں دوسرے نمبر پر رہے۔ وہ یقینا اوّل آتے مگر بے ایمانی سے ایف سی کالج کے ایک پروفیسر کے لڑکے کو یہ اعزاز بخش دیا گیا۔ ایم اے سے فارغ ہو کر سرٹیفکیٹ لینے گئے تو ایک متعصب انگریز پروفیسر راس ولسن سے ملاقات ہوئی۔ اس نے پریشان ہو کر پوچھا: "تم مسلمان کیوں ہوئے' عیسائی یا بدھ کیوں نہیں ہو گئے؟"

صوفی صاحب نے جواب دیا "مجھے پیغمبر اسلام کے اخلاق اور سیرت اور مثالی کردار نے متاثر کیا ہے"۔

یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ جب صوفی صاحب نے اسلام قبول کیا تو گورنمنٹ کالج کے پرنسپل کرنل سٹیفن کے پاس تبدیلی نام کی خاطر گئے۔ پرنسپل اگرچہ دہریہ تھا مگر ادب اور شاعری خصوصاً سعدی اور شیکسپیئر سے گہری قلبی مناسبت رکھتا تھا۔ اس نے اعتراض کیا کہ سرپرست کی موجودگی کے بغیر نام تبدیل نہیں ہو سکتا۔ آپ نے جواب دیا کہ میں اپنے پہلے سرپرستوں کو نہیں مانتا اب میں خود ہی اپنا سرپرست ہوں۔ یہ سن کر پرنسپل مسکرا پڑا اور نیا اسلامی نام لکھ لیا۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد صوفی صاحب محبوب عالم اسلامیہ ہائی سکول گوجرانوالہ کے ہیڈ ماسٹر تعینات ہوئے اور ۱۹۲۶ء تک اس فرض کو نبھاتے رہے۔ بعد ازاں وہ ایم بی ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر بنے مگر کچھ عرصے کے بعد انٹر کالج گجرات میں

لیکچرار ہو گئے۔ پھر سرکاری ملازمت اختیار کر لی اور مختلف ہائی سکولوں کے ہیڈ ماسٹر رہے۔ ۱۹۴۷ء میں سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو کر وہ اسلامیہ کالج گوجرانوالہ میں لیکچرار مقرر ہوئے اور ۱۹۶۱ء میں یہاں سے ریٹائر ہوئے۔

صوفی صاحب کو اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی بڑی فکر تھی۔ کالج میں وہ باقاعدگی کے ساتھ طالب علموں کو قرآن و سنت پر مبنی درس دیتے۔ ہر جمعہ کو تھانے والا بازار کی نالی والی مسجد میں تقریر کرتے' خطبہ دیتے اور نماز پڑھاتے۔ ان کی تقریریں انگریزی' اردو' عربی' فارسی اور پنجابی زبان کے اشعار اور عالمی مفکرین کے فرمودات سے مزین ہوتی تھیں جنہیں ان کے لہجے کی شیرینی اور خلوص نئی آب و تاب دے دیتا تھا۔ قرآن و حدیث اور تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ چنانچہ سامعین وجد و کیف سے مسحور ہو جاتے اور سینوں میں نیا جذبۂ عمل کروٹیں لینے لگتا۔

صوفی صاحب کو تصنیف و تالیف سے بھی یک گونہ تعلق تھا۔ انگریزی میں سیرتِ مقدسہ پر ایک کتاب لکھی اور ایک دوسرے اہم موضوع پر مواد اکٹھا کر رہے تھے مگر اسے مکمل نہ کر سکے۔

صوفی صاحب کو علامہ اقبال سے والہانہ عقیدت تھی۔ اکثر ان کے اشعار گنگناتے رہتے۔ وہ ۱۹۲۰ء میں پہلی مرتبہ اقبال سے ملے اور جب علامہ کو معلوم ہوا کہ صوفی صاحب نومسلم ہیں تو بہت خوش ہوئے اور خصوصی محبت اور توجہ فرماتے رہے۔ صوفی صاحب کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ انہوں نے علامہ اقبال کی بیاض سے "ضربِ کلیم" کا مسودہ نقل کیا۔ علامہ مرحوم نے ضربِ کلیم کا ایک نسخہ بکمال شفقت سے صوفی صاحب کو عنایت فرمایا تھا۔

صوفی صاحب کو قرآن سے عشق تھا۔ احباب کو عموماً قرآن پاک کی تلاوت کی تلقین کرتے۔ وہ اسلام کو اس کی صحیح روح کے ساتھ سمجھتے تھے۔ علمائے سو اور عالمانِ ظاہر بین پر شدید گرفت کرتے۔ فرقہ بندی اور بدعات کے سخت خلاف تھے اور توحید پر خصوصی زور دیتے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت پر بھی عملاً کاربند رہے۔ پُر رعب و باوقار شخصیت داڑھی سے مزین تھی' خوبصورت نورانی چہرہ' محبت بھری گفتگو اور لہجے میں کوثر و تسنیم کی مٹھاس اور روانی' صوفی محبوب الٰہی کو جو شخص ایک مرتبہ ملتا تھا وہ صوفی صاحب کو واقعی اپنا محبوب بنا لیتا تھا۔

کرنل عبدالرحمٰن عیسیٰ

نوٹ: ذیل کا بے حد دلچسپ اور روح پرور مضمون ملک محمد خان اعوان نے تحریر فرمایا ہے۔ یہ نوائے وقت ۱۷، ۱۸۔ اپریل ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا تھا۔

☆☆☆

۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو بیساکھی کا تہوار تھا۔ امرتسر (بھارت) میں یہ تہوار ہندو مسلم سب مل کر منایا کرتے تھے کیونکہ پنجاب میں یکم بیساکھ سے گندم کی کٹائی شروع ہوتی تھی۔ پنجاب کے اکثر اضلاع میں میلے منعقد ہوا کرتے تھے اور سب سے بڑا میلہ امرتسر میں ہوتا تھا۔ سیاسی لیڈروں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا کہ اس روز پنجاب بھر سے لوگ امرتسر بیساکھی کا میلہ دیکھنے آئے تھے لہذا جلیانوالہ باغ میں ایک سیاسی جلسہ منعقد کرنے کا انتظام کیا گیا۔ شہر میں بڑے بڑے پوسٹر لگائے گئے۔ منادی کرائی گئی' اخبارات میں اعلانات شائع کرائے گئے۔ ان دنوں ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ بڑے زوروں پر تھا۔ آل انڈیا نیشنل کانگریس اور تحریکِ خلافت کا یہ مشترکہ جلسہ تھا۔ ہندوستان کی دونوں قومیں برطانوی راج کے خلاف تھیں۔ گورنمنٹ ہند نے رولٹ ایکٹ پاس کیا تھا جس کی وجہ سے ہر ہندوستانی باشندے کے دل میں حکومت کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ ادھر مسلمانانِ عالم خلافتِ عثمانیہ کو ختم کرنے کی برطانوی سازش سے بڑے برافروختہ تھے۔ اس جلسہ میں ہندو مسلم مل کر ایک ہی پلیٹ فارم سے حکومتِ برطانیہ کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہتے تھے اور متفقہ ریزولیشن پاس کر کے حکومت سے ہر طرح کا بائیکاٹ مقصود تھا۔ دوسرے لفظوں میں کھلی ''بغاوت'' کا اعلان کرنا تھا۔ جب اس جلسہ کے متعلق حکومت کو رپورٹ پہنچی تو گورنر پنجاب سر مائیکل اڈوائر نے لاہور ڈویژن کے جنرل آفیسر کمانڈنگ جنرل ڈائر سے مدد طلب کی اور کہا کہ یہ جلسہ کسی صورت بھی منعقد نہیں ہونا چاہیے اور اگر

لوگ بضد ہوں اور تنبیہ کرنے پر بھی منتشر نہ ہوں تو طاقت کا زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جائے خواہ کتنی تعداد میں آدمی گولی کا نشانہ بنیں تا کہ ہندوستانی آئندہ اس قسم کی جرأت نہ کر سکیں۔ لہذا اس سلسلہ میں امرتسر چھاؤنی میں مقیم برٹش یونٹ کی ایک مشین گن کمپنی کا تعین کیا گیا جس کا کمانڈر میجر البرٹ ریمزے میسی مقرر ہوا اور اسے مکمل ہدایات جاری کی گئیں۔

جب کمپنی جلیانوالہ باغ پہنچی تو ابھی جلسہ شروع نہیں ہوا تھا۔ ہر طرف بڑے بڑے بینر لگے تھے۔ گاندھی اور مولانا جوہر کی قدِ آدم تصاویر آویزاں تھیں۔ حکومت کے خلاف نعرے بلند ہو رہے تھے۔ کنگ جارج پنجم کا پتلا جلایا جا رہا تھا۔ لوگ بڑے مشتعل تھے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر باغ کے گرد و نواح میں رہائشی مکانوں کی چھتوں پر فوجیوں نے پوزیشن سنبھالی۔ سکیم یہ تھی کہ حکم ملتے ہی ہر سہ اطراف سے مشین گنوں کا کراس فائر کھول دیا جائے۔ جلسہ کی کارروائی شروع ہونے میں کچھ دیر تھی اور لوگ جوق در جوق آ رہے تھے۔ جلسہ گاہ میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ میجر میسی نے جائزہ لیا اور اچانک کسی غیبی طاقت نے میجر میسی کو ان نہتے عوام پر ظلم کرنے سے روک دیا۔ مشہور ہے کہ وہ انتہائی رحم دل انسان تھا۔ اس نے تھوڑی دیر سوچا پھر اچانک کمپنی کی کمان اپنے نائب کو سونپی اور اس کو سمجھایا کہ جب تک کوئی سینئر آفیسر نہ پہنچے خواہ پوزیشن کتنی خراب کیوں نہ ہو جائے فائر کا حکم ہرگز نہ دیا جائے اور بہت جلد کوئی دوسرا میجر وہاں پہنچ جائے گا۔

میجر میسی فوراً واپس ہیڈ کوارٹر پہنچا اور کمانڈنگ آفیسر کو بتایا کہ وہ اس حکم کو بجالانے سے قاصر ہے لہذا کسی دوسرے سینئر آفیسر کو موقع پر بھجوایا جائے۔ فوراً ایک دوسرے برٹش میجر کو جلیانوالہ باغ بھیجا گیا تا کہ وہ حکم کی تعمیل کرے اور میجر میسی کو حکم عدولی کی بنا پر حراست میں لے لیا گیا۔ جب دوسرا میجر وہاں پہنچا تو جلسہ شروع ہو چکا تھا اور حکومت کے خلاف بغاوت کا ریزولیوشن پاس ہونے والا تھا کہ میجر نے ہر سہ پوسٹوں کو فائر کرنے کا اشارہ کیا۔ آن کی آن میں سینکڑوں بے گناہوں کے سینے گولیوں سے چھلنی ہو گئے۔ ان کی لاشیں میدان میں بکھر گئیں۔ مرنے والوں کی تعداد کئی ہزار تھی اور زخمیوں کی تعداد کا کوئی اندازہ ہی نہ تھا۔ ساٹھ ستر ہزار کے مجمع میں سے شاید پانچ چھ ہزار آدمی جان بچا سکے۔ برطانوی راج کے دوران جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد یہ سب سے بدترین حادثہ تھا۔

اس المیے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح برصغیر میں پھیل گئی۔ ملک میں فوری ردعمل یہ ہوا کہ جہاں کہیں بھی کوئی انگریز نظر آیا اس کو بڑی بیدردی سے مار دیا گیا۔ مردوں کے علاوہ انگریز عورتوں اور بچوں کو بھی سر بازار قتل کر دیا گیا۔ سرکاری عمارتوں کو آگ لگا دی گئی۔ ریل کی پٹڑیاں اکھاڑ دی گئیں۔ گوجرانوالہ کا ریلوے اسٹیشن مکمل طور پر جلا دیا گیا۔ حکومت کو کسی ہندوستانی پر اعتماد نہ رہا۔ انڈین آرمی کے کئی یونٹوں کے ہتھیار لے لئے گئے۔ دوسرے روز ضلع امرتسر کے علاوہ لاہور اور گوجرانوالہ میں مارشل لا نافذ ہو گیا۔ تشدد کی ایسی تباہی کی خبر جب انگلینڈ پہنچی تو برطانوی پارلیمنٹ میں زبردست ہنگامہ ہوا اور حکومت نے مطالبہ کیا گیا کہ ذمہ دار افسروں کو واپس بلایا جائے اور ان پر مقدمات چلائے جائیں۔ گورنر پنجاب سر مائیکل ایڈوائر اور جنرل ڈائر ملازمت سے سبکدوش کر دیئے گئے۔ ان پر مقدمات تو کیا چلتے محض ہندوستانیوں کو ٹھنڈا کرنے کی خاطر ان کو برائے نام سزائیں دی گئیں۔ یہ میری اس کہانی کا پس منظر تھا۔ اب میں اپنے مطلب پر آتا ہوں۔

میجر میسی کا کورٹ مارشل ہوا اور حکم عدولی کی سزا کے طور پر اس کی تنزلی کر کے لیفٹیننٹ بنا دیا گیا اور ہندوستان سے انگلینڈ بھیج کر اسکی تعیناتی دوسرے یونٹ میں کر دی گئی۔ آٹھ نو سال کے بعد وہ پھر میجر کے رینک پر پہنچا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اب کے دوبارہ اس کے موجودہ یونٹ کو تین سال کے لئے ہندوستان بھیجا گیا۔ یہ برٹش یونٹ اٹک کے قلعہ میں تعینات کیا گیا۔ شاید یہ قلعہ مغل شہنشاہ اکبر نے تعمیر کرایا تھا۔ جب سے انگریزوں کا قبضہ اس ملک پر ہوا تھا اس قلعہ میں ہمیشہ ایک برٹش یونٹ اور کچھ انڈین آرمی کی یونٹیں رکھی جاتی تھیں۔ جون کا مہینہ تھا اور شدید گرمی کا موسم۔ خصوصاً خشک پہاڑیوں میں گھرے ہونے کی وجہ سے قلعہ اٹک کا درجہ حرارت ان ایام میں ۱۳۰ ڈگری تک پہنچ جاتا تھا اسی موسم میں ایک روز کا واقعہ ہے کہ میجر میسی پریڈ سے واپس آ کر اپنے دفتر میں کام کر رہا تھا۔ اس نے کوئی خاص رپورٹ تیار کرنا تھی' اس لئے کھانے پر نہیں گیا تھا۔ دو بجے کا وقت ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ سامنے والی پریڈ گراؤنڈ میں ایک ہندوستانی سپاہی کو سزا کے طور پر گراؤنڈ کے گرد دوڑایا جا رہا ہے۔ اس کی پیٹھ پر اینٹوں سے بھرا پٹھو بندھا ہے۔ اس تپتی دھوپ میں کولہو کے بیل کی طرح اسے دوڑایا جا رہا ہے۔ اگر اسکی رفتار میں تھوڑی سی سستی

آتی ہے تو پیچھے سے سکھ سنتری اسے کوڑے مارتا ہے تاکہ وہ پوری رفتار سے دوڑے۔ یہ سلسلہ پورے ایک گھنٹے تک جاری رہا۔ میجر میسی اس ہندوستانی سپاہی کی ہمت پر حیران ہو رہا تھا۔ جب گھڑی نے اڑھائی بجائے تو سکھ سنتری نے اسے ٹھہر جانے کو کہا اور اس کو آدھا گھنٹہ آرام کرنے کا موقع دیا۔ میجر میسی یہ نظارہ دیکھتا رہا۔ جونہی اس نے سزا یافتہ کو چھٹی دی' وہ بڑی تیزی سے پانی کے نل پر پہنچا۔ دونوں ہاتھ دھوئے' پھر تین دفعہ منہ میں پانی ڈال کر کلی کر کے پانی باہر پھینک دیا لیکن ایک گھونٹ بھی حلق سے نیچے نہ اترنے دیا۔ اس کے بعد چہرے کو اور کہنیوں کو دھویا۔ آخر میں پاؤں دھوئے اور آگ کی طرح جلتی زمین پر قبلہ کی طرف منہ کیا اور ہاتھ باندھ کر عبادت (نماز) میں مصروف ہو گیا۔ ابھی اس نے دونوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھائے تھے کہ سکھ سنتری پھر موت کے فرشتہ کی طرح اس کے سر پر آ نازل ہوا اور پہلے کی طرح اس کو دوڑانا شروع کر دیا۔

دفتر کی کھڑکی سے یہ منظر دیکھ کر میجر میسی کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اپنے دفتر سے اٹھ کر انڈین یونٹ کے دفتر جا پہنچا۔ وہاں اپنے ہم عہدہ میجر سے دریافت کیا کہ سامنے والی گراؤنڈ میں اس کے ایک سپاہی کو سزا دی جا رہی ہے۔ کیا اس نے کوئی جرم کیا ہے؟ اس کی بلند ہمتی قابلِ صد آفرین ہے کہ اس شدید گرمی میں بھی اس نے ایک گھونٹ پانی نہیں پیا۔ یہ تو کوئی سپر انسان ہے۔ میجر میسی نے اس سے سفارش کی کہ اب اس کی سزا معاف کر دی جائے اور اس کو یہاں دفتر میں بلوایا جائے۔ کیونکہ میجر میسی اس سے کچھ باتیں دریافت کرنا چاہتا ہے۔ اس کو بلوایا گیا۔ سب سے پہلے تو میجر میسی نے اس سے دریافت کیا کہ اس نے کون سا قصور کیا ہے جس کی بنا پر اس کو اتنی سخت سزا دی گئی ہے۔ سپاہی نے بتایا کہ وہ صبح کی پریڈ میں چند منٹ دیر سے پہنچا تھا۔ اس قصور پر اس کے سکھ کمپنی آفیسر نے یہ سزا سنائی تھی۔ (انڈین آرمی میں اکثر ایسا ہوتا تھا کہ محض مذہبی تعصب کی بنا پر سکھ' مسلمان سپاہیوں کو سخت سے سخت سزا دیا کرتے تھے)۔ اس کے بعد دوسرا سوال میجر میسی نے اس سے یہ کیا کہ کیا اس قیامت خیز گرمی میں اسے پیاس محسوس نہ ہوئی کہ اتنی زبردست ورزش کے بعد اس نے منہ میں پانی ڈال کر کلی کر دی۔ سپاہی نے جواب دیا کہ جناب وہ بھی انسان ہے اور پیاس سے اس کا برا حال ہو رہا تھا لیکن اس نے پیاس کی یہ

شدت محض اس لئے برداشت کی کہ وہ مسلمان ہے اور اسلام کا تیسرا بڑا رکن ماہ رمضان کے روزے ہیں۔ یہ رمضان کا مہینہ ہے' ہر مسلمان بالغ تندرست پر روزہ فرض ہے۔ صبح سے شام تک کھانا پینا منع ہے۔ اس نے تفصیل سے روزہ کے فلسفہ پر روشنی ڈالی۔ میجر میسی نے اس سے پوچھا کہ اس قدر پیاس کی شدت تھی' اگر ایک دو گھونٹ پانی پی لیتا تو اس وقت اس کو کون دیکھ رہا تھا۔ سپاہی نے جواب دیا کوئی دیکھے یا نہ دیکھے مگر خدا تو حاضر ناظر ہے اور اس کے حکم کی خلاف ورزی وہ نہیں کر سکتا۔ مسلمان کے لئے جان دینا کوئی بڑی بات نہیں لیکن خدائے وحدہ' لاشریک کی حکم عدولی کرنا اس کے لیے درست نہیں۔ تیسری بات میجر میسی نے اس سے یہ کہی کہ جب کہ تم کو صرف چند منٹ کا وقفہ آرام کرنے کو ملا تو تھوڑی دیر کے لیے کسی سائے میں ستا لیتے اور تازہ دم ہو جاتے۔ سپاہی نے جواب دیا کہ مسلمان کے لیے سب سے بڑا رکن نماز ہے۔ ہر نماز عین وقت پر ادا کرنا فرض ہے۔ وقت اتنا کم تھا کہ اگر وہ ستانے کے لئے بیٹھ جاتا تو نماز کا وقت گزر جاتا اور اس کی نماز قضا ہو جاتی' جس سے اس کا خدا ناراض ہو جاتا۔ اس نے ستانے کی بجائے فرض کی ادائیگی کو مقدم سمجھا۔

سپاہی کی یہ باتیں سن کر میجر پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ واپس بنگلہ پہنچا اور گھنٹوں گہرے خیالوں میں گم رہا۔ وہ اسلام کے فلسفہ پر سوچتا رہا اور اس کے ادنیٰ پیروکار کی مذہب سے وابستگی دیکھ کر بڑا متاثر ہوا۔ شام کو کلب جانا چھوڑ دیا۔ اپنی فوجی ڈیوٹی میں دلچسپی لینی بھی چھوڑ دی۔ بالکل خاموش رہتا اور سب سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس کے ساتھی آفیسر حیران تھے کہ میجر میسی کو کیا ہو گیا۔ گہرے خیالوں میں مستغرق رہتا ہے۔ ہفتہ کے بعد اس نے چار روز کی رخصت لی۔ راولپنڈی پہنچا اور وہاں تمام کتب فروشوں کی دکانیں چھان ماریں اور جہاں جہاں اسے اسلام پر کوئی کتاب انگریزی میں نظر آئی' خرید لی۔ درجنوں کتابیں قرآن پاک کے چند پارے جو انگریزی میں ترجمہ ہو چکے تھے' لے کر واپس قلعہ اٹک پہنچا۔ اب تو صبح و شام انہی کتابوں میں مصروف رہتا۔ چند دنوں کے بعد اس نے اسلام کی بابت کافی معلومات حاصل کر لیں۔ اب اس نے فیصلہ کر لیا کہ جتنی جلدی ہو سکے حلقۂ اسلام میں داخل ہو کر زندگی کو نئے ڈھب پر ڈھالے اور گزشتہ گناہوں

کی تلافی کرے اور جلد سے جلد باقاعدہ اسلام قبول کر کے باقی زندگی اسلام کی تبلیغ و تعلیم میں گزارے۔ چنانچہ ایک روز جمعہ کے دن جب قلعہ کی مسجد میں اذان ہوئی تو میجر میسی نہا دھو کر مسجد میں جا پہنچا۔ امام صاحب نے ابھی خطبہ شروع نہیں کیا تھا۔ نمازی مسجد میں جمع ہو رہے تھے۔ وہ سیدھا پہلی صف میں جا پہنچا اور امام صاحب سے بڑے مؤدبانہ اور نیازمندانہ لہجہ میں التجا کی کہ آپ مجھے حلقۂ اسلام میں داخل کر لیں اور کہا کہ مجھے یقین ہو چکا ہے کہ اسلام ہی ایک سچا دین ہے اور قرآن مجید واحد الہامی کتاب ہے جس میں چودہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ایک زیر یا زبر کی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ اسلام واقعی مکمل ضابطۂ حیات ہے۔

امام صاحب اور باقی سب حاضرین برٹش یونٹ کے ایک برٹش میجر کی زبان سے یہ الفاظ سن کر دنگ رہ گئے۔ شاید امام صاحب ایسے خدشات میں مستغرق تھے کہ ایسا کرنے سے ان کا انجام کیا ہوگا۔ غرضیکہ کچھ دیر کھڑے کھڑے میجر میسی کی صورت تکتے رہے۔ اتنے میں حاضرین نے زبردست مطالبہ کیا کہ امام صاحب جلد کریں۔ نماز کا وقت ہو رہا ہے۔ خطبہ سے پہلے یہ کارِ خیر سرانجام دیں۔ میجر صاحب کو کلمۂ طیبہ پڑھائیں اور مشرف بہ اسلام کر دیں۔ سب نے متفقہ طور پر امام صاحب کو یقین دلایا کہ اگر افسروں کی طرف سے خدانخواستہ ان پر کوئی مصیبت آئی تو تمام مسلمان فوج ان کا ساتھ دے گی اور تمام مسلمان فوجی حکمرانوں کے خلاف کھلی بغاوت کر دیں گے کیونکہ یہ ہر مسلمان کا دینی فرض ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم اسلام قبول کرنے کا خواہاں ہو تو کسی کی پروا کئے بغیر اس کو حلقۂ اسلام میں داخل کرے۔ لہذا امام صاحب نے میجر میسی کو کلمہ پڑھایا اور اسلام کے رکن سنائے۔ اس طرح اس کو دائرہ اسلام میں داخل کیا گیا اور اس کا نام عبدالرحمٰن رکھا گیا۔ مسجد سے نعرۂ تکبیر بلند ہوا۔ خوشی سے سب نے میجر میسی کے ہاتھ چومے۔ باری باری ہر ایک نے گلے لگایا اور ہدیۂ تبریک پیش کیا۔

یہ خبر قلعہ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ جب یہ خبر برٹش کیمپ میں پہنچی تو یونٹ کمانڈر نے فوراً یونٹ بگلر کو حکم دیا کہ آفیسر کال بجائی جائے۔ برٹش یونٹ کے علاوہ سارا قلعہ فالن ہو گیا۔ میجر میسی کو سب کے سامنے کھڑا کیا گیا۔ اس کی

پیٹی (BELT) اور بیجز آف رینک اتار دیئے گئے اور کرنل کے حکم سے اُسے حراست میں لے کر اپنے بنگلہ میں نظر بند کر دیا گیا اور ایک دوسرا سینئر میجر اس پر تعینات کر دیا گیا اور فوراً رپورٹ آرمی ہیڈ کوارٹرز دہلی کو بھیجی گئی۔ دوسرے ہی روز دہلی سے ایک بریگیڈیئر اور ایک کرنل وہاں پہنچے اور میجر میسی کا کورٹ مارشل ہوا جس کے نتیجے میں اس کو "بارہ پتھر" کی سزا دی گئی۔ یعنی میجر میسی کو ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا' اس کا تمام سامان بحقِ سرکار ضبط کیا گیا' بینک بیلنس منجمد کر دیا گیا اور گارڈ کی سپردگی میں اسے راولپنڈی سے لاہور کا ٹکٹ دے کر روانہ کر دیا گیا۔ اتفاقاً اس کی جیب میں صرف تین چار سو روپے تھے اور تن پر تین کپڑے اور بس۔ کسمپرسی کی حالت میں لاہور پہنچا۔ اسٹیشن سے باہر نکلا' کچھ نہیں جانتا تھا کہ کہاں جائے۔ یہاں اس کا کوئی شناسا نہ تھا۔ اسٹیشن کے نزدیک ہر کز ا ہوٹل پہنچا اور چھوٹا سا کمرہ بک کرالیا۔ کئی روز تک تو کمرے کے اندر ہی رہا۔ کھانا بھی کمرے میں کھاتا تھا۔ جب تنہائی سے گھبرا گیا تو کھانے کے وقت ڈائننگ ہال میں جاتا اور دور ایک کونے کی میز پر اکیلا بیٹھتا اور کھانا کھا کر واپس کمرے میں آجاتا۔ اس کو اگر کسی بات کا افسوس تھا تو صرف یہ کہ اس کی تمام کتابیں بھی ضبط کر لی گئی تھیں۔ اخبار پڑھنے کے سوا اور کوئی شغل نہ تھا۔

ایک روز ڈائننگ ہال میں تقریب تھی اور بڑی تعداد میں لوگ جمع تھے۔ خوب رونق تھی لیکن میجر میسی خاموش ایک کونے میں بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ سب کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ مگر وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے خیالات میں گم تھا۔ جب تقریب ختم ہوئی تو ایک شریف آدمی اس کے پاس پہنچا اور معذرت کر کے دریافت کیا کہ آپ کون ہیں؟ کس ملک سے آپ کا تعلق ہے؟ اور کھوئے کھوئے کیوں رہتے ہیں؟ کیا وہ اس کی کوئی خدمت کر سکتا ہے؟ میجر میسی نے نہایت خندہ پیشانی سے اس کو اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ اس کی اتنی مدد کریں کہ کسی اسلامی ادارے سے اس کا تعارف کرادیں تاکہ وہ اسلام کے متعلق پوری معلومات حاصل کر سکے۔ اس شخص نے وعدہ کیا کہ دوسرے روز وہ اس کو ساتھ لے جا کر لاہور میں بہترین اسلامی ادارہ سے روشناس کرائے گا۔ دوسرے روز وقتِ مقررہ پر وہ آدمی میجر میسی کو انجمن اشاعتِ اسلام کے دفتر لے گیا۔ یہ جماعت احمدیہ کی لاہوری

پارٹی کا دفتر تھا۔ وہاں جماعت کے سربراہ نے وعدہ کیا کہ وہ اس کے لئے کسی معقول تنخواہ والی ملازمت کا انتظام کر دے گا۔ میجر ہر روز اس کے دفتر جاتا اور لائبریری میں کتب کا مطالعہ کرتا۔ وہ بڑا خوش تھا کہ اللہ نے اسے ایک تبلیغی ادارے سے منسلک کر دیا ہے۔ ایک روز لائبریری میں بیٹھا ایک رسالہ پڑھ رہا تھا۔ اس رسالہ میں مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کا ذکر تھا اور مرزا کی پیشین گوئیوں پر بحث کی گئی تھی۔ میجر میسی کو اس عبارت کے پڑھنے سے بڑی حیرانی ہوئی کہ جو کچھ اب تک اس نے اسلامی کتابوں میں پڑھا تھا اور جو کچھ اس کو بتایا گیا تھا وہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق یہ بات تھی کہ ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ آپ آخری نبی ہیں اور قرآنِ مجید آخری الہامی کتاب ہے، لیکن غلام احمد اس بات کی صاف نفی کرتا ہے۔ میجر نے بار بار اس تحریر کو پڑھا۔ یہ بات میجر میسی کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ وہ وہی رسالہ لے کر لائبریری کے انچارج کے پاس پہنچا اور اس سے وضاحت چاہی مگر وہ اس کو مطمئن نہ کر سکا۔ دوسرے روز جمعہ تھا۔ میجر میسی ان کی مسجد میں گیا اور نماز کے بعد اس نے امام مسجد سے اس مسئلہ کی وضاحت چاہی مگر امام مسجد کی باتوں سے مطمئن ہونے کی بجائے اس کے دل میں مزید شکوک پیدا ہو گئے۔

قادیانی علما اس کو مرزا غلام احمد کی نبوت کا قائل نہ کر سکے۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی دوسرے عالم سے اس بارے میں گفتگو کرے لیکن وہ کسی کو نہ جانتا تھا کیونکہ ان چند دنوں میں اس کو صرف قادیانیوں ہی سے واسطہ پڑا تھا۔ اتفاق سے لاہور سے نکلنے والے ایک اخبار ''ایسٹرن ٹائمز'' میں اس نے علامہ عبداللہ یوسف علی کا ایک مضمون پڑھا جو ان دنوں اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) لاہور کے پرنسپل تھے۔ میجر میسی نے علامہ عبداللہ یوسف علی کے انگریزی ترجمۂ قرآن کے چند پارے پڑھے تھے۔ ان کے نام سے واقف تھا۔ لہذا اسی دن سیدھا اسلامیہ کالج پہنچا اور علامہ سے انٹرویو کے لئے وقت مانگا۔ علامہ نے فوراً اس کو اندر بلا لیا۔ میجر میسی نے اپنی پوری داستان سنائی اور مرزا غلام احمد قادیانی کے متعلق دریافت کیا۔ علامہ نے اس کو ساری بات سمجھائی، تسلی دی اور کہا کہ تمہاری پریشانی بجا ہے۔ علامہ اسی روز چند دنوں کے لئے بمبئی جا رہے تھے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ واپسی پر وہ اس کی تشفی کر دیں گے۔ فی الحال اس کا تعارف علما سے کرا دیا تا کہ اس کو اسلام کی صحیح تعلیم دیں۔

کچھ دنوں بعد علامہ واپس لاہور پہنچے اور میجر میسی سے دریافت کیا کہ آیا علما نے اس کی تسلی کرا دی ہے اور معلوم ہو گیا ہو گا کہ قادیانی فرقہ نے مذہب اسلام میں ایک فتنہ پیدا کیا ہے۔ علامہ صاحب نے جو خود بھی عربی زبان میں عبور رکھتے تھے اور قرآنِ مجید کا ترجمہ اور تفسیر لکھ رہے تھے' میجر میسی کو حقیقتِ حال سے آگاہ کیا۔ میجر میسی نے ان کی صحبت سے بڑا فائدہ اٹھایا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا علمائے دین سے اس کی واقفیت کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ اب لاہور کے مسلم اشراف میں اس کو نمایاں حیثیت سے دیکھا جانے لگا۔ اتنے عرصے میں اس کے پاس جتنے روپے تھے' وہ سب خرچ ہو چکے تھے۔ اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ کسی سے اس مسئلے پر بات کرے۔ آئندہ کے لئے اس کو فکر لاحق ہوئی۔ ایک روز مجبوراً علامہ یوسف علی کو اپنی پریشانی کے متعلق بتایا کہ وہ چاہتا ہے کہ اس کو کوئی روزگار مل جائے جس سے وہ اپنے اخراجات پورا کر سکے۔ وہ کسی فرد یا ادارے پر بوجھ نہیں بننا چاہتا لہذا علامہ صاحب نے دوسرے ہی دن انجمن حمایت اسلام کے ان وقت کے صدر سر عبدالقادر سے اس کا ذکر کیا اور اس بارے میں پوری کوشش اور مدد کا وعدہ کیا۔ شیخ صاحب کے دماغ میں ایک منصوبہ آیا کہ اسی سال ماہِ دسمبر کے آخری ہفتے میں ''انجمن حمایتِ اسلام'' کا سالانہ جلسہ منعقد ہونے والا ہے اور جلسے کی صدارت کے لئے ہز ہائی نس سر صادق محمد خاں عباسی خامس فرمانروا ریاست بہاولپور کو مدعو کیا گیا ہے۔ اس موقع پر میسی کا نواب صاحب سے تعارف کرایا جائے اور ان سے درخواست کی جائے کہ وہ اس نومسلم کی امداد کریں۔ یقین تھا کہ نواب صاحب ضرور اس بارے میں کوئی مناسب انتظام کر دیں گے۔

۲۶ دسمبر ۱۹۳۰ء کو انجمن کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا جس میں تمام برصغیر سے نامور دانشور' علمائے دین اور اکابرِ ملت نے شمولیت کی۔ شروع سے ہی یہ طریقہ رائج تھا کہ ہر سال کسی مشہور نومسلم کو مدعو کیا جاتا کہ وہ حلقۂ اسلام میں داخل ہونے کی وجہ بیان کرے اور دینِ اسلام کے فلسفہ پر روشنی ڈالے۔ چنانچہ اس مرتبہ میجر میسی نے اپنی داستان سنائی کہ کس طرح ایک سپاہی کے جذبۂ ایمانی نے اس کی دنیا بدل دی۔ اس کی اس سرگزشت نے صدرِ جلسہ نواب صاحب پر بڑا اثر ڈالا۔ تقریر کے بعد نواب صاحب نے اس کو گلے لگا لیا اور مبارکباد دی۔ اس کی جرأت اور اسلام کی خاطر اتنی قربانی دینے پر داد دی۔ نیز ان

دنوں اسلامیہ کالج میں بی اے کا طالب علم تھا جو کچھ میجر میسی کے متعلق اوپر بیان کیا گیا ہے یہ باتیں میں نے خود میجر میسی کی زبانی سنیں اور میری خوش قسمتی تھی کہ تین سال کے بعد جنوری ۱۹۳۴ء میں جب مجھے بہاولپور سٹیٹ سروسز میں کمیشن ملا اور میری تعیناتی فسٹ بہاولپور انفنٹری میں بہ عہدہ سیکنڈ لیفٹننٹ ہوئی تو یہی میجر میسی جواب کرنل کے عہدہ پر فائز تھے' اب اس بٹالین کے کمانڈنگ آفیسر تھے۔ یہ راقم کی خوش قسمتی تھی کہ ایسے محبِ اسلام کمانڈر کے ماتحت ملازمت کا موقع ملا۔

انجمن کا جلسہ ختم ہوا تو اسی رات انجمن حمایتِ اسلام کے صدر شیخ عبدالقادر نے نواب بہاولپور کے اعزاز میں اپنی کوٹھی واقع ٹمپل روڈ (موجودہ حمید نظامی روڈ) پر دعوت دی جس میں پنجاب بھر کے تمام سرکردہ مسلمان رہنما شامل تھے۔ میجر میسی کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ کھانے کے خاتمہ پر سر عبدالقادر نے باری باری تمام حاضرین کا نواب صاحب سے تعارف کرایا۔ سب سے آخر میں میجر میسی کو بلایا گیا تو نواب صاحب نے اس سے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور اپنے ساتھ صوفہ پر بٹھایا۔ شیخ عبدالقادر نے یہ موقع غنیمت جانا اور نواب صاحب سے التجا کی کہ میجر میسی کے ذریعۂ معاش کا اگر ریاست انتظام کر سکے تو یہ بڑی خوشی کی بات ہوگی کیونکہ اس طرح وہ اسلامی ریاست کے اس اسلامی معاشرے میں رہ کر اسلام کی اصلی روح پہچانے گا اور ساتھ ہی وہ کسی کا دستِ نگر نہ ہوگا اور خودداری سے زندگی بسر کر سکے گا۔ یہ سنتے ہی نواب صاحب بڑے خوش ہوئے اور میجر میسی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میجر صاحب! کیا آپ دوبارہ فوجی زندگی اختیار کرنا پسند کریں گے کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ حکومتِ ہند کی طرف سے جو سٹیٹ فورسز کی نئی پالیسی نافذ کی گئی ہے کہ ریاستی افواج کو تین حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ پہلا حصہ امپیریل ٹروپس جو ٹریننگ اور انتظامی طور پر انڈین آرمی کا حصہ ہوگا۔ البتہ اس کے اخراجات ریاست برداشت کرے گی' لیکن بوقت ضرورت حکومتِ ہند اس فورس کو ریاست سے باہر جہاں ضرورت ہوگی تعینات کر سکے گی۔ دوسرا حصہ ریاست کے اندرونی نظم ونسق کے لئے اور تیسرا حصہ ریاست کے حکمران کا حفاظتی دستہ۔ تشکیلِ نو کے بعد وہ چاہتے ہیں کہ ان کو میجر کے عہدہ سے ترقی دے کر لیفٹننٹ کرنل بنائیں اور فسٹ بہاولپور انفنٹری کی کمان ان کو

سونپ دیں۔نواب صاحب کی یہ بات سن کر میجر میسی بڑے خوش ہوئے اور کہنے لگے زہے قسمت کہ ان کو اسلامی ریاست کی فوج کی قیادت نصیب ہو لیکن اس بارے میں اتنا عرض ہے کہ ان کی تعیناتی سے حکومت ہند کا پولیٹکل محکمہ ناراض نہ ہو جائے اور اس کی وجہ سے کوئی نقصان نہ پہنچے۔نواب صاحب نے مسکرا کر جواب دیا کہ وہ اس بات کو سمجھتے ہیں لیکن یہ ان کی اپنی ذمہ داری ہے۔اس بات کا وہ خود خاطر خواہ انتظام کریں گے۔انشاء اللہ تعالیٰ آپ کی ذات پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔میجر میسی نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا تو نواب صاحب نے فوراً اپنے ملٹری سکرٹری کو مخاطب کر کے کہا کہ بہاولپور پہنچ کر وزیر افواج اور جنرل آفیسر کمانڈنگ کی طرف سے میجر میسی کو بہاولپور سٹیٹ فورسز میں بہ عہدہ لیفٹننٹ کرنل کی تعیناتی کے احکام جاری کرائے جائیں۔

ابھی چار ہی روز گزرے تھے کہ میجر میسی کو شیخ عبدالقادر کی معرفت آرمی منسٹر بہاولپور کے دفتر سے چٹھی ملی جس میں اس کی تعیناتی کے علاوہ میجر کے رینک سے لیفٹننٹ کرنل کے عہدہ پر ترقی کا حکم تھا اور یہ کہ وہ جلد از جلد ڈیرہ نواب صاحب' جہاں بہاولپور سٹیٹ فورسز کا ہیڈکوارٹر تھا' پہنچ کر عہدے کا چارج سنبھالیں۔میجر میسی دوسرے ہی روز لاہور سے روانہ ہو کر ڈیرہ نواب صاحب (یہ جگہ بہاولپور سے ۴۵ میل کے فاصلہ پر واقع ہے) پہنچا۔اسٹیشن پر نواب صاحب کا اے ڈی سی استقبال کے لئے موجود تھا۔وہ اس کو ہمراہ لے کر سیدھا شاہی مہمان خانہ پہنچا اور تھوڑی دیر کے بعد آرمی منسٹر اور جنرل آفیسر کمانڈنگ کے ہیڈکوارٹر جا کر حاضری کی رپورٹ دی۔ابتدا میں اسے شاہی مہمان خانہ میں ٹھہرایا گیا اس کے بعد ایک بنگلہ میں جو پوری طرح آراستہ تھا' منتقل کیا گیا۔چارج سنبھالنے سے پہلے آرمی منسٹر میجر میسی کو اپنے ہمراہ شاہی محل صادق گڑھ پیلس لے گیا۔نواب صاحب کے حکم کے مطابق نواب صاحب سے ہر ملاقاتی کے لئے ضروری تھا کہ محل کے مین گیٹ پر سر پر ترکی ٹوپی پہنے۔دہاں درجنوں ترکی ٹوپیاں مختلف سائز کی موجود تھیں۔

نواب صاحب کی ملاقات کے لئے اس لباس کا ہونا ضروری تھا۔ماسوائے والیانِ ریاست' وائسرائے ہند' گورنر اور کمانڈر انچیف باقی کوئی شخص ترکی ٹوپی پہنے بغیر گیٹ کے اندر نہیں جا سکتا تھا۔انگریز ہو یا ہندو ان کو ملاقات کے وقت سرخ ترکی ٹوپی پہننی ضروری

تھی۔ میجر میسی نے ترکی ٹوپی پہنی جب شیشہ دیکھا تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ پہلے وہ باطنی طور پر مسلمان تھا لیکن اسلامی لباس پہننے سے اب ظاہری طور پر بھی مسلمان معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ میجر میسی کو ملاقات کا طریقہ بھی سمجھا دیا گیا تھا کہ ہر ملاقاتی اپنے منصب اور عہدہ کے مطابق نواب صاحب کو نذرانہ پیش کرتا ہے۔ چنانچہ اس نے سونے کی دو اشرفیاں نچھاور کیں۔ نواب صاحب نے گلے لگایا اور اس کے بعد اس کے کندھے پر ایک اور اسٹار لگا کر میجر سے لیفٹننٹ کرنل بنا دیا اور ایک سنہری دستے کی تلوار عنایت کی۔

ایک سال کے قلیل عرصہ میں کرنل میسی نے یونٹ کی تربیت اور نظم ونسق کا معیار انڈین آرمی تک پہنچا دیا۔ دوسرے سال جب جنرل ہیڈ کوارٹر دہلی سے انڈین سٹیٹ سروسز کا ملٹری ایڈوائزر انچیف سالانہ معائنہ کے لئے آیا تو اس نے نواب صاحب کو مبارک باد دی اور کہا کہ آپ کی فورسز کا معیار ہندوستان کی تمام ریاستی افواج سے اعلیٰ ہے اور انڈین آرمی کی کسی یونٹ سے کسی طرح کم نہیں۔

نواب صاحب نے کچھ عرصہ بعد کرنل میسی کی شادی کا بندوبست کروایا اور ایک معزز خاندان کی بیوہ خاتون سے اس کا نکاح کرا دیا تاکہ اسے خانگی زندگی کا آرام میسر ہو۔ راقم کو فروری ۱۹۳۴ء میں بہاولپور سٹیٹ فورسز میں کمیشن مل گیا اور سیکنڈ لیفٹننٹ کے عہدہ پر تعینات کر کے فرسٹ بہاولپور انفنٹری میں کمپنی آفیسر مقرر کیا گیا۔ کرنل میسی نئے کمیشن یافتہ نوجوان افسروں سے بڑی مہربانی سے پیش آتے اور ان کی تربیت میں خاص دلچسپی لیتے تھے۔ اس کے علاوہ مجھے جو بنگلہ الاٹ کیا گیا وہ کرنل میسی کے بنگلہ سے ملحق تھا۔ اکثر شام کو جب کرنل آرمی میس میں جاتے تو مجھے اپنی کار میں ہمراہ لے جاتے اور کھانے کے بعد جب واپس بنگلہ پہنچتے تو کافی دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں کرتے اور راقم سے اردو الفاظ کا تلفظ درست کراتے۔

جون ۱۹۳۴ء میں کرنل میسی چند روز بیمار رہنے کے بعد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کو پورے فوجی اعزاز اور اسلامی طریقہ پر دفنایا گیا۔ ان کی قبر ڈیرہ نواب صاحب سے احمد پور اور بہاولپور جانے والی سڑکوں کے درمیان بالکل سڑک کے کنارے واقع ہے۔ جب تک نواب صاحب سر صادق محمد خاں زندہ رہے، وہ یہاں گزرتے ہوئے ہمیشہ کار سے

اتر کر فاتحہ پڑھا کرتے تھے اور ان کی زندگی میں حساکر بہاولپور کے لئے یہ حکم تھا کہ یہاں سے گزرتے ہوئے سلامی دے کر گزرا کریں۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

(بشکریہ مصنف و اخبار)

●......●......●

الشیخ عبدالواحد یحییٰ

(فرانس)

عالم، فلسفی، مصنف، دانشور، متکلم اور صوفی عبدالواحد یحییٰ کا اصل نام رینے گینوں تھا۔ وہ ۱۵ نومبر ۱۸۸۶ء کو فرانس کے ایک خوش حال کیتھولک گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک معزز انجینئر تھے اس لئے ان کا بچپن مطمئن و مسرور گزرا۔ تعلیم کا آغاز آبائی شہر بلوا (BLOIS) سے کیا جو پیرس سے ۱۷۲ کلومیٹر کے فاصلے پر دریائے لوار کے کنارے واقع ہے۔ طفولیت ہی سے ان میں غیر معمولی ذہانت کی علامات نمایاں تھیں اور وہ اپنے ساتھیوں میں ہمیشہ ممتاز و فائق رہے۔ چنانچہ ۱۹۰۴ء میں انہوں نے بیچلر کی ڈگری امتیازی اسناد کے ساتھ حاصل کی۔ اسی برس وہ پیرس یونیورسٹی چلے گئے جہاں دو سال تک ریاضی کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔

پیرس میں رینے گینوں نے اپنی سرگرمیاں محض نصابی تعلیم تک محدود نہ رکھیں بلکہ حقیقتِ ازلی تک پہنچنے کی تگ ودو شروع کر دی۔ وہ اپنے آبائی مذہب عیسائیت سے مطمئن نہ تھے اور ان کی زبردست ذہانت اسے قبول کرنے پر تیار نہ تھی۔ اس کے لئے انہوں نے دنیا بھر کے مذاہب کا دقتِ نظر سے مطالعہ ہی نہیں کیا بلکہ مختلف مفکرین اور دانشوروں سے بالمشافہ گفتگوئیں بھی کرتے رہے مگر ان کی تشفی نہ ہوئی۔ اس ذہنی کشمکش اور روحانی سفر میں ان کی تعلیم بھی ادھوری رہ گئی اور انہوں نے یونیورسٹی کو خیرباد کہہ دیا۔ یہ کیفیت ۱۹۰۹ء تک جاری رہی۔ اسی دور میں ان کا تعارف دو ایسے اصحاب سے ہوا جو نومسلم تھے اور اسلام کے علاوہ دیگر علوم عمرانیات میں بھی دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ ان میں شیخ عبدالحق فرانسیسی نژاد تھے جن کا پرانا نام شمپرینو تھا۔ وہ معروف عالم تھے اور ایک رسالہ "الطریق" نکالا کرتے تھے جو

اب بند ہو چکا تھا۔ دوسرے صاحب فن لینڈ کے عبدالہادی تھے جن کا مسیحی نام آئیوان گستاف تھا۔ قبول اسلام کے بعد انہوں نے عربی زبان سیکھی اور اس میں استادانہ عبور حاصل کیا۔ قاہرہ کے مجلہ "انصاری" میں ان کے مقالات چھپا کرتے تھے۔

۱۹۰۹ء میں رینے گینوں نے "المعرفت" کے نام سے ایک رسالے کا اجرا کیا۔ دونوں متذکرہ نومسلم علما نے ان سے بھرپور تعاون کیا۔ اس رسالے میں عیسائیت' ہندو مت' بدھ مت' اور اسلام سے متعلق مباحث شائع ہوتے تھے اور اوّل الذکر تینوں مذاہب پر بھرپور تنقید بھی ہوتی تھی۔ یہ رسالہ ۱۹۱۲ء تک جاری رہا۔ اسی سال رینے گینوں مسلمان ہو گئے اور عبدالواحد یحییٰ کا نام اختیار کیا۔

شیخ عبدالواحد یحییٰ کے قبول اسلام میں اگرچہ ان کی ذاتی تلاش و جستجو' بے پناہ سلامتِ طبع اور شیخ عبدالحق اور شیخ عبدالہادی جیسے علما کا بھی عمل دخل تھا لیکن دراصل وہ شیخ عبدالرحمٰن عیش سے متاثر ہو کر حلقۂ بگوشِ اسلام ہوئے۔ شیخ عیش ازہر (مصر) میں فقہ مالکی کے مفتی اعظم تھے اور صاحب طریقت و شریعت بزرگ تھے۔ وہ صاحب عزیمت عالم تھے اور اس راہ میں قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیل چکے تھے۔ بعد میں انہیں جلاوطن کر کے روڈس بھیج دیا گیا مگر عمر کے آخری دنوں میں انہیں مصر آنے کی اجازت مل گئی تھی۔

نومسلم عبدالہادی شیخ عبدالرحمان عیش سے براہ راست تعلقات رکھتے تھے۔ انہوں نے رینے گینوں کو ثانی الذکر سے متعارف کرایا اور رینے گینوں ان سے اتنے متاثر ہوئے کہ طویل تحقیق و مطالعہ کے بعد بالآخر انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔

پیرس کے ایک اشاعتی ادارے نے شیخ عبدالوحد کو پیش کش کی کہ وہ اس کے خرچ پر قاہرہ جائیں وہاں تصوف کا مطالعہ کریں اور صوفیا کی تصانیف اور ان کے تراجم ارسال کریں۔ چنانچہ فروری ۱۹۰۹ء میں شیخ قاہرہ آ گئے۔ وہ آئے تو عارضی قیام کے لئے تھے مگر حالات ایسے پیدا ہوئے کہ انہوں نے یہاں مستقلاً قیام کر لیا۔ ان کا مکان محلہ ازہر میں تھا۔

قاہرہ آنے سے پہلے ہی شیخ عبدالواحد یحییٰ کے والد' والدہ اور اہلیہ وفات پا چکے تھے۔ یہاں تن تنہا زندگی مشکل ہوئی تو ۱۹۳۷ء میں انہوں نے ایک خاتون کریمہ بنت شیخ ابراہیم سے نکاح کر لیا۔ اس نیک بی بی نے ان کی زندگی سکون اور اطمینان سے بھر دی۔

ان کی اولاد دو بچے اور دو بچیاں تھیں۔

قاہرہ میں شیخ موصوف نے بہت خاموش زندگی گزاری۔ لوگوں سے بہت کم ملتے جلتے تھے اور چند اصحاب ہی جانتے تھے کہ شہرہ آفاق مصنف رینے گینوں قاہرہ کے کس محلے میں رہتا ہے۔ دراصل وہ ان لوگوں سے بہت کتراتے تھے جو ان کا وقت ضائع کرتے اور سوائے شخصی باتوں اور ذاتی احوال کے کوئی بات ہی نہیں کرتے تھے۔ البتہ جب وہ دیکھتے کہ ملنے والا طلبِ صادق اور علمی ذوق رکھتا ہے تو وہ نہایت خوش دلی سے اسے قریب بٹھاتے اور باتیں کرتے تھے۔

شیخ نہایت وجیہہ و شکیل اور بارعب شخصیت کے حامل تھے۔ طویل قامت، پُر نور اور مرعوب کن چہرہ، پُر جلال و پُر وقار اور ذہانت سے بھرپور آنکھیں اور صلح و تقویٰ کی شہادت دیتا ہوا سراپا۔ جو بھی ایک مرتبہ ان سے ملتا متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ ان کی تحریروں اور شخصیت کے اثر سے یورپ کے بہت سے اہلِ کمال نے اسلام قبول کر لیا۔ ان لوگوں میں سرِ فہرست شیخ عیسیٰ نور الدین ہیں جنھیں مشرق میں فلسفے کے استاد کے نام سے جانتے ہیں۔ موصوف سلسلہ شاذلیہ مالکیہ میں صاحبِ اجازت ہیں۔ تقابلِ ادیان اور فلسفۂ دین پر ان کو یورپ میں سند مانا جاتا ہے۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔

دوسرے صاحب ابوبکر سراج ہیں۔ ان کا مسیحی نام مارٹن لنگز تھا۔ انگریزی اور عربی پر یکساں قادر ہیں۔ تصوف ان کا خاص موضوع ہے اور یورپ کی علمی دنیا میں سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ اعلیٰ پائے کے شاعر اور مترجم ہیں۔ پانچ چھ کتابوں کے مصنف ہیں۔

تیسرے صاحب مصطفیٰ عبدالعزیز (مائیکل یو آلسن) ہیں۔ ان کا چند ہی سال قبل انتقال ہوا ہے۔ یہ ایک ثقہ جریدے کے مدیر اور عالمِ دین تھے۔ ان کا مجلہ مغرب میں تصوف اور روایتی علوم کی توضیح و اشاعت کرنے والا معتبر ترین جریدہ تھا۔

اسی طرح FINTSBURCHARAT نے خصوصیت سے قدیم تہذیبوں کے تصورات و فن پر تحقیق کی ہے۔ صوفی تصورات پر ایک معرکۃ الآرا کتاب لکھی ہے۔ کیمیا پر لکھی جانے والی اس صدی میں سب سے اچھی کتاب کے مصنف بھی یہی صاحب ہیں۔ جرمن، انگریزی، فرانسیسی، سوِس، عربی اور فارسی پر عبور رکھتے ہیں۔ شیخِ اکبر ابنِ عربی کی

فصوص الحکم' الجیلی کی انسان کامل اور شیخ در قادی کی رقعات در قادیہ کا فرانسیسی اور انگریزی میں ترجمہ بھی کر چکے ہیں۔

ان کے علاوہ بہت سی شخصیات شیخ عبدالواحد یحییٰ سے متاثر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہوئیں۔ یہ سب لوگ اب اپنے اپنے شعبے میں اسلام کی اشاعت و تبلیغ کر رہے ہیں اور ان کے واسطے سے اسلام کا تعارف یورپ میں وسیع ہوتا جا رہا ہے۔

قبول اسلام کے بعد شیخ عبدالواحد نے اسلامی تصورات کی شرح اور مغرب کو ان سے روشناس کرانے کا بیڑہ اٹھایا۔ انہوں نے عمر بھر لکھا اور بہت کچھ لکھا۔ یوں بیشمار مقالات کے علاوہ ان کی مستقل تصانیف کی تعداد دو درجن سے زائد ہے۔ ان میں سے EAST AND WEST ان کی وہ زبردست تصنیف ہے جو دائمی اہمیت و حیثیت کی حامل ہے۔ اس میں انہوں نے مشرقی فکر اور تہذیب کی مغربی فکر و تہذیب پر برتری ثابت کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ مغربی تہذیب کی بنیاد ظلم و عدوان اور مادی استحصال پر رکھی گئی ہے اس لئے خونریزی اور مادہ پرستی اس کی سرشت میں شامل ہے' اسی لئے وہ مشرق کی انسانیت نوازی کا اندازہ نہیں کر سکتی۔ کتاب کے ہر صفحے سے تہذیبِ مشرق اور انسانی رفعت کی شہادت ملتی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے مغرب کے تین خداؤں یعنی ''ترقی'' ''تہذیب'' اور ''سائنس'' کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ ان کے بودے پن کو واضح کیا ہے اور پس منظر میں کارفرما اغراض و مقاصد کی جھلک دکھائی ہے۔ انہوں نے برملا لکھا ہے کہ اگر مغرب کی مادی قوت کو نظر انداز کر دیا جائے تو اس کی حیثیت ایشیا اور افریقہ کے مقابلے میں جسدِ ارضی پر ایک بے وقعت مردار گوشت کی رہ جاتی ہے اور تاریخ میں مغرب کی حیثیت ہمیشہ وہی رہی ہے جو تنے کے سامنے غلط رخ میں بڑھی ہوئی شاخ کی ہوتی ہے۔

ان کی دوسری اہم ترین کتاب ''جدید دنیا کا المیہ'' ہے۔ اس میں انہوں نے تاریخ کے قدیم اور روایتی تصور کے حوالے سے انسانی تاریخ میں تہذیب مغرب کا مقام متعین کیا ہے۔ ساتھ ہی اس مہلک راہِ انحراف کی نشاندہی بھی کی ہے' جس پر مغرب گامزن ہے' جو کھلی گمراہی ہے اور جس نے مغرب کو سیدھی راہ دیکھنے سے اندھا بنا رکھا ہے۔

REIGN OF QUANTITY میں انہوں نے مغربی سائنس کے خالصتا

مقداری اور نتیجتاً مادی مزاج کا محاکمہ کیا ہے۔ یعنی مغربی تہذیب کے اس غالب رجحان پر تنقید کی ہے جس کے تحت ہر معیار اور اصول کو فقط مقدار اور تعداد تک محدود رکھا جاتا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے مغربی سائنس اور صنعت کے مختلف ہولناک پہلوؤں پر خاص تبصرہ کیا ہے۔ آخر میں تحلیلِ نفسی ANALYSIS PSYCO اور اس کے نظریات وخطرات پر بھی تنقید کی ہے جبکہ خامیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔

۷۔ جنوری ۱۹۵۱ء کو ۶۵ برس کی عمر میں شیخ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ مصر اور یورپ کے ثقہ علمی حلقوں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ لیکن جہاں بہت سے لوگوں نے انہیں جی بھر کر خراجِ تحسین پیش کیا، وہاں ان کے دشمنوں کی تعداد بھی کم نہ تھی۔ فری میسری، متعصب عیسائیوں اور مادی تہذیب کے علمبرداروں کے خلاف شیخ نے کسی رورعایت کے بغیر بے رحمی سے تنقید کی تھی۔ ان سب نے ان کے خلاف لکھا۔ اس طرح ان کے حامیوں اور مخالفوں کے درمیان ایک مباحثہ چل نکلا، جس کا فائدہ یہ ہوا کہ بہت سے لوگ ان کی تصانیف کی طرف مائل ہوئے۔ ان کی اصلاح ہوئی۔ اسلام کے بارے میں عیسائی مصنفین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیاں بھی دور ہوئیں اور یورپ کے سنجیدہ طبقے میں متعدد افراد نے اسلام قبول کر لیا۔ کلیسا کی ممانعت کے باوجود ان کی تصانیف پورے یورپ میں پھیل گئیں۔ مغرب کی بہت سی زبانوں میں ان کے تراجم ہوئے اور بے شمار لوگ ان سے متأثر ہو رہے ہیں۔

شیخ عبدالوحد یحییٰ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے عبدالحلیم محمود مرحوم رئیس الجامعہ از ہر نے کہا تھا:

"رینے گینوں ان شخصیات میں سے ہیں جنہوں نے تاریخ میں ایک مقام پیدا کیا ہے۔ مسلمان انہیں امام غزالی جیسے لوگوں کا ہمسر گردانتے ہیں" اور ریڈیو پاکستان کے ایک انٹرویو میں مشہور ماہرِ اقبالیات اور جرمن مستشرق ڈاکٹر این میری شمل نے شیخ موصوف کے قول وفعل کی یکسانیت اور طرزِ حیات کی پاکیزگی اور للّٰہیت کا اعتراف کیا۔

(یہ مضمون محمد سہیل عمر صاحب کے دو مضامین مطبوعہ جریدہ "معاصر" لاہور شمارہ اول کی مدد سے مرتب کیا گیا ہے)

(بشکریہ مصنف و مدیر)

●......●......●

ڈاکٹر عمر عبدالعزیز

(جرمنی)

ڈاکٹر عمر عبدالعزیز جرمن نومسلم ہیں۔ اصل نام ڈاکٹر شور کا ہے۔ آبائی وطن پولینڈ ہے جہاں سے انہیں اسلام قبول کرنے کے بعد نکلنا پڑا اور وہ نقلِ مکانی کر کے جرمنی چلے گئے۔ وہاں ان کا تعارف ایک عالمہ فاضلہ خاتون سے ہوا جو ان کے کردار اور گفتگوؤں سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئی اور زندگی بھر کی ساتھی بن گئی۔ یہ خاتون فاطمہ ہیرین ہیں جنہوں نے رسالہ "دینیات" اور دیگر دینی کتب کا جرمن میں ترجمہ کیا ہے۔ (موصوفہ محترمہ کا تذکرہ بھی اس کتاب میں شامل ہے)

ڈاکٹر عمر عبدالعزیز نے پراگ یونیورسٹی سے عربی میں پی ایچ ڈی کیا۔ عربی زبان کے مطالعے نے ان کا دل اسلام کے لئے کھول دیا اور اللہ کے خصوصی فضل اور ذاتی کاوش سے وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ ایمان کی حفاظت کی خاطر پہلے پولینڈ سے جرمنی گئے اور پھر اسلامی تہذیب و تمدن کی محبت کی خاطر انہوں نے اپنی شاندار ملازمت اور دیگر سہولتوں کو چھوڑا اور اہلیہ کے ساتھ ۱۹۶۳ء کے اوائل میں کراچی آ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا ہے اور یہاں ایک مثالی اسلامی معاشرے کی برکات جاری و ساری ہوں گی مگر افسوس کہ وہ یہاں کے سماجی حالات سے بہت بددل ہوئے اور تقریباً ڈھائی سال تک یہاں مقیم رہ کر واپس جرمنی چلے گئے۔ جرمنی میں دونوں میاں بیوی ہمہ تن خدمتِ دین میں مصروف ہیں۔ ذیل کا مضمون "چراغِ راہ" کراچی کے شمارہ مئی، جون ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تھا اور اسے مدیر رسالہ پروفیسر خورشید احمد نے مرتب کیا تھا۔

ڈاکٹر عمر سے میری ملاقات ان کی پاکستان میں آمد کے فوراً بعد ہی ہوئی۔ انہوں نے

یورپ ہی میں مولانا مودودی کی کتاب TOWARDS UNDERSTANDING ISLAM کا مطالعہ کر لیا تھا اور چونکہ اس کتاب کو انگریزی کا جامہ پہنانے کی سعادت مجھے حاصل ہوئی تھی اس لیے وہ مجھ سے بھی متعارف ہو گئے تھے۔ کراچی آتے ہی انھوں نے میرے بارے میں دریافت کیا اور ایک دوست کے توسط سے ہماری ملاقات ہوئی اور ملاقات بھی اس طرح کہ وہ خود ہی میرے گھر پر آ گئے۔ بس ایک فون آیا کہ ڈاکٹر شورکا آ رہے ہیں اور آدھ گھنٹے بعد وہ میرے سامنے تھے۔

انسان کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اس کا ذہن آنکھوں سے کچھ زیادہ ہی کام کرتا ہے۔ جسے نہیں بھی دیکھا اس کی خیالی تصویر بنا لیتا ہے۔ بہتیرے جرمنوں سے ملا ہوں۔ بہتوں کے فوٹو نگاہوں سے گزرے ہیں۔ مَیں نے بھی ڈاکٹر شورکا کی ایک تصویر بنالی تھی...... ڈاکٹر آف فلاسفی...... ضرور کوئی معمر سا آدمی ہو گا۔ سب نہیں تو آدھے بال تو سفید ہوں گے۔ بس عام سا لیکن جسامت میں عام لوگوں سے کچھ دبلا۔ ہو سکتا ہے کمر میں بھی ہلکا سا خم آ گیا ہو۔ چہرے پر سنجیدگی مگر آنکھوں میں ذہانت کی تیزی...... کچھ ایسی تصویر تھی جو اس نام سے میرے ذہن میں بنی تھی۔ لیکن اب جو شخص میرے سامنے تھا اسے دیکھ کر تو :

اعتبار دل و نگاہ گیا!

سرخ و سفید رنگ، دیو قامت، قوی ہیکل، چوڑا چکلا سینہ، لوہے کی طرح مضبوط جسم، چہرے پر چستی مگر آنکھوں میں ذہانت۔ پہلے مصافحہ ہی نے مجھے احساس دلا دیا کہ مَیں محض ایک ڈاکٹر آف فلاسفی سے نہیں ہٹلر کے جرمنی کے ایک رعنا جوان سے مل رہا ہوں جس کی عمر ۳۴ سال سے زیادہ نہیں ہے۔

یہ تھی ہماری پہلی ملاقات، اس میں استعجاب کا عنصر بس اتنا ہی تھا اور لطف یہ ہے کہ یہ استعجاب ہم دونوں کے لئے تھا۔ شورکا کا میرے بارے میں بھی یہی خیال تھا کہ وہ کسی معمر بزرگ سے ملنے جا رہے ہیں جو مولانا مودودی کے انگریزی مترجم ہیں۔ اب ہم دونوں کا استعجاب ختم ہو گیا اور اس کے بعد تو کیفیت یہ رہی کہ پہلی ہی ملاقات میں ہم ایک دوسرے کے دوست بن گئے اور خدا کا شکر ہے کہ ہم دونوں ہی کو ایک دوسرے کی دوستی و مفارقت بہت عزیز ہے۔

ڈاکٹر شورکا نے اپنی کہانی سنائی:

زمانۂ طالب علمی میں میرا رجحان عربی کی طرف ہو گیا اور میں نے طے کیا کہ اس زبان میں پی ایچ ڈی کروں گا۔ شوق بڑھتا گیا اور اس زبان' اس کے ادب' اس کی تہذیب سے میری دلچسپی بڑھتی گئی۔ اعرابی پاشا پر میں نے اپنا مقالہ لکھا۔ اس زمانے میں ایک بالکل نئی دنیا میرے سامنے کھل گئی۔ میرا ربط کسی مسلمان سے نہ تھا۔ مسلمانوں کا ادب ہی تعارف کا ذریعہ تھا جس سے دنیائے اسلام میرے سامنے وا ہوئی۔ یہ دنیا میری دنیا سے کتنی مختلف تھی۔ میرا دل اس کی طرف کھنچنے لگا۔ ایک نامعلوم مقناطیسی کشش تھی جو مجھے اس دنیا کی طرف لے جا رہی تھی۔ مطالعہ جاری تھا۔ غور و فکر کی راہیں کھلیں' اپنے ماحول' اپنے عقائد' اپنے ذہنی تصورات سے میری نفرت بڑھتی گئی اور اس نئی دنیا سے میرا ذہنی رشتہ جڑتا چلا گیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کون سی چیز تھی جس نے مجھے اپنا بنا لیا۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ نیم مدہوشی کے اس عالم سے جب میں جاگا تو میں نے اپنے کو مسلمان پایا اور میرے زبان و دل سے یہ کلمہ بلند ہوا۔

اشھد انّ لا الہ الا اللّٰہ و اشھد انّ محمد رسول اللّٰہ ○

ڈاکٹر شورکا اپنی کہانی سنا رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ خالص تعلیماتِ اسلام کے مقابلے میں مسلمانوں کے ذریعہ اس دینِ برحق تک آنے کی کوشش کرتے تو کیا واقعی اس منزل تک پہنچ جاتے؟

انسان کو اگر بڑی سے بڑی نعمت بھی بغیر محنت اور قربانی کے مل جائے تو اسے اس کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہو پاتا۔ ہم مسلمانوں کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ زمین اور آسمان کی سب سے بڑی اور سب سے قیمتی نعمت ہمیں شیرِ مادر کے ساتھ حاصل ہو گئی اور ہمیں اس کی عظمت کا پورا شعور بھی نہیں۔ لیکن ڈاکٹر شورکا نے ڈاکٹر عمر بنتے ہی اس بات کو محسوس کر لیا کہ وہ کتنی بڑی نعمت سے نوازے گئے ہیں۔ اس نے اپنی محنت سے اسلامی آداب و اخلاق سیکھنے شروع کئے اور ان پر ایک نئے دلولے کے ساتھ عمل شروع کیا۔

ابتداء میں اپنے اسلام کو خفیہ رکھا۔ لیکن پھر ضمیر نے سرزنش کی کہ جس دین کو اختیار کر لیا اسے پوشیدہ کیوں رکھتے ہو۔ تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی تو ایک ہی سال میں حکم ہو گیا تھا کہ اٹھو اور اپنے دین کا اعلان کرو اور کیا مکہ کے ناسازگار حالات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام لاتے ہی خانہ کعبہ میں ادائے نماز کا اہتمام نہ کر ڈالا تھا...... میں نے جب نام کے انتخاب میں ان سے نسبت قائم کی ہے تو کیوں نہ ان ہی کی مثال پر عمل کی کوشش بھی کر دوں۔

پھر ڈاکٹر عمر کے لئے حالات ناسازگار تر ہوتے گئے اور اسے پولینڈ سے جرمنی کی طرف مراجعت کرنی پڑی۔

عمر اپنے عنفوانِ شباب میں تھا' اس کے لئے شادی کا مسئلہ بھی پیدا ہوا۔ وہ کسی غیر مسلم خاتون سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جرمنی میں وہاں کے ایک معزز گھرانے کی ایک خاتون کو اس نے مسلمان کیا۔ یہ تھیں فاطمہ ہیرین۔ دونوں نو مسلموں نے اسلامی طرز پر نکاح کر لیا۔

پھر یہ دونوں پاکستان منتقل ہو گئے اور اس جذبہ سے ہوئے کہ یہاں اسلامی زندگی گزاریں گے۔ فاطمہ نے مولانا مودودی کے رسالہ ''دینیات'' کا جرمن زبان میں ترجمہ شروع کر دیا۔ ڈاکٹر عمر ان کی معاونت کرنے لگے۔

ہماری یہ ملاقات دو ڈھائی گھنٹے تک جاری رہی۔ پہلی ہی ملاقات میں ہم ایک دوسرے کے بہترین دوست بن گئے۔ عمر جب مجھ سے رخصت ہونے لگے تو دوبارہ معانقہ کیا۔ اس کے بعد عمر جلد ہی ڈھاکہ چلے گئے اور کئی ماہ ہماری ملاقات نہ ہو سکی۔ ایک دن ٹیلیفون آیا اور معلوم ہوا کہ عمر کراچی منتقل ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد تو ہم برابر ملتے رہے۔ اس کی زندگی کا جو پہلو میرے لئے سب سے زیادہ متاثر کن تھا وہ اسلام کے بارے میں اس کی حمیت تھی۔ جس بات کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ اسلام کا حکم ہے پھر اس کے آگے اس کا سر فوراً جھک جاتا ہے۔ اسلام کے سلسلے میں اس کی حمیت اتنی مستعد ہے کہ کسی معمولی سے معمولی معاملہ میں مغرب کی تقلید اسے پسند نہیں۔ ان دونوں میاں بیوی نے جس شرح صدر اور یکسوئی کے ساتھ اسلام قبول کیا' اس کی مثال کم ملتی

ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ان کے دل کی گہرائیوں میں رچ بس گیا ہے اور اس نے ان کے معیارات کو مکمل طور پر بدل دیا ہے۔ اب جن چیزوں کو دوسرے پوجتے ہیں یہ ان سے متنفر ہیں اور جس چیز کو اسلام پسند کرتا ہے یہ اس کے عاشق ہیں۔ اندازہ کیجیے کہ فاطمہ مکمل پردہ کرتی ہے اور ایسا پردہ کہ پاکستانی خواتین بھی نہ کرتی ہوں گی۔ اپوا کی بیگمات نے اس جرمن خاتون کو "ماڈرن" سمجھ کر انہیں عیدملن پارٹی میں بلا لیا وہاں اس نے ان کی ایسی خبر لی کہ بیگمات بس بغلیں جھانکتی رہیں۔

اس نے کہا کہ تم اپنے کو مسلمان کہتی ہو اور تبرّج جاہلیت کو تم نے اپنا شعار بنا رکھا ہے۔ اسلام تم سے سادگی اور پردہ کا تقاضا کرتا ہے اور تم نے مسرفانہ طرز زندگی اور بے حجابی کی راہ اختیار کر رکھی ہے اور تم اس کو ترقی سمجھتی ہو۔ حالانکہ یہ بدترین گمراہی اور صریح جاہلیت ہے۔ اس وقت تو بیگمات اپوا کچھ نہ کہہ سکیں، لیکن پھر کانوں پر ہاتھ رکھ لئے کہ آئندہ اس ملّانی کو کبھی مدعو نہیں کریں گی۔

آپ ان کے گھر میں جائیے تو اسے مشرقی طرز آرائش کا بہترین نمونہ پائیں گے بلکہ اس بارے میں تو ان دونوں نے کمال یہ کیا ہے کہ اپنے گھر میں مغربی طرز کا فرنیچر تک نہیں رکھا۔ وہاں آپ کو ایک بھی کرسی یا صوفہ نہ ملے گا۔ صوفوں کی جگہ دیوان ہیں، پڑھے ہیں، فرش پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ تخت ہے، پلنگ ہے، مشرق کے انداز ہیں۔ غرض ہر چیز سے مغرب سے بیزاری اور اسلامی کلچر سے نسبت ہویدا ہے۔ نماز روزے کی پابندی...... عمر نے پوری تراویح مولانا احتشام الحق کے پیچھے ادا کیں۔ افطار کی تقاریب میں بھی شرکت بہت کم کی کہ اس سے تراویح میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔ آخری طاق راتوں میں شب بیداری کا اہتمام کیا۔ ان لوگوں کے دینی شغف پر رشک آتا ہے۔

اس ضمن میں ایک دو واقعات دلچسپ اور عبرت آموز ہیں۔ عمر مجھ سے ملنے اکیڈیمی میں آئے۔ وہ زمانہ بسوں کی ہڑتال کا تھا۔ راستے میں ایک سوٹڈ بوٹڈ صاحب بہادر نے سڑک پر ان کی گاڑی کو اشارہ دے کر رکوایا اور لفٹ کی درخواست کی۔ عمر نے گاڑی روک کر اسے بٹھا لیا۔ اب صاحب بہادر نے ان کو ایک غیر ملکی جان کر بڑے ترقی پسندانہ انداز میں کہا کہ یہ ملک بہت ہی پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ ہے۔ اب یہی دیکھو کہ رمضان

ہے تو کوئی شخص بازار میں سگریٹ تک نہیں پی سکتا۔ یہ کہہ کر اس نے جیب سے سگریٹ نکالا اور بڑی ادا کے ساتھ ان کو پیش کیا۔ عمر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس نے تیز چلتی ہوئی گاڑی کو فوراً روکا اور چلا کر کہا:

YOU MUST BE ASHAMED OF YOURSELF.I AM A MUSLIM AND I AM FASTING, GET OUT OF MY CAR.

عمر کے لہجے میں اتنا جلال تھا کہ صاحب بہادر کے پسینے چھوٹ گئے اور اپنا سا منہ لے کر اتر گیا۔

اسی طرح وکٹوریہ روڈ پر عمر کسی کام سے گئے۔ جس دفتر میں وہ گئے اس کے باہر کھلے برآمدے میں ایک شخص بڑے بانکپن سے سگریٹ کے کش لے رہا تھا اور فضائے بسیط میں دھوئیں کے مرغولے اڑا رہا تھا۔ عمر کے لئے ماہِ صیام میں یہ منظر نا قابلِ برداشت تھا۔ وہ آگے بڑھے اور اس سے اس کا نام پوچھا۔ پھر دوبارہ نام پوچھا۔ جب یقین ہو گیا کہ مسلمان ہے تو ایک ہی ہاتھ میں اس کا سگریٹ کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ اور کہا: تم مسلمان ہو کر یہ حرکت کرتے ہو۔

عمر اور ان کی اہلیہ محترمہ نے پوری طرح اسلامی زندگی اختیار کر لی ہے اور ان کی زندگی کا یہی پہلو میرے لئے سب سے زیادہ INSPIRING ہے۔ البتہ ابھی تک ایک چیز ایسی ہے جس پر عمر قابو نہیں پا سکے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ان کا چہرہ ہنوز ڈاڑھی سے آراستہ نہیں۔ لیکن اس کی خلش وہ بھی محسوس کرتے ہیں اور میں بھی۔

دسمبر ۱۹۶۲ء میں عمر کی شادی کا پہلا ثمرہ نمودار ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک حسین اور تنومند بچے سے نوازا۔ عمر نے اس کا نام سیف الدین محمد عمر رکھا ہے۔ دونوں کی خواہش ہے کہ اس بچے کو خدا کی راہ کا مجاہد بنائیں۔ مغرب میں یہ رواج ہے کہ بچے کی ولادت کا اعلان کارڈ کے ذریعے کرتے ہیں۔ اس طرح اس کا ریکارڈ بھی رہتا ہے اور دور ونزدیک کے سب اعزا واحباب کو خبر بھی ہو جاتی ہے۔ عمر نے بھی سیف الدین محمد کی ولادت پر کارڈ چھپوایا لیکن اردو میں...... ناموں کے لئے عربی رسم الخط اختیار کیا اور یہ کارڈ یورپ اور عرب دنیا کے اپنے تمام احباب کو بھیجا۔

میں جب اپنے یہاں کے شادی کے دعوت نامے بھی انگریزی میں لکھے ہوئے دیکھتا ہوں تو عمر کی یہ حرکت مسرور بھی کرتی ہے اور نادم بھی۔ ہماری ذہنی غلامی پر ایک نومسلم کا یہ سچا جوش وولولہ اور مغربی تہذیب وتمدن کے خلاف جذبۂ بغاوت ہماری حالت پر لطیف طنز ہے۔

پاکستان میں اسلامی نظام کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس کا عمر پر بڑا گہرا اثر تھا۔ وہ یہ تصور بھی نہیں کرسکتا کہ ایک ملک اسلام کے نام پر وجود میں آئے' مگر وہاں قدم قدم پر اسلام کو نظر انداز کیا جائے اور غیر اسلامی تہذیب اور اطوار کو فروغ دیا جائے۔

یہ بات اس کی توقعات کے خلاف تھی......اور یہی بات کیا' نہ معلوم کہاں کہاں اس کی توقعات کے فانوس پاش پاش ہوئے۔ کب کب اس کے جذبات مجروح ہوئے۔ کیسی کیسی چوٹیں اس کے دل نے کھائیں؟ لیکن اس سب کے باوجود اس کا جذبہ کم نہ ہوا اور جس کے دل میں اسلام گھر کر گیا ہو اس کا جذبہ کم ہونے کا کیا سوال؟......تکلیف اپنی جگہ ہے مگر عزائم میں کمی کیسے آسکتی ہے؟ ''لیکن میں مایوس نہیں'' عمر کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ اس کا کراچی میں ڈھائی سال کا قیام میرے سامنے تھا۔ یہاں کتنی ہی نئی امیدیں بندھیں اور کتنی قائم شدہ امیدیں ٹوٹیں۔ لیکن زندگی ہے بھی کیا......توقعات کی اس شکست وریخت سے تو زندگی عبارت ہے۔

ناکامیوں سے کام محبت میں بن گیا
جو عمر رائیگاں ہے' وہی رائیگاں نہیں

●......●......●

محمد علی کلے

(امریکہ)

عالمی ہیوی ویٹ چیمپئن ...... محمد علی کلے ...... رنگ (RING) کی دنیا کا طلسماتی کردار ہے۔ اس نے بیسیوں مقابلوں میں حصہ لیا اور ایک آدھ کے سوا ہر ایک میں سرخرو رہا۔ وہ اپنے دور میں یقیناً ناقابلِ تسخیر تھا اور دنیا بھر کے باکسر اس سے پنجہ آزمائی کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ وہ شیر کی طرح شہ زور اور چیتے کی مانند برق رفتار تھا۔ وہ ہر مقابلے سے پہلے پیش گوئی کرتا کہ اپنے حریف کو وہ اتنے راؤنڈ میں ناک آؤٹ کر دے گا اور حیرت انگیز طور پر ایسا ہی ہوتا۔

فروری ۱۹۶۴ء میں وہ عالمی ہیوی ویٹ چیمپئن بنا اور یہ اعزاز حاصل کرتے ہی اس نے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس پر اس کے ہم وطن امریکیوں نے جو رویّہ اختیار کیا وہ چونکا دینے والا ہے۔ علمی فتوحات' سائنسی برتری' انصاف' مساوات' جمہوریت اور انسانی حقوق کے علمبردار اس ملک نے تعصب' تنگ نظری اور بے اصولی اور بے انصافی کا جو مظاہرہ کیا وہ چشم کشا اور عبرت ناک ہے۔ محمد علی کی زندگی اور قبولِ اسلام کے حوالے سے اس کی تفصیلات ملاحظہ ہوں۔

محمد علی کلے کا پیدائشی نام کاسیس مارسیلس کلے تھا۔ وہ ۱۸۔ جنوری ۱۹۴۲ء کو امریکہ کے ایک قصبے لازیل کنٹکی میں پیدا ہوا۔ اس کا والد کاسیس مارسیلس کلے (سینئر) سائن بورڈ پینٹر تھا۔ والدہ کا نام اوڈیسا کلے تھا۔ یہ امریکی حبشی خاندان مذہباً کیتھولک عیسائی تھا اور عام نیگروز کے برعکس شرافت اور وضع داری کی روایت رکھتا تھا۔ محمد علی کا والد محنتی

انسان تھا' اس لئے غربت و افلاس کی آزمائش سے محفوظ رہا۔ چنانچہ محمد علی کا بچپن دوسرے سیاہ فام بچوں کی طرح محرومی اور بے بسی کا شکار نہیں رہا۔ اس کا والد ایک باعزت شہری تھا اور عام سیاہ فاموں کی طرح اس نے کوئی ایسی حرکت نہ کی جس کے نتیجے میں اسے کبھی جیل جانا پڑا ہو۔ اسے اپنے بچوں سے محبت تھی اور وہ چاہتا تھا کہ وہ تعلیم حاصل کر کے معاشرے کے معزز شہری بنیں۔ چنانچہ اس نے اپنے بیٹے کاسیس کلے (جونیئر) کو اسکول میں داخل کرا دیا لیکن موصوف کو تعلیم سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ وہ شوخ' چلبلی طبیعت کا مالک تھا۔ ساتھیوں سے جھگڑنا اور انہیں مکے بازی سے مرعوب کرنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ چنانچہ جون ۱۹۶۰ء میں اس نے سنٹرل ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا تو اس کے نمبر بہت کم تھے۔

تاہم مکے بازی سے اس کا شغف بہت بچپن ہی سے تھا اور اس کی عمر ابھی بارہ سال ہی کی تھی جب ایک موقع پر اس کا جوش و جذبہ دیکھ کر امریکی پولیس کا ایک سفید فام ریٹائرڈ سارجنٹ جوزف مارٹن اسے باکسنگ کی ایک تربیت گاہ میں لے گیا جہاں اس نے بڑی حیرت سے لڑکوں کو ایک دوسرے پر گھونسے برسانے کی تربیت لیتے ہوئے دیکھا۔ کلے نے اس شغل میں اتنی دلچسپی کا مظاہرہ کیا کہ دوپہر کا کھانا بھی بھول گیا اور پھر پابندی اور باقاعدگی سے باکسنگ کی تربیت حاصل کرتا رہا اور ابھی اس کی عمر چودہ برس ہی کی تھی کہ وہ ہائی اسکول کے باکسنگ کے مقابلوں میں اوّل رہا اور جب اس نے اپنی اٹھارویں سالگرہ منائی تو اس کے سرپرست دوست جوزف مارٹن نے اعلان کیا: ''حضرات! ہمارا یہ نوجوان چھ سال کی مدت میں ایک سو آٹھ مقابلوں میں حصہ لے چکا ہے۔ جن میں سے ایک سو مقابلے اس نے جیت لئے اور صرف آٹھ میں شکست کھائی ہے اور یہ آٹھ مقابلے بھی ابتدائی نوعیت کے تھے۔'' گریجوایشن کرنے تک کاسیس کلے کا شہرہ سارے امریکہ میں پھیل چکا تھا۔

مکے بازی سے محمد علی گہرا فطری لگاؤ رکھتا تھا۔ اس کے لیے وہ خوب ریاضت کرتا۔ صبح اسکول جاتے ہوئے بس میں سوار ہونے کی بجائے بھاگتا ہوا اسکول پہنچتا اور گھر آتے ہی ورزش گاہ میں چلا جاتا اور مشق شروع کر دیتا۔ اسی ریاضت اور محنت کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۵۸ء میں جب وہ سولہ برس کا تھا اس وقت اس نے لازویل گولڈن گلوز

(GLOVES) ٹورنامنٹ میں لائٹ ہیوی چیمپئن شپ کا اعزاز حاصل کیا۔ ۱۹۵۹ء میں شکاگو میں نیشنل گولڈن گلوز لائٹ ہیوی ویٹ چیمپئن شپ جیتی۔ اس وقت اس کی عمر ۱۷ سال' قد چھ فٹ اور وزن ۱۷۰ پونڈ سے زیادہ تھا۔ اس نے مقابلے میں برطانیہ کے چیمپئن کو ہرایا تھا۔ اسی سال جب اس کی عمر ۱۸ برس' قد چھ فٹ اور وزن ۱۸۰ پونڈ تھا اس نے کلکی میں چھٹی بار گولڈن گلوز ٹورنامنٹ جیتا۔ مارچ میں شکاگو کے چیمپئنز ٹورنامنٹ میں فتح حاصل کی۔ اس کے بعد میڈیسن سکوئر گارڈن گلوز کے فائنل میں شاندار کامیابی حاصل کی۔ اس مقابلے میں اس کے حریف کیری جاوش کا وزن اس سے چالیس پونڈ زیادہ تھا۔

اپریل ۱۹۶۰ء میں اس نے نیشنل لائٹ ویٹ مقابلوں میں اپنے تمام حریفوں کو شکست فاش دی۔ یہ اعزاز جیتنے کے بعد وہ خود بخود اولمپک کھیلوں کے آزمائشی مقابلوں میں حصہ لینے کا اہل ہو گیا لیکن اس نے آزمائشی مقابلوں میں حصہ لینے سے پہلے آرام کرنے کی بجائے ایسٹرن ریجنل اولمپک ٹرائلو میں شرکت کی اور اپنے تین حریفوں کو آسانی سے ہرا دیا۔ چنانچہ جس وقت محمد علی اولمپک کھیلوں کے لئے آزمائشی مقابلوں میں شریک ہو رہا تھا اس وقت تک اس نے ایک سو تیس مقابلوں میں حصہ لیا تھا اور اسے صرف سات بار شکست ہوئی تھی۔ ان آزمائشی اولمپک مقابلوں میں اس نے چالیس حریفوں کو ہرا دیا اور ستمبر ۱۹۶۰ء میں روم میں منعقدہ اولمپک چیمپئن شپ جیت لی۔ یہاں اس نے روس' برطانیہ' پولینڈ' اور بلجیم کے معروف اور خطرناک مکے بازوں کو شکست فاش دی اور بے پناہ شہرت کے علاوہ سونے کا تمغہ حاصل کیا۔

یہ اعزاز حاصل کر کے جب کاشیس کلے واپس امریکہ آیا تو لاز ویل میں اس کا ہیرو کی طرح استقبال ہوا۔ ہزاروں افراد کے علاوہ شہر کے میئر نے اسے خوش آمدید کہا اور امریکہ کے گیارہ لکھ پتی حضرات نے اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ ایک سنڈیکیٹ قائم کیا گیا جس کا محفوظ سرمایہ ۲۵ ہزار ڈالر تھا۔ دس ہزار ڈالر اسے نقد ادا کیے گئے۔

لیکن اس موقع پر اسے ایک تکلیف دہ تجربے سے گزرنا پڑا۔ وہ ایک روز ایک ایسے ہوٹل میں چلا گیا جو گوروں کے لئے مخصوص تھا۔ جونہی وہ ایک میز پر بیٹھا' ہوٹل کی خاتون منیجر نے بڑی درشتی کے ساتھ حکم دیا کہ وہ فوراً ہوٹل سے باہر چلا جائے کہ یہاں کسی نیگرو کو

داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ کاسیس کلے نے جو سیاہ فام ہونے کے باوجود خوبصورت اور دلکش شخصیت کا حامل تھا بتایا کہ میں روم کے اولمپک مقابلوں میں جیت کر آیا ہوں' سونے کا تمغہ لایا ہوں' لیکن اس خاتون نے ایک نہ سنی اور اسے حقارت کے ساتھ زبردستی ہوٹل سے نکال دیا۔ گوروں کے اس سلوک نے کلے کے احساس پر غیر معمولی چوٹ لگائی اور وہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔

کلے کے عزائم بلند تھے اور صلاحیتیں بے پناہ' چنانچہ اب اس نے عالمی چیمپئن شپ پر نظریں جما دیں اور اس کے لئے ریاضت اور تگ و دو شروع کر دی۔ اکتوبر ۱۹۶۰ء سے اس نے پیشہ ورانہ مقابلوں کا آغاز کر دیا اور یکے بعد دیگرے بہت سے مقابلوں میں حصہ لیا۔ اس نے اپنے وقت کے مشہور ترین اور انتہائی خطرناک کے بازوں کو شکست دی۔ اس کے جسم میں گویا بجلیاں بھری ہوئی تھیں۔ وہ غیر معمولی پھرتی اور حیرت انگیز قوت سے حریف پر حملہ کرتا اور تھوڑے ہی وقت میں اسے ناک آؤٹ کر دیتا۔ چنانچہ ۱۵۔ نومبر ۱۹۶۲ء کو لاس انجلز میں آرچی مور کو شکست دیکر وہ عالمی چیمپئن کے مقابلے کے دعوے داروں میں چوتھے نمبر پر آ گیا۔ اس وقت تک آرچی مور دو سو مقابلوں میں حصہ لے چکا تھا جبکہ کلے نے صرف پندرہ پیشہ ورانہ مقابلوں میں حصہ لیا تھا۔

اسی مہینے یعنی نومبر ۱۹۶۲ء ہی میں کلے نے منزل کی طرف مزید پیش قدمی کی اور ڈوگ جونز کو ہرا کر براہ راست چیمپئن کے مقابلے میں آ گیا۔ مشہور امریکی رسالے ''ٹائم'' نے سرورق پر اس کی تصویر شائع کی۔ اس نے لکھا ''یہ کلے ہرکولیس ہے جب وہ غصے میں گرجتا ہے تو بڑے بڑے شہ زوروں کا دل دہل جاتا ہے اور جب وہ مسکراتا ہے تو عورتوں پر نشے کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے''۔

عالمی چیمپئن اور قبول اسلام:

جون ۱۹۶۳ء میں کلے نے برطانیہ کا دورہ کیا اور برطانوی چیمپئن ہنری کو ہرا دیا۔ نوعمری ہی سے کلے کا تکیہ کلام تھا ''میں عظیم ہوں'' (I am great) وہ جب بھی کسی حریف کو پچھاڑتا مخصوص انداز میں ناچتا اور یہ فقرہ بار بار دہراتا ...... اور آخر کار اس نے

اپنی عظمت کا لوہا ساری دنیا سے منوا لیا۔ ۲۵ فروری ۱۹۶۴ء کو فلوریڈا میں اس نے عالمی ہیوی ویٹ چیمپئن سونی لسٹن کو ہرا کر عالمی اعزاز جیت لیا...... اور اسی روز اس نے اپنی زندگی کا سب سے مبارک اور انقلابی فیصلہ کیا۔ اس نے اس شام کو مشہور امریکی نومسلم میلکم ایکس کے ہمراہ پریس کانفرنس سے خطاب کیا اور مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔ اسی روز سیاہ فام مسلمانوں کی تنظیم کے سربراہ عالیجاہ محمد نے شکاگو میں اعلان کیا کہ کاسیس کلے اسلام قبول کر چکا ہے اور عالمی اعزاز جیتنے میں اسے خدا کی مدد حاصل ہے۔

یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح امریکہ اور پوری دنیا میں پھیل گئی۔ اس نے ایک استفسار پر بتایا: ''ہاں مَیں مذہب اسلام کا پیروکار ہوں۔ مَیں خدا پر محکم یقین رکھتا ہوں۔ مَیں ہر روز پانچ وقت نماز پڑھتا ہوں اور لسٹن کو ہرانے کے فوراً بعد مَیں نے ڈریسنگ روم میں جا کر نماز پڑھی تھی''۔

میلکم ایکس کی تجویز پر کاسیس کلے نے اپنا اسلامی نام محمد علی اختیار کیا...... اور اس کے قبولِ اسلام سے جہاں ساری اسلامی دنیا میں مسرت کی لہر دوڑ گئی اور لاکھوں مسلمانوں نے اسے مبارک باد کے خطوط لکھے' وہاں امریکہ میں اس کے خلاف نفرت اور بیزاری کا اعلانیہ اظہار شروع ہو گیا۔ اخبارات میں اس کے خلاف لا متناہی مہم شروع ہو گئی اور پوری قوم نے تعصب اور تنگ نظری کا وہ مظاہرہ کیا کہ امریکیوں کی اصلیت کھل گئی۔ احترامِ انسانی' عدل اور اصول پسندی کے سارے دعوے بھک سے اڑ گئے۔

محمد علی چودہ سال کی عمر میں اسلام کی طرف اس وقت مائل ہوا جب اسکا عالیجاہ محمد سے تعارف ہوا۔ پھر ۱۹۶۲ء میں اس کی ملاقات مشہور امریکی نومسلم میلکم ایکس سے ہوئی اور دونوں دوست بن گئے۔ اور محمد علی ان سے اس قدر متاثر ہوا کہ اٹھارہ سال کی عمر میں اس نے اسلام قبول کر لیا۔ مگر میلکم ایکس کے مشورے پر طے پایا کہ اس کا اعلان عالمی چیمپئن شپ جیتنے کے بعد ہی کیا جائے گا ورنہ امریکی مقابلے کی نوبت نہیں آنے دیں گے اور اس میں رکاوٹیں ڈالیں گے۔ چنانچہ لسٹن سے مقابلے کے وقت میلکم ایکس اور ان کی اہلیہ بطور خاص میامی آئے اور محمد علی کے مہمان بنے۔ انہوں نے کہا ''یہ محض کھیل کی بازی کا مقابلہ نہیں بلکہ جہاد ہے۔ خدا کی مرضی یہی ہے کہ تم رِنگ سے عالمی چیمپئن بن کر نکلو''۔

چنانچہ جب محمد علی اور لسٹن کا وزن ہو رہا تھا' محمد علی اس فقرے کو بار بار دہرا رہا تھا۔ مقابلہ شروع ہونے سے تھوڑی دیر پہلے محمد علی نے میلکم ایکس کے ساتھ مل کر نوافل بھی ادا کیے۔
ایک سفید فام اخبار نویس کو محمد علی نے بتایا'' جب میں مسلمانوں کے جلسوں میں جاتا تھا تو ایک عجیب منظر دیکھتا تھا۔ کوئی مسلمان سگریٹ یا شراب نہیں پیتا۔ عورتیں باپردہ لباس پہنتی ہیں۔ مجھے یہ بات بہت اچھی لگتی تھی۔ یہی طرز زندگی دنیا کو تباہی سے بچا سکتا ہے۔''
''اگر آپ کو اپنا مذہب اور مکے بازی میں سے کسی ایک کو ترک کرنا پڑا تو آپ کسے ترجیح دیں گے''؟

اسی اخبار نویس کے استفسار پر محمد علی نے برملا اور دوٹوک انداز میں جواب دیا:'' اگر ایسی نوبت آئی تو میں مکے بازی کو ترک کر دوں گا اور پھر کبھی اس کا خیال تک ذہن میں نہیں لاؤں گا۔ اسلام کو ترک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا''۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اس سے پہلے ہر موقع پر محمد علی نعرہ لگایا کرتا تھا:'' میں عظیم ہوں''۔ مگر عالمی چیمپئن کا اعزاز حاصل کرتے ہی اس نے خودستائی کا یہ انداز ترک کر دیا اور کہا:'' اللہ سب سے بڑا ہے (اللہ اکبر) اور سب تعریفیں صرف اسی کے لیے ہیں (الحمد للہ رب العالمین)۔ اسی کی مدد سے مجھے یہ اعزاز حاصل ہوا ہے''۔

آزمائشوں کا سلسلہ:

محمد علی کے قبولِ اسلام کا اعلان کرتے ہی امریکہ میں کھلبلی مچ گئی۔ اس کے خلاف مضامین کا تانتا بندھ گیا اور تو اور سابق عالمی چیمپئن فلائیڈ پیٹرسن نے بھی اس کے خلاف مضمون لکھ مارا۔ ہر طرف ہاہا کار مچ گئی......اور جب وہ اپنے آبائی قصبے میں آیا تو اس کا استقبال بڑی ہی سرد مہری سے ہوا۔ صرف چار سو افراد اس کے خیر مقدم کے لئے جمع ہوئے۔ اس کے اعزاز میں کوئی تقریب بھی نہ ہوئی یہاں چند روز ٹھہر کر وہ نیو یارک چلا گیا مگر وہاں بھی وہ برابر تنقید کی زد میں رہا۔

انہی دنوں کانگرس کے سپیکر جان میک کورمک کی طرف سے سابق ہیوی ویٹ چیمپئن جیک ڈیمپس کو'' بے مثال کھلاڑی'' کا اعزاز دیا گیا اور تقریب میں سپیکر نے ڈیمپس کو

تاریخ کا عظیم ترین چیمپئن قرار دیا مگر محمد علی کی عظمت تسلیم کرنے کے بجائے الٹا اسے بے جواز طور پر تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب امریکہ ویت نام میں جنگ لڑ رہا تھا اور نوجوانوں کو فوج میں جبری بھرتی کے ذریعے محاذ جنگ پر بھیجا جا رہا تھا۔ تاہم مذہبی مبلغ اور معروف کھلاڑی اس سے مستثنیٰ تھے۔ لیکن اپنے ہی اصولوں کو نظر انداز کرتے ہوئے محمد علی کو حکم دیا گیا کہ وہ فوج میں بھرتی ہو اور جنگ کے لیے ویت نام پہنچے۔ مگر ہوا یوں کہ دو بار اس کا ٹیسٹ ہوا اور دونوں بار ذہنی امتحان میں اسے ناکام قرار دے دیا گیا...... ایک بار عالمی چیمپئن شپ حاصل کرنے سے پہلے جب اس نے مسلمان ہونے کا اعلان نہیں کیا تھا اور دوسری بار ۲۰ مارچ کو۔ چنانچہ اس پر بھی طویل لے دے شروع ہو گئی اور بحث ہونے لگی کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شاعر، مقرر اور اعلیٰ درجے کا باکسر ذہنی طور پر مطلوبہ اہلیت نہ رکھتا ہو۔ محمد علی کے پرنسپل نے شہادت دی کہ موصوف ایک طالب علم کی حیثیت سے کبھی لائق نہ تھا اور ریاضی میں تو خاصا کمزور تھا جب کہ بھرتی کے امتحان میں اسے خاصے مشکل سوال دیئے گئے تھے۔ لیکن کسی نے اس معتبر شہادت کو اہمیت نہ دی...... یوں لگتا تھا جیسے ساری قوم محمد علی کو دو سال کے لیے ویت نام بھجوا کر قبولِ اسلام کی سزا دینا چاہتی ہے۔ امریکی سینٹ اور کانگرس کو ہزاروں خطوط موصول ہوئے۔ فوجیوں کے والدین نے واویلا کیا کہ محمد علی جان بوجھ کر امتحان میں ناکام ہوا ہے۔

تعصب اور تنگ نظری کا یہ عالم تھا کہ ایک شام کو محمد علی میڈیسن سکوائر گارڈن گیا۔ وہاں مکے بازی کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ روایت یہ ہے کہ اگر کوئی عالمی چیمپئن اس قسم کا مقابلہ دیکھنے آئے تو اسے رِنگ میں بلا کر تماشائیوں سے متعارف کرایا جاتا ہے لیکن مقابلے کے منتظم نے ڈھٹائی سے کہا کہ وہ محمد علی کو اس کے اسلامی نام سے متعارف کرانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ محمد علی نے یہ شرط قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ہال سے باہر آ گیا۔ جب وہ باہر نکل رہا تھا تو سینکڑوں تماشائی چیخ چیخ کر اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔

بہر حال محمد علی نے صاف انکار کر دیا کہ وہ کسی قیمت پر فوج میں بھرتی نہیں ہوگا۔ اس نے دوٹوک لفظوں میں کہا: ’’میری ویت نامیوں سے کوئی دشمنی نہیں اور میں اپنے عقیدے

کی رُو سے صرف اسی جنگ میں شامل ہو سکتا ہوں جو جہاد ہو"...... اس پر عالمی باکسنگ ایسوسی ایشن کے صدر نے دھمکی دی کہ اسے عالمی اعزاز سے محروم کر دیا جائے گا۔ اس لئے کہا: "کلے نے امریکی نوجوانوں کے لیے بُری مثال قائم کی ہے"۔

اس کے جواب میں محمد علی نے کہا: "میں نے امریکی نوجوانوں کے لیے بُری مثال کیسے قائم کی ہے؟ میں تو سگریٹ تک نہیں پیتا اور صاف ستھری زندگی بسر کرتا ہوں۔ رہی بات اعزاز کی تو میں ہی اس کا اہل ہوں اور میں نے یہ اعزاز خدا کی مدد سے اور اپنے دست و بازو سے حاصل کیا ہے اور دوبارہ بھی جب موقع آیا' میں اسے جیت لوں گا۔ میں سونی لسٹن' فلائیڈ پیٹرسن' اور ڈوگ جونز یا ایڈی میچن سے ایک ہی رات میں یکے بعد دیگرے مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوں"۔

محمد علی نے واضح کیا کہ اب وہ اکیلا نہیں ہے اور پوری افریقی اور ایشیائی اقوام اس کی ہمدرد و مونس ہیں۔

مخالفت شدید تر ہوتی چلی گئی۔ عالمی باکسنگ ایسوسی ایشن کے کمشنر نے تجویز دی کہ محمد علی کو اسلام یا عالمی چیمپئن شپ میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کو کہا جائے۔ "روشن خیال" امریکی مذہبی تعصب میں ساری حدوں کو پھلانگتے جا رہے تھے۔

۱۴۔ مئی ۱۹۶۴ء کو محمد علی نے اپنے چھوٹے بھائی رحمان علی اور عالیجاہ محمد کے بیٹے ہربرٹ محمد کے ہمراہ افریقہ کا دورہ کیا۔ وہ پہلے گھانا پہنچے۔ پھر نائیجیریا اور پھر مصر میں... ہر جگہ اس کا ایک قومی ہیرو کی طرح استقبال ہوا۔ پانچ ہفتوں کے بعد وہ واپس نیویارک پہنچا۔ مخالفت شدید ترین ہو رہی تھی۔ گنتی کے چند حامی بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔

۴۔ اگست ۱۹۶۴ء کو محمد علی نے انڈیانا کی ماڈل گرل سونجی سے شادی کر لی۔ سونجی نے اسلام قبول کر لیا اور طے پایا کہ وہ اسلامی لباس اور دینی شعائر کو اختیار کر کے اپنے موجودہ طریق زندگی کو ترک کر دے گی۔ سونجی نے شادی کے بعد اخبار نویسوں کو بتایا: "میرے شوہر کی خواہش تھی کہ میں زیادہ وقت اپنے گھر میں بسر کروں اور اس کے لیے زندگی کو زیادہ سے زیادہ اطمینان بخش بناؤں۔ وہ اس بات کا سخت مخالف ہے کہ میں کلبوں یا رقص گاہوں میں جاؤں اور وہ لباس پہنوں جس کی اسلام میں ممانعت ہے"۔

اکتوبر ۱۹۶۴ء میں عالمی باکسنگ ایسوسی ایشن نے محمد علی کو عالمی چیمپئن شپ کے اعزاز سے محروم کر دیا۔ اس کا بڑا قصور یہی تھا کہ اس نے عیسائیت کو ترک کر کے اسلام اختیار کر لیا تھا۔

لیکن محمد علی نے ہمت نہ ہاری۔ اس نے سونی لسٹن کو دوبارہ للکارا اور مقابلے کا اعلان کر دیا۔ لیکن امریکہ کی کوئی ریاست اپنے علاقے میں مقابلے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ بڑی مشکل سے میساچوسٹس نے اجازت دی اور بوسٹن میں مقابلے کی تاریخ طے پا گئی۔ (۹ نومبر ۱۹۶۴ء) لیکن بدقسمتی سے مقابلے سے تین روز پہلے محمد علی ہرنیا کی تکلیف میں مبتلا ہو گیا اور اسے اپریشن کرانا پڑا۔

اس صورتِ حال کا بہانہ بنا کر عالمی باکسنگ ایسوسی ایشن نے ارنی ٹیرل اور ایڈی میچن کے درمیان مقابلے کا اعلان کر دیا اور یوں ارنی ٹیرل جسے امریکہ سے باہر کوئی نہیں جانتا تھا میچن کو پوائنٹس پر ہرا کر عالمی چیمپئن بن بیٹھا۔

۲۱ فروری ۱۹۶۵ء کو میلکم ایکس کو شہید کر دیا گیا اور الزام لگایا گیا کہ قاتلوں میں عالیجاہ محمد کے ساتھ ساتھ محمد علی بھی ہے...... اس دقوعہ کے چند گھنٹوں کے بعد محمد علی کے فلیٹ کو آگ لگا دی گئی۔ انسانی قدروں کے علمبردار مہذب امریکی محمد علی کو قبولِ اسلام کی بھرپور سزا دے رہے تھے اور ہر نوع کا نقصان پہنچا کر ذہنی اور اعصابی طور پر اسے مفلوج کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

سونی لسٹن سے حیرت انگیز مقابلہ:

چند ماہ کے توقف سے مئی ۱۹۶۵ء میں محمد علی اور لسٹن کے مقابلے کی نئی تاریخ طے پائی۔ تیاریاں مکمل تھیں، مگر دو ہفتے قبل میساچوسٹس کے حکام نے اجازت منسوخ کر دی۔ تاہم میامی ایتھلیٹک کمیشن نے اجازت دے دی اور طے پایا کہ ۲۵ مئی ۱۹۶۵ء کو لیوسٹن گارڈنز میں یہ تاریخی معرکہ برپا ہوگا۔ امریکیوں نے اسے واقعی ہلال وصلیب کا معرکہ بنا ڈالا اور مذہبی جوش و تعصب کے ساتھ اخبارات نے لسٹن کے حق میں اور محمد علی کی مخالفت میں زبردست مہم چلائی۔ امریکہ میں باکسنگ کے تمام جرائد اور پانچ بڑے

روزناموں کے سپورٹس رپورٹروں نے لسٹن کی کامیابی کے لیے پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ باکسنگ کے ایک مشہور مبصر جیمز ایچ ایلین نے مقابلے سے پندرہ دن قبل حتمی دعوے کے ساتھ پیش گوئی کی کہ اس بار کلے ہار جائے گا اور فتح لسٹن کے قدم چومے گی۔

ایلین نے اپنی پیشین گوئی کو منطقی دلائل کے ساتھ آراستہ کیا۔ اس نے لکھا: ''میں پیشس گوئی کرتا ہوں کہ سونی لسٹن پانچ راؤنڈ کے اندر اندر جیت جائے گا خواہ کلے ناک آؤٹ ہو یا ٹیکنیکل ناک آؤٹ''۔ اس ضمن میں ایلین نے اپنے مشاہدات بیان کیے: ''میں اپنے نوجوانی کے زمانے میں شوقیہ کلبوں اور تعلیمی اداروں کی جانب سے متعدد مقابلوں میں حصہ لے چکا ہوں۔ پھر میں نے نامور باکسروں کو مقابلہ کرتے ہوئے دیکھا بھی ہے۔ ان باکسروں میں جیک ڈیمپس' کارپینٹر' میلنی' شارکی' اطالوی شہ زور پریمو کارنیرا' میکسی بیر' ناقابلِ تسخیر جولوئی' والکاٹ چارلس' پٹیرسن اور جانسن قابلِ ذکر ہیں۔ میں نے سونی لسٹن کو پانچ بار اور محمد علی کو تین بار رِنگ میں لڑتے دیکھا ہے لیکن محمد علی کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنے کے باوجود میرا پختہ نظریہ ہے کہ لسٹن اس سے بڑا باکسر ہے''۔

ایلین نے آگے چل کر لسٹن اور محمد علی کی ذہنی' جسمانی قوتوں کا ان الفاظ میں موازنہ کیا:

''جس نے لسٹن کو قریب سے دیکھا ہے وہ میرے نقطۂ نظر کی تائید کرے گا کہ وہ واقعی عظیم ہے۔ وہ خالی ہاتھ بنگال کے شیر سے لڑ سکتا ہے اور اس کا گلا گھونٹ سکتا ہے۔ وہ ایک غضب ناک باکسر ہے اور محمد علی کے ہاتھوں شکست نے اسے اور بھی غضب ناک بنا دیا ہے۔ اس نے اس مقابلے کے لیے اتنی زیادہ مشق کی ہے کہ اب تک شاید ہی کسی اور مقابلے کے لیے کی ہو۔ محمد علی نوجوان ہے اور بڑا پھرتیلا ہے لیکن لسٹن اپنے قد و قامت اور صلاحیتوں کے لحاظ سے کہیں زیادہ پھرتیلا ہے۔ وہ ایک گھونسے سے کلہاڑی کو توڑ سکتا ہے۔ وہ ایک شیر ہے جس کے مقابلے میں ایک نوجوان اور پھرتیلا چیتا آنے والا ہے۔ ان حالات کی بنا پر میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ کلے فوراً ناک آؤٹ ہو جائے گا اور کسی کو اس پر حیرت نہیں ہوگی''۔

غرض لسٹن کے حق میں اور محمد علی کی مخالفت میں پروپیگنڈا مہم اتنی منظم اور شدید تھی کہ کوئی اور ہوتا تو احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر ہمت ہار بیٹھتا۔ لیکن محمد علی کو اپنے اللہ پر اور

لاکھوں مسلمان بھائیوں کی دعاؤں پر مکمل بھروسہ تھا۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ تیاری کرتا رہا۔ اس نے کہا: ''جب میں رنگ میں اتروں گا تو دنیا کے ایک ارب سے زیادہ لوگ میری کامیابی کے لیے دعا کر رہے ہوں گے۔ میں اللہ کے فضل سے کامیاب ہوں گا''۔ اس نے مقابلے سے پہلے نوافل ادا کیے' خوب دعائیں کیں اور جب وہ رنگ میں داخل ہوا اور مقابلہ شروع ہونے لگا تو لاکھوں نہیں کروڑوں افراد کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اس مقابلے سے امریکیوں کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ ایک محتاط اندازے کے مطابق پچاس لاکھ ڈالر کی آمدنی ہوئی۔ ٹیلی ویژن کے چھ لاکھ ڈالر ان کے علاوہ تھے۔ یقیناً یہ ریکارڈ آمدنی تھی۔

مقابلہ شروع ہوا۔ پہلے محمد علی اور پھر لسٹن نے اپنی عبا اتار کر پھینکی۔ محمد علی کو اس کے اسلامی نام سے متعارف کرایا گیا تو تماشائیوں نے آوازے کسے اور مخالفانہ نعرے لگائے۔ ریفری نے اشارہ کیا اور دونوں باکسر ایک دوسرے کی طرف بڑھے...... لیکن یہ کیا؟... ایک عجیب' محیر العقول اور ناقابلِ فہم واقعہ ہوا۔ محمد علی نے گھونسے کا وار کیا اور مقابلہ شروع ہوئے ایک منٹ اور ۴۲ سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ لسٹن گھونسا کھا کر گر پڑا اور پھر اٹھ نہ سکا۔ اس کا اور اس کے صلیبی ہموطنوں کا غرور خاک میں مل گیا اور جب لسٹن لڑکھڑاتا ہوا اٹھا تو گنتی پوری ہو چکی تھی۔ باکسنگ کے مشہور اور ثقہ جریدے ''رنگ'' کا ایڈیٹر فلیشر قریب ہی موجود تھا' وہ باکسنگ کا نامور مبصر تھا اور اس کی رائے حتمی سمجھی جاتی تھی۔ اس نے کھڑے ہو کر کہا کہ لسٹن گنتی پوری ہونے کے بعد اٹھا ہے۔ ٹائم کیپر نے بھی اس کی تصدیق کر دی اور یوں محمد علی نے اللہ تعالیٰ کی تائید اور اس کے فضل و کرم سے فتح مبین حاصل کر لی۔

ابھی لوگ ٹھیک طرح سے بیٹھے بھی نہ تھے کہ مقابلہ ختم ہو گیا۔ یہ سب کچھ اس قدر آناً فاناً ہوا کہ فوٹو گرافر بمشکل تین تصویریں ہی بنا سکے۔ تماشائیوں نے شور مچا دیا کہ یہ سب فراڈ ہے۔ نورا کشتی ہے' بکواس ہے۔ دراصل کسی کے فہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ لسٹن اس قدر بے مثال ذلت و رسوائی سے دو چار ہو گا۔ چنانچہ ہال میں خوب ہنگامہ ہوا۔ لوگ غصے میں چیختے ہوئے رنگ پر حملہ آور ہوئے۔ وہ پاگلوں کی طرح محمد علی کو گالیاں دے رہے

تھے۔ تعصب کے علاوہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ نا قابلِ تسخیر لسٹن محمد علی کا ایک ہی مکا کھا کر بیہوش ہو جائے گا اور دوبارہ اٹھ نہیں سکے گا۔ ہر ذہن میں سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ محمد علی کا پنچ بظاہر اتنا زور دار نہیں تھا پھر لسٹن کیوں چت گرا اور بیہوش ہو گیا۔ روحانیت کے دشمن مادہ پرست امریکیوں کی سمجھ میں یہ بات آ نہیں رہی تھی کہ تعلق باللہ اور دعا میں کیا تاثیر ہوتی ہے اور حالانکہ بہت سے غیر جانبدار نقادوں اور مبصروں کے علاوہ متعدد سابق ہیوی ویٹ عالمی چیمپئن فلائیڈ پیٹرسن' انگیمار' جوہن سن' اور جو والکاٹ نے اس مقابلے میں محمد علی کو عظیم مکہ باز تسلیم کیا مگر اکھڑ اور ہٹ دھرم متعصب امریکیوں کا غیظ و غضب اس کراماتی واقعے کے بعد مزید بڑھ گیا۔ سپورٹس کے بعض رسالوں اور اخبارات نے کارروائی کرنے کا مطالبہ کیا اور عالمی باکسنگ ایسوسی ایشن نے اسے عالمی چیمپئن تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس کی بجائے فلائیڈ پیٹرسن کو جو لسٹن سے دوبار شکست کھا چکا تھا' اپنا چیمپئن مقرر کر دیا۔ امریکیوں کی ''اصول پسندی'' کا ایک ایک پرت الگ ہو رہا تھا۔

فلائیڈ پیٹرسن کی پٹائی:

محمد علی نے عالمی چیمپئن شپ دوبارہ حاصل کرنے کے لئے فلائیڈ پیٹرسن کو مقابلے کی دعوت دے دی اور اس کے لئے ۲۲ نومبر ۱۹۶۵ء کی تاریخ بھی طے ہو گئی۔ مقابلے کا اعلان ہوتے ہی فلائیڈ پیٹرسن نے محمد علی کا مضحکہ اڑانا شروع کر دیا اور خصوصاً اس حوالے سے وہ اسلام اور اسلامی تاریخ و روایات کا مذاق اڑانے لگا۔ وہ محمد علی سے مقابلے کو باقاعدہ صلیبی جنگ قرار دینے لگا اور یوں سارے متعصب امریکیوں کی ہمدردیاں اسے حاصل ہو گئیں اور انہوں نے محمد علی کے خلاف بغض و عداوت کے اظہار کے لیے اب فلائیڈ پیٹرسن سے ساری امیدیں وابستہ کر لیں۔ وہ کہنہ مشق اور گھاگ باکسر تھا۔ دو مرتبہ عالمی چیمپئن شپ جیت چکا تھا اور اگرچہ دو بار لسٹن سے مار کھا چکا تھا مگر اس نے رِنگ کی دنیا سے ناطہ ختم نہیں کیا تھا۔ مقابلے سے پہلے اس نے پانچ معروف مکا بازوں کو شکست دی جس سے اس کا اعتماد بحال ہو گیا۔ وہ اپنی فتح کے دعوے کرتا رہا اور اسلام کا مذاق اڑاتا رہا۔

تنگ آ کر محمد علی نے جواب دیا: ''مجھے پوپ اور کیتھولک مذہب پر تنقید کرنے پر مجبور

کیا جا رہا ہے' مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ عالمی چیمپئن کے اعزاز کا اسلام سے کیا تعلق ہے؟ بہرحال اب میں پیٹرسن کی اچھی طرح ٹھکائی کروں گا۔ میں مقابلے کو زیادہ سے زیادہ طول دوں گا تاکہ اس چوہے کو خوب ذلیل کر سکوں اور اس وقت تک اسے مارتا رہوں گا جب تک اس کی ٹانگیں جواب نہ دے جائیں۔ میں اسے دردناک مثال بنا دوں گا''۔

اس بار حادثہ یہ ہوا کہ محمد علی کا قریبی دوست اور اسسٹنٹ ٹرینر بنڈینی اس سے قطع تعلق کر کے پیٹرسن سے جا ملا اور اسے محمد علی کو ہرانے کے گر بتانے میں مصروف ہو گیا۔ اخبارات اور دیگر ذرائع نے بھی حسب سابق محمد علی کی کردار کشی اور پیٹرسن کی تعریف و توصیف میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ مقابلے سے عین قبل محمد علی نے کہا''میں اپنے ناظرین اور ٹی وی پر مقابلہ دیکھنے والوں کو بتا دوں کہ میں پیٹرسن کو ناک آؤٹ نہیں کروں گا بلکہ اسے انتہائی بے رحمی سے ماروں گا''۔

اور پھر ایسے ہی ہوا۔ مقابلہ شروع ہوا اور چوتھے راؤنڈ سے بارہویں راؤنڈ تک محمد علی نے مار مار کر پیٹرسن کا بھرکس نکال دیا۔ اس کا سر' منہ' آنکھیں سوج گئیں۔ اس کا چہرہ لہولہان ہو گیا۔ حتیٰ کہ وہ بے حس ہو کر چت گر گیا اور رسوا کن شکست سے دوچار ہوا۔ اسے نیم بیہوشی کی حالت میں اٹھا کر رنگ سے باہر لے جایا گیا۔ محمد علی نے ایک بدزبان اور گستاخ باکسر سے خوب انتقام لیا۔ حالانکہ سارے مقابلے کے دوران آٹھ ہزار تماشائی اسے ہوٹ کر رہے تھے اور نفرت و بیزاری کا اعلانیہ اظہار کر رہے تھے اور جب پیٹرسن کی پٹائی ہو رہی تھی تو وہ غصے سے پاگل ہو رہے تھے۔

امریکیوں کی ڈھٹائی دیکھئے کہ اس شرمناک شکست کے بعد پیٹرسن کی مقبولیت گھٹنے کی بجائے اور بڑھ گئی۔ محمد علی کے مخالفین نے کہا کہ حقیقی فتح تو پیٹرسن کی ہوئی جس نے اتنی دلیری سے مار کھائی اور اف تک نہ کی۔ اس مقابلے کے بعد مخالفین نے محمد علی کو قصاب اور درندہ کہہ کر دل کی بھڑاس خوب نکالی۔

اس مقابلے پر خود محمد علی نے یوں تبصرہ کیا:''میری ضرب' ضرب حیدری ہے اور مجھ پر میرے پیغمبر کا سایہ ہے۔ میں مسلمان ہوں اور میرے نام کا ایک جزو محمد اور دوسرا علی ہے''۔

اور جب اس پر نکتہ چینی کی گئی کہ اس نے پیٹرسن پر بڑا ظلم کیا ہے۔ اسے اتنا نہیں مارنا چاہئے تھا تو محمد علی نے جواب دیا: "جب میں نے سونی لسٹن کو ایک ہی گھونسے میں ڈھیر کر دیا تھا تو لوگوں نے کہا تھا کہ یہ ملی بھگت اور نورا کشتی ہے۔ اب میں نے فلائیڈ پیٹرسن کو بارھویں راؤنڈ میں مار گرایا ہے تو کہا جا رہا ہے کہ اسے اس بری طرح نہیں مارنا چاہئے تھا۔ آخر یہ لوگ چاہتے کیا ہیں؟ پتہ نہیں اب کون میرا مقابلہ کرے گا۔ میرا خیال ہے کہ اب مجھے چاند پر ہی جا کر مقابلہ کرنا چاہئے۔ شرط یہ ہو کہ جیتنے والا واپس آ جائے اور ہارنے والا چاند پر ہی رہ جائے"۔

سونجی کو طلاق:

محمد علی کی بیوی سونجی کچھ عرصہ تو اپنے عہد پر قائم رہی اور گھریلو زندگی اور دینی تقاضوں کی پابند رہی، مگر پھر اس کا اصل مزاج عود کر آیا۔ اس نے نیم عریاں اور چست لباس دوبارہ پہننا شروع کر دیا۔ وہ بعض اوقات کئی کئی دن گھر سے غائب رہتی۔ اس قابلِ اعتراض لباس میں اس نے پریس کانفرنس سے خطاب کیا اور محمد علی اور مذہبِ اسلام پر الزام تراشی کی۔ تنگ آ کر ۱۹۶۵ء میں محمد علی نے سونجی کو طلاق دے دی۔ سونجی نے اس کے خلاف عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا اور وہ ملک جہاں روزانہ ہزاروں طلاقیں ہوتی ہیں اور عدالتیں ان میں دخل اندازی نہیں کرتیں وہاں عدالت نے چند دنوں میں محمد علی کے خلاف فیصلہ سنا دیا۔ جس کے تحت وہ دس برس تک سونجی کو پندرہ ہزار ڈالر سالانہ ادا کرے گا۔ جبکہ قانونی اخراجات کے طور پر بائیس ہزار پانچ سو ڈالر کی ادائیگی اس کے علاوہ ہو گی۔ امریکہ کے "مہذب" معاشرے میں ایک مردِ حر کو قبولِ حق کی عجیب و غریب سزا مل رہی تھی۔

اب محمد علی نے عالمی باکسنگ ایسوسی ایشن کے نامزد چیمپئن ارنی ٹیرل کو للکارا۔ ۲۹۔ مارچ کی تاریخ بھی طے ہو گئی، مگر نیویارک اسٹیبلشمنٹ کمیشن نے میڈیسن سکوائر گارڈنز میں مقابلے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ شکاگو میں مقابلے کی بات چیت شروع ہوئی، مگر اسی دوران میں فوجی بھرتی بورڈ کی طرف سے اسے خط موصول ہوا کہ

بھرتی پر دوبارہ غور ہو رہا ہے اور ایک ہی ہفتے کے بعد وزارت دفاع کی طرف سے حکم نامہ صادر ہو گیا کہ فوجی بھرتی کا معیار کم کر دیا گیا ہے اس لیے اب وہ بھرتی کا اہل ہے اور اسے کسی بھی وقت طلب کیا جا سکتا ہے۔ اس پر محمد علی نے کہا:

''کتنی حیرت کی بات ہے کہ میں حکومت کو ہزاروں ڈالر ٹیکس دیتا ہوں لیکن پھر بھی مجھے ہتھیار اٹھانے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ حکومت سن لے کہ میں کسی قیمت پر فوج میں نہیں جاؤں گا۔ کیونکہ ایک تو میرا مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا۔ دوسرے ویت کانگ سے میرا کوئی جھگڑا نہیں۔ ہم مسلمان اس وقت تک جنگ نہیں کرتے جب تک وہ خدا کی راہ میں جہاد نہ ہو''۔

محمد علی کے اس بیان پر پورے ملک میں پھر ہنگامہ شروع ہو گیا۔ اس پر ملک سے غداری کے الزامات لگائے گئے۔ ایتھلیٹک کمیشن نے اسے طلب کیا اور کمیشن کا چیئرمین اس سے وضاحت طلب کرتا رہا۔ محمد علی نے احتجاج کیا کہ اسے اس کے غیر اسلامی نام سے پکارا جا رہا ہے۔ اس نے یہاں بھی اپنا بیان دہرایا کہ وہ ہرگز فوج میں بھرتی ہو کر ویت نام نہیں جائے گا نتیجتاً شکاگو میں بھی مقابلے کی ممانعت کر دی گئی۔

اخبارات میں محمد علی کے خلاف کردار کشی کی لے تیز تر ہو گئی۔ محمد علی کے اس بیان کو ملک دشمنی پر محمول کیا گیا کہ ''میری ویت کانگ سے کوئی دشمنی نہیں''۔ اس پر محمد علی نے ایک بیان میں کہا'' امریکہ ہی کے بہت سے سیاست دان اور دانشور ہیں جو ویت نام میں امریکی پالیسی کے سخت مخالف ہیں اور اس کے خلاف بیان دیتے رہتے ہیں لیکن انہیں نہ غدار قرار دیا جاتا ہے نہ ان کے بیانات کو ملک دشمنی پر محمول کیا جاتا ہے، لیکن میں نے اپنے دفاع میں ایک صحیح بات کہہ دی تو آسمان سر پر اٹھا لیا گیا ہے۔ دراصل یہ سب تعصب اور تنگ نظری ہے اور مجھے میرے عقیدے کی سزا دی جا رہی ہے۔ یاد رکھیں میں اپنے الفاظ واپس نہیں لوں گا۔ میں بزدل نہیں ہوں۔ عالمی ہیوی ویٹ چیمپئن ہوں۔ میں اپنی بات پر قائم رہوں گا''۔

ارنی ٹیرل سے مقابلے کی بڑی مشکلوں سے کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں اجازت مل گئی لیکن ارنی ٹیرل مقابلے سے بھاگ گیا۔ اس کے بجائے جارج شوالو سے مقابلہ ہوا۔ یہ

باکسر غیر معمولی طاقت اور تجربے کا حامل تھا۔ اس لیے مقابلہ پندرھویں راؤنڈ تک جاری رہا آخرکار جارج شوالو بھی ہار گیا۔

اسی دوران میں عدالت کی طرف سے نوٹس جاری ہوا کہ محمد علی اپنی سابق بیوی سونجی کو چھبیس ہزار دو سو پچاس ڈالر کی رقم فوراً ادا کرے ورنہ توہین عدالت کے جرم میں اسے جیل بھیج دیا جائے گا۔ سونجی دوبارہ ایک نائٹ کلب میں رقاصہ بن گئی۔ وہ جان بوجھ کر محمد علی کے لیے ذہنی صدمات کا سبب بن رہی تھی۔ غالب امکان یہ ہے کہ اس میں بھی یہود نواز، اسلام دشمن حکومت ہی کی سازش کارفرما ہو گی۔

۲۱۔ مئی ۱۹۶۵ء کو محمد علی کا مقابلہ انگلینڈ کے چیمپئن ہنری کوپر سے ہوا۔ یہ ساٹھ سال کے بعد پہلا موقع تھا کہ امریکہ کے ایک عالمی حیثیت کے باکسر کا مقابلہ انگلینڈ کے چیمپئن سے ہو رہا تھا۔ انگلستان اور یورپ کے لوگوں نے اس میں غیر معمولی دلچسپی لی اور یہاں بھی امریکہ کی طرح صلیبی ماحول پیدا کر دیا گیا۔ لندن کے فٹ بال سٹیڈیم میں ۴۲ ہزار کے مجمع نے یہ مقابلہ دیکھا۔ محمد علی نے خلاف معمول اس مقابلے میں اچھل کود کی، نہ کھلنڈرے پن کا مظاہرہ کیا نہ مذاق کیا۔ وہ بڑی سنجیدگی اور وقار کے ساتھ رنگ میں آیا۔ سب سے پہلے اللہ سے کامیابی کی دعا کی اور پھر ہنری کوپر کو شکست فاش دی۔ یہاں بھی کچھ تماشائیوں نے غنڈہ گردی کی، آوازے کسے "ناپاک حبشی کو قتل کر دو" فتح کے اعلان پر رنگ پر حملہ بھی کیا مگر پولیس نے مداخلت کر کے انہیں پیچھے ہٹا لیا۔

اگست ۱۹۶۵ء میں لندن ہی میں اس نے برائن لنڈن کو شکست دی۔ پانچ لاکھ افراد نے اس مقابلے کو دیکھا۔ محمد علی کو نوے ہزار سٹرلنگ پونڈ کی آمدنی ہوئی۔

لندن ہی میں ایک پاکستانی صحافی نے محمد علی سے ملاقات کی۔ پاکستان کے بارے میں اس نے بڑے ہی جوش و جذبے کا اظہار کیا۔ اس نے کہا "میں جہاں بھی جاتا ہوں میرے پاکستانی بھائی میرا والہانہ استقبال کرتے ہیں۔ کیسی عجیب بات ہے اسلام نے لازویل کے ایک معمولی لڑکے کو دنیا بھر کے مسلمانوں کا بھائی بنا دیا ہے۔ میں جب سے لندن آیا ہوں پاکستانی زبردستی مجھے اپنے ہوٹلوں میں کھانا کھلاتے ہیں۔ جب سے میں نے اسلام قبول کیا ہے یوں محسوس کرتا ہوں جیسے ہر مسلمان ملک میرا ہی وطن ہے۔ میں

عنقریب حج کے لیے مکہ جاؤں گا"۔

اسی سفر میں محمد علی نے جرمنی کا دورہ کیا اور فرینکفرٹ میں مشہور جرمن چیمپئن ملڈن برگر سے مقابلہ ہوا۔ یہ بڑا ہی شہ زور مکا باز تھا اور مختلف ۵۴ مقابلوں میں سے صرف دو میں ہارا تھا۔ اس ۲۸ سالہ مکہ باز نے متعدد امریکیوں کو بھی ہرایا تھا۔

مقابلے کی صبح محمد علی نے نوافل ادا کیے۔ مقابلے کے وقت ملڈن نے محمد علی کے اسلامی نام کا مذاق اڑایا۔ سٹیڈیم میں اسی ہزار کا ہجوم تھا جن میں بہت سے لوگ محمد علی کا مذاق اڑا رہے تھے۔ مقابلہ زبردست تھا۔ ملڈن نے خوب جم کر مار کھائی' لیکن آخر کار بارھویں راؤنڈ میں ہمت ہار بیٹھا۔ ملڈن برگر کی شکست کے بعد یورپ میں کوئی مکا باز ایسا نہ تھا جو محمد علی کے مقابل آ سکے۔ اس کی جسمانی اور روحانی قوت نے امریکہ کے بعد یورپ کو بھی تسخیر کر لیا تھا۔

انگلستان اور یورپ کے دورے کے بعد محمد علی واپس امریکہ آیا تو اسے بتایا گیا کہ جبری بھرتی کے خلاف اس کی اپیل مسترد کر دی گئی ہے۔ اسی دوران میں عدالت کی طرف سے اسے حکم ملا کہ مطلقہ بیوی کے سلسلے میں پچیس ہزار ڈالرز ضمانت جمع کرائے اور اگر اس نے آئندہ سونجی کو بروقت خرچہ نہ دیا تو یہ زر ضمانت ضبط کر لیا جائے گا۔

۱۹۶۶ء میں امریکا کے کلیولینڈ ولیمز نے محمد علی کو للکارا۔ یہ اتنا زبردست مکا باز تھا کہ ایک بار اس نے جونی ہولیمین کو اتنے زور کا پنچ مارا کہ وہ نصف گھنٹہ تک بے ہوش پڑا رہا۔ ایک اور مکے باز کرلی لی نے اس کا ایک پنچ کھانے کے بعد مکا بازی ترک کر دی تھی۔ ولیمز نے ۱۹۶۲ء میں عالمی باکسنگ ایسوسی ایشن کے چیمپئن ارل ٹیرل کو بھی شکست دی تھی اور محمد علی کو للکارنے سے پہلے اس نے ۷۱ (اکہتر) پیشہ ورانہ مقابلوں میں حصہ لیا تھا اور ۶۰ جیت لیے تھے۔ مگر اللہ کی مدد سے محمد علی نے ولیمز کو شکست دی اور اس کے بدترین مخالفوں کو بھی اس کی قوت اور عظمت کا لوہا ماننا پڑا۔ قبولِ اسلام کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ تماشائی تالیاں بجا کر اسے خراج تحسین پیش کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ولیمز اس مقابلے کے بعد ریٹائر ہو گیا۔ محمد علی کو دو لاکھ تیس ہزار چھ سو ڈالر کی آمدنی ہوئی۔

اب محمد علی نے عالمی باکسنگ ایسوسی ایشن کے تیار کردہ چیمپئن ارنی ٹیرل کو دعوت

مبارزت دی اور اسے مجبور ہو کر مقابلے پر آنا پڑا۔ ٹیرل کا شمار بہر حال امریکہ کے صف اوّل کے مکا بازوں میں ہوتا تھا۔ اس کا قد محمد علی سے تین انچ زیادہ تھا۔ اس کی چھاتی اور مکے کی گولائی محمد علی سے ایک ایک انچ زائد اور بازو کی پہنچ دو انچ زیادہ تھی۔ مقابلے کا اعلان ہونے پر اس نے خوب لافیں ماریں اور محمد علی کو کاسیس کلے کے نام ہی سے پکارتا رہا۔ اس نے کہا: ''میں زندگی میں پہلی بار دل میں نفرت کے جذبات لے کر رنگ میں جا رہا ہوں۔ میں حریف کا منہ ہمیشہ کے لئے بند کر دوں گا''۔ ماہرین اور ناقدین نے بھی اس کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیے۔ مقابلے سے چوبیس گھنٹے پہلے محمد علی نے ہوسٹن کی نو تعمیر شدہ مسجد میں جمعہ کی تقریر کی جس میں سینکڑوں مسلمانوں نے شرکت کی اور اس کی کامیابی کے لیے دعا بھی کی۔

۶۔ فروری ۱۹۶۷ء کو ہوسٹن کے اسٹرڈم اسٹیڈیم میں ۳۸ ہزار تماشائیوں نے یہ مقابلہ دیکھا۔ مقابلے سے پہلے محمد علی نے کہا: ''ٹیرل مجھے غیر اسلامی نام سے پکارتا ہے چنانچہ میں حق رکھتا ہوں کہ اس شخص کی بداخلاقی کی سزا دوں۔ سن لیں کہ میں اس کو اسی طرح ماروں گا جس طرح سونی لسٹن کو مارا تھا۔ میں اسے چھٹی کا دودھ یاد کرا دوں گا۔''

اور ہمیشہ کی طرح محمد علی کی اس پیشین گوئی کی بھی اللہ نے خوب لاج رکھی۔ محمد علی نے ٹیرل کی خوب پٹائی کی اور ساتویں راؤنڈ میں تو اس کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ بے بس ہو کر گر پڑا اور بڑی مشکلوں سے اٹھا۔ آٹھویں راؤنڈ میں محمد علی نے ٹیرل کے دائیں جبڑے پر زناٹے کا گھونسا مارا اور کہا ''بول میرا نام کیا ہے''؟ پھر بائیں جبڑے پر دوسری ضرب لگائی اور وہی بات دہرائی: ''بول میرا نام کیا ہے''؟

غرض پندرھویں راؤنڈ تک اس کی خوب ٹھکائی ہوئی۔ منہ سوج گیا' جبڑے زخمی ہو گئے' ناک سے خون بہنے لگا اور آنکھیں کپا بن گئیں۔ وہ رسوا کن شکست سے دوچار ہوا۔

اس مقابلے کے بعد محمد علی کے دشمنوں کی امیدیں خاک میں مل گئیں۔ رنگ میں اسے پٹتا دیکھنے اور ہارنے کی آرزو اپنی موت آپ مر گئی۔ اب پورے امریکہ اور ساری دنیا میں کوئی اس کا مقابل نہ تھا۔ مجبور ہو کر عظیم مکے باز جو لوئی نے بھی اس کی عظمت تسلیم کر لی۔

کچھ عرصے کے بعد محمد علی کا مقابلہ ۳۴ سالہ زورا فولی سے ہوا۔ یہ ۸۴ میں ۴۷

مقابلے جیت چکا تھا اور باکسنگ کی دنیا میں خاص نام رکھتا تھا۔ میڈیسن سکوائر گارڈن میں بارہ ہزار ناظرین نے یہ مقابلہ دیکھا اور زورا فولی ساتویں راؤنڈ میں ناک آؤٹ ہو گیا۔

زورا فولی نے مقابلے کے بعد اخبار نویسوں سے کہا: ''بلاشبہ اس وقت دنیا میں کوئی ایسا مکے باز نہیں جو محمد علی کو ہرا سکے۔ میں یہ دعویٰ اس لیے کر رہا ہوں کہ میں ان میں سے بیشتر سے مقابلہ کر چکا ہوں''۔

ناک آؤٹ ہونے کے بارے میں اس نے کہا: ''مجھے اتنا یاد ہے کہ میرے جبڑے پر ایک گھونسا پڑا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا یہ مجھے یاد نہیں۔ بہر حال مجھے اس شکست کا کوئی افسوس نہیں کہ میں دنیا کے بہترین مکہ باز سے ہارا ہوں''۔

وزارت دفاع کی طرف سے محمد علی کو آخری اور حتمی حکم ملا کہ ۲۸ اپریل ۱۹۶۷ء کو فوجی بھرتی کے دفتر میں پہنچ جائے۔ اس پر اس نے شدید احتجاج کیا اور ایک پریس کانفرنس میں کہا:

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں یہاں سے دس ہزار میل دور جا کر انسانوں کو قتل کروں اور ان کے گھر جلاؤں تاکہ رنگ دار عوام پر سفید فام آقاؤں کا غلبہ برقرار رہ سکے۔ یاد رکھیں میں کسی قیمت پر یہ حکم نہیں مانوں گا۔ سوال یہ ہے کہ میں خدا سے ڈروں یا اپنی حکومت سے''؟ میرا جواب یہ ہے کہ میں خدا ہی سے ڈرتا ہوں''۔

محمد علی نے واشنگٹن میں مختلف عدالتوں سے رجوع کیا اور حکم امتناعی لینے کی کوشش کی مگر کسی عدالت نے اس کی اپیل پر توجہ نہ دی۔ اس مقصد کے لیے اس نے ہوسٹن (ٹیکساس) میں بھی قسمت آزمائی کی' مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اس سلسلے میں اس نے ایک بار پھر اخبار نویسوں سے کہا:

''میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ امریکہ کے تمام فٹ بال' بیس بال اور باسکٹ بال کے کھلاڑیوں کو چھوڑ کر میرا ہی انتخاب کیوں کیا گیا ہے جبکہ میں امریکہ کا واحد عالمی ہیوی ویٹ چیمپئن ہوں جسے کوئی شکست نہیں دے سکا۔ یہ بات ناقابل فہم ہے کہ بھرتی بورڈ ایک ایسے آدمی کو صرف اسی (۸۰) ڈالر ماہانہ کی نوکری دینے پر کیوں مصر ہے جو کم سے کم

دو لاکھ آدمیوں کی سالانہ تنخواہوں اور دو مقابلوں میں چھ نئے جیٹ طیاروں کی قیمت کے برابر ٹیکس دے سکتا ہے"۔

لیکن علم و تہذیب کی دعوے دار امریکی حکومت کا ضمیر بیدار نہ ہوا اور وہ اسے ویت نام بھجوانے پر اصرار کرتی رہی۔ محمد علی نے آخری اپیل ۲۷ اپریل ۱۹۶۷ء کو فیڈرل ڈسٹرکٹ کورٹ میں کی۔ عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا:

"مجھے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ اپنا ایمان عزیز ہے اور میں اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا ہوں۔ اندازہ کیجیے کہ جب میں عالمی چیمپئن کا اعزاز حاصل کرنے کے لیے سونی لسٹن سے مقابلہ کرنے والا تھا تو مقابلے کے منتظم بل میکڈ انلڈ کو اندازہ ہو گیا کہ میں مسلمان ہوں اور اس نے دھمکی دی کہ اگر اسلام سے انکار نہ کیا تو مقابلہ منسوخ کر دوں گا' لیکن میں نے یہ مطالبہ مسترد کر دیا اور سامان اٹھا کر جانے ہی والا تھا کہ میکڈ انلڈ نے مطالبہ واپس لے لیا۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں نے ملک کی خوبصورت ترین نیگرو لڑکی کو اس لیے طلاق دے دی کہ وہ اسلامی نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض لباس پہنتی تھی۔ اسی طرح ویت نام میں جا کر لڑنا میرے مذہب کی تعلیمات کے منافی ہے۔ میں بورڈ کو دھوکا نہیں دے رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم مسلمان صرف اس لڑائی میں شریک ہوتے ہیں جو خدا کی راہ میں لڑی جائے۔ ہم صلیبی جنگوں یا ملحدوں کی لڑائی میں شریک نہیں ہوتے"۔

فیڈرل کورٹ نے یہ اپیل مسترد کر دی اور دوسرے روز بھرتی دفتر میں حاضر ہونے کی تاکید کر دی۔ لیکن محمد علی نے یہ حکم ماننے سے صاف انکار کر دیا اور لکھ کر دے دیا کہ وہ فوج میں کسی قیمت پر بھرتی نہیں ہو گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سرکاری حکم کی خلاف ورزی کے الزام میں اسے پانچ سال قید اور دس ہزار ڈالر جرمانہ کی سزا سنا دی گئی۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ گرفتاری اور مقدمے کی سماعت سے قبل ہی باکسنگ کے حکام نے اس کا عالمی اعزاز بھی چھین لیا۔

محمد علی نے اس فیصلے کے خلاف نیو اور لینز فیڈرل کورٹ میں اپیل دائر کی' مگر وہ بھی مسترد کر دی گئی۔ محمد علی نے ہر اپیل میں یہ وضاحت بھی کی کہ وہ اسلام کا مبلغ ہے اور جونہی اس نے اسلام قبول کیا تھا اس کے مذہبی رہنما عالیجاہ محمد نے اس کے ذمہ تبلیغ دین کا فریضہ

عاید کر دیا تھا اور جیسا کہ امریکہ کی روایت ہے کسی پادری اور مذہبی مبلغ کو فوج میں بھرتی ہونے پر مجبور نہیں کیا جاتا' اس لئے اسے بھی فوجی بھرتی سے مستثنیٰ قرار دیا جائے' مگر کسی عدالت نے اس کی اس دلیل کو درخور اعتنا نہ جانا۔

......اس آئینے میں امریکہ کے "غیر جانبدار" عدالتی نظام کی بھی تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔

محمد علی بحیثیت مسلمان:

قبول اسلام کے بعد امریکہ میں محمد علی کو جن جانگسل آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا اور امریکی حکومت' وہاں کی عدالتوں' مختلف اداروں اور عامۃ الناس نے تعصب اور تنگ نظری کا جو مظاہرہ کیا وہ جہاں بے حد افسوس ناک اور تکلیف دہ ہے وہاں اس اعتبار سے ایمان افروز اور روح پرور بھی ہے کہ محمد علی نے ایک لمحے کے لیے بھی حالات کے سامنے سپر نہ ڈالی اور رنگ کے اندر اور باہر لاکھوں افراد کی مخالفت اور نفرت وحقارت کے اعلانیہ اظہار کے باوجود اس کے اعصاب کبھی متاثر نہ ہوئے۔ ہنری کوپر سے مقابلے کے دوران' لسٹن سے دوسرے مقابلے میں اور پھر پیٹرسن سے لڑتے ہوئے اسے جس صورتحال کا سامنا کرنا پڑا' کوئی اور ہوتا تو گھٹنے ٹیک دیتا لیکن خدا پر محکم یقین اور پختہ کردار نے اسے وہ قوت ارادی عطا کر دی جس کی بنا پر وہ ایک لمحے کے لئے بھی ہراساں نہ ہوا اور سب حریفوں کے چھکے چھڑا دیئے۔

دراصل قبول اسلام کے بعد اس نے اپنے اندر زبردست تبدیلیاں پیدا کیں۔ وہ بڑی باقاعدگی سے پنج وقتہ نماز پڑھتا' دیگر اسلامی شعائر پر عمل کرتا اور اسلامی تعلیمات سے آگاہی کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرتا۔ وہ آغاز ہی میں عالیجاہ محمد کے عقائد کا پیروکار تھا۔ جس میں بعض جھول اور خلاف اسلام باتیں بھی تھیں' لیکن جب عالیجاہ محمد کے بیٹے ہربرٹ محمد اور محمد علی نے افریقہ کا دورہ کیا اور وہ دو بار مصر گیا تو دونوں کے عقاید درست ہو گئے۔ ہربرٹ محمد بھی راست فکر مسلمان بن گیا اور محمد علی نے بھی قرآن وسنت کے مطابق عقائد درست کر لیے۔

محمد علی کو شراب' خنزیر اور دیگر شرعی ممنوعات سے سخت نفرت رہی۔ وہ سگریٹ تک

نہیں پیتا اور بڑی پاکیزہ زندگی گزارتا ہے۔ قبولِ اسلام کے بعد وہ کبھی کسی کلب یا رقص گاہ میں نہیں گیا۔ وہ کہا کرتا "اسلام نے مردوں اور عورتوں کے مخلوط اجتماعات کی ممانعت کی ہے"۔ یہ امر خوش آئند ہے کہ اس کے سارے خاندان یعنی والدین اور دو بھائیوں نے اسلام قبول کر لیا۔ چھوٹے بھائی کا نام رحمان علی ہے جس سے محمد علی ٹوٹ کر محبت کرتا ہے اور دونوں سفر و حضر میں ہمیشہ اکٹھے رہتے ہیں۔ محمد علی کے گھریلو ملازم بھی مسلمان ہیں۔ باورچی خانے کی نگران بھی ایک ادھیڑ عمر نیگرو مسلمان خاتون ہے۔ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ گھر میں کسی بھی اختیار سے اسلامی شعائر کی خلاف ورزی نہ ہو۔ وہ سفر میں مذکورہ خاتون کو ساتھ رکھتا تاکہ عیسائی ہوٹلوں میں کھانا نہ کھانا پڑے۔

عالمی ہیوی ویٹ چیمپئن شپ جیتنے کے بعد محمد علی نے نیو یارک میں رہائش اختیار کر لی اور ساری مصروفیات کے باوجود وہ ظہر، عصر اور عشا کی نمازیں شہر کے اسلامک سنٹر میں ادا کرتا اور اب تک اس کا یہی معمول ہے۔ وہ عصر کی نماز کے بعد نواحی قصبات میں تبلیغ کے لیے نکل جاتا ہے اور عشا کی نماز کے وقت واپس لوٹتا ہے۔ فارغ اوقات میں بھی اپنے دوستوں اور جاننے والوں میں اسلام کی تبلیغ کرتا ہے۔ وہ اس قولِ فیصل کو ہر وقت پیشِ نظر رکھتا ہے کہ "ہر مسلمان ہر وقت مبلغ ہوتا ہے"۔

ایک موقع پر اس نے کہا:

"اسلامی تعلیمات کی بدولت مجھ میں زبردست تبدیلیاں آئی ہیں اور اب میں زیادہ سنجیدہ ہونا چاہتا ہوں۔ اسی لیے میں نے شاعری بھی ترک کر دی ہے"۔

اللہ تعالیٰ سے محمد علی کے تعلق کا یہ عالم ہے کہ ہر مقابلے میں پہلے محمد علی بیس منٹ تک نوافل پڑھتا اور سربسجود ہو کر اللہ سے دعائیں کرتا۔ اس کا کہنا ہے "جب بھی تم کسی کام میں ہاتھ ڈالو تو خدا سے خوب دعائیں کرو۔ یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا"۔

اس کی دینی غیرت کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنی توہین برداشت کر لیتا ہے لیکن اسلام اور دینی شعائر کی تضحیک برداشت نہیں کرتا۔ چنانچہ لسٹن اور پیٹرسن سے مقابلے کے دوران اس نے ان دونوں کی سخت پٹائی اسی لیے کی تھی کہ انہوں نے مقابلے سے پہلے اسلام اور اسلامی شعائر کا مذاق اڑایا تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ محمد علی کا ذاتی کردار بھی ہمیشہ صاف ستھرا رہا اور اس کے کسی کٹر مخالف کو بھی اس کے خلاف انگشت نمائی کی جرأت نہیں ہوئی۔ جبکہ اس کے اکثر ہم عصر حریف بدکردار اور پست ذہنیت کے حامل تھے۔ لسٹن' فلائیڈ پیٹرسن اور ارنی ٹیرل اس ضمن میں بڑے بدنام تھے اور بارہا جیل کی ہوا کھا چکے تھے۔ چنانچہ رنگ کے اندر اپنے پیشے کے تقاضوں کے مطابق بعض اوقات وہ جیسا بھی سخت گیر بن جاتا' لیکن ذاتی زندگی میں شرافت و اخلاص کا پیکر ہے۔ وہ واحد باکسر ہے جو مقابلہ ختم ہونے کے بعد اپنے حریفوں کی عیادت اور تیمارداری کرتا اور ہر ممکن طریقے سے ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتا۔ چنانچہ ایک بار وہ ہسپتال میں لسٹن کی تیمارداری کرنے گیا۔ بلا مبالغہ وہ کسی کا دشمن نہیں اور ہر ایک سے خندہ پیشانی اور خوش اخلاقی سے پیش آتا رہا ہے جبکہ اس کے برعکس اس کے حریف کشادہ دلی اور وسعتِ نظر سے محروم رہے۔ انہوں نے آنکھوں پر تعصب کی پٹی باندھے رکھی اور اس کی کردارکشی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس کا سبب صرف یہ تھا کہ وہ مسلمان ہے اور اسلام کی تبلیغ کرتا ہے۔

بہر حال جب فوج میں بھرتی کے حوالے سے محمد علی کو سزا سنائی دی گئی اور ایک فیڈرل کورٹ نے بھی اس کی اپیل مسترد کر دی تو اسے گرفتار کر لیا گیا اور حوالۂ زنداں کر دیا گیا۔ اس پر امریکہ میں اور تیسری دنیا میں وہ ہنگامہ برپا ہوا کہ باید و شاید۔ امریکہ کے سیاہ فام باشندے بلا امتیاز مذہب اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے احتجاج کی وہ لہر اٹھائی کہ امریکہ میں گویا بھونچال آ گیا۔ بہت سے سفید فام انصاف پسند امریکیوں نے بھی اس اقدام کی کھل کر مذمت کی۔ ایشیا اور افریقہ اور خصوصاً اسلامی دنیا میں بھی اس پر شدید غم و غصے کا اظہار کیا گیا اور سب ملکوں میں امریکی سفارت خانوں پر زبردست مظاہرے ہوئے۔ عالمی ادارہ برائے امن (ورلڈ پیس آرگنائزیشن) نے جس کے مشہور برطانوی فلسفی برٹرینڈ رسل اس کے کرتا دھرتا تھے' محمد علی کے خلاف امریکی رویّے کی مذمت کی اور شاہ فیصل سمیت متعدد مسلمان سربراہوں نے بھی اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ احتجاج کی اس

زبردست مہم سے امریکی حکومت بوکھلا گئی۔ وہ اس حقیقت سے بہت پریشان ہوئی کہ کل تک جو شخص باکسنگ اور اسلام کے حوالے سے اہمیت رکھتا تھا وہ اپنی گرفتاری کے ساتھ ہی عوامی ہیرو بن گیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ امریکی حکومت نے سزا معطل کر دی' اسے جیل سے رہا کر دیا گیا' تاہم اس کے اعزاز پر پابندی برقرار رہی اور لائسنس منسوخ رہا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کسی مقابلے میں حصہ نہیں لے سکتا۔

۲۰۔ جون ۱۹۷۰ء کو امریکی سپریم کورٹ نے محمد علی کی سزا ختم کر دی اور چار ہی ماہ کے بعد ایک فیڈرل کورٹ نے لائسنس بحال کر دیا۔ سپریم کورٹ نے اس سزا کو غیر حقیقت پسندانہ اور ''شدید'' قرار دیا تھا۔

پابندیاں اٹھتے ہی محمد علی نے اکتوبر ۱۹۷۰ء میں اٹلانٹا میں جیری کوری کو تیسرے ہی راؤنڈ میں ناک آؤٹ کر دیا جبکہ دسمبر ۱۹۷۰ء میں نیو یارک سٹی میں اس نے پندرھویں راؤنڈ تک آسکر بونیوینا کی پٹائی کی۔

مارچ ۱۹۷۱ء میں میڈیسن سکوائر گارڈن میں محمد علی نے عالمی باکسنگ ایسوسی ایشن کے چیمپئن جوئی فریزئر کا مقابلہ کیا اور زندگی میں پہلی بار شکست کھائی۔ ۲۸ جنوری ۱۹۷۴ء کو جوئی فریزئیر سے اس کا دوسرا مقابلہ ہوا جس میں اس نے فریزئیر پر فتح پائی۔ اس دوران میں محمد علی نے اپنے وقت کے متعدد نامور باکسروں کو شکست سے دوچار کیا۔

اس زمانے میں جارج فورمین عالمی ہیوی ویٹ چیمپئن تھا۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو زائرے (افریقہ) کے شہر کنشاسا میں محمد علی کا مقابلہ فورمین سے ہوا اور آٹھویں راؤنڈ میں فورمین ناک آؤٹ ہو گیا۔ محمد علی نے دوبارہ عالمی چیمپئن شپ کا اعزاز حاصل کر لیا۔ امریکی حکومت اور دیگر مخالفین کی سازشیں دم توڑ گئیں۔

آئندہ تین سال تک یہ اعزاز محمد علی کے پاس رہا اور اس دوران میں اس نے چھ بڑے مقابلوں میں حریفوں کو شکست دی۔ ان میں سے ایک مقابلہ ملائیشیا میں جبکہ دوسرا فلپائن میں ہوا۔

۱۹۷۷ء میں محمد علی کے ڈاکٹر نے پہلی بار نشاندہی کی کہ اس کی جسمانی مشینری کے اندر بعض خرابیوں کا آغاز ہو گیا ہے' اس لیے اسے حفظِ ماتقدم کے طور پر باکسنگ سے ریٹائر

ہو جانا چاہیے لیکن اس نے اس مشورے کی پروا نہ کی اور ۱۵ فروری ۱۹۷۸ء کو لاس ویگاس کے مقام پر نوجوان لیون سپنکس سے شکست کھائی۔ محمد علی نے پندرھویں راؤنڈ تک اس کا مقابلہ کیا۔ لیکن اسی برس ۱۵۔ ستمبر کو نیو اورلینز میں اس نے سپنکس کو ہرا کر شکست کا بدلہ چکا دیا۔ اس مقابلے میں محمد علی کو تیس لاکھ ڈالر کی آمدنی ہوئی۔

اس مقابلے کے بعد محمد علی نے باکسنگ سے ریٹائر ہونے کا اعلان کر دیا اور ساری توجہ تبلیغ دین اور رفاہی کاموں پر مبذول کر دی۔ اس نے حج کیا۔ مختلف اسلامی ممالک کا دورہ کیا اور حقوق' آزادی اور احترام انسانی کے لیے ایک عالمی ادارہ (WORLD) قائم کیا۔ (WORLD ORGANISATION FOR RIGHTS,LIBERTY AND DIGNITY)

اس نے غیر معمولی خداداد محنت سے بے پناہ دولت بنائی۔ وہ ایک ٹریننگ کیمپ' ایک فارم اور ایک ڈیپارٹمنٹل سٹور بلڈنگ کا مالک ہے۔ شکاگو میں علی انٹرپرائزز کے نام سے اس کی ایک تجارتی فرم بھی ہے۔ اللہ نے اسے جتنی دولت دی ہے' اتنا ہی بڑا دل بھی دیا ہے۔ چنانچہ وہ بڑی فراخ دلی سے طالب علموں' غریبوں اور ضرورت مندوں اور رفاہی اداروں کی مدد کرتا ہے اور آج جب کہ اس کی عمر ترپن برس (یہ مضمون ۱۹۹۵ء میں مرتب کیا گیا تھا) ہو چکی ہے وہ اب بھی چاق و چوبند' فعال اور مستعد ہے۔ خوش مزاج ہے اور چھ بچوں اور بیوی کے ہمراہ پنسلوانیا میں ڈیر لیک کے قریب پُر فضا اور خوبصورت مکان میں پُر سکون زندگی گزار رہا ہے۔

اس مضمون کی ترتیب میں مندرجہ ذیل کتب سے مدد لی گئی:

۱۔ محمد علی کلے از عباس' فیروز سنز لاہور۔

۲۔ محمد علی کلے از محمد بدر منیر مکتبہ عالیہ لاہور۔

۳۔ امریکی شخصیات کی سوانح (انگریزی کتاب)

●......●......●

محمد مارماڈیوک پکتھال

(انگلستان)

مترجم قرآن' مفکرِ اسلام' ادیب' محقق' صحافی اور مبلغ و خطیب محمد مارماڈیوک پکتھال بلاشبہ ان شخصیات میں سے ہیں جو صدیوں کے بعد پیدا ہوتی ہیں اور صدیوں کو متاثر کرتی ہیں۔ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل نابغہ انسان تھے۔ ان پر قدرتِ خداوندی کا سب سے بڑا کرم یہ تھا کہ اگرچہ وہ کفر و شرک کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں پیدا ہوئے مگر ان کی عقلِ سلیم انہیں اسلام کی سیدھی اور روشن شاہراہ پر لے آئی اور بہت سی دیگر تصانیف کے علاوہ انہوں نے خصوصاً ترجمۂ قرآن کی صورت میں انگریزی خواں طبقے کو ایسا انمول تحفہ عطا کیا جو قیامت تک راہروانِ شوق کی رہنمائی بھی کرتا رہے گا اور خود پکتھال مرحوم کے لئے بے بہا صدقۂ جاریہ کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ قارئین کو موصوف محترم کے قبولِ اسلام کے مراحل اور دیگر دینی خدمات سے روشناس کرایا جائے۔

مارماڈیوک ولیم پکتھال ۷۔ اپریل ۱۸۷۵ء کی صبح کو انگلستان میں سفک (SUFFALK) کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد چارلس پکتھال مقامی گرجا گھر کے پادری تھے۔ چارلس کی پہلی بیوی سے دس بچے تھے۔ وہ وفات پا گئی تو انہوں نے دوسری شادی امیر البحر ڈی ایم اد برائین کی بیٹی میری سے کی۔ اس بیوی سے چارلس کے ہاں مارماڈیوک پکتھال تولد ہوئے۔

موصوف چھ برس کے تھے کہ ان کے والد انتقال کر گئے چنانچہ یہ خاندان گاؤں سے ترک سکونت کر کے لندن کے محلہ ٹنگٹن میں آگیا اور ننھے مارماڈیوک کو نارفوک کے اسکول میں داخل کرایا گیا جہاں شروع ہی میں انہوں نے اپنی ذہانت کا سکہ جما لیا اور خصوصاً ریاضی میں انہوں نے اپنی قابلیت کا بھرپور مظاہرہ کیا' مگر کچھ عرصے کے بعد وہ سخت بیمار ہو گئے اور ڈاکٹروں نے ایک سال کے لئے آرام تجویز کیا۔

مکمل صحت یابی کے بعد پکتھال کو ہیرو (HARROW) کے مشہور و معروف پبلک اسکول میں داخلہ دلایا گیا جہاں انہوں نے جغرافیہ اور لسانیات میں امتیاز حاصل کیا۔ زمانۂ طالب علمی میں ونسٹن چرچل سے ان کی گہری دوستی تھی جو آخر وقت تک قائم رہی۔ چرچل نے آگے چل کر برطانوی سیاست میں غیر معمولی نام پیدا کیا۔ ثانوی تعلیم کی تکمیل کے بعد مارماڈیوک پکتھال فرانس گئے جہاں انہوں نے فرانسیسی زبان سیکھی اور پھر اٹلی کے شہر فلورنس سے اطالوی زبان میں دستگاہ حاصل کی۔ واپس لندن آ کر جرمن اور ہسپانوی زبانوں میں عبور حاصل کیا۔ اس کے ساتھ انہیں ادب و تاریخ سے بھی گہرا شغف تھا اور اس حوالے سے انہوں نے مشرقی زندگی اور معاشرتی روایات سے بھی اچھی خاصی شناسائی حاصل کر لی اور اس کے گہرے اثرات قبول کئے۔

تعلیم سے فارغ ہو کر انیس برس کی عمر میں مارماڈیوک امور خارجہ کے امتحان میں شریک ہوئے اور اگرچہ امتحان میں اوّل آئے مگر نامعلوم وجوہ کی بنا پر انہیں مطلوبہ ملازمت نہ دی گئی جس سے وہ بہت بددل ہوئے۔ اس زمانے کے تاثرات یوں قلمبند کرتے ہیں:

"میں ناامید اور افسردگی کا شکار ہو گیا۔ مجھے لندن کا ابر آلود گھٹا گھٹا اور یک رنگ ماحول بالکل اچھا نہیں لگتا تھا اور میری سوچوں پر مشرقی ممالک کی وہ فضا چھائی رہتی جہاں سورج پوری آب و تاب سے چمکتا اور جہاں کھجوروں کے نخلستان اور اونٹوں کی قطاریں دل و دماغ کو ایک نئی فرحت اور سکون سے آشنا کر دیتے۔ اگرچہ میری عمر کچھ زیادہ نہ تھی لیکن میرے دل میں ان ملکوں کے لئے بے پناہ کشش تھی جو مجھے اپنی طرف کھینچتی رہتی تھی اور خوشی کی بات یہ

ہے کہ میری والدہ نے بھی مجھے خوابوں کی اس سرزمین میں جانے کی اجازت دے دی''۔

اور حالانکہ ان کے عزیزوں کی طرف سے آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی تجویز بھی تھی مگر انہوں نے مشرق وسطیٰ کی سیاحت کو ترجیح دی اور وہ اپنے ایک دوست ڈوننگ کے ساتھ مصر پہنچ گئے۔

مصر پہنچ کر مارماڈیوک نے یہاں کی تہذیب و ثقافت کا مطالعہ شروع کر دیا اور کچھ عرصہ قیام کے بعد شام چلے گئے۔ وہاں وہ ایک پادری سینور سے ملے جو آثار قدیمہ کا مطالعہ کر رہا تھا۔ مارماڈیوک پکتھال نے پادری سے گہرے تعلقات استوار کر لئے اور اس سے عربی سیکھنا شروع کی۔ پھر وہ ایک ترجمان اور گائیڈ کو ساتھ لے کر صحرا کو عبور کر کے شہران' رملہ اور غزہ پہنچے۔ دوران سفر انہوں نے عرب کسانوں اور دیہاتیوں کی معاشرت اور مسائل سے واقفیت حاصل کی اور عربی سیکھنے کی استعداد میں بھی اضافہ کیا۔ دوسری جانب انہوں نے اونٹ پر سوار ہو کر کوہ جودی تک سفر کیا۔ وہ مشرق وسطیٰ کی سادہ اور فطری زندگی سے بہت متاثر ہوئے اور یوں لگا جیسے ان کے پسندیدہ خواب کی تعبیر مل گئی ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مجھے یہاں کی زندگی میں عجیب قسم کا سکون ملا۔ یورپ میں رہتے ہوئے مَیں نے کسی شخص کو سچی خوشی سے ہمکنار نہیں دیکھا' لیکن عربوں میں بیشتر لوگ مجھے خوش نظر آئے۔ ان کی زندگی سادہ تھی اور وہ فطرت کی آغوش میں مطمئن اور مسرور تھے۔ حالانکہ وہ مغربی اقوام کے غلام تھے اور یہ قومیں ان پر بہت بُرے طریقے سے حکومت کرتی تھیں۔ اہل یورپ کو یہاں حکومت کرتے دیکھ کر اندازہ ہوا کہ انسان انسان کا کس طرح دشمن ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپی قوموں نے اپنے مفادات کے لئے ان معصوم انسانوں کا خوب استحصال کیا''۔

زندگی کے اس تضاد اور سامراج کے اصل کردار نے نوجوان پکتھال کے حساس دل و دماغ میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ انہیں یورپ کی استحصالی قوتوں سے نفرت ہونے لگی اور

مشرق کے مظلوم انسانوں سے ہمدردی ان کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ اس ماحول میں انہوں نے اپنا پہلا ناول SAID THE FISHERMAN (سعید ایک مچھیرا) لکھا جسے یورپ کے بیشتر ناشروں نے چھاپنے سے انکار کر دیا۔ البتہ میسرز میوتھین نے اسے شائع کر دیا اور پھر فرانسیسی' جرمن اور دیگر یورپی زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔

مشرق وسطیٰ کی سیاحت کے بعد پکتھال انگلستان واپس چلے گئے اور کئی سال لندن' سفک اور پھر سوئٹزرلینڈ میں مقیم رہے۔ اس دوران میں پڑھنا اور غور و فکر کرنا ان کے محبوب مشاغل تھے' مگر ان کی بے اطمینانی بڑھتی جا رہی تھی اور یورپ کا ماحول انہیں سچا سکون اور اطمینان فراہم کرنے سے قاصر تھا۔ اسی دوران برطانوی سفیر لارڈ کرومر نے انہیں مصر بلوا بھیجا تاکہ اہل مصر کی نفسیات کے سلسلے میں ان کی رہنمائی حاصل کرے۔ یہ وہ دور تھا جب مصر میں سخت بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی اور اگرچہ برطانوی سامراج اپنے پورے عروج پر تھا مگر مصر کے لوگ اس کی قاہرانہ سطوت کو خاطر میں لائے بغیر بغاوتوں اور شورشوں میں مصروف رہتے تھے۔

۱۹۰۴ء میں پکتھال مصر پہنچے تو بعض حلقوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ وہ برطانیہ کی خفیہ سروس سے تعلق رکھتے ہیں حالانکہ اس کا حقیقت سے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ پکتھال نے مصر کے تعلیمی اداروں کے تفصیلی دورے کیے جس سے اہل مصر کی معاشرت کے نئے گوشے ان پر وا ہوئے اور عربی زبان کی استعداد میں بھی اضافہ ہوا۔ اپنے تجربات اور مشاہدات پر مبنی انہوں نے دو کتابیں مرتب کر کے شائع کیں۔ CHILDREN OF THE NILE اور VEILED WOMAN

مصر سے پکتھال اپنی اہلیہ کے ساتھ بیروت گئے۔ وہاں سے شام پہنچے اور پھر بیت المقدس میں خاصا عرصہ قیام کیا۔ اس سفر میں انہوں نے عربی کی تحصیل مکمل کی۔ اسلام کے بارے میں اپنی معلومات میں اضافہ کیا اور مشہور علماء سے طویل طویل گفتگوئیں کیں۔ اس زمانے میں وہ اسلام سے اس قدر متاثر ہو چکے تھے کہ مسجدِ اقصیٰ میں شیخ الجامعہ سے عربی پڑھتے پڑھتے انہوں نے قبولِ اسلام کا ارادہ ظاہر کیا۔ شیخ معمر تھے اور جہاندیدہ بھی۔ انہوں نے یہ دیکھ کر کہ ایک جوان آدمی کا یہ جذباتی فیصلہ نہ ہو' انہیں صلاح دی کہ اپنے

والدین سے مشورہ کر لیں اور سوچ سمجھ بھی لیں۔ پکتھال لکھتے ہیں: "اس مشورے نے میرے دل پر عجیب اثر کیا۔ میں تو عام یورپیوں کی طرح یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ مسلمان دوسرے مذاہب کے لوگوں کو مسلمان کرنے پر تلے رہتے ہیں مگر اس گفتگو نے میری رائے بدل دی اور میں یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا کہ مسلمان تو بڑے روادار اور حقیقت پسند ہیں۔ ان پر متعصب ہونے کا خواہ مخواہ الزام لگایا جاتا ہے"۔

اسلام کے بارے میں پکتھال کا براہ راست مطالعہ جاری رہا اور وہ شدت کے ساتھ اس کا اثر قبول کرتے رہے۔ مصر و شام کے علاوہ انہوں نے عراق اور ترکی کی بھی سیاحت کی۔ ترکی زبان بھی سیکھی اور ان ملکوں کے مسلم معاشروں کا انہوں نے قریب سے اور خاص توجہ سے مشاہدہ کیا اور ان ساری چیزوں نے مل کر ان کے دل و دماغ کا یوں احاطہ کیا کہ انہوں نے عربی لباس پہننا شروع کر دیا اور اسلام کی حقانیت ان کی روح میں اترتی چلی گئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب خلافتِ عثمانیہ میں اندرونی خلفشار پیدا ہو رہا تھا اور یورپی طاقتیں خلافت کی قوت توڑنا چاہتی تھیں۔ جنگِ طرابلس اور جنگِ بلقان میں خلافتِ عثمانیہ کو شکست ہو چکی تھی۔ مارماڈیوک پکتھال کا خیال تھا کہ یورپی طاقتیں محض مذہبی تعصب اور اسلام دشمنی کے سبب خلافتِ عثمانیہ کے ٹکڑے کرنا چاہتی ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں وہ مشرقِ اوسط سے واپس انگلستان گئے اور اینگلو عثمانیہ سوسائٹی قائم کی۔ اس سوسائٹی کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ترکوں کے ساتھ جو زیادتیاں ہو رہی ہیں ان کا تدارک ہو، مگر شدید مخالفانہ اور متعصبانہ فضا میں یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی اور غیر معمولی ذہنی دباؤ کے تحت پکتھال بیمار ہو گئے۔

بقول پکتھال: "فروری ۱۹۱۳ء میں میں نے چند ماہ کے لئے ترکی جانے کا ارادہ کیا تاکہ اس فضا سے چھٹکارا پا سکوں جس نے مجھے بیمار کر دیا تھا۔ بیسویں صدی کے ان ایام میں برطانوی اخبارات اور عوام ترکوں کے خلاف اس صلیبی جنگ کے نعروں کی پرجوش حمایت کر رہے تھے جو بعض عیار بلقانی حکمرانوں نے بلند کئے تھے۔ ایک مسلم طاقت کے خلاف عیسائیوں کی اس یکجہتی اور اتحاد کو بہت سے لوگوں نے سراہا، لیکن اس سے ان انگریزوں کے دل ٹوٹ گئے جو مشرق سے پیار کرتے تھے۔ اس وقت مجھے یوں لگتا تھا کہ جیسے عیسائیت دو طرح کی ہے۔ ایک وہ جس کی خیر اندیشیاں اور فیض رسانیاں صرف مسیحی

اقوام تک محدود تھیں اور دوسری وہ جو ساری دنیا کو بلا لحاظ مذہب و نسل عدل و انصاف اور سخاوت کا مستحق سمجھنے کی دعویدار ہے۔ مگر روس' انگلستان' اور بلقانی ریاستوں میں پہلی قسم کی عیسائیت کا دور دورہ تھا۔ یہ مذہبی جنون اور تعصب و تنگ نظری کی وہی کیفیت تھی جو اگر کم علم' جاہل مسلمانوں میں نمودار ہوتی تو ہم اس کی مذمت کرتے نہیں تھکتے مگر خود اس کا بار بار مظاہرہ کرتے ہیں''۔

پکتھال ترکوں سے پہلے ہی متاثر تھے مگر اب انہیں کئی ماہ تک یکسوئی کے ساتھ وہاں قیام کا موقع ملا تو ترکوں کی سماجی اور طبعی خوبیوں نے انہیں مکمل طور پر اپنا اسیر بنالیا۔ چنانچہ غازی طلعت بک اور دوسرے ترک رہنماؤں کا ذکر وہ یوں کرتے ہیں: ''ایک روز میں نے طلعت بک سے کہا: آپ یونہی غیر مسلح پھرتے رہتے ہیں۔ آپ کو اپنے ساتھ اسلحہ بردار محافظ رکھنے چاہئیں۔ جواب میں انہوں نے فرمایا کہ خدا سے بڑھ کر میرا کوئی محافظ نہیں۔ مجھے اسی پر اعتماد ہے اور موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ اسلام کی یہی تعلیم ہے۔''

پکتھال غازی انور پاشا' شوکت پاشا' غازی رؤف بک اور دوسرے ترک رہنماؤں کا تذکرہ بھی بڑی عقیدت اور والہانہ محبت سے کیا کرتے۔ ان کا تاثر تھا کہ لوگ ناحق ترکوں پر آزاد خیالی اور لادینی کا الزام دھرتے ہیں۔ میں نے انہیں ہمیشہ خدا سے ڈرنے والا مسلمان پایا۔

قیام ترکی کے دوران پکتھال نے قبول اسلام کا مصمم ارادہ کرلیا۔ چنانچہ انہوں نے غازی طلعت بک سے کہا: ''میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں''۔ اس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ ''قسطنطنیہ میں قبول اسلام کا اعلان نہ کیجئے بہتر ہے کہ اس کا اعلان لندن سے ہو۔ یورپ میں اس کے تبلیغی نتائج زبردست رہیں گے''۔ اسی مشورے کا نتیجہ تھا کہ پکتھال صاحب نے لندن جا کر دسمبر ۱۹۱۴ء میں اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا جس سے وہاں کی علمی اور سیاسی دنیا میں ہلچل مچ گئی۔ عیسائی دنیا کا عمومی تبصرہ یہ تھا کہ جس مذہب کو پکتھال جیسا شخص قبول کرتا ہے اس میں یقیناً بہت سی اچھائیاں ہوں گی۔

قبول اسلام کے موقع پر پکتھال کے تاثرات یہ تھے: ''میں اپنے زور مطالعہ سے مسلمان ہوا ہوں اور میرے دل میں اس کی بے حد قدر ہے۔ مسلمانوں کو اسلام ورثے

میں ملا ہے۔ اس لیے وہ اس کی قدر نہیں پہچانتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام امن و عافیت کا گہوارہ ہے اور اس نعمت پر میں خدائے بزرگ و برتر کا جس قدر شکر ادا کروں کم ہے"۔

جنگِ عظیم اوّل شروع ہوئی تو انہوں نے پوری کوشش کی کہ انگریزوں اور ترکوں کے درمیان صلح ہو جائے۔ جنگ ختم ہونے پر انہوں نے خلافت کی بقا کی جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کیا' مگر افسوس انگریزوں کے تعصب اور غرور کے سامنے پکتھال کی ساری کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ یوں بھی جب مصطفیٰ کمال پاشا نے خود ہی خلافت کا قلع قمع کر دیا تو ترکی کے ساتھ پکتھال کی دلچسپیاں مدھم پڑ گئیں۔

جنگِ عظیم کے دوران محمد مارماڈیوک پکتھال لندن میں تبلیغ اسلام کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ وہ جمعہ کا خطبہ دیتے' امامت کراتے' عیدین پڑھاتے اور رمضان میں تراویح کے امام ہوتے۔ رسالہ "اسلامک ریویو" کی ترتیب و تدوین بھی انہی کے سپرد تھی۔ اس دوران میں وہ "ادارہ معلوماتِ اسلامی" سے بھی منسلک رہے۔ اس زمانے میں ترکی کے حق میں متعدد مضامین کے علاوہ ان کی تین کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ یعنی ٹیلو فرام قائیو جمیز (۱۹۱۵ء)' وی ہاؤس آف وار (۱۹۱۶ء) اور نائٹس آف اعرابی (۱۹۱۷ء)۔

۱۹۲۰ء میں جناب عمر سبحانی کی دعوت پر پکتھال بمبئی آگئے۔ وہاں کے مشہور اخبار "بمبئے کرانیکل" کی ادارت سنبھالی اور ۱۹۲۴ء تک اس ذمہ داری کو نباہتے رہے۔ انہوں نے بے شمار اداریوں میں یہ بات مکمل کر لکھی کہ خلافتِ عثمانیہ کی تباہی میں عیسائی دنیا کا کیا کردار تھا اور یہ کہ عالمِ اسلام کے خلاف انگریز کس انداز کی سازشوں میں معروف ہیں۔ غرض اس دوران میں انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں اور ترکوں کے مسائل میں گہری دلچسپی لی۔ ہندوستان کی مقامی سیاست میں جزوی طور پر حصہ لیا اور ناگپور اور بڑوچ میں کانگرس کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی۔ ہندوستانی طرزِ معاشرت پر انہوں نے کہانیاں بھی لکھیں اور ایک انسائیکلو پیڈیا کے لئے بمبئی اور گجرات کے بارے میں دو بھرپور مقالے بھی قلم بند کیے۔

۱۹۲۴ء میں انہوں نے "بمبئے کرانیکل" کی ادارت ترک کر دی اور مغربی گھاٹ (دکن) میں کچھ دن آرام کرنے کے لئے چلے گئے۔ یہیں انہیں نظام حیدر آباد کی جانب

سے دکن کے وزیرِ اعظم سر اکبر حیدری اور ناظمِ تعلیمات سر راس مسعود کے خطوط ملے جس میں اس خواہش کا اظہار کیا گیا تھا کہ پکتھال اپنی خدمات حیدر آباد دکن کے سپرد کر دیں چنانچہ موصوف نے نظام کے حکم پر چادر گھاٹ کالج کی پرنسپلی قبول کر لی اور یکم جنوری ۱۹۲۵ء کو یہ ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

پکتھال حیدر آباد دکن کے ماحول اور معاشرت سے بے حد متاثر ہوئے۔ اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں:- ''حیدر آباد ایک شاندار جگہ ہے۔ ناقابلِ بیان حد تک خوبصورت۔ یہ آفتابِ مغلیہ کی ایک ضوفشاں کرن ہے۔ تہذیب و ثقافت میں اس کا مشرق میں کوئی جواب نہیں۔'' دکن اور اس کی تہذیب سے پکتھال کا گہرا قلبی لگاؤ آخر وقت تک قائم رہا۔ انہوں نے چادر گھاٹ کالج کو ترقی دینے کے لئے خوب محنت کی۔ طلبہ کی کردار سازی کے لئے خصوصی اقدامات کئے اور بہت جلد اسے ایک مثالی ادارہ بنا دیا۔ ان خدمات کی قدر کرتے ہوئے حضور نظام نے انہیں ریاست کی سول سروس ہاؤس کا منتظمِ اعلیٰ بنا دیا۔ اس ادارے میں حیدر آباد سول سروس کے تمام اعلیٰ عہدیدار تعلیم و تربیت حاصل کیا کرتے تھے۔

۱۹۲۷ء میں پکتھال نے ''اسلامک کلچر'' کے نام سے ایک سہ ماہی انگریزی رسالے کا اجرا کیا جس کے سرپرستِ اعلیٰ حیدر آباد کے وزیرِ اعظم سر اکبر حیدری تھے۔ اس رسالے میں علمی اور تحقیقی نوعیت کے مضامین شائع ہوتے تھے جن میں اسلامی تعلیمات کا اثبات دلائل و براہین کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ انہوں نے اس رسالے کو ہندوستان میں اپنی نوعیت کا منفرد جریدہ بنانے کے لئے سخت محنت کی۔ ایک ایسا علمی جریدہ جو ہر پہلو سے اسلامی ثقافت اور روایات کا آئینہ دار ہو۔ اپنے عہدِ ادارت میں انہوں نے متعدد مستشرقین کو اس رسالے میں لکھنے پر آمادہ کیا اور دنیا بھر کی ستر یونیورسٹیاں اس کے خریداروں میں شامل ہو گئیں۔ اشاعت کے لئے آنے والے مضامین کو وہ اکثر دوبارہ لکھتے اور رسالے کے اعلیٰ علمی معیار کو کسی صورت بھی کمزور نہ ہونے دیتے۔ چونکہ پکتھال دنیا کی بہت سی زبانیں جانتے تھے اس لئے وہ ان زبانوں کے علما اور محققین کے مقالات کا آسانی سے ترجمہ کر لیتے۔ تازہ ترین کتابوں پر تبصرہ بھی خود کرتے اور یوں انگریزی خواں طبقہ دنیا بھر میں اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے چھپنے والی کتابوں سے باخبر ہو جاتا۔

۱۹۲۷ء میں پکتھال نے مدراس میں مختلف اسلامی موضوعات پر متعدد لیکچر دیئے۔ سالانہ لیکچروں کا یہ اہتمام اسی شہر کے ایک دیندار اور علم دوست تاجر جمال محمد کرتے اور اس میں مختلف مشاہیر اپنے رشحاتِ فکر پیش کرتے تھے۔ ان لیکچروں کے موضوعات میں اسلامی تہذیب و ثقافت کے مختلف پہلو شامل تھے۔ جو بعد میں ''کلچرل سائیڈ آف اسلام'' کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ تعلیم یافتہ سنجیدہ طبقے میں یہ لیکچر بہت پسند کئے گئے۔

پکتھال کا سب سے بڑا لازوال اور عظیم کارنامہ ان کا ترجمۂ قرآن ہے۔ اس سے قبل انگریزی زبان میں قرآن مجید کے جتنے ترجمے ہوئے تھے وہ غیر مسلم مستشرقین اور علما نے کئے تھے اور مختلف مواقع پر موصوف نے شدت سے محسوس کیا تھا کہ ان مترجمین کا رویہ اسلام اور قرآن کے بارے میں معاندانہ اور تعصب پر مبنی ہے۔ اس لئے وہ قرآن پاک کے مطالب سے انصاف نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی تھی کہ کوئی راسخ العقیدہ مسلمان ترجمے کا فریضہ انجام دے۔ حیدر آباد میں انہوں نے اس مبارک کام کا ارادہ کیا اور یہ خبر نظام تک پہنچی تو انہوں نے اس منصوبے پر خوشنودی کا اظہار کیا اور پوری تنخواہ کے ساتھ انہیں دو سال کی رخصت عطا فرمائی تاکہ ترجمے کا کام کامل سکونِ توجہ اور یکسوئی کے ساتھ مکمل ہو۔ جب ترجمہ مکمل ہو گیا تو نظام نے اپنے خرچ پر پکتھال کو مصر بھیجا تاکہ علمائے ازہر سے ضروری نکات پر مشورہ کیا جا سکے۔ چنانچہ موصوف نے قاہرہ میں کئی ماہ قیام کیا اور جامعہ ازہر کے شیخ مصطفیٰ المراغی اور علامہ محمد احمد الغمراوی سے طویل ملاقاتیں اور مشورے کئے اور بعض دیگر علماء فضلاء سے بھی قرآنِ حکیم کے مشکل مقامات پر بحث و مباحثہ کیا اور جہاں ضروری سمجھا ترجمہ پر نظرِ ثانی کی۔ بالآخر تین سال کی محنتِ شاقہ رنگ لائی اور ۱۹۳۰ء میں یہ ترجمہ THE GLORIOUS QURAN کے نام سے بیک وقت لندن اور نیویارک سے شائع ہوا۔ یہ نسخہ دو جلدوں میں حیدر آباد دکن سے بھی شائع ہوا اور اس کے جملہ اخراجات حضور نظام نے برداشت کئے۔

محمد مارماڈیوک پکتھال ترجمۂ قرآن کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''اس ترجمہ کا مقصد انگریزی خواں طبقے کے سامنے یہ امر پیش کرنا ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان قرآن کے الفاظ سے کیا مفہوم لیتے ہیں۔ اس کا مقصد قرآن

کی ماہیت کو موزوں الفاظ میں سمجھاتا اور انگریزی بولنے والے مسلمانوں کی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ یہ دعویٰ بڑی سنجیدگی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے کہ کسی الہامی کتاب کو ایک ایسا شخص عمدگی کے ساتھ پیش نہیں کر سکتا جو اس کے الہامات اور پیغام پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ یہ پہلا انگریزی ترجمہ ہے جو ایک ایسے انگریز نے کیا ہے جو مسلمان ہے جبکہ بعض تراجم میں ایسی تعبیریں کی گئی ہیں جو مسلمانوں کے لئے دلآزار ہیں اور تقریباً سب میں زبان کا ایسا اسلوب اختیار کیا گیا ہے جسے مسلمان غیر موزوں سمجھتے ہیں۔ یہ قدیم علما کا اور میرا عقیدہ ہے کہ قرآن کا ترجمہ ناممکن ہے۔ میں نے اس کتاب کو علمی انداز میں پیش کیا ہے اور اس کے لئے کوشش کی گئی ہے کہ موزوں زبان استعمال کی جائے۔ لیکن بہرحال یہ ترجمۂ قرآن مجید نہیں ہو سکتا کہ قرآن تو بے مثل و بے عدیل ہے۔ قرآن میں تو اتنی اثر انگیزی ہے کہ لوگ اسے سنتے ہی رونے لگتے ہیں اور وجد میں آجاتے ہیں۔ یہ تو قرآن کے مفہوم کو انگریزی زبان میں پیش کرنے کی محض ایک کوشش ہے اور اس کے سحر کی قدرے عکاسی کی گئی ہے۔ یہ عربی قرآن کی جگہ نہیں لے سکتا۔ نہ میرا یہ مقصد ہے''۔

چنانچہ یہ پہلا انگریزی ترجمۂ قرآن ہے جس میں بائبل کے سے ترجمے کا لطف آتا ہے اور نہ صرف صحت' سلاست' اور فصاحت کے اعتبار سے مقبول ترین ہے بلکہ پُر شکوہ اور بے پناہ اثر آفریں ہے۔ محترمہ مریم جمیلہ نے اس ترجمے کو یوں خراج تحسین پیش کیا ہے:۔

''مجھے اس کے مقابلے کا کوئی انگریزی ترجمہ نہیں مل سکا۔ کسی ترجمے میں وہ فصاحت' بلاغت اور دلنشیں اندازِ بیان نہیں جو اس میں موجود ہے۔ بہت سے دوسرے تراجم میں اللہ کے لئے ''گاڈ'' کا لفظ استعمال کرنے کی غلطی کی گئی ہے لیکن پکتھال نے ہر جگہ ''اللہ'' ہی استعمال کیا ہے۔ اس سے اسلام کے پیغام میں مغرب کے قاری کے لئے بڑی تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔'' بہرحال پکتھال صاحب کی اس عظیم دینی اور علمی خدمت کو پورے عالم اسلام میں سراہا گیا اور حضور نظام نے انہیں پہلی گول میز کانفرنس میں سلطنت آصفیہ دکن کے وفد کا سیکرٹری نامزد کیا۔

جنوری ۱۹۳۵ء میں محمد مارما ڈیوک پکتھال حیدر آباد ایجوکیشنل سروس سے مستعفی ہو گئے۔ سرکار نظام نے تاحیات پنشن مقرر کر دی اور پکتھال واپس انگلستان چلے گئے اور وہاں ہمہ تن تبلیغ دین میں مصروف ہو گئے۔ اسلامک کلچر جو پہلے حیدر آباد سے چھپتا تھا اب لندن سے چھپنے لگا۔ رائل سنٹرل ایشین سوسائٹی لندن کی طرف سے ان کے سلسلہ وار مضامین "جدید دنیا میں مسلمانوں کا کردار" بھی شائع ہونے لگے۔

اس طرح بقیہ حیات مستعار کا ایک ایک لمحہ دین حق کی تبلیغ و اشاعت میں صرف کرتے ہوئے یہ عظیم مسلمان' بے مثل عالم اور مفکر و مبلغ ۱۹ مئی ۱۹۳۶ء کی صبح کو حرکت قلب بند ہونے سے وفات پا گئے۔ ۱۸ مئی کی رات سونے سے پہلے انہوں نے ایک سادہ کاغذ پر قرآن پاک کی یہ آیت اور اس کا انگریزی ترجمہ تحریر کیا۔

> بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ترجمہ: حق یہ ہے کہ جو بھی اپنی ہستی کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے اور عملاً نیک روش پر چلے تو اس کے لئے اس کے رب کے پاس اجر ہے اور ایسے لوگوں کے لئے خوف یا رنج کا کوئی موقع نہیں۔ (البقرہ: آیت ۱۱۲)

گویا اللہ تعالیٰ نے دنیا ہی میں محمد مارما ڈیوک پکتھال کو کامیابی اور خوشنودی کا مژدہ سنا دیا۔ یہ نصیب اللہ اکبر..... انہیں لندن میں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ اگرچہ ان کی دیرینہ تمنا تھی کہ ان کی موت سپین میں ہو اور وہیں دفن ہوں۔ سپین کے اسلامی دور سے انہیں بے حد محبت تھی۔

پکتھال یورپین ہونے کے باوجود مکمل طور پر اسلامی اخلاق سے آراستہ تھے۔ پنج گانہ نمازوں اور رمضان کے روزوں میں کبھی ناغہ نہ ہونے دیتے۔ قدم قدم پر اللہ اور رسول ﷺ کا ذکر فرماتے۔ اللہ پر ان کا ایمان بڑا محکم تھا۔ ہر کام اس کی رضا کے مطابق انجام دیتے۔ بے حد شریفانہ جذبات کے مالک تھے۔ حیدر آباد کے قیام کے دوران غریب اور نادار طلبہ کی دل کھول کر مالی امداد کرتے۔ بے تعصب اور بے ریا انسان تھے اور ان سے ملنے والے ایمان کی تازگی محسوس کرتے تھے۔ مشہور مصنف شیخ عطاء اللہ لکھتے ہیں:

"مجھے علی گڑھ میں ان کے چند شاگردوں سے ملاقات کا موقع میسر آیا۔ ان میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ لیکن ہر ایک ان کے خلوص اور ان کی شفقت پدرانہ کا مداح تھا"۔

کتابیات:

۱: پروفیسر ڈاکٹر اختر راہی ("فکر و نظر" اسلام آباد مئی ۱۹۸۱ء)

۲: "نگار پاکستان" کراچی (اگست ۱۹۶۸ء)

۳: روزنامہ "مشرق" ۴ نومبر ۱۹۸۳ء

۴: "اسلامی انسائیکلو پیڈیا" (مکتبہ شاہکار)

۵: "عظمت رفتہ" (ضیاء الدین برنی)

۶: "چند یادیں چند تاثرات" (عاشق حسین بٹالوی)

●......●......●

الحاج ملک الشہباز (میلکم ایکس)

(امریکہ)

(MALCOM X)

امریکہ میں اشاعتِ اسلام کے حوالے سے میلکم ایکس کا نام اہم ترین حیثیت کا حامل ہے۔ مختلف اخلاقی خرابیوں میں لت پت اس ذہین وفطین نیگرو نے اسلام قبول کیا تو اس کی مسحور کن شخصیت اور دل میں اتر جانے والے خطابات نے بالخصوص امریکہ کی سیاہ فام آبادی کو مسخر کر لیا اور لاکھوں کی تعداد میں لوگ جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے۔ افسوس باطل کی قوتیں اسے برداشت نہ کر سکیں اور عین چالیس سال کی عمر میں اسے ایک نسل پرست دہشت گرد کی گولی نے موت کی نیند سلا دیا۔ لیکن عجیب بات یہ دیکھنے میں آئی کہ اس کی موت نے اس کی تبلیغی تحریک کی رفتار کو تیز تر کر دیا اور آج نہ صرف اس کے دشمن نسل پرستوں کا مکمل خاتمہ ہو چکا ہے بلکہ میلکم ایکس کے خون سے نورِ ایمان پانے والے خوش نصیب حضرات کی تعداد کم از کم ۳۵ لاکھ ہو چکی ہے۔

ذیل میں امریکہ کے اس پہلے اولوالعزم شہید کی روداد حیات پیش کی جا رہی ہے۔

میلکم ایکس ۱۹۲۵ء میں امریکہ کی ریاست مشی گن کے شہر میسن سٹی (Mason City) میں پیدا ہوئے۔ ان کا والد کٹر اور مخلص عیسائی پادری تھا۔ وہ خاموش طبع حقیقت پسند انسان تھا' اپنے فرائض نبھاتا' سب سے خیرخواہانہ برتاؤ رکھتا اور قناعت پسندی سے چرچ سے ملنے والے معمولی وظیفے پر گزران کرتا تھا' لیکن ان ساری خوبیوں کے باوجود سفید فام نسل پرست عیسائی اسے پریشان کرنے کا کوئی موقع ضائع نہ کرتے اور بہانے بنا

بنا کر اسے دہشت گردی کا نشانہ بناتے۔ میلکم کی یادداشتوں کے مطابق "میری والدہ نے مجھے بتایا کہ میلکم تم پیدا ہونے والے تھے کہ ایک رات دہشت گرد نسل پرستوں نے ہمارے گھر پر حملہ کر دیا۔ وہ تمہارے باپ کی تلاش میں تھے جو خوش قسمتی سے گھر پر موجود نہ تھے اور کسی تبلیغی اجتماع میں گئے ہوئے تھے۔ دہشت گردوں کو جب شکار نہ ملا تو انھوں نے گھر کی ہر چیز توڑ پھوڑ دی، کار کو آگ لگا دی اور دھمکیاں دیتے ہوئے چلے گئے"۔ میلکم کے مطابق میرے والد کا ایک قصور یہ بھی تھا کہ وہ ایک ایسی تنظیم سے ہمدردی رکھتے تھے جو سیاہ فاموں کے حقوق کے لئے کام کرتی تھی۔ بہرحال میلکم کی پیدائش کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ نسل پرست جنونیوں نے ان کے والد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

میلکم بچپن ہی میں یتیم ہو گئے۔ چرچ نے معمولی سی امداد کی لیکن وہ بہت ناکافی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خاندان مالی مشکلات کا شکار ہو کر بکھر گیا۔ جس کا جہاں سینگ سمایا چلا گیا۔ صرف میلکم اور اس کی والدہ رہ گئیں۔ میلکم کہتے ہیں: "میری والدہ ہی نے میری پرورش کی۔ میں اپنی والدہ کو سخت محنت کرتے ہوئے دیکھتا، تو غم زدہ ہو جاتا"۔

میلکم نے پرائمری تک تعلیم سفید فاموں کے ایک اسکول میں حاصل کی جہاں ہر لمحے اسے سفید فام ساتھیوں کے تحقیر آمیز سلوک کا سامنا کرنا پڑتا اور اس کا ننھا سا دل کرچی کرچی ہو جاتا اور حالانکہ وہ ذہانت کے اعتبار سے کلاس کے تین نمایاں طالب علموں میں سے ایک تھا، لیکن اساتذہ کا رویہ حوصلہ شکنی پر مبنی ہوتا۔ مثال کے طور پر ایک روز ایک استاد نے اس سے پوچھا "تم بڑے ہو کر کیا پیشہ اختیار کرو گے"؟

"میں قانون دان بنوں گا"۔ میلکم نے جواب دیا۔

"ہوں"۔ استاد نے بھنویں سکیڑتے ہوئے حقارت سے کہا: "تم قانون دان کیسے بن سکتے ہو۔ بہتر ہے تم لکڑی کا کام سیکھ لو۔ فرنیچر اچھا بنا سکو گے"۔

دل شکنی اور دیگر مسائل کے اس ماحول میں میلکم نے ابتدائی ضروری تعلیم مکمل کی اور ۱۹۴۰ء میں جب کہ اس کی عمر پندرہ سال تھی وہ مشی گن سے بوسٹن آ گیا جہاں اس کی بڑی بہن رہتی تھی۔ یہاں وہ بالکل ہی نئے ماحول سے آشنا ہوا۔ موصوف لکھتے ہیں:

"میں نے ایک نائٹ کلب میں نوکری کر لی۔ لیکن یہ کام مجھے پسند نہ آیا اور کلب

کے باہر ہی بوٹ پالش کرنے کا دھندا شروع کر دیا اور اس طرح یہاں میں نے امریکی معاشرت کو بہت ہی قریب سے دیکھا جو شراب، جوئے، منشیات اور جرائم کی بے شمار قسموں میں سرتاپا ڈوبا ہوا ہے۔ بدقسمتی سے میں بھی اپنے دامن کو ان آلودگیوں سے محفوظ نہ رکھ سکا اور غیر شعوری طور پر ان میں ملوث ہوتا چلا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ پوری کی پوری امریکی معاشرت جنگل کے قانون کی عکاسی کرتی ہے جہاں فریب کاری اور عیاری انسان کا اصل جوہر قرار پاتا ہے۔ توجہ سے دیکھیں تو قانون اور اصول وہاں قدم قدم پر رسوا ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں''۔

بہرحال میلکم اس زمانے میں منشیات اور جرائم کی دنیا میں ڈوب گئے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس زمانے میں میرا عقیدہ تھا کہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر طرح کا جھوٹ، فریب، اور مکاری اور زیادتی جائز ہے۔ عورت کی حیثیت میرے نزدیک حصول لذت کے سوا کچھ بھی نہ تھی۔ پھر ایک دن میں ایک ایسے جرم میں گرفتار کر لیا گیا جو میں نے کیا ہی نہ تھا اور دس سال کے لیے جیل میں ڈال دیا گیا۔ یہاں میں نے دیکھا کہ جیل تو گویا جرائم کی تربیت گاہ ہے۔ وہاں کیا کچھ نہیں ہوتا۔ غنڈہ گردی، نشہ بازی اور ہر طرح کے اخلاقی جرائم۔ لیکن اللہ کو میری بہتری منظور تھی۔ وہاں کچھ لوگ اصلاح و تعمیر کا کام بھی کر رہے تھے۔ انہی میں سے کسی شخص نے مجھے عالیجاہ محمد کی تحریک ''نیشن آف اسلام'' کا تعارفی لٹریچر دیا اور یہ لٹریچر میری زندگی میں انقلاب کا باعث بن گیا۔ میں نے اس سے قبل اسلام کا نام تک نہ سنا تھا نہ کسی مسلمان سے میرا کبھی تعارف ہوا تھا۔ لہٰذا خدا (GOD) کا نام بھی میں نے بعض فلموں کے مکالموں میں سنا تھا اور بس۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ فرصت کے اس طویل دور میں میں نے اسلام کے بارے میں اچھی خاصی معلومات حاصل کر لیں۔ میں نے اسلامی تہذیب و تاریخ کے بارے میں متعدد کتابیں پڑھ ڈالیں اور پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی سیرت اور شخصیت کا بھی خوب مطالعہ کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام نے میرے دل میں گھر کر لیا۔ میں اس کے ایک ایک پہلو سے بے پناہ متاثر ہوا جس کے زیر اثر میرے قلب و دماغ ایک نئے انقلاب سے آشنا ہوئے۔ میں نے ساری بری حرکتیں ترک کر دیں۔ شراب نوشی سے توبہ کر لی حتیٰ کہ سگریٹ تک پینا چھوڑ دیا اور جیل ہی

میں اسلام قبول کر لیا اور ملک الشہباز کا نام اختیار کیا''۔

چنانچہ میلکم جیل سے باہر نکلے تو مکمل طور پر ایک بدلے ہوئے انسان تھے۔ لیکن عقاید کی حد تک وہ عالیجاہ محمد کے پیروکار تھے۔ یہ نسل پرست سیاہ فام رہنما ''نیشن آف اسلام'' کے نام سے صرف سیاہ فاموں میں ایک تحریک چلا رہا تھا جس کے عقائد خودساختہ اور گمراہ کن تھے۔ یعنی خدا کالے رنگ کا ہے' جنت میں صرف کالے جائیں گے اور سفید فاموں پر جنت حرام ہے۔ اسی طرح ''نیشن آف اسلام'' نے یہ بات بھی پھیلائی تھی کہ شیطان سفید فام ہے اور کالے خدا کے محبوب بندے ہیں اور عالیجاہ محمد اللہ کا پیغمبر ہے جو براہ راست خدا سے ملاقات کرتا ہے۔ خدا اس کے پاس ایک شخص W.FARD کے روپ میں آتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

دراصل یہ تحریک سفید فام امریکیوں کی اس نفرت اور دہشت گردی کے خلاف ایک ردِعمل اور جوابی تحریک تھی جس کا نشانہ سیاہ فام آبادی بنتی رہتی تھی۔ چنانچہ بیس ملین (دو کروڑ) سیاہ فاموں نے ''نیشن آف اسلام'' کی رکنیت اختیار کر لی اور سفید فاموں سے کٹ کر اپنی الگ معاشرت قائم کر لی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جس طرح حضرت موسیٰؑ یہودیوں کی طرف اور حضرت عیسیٰؑ عیسائیوں کی جانب مبعوث ہوئے تھے اور حضرت محمد ﷺ مسلمانوں کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے تھے اسی طرح عالیجاہ محمد امریکہ کے افریقی باشندوں کے لیے باقاعدہ پیغمبر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

میلکم لکھتے ہیں: ''یہ تھا وہ اسلام جس پر مَیں ایمان لایا تھا۔'' لیکن خوش قسمتی سے ان کی ملاقات سعودی سفارت خانے کے ایک اعلیٰ افسر سے ہو گئی جس نے انہیں قرآنِ حکیم کا انگریزی ترجمہ اور بعض اسلامی کتب پیش کیں۔ ان کے مطالعے سے میلکم پر انکشاف ہوا کہ عالیجاہ محمد کی تعلیمات کا اسلام یا قرآن کی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں اور نہ اس کی ذاتی زندگی میں اسلام کا کوئی عمل دخل ہے۔ خوش قسمتی سے انہیں سعودی عرب کی دعوت پر حج کی سعادت حاصل ہو گئی جہاں انہوں نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں ایک نئی دنیا کا مشاہدہ کیا۔ پورے کرۂ ارض سے آئے ہوئے ہر ملک اور ہر زبان اور رنگ و نسل کے مسلمان بے خدا اپنائیت' اخوت' یگانگت اور یکرنگی کے ماحول میں اپنے رب کو پکار رہے تھے اور اپنے

رسول ﷺ سے محبت و شیفتگی کا اظہار کر رہے تھے۔ تب میلکم کو اسلام کی عالمگیریت اور ہمہ جہتی کا اندازہ ہو گیا۔ انہوں نے عالیجاہ محمد کی ''نیشن آف اسلام'' سے ناطہ توڑ کر صحیح اور خالص اسلام اختیار کر لیا اور امریکہ واپس آ کر ایک جانب نسلی تعصب کے خلاف جہاد شروع کر دیا اور دوسری طرف رنگ و نسل کے امتیاز کے بغیر سب امریکیوں تک قرآن و سنت کا فطری اور بے میل پیغام پہنچانے لگے۔

میلکم شعلہ بیان مقرر تھے۔ وہ دینِ اسلام کے لیے غیر معمولی اخلاص اور جوش و جذبہ رکھتے تھے چنانچہ جب وہ خطاب فرماتے اور قرآنی تعلیمات اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث اور اسوۂ حسنہ کی مثالیں بیان کرتے تو سننے والے مسحور ہو جاتے۔ ان پر عالیجاہ محمد کا کھوکھلا پن عیاں ہو جاتا اور وہ ''نیشن آف اسلام'' سے تائب ہو کر مخلص مسلمان بن جاتے۔ عالمی ہیوی ویٹ چیمپئن محمد کلے بھی میلکم کی ترغیب سے مسلمان ہوئے اور جس پریس کانفرنس میں انہوں نے اپنے قبولِ اسلام کا اعلان کیا اس میں میلکم بھی موجود تھے۔

میلکم کی کوششیں رنگ لانے لگیں۔ عالیجاہ محمد کے لاکھوں پیروکار راسخ العقیدہ مسلمان ہو گئے۔ بے شمار نیگرو عیسائی بھی حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے اور میلکم کا دائرہ اثر تیزی سے بڑھنے لگا تو عالیجاہ محمد سخت برافروختہ ہوا۔ وہ نام نہاد اسلام اور نسل پرستی کا ڈھونگ رچا کر اپنے پیروکاروں سے بھاری نذرانے اور چندے اکٹھے کرتا اور خوب دادِ عیش دیتا' لیکن اب اسے ایک روایتی دنیادار لیڈر کی طرح اپنا سارا کاروبار ڈوبتا ہوا نظر آنے لگا تو اس ظالم نے ایک مکروہ سازش تیار کی اور ۲۱ فروری ۱۹۶۵ء کو جب میلکم ایک تبلیغی جلسے سے خطاب کر رہے تھے' کسی دہشت گرد نے گولی مار کر انہیں شہید کر دیا اور یوں لگتا ہے کہ چونکہ یہود نواز امریکی انتظامیہ بھی میلکم کی زبردست تبلیغی سرگرمیوں سے خوفزدہ تھی اس لیے نہ کوئی قاتل پکڑا گیا نہ کسی کو سزا ہوئی۔

بظاہر یہ بہت بڑا سانحہ اور نقصانِ عظیم تھا جس سے امریکہ میں اسلامی تبلیغ کو دوچار ہونا پڑا چنانچہ ایک دردمند عرب سفارت کار نے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا کہ اگر ہم دس لاکھ ڈالر خرچ کرتے تب بھی وہ تبلیغی اثرات مرتب نہ ہوتے جو اس شخص کی کوششوں

سے حاصل ہو گئے۔ ایک دوسرے سفیر نے انہیں یوں خراج عقیدت پیش کیا کہ "میلکم کی زندگی سے مجھے عمر فاروقؓ یاد آتے تھے۔ عمر فاروقؓ کے قبول اسلام سے جو تقویت اسلام کو ملی تھی، ویسی ہی قوت میلکم کے مسلمان ہونے سے امریکہ میں اسلام کو حاصل ہوئی۔ وہ عہد حاضر میں یقیناً امریکہ کے عمرؓ تھے"۔

لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ میلکم ایکس کا مقدس خون خوب رنگ لایا۔ عالیجاہ محمد سے خود اس کے پیروکار اور قریبی ساتھی متنفر ہو گئے حتیٰ کہ اس کے اپنے بیٹے ولیس محمد نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور وہ راست العقیدہ مسلمان بن کر میلکم کا عقیدت مند بن گیا۔ اس صدمے سے عالیجاہ محمد دم توڑ گیا اور اس کی تحریک اور عقائد میلکم ایکس کے خون میں ڈوب گئے۔

عالیجاہ کی موت کے بعد ولیس محمد اس کے جانشین بنے اور انہوں نے اپنے باپ کے خود ساختہ نظریات کو باطل قرار دے کر قرآن و سنت پر مبنی تعلیمات کی پیروی کا اعلان کر دیا اور آج صورت حال یہ ہے کہ ۱۹۹۴ء کی رپورٹ کے مطابق میلکم کی تنظیم میں ۲۵ لاکھ سے زاید نیگرو شامل ہو چکے ہیں اور یہ سب پختہ عقائد کے مسلمان ہیں خصوصاً جیلوں میں دینی تبلیغ کا کام بڑی ہی تیزی سے پھیل رہا ہے اور روزانہ بیسیوں جرائم پیشہ افراد مسلمان ہو جاتے ہیں اور اسلام قبول کرتے ہیں۔ ان کے کردار اور رویے میں یکسر انقلاب آ جاتا ہے۔ گزشتہ دنوں سابق ہیوی ویٹ چیمپئن مائیک ٹائسن بھی مسلمان ہو گئے ہیں اور انہوں نے میلکم کے اسلامی نام پر اپنا نام ملک شہباز عبدالعزیز رکھا ہے۔

الحاج ملک الشہباز نے اسلام کے لیے اپنی زندگی قربان کر دی لیکن ان کے پاکیزہ خون کا ایک ایک قطرہ روشنی کا مینار بن گیا اور یہ روشنی امریکہ کے ظلمت کدے میں ایک نئے باب کا اضافہ کر رہی ہے۔ درست فرمایا ہے مولانا محمد علی جوہر نے کہ ع

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

●......●......●

ملک شہباز عبدالعزیز (امریکہ)

(مائیکل ٹائی سن)

(ذیل کا مضمون میرے عزیز دوست اور پیارے بھائی عباس اختر اعوان صاحب (مدیر ماہنامہ ''خواتین میگزین'' لاہور) نے مرتب کیا اور ہفت روزہ ''ایشیا'' کے شمارہ ۲۸۔ اپریل ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔ میں اعوان صاحب کی اجازت اور ان کے شکریے کے ساتھ اسے شامل کتاب کر رہا ہوں۔)

یہ ۲۴ اور ۲۵ مارچ ۱۹۹۵ء کی درمیانی رات کا ایک منظر ہے۔
شمالی امریکہ کی ریاست انڈیانا پولس میں واقع انڈیانا یوتھ سنٹر کے باہر پھیلے ہوئے وسیع و عریض میدان میں ہجوم کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ اس ہجوم میں ہر طبقۂ فکر سے تعلق رکھنے والے لوگ موجود ہیں۔ ان میں نوجوانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے جو وقفے وقفے سے پرجوش نعرے لگا رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں پلے کارڈ اور خیر مقدمی بینرز اٹھا رکھے ہیں۔ ہجوم کی وسعت اور تعداد کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ اس میں شامل صرف صحافیوں کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ یہ صحافی اور فوٹوگرافر عالمی سطح کے متعدد اخبارات و جرائد اور مختلف ریڈیو ٹی وی اسٹیشنوں سے تعلق رکھتے ہیں۔
جب سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا' اچانک ایک مسرت بھری آواز دور تک گونجتی چلی گئی' ''ملک عبدالعزیز آ رہا ہے''۔ اس آواز کے ساتھ ہی جوش و خروش کی ایک لہر ہر طرف پھیل گئی اور پھر ہزاروں آنکھوں نے دیکھا کہ ایک سیاہ فام مرد آہن بڑے وقار اور تمکنت کے ساتھ انڈیانا یوتھ سنٹر نامی جیل کے مین گیٹ سے باہر آ رہا ہے۔ اس کے ارد گرد باڈی گارڈز کا جمگھٹا تھا۔ ویڈیو فلم والوں اور فوٹوگرافروں نے پورے ماحول کو رنگ و نور سے

نہلا دیا تھا۔ یہ مردِ آہن جو اس وقت سب نگاہوں کا مرکز تھا' ملک شہباز عبدالعزیز تھا۔

تین برس قبل جنوری ۱۹۹۳ء کی ایک سرد شام کو جب وہ اس جیل میں آیا تھا تو دنیا اسے مائیکل ٹائی سن کے نام سے جانتی تھی۔ باکسنگ کی تاریخ کا یہ انوکھا کردار جب یہاں پابندِ سلاسل کیا گیا تو وہ ایک سزا یافتہ قیدی اور عیسائی تھا مگر ۲۵۔ مارچ ۱۹۹۵ء کی صبح جب وہ آزاد دنیا میں قدم رکھ رہا تھا تو نئے جذبوں سے سرشار ایک مسلمان تھا۔ گزشتہ تین سالوں میں اس کے اندر حیرت انگیز انقلاب برپا ہو گیا تھا اور اس کا ظاہر و باطن بدل گیا تھا۔ اب مائیک ٹائی سن کہیں دور ماضی کے کھنڈرات میں دفن ہو چکا تھا اور ملک شہباز عبدالعزیز کی صورت میں ایک نیا انسان چلا آرہا تھا جو بند گلے کا کوٹ اور سر پر گول سفید ٹوپی لیے ہوئے تھا۔ دو برس قبل دنیا نے عظیم چیمپئن کے قبولِ اسلام کی جو خبر سنی تھی وہ حرف بحرف درست تھی۔

ملک عبدالعزیز تھوڑی دیر بعد اپنی لیموزین کار میں بیٹھ رہا تھا۔ جونہی کار روانہ ہوئی اس کے ہزاروں مداحوں کا مجمع بھی حرکت میں آگیا اور بصد احترام اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ فضا میں ہیلی کاپٹر گشت کر رہے تھے جن سے پھولوں کی پتیاں پھینکی جا رہی تھیں۔

ملک عبدالعزیز اور ان کے مداحوں کا یہ کاروان پلین فیلڈ اسلامک سینٹر پہنچ گیا۔ سینٹر کے باہر کچھ فاصلے پر ایک بہت بڑا بینر آویزاں تھا: ''ملک شہباز عبدالعزیز! اللہ تعالیٰ آپ کو برکات سے نوازے''۔ یہیں عظیم باکسر محمد علی اور سینٹر کے امام محمد صدیق بھی ملک عبدالعزیز کی پیشوائی کے لیے موجود تھے۔ گلوکار ہیمر بھی نظر آ رہا تھا۔ ملک عبدالعزیز مسجد میں داخل ہوا تو فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھی۔ اس علاقے میں پاکستانیوں کی خاصی بڑی تعداد آباد ہے۔ سینٹر میں اس وقت ۲۰۰ سے زائد افراد موجود تھے جو نمازِ فجر کی ادائیگی کے لیے آئے تھے۔

ملک عبدالعزیز عین اس وقت مسجد میں پہنچا تھا جب نمازِ فجر کے لیے جماعت کھڑی ہونے والی تھی۔ اب نماز شروع ہوئی تو ملک عبدالعزیز بھی صفِ اول میں عام نمازیوں کے درمیان موجود تھا۔ اوہائیو میں ۲۷۔ ایکڑ کی اسٹیٹ کے مالک اور کروڑوں ڈالرز میں کھیلنے والا ملک عبدالعزیز جب سربسجود ہوا تو دور کھڑے صحافی اور فوٹوگرافر بھی اس کی

سسکیاں سن رہے تھے۔ آہنی اعصاب کا مالک ملک عبدالعزیز جس نے اپنے مکوں کی مار سے اب تک لاتعداد مکہ بازوں کو لہو کے آنسو رلایا تھا، بارگاہ رب العالمین میں کھڑا زار و قطار رو رہا تھا۔

نماز سے فارغ ہو کر سینٹر کے امام محمد صدیق نے اعلان کیا کہ مائیک ٹائسن دو سال قبل اسلام قبول کر چکے ہیں اور ان کا اسلامی نام ملک شہباز عبدالعزیز ہے۔ پھر ملک عبدالعزیز نے کھڑے ہو کر ان تمام احباب اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے قید کے دوران میں اس سے ہمدردی کی تھی۔ پھر اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے گویا ہوا کہ یہ سراسر اسی کی مہربانی ہے کہ اس نے میرے لیے راہ ہدایت کشادہ فرمائی۔ مسلمان ہو کر مجھے ایک نئی قوت، نیا جذبہ اور نیا حوصلہ ملا ہے۔ میرے نزدیک اسلام دنیا کا سب سے بڑا امن پسند مذہب ہے۔ پچھلے سالوں میں قید کے دوران مجھے موقع ملا ہے کہ اپنی زندگی تبدیل کرلوں۔ اس دوران میں میری خوب ذہنی تربیت ہوئی ہے۔ اب میں ایک بہترین انسان کی طرح باقی ماندہ زندگی گزارنا چاہتا ہوں جو زیادہ سے زیادہ دوسروں کے کام آسکے۔ میں اسلام کے بارے میں بڑی دیر سے معلومات رکھتا تھا کیونکہ کسی باکسر کے لیے ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ محمد علی کو نہ جانتا ہو۔ تاہم مجھے اسلام کے بارے میں صحیح معلومات فراہم کرنے والی شخصیت جناب محمد صدیق ہیں۔

ملک عبدالعزیز نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے مزید کہا ''میں جانتا ہوں کہ میں فرشتہ نہیں بن سکتا مگر میں ایک اچھے انسان کی حیثیت سے زندگی ضرور گزاروں گا کیونکہ ماضی میں مجھ سے جو غلطیاں سرزد ہو چکی ہیں مجھے ان پر اب تک پچھتاوا ہے''۔

ملک عبدالعزیز نے اپنی بات ان الفاظ پر مکمل کی: ''اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو اور سب کو خوش رکھے''۔

ملک عبدالعزیز اس وقت اٹھائیسویں برس میں ہیں۔ انہوں نے جس ماں کے بطن سے جنم لیا تھا اس کا نام مورنا ٹائی سن ہے اور وہ اب بھی بروکلین کے علاقے میں قیام پذیر ہے۔ عبدالعزیز کے کل تین بھائی ہیں۔ باقی دونوں ان سے بڑے ہیں۔ مورنا ٹائی سن کی زندگی کا وہ دور جب ان کے بچے ابھی عملی زندگی میں نہیں آئے تھے بڑی مشکلات میں گزرا ہے۔ ایک طرف وہ اپنے ظالم شوہر کے ظلم سہتی تھیں اور دوسری طرف اپنے شرارتی بچوں کے

ہاتھوں بہت تنگ تھیں۔ مائیکل تائی سن جو بعدازاں مائیک تائی سن کے نام سے مشہور ہوا اور اب ''ملک عبدالعزیز'' بن چکا ہے وہ شرارتوں میں سب سے آگے تھا۔ لوگوں کے بٹوے چھین کر فرار ہو جانا' عورتوں سے ان کے لباس اور زیورات چھین کر رفو چکر ہو جانا اور پولیس کو جل دے کر بحفاظت اپنے ٹھکانے پر پہنچ جانا..... یہ مائیک تائی سن کا محبوب مشغلہ تھا۔ مگر پولیس ہر مرتبہ ناکام نہیں رہتی تھی۔ مائیک تائی سن ایک ہی سال میں ۳۸ مرتبہ گرفتاری کا ریکارڈ بھی رکھتا ہے۔ ایسی ہی ایک گرفتاری نے اس کی زندگی کا رخ موڑ دیا۔ ہوا یوں کہ وہ بروکلین کے تجارتی علاقے میں جہاں وہ اکثر وارداتیں کرتا تھا اچانک رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا گیا اور پھر بچوں کے اصلاحی مرکز میں بھیج دیا گیا مگر اس کی شرارتیں اس مرکز میں بھی جاری رہیں۔ روزانہ کسی نہ کسی سے لڑائی جھگڑا کر لیتا۔ ایک روز اپنے سے بڑی عمر کے نوجوان سے لڑائی ہو گئی جس میں کوشش کے باوجود اس نے بری طرح مار کھائی۔ کمسن تائی سن کا ذہن اس روز یہی سوچتا رہا کہ اب اپنے آپ کو اتنا زیادہ طاقتور بنانا چاہئے کہ کوئی ہاتھ اٹھائے تو بچ کر نہ جائے۔ چنانچہ اس نے جیل ہی میں ایک مکا باز باب سٹوریٹ کی شاگردی اختیار کر لی۔ باب نے اسے اچھی طرح بتایا کہ اپنا دفاع کیسے کیا جائے۔ پھر ڈی اماٹو تھا جس نے فلائیڈ پیٹرسن کو بھی عالمی چیمپئن بننے میں مدد دی تھی۔ ڈی اماٹو نے مائیک تائی سن کے قانونی سرپرست کی حیثیت اختیار کر لی تھی مگر اگلے ہی برس وہ دنیا میں چل بسا۔

باب سٹوریٹ اور ڈی اماٹو نے مائیک تائی سن کو باکسنگ کی جس راہ پر گامزن کر دیا تھا' ۱۹۸۵ء اس کے لیے اس راہ میں غیر معمولی کامیابی کی نوید لے کر آیا۔ اس سال اس نے ٹیری ہومز کو بدترین شکست سے دوچار کر کے عالمی چیمپئن کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ تب اس کی عمر صرف ۱۸ برس تھی۔ پھر اگلے برس ٹریور کو دوسرے راؤنڈ میں ناک آؤٹ کر کے باکسنگ کی تاریخ میں سب سے کم عمر ہیوی ویٹ چیمپئن کا اعزاز حاصل کر لیا۔ ۷ مارچ ۱۹۸۷ء کو ورلڈ باکسنگ ایسوسی ایشن کے چیمپئن جیمز سمتھ کو شکست سے دوچار کر کے یہ اعزاز بھی پا لیا۔ واضح رہے کہ جیمز سمتھ ''ہڈیاں توڑنے والا'' مشہور تھا۔ ۱۹۸۸ء میں تائی سن نے ۲۱ برس کی عمر میں انٹرنیشنل باکسنگ ایسوسی ایشن کے ٹونی ٹکر کو بھی شکست فاش دے دی۔ اب کوئی باکسر نہیں بچا تھا جو مائیک تائی سن کے مقابل آ سکے۔ ۱۹۹۱ء میں اگرچہ وہ

ٹوکیو میں اپنے کیریر کی پہلی پیشہ وارانہ شکست سے دو چار ہو چکا تھا تاہم جلد ہی اس نے متعدد کامیابیاں حاصل کر کے اس شکست کا داغ مٹا دیا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ قوت اور تکنیک کا خزانہ ہے اور اس کے سامنے کوئی باکسر نہیں ٹھہرتا۔ وہ اپنے تین سالہ دورِ اسارت میں بھی جیل کے اندر مسلسل ورزش کرتا رہا ہے تاکہ جسمانی طور پر فٹ رہے اور رہائی کے بعد اپنے اعزاز کو بحال کر سکے۔

ابھی تک یہ راز افشا نہیں ہو سکا کہ مائیک ٹائسن کو کس جرم کی پاداش میں "ورلڈ ہیوی ویٹ چیمپئن" کے اعزاز سے محروم کیا گیا اور تین سال تک پابندِ سلاسل رکھا گیا۔ محمد علی کی طرح وہ مسلمان نہیں بلکہ عیسائی تھا۔ ہاں ایک جرم سامنے آتا ہے کہ وہ "کالا" ہے۔ نئے عالمی نظام کے علمبردار امریکہ کے اندر کالے گورے کے درمیان یہ تفاوت پوری انتہا پر ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ مائیک ٹائی سن بھی اسی تعصب اور امتیاز کا شکار رہا ہے اور اس کے خلاف اسی نسل کی ایک لڑکی کو سازش کا حصہ بنایا گیا ہے۔

سیاہ فام حسینہ سے زیادتی کا الزام ۱۹۹۱ء میں سامنے آیا تھا۔ واشنگٹن ڈیزائری نامی یہ لڑکی جو "مس سیاہ فام امریکہ" کے مقابلہ میں شریک تھی' کے مطابق اکتوبر ۱۹۹۱ء میں ایک رات ٹائی سن نے اسے اپنے کمرے میں چلنے کی دعوت دی جہاں کچھ وقت گزارنے کے بعد اس نے ٹائی سن سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اسے لفٹ تک چھوڑنے آئے مگر ٹائی سن نے انکار کر دیا۔ اس پر وہ مشتعل ہو گئی اور ٹائی سن پر زبردستی کا الزام عائد کر دیا۔ ۳ ماہ بعد ٹائی سن کی گرفتاری' ضمانت پر رہائی اور پھر سزا کے واقعات پیش آئے۔

سزا ملنے کے بعد مائیک ٹائی سن نے ایک بات جو تکرار سے کہی' یہ تھی کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا' مجھ پر جھوٹا الزام لگایا گیا اور میں اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے ساری عمر لڑتا رہوں گا۔

ٹائی سن نے قبولِ اسلام کی صورت میں جو اقدام کیا ہے' مغرب کے نزدیک یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ اب اسے ساری زندگی مغرب کے جارحانہ رویے کا سامنا کرنا ہو گا۔ خود ٹائی سن یعنی عبدالعزیز کے الفاظ ہیں کہ اس رویے کے خلاف میں ساری عمر لڑتا رہوں گا۔ ٹائی سن کے لاکھوں مداحوں نے بھی اس الزام کی بار بار مذمت کی ہے اور وہ الزام کو محض

گمراہ قرار دیتے ہیں اور الزام لگانے والی حسینہ کو اب تک کوستے ہیں جس کی وجہ سے اتنا بڑا باکسر مشکلات میں گھر گیا۔

بہر حال جو کچھ ہوا' اگرچہ بظاہر یہ پریشان کن صورت حال تھی' مگر اب اس شر سے بھی خیر برآمد ہو گیا ہے۔ ٹائی سن جیل میں جا کر پہلے پہل تو خاصا پریشان رہا پھر اس نے اللہ تعالیٰ سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگی۔ انہی حالات میں وہ مطالعہ کی طرف آ گیا۔ چنانچہ اس نے ٹالسٹائی' نطشے' ڈیوس اور دیگر عالمی ادیبوں کی کتب پڑھ ڈالیں۔ پھر اسلامی کتب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اسی اثنا میں محمد علی اور ایک دوسرے باکسر مصطفیٰ محمد نے جیل میں اس سے ملاقاتیں کیں۔ پلین فیلڈ اسلامک سینٹر کے امام محمد صدیق کا رابطہ بھی رہا۔ محمد علی جب ٹائی سن کے پاس گیا تو اس نے اسے بتایا کہ ۱۹۶۶ء میں مجھے امریکیوں نے ویت نام کی جنگ میں شرکت پر مجبور کیا تو میں نے انکار کر دیا تھا۔ چونکہ میں ان دنوں نیا نیا مسلمان ہوا تھا اس لیے میرے خلاف فوری کارروائی کی گئی اور مجھ سے میرا اعزاز چھین لیا گیا۔ لیکن اس سے میرے عزم و ثبات میں ذرہ بھر بھی فرق نہ آیا اور میں اپنے دعوائے اسلام پر بدستور قائم رہا۔ اس پر ٹائی سن نے محمد علی سے دریافت کیا "آپ کے پاس کون سی طاقت تھی جس نے آپ کا مورال بلند رکھا؟"

''اسلام'' محمد علی نے جواب دیا۔ پھر کچھ دیر ٹھہر کر کہا کہ" اسلام نے میرے اندر اتنی قوت بھر دی تھی کہ میں پوری دنیا کا مقابلہ کر سکتا تھا''۔

محمد علی سے ملاقات کے اگلے روز ٹائی سن قرآنِ مجید کا مطالعہ کر رہا تھا۔

محمد علی نے مائیک ٹائی سن کے قبولِ اسلام کی خبر سن کر ایک بار پھر اس سے ملاقات کی اور مفید مشوروں سے نوازا۔ بعد ازاں پریس سے گفتگو کرتے ہوئے اس نے کہا'' قبولِ اسلام سے ٹائی سن کی زندگی ذرائع ابلاغ کی توجہ کا مرکز بن جائے گی اور اس کی ایک ایک بات کو نکتہ چینی کا نشانہ بنایا جائے گا'' لیکن ٹائی سن اسلام کے حوالے سے نہایت پُرجوش نظر آتے ہیں۔ آج ذرائع ابلاغ نے محمد علی کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف درست ثابت کر دی ہے۔ اس کے قبولِ اسلام کی خبر اخبارات نے شہ سرخیوں سے شائع کی ہے۔ ایک اخبار نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ'' ٹائی سن کے قبولِ اسلام سے امریکہ میں گویا زلزلہ آ گیا ہے۔

بہت سے لوگوں کو اب تک یقین ہی نہیں آ رہا کہ ٹائی سن ایسا بھی کر سکتا ہے۔"

ٹائی سن کا یہی "جرم" کچھ ہلکا نہ تھا کہ وہ سیاہ فام ہے اور اپنے مکوں کی بارش سے لاتعداد لوگوں کا بھرکس نکال چکا ہے اب اس نے اسلام قبول کر کے مغرب کے نزدیک اپنے جرم کی سنگینی کو کئی گنا بڑھا لیا ہے۔ پہلا جرم تو شاید قابل معافی تھا مگر دوسرا جرم قطعی نا قابل معافی ہے۔ مغربی میڈیا کے لیے یہ بات نہایت درجہ صدمہ انگیز ہے کہ دوسرا عالمی چیمپئن بھی مسلمان ہو گیا ہے۔ چنانچہ اسے اخبارات میں بڑے تواتر سے بدتمیز' جاہل' اجڈ اور آوارہ گرد قرار دیا جا رہا ہے۔ "عرب نیوز" نے تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ٹائی سن یعنی ملک شہباز عبدالعزیز کو آنے والے وقت میں اور زیادہ شدید نکتہ چینی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مغربی اخبارات میں ان دنوں یہ بحث چلی ہوئی ہے کہ ملک عبدالعزیز کی آئندہ زندگی کیسی ہو گی۔ لندن کے تمام اخبارات نے بھی ٹائی سن کے حلقہ بگوش اسلام ہونے کی خبر شہ سرخیوں کے ساتھ شائع کی تھی۔ یہ اخبارات اب تفصیل کے ساتھ اپنے قارئین کو بتا رہے ہیں کہ سابقہ عالمی چیمپئن کے نزدیک صحافی اور فوٹو گرافر کوئی اہمیت نہیں رکھتے اور وہ نمازوں کے اوقات میں ان سے ملنے کی بجائے مسجد چلا جاتا ہے۔ اب وہ مکمل طور پر ایک نئے انسان کے روپ میں سامنے آ رہا ہے۔ ہر ملاقاتی کو "السلام علیکم" کہنا اس کا شعار بن گیا ہے اور وہ سر پر باریک کاٹن کی ٹوپی پہنتا ہے جو پابند نماز مسلمانوں کی علامت ہے۔

ملک عبدالعزیز کو تنقید کے ساتھ ساتھ تائید بھی مل رہی ہے۔ جن دنوں اس کے قبول اسلام اور رہائی کی خبریں اخبارات کی زینت بنی تھیں' سوڈان میں عالمی اسلامی تحریکوں کا اب تک کی تاریخ کا سب سے بڑا اجتماع ہو رہا تھا' اس کانفرنس میں ۸۰ ممالک سے ۳۰۰ سے زائد وفود شریک تھے۔ کانفرنس کے تمام شرکاء نے ٹائی سن کے قبول اسلام کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس کے لیے ثابت قدمی کی دعا کی۔ اس موقع پر کانفرنس میں شریک امریکی وفد کے سربراہ اکبر محمد نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مائیک ٹائی سن کا قبول اسلام اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ امریکہ کی نئی نسل میں اسلام تیزی سے مقبول ہو رہا ہے۔

●......●......●

موہنی (پاکستان)

یہ ایک ہندو جوڑے کے قبول اسلام کی سچی اور واقعاتی کہانی ہے جسے تنویر احمد خان صاحب نے سیارہ ڈائجسٹ کے ''قرآن نمبر'' کے لئے رقم فرمایا۔ اس کہانی پر مصنف کو انعامی مقابلے کا دوسرا انعام ملا تھا۔ ''سیارہ ڈائجسٹ'' کے شکریے کے ساتھ قرآن پاک کے اس روح پرور معجزے کو نذر قارئین کیا جارہا ہے۔ (مؤلف)

یہ اس زمانے کی بات ہے جب تقسیم ہند کا فیصلہ ہو گیا تھا اور ہندوستان سے مسلمان اور پاکستان سے غیر مسلم نقل مکانی کی تیاریاں کر رہے تھے۔ قصہ سندھ کے ایک قصبہ کا ہے۔ جہاں صرف میاں بیوی پر مشتمل ایک ہندو گھرانہ رہتا تھا۔ ان کے پڑوسی مسلمان تھے۔ دونوں خاندان آپس میں بڑے اچھے تعلقات رکھتے تھے۔

فرقہ وارانہ فسادات کی شدت بڑھنے لگی تو ایک روز ہندو گھرانے کے سربراہ نندلعل نے اپنے مسلمان پڑوسی احمد سے کہا: ''بھائی! میرا ارادہ ہے اب ہمیں ہندوستان چلے جانا چاہئے۔ اگرچہ دل تو نہیں چاہتا کہ اس جگہ کو چھوڑیں جہاں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے ہیں' مگر اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ حالات بہت بگڑ گئے ہیں' کہیں ایسا نہ ہو ہمارا نقصان ہو جائے''۔

احمد نے کہا: ''نندا کیسی باتیں کرتے ہو۔ ہمارے ہوتے ہوئے کوئی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔'' مگر نندلعل کا دل خوف و ہراس کی شدید لپیٹ میں آچکا تھا۔ وہ احمد کی باتوں سے مطمئن نہ ہوا' اس نے گھر میں اپنی بیوی سے کہہ دیا کہ ہم موقع ملتے ہی بھارت

چلے جائیں گے' تم تیاری مکمل رکھنا۔

اس گفتگو کو کئی روز گزر گئے۔ ایک دن نند لعل کے برادرِ نسبتی کا خط آیا کہ ہم لوگ بھارت جا رہے ہیں آپ لوگوں کا کیا ارادہ ہے؟ اگر تیار ہوں تو اکٹھے چلیں گے۔ نند لعل کا برادرِ نسبتی خاصی دور رہتا تھا۔ نند لعل نے اس کا خط اپنے پڑوسی احمد کو بھی دکھایا' اس سے رائے طلب کی کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ احمد نے مشورہ دیا کہ تم لوگ گھر میں مکمل تیاری رکھو اور خود سالے کے پاس جا کر صلاح مشورہ کر آؤ۔ پھر جو پروگرام بنے اس پر عمل کرو۔ نند لعل نے یہ تجویز پسند کی اور بیوی کو بالکل تیار رہنے کا حکم دیکر خود اپنے سالے سے ملنے چلا گیا۔

نند لعل کی بیوی بہت خوبصورت تھی۔ عمر اس کی پچیس چھبیس سال کی تھی مگر اولاد نہ ہونے اور صحت اچھی ہونے کی وجہ سے سولہ سترہ سال کی لگتی تھی۔ احمد ایک عرصہ سے اس پر نگاہ رکھتا تھا مگر اس سے کوئی ایسی ویسی بات کرنے کی کبھی جرأت نہ کر سکا تھا۔ اب اسے ایک موقع مل گیا۔ نند لعل اپنے سالے سے ملنے چلا گیا اور اپنی بیوی کو تیار رہنے کے لئے کہہ گیا تو احمد نے فائدہ حاصل کرنے کا پروگرام بنا لیا۔ اس نے ایک تانگہ لیا اور شام کو ہانپتا کانپتا نند لعل کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اندر سے نند لعل کی بیوی موہنی نے پوچھا:

''بھائی کون ہو' کیا کام ہے''؟

''میں احمد ہوں بھابی!'' احمد نے جواب دیا۔ بھائی نند لعل آٹھ بجے والی گاڑی سے آ رہے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی آپ کے بھائی بھی ہیں۔ ان کا ارادہ سیدھے کھوکھرا پار جانے کا ہے۔ وہ یہاں نہیں رکیں گے۔ انہوں نے مجھے پیغام بھجوایا ہے کہ میں آپ کو ریلوے اسٹیشن پر پہنچا دوں۔ آپ ضروری چیزیں' زیورات' نقدی' اور کپڑے لے لیں اور تیار ہو کر فوراً باہر آ جائیں''۔

موہنی احمد کو ایک عرصے سے جانتی تھی۔ دونوں پڑوسی تھے اور ان کے باہمی تعلقات بھی بہت اچھے تھے۔ پھر بھارت جانے کی باتیں بھی روز ہی ہوتی تھیں۔ اس نے احمد کی باتوں کو سچ جانا اور ضروری تیاری کے بعد باہر آ کر تانگے پر بیٹھ گئی۔

ریلوے اسٹیشن زیادہ دور نہیں تھا مگر تانگہ بہت دیر سے چل رہا تھا۔ اس سے موہنی کو کچھ شک گزرا۔ اس نے منہ سے پلّو اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا تو راستہ ہی بدلا ہوا پایا۔ اس

نے احمد سے پوچھا "بھائی! ہم کدھر جا رہے ہیں۔ یہ تو اسٹیشن کا راستہ نہیں ہے۔"

"گھبراؤ نہیں بھابی!" احمد نے عیاری سے جواب دیا: "ہم نے جان بوجھ کر جنگل کا راستہ اختیار کیا ہے تاکہ عام سڑک پر سے لوگ ہمیں دیکھ نہ سکیں اور کوئی آپ کو پریشان نہ کر سکے۔ ہم تھوڑی دیر میں اسٹیشن پہنچنے والے ہیں"۔

موہنی یہ سن کر خاموش ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد تانگہ اچانک رک گیا۔ احمد نے ہوسناک لہجے میں کہا: "پیاری! اب اتر بھی آؤ۔ کب تک دل تڑپاتی رہو گی۔ تم نہیں جانتیں ارمان اس وقت کا کتنے سالوں سے انتظار کر رہے ہیں"۔ موہنی نے گھبرا کر دیکھا۔ چاروں طرف خوفناک جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ وہ سارے معاملے کو سمجھ گئی اور لجاجت سے بولی: "احمد میں نے تمہیں بھائی اور تم نے مجھے بہن بنایا ہوا ہے' کچھ شرم کرو اور اس مقدس رشتے کی کچھ لاج رکھو"۔

مگر احمد پر شیطان سوار تھا۔ اس نے جھٹکے کے ساتھ موہنی کو کھینچ کر تانگے سے اتارا اور دست درازی شروع کر دی۔ موہنی نے اس کے چنگل سے بچنے کی بہت کوشش کی اور پورے عزم کے ساتھ اپنی عزت کو بچانے کی تگ ودو کرنے لگی۔ اس نے رحم طلب نگاہوں سے تانگے والے کی طرف دیکھا مگر اس کی نگاہوں میں بھی ہوس کے شعلے ناچ رہے تھے۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر احمد سے درخواست کی "احمد خدا کے واسطے مجھے برباد نہ کرو۔ میں کہیں کی نہ رہوں گی۔ تمہیں تمہارے پیارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا واسطہ' میری عزت نہ لوٹو۔ میرے زیورات لے لو' مگر مجھے چھوڑ دو۔"

لیکن احمد ہوس کی مستی کا شکار تھا۔ اس نے موہنی کی درخواست پر کان نہ دھرے اور اسے وحشیانہ انداز میں اٹھا کر ایک ٹیلے کے پیچھے لے چلا۔ موہنی نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے' مگر احمد کے طاقتور بازوؤں کے سامنے اس کی کوئی پیش نہ گئی۔ آخری چارۂ کار کے طور پر اس نے احمد کے کندھے میں اپنے دانت گاڑ دیئے۔ وہ بلبلا اٹھا اور اس کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی موہنی ایک طرف کو بھاگ اٹھی۔ احمد نے تھوڑی دیر توقف کیا' مگر پھر زخمی بھیڑیے کی مانند نئے جوش کے ساتھ اس کے پیچھے بھاگ کھڑا ہوا اور تھوڑی دور جا کر اسے دوبارہ دبوچ لیا اور وحشیانہ انداز میں اس کے کپڑے پھاڑنے لگا۔ اب

موہنی برہنہ ہو گئی تھی۔ مگر عزت بچانے کا احساس اب تک اس میں زندہ تھا۔ اچانک اس نے اپنی گردن میں ہاتھ ڈالا اور ایک تعویذ نوچ کر احمد کے سامنے کر دیا۔ ''احمد اس میں تمہاری پاک کتاب قرآن مجید کی آیتیں لکھی ہوئی ہیں۔ یہ تمہارا قرآن ہے' اسی کے صدقے میں مجھے معاف کر دو۔ میری عزت نہ لوٹو۔ میری عصمت برباد نہ کرو''۔

مگر احمد نے وہ تعویذ موہنی کے ہاتھ سے چھین کر دور پھینک دیا اور لپک کر موہنی کو پکڑ لیا اور قریب تھا کہ وہ اپنے ناپاک عزائم کو عملی صورت دے ڈالے کہ اچانک اس کی چیخیں نکل گئیں۔ اس کے جسم میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہو گئی اور موہنی کے جسم پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

موہنی آزاد تھی۔ اس نے حیرت اور اچنبھے کے ساتھ دیکھا کہ احمد کا بدن ایک طرف کو ڈھلک رہا ہے۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک لمبا سیاہ ناگ احمد کی ٹانگ سے لپٹا ہوا تھا اور اس کی پنڈلی سے خون بہہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں احمد تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ سانپ اپنا کام ختم کر کے جا چکا تھا۔

یہ منظر تانگے والے نے بھی دیکھا۔ وہ بھاگتا ہوا آیا اور تعویذ کو اٹھا کر چومنے لگا' پھر اس نے اپنی چادر موہنی کے جسم پر ڈال دی۔ اس سے رو رو کر معافی مانگی اور اسے تانگے پہ بٹھا کر واپس شہر کی طرف چل دیا۔

راستے میں موہنی نے بتایا کہ سات سال سے میرے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ میری ایک مسلمان سہیلی نے یہ تعویذ لا کر دیا تھا اور اس نے بتایا کہ اس میں سورۃ یاسین اور پانچ اور آیتیں چھپی ہوئی ہیں۔ موہنی عقیدت بھرے انداز میں کہہ رہی تھی کہ اسے قرآن کی قوت کا اندازہ ہو گیا ہے۔ قرآن عزتوں کا محافظ ہے۔ یہ اس وقت دستگیری کرتا ہے جب سارے سہارے ٹوٹ جاتے ہیں۔

اتفاق سے آٹھ بجے والی ٹرین سے نند لعل واپس آ گیا۔ وہ بڑا پریشان تھا کہ موہنی کہاں گئی؟ اسے یہ پتہ چل گیا تھا کہ احمد اسے تانگے پر بٹھا کر کہیں لے گیا ہے مگر پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کہاں گئے ہیں۔ اسی جستجو میں رات خاصی گزر گئی حتیٰ کہ موہنی واپس گھر پہنچی اور اپنے خاوند کو ساری کہانی سنائی۔

دوسرے ہی دن نند لعل اور موہنی نے ہندوستان جانے کا خیال ترک کر دیا۔ انہوں

نے قرآن کا معجزہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ وہ مسلمان ہو گئے اور ان کے اسلامی نام محمد علی اور عائشہ رکھے گئے۔ اب ان کے چار بچے ہیں اور وہ بڑی ہی پُر سکون زندگی گزار رہے ہیں۔

●......●......●

نورالدین ڈرکی

(امریکہ)

ذیل کا مضمون جدہ کے روزنامہ ''عرب نیوز'' میں شائع ہوا۔ جس کا ترجمہ ثروت جمال اصمعی نے کیا اور روزنامہ ''جسارت'' کراچی کی جمعہ اشاعت (۲۲ مئی ۱۹۸۱ء) کی زینت بنا۔ مَیں نے اپنے ڈھب کے مطابق اسے ترتیب تو دی ہے مگر بنیادی معلومات میں کوئی کمی بیشی نہیں کی۔

(بشکریہ جسارت و مترجم)

---

۴۲ سالہ امریکی نورالدین ڈرکی کا آبائی نام سٹیفن ڈرکی تھا۔ انہوں نے ۳۳ برس کی عمر میں اسلام قبول کیا اور آج وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان اور پُرجوش مبلّغ اسلام ہیں۔ وہ امریکہ میں اسلام کی اشاعت کا بھرپور عزم رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں ایک انوکھے اور منفرد تجربے میں مصروف ہیں۔ انھوں نے نیومیکسیکو کے مضافات میں ایک ہزار ایکڑ پر مشتمل اسلامی بستی آباد کرنے کا منصوبہ تیار کیا ہے اور تعمیرات کا باقاعدہ آغاز بھی کر دیا ہے۔ اس منصوبے میں مسجد' مدرسہ' مکانات اور دکانیں شامل ہیں۔ مسجد کی تعمیر مکمل ہونے والی ہے جو خوبصورت گنبدوں اور شاندار میناروں کے ساتھ روایتی شان و شوکت سے سر اٹھائے کھڑی ہے۔

چھ فٹ چار انچ کے بلند قامت اور مسحور کن شخصیت کے حامل نورالدین نیومیکسیکو کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے اور سات برس کی عمر سے تعلیم کا آغاز نیویارک کے ایک اعلیٰ درجے کے کیتھولک اسکول سے کیا۔ تعلیم کی تکمیل تک وہ نہ تو اسلام کے بارے

میں کچھ جانتے تھے نہ عربی زبان کے کسی لفظ سے شناسا تھے۔ مگر خوش بختی انہیں سیاحت کے سلسلے میں مشرق وسطیٰ لے آئی۔ یہاں انہیں مسلمانوں سے براہ راست ملنے جلنے اور مسلم معاشرے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع ملا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ آج کی خود غرض اور مفاد پرست مغربی دنیا کے مقابلے میں مسلم معاشرے میں کہیں زیادہ بے لوثی اور اخلاص پایا جاتا ہے۔ ان کی روایت ہے "میں اس سفر میں جس جس مسلم ملک میں گیا اور جس علاقے میں پہنچا' میرا تجربہ یہ رہا کہ جب وہاں کے لوگ دیکھتے کہ ہمارے پاس سفری تھیلوں میں مختصر سا سامان ہے' کھانا تیار کرنے کے لئے ضرورت کی چیزیں موجود نہیں ہیں تو وہ بلا تاخیر اپنے گھروں سے ہمارے لئے کھانا لے کر آتے اور ہماری میزبانی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔ اس محبت اور خلوص کا کوئی تصور مغربی معاشرے میں نہیں کیا جا سکتا۔ اپنے اس تجربے سے مجھے احساس ہوا کہ مسلمان آج بھی دنیا کے بہترین لوگ ہیں۔"

مسلمانوں کی مہمان نوازی نے نورالدین کے دل میں جو اَب تک سٹیفن ڈرکی تھے' مسلمانوں اور اس کے حوالے سے شاید اسلام کے لئے بھی نرم گوشہ پیدا کر دیا' مگر ابھی وہ اسلام کو اپنا لینے اور اپنی زندگی کا نصب العین بنا لینے کے لئے تیار نہ تھے۔ اسلام سے تفصیلی تعارف کا موقع بھی انہیں محض حسنِ اتفاق سے میسر آ گیا اور یہ ان کی زندگی کا سب سے خوشگوار واقعہ تھا۔

مشرقِ وسطیٰ کے سفر کے دوران' دریائے اردن کے مغربی کنارے پر جبلِ زیتون کے علاقے میں وہ ایک بس پر سوار ہوئے۔ اچانک ان کی نظریں ایک شخص سے چار ہوئیں اور دونوں کو یوں لگا جیسے وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہوں اور اپنی ہی شکل دیکھ رہے ہوں۔ سرخ ڈاڑھی' سرخ بال' چہرے کے خطوط بڑی حد تک ملتے جلتے' یکساں قد و قامت۔ اس حسنِ اتفاق پر دونوں پہلے تو حیرت زدہ رہ گئے' پھر بے ساختہ ہنس پڑے۔ دوسرے صاحب فلسطین کی ایک مذہبی عدالت کے جج تھے اور تھوڑی بہت انگریزی بول لیتے تھے۔ سٹیفن بھی عربی کے دو چار جملے بولنے لگے تھے۔

ابتدائی تعارف کے بعد جج صاحب نے ڈرکی کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ ان کی روح پیاسی تو تھی ہی' انہوں نے جھٹ اس دعوت کو قبول کیا اور دوسرے دن جج

صاحب کے مکان پر پہنچ گئے۔ ایک ترجمان بھی ہمراہ تھا جو عیسائی تھا۔ اس کی موجودگی میں سٹیفن ڈرکی نے محسوس کیا کہ اسلام کے بارے میں بے تکلفی سے گفتگو نہیں ہو سکتی' لہذا انہوں نے ایک ایسے مسلمان ترجمان کا انتظام کیا جو مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ ان تینوں کی محفلیں جمنے لگیں اور مسلمان جج نے ڈرکی کو اسلام کے بارے میں بنیادی باتیں اور ان کی تفصیلات بتانی شروع کیں۔ ڈرکی کا دل حق کی تلاش میں تھا' اسلام کا پیغام ان کے دل میں گھر کرتا چلا گیا اور وہ بہت جلد سٹیفن سے نورالدین بن گئے۔

ڈرکی خود تو حق کی راہ پا گئے' لیکن ابھی ان کے ذہن میں اس سچائی کو اپنے ملک میں عام کرنے کا کوئی خاکہ نہ تھا۔ کئی سال بعد یہ منصوبہ بھی حسن اتفاق کے نتیجے میں وجود میں آیا۔ اُن دنوں وہ مکہ مکرمہ کے ایک مذہبی کالج میں زیر تعلیم تھے۔ ایک شام زبردست طوفان بادوباراں نے شہر کی روشنیاں گل کر دیں۔ کالج جلدی بند ہو گیا تو نورالدین اپنی قیام گاہ کو چل دیئے۔ نماز عشا کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ فریضہ عبدیت بجالانے کے لئے ایک مسجد میں داخل ہوئے۔ وہاں سہل کہانی نامی ایک دردمند مخلص عرب مسلمان بھی نماز پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے ایک امریکی کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو ان سے تعارف حاصل کیا۔ پھر وہیں بیٹھ کر اللہ کے یہ دونوں بندے خدا کے دین کو پھیلانے کی تدابیر سوچنے لگے۔ اس کام میں ان کا انہماک اس قدر زیادہ تھا کہ انہیں وقت کا احساس ہی نہ رہا۔ انہیں گفتگو کرتے ہوئے چار گھنٹے گزر گئے تھے۔

سہل کہانی امریکہ کی ریاست میساچوسٹس کے ورسٹر پولی کلینک انسٹیٹیوٹ میں تعلیم پا چکے تھے۔ دوران قیام میں انہوں نے جو کچھ دیکھا اس کی بنا پر وہ سمجھتے تھے کہ امریکی معاشرہ جس روحانی اضطراب میں مبتلا ہے' اسلام ہی اس کا آخری علاج ہے۔ آج نورالدین ڈرکی کے ساتھ وہ انہی پہلوؤں پر گفتگو کرتے رہے۔

ادھر مسلمان ہونے کے بعد نورالدین ڈرکی اپنے سامنے دو ہی راستے پاتے تھے۔ ایک تو یہ کہ امریکہ کو خیر باد کہہ کر کسی اسلامی ملک میں مستقل سکونت اختیار کریں تاکہ اسلامی زندگی کے تقاضوں کو عملاً پورا کر سکیں یا پھر امریکہ ہی میں رہ کر اپنے طریقے کے مطابق اسلام کو پھیلانے کا کام کریں۔ انہوں نے بالآخر دوسرا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

کئی ماہ کی گفتگوؤں کے بعد کہ امریکہ میں اسلام کو متعارف کرانے کا بہترین طریقہ کیا ہے' کہانی اور ڈرکی اس نتیجے پر پہنچے کہ انہیں امریکہ میں ایک مثالی اسلامی بستی بسانی چاہئے۔ ان کی یہ سوچ بالکل درست تھی کہ آج تک اس ملک میں اسلام کو متعارف کرانے کے لئے جو بھی طریقے اختیار کئے گئے' وہ محض تبلیغی اور نظریاتی طریقے ہیں۔ مثلاً مختلف جگہوں پر اسلامی وفود کا جانا' لوگوں سے ملاقاتیں کرنا' سیمینار اور کانفرنسوں کا انعقاد اور کتابوں کا تقسیم کرنا وغیرہ' لیکن یہ طریقے امریکیوں کے لئے زیادہ پرکشش ثابت نہیں ہو سکتے کہ امریکی فطرتاً مادی نقطہ نظر کے حامل ہیں۔ وہ ہر چیز کو محسوس اور عملی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ محض نظری باتیں انہیں زیادہ متاثر نہیں کرتیں۔ پھر امریکہ کے بیشتر لوگوں کے نزدیک اسلام ایک بیرونی اور اجنبی نظریہ بلکہ خطرناک چیز ہے اور یہ کہ اسلام کا ان کی اپنی زندگیوں سے کوئی واسطہ اور تعلق نہیں ہو سکتا۔

اس پس منظر میں جب کہ امریکیوں میں اسلام کو مقبول بنانے کے لئے محض نظریاتی دعوت بالکل ناکافی ہے' دونوں صاحبان نے فیصلہ کیا کہ امریکہ کے اندر کوئی خطۂ زمین ایسا ہونا چاہئے جہاں لوگوں کو اسلام چلتا پھرتا نظر آئے تاکہ جو لوگ پوچھتے ہیں کہ اسلام کیا ہے اور عملاً اس کی شکل کیا ہوتی ہے' وہ اس بستی میں آکر اپنی آنکھوں سے اسلام اور اس کی برکتوں اور اخوت و رحمت کے اس نظام کی بے مثال خوبیوں کو مجسم اور متحرک دیکھ سکیں۔

اس فیصلے کے بعد ڈرکی اور کہانی نے اپنے امریکی اور عرب مسلمان دوستوں کے سامنے منصوبے کو پیش کیا اور اس کے لئے فنڈ قائم کیا۔ ڈرکی کی اہلیہ نے بھی اس سلسلے میں دوڑ دھوپ کی اور اپنی دوست مسلمان خواتین سے رقوم حاصل کیں۔ کاروباری لوگوں' ڈاکٹروں' وکلا اور معاشرے کے دوسرے طبقوں سے تعلق رکھنے والے افراد سے عطیات حاصل کیے گئے لیکن سعودی عرب یا امریکی حکومت سے عطیہ وصول نہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور اس پر سختی سے عملدرآمد ہوگا۔

اسلامی بستی بسانے کے لیے نیو میکسیکو کا انتخاب اس لئے کیا گیا کہ یہاں اینگلو سیکسن ثقافت غالب ہے۔ یہ خطہ تین مختلف تہذیبوں کا مرکز ہے۔ سپین کے لوگ یہاں خاصی تعداد میں ہیں اور آج بھی ان پر عرب و اسلامی تہذیب کے اثرات موجود ہیں۔ یہاں

امریکی ریڈ انڈینز کی بھی خاصی تعداد ہے جن کی ایک الگ تہذیب ہے۔ یوں ڈرکی کے خیال میں یہاں کی فضا اسلامی تہذیب کے فروغ کے لئے بڑی سازگار ہے اور تین تہذیبوں کے اس خطے میں اسلامی تہذیب کے لئے نسبتاً زیادہ آسانی سے گنجائش نکل سکتی ہے۔

مارچ ۱۹۸۰ء میں دارالسلام فاؤنڈیشن نے ایک ہزار ایکڑ پر مشتمل ایک قطعۂ زمین چودہ لاکھ ڈالر کے عوض خریدا اور یوں امریکہ میں اشاعت اسلام کے اس اچھوتے تجربے کا آغاز ہو گیا۔ ڈرکی کا دعویٰ ہے کہ اس ملک میں اسلام کی کامیابی کے امکانات نہایت روشن ہیں۔ دلیل ان کی یہ ہے کہ آج امریکہ میں جو حالات ہیں اور امریکی معاشرہ جس تیزی سے انحطاط پذیر ہے' اس کی بنا پر اسلام اس کی ناگزیر ضرورت بن گیا ہے۔ اسلام ہی امریکہ کو تباہی سے بچا سکتا ہے اور جب امریکیوں کے سامنے یہ حقیقت متشکل ہو کر آئے گی تو وہ لازماً اسلام کی طرف رجوع کریں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ امریکہ میں آج ہر لمحے قتل' ڈاکے' اغوا اور دیگر سنگین جرائم کا جو بازار گرم ہے' یہ اس معاشرے کی تیزی سے رو بہ زوال ہونے کی کھلی علامت ہے اور اسلام ہی ان تمام خرابیوں کا واحد علاج ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مکے میں مجھے کبھی پریشانی نہیں ہوئی تھی کہ میری بیوی اگر بازار گئی ہے تو وہاں سے بخیریت لوٹے گی یا نہیں اور میری بچی اسکول سے واپس آسکے گی یا راستے میں کسی جرائم پیشہ گروہ کے ہاتھوں اغوا ہو جائے گی۔ لیکن امریکہ میں نہ صرف مجھے بلکہ ہر فرد کو ہر لمحے یہ فکر پریشان کرتی رہتی ہے۔ یہاں کوئی اپنی بیوی اور بچی کے بارے میں بے فکر نہیں ہو سکتا۔ یہاں نہ کسی کی جان محفوظ ہے اور نہ مال و آبرو۔

یوں نورالدین ڈرکی اس پرآشوب ماحول میں دارالسلام کے نام سے امن و آشتی' روحانی و اخلاقی پاکیزگی' خلوص و محبت اور انسانیت کی اعلیٰ اقدار کا ایک پرسکون جزیرہ تعمیر کرنا چاہتے ہیں اور اس طرح یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ انسان اگر آج بھی خدا کے بتائے ہوئے راستے پر چلے تو اسے اطمینان قلب کی وہ دولت نصیب ہو سکتی ہے جس کا مادہ پرست دنیا میں کسی بلند سے بلند مقام تک پہنچ جانے کے باوجود ہاتھ آنا قطعی ناممکن ہے۔

دارالسلام کے اس منصوبے میں مسجد اور مدرسے کے علاوہ ایک شفاخانہ' دستکاریوں

کی تربیت کا ایک مرکز، مسلم سائنس دانوں کے لیے ایک ریسرچ سنٹر اور سو خاندانوں کے لیے مکانات شامل ہیں۔ ان عمارتوں میں سے مسجد تقریباً مکمل ہو چکی ہے۔ جبکہ باقی عمارتیں پلاننگ کے مرحلے میں ہیں۔ مسجد کی تعمیر کا کام گزشتہ برس جون میں شروع ہوا تھا۔ اس میں تقریباً ڈیڑھ سو نمازیوں کی گنجائش ہے۔ اس کے ساتھ ایک مدرسہ ہو گا اور یہ مسجد دراصل مدرسہ کے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بنائی گئی ہے۔ پوری بستی کے لیے ایک بہت بڑی مسجد کی تعمیر منصوبے میں شامل ہے۔

اس مثالی بستی میں بسنے والوں کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا جا رہا ہے۔ کوشش یہ ہے کہ ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے باعمل مسلمان یہاں آباد ہوں تاکہ ایک طرف ماحول صحیح معنوں میں اسلامی ہو اور دوسری جانب بستی کی تمام ضروریات مقامی طور پر پوری ہو سکیں۔ چنانچہ ان منتخب لوگوں میں اساتذہ، ڈاکٹر، وکلا، کارپینٹر اور مختلف فنی ماہرین بھی شامل ہیں۔ ان دنوں بورڈ آف دارالسلام فاؤنڈیشن نہایت احتیاط کے ساتھ امیدواروں کی درخواستوں کا جائزہ لے رہا ہے جو اس مثالی بستی میں آباد ہونا چاہتے ہیں۔ نور الدین ڈرکی کا کہنا ہے کہ اس سلسلے میں پورے امریکہ سے درخواستیں موصول ہو رہی ہیں اور یہ کہ اس بستی کے پوری طرح آباد ہونے کے بعد غیر مسلموں کو بھی یہاں رہنے کا موقع دیا جائے گا۔ ان کا عزم ہے کہ اسکیم کا ابتدائی مرحلہ مکمل ہو جائے تو پھر یہاں غیر مسلموں کے لئے سیمینار اور تعارفی پروگراموں کا ایک مستقل سلسلہ شروع کیا جائے گا تاکہ وہ دارالسلام آ کر بیک وقت نظری اور عملی طور پر اسلام سے متعارف ہو سکیں۔

●......●......●

متفرقات

ممتاز شاعر جنابِ احسان دانش نے ایک ملاقات میں مجھے بتایا کہ ان کے آبائی قصبے کاندھلہ' (یو۔ پی) میں ایک مرتبہ کسی زمین کے ٹکڑے کے تنازعہ پر مسلمانوں اور ہندوؤں میں تصادم ہو گیا۔ مصالحت کی خاطر ضلعی صدر مقام سہارن پور سے ایک اعلیٰ انگریز افسر آیا اور ایک بزرگ مسلمان عالم دین (غالباً شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس کاندھلوی مرحوم کے والد محترم) کو بلا بھیجا اور کہا کہ وہ جس قوم کے حق میں فیصلہ دیں گے' میں مان لوں گا۔

۱۸۵۷ء کے المیے کو ابھی زیادہ مدت نہیں گزری تھی۔ مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت بڑی شدید تھی چنانچہ عالم دین نے انگریز افسر کو ملنے سے انکار کر دیا۔ مگر بار بار کے اصرار کے بعد اس شرط پر آنے کو تیار ہوئے کہ وہ انگریز کا چہرہ نہیں دیکھیں گے۔ افسر موصوف نے اس شرط کو مان لیا۔ عالم دین تشریف لائے۔ انگریز کی طرف پشت کر کے کھڑے ہوئے اور ہزاروں مسلمانوں اور ہندوؤں کی موجودگی میں اعلان کیا کہ زمین کا متنازعہ ٹکڑا اور اصل ہندوؤں کا ہے اور اس پر مسلمانوں کا دعویٰ بے جا ہے۔ زمین ہندوؤں کو مل گئی مگر اسی روز شام تک ہندوؤں کے چوبیس خاندان اسلام قبول کر چکے تھے۔

●......●......●

سر جیمز جینز اور قرآن

مندرجہ ذیل واقعہ کے راوی علامہ عنایت اللہ مشرقی ہیں اور اسے ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے تحریر کیا ہے۔

''۱۹۰۹ء کا ذکر ہے' اتوار کا دن تھا اور بوندا باندی ہو رہی تھی۔ مَیں کسی کام سے باہر نکلا تو جامعہ کیمبرج کے مشہور ماہر فلکیات سر جیمز جینس (JAMES GEANS) پر نظر پڑی جو بغل میں چھاتا دبائے چرچ کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے قریب ہو کر سلام کیا۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوبارہ سلام کیا تو متوجہ ہوئے اور کہنے لگے: ''تم کیا چاہتے ہو؟'' مَیں نے کہا: دو باتیں۔ اول یہ کہ بارش ہو رہی ہے اور آپ نے چھاتا بغل میں داب رکھا ہے۔ سر جیمز اپنی بدحواسی پر مسکرائے اور چھاتا تان لیا۔ دوم یہ کہ آپ جیسا شہرہ آفاق سائنسدان گرجا میں عبادت کے لیے جا رہا ہے۔ یہ کیا؟ میرے اس سوال پر پروفیسر جیمز لمحہ بھر کے لئے رک گئے اور پھر میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا: ''آج شام کو چائے میرے ساتھ پیو۔'' چنانچہ شام کو مَیں ان کی رہائش گاہ پہنچا۔ ٹھیک چار بجے لیڈی جیمز باہر آ کر کہنے لگیں: ''سر جیمز تمہارے منتظر ہیں''۔ اندر گیا تو ایک چھوٹی سی میز پر چائے لگی ہوئی تھی۔ جیمز صاحب تصورات میں کھوئے ہوئے تھے۔ کہنے لگے: ''تمہارا سوال کیا تھا؟'' اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اجرام آسمانی کی تخلیق' ان کے حیرت انگیز نظام' بے انتہا پہنائیوں اور فاصلوں' ان کی پیچیدہ راہوں اور مداروں نیز باہمی کشش اور طوفان ہائے نور پر وہ ایمان افروز تفصیلات پیش کیں کہ میرا دل اللہ کی اس داستانِ کبریائی و جبروت پر دہلنے لگا اور ان کی اپنی کیفیت یہ تھی کہ سر کے بال سیدھے اٹھے ہوئے تھے، آنکھوں سے حیرت و خشیت کی دوگونہ کیفیتیں عیاں تھیں' اللہ کی حکمت و دانش کی ہیبت سے انکے ہاتھ قدرے کانپ رہے تھے اور آواز لرز رہی تھی۔ فرمانے لگے: ''عنایت اللہ خاں! جب مَیں خدا کے تخلیقی کارناموں پر نظر

ڈالتا ہوں تو میری تمام ہستی اللہ کے جلال سے لرزنے لگتی ہے اور جب کلیسا میں خدا کے سامنے سرنگوں ہو کر کہتا ہوں "تو بہت بڑا ہے" تو میری ہستی کا ہر ذرہ میرا ہم نوا بن جاتا ہے۔ مجھے بے حد سکون اور خوشی نصیب ہوتی ہے۔ مجھے دوسروں کی نسبت عبادت میں ہزار گنا زیادہ کیف ملتا ہے۔ کہو عنایت اللہ خاں! تمہاری سمجھ میں آیا کہ میں گرجے کیوں جاتا ہوں"؟

علامہ مشرقی کہتے ہیں کہ پروفیسر جیمز کی اس تقریر نے میرے دماغ میں عجیب کہرام پیدا کر دیا۔ میں نے کہا: جناب والا میں آپ کی روح پرور معلومات سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ اس سلسلے میں قرآن کی دو آیتیں یاد آ گئی ہیں۔ اگر اجازت ہو تو پیش کروں"۔ فرمایا: "ضرور۔"

چنانچہ میں نے سورہ فاطر کی آیت نمبر ۲۷ اور ۲۸ پڑھ کر سنائیں۔ جن کا ترجمہ یوں ہے:

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور پھر اس کے ذریعے سے ہم طرح طرح کے پھل نکال لاتے ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ پہاڑوں میں سفید، سرخ اور گہری سیاہ دھاریاں پائی جاتی ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں۔ بے شک اللہ زبردست اور درگزر فرمانے والا ہے"۔

آیتوں کا ترجمہ سنتے ہی پروفیسر جیمز بولے:

"کیا کہا...... اللہ سے صرف اہل علم ڈرتے ہیں۔ حیرت انگیز، بہت عجیب، یہ بات جو مجھے پچاس برس کے مسلسل مطالعہ و مشاہدہ کے بعد معلوم ہوئی، محمد کو کس نے بتائی وہ تو پڑھے لکھے نہیں تھے؟ کیا قرآن میں واقعی یہ آیت موجود ہے، اگر ہے تو میری شہادت لکھ لو کہ قرآن ایک الہامی کتاب ہے۔ محمد ان پڑھ تھے، انہیں یہ عظیم حقیقت خود بخود معلوم نہیں ہو سکتی، انہیں یقیناً اللہ نے بتائی تھی۔ بہت خوب، بہت عجیب"۔

(نقوش شخصیات نمبر ۲ صفحات ۹۔۱۲۰۸)

●.....●.....●

موسیقار اور قرآن

پیرس میں مقیم شہرۂ آفاق مصنف' عالم دین اور مفکر ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں کہ چند برس قبل فرانس میں گلزر گلبرٹ نامی ایک ایسا شخص رہتا تھا جو اپنے ذوق' مزاج اور پیشے کے اعتبار سے مشہور و ماہر موسیقار تھا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی تھا اور موسیقی کے فن پر عبور رکھتا تھا۔ حسن اتفاق کہ اس نے کسی مسلمان قاری کو قرآن پڑھتے ہوئے سن لیا اور پھر وہ قرآن کے لحن کا شیدائی بن گیا۔ اس کے نزدیک یہ موسیقی تھی اور اس کا وہ اس طرح غیر معمولی پرستار ہوا کہ اکثر و بیشتر وہ فرمائش کر کے قاری صاحبان سے قرآن سنا کرتا لیکن جب ایک مرتبہ اسے بتایا گیا کہ قرآن نثر کی کتاب ہے اور اسے شاعری سے دور کا بھی واسطہ نہیں تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ سوچتا رہتا کہ شاعری خواہ کسی زبان کی ہو وہ بہرحال مترنم ہوتی ہے۔ اسے گایا جا سکتا ہے' اس کے مصرعوں کی تقطیع کی جا سکتی ہے اور اسے خاص اوزان پر جانچا جا سکتا ہے' لیکن دنیا کی کسی زبان کی نثر میں یہ خصوصیات نہیں ہوتیں۔ اس میں نہ اوزان ہوتے ہیں نہ اسے کسی طرح گایا جا سکتا ہے۔ یہ منفرد و یکتا صلاحیت عربی زبان میں ہے کہ وہ نثر ہے مگر پھر بھی اسے گایا جا سکتا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ یہ عجیب و غریب اور منفرد خصوصیت اس میں کیسے پیدا ہو گئی؟

اس سوال کا جواب پانے کے لئے گلزر گلبرٹ نے عربی زبان سیکھنی شروع کر دی اور تھوڑے عرصے بعد وہ روانی سے قرآنِ پاک پڑھنے لگا۔ اس نے جیبی سائز کا ایک قرآن پاک خرید لیا' اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا اور اکثر و بیشتر اس کا مطالعہ کرتا رہتا۔ اس نے قرآن کی متعدد چھوٹی سورتیں زبانی یاد کر لیں اور انہیں خوش الحانی سے پڑھتا رہتا حتیٰ کہ کچھ ہی عرصے بعد اس نے اسلام قبول کر لیا اور عبداللہ گلبرٹ نام اختیار کیا۔

میری موصوف سے ملاقات بیس سال پہلے استنبول میں ہوئی۔ اس نے اپنے اس نظریئے یا انکشاف کی وضاحت کی کہ شاعری یا منظومات کو ریاضی کے کلیوں کی طرح مختلف اوزان پر جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے' لیکن دنیا کی کوئی نثر خواہ وہ کلاسیکل ہو یا ماڈرن اس

معیار پر پوری نہیں اترتی۔ یہ انفرادیت صرف عربی اور وہ بھی قرآنی عربی کو حاصل ہے کہ اس کی آیات کو شاعری کے اوزان کی طرح جانچا جا سکتا ہے اور ایک لفظ بھی اگر ادھر ادھر ہو جائے تو تجوید کا جاننے والا اس سے باخبر ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس صورت میں یہ کلام کسی انسان کا نہیں ہو سکتا تھا۔ لازماً یہ وحی الٰہی ہے اور یہی سبب ہے کہ میں اس پر ایمان لے آیا۔

میں استنبول ہی میں تھا کہ ایک روز وہ میرے پاس یونیورسٹی میں آیا۔ وہ سخت برہم اور جذباتی ہو رہا تھا۔ اس نے کہا: "یقیناً ہمارے مسلمان بزرگوں نے کسی طرح قرآن کا ایک ٹکڑا گم کر دیا ہے"۔ وضاحت کرتے ہوئے وہ کہنے لگا: سورہ نمبر ۱۱۰(اِذَا جَـاءَ نَـصْـرُ اللّٰـهِ) میں لوگ پڑھتے ہیں "اَفْـوَاجـاً فَـسَبِّـحْ" اور موسیقی کے اصولوں کے مطابق یہ ناممکن ہے"۔

خدا کا شکر ہے کہ مجھے فن تجوید سے بھی کچھ شناسائی تھی اس لیے میں نے اسے بتایا کہ "نہیں اس آیت کو پڑھنے کا صرف یہی ایک طریقہ نہیں بلکہ اسے اَفْـوَاجَـنْ فَـسَبِّـحْ (اَفْـوَاجـاً فَـسَبِّـحْ) بھی پڑھا جا سکتا ہے"۔ یہ سن کر وہ اچھل پڑا۔ اس کا سارا اضطراب سکون میں بدل گیا اور کہنے لگا: "واہ بہت خوب' مسئلہ حل ہو گیا۔ فن موسیقی کا ایک لازمی تقاضا پورا ہو گیا۔ لایئے میں آپ کے ہاتھ پر دوبارہ ایمان کی تجدید کرتا ہوں"۔

عبداللہ گلبرٹ کو ترکوں سے بڑی محبت تھی۔ پیرس میں وہ ترکوں کی مسجد میں جمعہ کے لیے آیا کرتا اور وہیں اس سے ملاقات ہوا کرتی۔ افسوس وہ کچھ بیمار رہ کر وفات پا گیا۔ اللہ مغفرت کرے (ترجمہ از یقین انٹرنیشنل ۷ مارچ ۱۹۸۲ء)

ہالینڈ کا ایک نومسلم

ایک روز میں آرنہم کے وسیع وعریض جنگل میں گھوم رہا تھا۔ تھک کر درختوں کے جھنڈ میں ایک بینچ پر بیٹھا' تو قریب کے بینچ سے دھیمی دھیمی خوش الحان آواز میں سورۂ رحمٰن کی تلاوت کی آواز آئی۔ ایک نہایت خوش پوشاک' فرنچ کٹ ڈاڑھی والا ڈچ آنکھیں بند کئے جھوم جھوم کر سورہ رحمٰن کی قرأت کر رہا تھا۔ جب وہ فارغ ہوا تو میں نے اٹھ کر السلام علیکم کہا۔ اس نے "وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" کہہ کر جواب دیا۔

''کیا آپ ڈچ مسلمان ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ اس کا نام عبداللہ ڈی ہوگ تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میرا وطن پاکستان ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے بتایا کہ اسلام کا تحفہ اسے کراچی میں نصیب ہوا تھا۔ وہ پہلے ڈچ نیوی میں اعلیٰ افسر تھا۔ وہاں سے قبل از وقت فراغت حاصل کر کے وہ مرچنٹ فلیٹ میں شامل ہو گیا اور ایک کارگوشپ کا کپتان بن گیا۔ یہ جہاز مشرقی بندرگاہوں اور یورپ کے درمیان سامان ڈھوتا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں ایک بار اس کا جہاز کراچی کی بندرگاہ پر کچھ سامان لدوانے کے لئے رکا۔ گرمی اور حبس کا موسم تھا۔ سامان لادنے والے مزدور پسینے میں شرابور تھے۔ جہاز کے عملے نے انہیں ٹھنڈا پانی دیا تو سب نے پینے سے انکار کر دیا کیونکہ ان کا روزہ تھا۔ ایک بوڑھے مزدور پر ڈی ہوگ کو بڑا ترس آیا جو گرمی' حبس اور سامان کے بوجھ تلے بدحال ہو رہا تھا۔ دوسروں سے نظر بچا کر وہ اس بڈھے کو اپنے کیبن میں لے گیا اور اسے ٹھنڈے جوس کا گلاس دے کر اشارے سے کہا یہاں پر اسے کوئی نہیں دیکھ رہا۔ وہ چپکے سے اسے پی لے۔ بوڑھے مزدور نے نفی میں سر ہلا کر جوس کا گلاس واپس کر دیا اور آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر "اللہ' اللہ" کہتا ہوا کیبن سے باہر چلا گیا۔

آن دیکھے خدا کی ذات پر اس قدر مکمل' بے ابہام اور غیر متزلزل ایمان دیکھ کر ڈی

ہوگ کا دل تو اسی وقت مسلمان ہو گیا تھا' لیکن اس کے دماغ نے یہ تبدیلی ایک برس بعد قبول کی۔ اس ایک برس کے دوران اس نے اپنے جہاز کے عملے میں ڈچ زبان جاننے والا ایک انڈونیشی مسلمان بھرتی کیا۔ اس سے انہوں نے قرآن شریف پڑھا' حدیث سے واقفیت حاصل کی اور پھر قاہرہ کی ایک مسجد میں جا کر باقاعدہ اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد وہ دو برس اور مرچنٹ فلیٹ میں رہا لیکن اپنا اسلام خفیہ رکھا۔ اب ریٹائر ہونے کے بعد وہ آرنہم کے قریب ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ ان کی بیوی بھی مشرف بہ اسلام ہو چکی تھی، لیکن دو بیٹے جو ترک وطن کر کے آسٹریلیا میں آباد ہو گئے ہیں' اس نعمت سے محروم رہ گئے تھے۔

عبداللہ ڈی ہوگ صاحب نے اپنے ایک دوست کا بھی ذکر کیا جو ہالینڈ کے ایک بڑے بینک میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ وہ بھی کئی برس سے مسلمان ہو چکے ہیں لیکن اپنی ملازمت کے دوران یہ راز افشا کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے' کیونکہ اس سے اس کی ترقی کے امکانات ہی مسدود ہونے کا خدشہ نہیں بلکہ خود ملازمت بھی خطرہ میں پڑ سکتی ہے۔

یہ تعصبات صرف ہالینڈ کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ مغرب کے کئی اور معاشرے بھی اسلام کے متعلق اسی قسم کی تنگ نظری کا شکار ہیں۔ یہ معاشرے اپنی جگہ بڑے متمدن' تعلیم یافتہ' آزاد خیال' متحمل' روادار اور سیکولر شمار ہوتے ہیں لیکن اسلام کے سیاق میں ان کی آزاد خیالی' بردباری اور سیکولرازم بڑی حد تک سلب ہو جاتی ہے۔

''شہاب نامہ'' قدرت اللہ شہاب (ص ۵۴۱۔۵۴۲)

کوریا میں اسلام کیسے آیا؟

۱۹۵۳ء کے بعد کوریا میں جنگ بندی ہوئی تو اقوام متحدہ کے فوجی دستے حدِ متارکہ جنگ پر متعین ہوئے۔ان میں ترکی کے دستے بھی تھے۔اب حالات کا نقشہ یہ تھا کہ دوسرے سبھی ملکوں کے فوجی خوب داد عیش دیتے اور شراب اور عورت کے نشے میں سرشار رہتے مگر ترک سپاہیوں کی شان الگ تھی۔وہ ہر طرح کے لہو ولعب سے دور رہتے۔ان کی وجہ سے نہ کسی مقامی عورت کی عزت پامال ہوتی نہ کسی کے مال کو خطرہ لاحق ہوتا۔نماز کا وقت ہوتا تو وہ وردیوں سمیت کمال نظم کے ساتھ قبلہ رُو ہو کر خدائے رحیم و کریم کے سامنے جھک جاتے۔

شب و روز کا یہ مثبت و حسنی عمل ہزاروں مقامی باشندے دیکھتے۔نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں ترکوں کے لیے عقیدت و احترام کے جذبات پیدا ہوئے اور ان میں سے کچھ لوگ اتنے متاثر ہوئے کہ مسلمان ہو گئے۔مکمل جنگ بندی ہوئی تو کچھ ترک سپاہی تبلیغ دین کی خاطر کوریا ہی میں آباد ہو گئے۔اسلام کا حلقہ روز بروز وسیع ہوتا جا رہا تھا۔

آج کل صورتحال یہ ہے کہ وہ جنوبی کوریا جہاں ۱۹۵۰ء میں اسلام کا کوئی نام لیوا نہیں تھا' وہاں اب مسلمانوں کی تعداد دس ہزار سے متجاوز ہے۔معاشرے کا بہترین ذہین اور تعلیم یافتہ طبقہ اسلام کی طرف لپک رہا ہے۔چند سال پہلے وہاں کے مسلمانوں نے سیول میں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی ہے۔کوریائی زبان میں قرآن کا ترجمہ ہو گیا ہے اور اشاعتِ اسلام کے امکانات وہاں بے حد روشن ہوتے جا رہے ہیں۔

●......●......●

ضمیمہ:

کچھ اپنے بارے میں:

یہ انٹرویو روزنامہ ''پاکستان'' لاہور کی ہفتہ وار اشاعت ''زندگی'' میں شائع ہوا۔ (۴ مئی ۲۰۰۲ء)

سوال: آپ سے یہ انٹرویو آپ کی تصانیف کے حوالے سے کیا جا رہا ہے تو براہ کرم سب سے پہلے اپنی کتب کا مختصر تعارف کرا دیجیے؟

جواب: اللہ کے فضل و کرم سے میں مختلف موضوعات پر اب تک تیرہ کتابیں مرتب کر کے شائع کرا چکا ہوں۔ ان میں سے تین کتابیں نومسلموں کے بارے میں ہیں۔ دو اردو میں ایک انگلش میں۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب کا عنوان ہے: ''ہم کیوں مسلمان ہوئے'' یہ ۵۰ نومسلموں کا تذکرہ ہے اور اپنی نوعیت کی اردو میں یہ پہلی بھرپور کتاب ہے۔ الحمدللہ اس کو علمی و ادبی حلقوں میں غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ اس کا بنگلہ، سندھی، بلوچی اور پشتو میں ترجمہ ہو گیا ہے اور چھ ماہ پہلے اس کا بارھواں ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ اس کے بعد تین سال پہلے میں نے اکاسی نومسلم خواتین کے قبول اسلام کے واقعات کتابی صورت میں شائع کیے۔ عنوان ہے: ''ہمیں خدا کیسے ملا'' اللہ کے فضل سے یہ کتاب خواتین کے لیے اپنی نوعیت کا منفرد تحفہ ہے اور اس کا سندھی اور پشتو میں ترجمہ ہو گیا ہے۔ اس سلسلے کی میری تیسری کتاب انگریزی میں ہے۔ عنوان ہے: OUR JOURNEY TO ISLAM اس میں ایک سو نومسلموں کے تذکرے شامل ہیں۔ یہ دراصل مختلف نومسلم خواتین و حضرات کے اپنے لکھے ہوئے مضامین ہیں اور میں نے کم و بیش تین سو مضامین سے ان کا کڑا انتخاب کیا ہے۔ ان کی غالب اکثریت پروفیسرز، ڈاکٹرز، انجینئرز اور ممتاز حیثیت کے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد پر مشتمل ہے۔

جملۂ معترضہ اور تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کر دوں کہ نومسلموں کے بارے میں میرے پاس اس قدر لوازمہ (Matter) ہے کہ شاید دنیا کی کسی بڑی لائبریری میں بھی یکجا صورت میں موجود نہ ہو۔

دس کتابیں میری ان کے علاوہ ہیں۔ ''کاروانِ عزیمت'' میں عہدِ حاضر اور ماضیِ قریب کے دس ایسے بزرگوں کے تذکرے ہیں جو تقویٰ اور دعوت و تبلیغ کے حوالے سے بے مثال کردار کے حامل تھے۔ یہ سب مولانا مودودی کے دورِ اول کے ساتھی تھے۔ ''اوصافِ حمیدہ'' جماعت اسلامی کی پہلی خاتون رکن اور حلقۂ خواتین کی ناظمہ محترمہ حمیدہ بیگم کے سوانحی حالات اور دینی کردار پر مشتمل ہے۔ ''مغرب پر اقبالؒ کی تنقید'' بھی علمی حلقوں میں پسند کی گئی ہے۔ اس میں علامہ اقبالؒ نے جہاں جہاں مغرب اور مغربی تہذیب پر تنقید کی ہے وہ سب مَیں نے یکجا کر دی ہے۔ ''یہ ہے مغربی تہذیب'' تقریباً ایک سو صفحے کی مختصر کتاب ہے لیکن اپنے موضوع پر خاص چیز ہے اور حیدر آباد سندھ کے نامور مصنف اور دانشور حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب نے اس کا سندھی زبان میں ترجمہ بھی شائع کر دیا ہے۔ ''ماہر القادری...... حیات اور ادبی خدمات'' میرا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے اور اب باقاعدہ کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے۔ مَیں اس کتاب کے حوالے سے بھی بہت خوش اور مطمئن ہوں کہ اللہ نے ایک ایسے شخص کے بارے میں تحقیقی کام کرنے کی سعادت عطا فرمائی جو جامع الصفات تھے اور علم و ادب اور دینی حوالے سے ان کی خدمات بے مثال ہیں۔ مجھے مولانا ماہر القادری کا ضخیم کلیات مرتب کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہوا ہے جس میں ان کا مطبوعہ، غیر مطبوعہ، مدوّن، غیر مدوّن کلام یکجا ہو گیا ہے۔ مَیں نے مولانا مودودیؒ اور محترمہ مریم جمیلہ کی انگریزی مراسلت کا بھی اردو میں ترجمہ کیا ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ اہلِ نظر نے ترجمے کو بہت پسند کیا ہے۔ اس طرح یہ دس کتابیں ہو گئیں۔ تین کتابیں ضخامت میں چھوٹی ہیں اور

دینی موضوعات پر ہیں۔ مختلف موضوعات پر درجنوں مضامین ان کے علاوہ ہیں۔

سوال: آپ نے زیادہ توجہ نومسلموں کے موضوع پر دی ہے' اس کا کوئی خاص سبب ہے؟ آپ کو ان میں کوئی خاص بات نظر آئی ہے؟

جواب: نومسلموں پر لکھنے کا خیال مجھے سب سے پہلے اس وقت آیا جب میں ۶۹-۱۹۶۸ء میں ''اردو ڈائجسٹ'' سے وابستہ تھا۔ وہاں کراچی سے ''یقین انٹرنیشنل'' کے نام سے ایک پندرہ روزہ رسالہ آیا کرتا تھا جو نصف انگریزی اور نصف عربی پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس کے ہر شمارے میں کسی ایک نومسلم کا تذکرہ شامل ہوتا تھا Why I accepted Islam کے عنوان سے مجھے یہ موضوع بہت اچھا لگا۔ اس میں دلچسپی کا عنصر بھی تھا' معلومات بھی تھیں اور ایمان افروزی کا پہلو بھی۔ چنانچہ میں نے ارادہ کر لیا کہ اس موضوع پر تحقیق کروں گا اور کتاب مرتب کروں گا۔ ستمبر ۱۹۷۰ء میں محکمۂ تعلیم میں لیکچرار ہو گیا اور فراغت میسر آئی تو اس موضوع پر تحقیق شروع کر دی۔ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے بہت سے انگریزی مضامین مل گئے۔ عائشہ بھوانی ٹرسٹ کراچی کی کتاب ISLAM OUR CHOICE سے بھی خاصی مدد ملی۔ اس طرح میں نے منتخب مضامین کا ترجمہ کیا اور ''ہم کیوں مسلمان ہوئے'' وجود میں آ گئی۔ اسے سب سے پہلے ۱۹۷۸ء میں سید قاسم محمود نے جریدی شکل میں چھاپا۔ باقاعدہ کتابی صورت میں یہ ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی اور اس کی غیر معمولی مقبولیت سے حوصلہ پا کر میں نے دوسری کتابیں مرتب کر ڈالیں۔

اپنی نوعیت کے اعتبار سے نومسلموں کا موضوع دینی لٹریچر کا شاید سب سے دلچسپ موضوع ہے۔ ناول اور افسانے کی طرح دلچسپ...... کہ اصل میں اس کا اسلوب کہانی ہی کا ہوتا ہے۔ ایک سچی بے آمیز کہانی کا...... اور وہ جو کہا جاتا ہے کہ ''سچائی افسانے سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے'' نومسلموں کے واقعات پر ہو بہو صادق

آتا ہے۔ پھر اس میں ایمان افروزی کا پہلو بڑا نمایاں ہوتا ہے۔ ایک شخص اپنے مذہب' ماحول اور خاندان و حالات سے بغاوت کرتا ہے' اسلام قبول کرتا ہے اور اس حوالے سے طرح طرح کی آزمائشوں کا سامنا کرتا ہے اور منزلِ حق کو پانے کے لئے ہر طرح کی قربانیاں دیتا ہے۔ قاری کو یہ سب چیزیں متاثر کرتی ہیں اور اس کے ایمان میں اضافے کا سبب بنتی ہیں۔ اس پر مزید یہ کہ اسے مختلف مذاہب کی کمزوریوں سے آگاہی ہوتی ہے جبکہ اسلام کی حقانیت واشگاف ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ نومسلموں کا موضوع تقابلِ ادیان کے حوالے سے بہت ہی مفید موضوع ہے اور قاری بغیر کسی اکتاہٹ کے بعض اوقات ثقیل دینی معلومات آسانی سے پڑھ لیتا ہے اور اسے ہضم بھی کر لیتا ہے' اس کے اندر دینی غیرت پیدا ہونے لگتی ہے اور عمل کا جذبہ کروٹیں لینے لگتا ہے۔

سوال: آپ کے خیال میں دنیا بھر میں قبولِ اسلام کی بڑی بڑی وجوہات کیا ہیں؟

جواب: مختلف نومسلموں کی زندگیوں اور کردار کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا بھر میں عقیدے کے حوالے سے ایک زبردست خلا پیدا ہو گیا ہے۔ یہودیت ہو' عیسائیت ہو' ہندومت ہو یا بدھ ازم' سب کے عقائد خلافِ عقل ہیں۔ کوئی تاریخی بنیاد نہیں رکھتے اور آج کے انسان کی رہنمائی کرنے میں قطعی ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ کمیونزم نے بھی دنیا کو قتل و غارت گری اور ظلم واستبداد کے سوا کچھ نہیں دیا۔ یہی سبب ہے کہ ان مذاہب کے بیشتر پیروکار خدا کے منکر ہیں' لیکن ذہنی اور قلبی اعتبار سے شدید ترین بے اطمینانی میں مبتلا ہیں جسے وہ شراب اور جنس میں غرق ہو کر نظر انداز کرنے اور بھول جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ نظریے اور عقیدے اور فکر کے اس غیر معمولی خلا کو اسلام بڑی ہی آسانی سے پُر کر سکتا ہے۔ اندازہ کیجئے کہ کسی مبلغ کی مداخلت کے بغیر یورپ اور امریکہ میں ان گنت لوگ اپنے طور پر قرآنِ پاک کا مطالعہ کر کے اور نبی اکرم صلی

اللہ علیہ وسلم کی سیرت مطہرہ کے بارے میں معلومات حاصل کر کے مسلمان ہو گئے ہیں۔ اس طرح جو خوش بخت بھی کھلے دل اور غیر جانبداری سے اسلام کا مطالعہ کرتا ہے' غور و خوض سے کام لیتا ہے' وہ شعوری طور پر اسے قبول کر لیتا ہے۔ چنانچہ قبول اسلام کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ دوسرا کوئی مذہب بھی کسی ذہین اور فکر و دانش رکھنے والے شخص کو عقلی سطح پر مطمئن نہیں کرتا اور ایسے لوگ جب بے تعصبی سے اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو عقل و دانش پر مبنی اس کی بے مثل تعلیمات انہیں متاثر کرتی ہیں۔ وہ قرآن سے خصوصاً بہت متاثر ہوتے ہیں اور نبی اکرمؐ کی تاریخی حیثیت اور اعلیٰ و ارفع انسانی' اخلاقی اور دعوتی کردار انہیں مسخر کر لیتا ہے۔ یہ امر خاصا عبرت ناک ہے کہ بعض نومسلموں نے برملا یہ اظہار کیا کہ اگر ہم اسلام قبول کرنے سے پہلے کسی مسلمان سے مل لیتے تو شاید اسلام قبول نہ کرتے۔

اسلام کی اثر آفرینی اور سحر نا کی کا یہ عالم ہے کہ سارے منفی پروپیگنڈے کے باوجود جونہی مغربی خواتین کو پتہ چلتا ہے کہ دین اسلام میں سب سے ارفع و اعلیٰ حیثیت عورت کی ہے اور یہاں اس کا ہر رشتہ محترم و مقدس ہے تو وہ مسلمان ہو جاتی ہیں۔ اندازہ کیجئے کہ گزشتہ چند برسوں میں جرمنی میں پچاس ہزار اور برطانیہ میں تیس ہزار خواتین مسلمان ہو چکی ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔

سوال: آپ کے خیال میں عہد حاضر میں تبلیغ اسلام کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

جواب: میرے خیال میں اس وقت اسلام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ خود مسلمان ہیں۔ مسلمانوں کی بے عملی' قول و فعل کا تضاد' دنیا پرستی اور مختلف معاملات میں رویے کا چھچھورا پن دنیا بھر میں اسلام کو بدنام کرنے کا سبب بن گیا ہے۔ لوگ اسلام سے متاثر ہوتے ہیں مگر اہل اسلام کی حرکتوں سے بدک جاتے ہیں حتیٰ کہ ہمارے دینی حلقے بھی داعی کا صحیح کردار ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ چنانچہ اگر ہم دعوت و تبلیغ کے حوالے سے

واقعی سنجیدہ ہیں تو پھر ضروری ہے کہ ہم دیگر اقوام کے مقابلے میں حریف کے بجائے داعی کا کردار ادا کریں۔ داعی بننا بہت ہی مشکل ہے۔ یہ نبیوں کی سنت ہے' یعنی پہلے اپنے کردار اور روّیے کو مکمل طور پر دینی تعلیمات کے مطابق ڈھالا جائے اور پھر یک طرفہ صبر اور انتظار کا اسلوب اختیار کیا جائے اور مدعو خواہ کتنی بھی زیادتیاں کیوں نہ کریں انہیں برداشت کیا جائے اور محبت اور حکمت کے ساتھ ان تک اسلام کا پیغام پہنچایا جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ دوسری اقوام کے خلاف محاذ آرائی اور نعرے بازی کا انداز ترک کر کے مفاہمت کا اسلوب اختیار کیا جائے۔ دعوت وتبلیغ کے مؤثر ہونے کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ ہم اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرنا سیکھیں۔ خواب وخیال کو چھوڑ کر حقیقت پسند بنیں اور احساس برتری کو ترک کر کے عجز اور فروتنی کا انداز اختیار کر لیں۔ یاد رہے کہ تاتاریوں جیسی وحشی اور سفاک قوم کو ایک عالم دین کے عجز' اخلاص اور دردمندی نے مسخر کر لیا تھا اور حیرت انگیز طور پر وہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئی تھی۔

سوال: اب آخر میں کچھ اپنے بارے میں بتایئے؟

جواب: مَیں تحصیل ڈسکہ' ضلع سیالکوٹ کے مشہور قصبے سمبڑیال کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں کوٹ بھگت میں پیدا ہوا۔ یہ گاؤں نہر اپر چناب کے کنارے واقع ہے اور اس نہر نے میری ذہنی اور علمی پرداخت میں فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے۔ پرائمری اسکول کے ریکارڈ کے مطابق میری تاریخ پیدائش یکم جون ۱۹۴۲ء ہے۔ میرا تعلق ایک ایسے خاندان سے ہے جہاں دُور دُور تک تعلیم کا گزر نہیں تھا۔ میرے والد مہر پیراں دتہ ارائیں ایک ان پڑھ کسان تھے۔ لیکن مکمل ناخواندہ ہونے کے باوجود وہ بڑے ہی خدا ترس اور بیدار مغز انسان تھے۔ پنج وقتہ نمازی تھے' مہمان نواز اور بہادر آدمی تھے۔ ان کے تین بیٹوں اور تین بیٹیوں میں سے قرعۂ تعلیم میرے ہی نام نکلا۔ یہ بھی اللہ کا احسان

ہے کہ پانچویں چھٹی جماعت ہی سے مجھے مطالعے کا شوق ہو گیا اور یہ شوق اتنا بڑھا کہ میں اسلامیہ ہائی اسکول سمبڑیال کے راستے میں بھی' جو کم از کم اڑھائی میل پر مشتمل تھا اور اسے پیدل ہی طے کرنا ہوتا تھا' میں کوئی ناول یا تاریخ کی کتاب پڑھتا جاتا تھا۔ اس طرح میٹرک تک میں نے اردو کے ہر اچھے ناول نگار کی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ لیکن میں سب سے زیادہ متاثر نسیم حجازی سے ہوا۔ اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے اور جنت میں اعلیٰ ترین مقامات سے نوازے' ان کی نگارشات نے میری ذہنی و ادبی تربیت میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ میرے نزدیک نسیم حجازی محض ادیب اور ناول نگار نہ تھے' وہ بہت بڑے مفکر بھی تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے کرداروں کی زبان سے جگہ جگہ حکمت و دانش اور عبرت و موعظت کے حوالے سے بہت خوبصورت زبان میں بے حد قیمتی مشورے عطا کیے ہیں۔ بہر حال مختلف مصنفین اور ادیبوں کی تحریریں پڑھتے ہوئے میں بار بار سوچا کرتا کہ یہ لکھنے والے بھی انسان ہیں' میں بھی انسان ہوں' پھر مجھے بھی ان کی طرح لکھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ چنانچہ بغیر کسی رہنمائی کے میں نے خود ہی لکھنا شروع کر دیا اور میٹرک میں جب مضمون نویسی کے ایک مقابلے میں میرے مضمون کو انعام ملا' تو میرا حوصلہ بڑھا۔ یہ مقابلہ مشہور صحافی' ادیب اور سرکاری افسر مرحوم صادق قریشی نے اپنے سرکاری رسالے "ہم لوگ" میں طلبہ کے صفحات پر کرایا تھا۔ "ہم لوگ" کے ایک کالم "کچھ یادیں کچھ مشاہدے" میں بھی میری تحریریں انٹرمیڈیٹ کے دوران چھپتی رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صادق قریشی مرحوم نے میری بہت حوصلہ افزائی فرمائی اور ہر مضمون اور کالم کا معاوضہ دیا۔ میں اس حوالے سے ان کا ہمیشہ شکر گزار رہوں گا۔

میں جناح اسلامیہ کالج سیالکوٹ میں بی اے کا طالب علم تھا جب کہ "اردو ڈائجسٹ" میں میرے تین طبع زاد طنزیہ مزاحیہ مضامین شائع ہوئے۔ یہ ۶۴-۱۹۶۳ء

کی بات ہے اور اس زمانے میں "اردو ڈائجسٹ" ملک کا سب سے کثیر الاشاعت رسالہ تھا اور اگر میں یہ کہوں کہ ان تینوں مضامین کی اشاعت میری زندگی کا سنگ میل بن گئی تو کوئی مبالغہ نہیں ہو گا۔ ہوا یوں کہ بی اے کرنے تک ہمارے گھر کے مالی حالات بہت ہی دگرگوں ہو گئے تھے۔ دونوں بڑے بھائی جو میری تعلیم کے حق میں نہیں تھے' دو سال پہلے الگ ہو گئے تھے اور بوڑھے والد یک و تنہا رہ گئے تھے۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کا بظاہر کوئی امکان نہ تھا' لیکن چونکہ بی اے میں میرے نمبر بہت اچھے تھے اس لیے گمان تھا کہ مجھے کوئی سکالرشپ مل جائے گا۔ چنانچہ میں نے والد صاحب سے اجازت لے لی۔ دو دوستوں سے آٹھ سو روپے قرض لیا اور پنجاب یونی ورسٹی اور ینٹل کالج میں ایم اے اردو میں داخلہ لے لیا۔ لیکن سوء اتفاق کہ مجھے کوئی سکالرشپ نہ ملا۔ اب اس آڑے وقت میں "اردو ڈائجسٹ" کے جناب الطاف حسن قریشی صاحب نے میری دستگیری فرمائی اور مجھے اپنے رسالے میں جز وقتی ملازمت عطا کر دی اور یوں میں حیرت انگیز طور پر ایم اے کرنے میں کامیاب ہو گیا ورنہ ؎

کہاں میں' کہاں یہ نکہتِ گل
نسیم صبح' تیری مہربانی

اس حوالے سے میں الطاف حسن قریشی صاحب کو اپنا بہت بڑا محسن سمجھتا ہوں اور میرے دل میں ان کے لئے احترام کے خاص جذبات موجود رہتے ہیں۔

ایم اے کرنے کے بعد میں نے کم و بیش تین سال تک ماہنامہ "اردو ڈائجسٹ" اور ہفت روزہ "زندگی" میں کام کیا حتیٰ کہ ۱۹۷۰ء میں پبلک سروس کمیشن نے مجھے لیکچرر کے لئے منتخب کر لیا اور میں ستمبر ۱۹۷۰ء میں سرکاری ملازمت سے وابستہ ہو گیا جہاں سے تقریباً ۳۲ سال کی ملازمت کے بعد ریٹائر ہو گیا ہوں۔ ریٹائر

مٹ کے وقت میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کی حیثیت سے بیسویں سکیل کی انتہا پر تھا اور اس دوران پی ایچ ڈی کے علاوہ میں نے ہومیوپیتھی (ڈی ایچ ایم ایس) کا چار سالہ کورس بھی کر لیا تھا۔

راشد صاحب! یوں تو مجھ پر اللہ تبارک وتعالیٰ کے بے حد حساب احسانات ہیں جن کے لئے میرا رواں رواں شکر گزار رہتا ہے لیکن اس کا سب سے بڑا فضل وکرم مجھ پر عقیدے کے حوالے سے ہے۔ میں جس ماحول میں پیدا ہوا' پلا بڑھا وہاں بدعات وخرافات کا دور دورہ تھا۔ قبر پرستی' پیر پرستی' توہم پرستی اور رسم پرستی پوری فضا میں رچ بس گئی تھی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہائی اسکول کی تعلیم کے دوران ہی مجھے ان "پرستیوں" سے بیزار و متنفر کر دیا اور میں نے اس کے فضل اور تائید سے "توحیدِ خالص" کو اختیار کر لیا جس کے نتیجے میں مجھے کم و بیش اسی طرح کی مشکلات اور آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا جس طرح کی مشکلات ایک نومسلم کو عموماً سہنی پڑتی ہیں۔ اندازہ کیجئے کہ عقائد ونظریات کی وجہ سے والدِ محترم اور ایک بڑی بہن کے سوا سارا گھر میری تعلیم کے خلاف ہو گیا لیکن اللہ رب العزت نے خاص فضل فرمایا' ساری مشکلات دور ہو گئیں اور ہر معاملے میں' ہر قدم پر کامیابیاں میری ہم رکاب بن گئیں۔ الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم۔

●......●......●

اسی مصنف کی دیگر کتب

۱۔ ''ہم کیوں مسلمان ہوئے؟'' دنیا بھر کے 90 نومسلموں کا تذکرہ، بے حد دلچسپ، بہت ایمان افروز اور روح پرور۔ اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی بڑی کتاب، مقبولیت کا یہ عالم کہ حال ہی میں اس کا پندرھواں ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ صفحات ۶۱۹ قیمت ۳۰۰ روپے۔

۲۔ ''ہمیں خدا کیسے ملا؟'' دنیا بھر کی 81 اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کے قبولِ اسلام کے واقعات۔ یہ بھی اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔ اسلام کی حقانیت کے منہ بولتے سچے واقعات۔ اس کا بھی حال ہی میں پانچواں ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۲۰۰۰ء میں چھپا تھا۔ صفحات ۴۹۰، قیمت ۲۵۰ روپے۔

۳۔ "Our Journey to Islam" ایک سو نومسلموں کا تذکرہ انگریزی میں۔ اپنے موضوع پر بھرپور، جامع کتاب۔ صفحات ۵۱۱۔ قیمت ۳۰۰ روپے

۴۔ ''کاروانِ عزیمت'' عہدِ حاضر اور ماضیِ قریب کے دس ایسے بزرگوں کے تذکرے جو تقویٰ، للّٰہیت اور دعوت و تبلیغ کے حوالے سے بے مثال کردار کے حامل تھے۔ اس کتاب کی تحقیق و تالیف پر مصنف کے پانچ سال صرف ہوئے۔ صفحات ۵۰۰۔ قیمت

۵۔ ''اوصافِ حمیدہ'' بے مثال دینی و دعوتی کردار کی مالک خاتون محترمہ حمیدہ بیگم کے سوانحی حالات اور دینی خدمات کا تذکرہ۔ محترمہ شادی کے بعد جب پہلے روز اپنے خاوند کے گھر تشریف لائیں اور محلے کی عورتیں انہیں دیکھنے کے لیے جمع ہوئیں تو انہوں نے وہیں، اُسی محفل میں درسِ قرآن شروع کر دیا ــــ اور پھر زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ کا ذکر بلند کرنے میں

۔ گزار دیا۔ صفحات ۳۲۰۔ قیمت ۱۵۰ روپے

۶۔ ''ماہر القادری..... حیات اور ادبی خدمات'' نامور شاعر، نعت گو، ناول نگار، افسانہ نویس، ماہرِ لسانیات، مبلغ، دانشور، صحافی اور مفکر مولانا ماہر القادری کے حالات اور علمی و ادبی کارناموں پر مشتمل کتاب ـــــ یہ مصنف کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ صفحات ۵۰۷، قیمت ۲۷۵ روپے۔

۷۔ ''کلیاتِ ماہر القادری'' ۱۰۵۰ صفحات پر مشتمل مولانا ماہر القادری کا مدوّن، غیر مدوّن، مطبوعہ، غیر مطبوعہ کلام یکجا کر دیا گیا ہے۔ قیمت ۶۰۰ روپے۔

۸۔ ''مغرب پر اقبال کی تنقید'' اپنے موضوع پر ایک منفرد کتاب ہے۔ اہل نظر نے بہت پسند کی ہے۔ صفحات ۱۸۸، قیمت ۷۵ روپے

۹۔ ''یہ ہے مغربی تہذیب'' اردو اخبارات کے دس سال کے تراشے حوالوں کے ساتھ چونکا دینے والی، چشم کشا تالیف۔ صفحات ۸۰، قیمت ۳۰ روپے

۱۰۔ ''مولانا مودودیؒ اور محترمہ مریم جمیلہ کی مراسلت''۔ انگریزی سے ترجمہ جو اہلِ نظر نے بہت پسند کیا ہے۔

۱۱۔ کائنات کے پانچ راز قرآن و سنت اور جدید ترین سائنسی تحقیقات کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ برمودا مثلث کا راز کیا ہے؟ اُڑن طشتریاں اور بلیک ہولز کیا ہیں اور ناسا کی تصویریں دراصل کیا ہیں؟ ٹھوس دلائل کے ساتھ اس کتاب میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دنیا میں گرمی کیوں بڑھ رہی ہے اور گلیشیر کیوں پگھل رہے ہیں۔ ایک منفرد، اچھوتی تحقیق، ایمان افروز، فکر انگیز تجزیہ۔

صفحات: ۳۲ قیمت: ۱۵ روپے

ہماری دیگر کتب

کتاب	مصنف	قیمت
اسلام، پیغمبر اسلام ﷺ اور مستشرقین مغرب کا انداز فکر	ڈاکٹر سید عبدالقادر جیلانی	250/-
ہمارا تعلیمی بحران ۔ چند نظریاتی مباحث	ڈاکٹر محمد امین	250/-
ہم کیوں مسلمان ہوئے	ڈاکٹر عبدالغنی فاروق	300/-
ہمیں خدا کیسے ملا؟	ڈاکٹر عبدالغنی فاروق	250/-
اوصاف حمیدہ	ڈاکٹر عبدالغنی فاروق	150/-
سید مودودی سرحد میں	پروفیسر نورورجان	90/-
مسلم نشاۃ ثانیہ ۔ اساس اور لائحہ عمل	ڈاکٹر محمد امین	200/-
علامت نگاری (انتخاب مقالات)	پروفیسر اشتیاق احمد	175/-
پردہ اٹھادوں اگر چہرۂ الفاظ سے......	ڈاکٹر ف ۔ عبدالرحیم	80/-
شہید قائد نے فرمایا! (علامہ احسان الٰہی ظہیر کے رشحات فکر)	ڈاکٹر قمر احسان کماپوری	50/-
خود ستائیاں (خود نوشت خاکے)	ڈاکٹر اشفاق احمد ورک	200/-
جھوٹا سب سنسار (شاعری)	مظفر حسین شمیم مرتب: خالد ندیم	200/-
کامیاب بیت بازی	ڈاکٹر محمود فیضانی	150/-
خطبۂ حجۃ الوداع	ڈاکٹر نثار احمد	150/-
وجود باری تعالیٰ	پروفیسر ڈاکٹر محمد وسیم اکبر شیخ	90/-
سرور دو عالم ﷺ	فضل کریم خاں درانی	90/-
حیات مسیح اور ختم نبوت	نور محمد قریشی ایڈووکیٹ	90/-
☆ الموسوعۃ القضائیۃ (عربی ایڈیشن)	نظر ثانی: پروفیسر ڈاکٹر سہیل حسن	300/-
الموسوعۃ القضائیۃ (اردو ایڈیشن)	رسول کریم ﷺ کے عدالتی فیصلوں کا مستند مجموعہ	300/-
قرآن اور تعمیر سیرت	پروفیسر فروغ احمد	100/-
مغربی جمہوریت، حقیقت اور سراب	ڈاکٹر مستفیض احمد علوی	150/-
تہذیب کے فرزند (مکالماتی کالم)	ڈاکٹر مستفیض احمد علوی	100/-
اقبال کی شخصیت پر اعتراضات کا جائزہ	پروفیسر ڈاکٹر ایوب صابر	300/-
انتخاب خطوط غالب	پروفیسر ڈاکٹر ایوب صابر	100/-

حقیقت ذکر	ڈاکٹر عبدالخالق	150/-
اردو نثر میں طنز و مزاح	ڈاکٹر اشفاق احمد ورک	590/-
ذاتیات (طنز و مزاح)	ڈاکٹر اشفاق احمد ورک	100/-
تاریخ میں سفر	عدنان طارق	250/-
جہان حیرت (خود نوشت سوانح حیات)	سردار محمد چوہدری	700/-
بیسویں صدی کا سب سے بڑا انسان	سردار محمد چوہدری	200
قدرتی خزانوں سے علاج	حکیم راحت نسیم سوہدروی	100/-
بیماریاں اور ان کا نباتاتی علاج	حکیم راحت نسیم سوہدروی	90/-
نادر ملت، آبروئے ملت (ایوارڈ یافتہ)	پروفیسر محمد رفیق عالم	350/-
بطل حریت۔ فقیر آف ایپی	ڈاکٹر فضل الرحمن	220/-
تذکرۃ النبلاء فی تراجم العلماء (تذکرہ علمائے اہلحدیث)	عبدالرشید عراقی	220/-
نقاد اور عقلیات	مطاہر ترمذی	140/-
جناب غلام احمد پرویز اپنے الفاظ کے آئینے میں	پروفیسر دین محمد قاسمی	200/-
مقالات شاغف	ابوالاشبال شاغف بہاری	250/-
محمد علی کلے کا قبول اسلام	ڈاکٹر عبدالغنی فاروق	15/-
کائنات کے پانچ راز	ڈاکٹر عبدالغنی فاروق	15/-
غزل آباد	ڈاکٹر اشفاق احمد ورک	200/-
علامت کے مباحث	پروفیسر اشتیاق احمد	320/-
محمد حسن عسکری۔ عہد آفریں نقاد	پروفیسر اشتیاق احمد	180/-
تاج محل سے زیرو پوائنٹ	چوہدری محمد ابراہیم	220/-
شہد اور کلونجی	حکیم راحت نسیم سوہدروی	100/-
جدیدیت کا تنقیدی تناظر	پروفیسر اشتیاق احمد	350/-
نماز کے بعد دعائے اجتماعی	عبدالجبار سلفی	70/-
قلمی دشمنی	ڈاکٹر اشفاق احمد ورک	100/-
وقائع پاکستان	اورنگ زیب علی طاہر	200/-

عمر بن عبد العزیزؒ	عبد الرشید عراقی	100/-
ہندو علماء و مفکرین کی قرآنی خدمات	اورنگ زیب اعظمی	40/-
ارمغان عروض	کندن لال کندن	160/-
مصطلحات ٹھگی	علی اکبر الہ آبادی۔ مرتب: رشید حسن خاں	190/-
اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	سید احتشام حسین	175/-
صحت الفاظ	سید بدر الحسن	190/-
دلی کی چند عجیب ہستیاں	اشرف صبوحی	100/-
عالم اسلام کی اخلاقی صورت حال	اسرار عالم	220/-
اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر سنبل نگار	210/-
اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر سنبل نگار	165/-
آئینہ ایام تاریخ	مولانا عبد الجبار سلفی	200/-
مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں (مکمل دو جلدوں کا سیٹ)	مرتب: حسن چشتی	500/-
مذاہب عالم میں تصور خدا	ڈاکٹر ذاکر نائیک	70/-
قرآن اور سائنس	ڈاکٹر ذاکر نائیک	40/-
مقصد زندگی	الفریڈ ایڈلر	200/-
ڈگر سے ہٹ کر (خود نوشت)	سعیدہ بانو احمد	180/-
علامہ شبلی نعمانی کی قرآن فہمی	ڈاکٹر محمد مسعود عالم قاسمی	75/-
مولانا شبلی نعمانی بحیثیت سیرت نگار	ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی	190/-
تدوین سیر و مغازی	قاضی اطہر مبارک پوری	200/-
وحی حدیث	ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی	160/-
عبد المطلب ہاشمی حضورؐ کے دادا	ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی	70/-
فتاویٰ	ڈاکٹر یوسف القرضاوی	350/-
سوئے مقتل	ہاؤکائی کولنز	60/-
پیام اقبال	پروفیسر محمد اسحاق اظہر	90/-
مشفق من خواجہ من	محمد عالم مختار حق	150/-

● میری آنکھوں میں کچھ تکلیف ہے' اس لیے اکثر رات کو پڑھنے لکھنے سے پرہیز کرتا ہوں' مگر پروفیسر عبدالغنی فاروق نے اپنی کتاب ''ہم کیوں مسلمان ہوئے؟'' مجھے دی' تو میں اسے گھر لے گیا اور باوجود آنکھوں میں تکلیف کے اس وقت تک اسے نہیں چھوڑا جب تک ختم نہ کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے موضوع پر یہ بڑی ہی بے مثال اور عجیب و غریب کتاب ہے۔ دنیا بھر کے نوے (۹۰) نامور نومسلم ان مراحل کی کہانی سناتے ہیں جن سے گزر کر یہ خوش نصیب حضرات اسلام کے چشمۂ صافی تک پہنچے۔ بلاشبہ یہ داستانیں بے حد دلچسپ اور ایمان پرور ہیں۔ ان کے مطالعے سے ایک طرف مختلف مذاہب کا کھوکھلا پن ظاہر ہوتا ہے' دوسری جانب اسلام کی صداقت نکھر کر عیاں ہوتی ہے اور تیسری طرف ان نومسلم حضرات کی سلامتِ طبع' جرأت مندی اور دینِ حق کے لیے ان کے اخلاص اور استقامت کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا محمد متین ہاشمی (مرحوم)

● میرے نزدیک یہ کتاب اس اعتبار سے بے حد اہم ہے کہ اس میں مغربی زندگی کے بارے میں وہ فسٹ ہینڈ معلومات حاصل ہوتی ہیں جن کی ہمیں خصوصاً ہمارے مبلغوں کو اشد ضرورت ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ کتابی (BOOKISH) نہیں' مسئلے نہیں چھانٹتی' فلسفے نہیں بگھارتی' دلیلیں نہیں دیتی' یہ کتاب قاری سے باتیں کرتی ہے۔ سب نومسلموں کی باتوں سے خلوص کی خوشبو آتی ہے' ان کی باتوں میں سچائی ہے۔ وہ باتیں Convincing ہیں۔ میں اس کتاب سے بہت متاثر ہوا ہوں اور اس نے میری بیشتر ذہنی مشکلات کو حل کر دیا ہے۔

ممتاز مفتی (مرحوم)

ڈسٹری بیوٹرز
فضلی بک سپر مارکیٹ
اردو بازار کراچی
فون: 021-2212991

فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اردو بازار، لاہور فون: 7320318
ای میل: hikmat100@hotmail.com

ISBN 969-8773-28-2